محاضرات حدیث
ڈاکٹر محمود احمد غازی

محاضرات حدیث

ڈاکٹر محمود احمد غازی

الفیصل ناشران و تاجران کتب
غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

دوسرا خطبہ

علم حدیث کی ضرورت اور اہمیت

سنت کی اقسام ۴۹

سنت فعلی ۴۹

سنت تقریری ۴۹

قرآن میں سنت کی سند ۵۱

حدیث کے مقابلہ میں دیگر مذاہب کے صحائف کی حیثیت ۵۳

کتاب الٰہی اور ارشادات انبیاء میں امتیازی فرق ۵۶

سنت: وحی الٰہی کا عملی نمونہ ۵۷

قرآن و سنت کا باہمی تعلق ۷۵

محدثین کی اقسام ۸۳

سوال و جواب ۸۶

تیسرا خطبہ:

حدیث اور سنت بطور ماخذ شریعت

وحی کی اقسام ۹۲

کتب حدیث کی خصوصیات ۱۱۳

احادیث نبویؐ کی تعداد ۱۱۹

تجمیع سنت ۱۲۰

سوال و جواب ۱۲۷

چوتھا خطبہ

روایت حدیث اور اقسام حدیث

روایت اور درایت ۱۳۵

متن حدیث ۱۳۶

علم روایت ۱۳۷

سماع ۱۳۷

قرأت ۱۳۸

اجازت ۱۳۸

مناولہ ۱۳۸

مکاتبہ ۱۳۹

اعلام ۱۳۹

وصیت ۱۴۰

وجادہ ۱۴۰

تحمل اور اداء ۱۴۱

راوی کی شرائط ۱۴۳

مقبول یا صحیح حدیث ۱۵۰

حدیث حسن ۱۵۰

ضعیف اور موضوع احادیث ۱۵۱

صحیح لعینہ اور صحیح لغیرہ ۱۵۲

حسن لعینہ اور حسن لغیرہ ۱۵۳

تواتر کے درجات ۱۵۴

حدیث مشہور ۱۵۹

خبر واحد ۱۵۹

مرسل حدیث ۱۶۳

منقطع حدیث ۱۶۴

معضل حدیث ۱۶۵

مدلس حدیث ۱۶۵

معلل حدیث ۱۶۶

شاذ حدیث ۱۶۹

دسواں خطبہ

کتب حدیث ۔ شروح حدیث

موطا امام مالک ۳۷۱

مصنف عبدالرزاق ۳۸۱

مسند امام احمد بن حنبل ۳۸۳

الجامع الصحیح امام بخاری ۳۸۹

صحیح مسلم ۳۹۱

سنن ابوداؤد ۳۹۳

جامع ترمذی ۳۹۴

سنن نسائی ۳۹۸

سنن ابن ماجہ ۳۹۹

سوال و جواب ۴۰۲

گیارھواں خطبہ

برصغیر میں علم حدیث

برصغیر میں علم حدیث کا پہلا دور ۴۱۵

برصغیر میں علم حدیث کا دوسرا دور ۴۲۰

برصغیر میں علم حدیث کا تیسرا دور ۴۲۰

شیخ عبدالحق محدث دہلوی ۴۲۰

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ۴۲۴

شاہ عبدالعزیز ۴۲۷

حضرت میاں نذیر حسین محدث دہلوی ۴۲۹

علامہ عبدالرحمن مبارکپوری ۴۳۰

مولانا رشید احمد گنگوہی اور ان کے تلامذہ ۴۳۱

مولانا انور شاہ کشمیری ۴۳۲

فرنگی محلی علماء ۴۳۳

نواب صدیق حسن خان ۴۳۴

دائرۃ المعارف العثمانیہ ۴۳۵

سوال و جواب ۴۳۷

بارھواں خطبہ:

علوم حدیث — دور جدید میں

مستشرقین کی خدمات ۴۴۳

تاریخ حدیث پر ہونے والا کام ۴۴۵

مخطوطات ۴۴۷

علم حدیث پر نئے علوم کی روشنی میں کام ۴۴۹

احادیث میں سابقہ کتب کا ذکر ۴۵۵

نئے انداز سے کام کرنے کی راہیں ۴۵۶

تدوین حدیث غیر مسلموں کے لئے ۴۵۸

علم حدیث کی کمپیوٹرائزیشن ۴۵۹

انکار حدیث کا مقابلہ ۴۶۱

☆☆☆

پیش لفظ

قبل ازیں محاضرات قرآنی کے عنوان سے علوم قرآن، تاریخ قرآن مجید اور تفسیر سے متعلق موضوعات پر بارہ خطبات پر مبنی ایک جلد طالبانِ علوم قرآنی کی خدمت میں پیش کی جا چکی ہے۔ زیر نظر جلد اسی سلسلے کی دوسری کڑی ہے۔ اس میں حدیث، علوم حدیث، تاریخ تدوین حدیث اور مناہج محدثین سے متعلق موضوعات پر بارہ خطبات پیش خدمت ہیں۔

یہ خطبات ادارہ "الہدیٰ" کے تحت ادارہ الہدیٰ ہی کے اسلام آباد مرکز کے وسیع ہال میں دیے گئے۔ مرکز میں راولپنڈی اور اسلام آباد کی بہت سی مدرسات قرآن کے علاوہ الہدیٰ سے وابستہ خواتین اہل علم کی بڑی تعداد شریک تھی۔ خطبات کا آغاز ۳ اکتوبر ۲۰۰۳ء بروز جمعہ ہوا اور درمیان میں اتوار کا دن نکال کر ۱۵ اکتوبر ۲۰۰۳ء تک مسلسل بارہ روز یہ سلسلہ جاری رہا۔ خواتین اساتذہ کی بڑی تعداد نے شرکت فرما کر مقرر کو عزت بخشی۔ علوم حدیث، رجال، جرح و تعدیل، حدیث کی اقسام اور ان کے احکام جیسے دقیق اور فنی مباحث کو شرکاء خواتین نے بڑی دلچسپی اور توجہ کے ساتھ سنا۔ اس دلچسپی سے اندازہ ہوا کہ خواتین کے اندر اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ میں دینی تخصصات کی کس قدر ضرورت اور کتنی شدید طلب موجود ہے۔

محاضرات قرآنی کی طرح ان محاضرات کی اصل مخاطب بھی وہ خواتین اہل علم ہیں جو قرآن مجید کے درس و تدریس میں مصروف ہیں۔ فہم قرآن اور تفسیر قرآن کے لیے حدیث و سنت کی ضرورت و اہمیت سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں ہے۔ مدرسات قرآن کو علوم حدیث اور حدیث کی اہمیت سے باخبر کرنا اور علم حدیث کی طلب اور شوق پیدا کرنا ہی ان خطبات کا اصل مقصد تھا اور

پہلا خطبہ

علم حدیث: ایک تعارف

پیر، 6 اکتوبر 2003ء

علم حدیث: ایک تعارف

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم وعلی آلہ واصحابہ اجمعین

سب سے پہلے میں دل کی گہرائیوں سے ادارہ الہدیٰ کا شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے یہ عزت بخشی اور یہ موقع عنایت فرمایا کہ حدیث نبوی اور سنت رسول ﷺ کے بارے میں چند ارشادات آپ کی خدمت میں پیش کرسکوں۔

یہ خطبات، جن کی تعداد ان شاءاللہ بارہ ہوگی، علم حدیث کے مختلف پہلوؤں سے بحث کریں گے۔ اس میں علم حدیث کے فنی مباحث پر بھی گفتگو ہوگی، علم حدیث کی تاریخ پر بھی گفتگو ہوگی، اور محدثین کرام نے احادیث رسول کو جمع کرنے، مرتب کرنے اور ان کا مطالعہ اور تشریح و تفسیر کرنے میں جو خدمات انجام دی ہیں، ان خدمات کا بھی اختصار کے ساتھ جائزہ لینے کی کوشش کی جائے گی۔

علم حدیث کا تعارف

آج کی گفتگو کا عنوان ہے علم حدیث: ایک تعارف۔ علم حدیث کے تعارف کی ضرورت اس لئے پیش آتی ہے کہ عموماً ہر مسلمان حدیث رسولؐ سے تو واقف ہوتا ہے، اس کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کیا ہے؟ اور اسلام میں حدیث کی اہمیت کیا ہے؟ لیکن بہت سے حضرات کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ فنی اعتبار سے علم حدیث کا کیا مطلب ہے؟ حدیث اور اس سے ملتی جلتی اصطلاحات کا مفہوم کیا ہے؟ ان اصطلاحات کا استعمال اہل علم کے یہاں کن کن معانی میں ہوا ہے؟ یہ اور اسی قسم کی بہت سی فنی تفصیلات ایسی ہیں جن سے بہت سے لوگ واقف نہیں

ہیں۔ ان سے عدم واقفیت کے باعث بہت سے مسائل اور غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ قرآن مجید کی تشریح وتفسیر کا سوال ہو، فقہی احکام اور شریعت کے مسائل کا معاملہ ہو، یا شریعت کے احکام میں ترتیب اور باہمی ربط کا سوال ہو، ان سب چیزوں کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے علم حدیث سے فنی واقفیت بقدر ضرورت لازمی ہے۔

ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآن مجید ایک متعین کتاب ہے۔ پورا قرآن مجید اس کتاب کے اندر لکھا ہوا ہے۔ اس سے باہر قرآن کا کوئی وجود نہیں ہے اور سارے کا سارا قرآن اس کتاب کے اندر آگیا ہے۔ لیکن حدیث یا سنت کے بارے میں ایسی کوئی ایک کتاب موجود نہیں ہے جس کے بارے میں کہا جاسکے کہ حدیث یا سنت پوری کی پوری اس کتاب میں موجود ہے۔

احادیث کی تاریخ، تدوین اور روایت ودرایت کے بارے میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ خود احادیث کے بہت سے مجموعے ابتدائی صدیوں سے متداول چلے آرہے ہیں۔ بعد کی صدیوں میں مرتب ہونے والے بھی بہت سے مجموعے ملتے ہیں جن میں بہت سی احادیث مختلف موضوعات پر مختلف مقاصد کے لئے جمع کی گئی ہیں۔ ان سب کتابوں سے سنت کا پتہ چلتا ہے۔ اس لئے جب تک اسلامیات کے طلبہ کو بالعموم اور قرآن مجید کے طلبہ کو بالخصوص اچھی طرح سے یہ معلوم نہ ہو کہ حدیث اور سنت کس کو کہتے ہیں، حدیث کی جو کتابیں ہمارے سامنے ہیں ان سے استفادہ کرنے کا طریقہ کیا ہے، حدیث کی کسی کتاب میں اگر کوئی حدیث لکھی ہوئی ہے تو اس کی روشنی میں قرآن پاک کو کیسے سمجھا جائے؟ جب تک ان سب امور سے گہری واقفیت نہ ہو اس وقت تک قرآن پاک کو کما حقہ سمجھنا بہت مشکل ہے۔ ان تمام امور کو جاننے اور سمجھنے کے تفصیلی قواعد اور ضوابط مقرر ہیں جن پر گزشتہ تیرہ سو سال سے لوگ عمل کرتے چلے آرہے ہیں اور قرآن مجید اور ارشادات رسول کو ان قواعد وضوابط کی روشنی میں سمجھ رہے ہیں۔

یہ سمجھنا کہ قرآن مجید اور سنت کسی خلا میں پائے جاتے ہیں اور بغیر کسی تسلسل کے آج جس کا جو جی چاہے وہی معنی قرآن مجید کی آیات اور الفاظ کو پہنا دے، یہ تصور درست نہیں ہے۔ قرآن مجید ایک تسلسل کے ساتھ ہم تک پہنچا ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے صحابہ کرام کو اس کے معانی ومطالب سمجھائے۔ صحابہ کرامؓ نے وہی معانی ومطالب تابعین کو سمجھائے اور اس طرح نسلاً بعد نسل ایک طبقہ کے بعد دوسرا طبقہ اور دوسرے کے بعد تیسرا طبقہ اس کو سیکھتا گیا اور اس طرح یہ

رہنمائی ہم تک پہنچی ہے۔ اس لئے علمی اور دینی امور میں خدانخواستہ اگر کوئی خلا پیدا ہو گیا یا ہماری فہم میں کوئی ایسا خلل آ گیا کہ جس میں ماضی سے ہمارا رشتہ کٹ جائے تو پھر قرآن مجید کے فہم میں بڑی غلطیاں پیدا ہو جانے کا امکان ہے۔ ماضی قریب میں خود ہمارے ملک میں بہت سی گمراہیاں اس لئے پیدا ہوئیں کہ بعض لوگوں نے سنت رسولؐ کے اس تسلسل کو، احادیث کے اس پورے علم اور فن کو اور قرآن مجید کی تفسیر و تشریح کے ان سارے اصولوں کو نظر انداز کر کے صرف اپنی عربی زبان دانی اور محض اپنی فہم کی مدد سے قرآن کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اس کے نتیجے میں بہت سی خرابیاں اور کمزوریاں پیدا ہوئیں۔ اس لئے قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے علم حدیث سے واقفیت ناگزیر ہے۔
علم حدیث کی ضرورت اور اہمیت پر تفصیلی گفتگو بعد میں ہو گی۔ لیکن اس ابتدائی تمہیدی گفتگو سے یہ اندازہ ہو گیا ہو گا کہ علوم اسلامیہ میں بالعموم اور قرآن مجید کو سمجھنے میں بالخصوص علم حدیث کی اہمیت کتنی ہے۔

حدیث کے لغوی معنی

لفظ حدیث، جس کو اس خاص فن کی اصطلاح کے طور پر استعمال کیا گیا ہے، عربی زبان میں بہت سے معانی اور مطالب کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ عربی زبان میں حدیث کے معنی گفتگو کے بھی ہیں۔ حدیث کے معنی نئی بات کے بھی ہیں اور حدیث کے معنی کسی اہم اور قابل ذکر واقعہ کے بھی ہیں۔ نئی چیز، نئی بات، اہم اور قابل ذکر واقعہ، کوئی گفتگو یا کوئی کلام، ان کو عربی زبان میں حدیث کہتے ہیں۔ آپ نے رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مشہور ارشاد سنا ہو گا جس میں آپ نے فرمایا: خیر الحدیث [illegible]، ایک جگہ ہے: احسن الحدیث کتاب اللہ، یعنی سب سے اچھی گفتگو، سب سے اچھا کلام اللہ کا کلام ہے۔ گویا حدیث اور کلام دونوں ہم معنی، مترادف کے طور پر بھی استعمال ہوتے ہیں۔

جاہلیت کے زمانے میں عربوں میں آپس میں جنگیں ہوتی رہتی تھیں اور آپس میں اختلافات بھی ہوتے رہتے تھے۔ جب ایک قبیلے کی دوسرے قبیلے سے جنگ ہوتی تھی تو جیتنے والا قبیلہ اپنی فتح کو ایک تاریخی جشن کے طور پر یاد رکھتا تھا۔ اس کی تفصیلات قبیلے کے خطیبوں، شاعروں اور میلوں میں افتخار کے ساتھ گفتگو کی جاتی تھیں۔ ان واقعات کو ایام العرب کے

حدیث نبوی

تاہم جب یہ لفظ یعنی علم حدیث ایک فنی اصطلاح کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ تو اس سے مراد وہ تمام چیزیں یا وہ تمام امور ہوتے ہیں جن کا مقصد رسول اللہ ﷺ کے ارشادات گرامی، آپؐ کے افعال اور آپ کے احوال کی تحقیق کرنا ہے۔ علامہ بدرالدین عینی ایک مشہور محدث ہیں، صحیح بخاری کے شارح بھی ہیں اور مشہور فقیہ بھی ہیں۔ انہوں نے علم حدیث کی تعریف کی ہے کہ ھُوَ علمٌ یُعرَفُ بِہٖ اقوالُ رسولِ اللہ ﷺ و افعالُہٗ و احوالُہٗ۔ یعنی علم حدیث وہ علم ہے جس کے ذریعے رسول اللہ ﷺ کے اقوال، آپؐ کے افعال اور آپؐ کے احوال معلوم کئے جائیں۔

علم حدیث کی تاریخ میں محدثین کے درمیان شروع سے حدیث کی اصطلاحی تعریف کے بارے میں ایک اختلاف چلا آرہا ہے۔ اور وہ اختلاف یہ ہے کہ کیا صرف رسول اللہ ﷺ کے اقوال، افعال اور احوال کا نام حدیث ہے یا صحابہ کرامؓ اور تابعین کے اقوال، افعال اور احوال کا نام بھی حدیث ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ صحابہ کرام کے اقوال اور افعال و احوال تو حدیث میں شامل ہیں لیکن تابعین کے اقوال، افعال اور احوال حدیث کے مفہوم میں شامل نہیں ہیں۔ کچھ اور حضرات کا کہنا ہے کہ تابعین کے اقوال، افعال اور احوال بھی حدیث میں شامل ہیں۔ اس اعتبار سے علم حدیث کی تعریف میں تھوڑا سا فرق واقع ہو جائے گا۔ جو حضرات صرف رسول اللہ ﷺ کے اقوال، افعال اور احوال کو حدیث قرار دیتے ہیں۔ وہ اس کی وہ تعریف کریں گے جو ابھی میں نے عرض کی۔ جو لوگ صحابہ اور تابعین کے اقوال، افعال اور احوال کو بھی حدیث کے مفہوم میں شامل قرار دیں گے وہ اس کی تعریف میں صحابہ اور تابعین کے الفاظ بھی شامل کر دیں گے۔

اس اختلاف سے یہ نہ سمجھئے گا کہ اس سے علم حدیث کے ذخیرہ پر کوئی فرق پڑتا ہے۔ علم حدیث کا ذخیرہ وہی ہے۔ چاہے آپ یہ تعریف اختیار کریں یا وہ تعریف اختیار کریں یا کوئی تیسری تعریف اپنائیں۔ اس لئے کہ جو حضرات صحابہ کرام کے ارشادات اور اقوال کو بھی حدیث قرار دیتے ہیں وہ ان کو اس لئے حدیث قرار دیتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ کے ارشادات سے رسول اللہ ﷺ کے اقوال اور احوال کا پتہ چلتا ہے۔ صحابہ کرام کے اجتماعی طرز عمل سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ

نکل جائیں گویا بجری روشنی کا مطلب یہ ہے کہ فلاں ختم ہوگئی۔ کسی کو یہ اصطلاح اختیار کرنے پر اعتراض کرنے کی اجازت نہیں کہ آپ نے یہ اصطلاح کیوں رکھی؟ یا اس کا عکس کیوں نہیں رکھا؟ آپ کو یہ اختیار ہے کہ آپ اپنی سہولت کی خاطر جو اصطلاح چاہیں وہ اختیار کرلیں۔ آپ بطور اصطلاح کوئی لفظ مقرر کرلیں کہ جو باہر سے نیا آنے والا ہو اس کو علم نہیں ہے تو بعد کا ہوگا اس کو معلوم کرنے کے۔ اس میں کوئی اختلاف کی بات نہیں ہے۔

اس لیے اگر محدثین نے اپنی اپنی اصطلاحات اختیار کی ہیں تو اس میں کسی کو اعتراض کا یا شک وشبہ کا حق نہیں ہے۔ اس لیے کہ ہر عالم یا غیر عالم کو اپنی اصطلاحات وضع کرنے کا حق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مفسرین میں اور محدثین میں کچھ اصطلاحات کے بارے میں تو اتفاق رائے ہے۔ لیکن کچھ اصطلاحات کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض حضرات نے ان کا ایک مفہوم قرار دے کر اس کو استعمال کیا ہے اور بعض دوسرے حضرات نے کوئی اور مفہوم قرار دے کر استعمال کیا ہے۔ جس کی تفصیل آئندہ دنوں میں آپ کے سامنے آتی رہے گی

حدیث اور سنت کا فرق

سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ حدیث اور سنت میں محدثین نے کیا فرق رکھا ہے۔ حدیث اور سنت دو مشہور اصطلاحات ہیں۔ قرآن مجید میں سنت کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے اور حدیث کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ خود حدیث پاک میں حدیث کا لفظ بھی آیا ہے اور سنت کا لفظ بھی آیا ہے۔ حدیث اور سنت کے بارے میں علماء کے ایک گروہ کی تو رائے یہ ہے کہ یہ دونوں بالکل ایک مفہوم رکھتی ہیں۔ جو حدیث ہے وہ سنت ہے اور جو سنت ہے وہ حدیث ہے۔ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ایک بڑی تعداد کی رائے یہ ہے

کچھ دوسرے حضرات کا کہنا ہے کہ حدیث ایک عام چیز ہے اور سنت خاص ہے اور اس کا ایک حصہ ہے۔ حدیث تو ہر وہ چیز ہے جو رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارک سے منسوب ہوگئی جس میں ضعیف احادیث بھی شامل ہیں اور موضوع احادیث بھی شامل ہیں، منکر اور شاذ احادیث بھی شامل ہیں جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ اور سنت سے مراد وہ طریقہ ہے جو احادیث صحیحہ کی بنیاد پر ثابت ہوتا ہے۔ جو رسول اللہ ﷺ کا طے کیا ہوا طریقہ ہے جو آپ نے اپنی امت کو سکھایا۔ جو قرآن

وتابعین ان سب کے اقوال وافعال واعمال کو حدیث بھی کہتے ہیں اور اثر بھی کہتے ہیں۔

علم حدیث کی اصطلاح میں ایک اصطلاح ہے 'مرفوع'۔ مرفوع کے لفظی معنی ہیں وہ چیز جس کو بلند کیا گیا ہو جس کو اٹھایا گیا ہو، بلند شدہ، انگریزی میں Exalted۔ اصطلاح میں اس سے مراد وہ حدیث ہے جو رسول اللہ ﷺ تک پہنچتی ہے، جس میں راوی رسول اللہ ﷺ کا اسم مبارک لے کر صراحتاً اس حدیث کو آپ کی ذات مبارک سے منسوب کرتا ہے۔ اس کو مرفوع کہتے ہیں۔

اس کے مقابلہ میں دوسری اصطلاح ہے 'موقوف'۔ یعنی جسے روک دیا گیا ہو، جو رک گیا ہو، انگریزی میں آپ Halted کہہ سکتے ہیں۔ یہ وہ روایت یا حدیث ہے جس کی نسبت صحابہ تک پہنچتی ہے، ان کے بعد آگے نسبت کوئی چیز ثابت نہیں کرتی۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ فلاں شخص نے مجھ سے بیان کیا، فلاں شخص سے فلاں نے بیان کیا، انہوں نے فلاں صحابیؓ کو یہ ارشاد فرماتے سنا اور پھر آگے وہ بات بیان ہوتی ہے۔ اس کے بعد آگے نہیں۔ اس بات کو موقوف کہتے ہیں جو صحابہ کرام پر جا کر رک جائے۔ جو لوگ حدیث اور اثر میں فرق کرتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ روایت اگر مرفوع ہو، رسول اللہ ﷺ کی ذات تک پہنچتی ہو تو اس کو حدیث کہا جائے گا اور اگر روایت صحابہ کرام یا تابعین پر موقوف ہو جائے تو اس کو اثر کہا جائے گا۔

یہی فرق ہے خبر اور حدیث کے درمیان۔ خبر کا لفظ بھی کتب حدیث میں کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ لغوی اعتبار سے خبر کا مطلب ہے اطلاع یا رپورٹ۔ یہ اطلاع یا رپورٹ جو رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد یا فعل یا کیفیت کے بارے میں اگر کسی نے دی وہ اصطلاحاً خبر بھی کہلاتی ہے اور حدیث بھی کہلاتی ہے۔ یہ دونوں اصطلاحات Inter-changeable ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے کے بدلے میں بھی استعمال ہوتی ہیں اور الگ الگ بھی استعمال ہوتی ہیں۔ یہ چار اصطلاحی الفاظ ہیں جن کو دیکھ لینا چاہئے یعنی حدیث، سنت، اثر اور خبر۔

اصطلاحات میں کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہئے۔ ہر محدث کا حق ہے کہ جو اصطلاح چاہے وضع کرے۔ لیکن جب ہم کسی اصطلاح کو استعمال کرنا چاہتے ہیں تو ہم پہلے یہ ضرور دیکھ لیں کہ ہم اس اصطلاح کو کس سیاق و سباق میں استعمال کر رہے ہیں اور کس مفہوم میں استعمال کر رہے ہیں۔ مثلاً ایک اصطلاح امام بخاری کی ہے تو ہم امام بخاری کے سیاق و سباق میں امام بخاری کی اصطلاح کو استعمال کریں گے اور اپنی اصطلاح استعمال نہیں کریں گے۔ جو

بات درست نہیں ہوگی کہ میں اپنی کوئی اصطلاح وضع کرلوں یا آپ اپنی کوئی اصطلاح وضع کریں اور اس کو امام بخاری کے سیاق وسباق میں استعمال کریں۔ وہ امام بخاری کے نقطۂ نظر کی صحیح ترجمانی نہیں ہوگی۔ اس لئے ان چاروں اصطلاحات کا مفہوم پہلے سے ہی ذہن میں واضح ہونا چاہئے۔

علم حدیث: ایک بے مثال فن

علم حدیث جس کے بارے میں عام طور پر یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ یہ دن بدن کم ہوتا جارہا ہے اور لوگوں کی دلچسپی بھی روز بروز گھٹ رہی ہے۔ اس میں مہارت رکھنے والے دن بدن محدود ہوتے چلے جارہے ہیں۔ اس علم سے دلچسپی خود اسلامیات کے طلبہ کی محدود ہوتی چلی جارہی ہے۔ یہ انسانی تاریخ کا ایک انتہائی منفرد اور بے مثال علمی کارنامہ ہے۔ یہ ایک ایسا عظیم علم ہے جس کی مثال پیش کرنے سے انسانی تاریخ قاصر ہے۔ اس پر تھوڑی سی گفتگو آگے چل کر ہوگی۔ لیکن سردست اختصار کے ساتھ یہ ذہن میں رکھئے کہ انسانی تاریخ میں کوئی ایسا علم موجود نہیں ہے جس کا مقصد کسی ایک شخصیت کے اقوال وافعال کو محفوظ رکھنا اور ان کو ہر قسم کے شک وشبہ سے پاک کرکے اس طرح پیش کردینا ہو کہ پڑھنے والوں کو ایسا یقین آجائے جیسے کہ آج سورج نکلنے کا یقین ہے۔ جتنی یہ بات یقینی ہے کہ اس وقت سورج نکلا ہوا ہے اتنا ہی اس بات کو یقینی بنادینا کہ یہ بات رسول اللہ ﷺ کے دہن مبارک سے نکلی تھی یا نہیں نکلی۔ یہ چیز انسانی تاریخ میں اپنی نوعیت کی منفرد کاوش ہے۔ دنیا میں بڑی بڑی بڑی دینی شخصیتیں گزری ہیں۔ آج بھی ایسی دینی شخصیتیں موجود ہیں اور تاریخ میں بھی موجود رہی ہیں جن کے پیروکاروں کی تعداد رسول اللہ ﷺ کے ماننے والوں سے زیادہ ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جو لوگ مانتے ہیں۔ ان کی تعداد ان سے بہت زیادہ ہے جو رسول اللہ ﷺ کو مانتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ماننے والوں میں یہودی بھی شامل ہیں، عیسائی بھی شامل ہیں اور مسلمان بھی شامل ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ماننے والوں میں یہودی، عیسائی اور مسلمان تینوں شامل ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی بھی جلیل القدر پیغمبر کے اقوال وافعال اور ارشادات کو محفوظ رکھنے کا ان کے ماننے والوں نے ایک لاکھواں اہتمام بھی نہیں کیا، ایک کروڑواں اہتمام بھی نہیں کیا جتنا اہتمام مسلمانوں نے رسول اکرم ﷺ کے ارشادات گرامی کو محفوظ کرنے کے لئے کیا۔ اس پر آگے چل کر مزید تفصیل سے گفتگو ہوگی۔ تاہم اس سے پہلے ایسے کسی فن کی کوئی مثال

آئے گا کہ آپ کا سوال کیا ہے، اور اگر سمجھ میں آ جائے تو پچیس تیس آدمیوں سے یا شاید پچاس پچاس آدمیوں سے زیادہ کے نام آپ کو نہ بتا سکیں۔ مسلمانوں میں چھ لاکھ رواۃ کے نام اس وقت محفوظ اور موجود ہیں۔

ابھی میں ساتھ والے کمرے میں بیٹھا تھا تو یہاں جو کتابیں رکھی ہوئی ہیں وہ اس بات کے ثبوت کے لئے کافی ہیں۔ رجال کی ان کتابوں میں کئی لاکھ انسانوں کے حالات محفوظ ہیں۔ صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارک کو دیکھا۔ ان کی آنکھیں اس شرف سے مشرف ہوئیں اور ان کے کان اس اعزاز سے معزز ہوئے۔ اس لئے سب سے پہلے ان کے حالات جمع کرنے پر توجہ دی گئی۔ آج صحابہ کرام کے تذکرے پر جو کتابیں ہیں جن کی تعداد ایک دو نہیں بلکہ درجنوں میں ہے۔ ان میں کم و بیش بارہ سے پندرہ ہزار صحابہ کرام کے حالات محفوظ ہیں۔ اس کی کوئی مثال آج تک کی تاریخ میں نہیں مل سکی۔ اور اس وقت بھی نہیں مل سکتی تھی۔ کہ کسی بڑے سے بڑے انسان کے ساتھیوں کا اور اس کے اصحاب کا تذکرہ جمع کیا گیا ہو اور بارہ پندرہ ہزار افراد کا تذکرہ اس لئے جمع کیا گیا ہو کہ یہ فلاں شخص کے اصحاب اور اس کے ساتھی ہیں اور ان سے ان کے بارے میں کوئی معلومات یا کوئی رہنمائی مل سکتی ہے۔ اس نقطہ نظر سے آپ جتنا غور کریں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہ انسانی تاریخ کا ایک انتہائی منفرد علم ہے، جس کی کوئی مثال دنیا کی تاریخ میں نہ مذہبی علوم میں ملتی ہے اور نہ غیر مذہبی علوم کی تاریخ میں ملتی ہے۔

مذہبی علوم کی تاریخ میں ایسی مثالیں تو موجود ہیں کہ کسی مذہبی شخصیت کے ارشادات کے مجموعے مرتب ہوئے ہوں۔ آج بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعض ارشادات بائبل میں موجود ہیں۔ یہ چار انجیلیں جن کو عیسائی مستند انجیلیں مانتے ہیں، یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سوانح عمریاں اور ارشادات کے مجموعے ہیں۔ اس سے قطع نظر کہ ان کی تاریخی حیثیت کیا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ ان کی کوئی Authenticity ہے کہ نہیں، یہ بات بہرحال سب مانتے ہیں کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اقوال اور ارشادات کے کچھ مجموعے ہیں۔ لیکن ان مجموعوں کی مدد سے اگر آپ حضرت عیسیٰ کے اقوال و ارشادات کی کوئی فہرست مرتب کریں تو وہ سوا ڈھائی سو سے زیادہ ارشادات کا مجموعہ نہیں بنے گا۔ سارے ارشادات ملا کر ان کی تعداد سوا ڈھائی سو سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اس کے مقابلے میں رسول اللہ ﷺ کے ارشادات گرامی جو صحابہ کرام نے جمع کئے ہیں ان

کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی غلطی کو درست کردے۔ لیکن یہ بات یا تو پرلے درجہ کی غلط فہمی اور کم فہمی ہے یا انتہائی بدترین تحریک کی بدنیتی ہے جس میں علم حدیث کے بارے میں شک وشبہ کا اظہار کیا جائے۔

کسی بھی چیز کو محفوظ رکھنے کے جتنے طریقے ہو سکتے ہیں اور انسانی ذہن ودماغ میں آسکتے ہیں وہ سب حدیث کے سارے متن کو، ارشادات رسول ﷺ کو محفوظ رکھنے کے لئے محدثین نے اور امت مسلمہ نے اختیار کئے اور ان سب طریقوں سے محفوظ ہو کر علم حدیث مرتب و منقح ہو کر ہم تک پہنچا ہے۔ دنیا کے کسی علم پر اتنے بڑے بڑے انسانی دماغوں نے اور اتنے غیر معمولی یادداشت رکھنے والے انسانوں نے مسلسل غور وخوض نہیں کیا جتنا علم حدیث پر غور وخوض ہوا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلنے والے ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف پر ہزاروں پہلوؤں سے لاکھوں انسانوں نے غور کیا ہے اور یہ غور چودہ سو برس سے مسلسل ہوتا چلا آرہا ہے۔ ابھی یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ اس وقت بھی دنیا بھر میں جاری وساری ہے۔ اور نئے نئے اہل علم تسلسل کے ساتھ نئے نئے راستے اور نئے نئے موضوعات علم حدیث پر غور کرنے کے لئے سامنے لا رہے ہیں۔ جن پر میں سب سے آخری خطبہ میں ان شاء اللہ گفتگو کروں گا۔

اس لئے سب سے پہلے تو یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ علم حدیث اسی طرح کا مستند علم ہے جیسے کوئی بھی انسانی علم مستند ہو سکتا ہے۔ اس علم کے ذریعے رسول اللہ ﷺ کی سنت اور آپ کی احادیث مبارکہ کو جس طرح محفوظ کیا گیا وہ اسی طرح قطعی اور یقینی ہے جس طرح قرآن حکیم قطعی اور یقینی ہے۔ حدیث وسنت قرآن حکیم کی طرح صرف ایک فرق کے ساتھ قطعی اور یقینی ہے کہ قرآن مجید کے الفاظ اللہ کی طرف سے ہیں اور احادیث کے الفاظ اللہ کی طرف سے نہیں ہیں۔ قرآن مجید ایک خاص ترتیب سے رسول اللہ ﷺ نے محفوظ کرایا اور احادیث کو حضورؐ نے اس ترتیب سے محفوظ نہیں کرایا۔ صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ ﷺ کے زمانہ مبارک میں قرآن مجید کو زبانی یاد کیا اور احادیث کو بہت سے صحابہ نے اس طرح سے زبانی یاد نہیں کیا۔ اس لئے کہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اس ایک فرق کے ساتھ احادیث اور سنت اسی طرح مستند اور محفوظ ہیں جس طرح کہ قرآن مجید مستند اور محفوظ ہے۔

بیان کی، جس کے سامنے بیان کیا اس نے آپ کی نسبت زیادہ بہتر سمجھا۔ یا اس کی حفاظت کی۔ یعنی آپ نے بیان کی اور کسی وجہ سے آپ کو یاد نہیں رہا، جس سے بیان کی تھی اس نے یاد رکھا اور آگے سینکڑوں ہزاروں تک پہنچایا، یا جہاں تک آپ شاید نہیں پہنچا سکتے تھے۔ تو اس کا امکان ہے کہ آپ سے زیادہ بہتر انداز میں وہ دوسروں تک پہنچا سکے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض ایسے لوگ جن کو پہنچایا گیا ہو وہ پہنچانے والے سے زیادہ حفاظت کرنے والے ہوں۔ ایک جگہ ارشاد ہوا کہ "رب حامل فقه الى من هو افقه منه" بعض اوقات ایسا ہو سکتا ہے کہ فقہ اور دانائی کی یہ بات، دین میں گہری سمجھ اور شعور کی یہ بات آپ نے کسی ایسے کو پہنچائی جو آپ سے زیادہ سمجھدار ہو اور وہ اس سے وہ معانی اور مطالب نکال لے جو آپ کے ذہن میں نہیں آئے۔ میں نے اپنی زندگی میں بارہا اس کی مثالیں دیکھی ہیں۔ کہ علم حدیث کا ایک خاص پہلو کسی جگہ بیان کیا گیا اور جس کے روبرو اور جس سے بیان کیا گیا اس نے اس سے وہ معنی نکالے جو بیان کرنے والے کے ذہن میں بالکل نہیں تھے۔

میرے ساتھ بھی ایک بار ایسا ہی ہوا۔ اے کے بروہی مرحوم ہمارے ملک کے مشہور دانشور اور قانون دان تھے۔ ایک مرتبہ ہم دونوں کسی معاملہ پر تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ میں نے ان کو اپنے نقطہ نظر کی تائید میں ایک حدیث سنائی جو انہوں نے پہلے نہیں سنی تھی۔ انہوں نے اس کو بڑا خوش ہو کر سنا اور اپنے پاس نوٹ بھی کر لیا۔ اگلے دن کسی موضوع پر ان کا لیکچر تھا۔ اس لیکچر میں انہوں نے اس حدیث کے معانی اور پیغام کو اتنی خوبصورتی اور جامعیت سے بیان کیا کہ میرے ذہن میں بے اختیار حضورؐ کے الفاظ گونجنے لگے کہ "رب حامل فقه الى من هو افقه منه" بعض اوقات سنانے والا اصل بات کی گہرائی تک اتنا نہیں پہنچ پاتا جتنا کہ سننے والا پہنچ جاتا ہے۔ حدیث رسول کی یہ بصیرت میں نے خود دیکھی ہے۔

ایک جگہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اور یہ ہم سب کے لئے ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ "اللهم ارحم خلفائی" اے اللہ میرے جانشینوں پر رحمت فرما۔ صحابہ کرامؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ آپ کے خلفاء سے مراد کون لوگ ہیں؟ آپؐ نے فرمایا "الذين ياتون من بعدي" میرے خلفاء سے مراد وہ لوگ ہیں جو میرے بعد آئیں گے۔ "يروون احاديثي" میری حدیثیں روایت کریں گے۔ "و يعلمونها الناس" اور لوگوں کو سکھائیں گے۔ یعنی وہ لوگ جو میری عادات کا

موجود ہیں اور دستیاب ہیں۔ لہٰذا یہ سمجھنا کہ حدیث تو زبانی روایت کی بنیاد پر چلی اور زبانی روایت کی بنیاد پر تین سو سال تک چلتی رہی اور بعد میں لوگوں نے جمع کر دیا، یہ بات درست نہیں ہے۔ اس پر تفصیل سے آگے چل کر بات کریں گے۔

لیکن ایک بات یاد رکھیں کہ کسی چیز کو محفوظ رکھنے کے جو طریقے ہو سکتے ہیں وہ سارے کے سارے علم حدیث اور سنت کو محفوظ رکھنے کے لئے اختیار کئے گئے۔ صحابہ کرامؓ میں سے پچاس کے قریب ایسے ہیں کہ جنہوں نے حضور ﷺ کی حیات مبارکہ ہی میں آپؐ کے ارشادات کو لکھا۔ ان لکھنے والوں میں حضرت ابو ہریرہؓ بھی شامل ہیں۔ ان میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ، حضرت سعد بن عبادہؓ اور کئی ایک حضرات شامل ہیں جن کے بارے میں آئندہ گفتگو کی جائے گی۔ یہ حضرات رسول اللہ ﷺ کے ارشادات گرامی کو تحریر کیا کرتے تھے، زبانی یاد کیا کرتے تھے اور اس زبانی یادداشت کا وقتاً فوقتاً اپنے تحریری ذخائر سے موازنہ کرتے رہتے تھے۔ ان ذاتی ذخائر سے موازنہ کرنے کے ساتھ ساتھ ہزاروں افراد ایسے موجود تھے جو تھوڑی سی بھی بھول چوک یا کمزوری اگر پیدا ہوتی تو اس کی نشاندہی کرنے پر ہر وقت کمربستہ رہا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ عرض کرتا ہوں جس سے اندازہ ہوگا کہ لوگ اس معاملہ میں کتنے حساس اور متشدد تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی ذات کے ساتھ کوئی ایسی چیز منسوب نہ ہونے پائے جس کے بارے میں پورے یقین کے ساتھ یہ ثابت نہ ہو کہ حضورؐ کی زبان مبارک سے ایسا ہی نکلا تھا۔

حضرت ابو ہریرہؓ راویان حدیث میں سب سے مشہور ہیں اور آپ ایک طویل عرصہ تک حدیث بیان فرماتے رہے۔ ذخیرۂ حدیث کا سب سے بڑا اثاثہ آپ ہی کی ذات گرامی رہی ہے۔ اس پر بھی آگے گفتگو کریں گے۔ آپؓ مدینہ منورہ میں حدیث بیان فرمایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں مشہور تابعی، جن کو بعض لوگوں نے صحابہ میں بھی شامل کیا ہے، مروان بن حکم، مدینہ کے گورنر تھے۔ یہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے پہلے تھے۔ اپنی گورنری کے زمانے میں وہ کبھی کبھی حضرت ابو ہریرہؓ کے درس حدیث میں جا کر بیٹھا کرتے تھے۔ بعض احادیث انہوں نے سنیں اور یاد کر لیں۔ اس کے بعد گورنری سے معزول ہو کر کہیں اور چلے گئے۔ ایک طویل عرصہ کے بعد وہ خلیفہ بنے اور کچھ عرصہ بعد حج کے لئے آنا ہوا اور مدینہ منورہ میں حاضری ہوئی تو دوبارہ حضرت ابو ہریرہؓ کے درس میں جا کر بیٹھ گئے۔ ان کو خیال ہوا کہ شاید حضرت ابو ہریرہؓ سے حدیث بیان

کرتے تھے کوئی بھول چوک ہو رہی ہے؟ ورنہ جو پہلے بیان کیا تھا آج اس سے مختلف بیان کر رہے ہیں۔ انہوں نے حضرت ابو ہریرہؓ سے اس بارے میں کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ صرف یہ کہا کہ میں حدیث سننا چاہتا ہوں آپ ایک خاص مجلس میرے لئے بھی رکھیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے حامی بھر لی۔ ادھر خلیفہ نے ایک کاتب کی ذمہ داری لگائی کہ تم اس محفل میں جب حضرت ابو ہریرہؓ حدیث بیان کریں تم ان کے پیچھے چپکے چپکے نوٹ کرتے رہو اور کسی کو اس کا پتہ نہ چلے۔ جب یہ خاص مجلس شروع ہوئی تو حضرت ابو ہریرہؓ حدیث بیان کرتے اور کاتب لکھتے گئے۔ مروان بن حکم بعد میں اس تحریر کو اپنے ساتھ لے گئے۔

ایک سال کے بعد ان کو دوبارہ یہ مشورہ آیا تو وہ اس موقع پر وہ اپنے ساتھ اس تحریر کو بھی ساتھ لائے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے کہا کہ وہ احادیث آپ دوبارہ بیان فرما دیجئے۔ انہوں نے وہ احادیث دوبارہ بیان کیں۔ کاتب ایک ایک کرکے چیک کرتے رہے اور معلوم ہوا کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے نہ تو کوئی حرف زیادہ کیا تھا اور نہ ہی ایک حرف کم کیا تھا۔ اس پر مروان نے کہا کہ مجھے شبہ ہوا تھا کہ شاید آپ حدیث سنانے میں کچھ بھول رہے ہیں تو میں آپ کی آزمائش کرنا چاہتا تھا کہ آپ کی یادداشت میں کوئی فرق تو نہیں آیا۔ اس لئے میں نے آپ سے دوبارہ سن کر چیک کیا تو درست نکلا۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے یہ سن کر فرمایا کہ اس میں ایک نقطہ کا بھی فرق نکلتا تو میں آج سے احادیث بیان کرنا چھوڑ دیتا۔ پھر غصہ کرتے ہوئے اپنے مکان پر گئے۔ وہ سارے دفتر ان کو دکھائے اور کہا کہ یہ وہ تحریرات ہیں جو میں نے رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے سن کر لکھے تھے۔ میں ان کو روزانہ چیک کرتا ہوں، روزانہ یاد کرتا ہوں اور جب بھی کوئی حدیث بیان کرنے لگتا ہوں تو پہلے اس تحریر سے اپنی یادداشت کو تازہ کرتا ہوں۔

پھر آپؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کی محفل میں میری حاضری کا معاملہ یہ تھا کہ دوسرے صحابہ کرامؓ اپنے کاروبار وغیرہ کے لئے چلے جاتے، کسی کے خاندان تھے، بیویاں تھیں اور زمینیں تھیں۔ میرا کچھ نہیں تھا۔ میں مسجد نبوی میں رہتا تھا اور اصحاب صفہ میں سے تھا۔ نہ میرا کوئی روزگار تھا نہ ملازمت تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے کھانے کے لئے کچھ دیا تو میں نے کھا لیا۔ جب بھی آپ مسجد میں تشریف لاتے میں قریب جا کر بیٹھ جاتا تھا۔ ہر بات سنتا رہتا تھا۔ ایک دن میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ آپ جب ارشاد فرماتے ہیں تو بعض اوقات مجھے یاد نہیں

رہتا۔ مجھے کوئی ایسا طریقہ بتائیں کہ مجھے یاد رہا کرے۔ آپ نے دو باتیں ارشاد فرمائیں۔ ایک تو کیا کرو اپنی چادر بچھاؤ۔ میں نے اپنی چادر بچھا دی۔ آپ نے کوئی دعا پڑھی اور چادر پر پھونک دی۔ اور دیکھنے میں گرہ لگائی جیسے کوئی چیز لگا کر گرہ لگائی جاتی ہے۔ پھر فرمایا اس چادر کو سینے سے لگا لو۔ ایک تو دعا کا یہ خاص طریقہ اختیار فرمایا۔ دوسرا آپ نے فرمایا کہ استعن بیمینک اپنے دائیں ہاتھ سے کام لو۔ یا قیدوا العلم بالکتابۃ یعنی علم کو کتابت کے ذریعے قید کرلو، محفوظ کرلو۔ اس طرح کے مختلف الفاظ آئے ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں لکھنے لگا اور جو کچھ آپ فرماتے تھے میں جس کا سنتا سب کچھ لکھ لیا کرتا تھا۔ اس کے بعد کوئی چیز میں بھولا نہیں۔ جو کچھ میں نے آپ سے سنا وہ میرے حافظے میں بھی محفوظ رہا اور میں نے اس کو لکھا بھی۔ یہ سارا ذخیرہ رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ کے آخری سالوں میں سے تین سالوں کا ہے۔

یہ گویا صحابہ کرامؓ کے زمانے کی ایک مثال ہے کہ علم حدیث کا آغاز ہو گیا تھا۔ یہ سلسلہ تابعین کے زمانے میں اور بھی دراز ہو گیا۔ تبع تابعینؒ کے زمانے میں مزید آگے بڑھا۔ پھر تدوین حدیث کا دور آ گیا۔ علم حدیث کی تدوین پر ایک دن ہم الگ سے گفتگو کریں گے۔ جب یہ سارا ذخیرہ مرتب ہو گیا تو مختلف محدثین نے اس کو مختلف انداز سے ترتیب دیا جس سے نئے مجموعے ہمارے سامنے آئے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ روز بروز احادیث کا کوئی نیا مجموعہ کسی نئے انداز سے سامنے آتا ہے۔

ان سارے مجموعوں میں جو موضوعات بیان ہوئے ہیں، ان کو بڑی بڑی قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ بعض محدثین نے ان کو آٹھ موضوعات میں تقسیم کیا ہے اور یہ ابواب ثمانیہ کہلاتے ہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ اس کی تعداد میں کمی بیشی کی جا سکتی ہے یہ کوئی متعین چیز نہیں۔ محدثین میں سے کئی حضرات نے ان کو آٹھ موضوعات قرار دیا ہے۔ بہرحال احادیث کے بڑے بڑے موضوعات یہ ہیں:

۱) عقائد

۲) احکام

۳) آداب و اخلاق

۴) رقاق یعنی دل میں رقت قلب پیدا کرنے والی احادیث، جن سے تعلق باللہ

خشیت الٰہی پیدا ہو، دلوں کی نرمی پیدا ہو، دلوں میں نرمی پیدا ہو۔ صحیح بخاری اور حدیث کی تقریباً ہر کتاب میں آپ کو اس سے متعلق ابواب ملیں گے۔

۵) تفسیر: حدیث کی تقریباً ہر کتاب میں آپ کو تفسیر کے ابواب ملیں گے۔

۶) تاریخ اور سیر: یعنی انبیا و سابقہ اقوام کا تذکرہ اور واقعات

۷) شمائل: یعنی رسول اللہ ﷺ کی اپنی عادات و خصائل۔ بعض لوگوں نے الگ کتابوں کی شکل میں بھی محفوظ کر دیا ہے۔ شمائل ترمذی مشہور ہے۔ حدیث کی تقریباً ہر کتاب میں شمائل پر ایک باب ہوتا ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کے بارے میں، آپ کے جسمانی وجود اور شخصی محاسن اور کمالات کے بارے میں، آپ کے عادات و خصائل، آپ کے لباس اور آپ کی ذات سے متعلق مختلف چیزوں کے بارے میں شمائل کے ابواب میں تفصیلات درج ہیں۔

۸) فتن: یعنی آئندہ جو فتنے آنے والے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کو فتنوں سے آگاہ کیا تھا اور متنبہ کیا تھا کہ یہ راستے خطرے کے راستے ہیں ان سے بچا جائے۔ ان راستوں پر چلنے سے جن خرابیوں کے پیدا ہونے کا امکان تھا ان کی آپ نے نشاندہی فرمائی۔

۹) مناقب اور مثالب: یعنی صحابہ کرام کے مناقب اور فضائل، حضور کے جو دشمن تھے ان کے مثالب اور ان کی کمزوریوں کی آپ نے نشاندہی فرمائی۔ اسی طرح سے آپ نے بعض قبائل کے مناقب بیان فرمائے۔ انصار اور قریش کے فضائل بیان فرمائے۔ مختلف اقوام کی کمزوریوں کی آپ نے نشاندہی فرمائی۔ بعض اقوام میں کوئی کمزوری ہے تو اس کی نشاندہی فرمائی تاکہ لوگ ان کی خوبیوں سے فائدہ اٹھائیں اور خرابیوں سے بچیں۔

۱۰) اشراط الساعۃ: یعنی قیامت کی علامات۔ شرط علامت کو بھی کہتے ہیں۔ اگر اس کو شرط یعنی Condition کے معنوں میں لیا جائے تو یہ بھی ٹھیک ہے۔ عربی زبان میں شرط علامت کو بھی کہتے ہیں۔

بعض لوگوں نے اس کو ابواب ثمانیہ یعنی آٹھ ابواب میں تقسیم کیا ہے وہ یہ ابواب بیان کرتے ہیں۔

۱) عقائد

۲) احکام

۳) آداب اور شمائل

۴) رقاق

۵) تفسیر

۶) فضائل

۷) فتن اور اشراط الساعۃ

۸) سیر

یہ آٹھ ابواب محدثین کرام نے بیان کئے ہیں۔ یہ ابواب آٹھ ہوں، دس ہوں یا بارہ بھی ہوں، لیکن تقریباً یہی عنوانات ہیں جن میں علم حدیث کی کتابیں مرتب ہیں۔

کتب حدیث کی اقسام

علم حدیث کی کتابوں کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ آپ نے سنا ہوگا کہ امام بخاری کی کتاب صحیح بخاری کہلاتی ہے۔ امام مسلم کی کتاب صحیح مسلم، ابوداؤد کی کتاب سنن ابوداؤد، امام احمد کی مسند امام احمد اور امام طبرانی کی کتاب معجم طبرانی کہلاتی ہے۔ مسند، صحیح، جامع، سنن اور معجم وغیرہ میں فرق کیا ہے؟ کل کی گفتگو کا آغاز اس سے کریں گے کہ کتب حدیث کی ترتیب کیا ہے۔ علم حدیث کی وہ کتاب جس میں ان تمام موضوعات پر احادیث بیان کی گئی ہوں اور ان سب موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہو وہ کتاب الجامع کہلاتی ہے۔ الجامع وہ کتاب ہے جس میں ان آٹھ یا دس موضوعات کے بارے میں احادیث بیان کی گئی ہوں۔ صحیح بخاری، صحیح مسلم اور ترمذی جامع ہیں۔ ان کتابوں میں آٹھ کے آٹھ ابواب آگئے ہیں۔

بقیہ کتابوں کی ترتیب اور اسباب پر کل گفتگو ہوگی۔

یہ علم حدیث کا ایک ابتدائی تعارف تھا۔ کل علم حدیث کی ضرورت اور اہمیت پر بات کریں گے۔ علم حدیث کی ضرورت و اہمیت ایک عام طالب علم کے لئے، پھر دینیات اور دینیات کے طالب علم کے لئے اور پھر قرآن مجید اور اسلامی علوم کے طلبہ کے لئے علم حدیث کی کیا اہمیت ہے۔ علم حدیث کی عظمت کے بارے میں چند اشارے کل کی گفتگو میں ہوگا۔

لوگوں کی غلط فہمی کو کس طرح دور کیا جائے کہ آیا احادیث کی حفاظت ضعیف تھی۔

ان شاء اللہ آگے درس میں دونوں کی گفتگو سے آپ کو اس سوال کے جواب میں تمام مواد مل جائے گا اور پھر آپ کے لئے لوگوں کو یہ بتانا آسان ہو جائے گا کہ یہ غلط فہمی کیوں پیدا ہوئی اور اس کی بنیاد کیا ہے۔

جو لوگ حدیث اور سنت میں فرق کرتے ہیں وہ دونوں کی واضح تعریف بتاتے ہیں؟

جو لوگ حدیث اور سنت میں فرق کرتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ حدیث سے مراد تو وہ روایت ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کے کسی قول، فعل یا حالت کی نشاندہی ہو۔ مثال کے طور پر صحیح بخاری کی پہلی حدیث ہے انما الاعمال بالنیات۔ یہ رسول اللہ ﷺ کا ایک ارشاد گرامی ہے۔ لیکن سنت سے مراد وہ طریقہ ہے جس کی آپ نے لوگوں کو تعلیم دی ہو اور جس کو آپ نے لوگوں کو سمجھایا ہو۔ مثال کے طور پر رسول اللہ ﷺ نے یہ سکھایا کہ جب رمضان کا مہینہ آتا ہے تو کیا طرز عمل اختیار کیا جاتا ہے۔ جب مسلمان پانچ وقت کی نماز ادا کرتے ہیں تو کیا کرتے ہیں۔ یہ جو مجموعی طور پر نماز کی ادائیگی کا حکم ہے یہ سنت ہے اور اس حکم کی تشریح اور توضیح کے لئے اگر کوئی انفرادی روایت آئی ہے تو وہ حدیث ہے۔ گویا حدیث تو وہ روایت یا بیان ہے اور اس کے نتیجے میں جو طرز عمل سامنے آیا ہے وہ سنت ہے۔ یہ ان لوگوں کی رائے ہے جو حدیث اور سنت کو الگ الگ قرار دیتے ہیں۔

میرے ذاتی خیال میں وہ رائے زیادہ درست ہے لیکن یہ محض لفظی بحث ہے۔ مجھے اپنی رائے پر زیادہ اصرار نہیں لیکن میرے خیال میں وہ رائے زیادہ درست ہے جس کے مطابق حدیث ایک عام لفظ ہے۔ اس میں سنت سمیت وہ ساری چیزیں شامل ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی ذات سے منسوب ہوں۔ ان میں وہ چیز بھی شامل ہے جو ثابت شدہ ہے، جس کے بارے میں تمام امت کا اتفاق ہے کہ حضور سے اس کا انتساب درست ہے، جس کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں اور جس سے امت کے طرز عمل کی تشکیل ہوئی ہے وہ سنت ہے۔ جبکہ حدیث میں کچھ چیزیں ایسی بھی شامل سمجھی جاتی ہیں جو سنت میں شامل نہیں ہیں مثلاً ضعیف احادیث۔ محدثین نے کہا کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ حضور سے اس کی نسبت کمزور ہے۔ حدیث تو یہ بھی ہے۔ چونکہ اسے حدیث کہا گیا ہے۔ اگرچہ ضعیف ہونے کی وجہ سے وہ سنت میں شامل نہیں

علم حدیث کی ضرورت اور اہمیت

علم حدیث کی ضرورت اور اہمیت پر گفتگو دو عنوانات کے تحت ہو سکتی ہے۔ ایک عنوان جس پر آج گفتگو کرنا مقصود ہے وہ علم حدیث کی عمومی ضرورت اور اسلامی علوم وفنون میں بالخصوص اور انسانی فکر کے دائرے میں بالعموم اس کی اہمیت کا مسئلہ ہے۔ دوسرا پہلو بطور ایک ماخذ قانون اور مصدر شریعت کے حدیث اور سنت کی اہمیت اور مقام ومرتبہ کا ہے۔ ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآن مجید اور سنت رسول مسلمانوں کے لئے شریعت اور قانون سازی کا اولین اور ابتدائی ماخذ ہے۔ سنت قرآن مجید کے ساتھ شریعت کا ماخذ کس طرح ہے؟ کن معاملات میں یہ ماخذ اور مصدر ہے؟ اس سے احکام کا استنباط کس طرح ہوتا ہے؟ اس پر قدرے تفصیل کے ساتھ کل گفتگو ہوگی۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے محدثین کرام کی غالب اکثریت کے نزدیک حدیث کی اصطلاح عام ہے اور سنت کی اصطلاح خاص ہے۔ سنت سے مراد وہ طریقہ یا وہ انداز اور ڈھنگ ہے جس پر کوئی انسان زندگی گزارتا ہے یا جس کے مطابق کوئی کام کرتا ہے۔ اچھے ڈھنگ کو بھی سنت کہا جاتا ہے اور برے ڈھنگ کو بھی سنت کہا جاتا ہے۔ عربی زبان میں سنت کا لفظ دونوں قسم کے انداز اور ڈھنگ کے لئے استعمال ہوا ہے۔

خود حدیث پاک میں بھی یہ لفظ اپنے لغوی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک مشہور حدیث آپ نے پڑھی ہوگی: من سن فی الاسلام سنۃ حسنۃ، جس نے اسلام میں کوئی اچھی سنت پیدا کی، یعنی اچھا ڈھنگ اختیار کیا، کوئی اچھی ریت ڈالی یا اچھا طور طریقہ نکالا تو اس کو اس کا اجر ملے گا اور جو لوگ آئندہ اس پر عمل کریں گے ان کا اجر بھی اس کو ملتا رہے گا۔ لیکن ان کا اجر کم نہیں ہوگا۔ یہاں سنت کا لفظ اچھے طریقے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اسی حدیث کا دوسرا جملہ

سنت کی اقسام

سنت کی تین قسمیں ہیں۔ یعنی سنت ہم تک تین طریقوں سے پہنچی ہے۔ ایک طریقہ ہے رسول اللہ ﷺ کے زبانی ارشادات گرامی کا جو صحابہ کرام نے آپ سے سن کر یاد کئے اور ہم تک پہنچائے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے: "انما الاعمال بالنیات، وانما لکل امرئ ما نوی، فمن کانت ہجرتہ الی اللہ ورسولہ فہجرتہ الی اللہ ورسولہ ومن کانت ہجرتہ الی دنیا یصیبہا او امرأۃ یتزوجہا فہجرتہ الی ما ہاجر الیہ" یہ ایک مثال ہے سنت قولی کی۔ کہ آپ کی زبان مبارک سے ایک قول نکلا، صحابہ نے اسی طرح یاد کر کے دوسروں تک پہنچایا۔ دوسروں نے اس کو یاد کر کے آگے منتقل کیا اور یوں یہ ارشاد گرامی ہم تک پہنچ گیا۔ یہ سنت قولی یا حدیث قولی ہے۔

سنت فعلی

سنت کی ایک قسم ہے سنت فعلی۔ یعنی صحابہ کرام نے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ یہ کیا کرتے تھے یا فلاں موقع پر آپ نے یہ کیا۔ سنت قولی وہ ہے جو رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلنے والے الفاظ پر مشتمل ہو اور صحابہ کرام نے اسے بعینہ نقل کیا ہو۔ سنت فعلی یہ ہے کہ ایک صحابیؓ نے حضورؐ کو کچھ کرتے ہوئے دیکھا اور اپنی زبان میں اپنے الفاظ میں بعد والوں کے لئے بیان کیا۔ یہ سنت فعلی ہے۔

سنت تقریری

سنت کی تیسری قسم سنت تقریری ہے۔ جس میں نہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی بیان ہوا ہے، نہ رسول اللہ ﷺ کا اپنا کوئی فعل یا عمل نقل ہوا ہے۔ بلکہ دوسروں کا کوئی فعل یا عمل حضورؐ کے سامنے ہوا اور آپؐ نے اس کی ممانعت نہیں فرمائی اور اس کو جاری رکھنے کی اجازت دی۔ یہ بھی سنت ہے۔ اس طرح کی سنت سے بہت سے معاملات حدیث میں ثابت ہوتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ جب تشریف لائے تو عربوں میں بہت سے طور طریقے رائج تھے۔ بہت سے معاملات تھے جو عرب لوگ کیا کرتے تھے۔ ان معاملات اور طور طریقوں میں جس چیز کو رسول اللہ ﷺ نے شریعت کے خلاف

افضل ہے۔ جن صاحب نے وضو کر کے نماز دہرائی۔ آپ نے پہلے صاحب کو جواب دیا
أصبت السنة تم نے سنت کے مطابق عمل اختیار کیا، دوبارہ نماز نہیں دہرائی۔ دوسرے صاحب
سے فرمایا کہ لك الأجر مرتين تمہیں دوہرا اجر ملے گا۔ گویا آپ نے دونوں حضرات کے اس
تفقہ و اجتہاد کو پسند فرمایا اور جائز قرار دیا۔ اس لئے اب یہ سنت ہوگئی۔ سنت سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ
جس شخص کو پانی دستیاب نہ ہو اور وہ وضو کے بجائے تیمم کر کے نماز پڑھ لے تو یہ کافی ہے۔ دوبارہ
پانی ملنے کے بعد دوبارہ نماز ضروری نہیں۔ لیکن اگر کوئی دہرا لے تو اس کو دوہرا اجر ملے گا۔ اسی طرح
کے اور بھی بہت سے واقعات ہمیں مل سکتے ہیں۔ حدیث میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ
سنت تقریری سے کوئی چیز کیسے ثابت ہوتی ہے؟ ان مثالوں سے اس کا اندازہ ہوجائے گا۔

قرآن میں سنت کی سند

اس دور میں بعض حضرات کو یہ خیال ہے جو کہ بہت بڑی گمراہی ہے اور اسلام کے بنیادی
تصور کے خلاف ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں اور دوسروں کو بھی یہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ جو چیز
سنت کی صورت میں مسلمانوں کے پاس اس وقت موجود ہے اس کی کوئی سند یا کوئی اعتبار قرآن
پاک میں موجود نہیں ہے۔ یہ نہ صرف ایک بہت بڑی گمراہی ہے بلکہ ایک بہت بڑی غفلت سے
تعلق رکھنے والی بات بھی ہے۔ اگر صرف قرآن مجید یا کوئی تحریری دستاویز انسانوں کی ہدایت کے لئے کافی
ہوتا تو اللہ تعالیٰ کو انبیاء بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔ آسمانی کتابیں اتاری جاتیں اور اسی پر اکتفا
کیا جاتا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوا۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء بھیجے گئے جن میں سے
چند پر کتابیں بھی نازل کی گئیں۔ کتابوں کی تعداد چند ہے، یہ واضح نہیں ہے۔ ایک روایت میں ایک
سو چار (۱۰۴) کتابوں کی تعداد بیان ہوئی ہے۔ ایک دوسری روایت سے تین سو چودہ (۳۱۴)
کتابوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن انبیاء کرام کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار کے قریب ہے۔
گویا اصل چیز نبی اور پیغمبر ہے۔ کتاب کا اتارا جانا یا نہ اتارا جانا اللہ کی مشیت پر ہے۔ جب
مناسب سمجھا اس نے کتاب نازل فرمادی اور جب مناسب نہیں سمجھا کتاب نازل نہیں فرمائی۔ اس
لئے نبی اور پیغمبر کا وجود اور ان کی رہنمائی کو کتاب سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بات خود کتاب اللہ
یعنی اللہ کی کتاب قرآن مجید میں دونوں مقامات پر جو آیات موجود ہیں ان میں حکم کا تذکرہ

آئندہ کیا جا رہا ہے۔ جس میں پیغمبر کی سنت اور اس کی تفسیر و تشریح کو قرآن مجید کے سمجھنے اور اس پر عمل درآمد کے لیے لازمی قرار دیا گیا ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "الا انی اوتیت القرآن ومثلہ معہ" یاد رکھو مجھے قرآن مجید بھی دیا گیا اور اس کے ساتھ اتنا ہی اور بھی بہت کچھ دیا گیا ہے۔ قرآن سے ملتی جلتی اور بھی بہت سی ہدایات اور رہنمائی عطا فرمائی گئی ہے۔ لہٰذا یہ دونوں قسم کی رہنمائی جس کی مزید تفصیل ہم آگے چل کر دیکھیں گے، اللہ کی طرف سے رسول علیہ الصلوۃ والسلام کو عطا ہوئی۔

ایک روایت میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر نزول وحی کم و بیش چوبیس ہزار مرتبہ ہوا۔ بظاہر یہ چوبیس ہزار مرتبہ وحی نازل ہوئی ہو اور قرآن پاک کی ایک ایک آیت ایک مرتبہ بھی نازل ہو، اگرچہ بعض مرتبہ لمبی لمبی سورتیں ایک ہی مرتبہ کی وحی میں نازل ہوئیں، سورۃ انعام پوری ایک ہی وقت میں نازل ہوئی۔ سورۃ یوسف پوری ایک وقت میں نازل ہوئی۔ بعض سورتیں اکثر چھوٹی چھوٹی ایک ایک وقت میں نازل ہوئیں تو اس سے زیادہ سے زیادہ چار پانچ ہزار مرتبہ کر کے پورا قرآن مجید نازل ہو سکتا تھا۔ یہ چوبیس ہزار مرتبہ وحی نازل ہونے کا کیا مفہوم ہے؟

امام ابوداؤد نے اپنی کتاب سنن میں روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر جبریل امین قرآن لے کر بھی اترتے تھے اور سنت لے کر بھی نازل ہوتے تھے۔ کان ینزل جبریل علیہ الصلوۃ والسلام علی رسول اللہ ﷺ بالسنۃ کما ینزل علیہ بالقرآن۔ جبریل امین سنت لے کر بھی اسی طرح اترتے تھے جس طرح کہ قرآن مجید لے کر اترتے تھے۔ ویعلمہ ایاہ کما یعلمہ القرآن۔ اور جیسے آپ کو قرآن سکھایا کرتے تھے اسی طرح سنت بھی سکھایا کرتے تھے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ چوبیس ہزار مرتبہ جو نزول وحی ہوا اس میں قرآن پاک کے ساتھ ساتھ سنت کا نزول بھی شامل ہے۔ اور جبریل امین نے سنت کے بیشتر احکام بھی رسول اللہ ﷺ کو سکھائے۔

اس لئے علم حدیث جو سنت کا سب سے اہم، بلکہ سب سے بڑا مصدر ہے اس کی اہمیت اس لئے بھی بڑھ جاتی ہے اور اس کی ضرورت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ علم سنت کو بیان کرتا ہے۔ سنت کی تفصیلات علم حدیث کے ذریعے ہم تک پہنچتی ہیں۔ سنت کا تحفظ اور اس کی پیروی کی ہر کاوش مسلمانوں کے لئے اسی طرح لازمی ہے اور بہت اونچی فضیلت رکھتی ہے جس طرح

قرآن مجید کا تحفظ اور اس کی بقا کی کاوش ہے۔ قرآن مجید کی حفاظت کا تو اللہ نے وعدہ کیا ہے انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون۔ لیکن اس وعدے کی جزوی تطبیق سنت پر بھی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ یہاں ذکر کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ذکر میں قرآن مجید شامل ہے۔ لیکن ذکر یعنی یاددہانی اسی وقت یاددہانی ہو سکتی ہے جب اس کا مفہوم سامنے ہو۔ اگر کوئی یاددہانی ہو لیکن اس کا مفہوم کسی کی سمجھ میں نہ آئے۔ مثلاً کوئی شخص آپ کو کسی ایسی زبان میں یاددہانی کا خط بھیج دے، جیسے سریانی یا روسی یا لیتھن زبان میں آپ کو خط لکھے اور آپ کو وہ زبان نہ آتی ہو تو یاددہانی بے معنی ہے۔ یاددہانی اسی وقت بامعنی ہوگی جب آپ کی سمجھ میں آئے۔ اس لئے اگر قرآن مجید کی تشریح اور توضیح موجود نہیں ہے تو یاددہانی اور اس کے اثرات محدود ہو جاتے ہیں۔ اس لئے یاددہانی کو برقرار رکھنے کے لئے جہاں اس کے متن کا تحفظ ضروری ہے وہاں اس کی تشریح و تعبیر کا تحفظ بھی ضروری ہے۔ اور وہ تشریح و تعبیر کا تحفظ سنت کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے امت مسلمہ کو تلقین فرمائی کہ سنت کے تحفظ اور بقا کے لئے بھی اسی طرح کوشش کریں جیسے قرآن پاک کے تحفظ اور بقا کے لئے کرتے ہیں۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا: المتمسک بسنتی عند فساد امتی لہ اجر شہید، کہ وہ شخص جو میری سنت کا دامن پکڑے ہوئے ہے، اس وقت جب میری امت فساد کا شکار ہو تو اس کے لئے شہید کا اجر ہے۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ لہ اجر مائۃ شہید، یعنی اس کو سو شہیدوں کا اجر ملے گا۔ سو شہیدوں کا اجر اس لئے ملے گا کہ ایک شہید جس مقصد کے لئے جان قربان کرتا ہے وہ کیا ہے؟ وہ اسلام کی بقا اور اسلام کا تحفظ ہے، امت مسلمہ کا تحفظ ہے۔ اگر خدانخواستہ سنت مٹ رہی ہو، حدیث ختم ہو رہی ہو تو پھر امت مسلمہ کا وجود دینی بنیادوں پر باقی نہیں رہ سکے گا۔ تو جن مقاصد کی خاطر شہید اپنی جان قربان کرتا ہے سنت کا تحفظ کرنے والا انہی مقاصد کو دوسرے انداز سے حاصل کرتا ہے۔ اس لئے اس کو ایک شہید یا سو شہیدوں کا اجر ملے گا۔ مختلف اسباب اور نیتوں کے لحاظ سے دونوں اپنے اپنے اجر کے مستحق ہوں گے۔

امام شافعی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ علماء حدیث اور علماء سنت کی اپنے اپنے علاقے اور زمانے میں وہی حیثیت ہے جو صحابہ کرام اور تابعین کی اپنے دور میں تھی۔ صحابہ کرام اور تابعین کو ان کے دور میں عزت و احترام کا مقام کیوں حاصل تھا؟ اس لئے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی دی

ہوئی رہنمائی لوگوں تک پہنچا رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات ان کے ذریعے لوگوں تک پہنچ رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی سنت کا علم ان کے ذریعے منتقل ہو رہا تھا۔ لہٰذا آج اگر ایک صاحب علم جو حدیث اور سنت کا ماہر ہے اور اس کے ذریعے علم لوگوں تک پہنچ رہا ہے تو گویا وہ وہی کردار ادا کر رہا ہے جو صحابہ کرامؓ اور تابعین اپنے زمانے میں ادا کیا کرتے تھے۔ اسی لئے امام شافعی نے ایک جگہ فرمایا ہے کہ اہل الحدیث فی کل زمان کالصحابۃ فی زمانہم کہ علمائے حدیث کی ہر زمانے میں وہی حیثیت ہوگی جو صحابہ کرام کی اپنے زمانے میں تھی۔ ایک جگہ انہوں نے فرمایا کہ اذا رأیت صاحب حدیث فکأنی رأیت احدا من اصحاب رسول اللہ ﷺ کہ اگر میں حدیث کے کسی عالم کو حدیث بیان کرتے ہوئے دیکھوں، اور خود امام شافعی ان میں شامل تھے، تو گویا میں نے رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابی کو دیکھا جو علم حدیث بیان کر رہے تھے۔

یہ حدیث اور سنت کی دینی اور اساسی اہمیت اور ضرورت ہے۔ اس پر ایک دوسرے نقطہ نظر سے بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ وحی الٰہی جو قرآن پاک کی شکل میں ہمارے پاس ہے، اس میں بنیادی ہدایات اور کلیات بیان ہوئی ہیں جن میں سے بعض کا ذکر ہم ابھی کریں گے، لیکن ان ہدایات کا جو کتاب الٰہی میں بیان ہوئی ہیں جب تک مکمل تفصیل نہ ہو اس وقت تک ان ہدایات پر عمل ہونا بڑا دشوار ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ حدیث اور سنت کی رہنمائی کے بغیر ان ہدایات پر عمل درآمد ممکن نہیں ہے تو شاید غلط نہیں ہوگا۔

حدیث کے مقابلے میں دیگر مذاہب کے صحائف کی حیثیت

سابقہ آسمانی کتابوں کو دیکھیں۔ آج حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ناپید ہے۔ ان پر اتارے جانے والے صحیفے ناپید ہو گئے۔ ان کے ارشادات ہمارے علم میں نہیں ہیں۔ ان کی سنت کے بہت معمولی اور بکھرے آثار ہیں جو اس لئے محفوظ ہو گئے کہ رسول اللہ ﷺ کی شریعت میں وہ شامل ہو گئے، عرب میں ان کا رواج تھا اور رسول اللہ ﷺ نے اللہ کے حکم سے ان کو شریعت کا حصہ بنا دیا۔ اسی لئے وہ آج محفوظ ہیں ورنہ وہ آثار بھی محفوظ نہ رہتے۔

حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ماننے والے آج کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ ان کی ایک ریاست بھی موجود ہے جس کے پاس بڑے بڑے وسائل ہیں۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ

اس نے ترجمہ کر کے چھوڑ دیا۔ وہ ترجمہ دو ڈھائی سو سال بعد کسی سے دریافت ہوا اور اس غیر مستند ترجمہ کے یہ سارے ترجمے ہیں جو آج عہد نامہ جدید کی چار کتابوں کی صورت میں موجود ہیں۔ یہ اناجیل اربعہ کی تاریخی حیثیت ہے۔

اس کے مقابلہ میں آپ دیکھیں سنت رسول اللہ ﷺ کو، جس کی تفصیل میں آگے چل کر مزید بیان کروں گا۔ مگر آج میں آپ سے یہ بیان کروں کہ یہ حدیث مبارک جو ابھی میں نے پڑھی یعنی انما الاعمال بالنیات وانما لکل امرئ مانوی میں آپ سے بیان کر سکتا ہوں کہ مجھ سے یہ حدیث کس نے بیان کی۔ اس سے کس نے بیان کی اور میں رسول اللہ ﷺ تک پوری سند آپ کو سنا سکتا ہوں۔ اور ان شاء اللہ آخری دن میں تبرک کے طور پر بیان بھی کروں گا۔ پوری سند میں آپ کے سامنے بیان کر دوں گا کہ صحاح ستہ کی احادیث میں کس روایت سے بیان کرتا ہوں۔ مسلمانوں کے علاوہ دنیا میں کسی اور کے پاس ایسی کوئی چیز موجود نہیں۔ دنیا کے لئے یہ بات ناقابل تصور ہے کہ ایسی کوئی چیز بھی ہو سکتی ہے؟ حضرت عیسیٰؑ تو بہت پہلے تھے۔ آج سے سو دو سو سال پہلے کے کسی آدمی کا بیان اس سند کے ساتھ موجود نہیں کہ سند میں شامل ہر آدمی ایک تاریخی وجود رکھتا ہو اور آپ کو اختیار ہو کہ ہر ایک کے بارے میں پوچھیں کہ یہ آدمی کون تھا؟ اور میری ذمہ داری ہو کہ میں تاریخ سے ثابت کروں کہ یہ فلاں صاحب تھے، فلاں جگہ پیدا ہوئے تھے، یہ ان کا نام تھا اور یہ ان کا کارنامہ ہے۔ یہ چیز دنیا میں کسی کے پاس نہیں ہے۔ یہ صرف مسلمانوں کے پاس ہے۔

کتاب الٰہی اور ارشادات انبیا میں بنیادی فرق

اب وحی الٰہی کی طرف آتے ہیں۔ وحی الٰہی کا ایک خاص اسلوب ہے۔ قرآن مجید میں بھی یہی اسلوب ہے۔ تورات میں بھی یہ اسلوب ملتا ہے، جو حصے تورات کے مستند باقی رہ گئے۔ اور جس حد تک انجیل میں استناد پایا جاتا ہے۔ انجیل میں بھی یہ بات موجود ہے کہ انبیا علیہم السلام اپنی باتوں کو عمومی انداز میں بیان فرماتے تھے۔ کتاب الٰہی کے عمومی اصول ہوتے تھے۔ کتاب الٰہی میں عملی تفصیلات اور روزمرہ کے احکام نہیں ہوتے۔ اگر ایسا ہوتے تو کتاب الٰہی کی کم از کم سو جلدیں ہوتیں۔ قرآن مجید کی سو جلدیں ہوتیں اگر یہ سب یعنی قرآن مجید میں لکھا جاتا کہ نماز میں ہاتھ

ایک مثال میں عرض کرتا ہوں۔ قرآن پاک میں ہے: اقیموا الصلوۃ۔ درجنوں نہیں سینکڑوں جگہ آیا ہے کہ نماز قائم کرو، لیکن کہیں بھی نماز کی تفصیل بیان نہیں کی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے نماز کے احکام اور طریقہ کار کو بیان فرمایا اور آپ اس تفصیل میں نہیں گئے کہ یہ فرض ہے، اور یہ واجب ہے۔ آپ نے صرف اتنا کہنے پر اکتفا فرمایا کہ صلوا کما رأیتمونی اصلی، جس طرح مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو اسی طرح نماز پڑھنی شروع کردو۔ صحابہ نے اسی طرح نماز پڑھنی شروع کردی۔ صحابہ نے آگے تابعین کو سکھایا، تابعین نے تبع تابعین کو سکھایا اور ہر دور میں فقہائے اسلام اور محدثین اور مفسرین قرآن نماز کے احکام کی تفصیلات بیان کرتے رہے۔ آج مسلمان اربوں کی تعداد میں نماز ادا کر رہے ہیں۔ کروڑوں کی تعداد میں مسلمان باقاعدہ نماز پڑھتے ہیں۔ اگر آپ کو یہ جاننے کا شوق ہو کہ کس دور میں مسلمان نماز کس طرح پڑھتے تھے تو اس دور کی کوئی کتاب، فقہ کی، حدیث کی یا تفسیر کی دیکھ لیں۔ معلوم ہو جائے گا کہ مسلمان بارہویں صدی ہجری میں ایسے کرتے تھے۔ ساتویں صدی ہجری میں ایسے کرتے تھے۔ نویں صدی ہجری میں ایسے کرتے تھے۔ اگرچہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ آج جس طرح کر رہے ہیں یہ تواتر سے ثابت ہے۔ لیکن مزید چیک کرنا چاہیں تو یہ سارا ذخیرہ موجود ہے اس کو چیک کیا جا سکتا ہے۔ یہ تیسرا تعامل ہے جو قرآن مجید کے تسلسل کے لئے ضروری ہے۔

۵۔ پھر جس ماحول اور جس سیاق وسباق میں قرآن مجید نازل کیا گیا اس ماحول اور سیاق وسباق کی پوری تفصیل موجود ہے اور یہ حدیث کی صورت میں ہمارے سامنے آئی ہے۔ سیرت اور حدیث کے ذخائر میں وہ پورا ماحول، اس کی منظر کشی اور نقشہ کشی کر کے ہمارے سامنے رکھ دی گئی جس میں قرآن مجید نازل ہوا۔ جب حدیث کا ایک طالب علم حدیث کی کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے، سیرت کا طالب علم سیرت کی تفصیلات پڑھتا ہے تو اس کے سامنے چشم تصور میں وہ سارا منظر متشکل ہو کر آجاتا ہے جس منظر میں قرآن پاک نازل ہوا، جس پس منظر اور پیش منظر میں قرآن پاک کے احکام و ہدایات پر عمل درآمد شروع ہوا اور کئی چیزیں جن کا بظاہر قرآن پاک یا حدیث پاک کے سمجھنے سے کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا وہ تفصیلات بھی صحابہ کرام نے بیان کر دیں اور ان کو محفوظ رکھا گیا۔

حدیث کی اقسام پر آگے چل کر بات ہوگی، لیکن ابھی ضمناً ایک بات عرض

انسان کی شخصیت کی تفصیلات کو محفوظ رکھنے کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔

یہ انسان کے حاشیۂ خیال میں وہ امکانات اور تفصیلات بھی نہ تھیں جو سیرت کے واقعات کو محفوظ رکھنے کے لئے کی گئیں۔ زیادہ تفصیلات بیان کرنے کا موقع نہیں لیکن ایک چھوٹی سی مثال عرض کرتا ہوں۔

عربوں کے دل میں اللہ تعالیٰ نے یہ ذوق اور بظاہر ہمارے خیال میں اسی لئے ڈالا کہ سیرت کے واقعات محفوظ رکھنے تھے، کہ اپنے قبائل اور برادریوں کے نسب کو محفوظ رکھیں۔ علم الانساب ان کے ہاں ایک باقاعدہ فن تھا۔ اس پر درجنوں کتابیں آج بھی موجود ہیں۔ علم الانساب کے نام سے ان موضوعات پر کتابیں لکھی گئیں کہ عرب قبائل کا نسب کیا تھا؟ کون کس کا بیٹا تھا، کس کا پوتا تھا، کس کا دادا تھا، کس کی شادی کہاں ہوئی، کس کی کتنی اولادیں تھیں، کس قبیلے کی آپس میں کیا رشتہ داریاں تھیں۔ ان موضوعات پر درجنوں کتابیں آج بھی دستیاب ہیں جو لوگوں نے وقتاً فوقتاً لکھیں۔

اب کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ عربوں کو ان موضوعات سے دلچسپی تھی، اس لئے ان کو ان چیزوں پر معلومات جمع کرنے کا شوق تھا، اس لئے انہوں نے انساب پر کتابیں لکھ دیں۔ بہت سے لوگ اپنے شوق کے لئے کتابیں لکھ دیتے ہیں، اس لئے ان لوگوں نے بھی لکھ دیں۔ لیکن محض یہ کہنا کافی نہیں ہے۔ جب ہم انساب کی ان کتابوں کا جائزہ لیتے ہیں اور ان کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایک عجیب و غریب بات سامنے آتی ہے، بہت عجیب و غریب۔ اتنی عجیب و غریب کہ اس کو محض اتفاق نہیں کہا جا سکتا۔ وہ عجیب و غریب بات یہ سامنے آتی ہے کہ جتنی معلومات محفوظ ہوئیں وہ مرکوز ہیں رسول اللہ ﷺ کی شخصیت پر، حالانکہ جس وقت سے محفوظ ہونا شروع ہوئیں اس وقت تو حضورؐ پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ چالیس سال تک کسی کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں تھا کہ یہ نبی ہوں گے اور نبوت کا سلسلہ اس طرح چلے گا اور پھر ایک امت قائم ہوگی اور اس امت میں علوم وفنون کے بہت سے سلسلوں میں سے ایک سلسلہ یہ چلے گا کہ انساب کے بارے میں یہ معلومات جمع کی جائیں گی۔ یہ تو کبھی کسی کے تصور میں بھی نہیں آیا تھا۔ لیکن عربوں نے اپنے عہد پر جو معلومات جمع کیں اور جو بعد میں کتابی شکل میں مدون ہوئیں اور آج جس طرح ہم تک پہنچیں، وہ سب رسول اللہ ﷺ کی شخصیت مبارکہ پر مرکوز ہیں۔ جس طرح ایک سرچ لائٹ ہوتی ہے۔ آپ پانچ ہزار واٹ کے ایک بلب سے روشنی کسی ایک نقطہ پر ڈالیں تو جس طرح سے وہ نقطہ چمکے گا اور

ٹھیک ایک ایک گوشہ اس کا روشن ہو جائے گا اسی طرح سے رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارک کا ایک ایک گوشہ محفوظ ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے لے کر آپ کے پیشتر یں چالیسویں جد امجد عدنان تک اہم اور بنیادی امور سے متعلق ہر ایک چیز محفوظ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی دادیاں کون تھیں، نانیاں کون تھیں، پھوپھیاں کون تھیں۔ یہ سب معلومات علم انساب کی کتابوں میں ملیں گی۔ مثال کے طور پر میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ کی دادی کا نام کیا تھا تو شاید آپ بتا دیں۔ آپ میں سے اکثر بتا دیں گے۔ اگر میں یہ پوچھوں کہ دادی کی دادی کا کیا نام تھا تو شاید آپ میں سے دس فیصد بتا سکیں اور اگر میں پوچھوں کہ دادی کی دادی کی دادی کا کیا نام تھا تو شاید ہم میں سے کوئی بھی نہ بتا سکے۔ کم از کم میں تو نہیں بتا سکتا۔ اسی طرح میری یا آپ کی نانی کا کیا نام تھا، سب بتا دیں گے۔ نانی کی نانی کا نام شاید دو چار بتا سکیں۔ نانی کی نانی کی نانی کا کیا نام تھا شاید کوئی بھی نہیں بتا سکتا۔

رسول اللہ ﷺ کے بارے میں یہ عجیب و غریب بات ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اجداد، آپ کی دادیاں، آپ کی نانیاں، آپ کے نانا اور آگے آپ کی پھوپھیاں اور آگے آپ کے چچا اور آگے ہر ایک کی تفصیلات بیسیوں بیسیوں اور تیس تیس نسلوں تک محفوظ ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی محفوظ نہیں ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ کی محفوظ نہیں ہیں۔ ابوجہل، ابولہب کی محفوظ نہیں ہیں، خالد بن ولیدؓ کی محفوظ نہیں ہیں۔ یہ اسلام سے پہلے عرب کے بڑے بڑے لوگ تھے، انہی کا چرچا تھا۔ ان میں سے کسی کے بارے میں اس طرح کی معلومات محفوظ نہیں رہیں۔ جو محفوظ رہ گئیں وہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں محفوظ رہ گئیں۔

اس لئے میں یہ سمجھتا ہوں۔ اور میرا خیال ہے کہ میں حق بجانب ہوں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص مشیت سے عربوں کے دل میں یہ ڈالا کہ وہ نسب محفوظ رکھیں اور جس نسب کو عربوں نے زیادہ اہتمام کے ساتھ محفوظ رکھا یہ وہ تھا جس کا رشتہ رسول اللہ ﷺ سے بالواسطہ یا بلاواسطہ ملتا تھا۔

سیرت کے واقعات کے محفوظ رکھے جانے کی ایسی ایسی مثالیں ہیں کہ جن کی تفصیلات میں اگر میں جاؤں تو گفتگو موضوع سے آگے نکل جائے گی۔ رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے۔ مسجد نبوی میں ایک ستون سے ٹیک لگا کر خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ آج بھی وہ جگہ محفوظ ہے اس کو اسطوانہ حنانہ کہتے ہیں۔ اس کے بعد جب صحابہ کی تعداد بڑھنے لگی تو کسی نے تجویز پیش کی کہ

کوئی بلند جگہ ہو جس پر قیام فرما کر آپ وہاں سے خطبہ ارشاد فرمایا کریں۔ اس غرض کے لئے ایک صحابی نے منبر تیار کیا جس پر آپ بیٹھ بھی سکیں اور ضرورت ہو تو کھڑے بھی ہو سکیں۔ چنانچہ وہ منبر بنا کر لے آئے۔ اب بظاہر اتنا کافی ہے۔ عام معلومات اور روایات کے لئے اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ تفصیلات کہ یہ منبر کس لکڑی کا تھا، وہ منبر کس نے بنایا تھا، اس کا سائز کیا تھا، اس کا ڈیزائن کیا تھا، وہ لکڑی کس علاقے کی تھی، کس جنگل سے کاٹ کر لائی گئی تھی، کیسے بیٹھ کر اس کو بنایا گیا، ان پر لوگوں نے معلومات جمع کیں اور کتابیں لکھیں۔ سیرت پر جو قدیم ذخیرہ ہے اس میں تقریباً ایسی کتابوں کا تذکرہ ملتا ہے جو منبر کے ڈیزائن اور اس کے بارے میں تیار ہوئیں۔ رسول اللہ ﷺ جو نعلین استعمال فرماتے تھے نعلین مبارک، ان کی شکل کیسی تھی، وہ چمڑے کا ٹکڑا کیسا تھا، کون بناتا تھا، کس سے خریدتے تھے، نعلین مبارک ٹوٹ جاتا تو کس سے مرمت کراتے تھے۔ اس پر کتابیں موجود ہیں اور ایک چھوٹا رسالہ اردو میں بھی دستیاب ہے۔ یہ اس شخصیت سے محبت کا تقاضا ہے جو شخصیت حامل قرآن اور مبلغ قرآن ہے، جس کے ذریعے قرآن ہم تک پہنچا۔

۸۔ وہ علوم جو رسول اللہ ﷺ کی شخصیت سے متعلق ہیں یعنی علم سیرت۔ ارشادات اور سنت اور ان سے متعلق تو سنت اور حدیث ہو گئیں لیکن آپ کی ذات سے متعلق، آپ کی شخصی اور جسمانی حالات اور واقعات سے متعلق ان کی وضاحت کو اگر بیان کیا جائے تو اس کے لئے سیرت اور آپ کی عمر کا ذکر کافی نہیں ہے۔ لوگ جس جس طرح سے تحقیق کرتے آ رہے ہیں، ان کے نتیجے میں جو نئے نئے معاملات اور مسائل سامنے آتے ہیں ان کا صرف ایک ہی سبب معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے تحفظ کے لئے سنت کا تحفظ فرمایا، سنت کے تحفظ کے لئے صاحب سنت کا تحفظ فرمایا، صاحب سنت کی سیرت کے تحفظ کے لئے ہر وہ چیز جو بالواسطہ یا بلاواسطہ اس سے متعلق تھی وہ محفوظ کر دی گئی۔

۹۔ پھر رسول اللہ ﷺ کے براہ راست مخاطبین تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے مخاطبین اور ہمراہیوں یعنی صحابہ کرامؓ کے حالات محفوظ رکھے گئے۔ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ بارہ ہزار صحابہ کرامؓ کے حالات محفوظ اور موجود ہیں۔ اور جو صحابی جتنے قریب تھے ان کے حالات اسی قدر تفصیل اور وضاحت کے ساتھ محفوظ ہیں۔ انسان اپنے دوستوں کے ذریعے پہچانا جاتا ہے۔ یہ

اسلامی علوم سنت کی شرح ہیں۔ در حقیقت سب سے پہلا علم جو پیدا ہوا علم حدیث اور سنت کی تفسیر اور توضیح سے عبارت ہیں۔ اور حدیث اور سنت قرآن پاک کی شرح ہے۔ لہٰذا قرآن پاک، حدیث اور دیگر تمام علوم و فنون میں وہ رشتہ ہے جو درخت میں اس کے تنے، اور شاخوں میں اور پتوں اور پھولوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ سارے علوم و فنون پھل اور پھول اور پتے ہیں، سنت شاخیں اور تنا ہے اور قرآن پاک وہ جڑ ہے جس سے یہ سارے علوم و فنون نکلے ہیں۔

یہاں تفصیلی مثالیں دینے کا موقع نہیں ہے، گفتگو طویل ہو جانے گی، میں چند مثالیں دینے پر اکتفا کرتا ہوں جن سے یہ پتہ چلے گا کہ اسلامی علوم و فنون کا آغاز علم حدیث اور سنت کی بنیاد پر کیسے ہوا؟

مسلمانوں کا ایک بہت بڑا اور اہم فن ہے علم کلام۔ جس کو بعض لوگ انگریزی میں Scholasticism بھی کہتے ہیں اور کسی کا خیال ہے Theology بھی کہہ سکتے ہیں۔ علم کلام سے مراد وہ علم ہے جس میں عقلی دلائل کے ذریعے اسلام کے عقائد کو ثابت کیا جائے اور اسلام کے عقائد پر دوسرے مذاہب اور نظریات کے اعتراضات کا جواب دیا جائے۔ اس کو علم کلام کہتے ہیں۔ اس پر صرف چند کتابیں ہی نہیں بلکہ پوری لائبریریاں اور کتب خانے موجود ہیں۔ لیکن اس علم کا آغاز جن مسائل سے ہوا وہ مسائل سب سے پہلے تفصیل کے ساتھ علم حدیث میں بیان ہوئے۔ جب محدثین نے احادیث کے ان پہلوؤں پر غور شروع کیا جن میں عقائد بیان ہوئے تھے اور جب انہوں نے ان احادیث کی تشریح کرنی چاہی تو ان مباحث کے نتیجے میں علم کلام پیدا ہوا۔

ایک چھوٹی سی مثال عرض کرتا ہوں۔ مسلمان ہونے کے لئے ایمان لانا شرط ہے۔ ایمان اسلام کی لازمی شرط ہے۔ لیکن ایمان کس کو کہتے ہیں؟ اس سے کیا مراد ہے؟ اس کی تعریف کیا ہے؟ کیا محض دل میں یہ خیال ہونا کہ اللہ ایک ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اللہ کے رسول ہیں، یہ کافی ہے؟ یا ایمان کے لئے اس سے زیادہ کچھ ہونا چاہئے؟ پھر اس سے زیادہ اور کیا ہو؟ کیا ایمان میں کمی بیشی ہو سکتی ہے؟ ایک رویہ اس زمانے میں یہ سامنے آیا کہ ایمان میں کمی بیشی ممکن نہیں ہے۔ اس لئے کہ جن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے وہ متعین اور معین ہیں۔ مثال کے طور پر امن الرسول بما انزل الیہ من ربہ والمومنون ۝ کل امن باللہ وملئکتہ وکتبہ ورسلہ لا نفرق بین احد من رسلہ۔ یہ جو ایمان مفصل یا ایمان مجمل ہے، یہ تو متعین ہے۔ اس میں

نقلی اور عقلی علوم جتنے بھی ہیں یہ سارے کا سارا علم حدیث کی دین ہے۔ علم حدیث اور سنت میں جو احکام بیان ہوئے ہیں ان سے اصول فقہ کا علم نکلا ہے۔ اس سے پہلے میں نے عرض کیا تھا کہ مسلمانوں کی عبقریت اور Genius کے دو نمایاں اظہار ہوئے ہیں۔ ایک علم حدیث اور دوسرا علم اصول فقہ۔

علم حدیث اسلامی ذہن اور عبقریت کا نمونہ ہے کہ جس میں معلومات اور اطلاعات کی صحت پرکھنے کا معیار ہے اور اصول فقہ اسلامی ذہن اور عبقریت کا نمونہ ہے جس میں تمام نئے حالات اور نئے نئے تصورات و نظریات کو سامنے رکھ کر معاملات کی بنیاد ہو۔ علم اصول فقہ نے علم کلام سے بھی زیادہ عقل و نقل کے درمیان تطبیق پیدا کی ہے اور عقل اور نقل کے درمیان توازن پیدا کیا ہے۔ یہ توازن و اعتدال اور جامعیت کی مثال دنیا کی کسی قوم کے مذہب یا علمی روایت میں نہیں ملتی۔ اور یہ بات آپ بلا خوف تردید عرض کر سکتے ہیں کہ دنیا کی کسی قوم کے پاس نہ آج ایسا علم ہے، نہ ماضی میں تھا اور نہ ماضی بعید میں کوئی ایسا علم تھا جس کو اصول فقہ کے مقابلہ میں رکھا جا سکے۔ جو بیک وقت خالص دینی علم بھی ہو، اس اعتبار سے اس کی اساس قرآن پاک اور سنت رسول پر ہو، اور بیک وقت اس کی بنیاد خالص عقلی اور تجرباتی معاملات پر بھی ہو، جس کو عقل کے بڑے سے بڑے معیار بھی عقلی بنیادوں پر غلط قرار نہ دے سکے۔ یہ مستحکم بنیادیں اصول فقہ کو علم حدیث سے حاصل ہوئیں۔ اس کی تفصیل میں جانے کا وقت نہیں ہے اس لئے میں صرف اشارہ پر اکتفا کرتا ہوں۔

دنیا میں اسلام سے پہلے بھی تاریخ کا تصور موجود تھا۔ اسلام سے پہلے تاریخ کی کتابیں موجود تھیں۔ یونان کی کتابیں تھیں جن میں قوموں کی تاریخ بیان ہوئی ہے۔ یہ کتابیں چین میں بھی موجود تھیں، ہندوستان میں بھی موجود تھیں اور رومیوں کے ہاں بھی موجود تھیں۔ جو تاریخ اسلام سے پہلے کی مدون ہے، اس کی بنیاد کی جو معلومات آج بھی دستیاب ہیں۔ ان کی Authenticity کتنی ہے، یہ ایک الگ مسئلہ ہے، یہ ایک دوسری بات ہے۔ لیکن اسلام سے پہلے کی تاریخ اور تاریخی معلومات کا ایک ذخیرہ ہمارے سامنے موجود ہے۔ ہندوستان میں بھی اسلام سے پہلے کی کتابیں موجود ہیں جن میں ہندو تاریخی روایت کی معلومات بھی شامل ہیں۔ لیکن وہ چیز جس کو اسلام سے پہلے تاریخ کہا جاتا تھا، وہ کیا تھی؟ آج دنیا کا کوئی مورخ اسلام کے اس احسان و

مانتا ہے یا نہیں مانتا۔ مانتا ہے تو بلاشبہ عدل وانصاف کی بات کرتا ہے اور نہیں مانتا تو یہ احسان فراموش یا کم از کم ناواقف ضرور ہے۔ لیکن تاریخ کا صحیح تصور اور تاریخ کا وہ صحیح شعور جس طریقے سے مسلمانوں کو اور ان سے دنیا کو حاصل ہوا اس کا اولین مصدر و ماخذ علم حدیث ہے۔

اسلام سے پہلے تاریخ کا جو تصور تھا وہ یہ تھا کہ کسی قوم میں جو قصے کہانیاں مشہور ہیں ان کو مدون کر لیا جائے۔ جو رطب ویابس دستیاب ہے اس کو حقیقت مان لیا جائے۔ گویا جب تاریخ لکھنے بیٹھو تو عوام میں رائج قصے جمع کر لو اور وہ سارے کے سارے بیان کر دو اور نقل کر کے جمع کر دو۔ کوئی یہ پوچھنے والا نہیں تھا کہ بیروسوس صاحب! آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ماخذ کیا ہے؟ یہ چیز آپ نے صحیح لکھی ہے یا غلط لکھی ہے؟ کس سے پوچھ کر، کس سے سن کر یا کن ماخذ کی مدد سے لکھی تھی؟ آپ سے کس نے بیان کیا؟ آپ وہاں موقع پر موجود تھے کہ نہیں تھے؟ آپ اس کے چشم دید گواہ تھے کہ نہیں تھے؟ اس وقت نہ یہ سوالات تھے اور نہ ایسا کوئی تصور تاریخ کے بارے میں موجود تھا۔

علم حدیث نے سب سے پہلے لوگوں کو یہ تصور دیا کہ جب کوئی واقعہ بیان کرو تو پہلے خود یہ اطمینان کرو اور پھر دوسروں کو یہ اطمینان دلاؤ کہ تم اس واقعہ کے عینی شاہد ہو۔ اگر عینی شاہد نہیں ہو تو جو عینی شاہد تھا اس کا حوالہ دو کہ مجھ سے فلاں شخص نے بیان کیا جو عینی شاہد تھا۔ پھر اس بات کا یقین دلاؤ کہ تم جس واقعہ کو بیان کر رہے ہو اس کو بیان کرنے میں تمہارا کوئی ذاتی مفاد نہیں ہے؟ اگر اس واقعہ کو بیان کرنے میں تمہارا کوئی ذاتی مفاد ہے تو ہم تمہارے بیان کو قبول کرنے میں تامل کریں گے۔ اس لئے کہ ذاتی مفاد کی بنیاد پر آدمی بہت سی باتوں کو غلط طور پر نمایاں کر سکتا ہے اور صحیح باتوں کو اپنے ذاتی مفاد کی خاطر دبا سکتا ہے۔

یہ تصورات سب سے پہلے مسلمانوں نے دیئے۔ سب سے پہلے اسلامی علوم وفنون میں یہ اصول پیدا ہوئے اور مسلمان مورخین نے ان کو مسلمانوں کی تاریخ پر منطبق کر کے دکھایا۔ انہوں نے مسلمانوں کی تاریخ ان اصولوں کی بنیاد پر مرتب کردی اور تاریخ نویسی کے اصول مقرر کر دیئے۔ یہ دنیا کو علم حدیث کی ایک ایسی بڑی دین ہے جس کے احسان سے دنیا کبھی بری الذمہ نہیں ہو سکتی۔ گزشتہ تین چار سو سالوں کے دوران مغرب میں بڑے بڑے فلسفی پیدا ہوئے، جو فلسفہ تاریخ کے مورخین مانے جاتے ہیں، جن کی کتابیں دنیا بھر میں پڑھی جاتی اور احترام کی نظر

سے اخذ کی جاتی ہیں۔ لیکن آج ان مورخین کو جو اعتبار حاصل ہوا ہے اس کی بنیاد کیا ہے؟ یہ اصول تاریخ ان حضرات کے ہاں کہاں سے آئے؟

مسلمانوں میں سب سے پہلے مورخین ابن خلدون اور علامہ سخاوی ہیں جنہوں نے اصول تاریخ نویسی اور فلسفہ تاریخ کو نئے انداز سے مرتب کیا۔ علامہ سخاوی اصلاً علم حدیث کے امام تھے۔ ان کی ایک تصنیف ہے جو فلسفہ تاریخ اسلامی کی ایک بڑی نمایاں کتاب ہے: الاعلان بالتوبیخ لمن ذم اہل التاریخ۔ اس میں انہوں نے مسلمانوں کی تاریخ نویسی اور Historiography کے اصول بیان کئے ہیں جو سارے کے سارے علم حدیث سے ماخوذ تھے۔

اگر آپ انگریزی میں پڑھنا چاہیں تو ایک چھوٹی سی کتاب میں ان مباحث کی تلخیص ہے Philosophical Interpretation of History۔ لاہور میں ایک بزرگ تھے پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم، یہ کتاب انہوں نے لکھی ہے۔ مختصر کتاب ہے۔ اس سے ذرا زیادہ تفصیل دیکھنا چاہیں تو ایک کتاب ملائشیا کے ایک ترکی محقق نے شائع کی تھی Quranic Concept of History، اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن پاک کی تعلیم کے نتیجے میں اور احادیث مبارکہ کی وضاحت کے نتیجے میں جو تصور تاریخ پیدا ہوا وہ کیا ہے؟ اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ علم حدیث کے علم تاریخ پر کتنے احسانات ہیں۔ مزید اختصار درکار ہو تو مولانا شبلی نعمانی کی سیرت النبی کی جلد اول کے مقدمے میں شبلی نے اس پر بحث کی ہے۔ وہ آپ پڑھ لیں، تیس چالیس صفحات کی بحث ہے۔ اس میں اس بات کا خلاصہ آپ کو مل جائے گا۔ وہ ضرور پڑھ لیجئے گا۔ سیرت النبی، شبلی نعمانی، جلد اول، مقدمہ۔

اصول دعوت اور اسلوب دعوت ایک اہم موضوع ہے۔ مسلمان اہل علم نے اس پر بیسویں صدی میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ یعنی یہ مباحث کہ دعوت کا اسلوب کیا ہے؟ جب دوسروں کو دعوت دی جائے تو کیسے دی جائے؟ دوسروں تک اسلام کا پیغام پہنچایا جائے تو کیسے پہنچایا جائے؟ جدید دور میں یہ پوری کی پوری مستقل ایک فن اور ایک خصوصی علم بن گیا ہے جس پر الگ کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں دعوت کے اصول اور آداب بیشتر احادیث سے لیے۔

تزکیہ و احسان یعنی انسان کو اندر سے کیسے پاکیزہ کیا جائے؟ انسان کے اخلاق و اندر

سے کیسے سدھارا جائے؟ یہ مسلمانوں میں ایک بہت بڑا فن ہے۔ اس پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ بعض کتابیں اچھی ہیں بعض اچھی نہیں ہیں۔ بعض کتابوں میں ایسا مواد بھی ہے جو اسلامی نقطۂ نظر سے نظرثانی کا محتاج ہے۔ لیکن بہت سی کتابیں ایسی ہیں جن میں بڑی صحیح باتیں کہی گئی ہیں اور احادیث اور سنت کی تعبیر اس انداز سے کی گئی ہے کہ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انسانی مزاج اور اندر کی اصلاح کیسے ہوتی ہے۔ اخلاق و کردار سازی کیسے ہوتی ہے؟ اس کو علم تزکیہ اور احسان کہتے ہیں۔ یہ سارے کا سارا علم حدیث سے عبارت ہے۔ اور اس کی بنیاد ان احادیث پر ہے جن کو رقاق کہتے ہیں، جس کا میں نے کل تذکرہ کیا تھا۔ یعنی اندر سے دل کو کیسے نرم کیا جائے۔ ان احادیث میں جو روحانی تعلیم ہے اس کو علمی انداز سے کیسے مرتب کیا جائے۔ اس سے ایک نیا فن پیدا ہوا۔

علم سیر یعنی اسلام کا بین الاقوامی قانون، یہ سارا کا سارا علم حدیث کی دین ہے۔ شروع میں علم حدیث کے وہ طلبہ اور محدثین جن کو بین الاقوامی تعلقات اور قانون صلح و جنگ سے زیادہ دلچسپی تھی وہ احادیث کے ان حصوں کو زیادہ محفوظ رکھتے تھے اور ان احادیث کو زیادہ پڑھتے اور پڑھاتے تھے جن سے بین الاقوامی قانون پر روشنی پڑتی ہے۔ اس طرح مغازی اور غزوات رسولؐ پر الگ سے کتابیں وجود میں آنی شروع ہوگئیں تو علم مغازی وجود میں آیا۔ علم مغازی وجود میں آیا تو علم غزوات میں جو احکام ہیں وہ وجود میں آئے تو قانون جنگ وجود میں آنا شروع ہوگیا اور دوسری صدی ہجری شروع ہونے سے پہلے پہلے بین الاقوامی قانون کے موضوع پر سیر کے نام سے ایک نیا فن وجود میں آگیا جس کو علم سیر کہتے ہیں جس کی بنیاد اصلاً احادیث رسول پر ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنے بارے میں فرمایا تھا اور بجا فرمایا تھا کہ انا افصح العرب میں عرب میں سب سے فصیح انسان ہوں۔ اللہ نے دنیا کی سب سے فصیح و بلیغ قوم کو قرآن کے تحمل کے لئے منتخب فرمایا۔ اور جو رسول بھیجا اسے ایسے شہر میں بھیجا جو فصاحت و بلاغت میں اپنی جگہ معیار سمجھا جاتا تھا۔ جہاں کی زبان ٹکسالی سمجھی جاتی تھی، یعنی مکہ مکرمہ میں، اس قبیلہ میں بھیجا جس قبیلے کی زبان بڑی ٹکسالی سمجھی جاتی تھی یعنی قریش۔ اور قریش میں فصیح ترین انسان اللہ نے رسول اللہ ﷺ کو بنایا۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ کے ارشادات، خطبے فصاحت و بلاغت کے اصولوں کا۔ جن مفسرین اور محدثین نے قرآن پاک کے ساتھ ساتھ سنت اور حدیث کے اعجاز کا فصاحت و بلاغت اور ادبیت کے نقطہ نظر سے جائزہ لیا۔ ان کی کاوشوں کے نتیجہ میں علم بلاغت کے قواعد

مرتب ہونے شروع ہوئے، اور یوں بلاغت کے نام سے ایک نیا فن وجود میں آنا شروع ہوا۔ یہاں تک کہ ایک بڑا فن معرض وجود میں آ گیا۔

یہ دس علوم وفنون ہیں جو براہ راست علم حدیث کی تاثیر کے نتیجہ میں مسلمانوں کے ہاں وجود میں آئے۔ لیکن علم حدیث کی اہمیت ان سے بھی بڑھ کر ہے۔ یہ علوم وفنون وجود میں آئے اور آج بھی ان میں وسعت آتی جا رہی ہے۔ ہر آنے والا دن علم حدیث میں ایک نیا میدان ہمارے سامنے لے کر آتا ہے جس پر آخری خطبہ میں گفتگو ہوگی۔ ہر نیا آنے والا استاذ علم حدیث کا نئے انداز سے مطالعہ کرتا ہے اور ہر آنے والا ہر طالب علم نئے انداز سے مطالعہ کرتا ہے۔ علم حدیث کے نئے نئے گوشے روز بروز ہمارے سامنے آتے چلے جا رہے ہیں۔ لیکن علم حدیث کی جو دیرپا اہمیت ہے جو دائمی، ازلی اور ابدی اہمیت ہے وہ ہے بطور ماخذ شریعت اور ماخذ قانون کے، جس پر تفصیل سے گفتگو آگے چل کر ہوگی۔

قرآن وسنت کا باہمی تعلق

ماخذ قانون اور ماخذ شریعت ہونے کی حیثیت سے قرآن اور سنت دونوں کا اتنا گہرا باہمی تعلق ہے کہ دونوں آپس میں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔ قرآن مجید بنیاد ہے، سنت رسول اس بنیاد پر تعمیر کی جانے والی عمارت ہے۔ قرآن مجید تنا ہے اور سنت رسول اس تنے سے نکلنے والی شاخیں ہیں۔ قرآن مجید ایک ایسا مرکز نور ہے جس سے شعاعیں نکل رہی ہیں اور وہ شعاعیں سنت رسول ہیں۔ قرآن مجید میں بنیادی اصول اور کلیات بیان کئے گئے ہیں۔ فقہی احکام کے اصول وکلیات جہاں جہاں بیان ہوئے ہیں جزئیات کے پیرائے میں بیان ہوئے ہیں۔ ان کلیات کی عملی تطبیق احادیث کے ذریعے ہوئی۔ اس عملی تطبیق کے نتیجہ میں مزید احکام نکلے۔ فقہائے اسلام نے ان پر غور کیا۔ غور کرنے سے مزید احکام نکلتے چلے گئے۔ جب دو قسم کے احکام کو سامنے رکھا گیا تو تیسری قسم کے احکام سامنے آ گئے۔ تیسرے اور دوسرے کو سامنے رکھا تو چوتھا حکم سامنے آیا۔ چوتھے اور تیسرے کو سامنے رکھا تو پانچواں حکم سامنے آ گیا۔ یہ سلسلہ آج تک چلتا چلا جا رہا ہے۔ اور ہر مرحلہ پر ان میں سے ہر حکم کی براہ راست وابستگی احادیث رسول اور سنت رسول سے ہے۔ کوئی حکم اور کوئی فقہی مسلک اس وقت تک قابل قبول نہیں ہے جب تک اس کو براہ

وسعت حدیث رسول کی سند حاصل نہ ہوتی۔ گویا احادیث رسول نے فقہی ارتقا اور قوانین فقہ کی توسیع کے عمل کو اس طرح سے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے جس طرح گھوڑے کی لگام سوار کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ انسانی تصورات کو پھیلنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ انسان کا ذہن ہر وقت کام کرتا رہتا ہے۔ انسان کا ذہن کسی افق کا پابند نہیں ہوتا۔ آپ رات کو آنکھیں بند کر کے لیٹیں اور سوچیں تو لگے گا کہ پوری کائنات کا افق آپ کے سامنے کھلا ہوا ہے۔ اس افق میں نہ زمین ہے نہ آسمان ہے۔ اس کی نہ حدود و ثغور ہیں، نہ کوئی ابتدا و انتہا، نہ کچھ اور ہے۔ یہ ایک لامتناہی وسعت ہے جو آپ کے سامنے ہے۔ یہی وسعت انسانی عقل میں ہوتی ہے۔ اگر اس لامتناہی وسعت کو کسی حد اور ضابطہ کا پابند نہ کیا جائے تو انسان کبھی مشرق کی طرف جائے گا کبھی مغرب کی طرف جائے گا اور اس کے سامنے کوئی راستہ متعین نہیں ہوگا۔ بار بار ایک ہی سفر کو طے کرے گا۔ اس لئے اس کی لگام کو کسی کے ہاتھ میں رکھنا ضروری ہے۔ اس کو حدود کا پابند کرتے رہنا ضروری ہے۔ یہ حدود کی پابندی اور یہ لگام تھامنے کا عمل حدیث رسول ﷺ نے کیا ہے۔

قرآن مجید کے عمومی کلیات یا ہدایات وہ ہیں کہ اگر حدیث و سنت کا حوالہ ختم کر دیا جائے تو ان کی اچھی تعبیر بھی ہو سکتی ہے اور بری تعبیر بھی ہو سکتی ہے۔ قرآن مجید میں خود ایک جگہ لکھا ہوا ہے: یضل به کثیرا و یهدی به کثیرا کہ اللہ تعالیٰ اسی قرآن کے ذریعے بہت سوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہت سوں کو ہدایت دیتا ہے۔ جو لوگ سنت اور حدیث سے ہٹ کر قرآن سے رہنمائی لینا چاہتے ہیں وہ گمراہ ہو جاتے ہیں اس لئے کہ قرآن مجید کی تعلیم ایک کلی چیز ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں عدل کی تعلیم ہے۔ لیکن عدل سے کیا مراد ہے؟ عدل کیا چیز ہے؟ جب تک اس کو سنت کی شکل میں Concretise نہیں کیا جائے گا اس وقت تک آپ کا جی چاہے عدل کو کوئی معنی پہنا دیں۔

آج سے تقریباً ستر سال پہلے برصغیر میں ایک صاحب پیدا ہوئے جنہوں نے کہا کہ قرآن مجید کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لئے حدیث اور سنت کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ حدیث و سنت میں بڑا اختلاف ہے، اس سے مسلمانوں میں فرقے پیدا ہو گئے ہیں۔ ایک بزرگ ان صاحب سے ملے اور ان سے کہا کہ یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ آپ مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اگر سنت اور حدیث کی وجہ سے اختلاف پیدا ہوا ہے تو قرآن کی بنیاد پر اتحاد ہو جائے گا۔ یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ لیکن آپ ذرا یہ بتائیے کہ قرآن پاک میں نماز کا حکم ہے

قرآن پاک کے حوالے سے بات کریں گے تو تم قرآن پاک کے حوالے سے بات مت کرنا۔ اس لئے کہ قرآن پاک کے فہم میں تو متعدد تعبیریں ہو سکتی ہیں۔ لیکن جو صحیح تعبیر ہے وہ صرف حدیث اور سنت ہی سے ملے گی، اس لئے سنت کے حوالے سے ان سے بات کرنا، قرآن پاک کے حوالے سے بات مت کرنا۔ یہ ایک جلیل القدر صحابیؓ دوسرے جلیل القدر صحابیؓ کو مشورہ دے رہا ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے جا کر خوارج سے سنت ہی کے حوالے سے بات کی اور بہت سے خوارج کو ان کی گمراہیوں سے روکا اور نکالا۔ اس لئے علم حدیث کی اہمیت مسلمانوں کے لئے نہ صرف سوموفنون کی خاطر بلکہ قرآن مجید کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے بھی ناگزیر ہے۔

اب میں اختصار کے ساتھ ایک چیز اور عرض کر دیتا ہوں۔ کل علم حدیث کے موضوعات کا تذکرہ ہوا تھا۔ علم حدیث کے آٹھ موضوعات مشہور ہیں، جن کی تفصیل بیان کرتے ہوئے میں نے عرض کیا تھا کہ وہ کتابیں جو علم حدیث کے ان سارے موضوعات پر حاوی ہوں وہ کتابیں جامع کہلاتی ہیں جیسے امام ترمذیؒ کی کتاب جامع ترمذی کہلاتی ہے، یا صحیح بخاری الجامع الصحیح کہلاتی ہے۔

لیکن کچھ کتابیں ایسی ہیں کہ جن میں فقہی احادیث کو فقہی مسائل کی ترتیب سے بیان کیا گیا ہے۔ وہ کتب احادیث جن میں مسائل کی ترتیب فقہی ہو۔ مثلاً پہلے وضو کے احکام ہوں پھر نماز کے احکام ہوں، پھر زکوٰۃ کے احکام ہوں، پھر روزے کے احکام ہوں۔ اور صرف فقہی معاملات سے متعلق احادیث کو لیا گیا ہو، وہ کتابیں سنن کہلاتی ہیں۔ جیسے سنن ابوداؤد۔ سنن ابوداؤد کتب حدیث میں فقہی احکام کا ایک بہت بڑا مصدر و ماخذ ہے۔

شروع میں جب احادیث مرتب ہو رہی تھیں اور صحابہ کرامؓ احادیث کا سب سے بڑا ذخیرہ اور مصدر و ماخذ تھے تو ہر تابعی کی کوشش ہوتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ صحابہ کرام کے پاس حاضر ہو کر ان کی احادیث اپنے پاس نوٹ کر لے۔ اس سے تابعین کے پاس احادیث کے جو مجموعے ہوتے تھے وہ صحابہ سے سنے ہوئے ہوتے تھے۔ مثلاً ایک صحابیؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے سنی ہوئی احادیث اپنے پاس نقل کر لیں۔ پھر حضرت عمرؓ سے سنی ہوئی احادیث نقل کر لیں۔ اس طرح شروع شروع میں جو مجموعے مرتب ہوئے وہ صحابہ کرام کی مرویات کے مجموعے تھے۔ لہٰذا جن کتابوں میں احادیث صحابہ کرامؓ کی ترتیب سے جمع کی گئی ہوں ان کو مسند کہا جاتا ہے۔ مسندوں میں سب سے بڑی کتاب مسند امام احمد ہے جس میں بہت بڑی تعداد میں

احادیث شامل ہیں۔ مسند امام احمدؒ کے ساتھ کچھ اور مسندیں بھی ہیں۔ مسند امام احمد تو ہے ہی۔ مسند ابو عوانہ ہے، مسند ابو داؤد طیالسی ہے۔ یہ سب وہ ہیں جن میں صحابہ کی ترتیب سے الگ الگ احادیث جمع کی گئی ہیں۔ صحابہ کی ترتیب میں کیا اصول رکھا جائے اس باب میں بھی محدثین کے اپنے اپنے ذوق تھے۔ مثلاً امام احمد نے یہ ترتیب اس حساب سے رکھی ہے کہ اسلام میں ان صحابی کا درجہ کیا ہے؟ چنانچہ سب سے پہلے عشرہ مبشرہ کی احادیث درج کی ہیں۔ عشرہ مبشرہ میں سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ کی احادیث ہیں۔ پھر بقیہ عشرہ مبشرہ، اس کے بعد ترتیب کے مطابق دوسرے دیگر صحابہ جو ان کے خیال میں اسلام میں اونچا مقام رکھتے تھے۔ کچھ مسندوں کے مصنفین نے فیصلہ کیا کہ حروف تہجی کے اعتبار سے (Alphabetical) ترتیب رکھیں گے۔ کچھ مصنفین نے طے کیا کہ رشتہ داری کے حساب سے ترتیب رکھیں گے کہ جس صحابیؓ کی قرابت رسول اللہ ﷺ سے زیادہ ہوگی اس کی احادیث پہلے ہوں گی۔ اس لحاظ سے بنی ہاشم کی احادیث پہلے ہوں گی۔ یہ ترتیب انہوں نے اپنی اپنی سہولت کی خاطر رکھی۔ لہٰذا مسند اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں احادیث کو صحابہ کی ترتیب سے بیان کیا گیا ہو۔

حدیث کی ایک کتاب ہوتی ہے 'معجم'۔ آپ نے سنا ہوگا معجم طبرانی کبیر، معجم طبرانی صغیر، معجم طبرانی اوسط، اور بھی کئی معجمیں ہیں۔ معجم سے مراد وہ احادیث ہیں جن میں مرتب کرنے والے محدث نے اپنے اساتذہ کی ترتیب سے احادیث کو جمع کیا ہو۔ مثلاً آپ حدیث کے طالب علم ہیں، آپ نے دس اساتذہ سے احادیث پڑھیں اور ان کی حدیثیں آپ کے پاس ہیں۔ اب جب آپ ان کو کتابی شکل میں مرتب کریں گے تو آپ سب اساتذہ کی احادیث الگ الگ کر دیں گے، باب اول استاد 'الف' کی احادیث ہیں، باب دوم استاد 'ب' کی احادیث ہیں۔ باب سوم استاد 'ج' کی احادیث ہیں۔ اس طرح کی ترتیب پر مشتمل احادیث کی کتاب کو معجم کہتے ہیں۔ اس میں بھی حروف تہجی کی ترتیب ہو سکتی ہے یا کوئی بھی ترتیب ہو سکتی ہے۔ معجم کے نام سے احادیث کی جو کتابیں ہیں ان میں طبرانی کی تین معجمیں زیادہ مشہور ہیں۔ پہلے امام طبرانی نے معجم کبیر لکھی۔ پھر امام صاحب کو خیال ہوا کہ یہ تو بہت بڑی ہے اس لئے اس کی تلخیص کی اور معجم صغیر لکھی۔ پھر خیال ہوا کہ یہ تو بہت چھوٹی رہ گئی تو ایک معجم اوسط لکھی جو درمیانے درجے کی ہے۔ یہ تینوں معجمیں چھپی ہوئی موجود ہیں اور دستیاب ہیں۔

کچھ کتابیں ایسی ہیں کہ جن کے مصنفین نے یہ چاہا کہ صرف ان احادیث کا انتخاب کریں جو تمام محدثین کے نزدیک صحیح ہوں۔ اور جن میں روایتی اعتبار سے کوئی کمزوری نہ ہو۔ اس پر ہم آگے چل کر بحث کریں گے۔

اس طرح کی صحیح احادیث کو انہوں نے کتابی شکل میں مرتب کیا، اس کا نام صحیح رکھا گیا۔ امام بخاری کی کتاب کا نام 'صحیح' ہے۔ صحیح مسلم 'صحیح' کہلاتی ہے۔ صحیح ابن حبان 'صحیح' کہلاتی ہے۔ صحیح ابن خزیمہ 'صحیح' کہلاتی ہے۔ یہ وہ کتابیں ہیں جو 'صحیح' کے نام سے مشہور ہیں۔ امام بخاری کی کتاب جامع بھی ہے اس لیے کہ اس میں تمام ابواب ہیں، لیکن صحیح بھی ہے کیونکہ انہوں نے ساری احادیث صحیح بیان کی ہیں اور اس میں غیر صحیح احادیث کو بیان نہیں کیا ہے۔

صحیح سے مراد یہ نہ سمجھئے گا کہ اس کا متضاد غلط ہے۔ جو صحیح ہے وہ صحیح ہے باقی غلط ہیں۔ نہیں غلط یہاں مراد نہیں ہے۔ صحیح ایک اصطلاح ہے جس کا ایک خاص مفہوم ہے۔ اس پر آگے چل کر بات کریں گے۔ جو صحیح نہیں ہے وہ لازماً غلط نہیں ہے، غلط بھی ہوسکتا ہے، غیر غلط بھی ہوسکتا ہے۔

کچھ احادیث کی کتابیں ایسی ہیں جن کو مستدرک کہا جاتا ہے۔ مستدرک سے مراد وہ مجموعے ہیں کہ جن میں بعد میں آنے والے کسی محدث نے کسی سابق محدث کی شرائط کو سامنے رکھ کر احادیث کا جائزہ لیا ہو اور ایسی احادیث جو سابق محدث سے رہ گئی ہوں ان کو ایک کتابی شکل میں مرتب کر دیا ہو۔ مثال کے طور پر امام بخاری کی اپنی شرائط ہیں، امام مسلم کی اپنی شرائط ہیں۔ ان دونوں حضرات نے یہ طے کیا کہ ہم اپنی کتاب میں صرف وہ احادیث جمع کریں گے کہ جن کی پوری سند رسول اللہ ﷺ تک براہ راست پہنچتی ہو۔ جس کے درمیان میں کوئی خلا نہ ہو، جتنے راوی ہوں وہ سارے کے سارے اچھے حافظے، عدالت اور تقویٰ کے اعلیٰ معیار پر پورے اترتے ہوں۔ ہم ان میں کوئی ایسی حدیث بیان نہیں کریں گے جو شاذ ہو یا احادیث متواترہ سے متعارض ہو۔ اس طرح کی کچھ اور شرائط انہوں نے اپنے پیش نظر رکھیں۔ امام بخاری کی شرائط میں ایک اضافی شرط یہ بھی تھی کہ صرف اس راوی کی حدیث لیں گے جس کی اپنے استاد سے ملاقات باقاعدہ ثابت ہو۔ محض امکان ملاقات کافی نہیں ہوگا۔ امام مسلم نے لکھا کہ ثبوت ملاقات ضروری نہیں ہے امکان ملاقات کافی ہے۔ یعنی اگر ایک محدث کسی ایسے محدث سے حدیث بیان

کر رہے ہیں جو کسی زمانے میں موجود تھے اور ان کے معاصر تھے اور اس بات کا امکان
موجود ہے کہ ان کی آپس میں ملاقات ہوئی ہو لیکن ان کی یہ ملاقات ہمارے علم میں نہیں آئی تو
میں ان کی حدیث کو تسلیم کرلوں گا کہ وہ صحیح حدیث ہے۔ اس لئے کہ وہ خود اخلاق و کردار کے لحاظ سے
اونچے معیار پر تھے تو ان کی روایت کو قبول نہ کرنا نامناسب ہے۔

مثلاً امام مالک روایت کرتے ہیں امام زہری سے۔ امام مالک اتنے اونچے درجے کے
انسان ہیں کہ مجھے یہ تحقیق کرنے کی ضرورت نہیں کہ امام مالک کی امام زہری سے ملاقات ہوئی تھی
کہ نہیں ہوئی تھی۔ جب وہ روایت کرتے ہیں تو دونوں ایک زمانے میں تھے۔ امام زہری مدینہ
بار بار تشریف لائے، حج کے لئے تشریف لائے، مدینہ منورہ میں ایک عرصے تک رہے اس لئے اس کی
تحقیق کئے بغیر کہ ان کی ملاقات واقعی ہوئی بھی تھی کہ نہیں ہوئی تھی میں ان کی روایت قبول کروں
گا۔ اس لئے امام مسلم نے کہا کہ امکان تو کوئی ہے ثبوت لقا ضروری نہیں ہے۔ یہ تھوڑا سا فرق
ہے امام مسلم اور امام بخاری کی شرائط اور معیارات میں۔ ان معیارات کی بنیاد پر دونوں نے اپنے
اپنے مجموعے مرتب کئے۔ ان دونوں حضرات کے تقریباً سو یا سوا سو سال بعد امام حاکم تشریف
لائے۔ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ مختلف کتابوں میں بہت سی ایسی احادیث موجود ہیں جو ان دونوں
محدثین کی شرائط پر پوری اترتی ہیں لیکن ان دونوں نے اپنی کتب میں ان کا ذکر نہیں کیا۔ تو انہوں نے
ایک نیا مجموعہ ان احادیث کا مرتب کیا جو مستدرک کہلاتا ہے۔ المستدرک علی الصحیحین۔ لہذا
مستدرک سے مراد وہ مجموعہ ہے جو کسی سابقہ محدث کی شرائط پر پوری اترنے والی احادیث کا بعد میں
آنے والے محدث نے مرتب کیا ہو۔ جس کی شرائط پر وہ ہوں اس کی مستدرک کہلاتی ہے۔ صحیحین کی
مستدرک، ابوداؤد کی مستدرک، ترمذی کی مستدرک، اسی طرح مستدرک کے نام سے خاصی کتابیں
موجود ہیں۔

ایک کتاب کہلاتی ہے: مستخرج۔ اس کے لفظی معنی تو ہیں نکالا ہوا لیکن
'مستخرج' سے مراد وہ مجموعہ ہے جس میں بعد میں آنے والے کسی محدث نے کسی سابقہ مجموعہ کی
احادیث کو اپنی سند سے بیان کیا ہو۔ مثلاً موطا امام مالک ہے۔ اس میں امام مالک ایک حدیث بیان
کرتے ہیں کہ حدثنی نافع عن ابن عمر عن النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام۔ مثلاً امام
نافع سے سنا۔ انہوں نے ابن عمر سے سنا اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا اور پھر حضور نے یہ

بیان فرمایا۔ اب بعد میں آنے والا کوئی محدث یہی روایت کسی اور سند سے بیان کرے، وہ روایت بھی ہو لیکن سند اور ہو تو گویا یہ حدیث زیادہ باوثوق ہو جائے گی۔ بات زیادہ قابل اعتماد ہو جائے گی کہ ایک سے زیادہ سندوں اور مختلف واسطوں سے ایک ہی بات آئی ہے تو بات زیادہ صحیح ہے۔ تو گویا پہلی کسی حدیث کو Reinforce کرنے کے لئے مستخرج کے نام سے کتابیں مرتب کی گئیں جو 'مستخرج' کہلاتی ہیں۔

حدیث کی کتابوں کی بڑی بڑی اور مشہور قسمیں یہی ہیں۔ اور بھی کئی قسمیں ہیں جن کی کوئی زیادہ اہمیت نہیں۔ ان میں سے ایک قسم جزء کہلاتی ہے۔ الجزء کے معنی ہیں حصہ لیکن اصطلاح میں کسی ایک صحابی کی احادیث، یا کسی ایک استاذ کی احادیث، یا کسی ایک موضوع پر پائی جانے والی احادیث کے مجموعوں کو جزء کہا جاتا ہے۔ امام بخاری کی کئی کتابیں 'جزء' کے نام سے موجود ہیں۔ بعض اور محدثین نے بھی کتابیں جزء کے نام سے لکھی ہیں مثلاً جزء حجة الوداع جس میں حجۃ الوداع سے متعلق ساری احادیث یکجا کر دی گئی ہیں۔ اسی طرح کسی موضوع پر ساری احادیث ایک ہی جگہ پر جمع کی جائیں تو یہ مجموعہ بھی جزء کہلاتا ہے۔

ایک مجموعہ اربعین کا ہے۔ چالیس احادیث کا مجموعہ بہت سے محدثین نے ایسے مجموعے مرتب کئے ہیں۔ اس لئے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو میری چالیس باتیں یاد کرکے دہرائے اس کے لئے بڑی بشارت ہے۔ اس بشارت کا مصداق بننے کے لئے محدثین نے چالیس احادیث کے مجموعے جمع کئے۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گا۔ یہ کام آپ بھی کر سکتی ہیں۔ اگر آپ یہ طے کریں کہ کسی ایک موضوع پر کتابوں کا جائزہ لے کر چالیس احادیث کا مجموعہ مرتب کر لیں تو آپ بھی اس حدیث کی مصداق ہو سکتی ہیں۔ مثلاً آپ یہ کر سکتی ہیں کہ ماں باپ کے حقوق پر چالیس احادیث، پڑوسیوں کے حقوق پر چالیس احادیث، طلب علم کے بارے میں چالیس احادیث، یا صفائی کی اہمیت پر چالیس احادیث جمع کر لیں، یا کوئی بھی دوسرا عنوان لے لیں اور اس پر چالیس احادیث جمع کر لیں، ترجمہ کریں، مختصر تشریح کریں اور چھپوا لیں یا کسی کو پڑھا دیں تو آپ اس حدیث کا مصداق بن سکتی ہیں۔ مختلف موضوعات پر اربعین کے نام سے چالیس احادیث کے سینکڑوں مجموعے ملتے ہیں۔ بہرحال یہ کتب احادیث کی بڑی بڑی قسمیں ہیں۔

محدثین کی اقسام

علم حدیث کے بارے میں آخری بات کہہ کے آج کی گفتگو ختم کرتا ہوں۔ علم حدیث سے جو لوگ وابستہ ہیں ان میں بڑی تعداد تو ہمارے اور آپ جیسے طالبان علم کی ہوتی ہے۔ جو طالب علم ہیں وہ تو کسی شمار قطار میں نہیں آتے، لیکن جن کا درجہ طالب علم سے ذرا آگے بڑھ کر ہے ان میں سب سے پہلا درجہ "مُسنِد" کا ہوتا ہے۔ مُسنِد کا مطلب ہے سند بیان کرنے والا۔ اَسنَدَ کا مطلب ہے سند بیان کی، اور یُسنِدُ سند بیان کرتا ہے۔ لہٰذا مُسنِد یہاں اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ مسند کے معنی ہے سند بیان کرنے والا یعنی حدیث کا وہ سنجیدہ طالب علم جو سند کے ساتھ حدیث کا مطالعہ کرے اور سند اور رجال اور متن ان سب چیزوں کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد آگے بیان کرے وہ مسند کہلاتا ہے۔ یہ سب سے پہلا درجہ ہے۔

اس کے بعد درجہ آتا ہے محدث کا، یعنی وہ شخص جس نے علم حدیث میں اتنی مہارت حاصل کرلی ہو کہ علوم حدیث کا بیشتر حصہ اس کے علم اور مطالعہ اور نظر میں محفوظ ہو وہ محدث کہلاتا ہے۔

اس کے بعد حافظ کہلاتا ہے۔ ہمارے ہاں بعض علاقوں میں حافظ اندھے اور نابینا کو بھی کہتے ہیں اس حافظ سے وہ نابینا حافظ مراد نہیں ہے، یا قرآن کے حافظ کو بھی ہم لوگ حافظ کہتے ہیں۔ یہاں حافظ سے وہ بھی مراد نہیں ہے۔ بلکہ حافظ علم حدیث کی ایک اصطلاح ہے جو بڑے بڑے علماء بلکہ ائمہ حدیث کے لئے استعمال ہوتی تھی۔ آپ کے اندازے کے لئے میں عرض کروں کہ ایک زمانہ میں حافظ ابن حجر عسقلانی گزرے ہیں جن سے بڑا محدث ان کے بعد سے کوئی پیدا نہیں ہوا۔ ان کو آج تک حافظ ابن حجر کہا جاتا ہے۔ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ ایک زمانے تک حافظ ابن تیمیہ کہلاتے تھے۔ علامہ ابن قیم آج بھی حافظ ابن قیم کہلاتے ہیں۔ اس درجہ کے لوگ جیسے ابن تیمیہ، ابن قیم اور ابن حجر تھے وہ لوگ حافظ کہلاتے ہیں۔ وہ لوگ جو علم حدیث کے ذخائر کو اپنی یادداشت میں محفوظ کئے ہوئے ہوں اور علم حدیث کے علوم وفنون ان کی یادداشت میں محفوظ ہوں اور علم حدیث کا کوئی گوشہ ان کے مطالعہ سے خارج نہ ہو وہ اصطلاحاً حافظ کہلاتے ہیں۔

اس کے بعد درجہ آتا ہے "الحجۃ" کا۔ الحجۃ سے مختلف لوگوں نے مختلف معنی مراد لئے

ہیں۔ کسی نے کہا کہ جس کو تین لاکھ احادیث یاد ہوں، وہ الحجہ کہلاتا ہے۔ کسی نے کہا کہ جس کو پانچ لاکھ احادیث یاد ہوں وہ الحجہ ہے۔ بہرحال احادیث کی یہ تعداد لاکھوں میں ہے۔ اس کے بعد درجہ آتا ہے حاکم کا۔ الحاکم سے مراد وہ ہے جس کو ساری دستیاب احادیث زبانی یاد ہوں۔ جو کچھ حدیث کا ذخیرہ اس وقت موجود ہے وہ اسناد کے ساتھ اس کو زبانی یاد ہو تو وہ الحاکم کہلاتا ہے۔ ان سب درجات کے بعد جو سب سے اونچا درجہ ہے وہ امیر المومنین فی الحدیث کہلاتا ہے۔ مسلمانوں نے جن بزرگوں کو امیر المومنین فی الحدیث کا لقب دیا ان میں حضرت سفیان ثوری، جن کا تذکرہ ہو چکا ہے، حضرت عبداللہ بن مبارک، وہ اس درجہ کے انسان تھے کہ ایک ایک وقت میں لاکھوں انسان ان سے کسب فیض کے لئے آیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ان سے حدیث مبارکہ کی روایت سننے کے لئے لوگ جب جمع ہوئے تو دوران حدیث ان کو چھینک آ گئی۔ ان کے ہزاروں شاگردوں نے جب بیک آواز اور بیک وقت یرحمک اللہ کہا تو اس سے اتنا شور پیدا ہوا کہ لوگ یہ سمجھے کہ بغداد میں شاید فساد ہو گیا اور پولیس پوچھتی ہوئی آئی کہ کیا واقعہ ہوا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ عبداللہ بن مبارک کو چھینک آئی تھی تو ان کے شاگردوں نے یرحمک اللہ کہا تھا یہ اس کا شور ہے۔ عبداللہ بن مبارک کی محفل میں شرکت کرنے والے ایک شخص نے بیان کیا کہ عبداللہ بن مبارک جب حدیث بیان کر رہے تھے اور لوگ لکھ رہے تھے تو ایک ایک دوات کو آٹھ آٹھ دس دس آدمی استعمال کر رہے تھے۔ اس حساب سے موجود دواتوں کی کل تعداد ۳۳ ہزار تھی۔ ایک مرتبہ ایسے ہی ایک موقع پر قریب موجود ایک کنویں کا پانی ختم ہو گیا تھا کیونکہ اپنی دوات میں تازہ پانی ڈالنے والوں کی اتنی کثرت تھی کہ لوگوں کے بار بار پانی لینے سے کنواں خشک ہو گیا۔ دوات میں کتنا پانی پڑتا ہے؟ ایک چھوٹے برتن سے بیسیوں دواتیں تر ہو سکتی ہیں اور وہاں دوات میں پانی لینے والوں کی وجہ سے کنویں کا پانی ختم ہو گیا تھا۔ یہ عبداللہ بن مبارک بھی امیر المومنین فی الحدیث کہلاتے تھے۔

امام احمد بن حنبل بھی امیر المومنین فی الحدیث کہلاتے ہیں۔ امام بخاری اور مسلم ان دونوں کا لقب بھی امیر المومنین فی الحدیث تھا۔ اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ کس درجہ کے انسان کو امیر المومنین فی الحدیث کہا گیا۔ بعد میں یہ سلسلہ آخری دنوں تک جاری رہا جن لوگوں کو یہ لقب دیا گیا، ان کے بعد کسی اور محدث کو عام طور پر یہ لقب نہیں ملا سوائے حافظ ابن حجر عسقلانی

ہو وہ بدعت نہیں ہے۔ جس کی ضرورت نہ ہو اور جس کی حضورؐ نے تعلیم نہ دی ہو۔ لیکن جو باتیں دو
عبادات سے تعلق ہو وہ بدعت ہے۔ جو چیز حرام نہیں ہے وہ آپ کے لئے بالکل جائز ہے۔ آپ جتنی
مرضی ہو اس میدان میں نئی نئی چیزیں بنائیے۔ مکان بنانے کے نئے سے نئے طریقے ایجاد کریں۔
کاروبار کرنے کے نئے سے نئے طریقے ایجاد کریں۔ کپڑا اچھے سے اچھا بنائیں۔ گھر کو اچھے سے اچھے
طریقے سے ڈیکوریٹ کریں۔ کوئی حرام چیز نہیں ہے تو جائز ہے۔ گھر میں سونے کے برتن نہ
رکھیں۔ اچھے سے اچھے برتن رکھنا جائز ہے۔ مردوں کے لئے ریشم نہ ہو تو اچھے سے اچھا کپڑا پہننا
جائز ہے۔ مرد سونے چاندی کا زیور نہ پہنے، ریشم استعمال نہ کرے، کسی کے مذہبی شعائر کی پیروی
نہ کرے، اس کے علاوہ ہر چیز جائز ہے۔ یعنی معاملات میں صرف حلال و حرام کی قید ہے۔ جو حرام
ہے اس سے بچیں، باقی جتنا مرضی رزق حلال کمائیں اور ترقی کریں۔

لیکن عقائد اور عبادات میں صرف اس حد تک رہیں جس حد تک رسول اللہ ﷺ اور
شریعت نے اجازت دی ہے۔ اس سے آگے جانا وہاں جائز ہے جہاں جو تعلیم دی گئی ہے اس پر عمل
کرنا اس کے لئے ناگزیر ہو جو حضورؐ نے سکھائی ہے۔ مثلاً حج کی تعلیم دی۔ حج فرض ہے۔ حج
کے لئے اگر آپ جانا چاہیں تو آج ویزا لینا ناگزیر ہے۔ بغیر ویزا کے آپ حج پر نہیں جا سکتے۔ ویزا
کے لئے پاسپورٹ ضروری ہے اور پاسپورٹ کے لئے تصویر ہونا ضروری ہے۔ تو یہ چیزیں لازمی
طور پر ضروری ہو جائیں گی۔ اس لئے کہ ان چیزوں کے بغیر یہ فریضہ ادا نہیں ہو سکتا۔ اگر ان
سب کے بغیر حج کے حکم پر عمل ہو سکے تو پھر نہ پاسپورٹ ہونا ضروری ہوگا نہ تصویر ہونا ضروری ہوگا۔
یہ چیزیں بدعت نہیں کہلائیں گی۔ اگرچہ خالص عبادات سے تعلق رکھتی ہیں، لیکن بدعت نہیں ہیں
اس لئے کہ عبادت کے لئے ناگزیر ہیں۔ عقائد اور عبادات سے متعلق جو چیز نہ ناگزیر ہو نہ حضورؐ
نے اس کی تعلیم دی ہو وہ بدعت ہے۔ مثلاً اگر میں آپ سے کہوں کہ آپ یہاں ظہر کے
بعد کھڑے ہو کر چھ رکعات نماز پڑھیں جماعت کے ساتھ، اور دوران پہلی رکعت میں فلاں سورۃ
پڑھیں، دوسری میں فلاں سورۃ پڑھیں اور سجدے میں یہ دعا کریں اور ایسا کرنا سب کے لئے
لازمی ہے تو یہ بدعت ہو جائے گی۔ یہ بدعت ہے اس لئے کہ مجھے ایسا کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میں
آپ کو کسی خاص نماز کی تلقین کروں جو حضورؐ نے نہیں سکھائی۔ یا میں کہوں کہ چونکہ میں ۱۸ تاریخ کو
پیدا ہوا تھا اس لئے آپ میری پیدائش کی خوشی میں اضافہ و تکبیر کا ورد شروع کریں۔ یہ بدعت ہے

اس لئے کہ حضورؐ نے ایسے کسی روزے کی تعلیم نہیں دی۔

معاشرہ میں منکرین حدیث کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ عام لوگ اس سے متاثر ہوتے ہیں، ایک سیدھا سادا انسان ان کے پروپیگنڈے سے کس طرح بچ سکتا ہے؟

اس طرح بچ سکتا ہے کہ لوگوں کو علم حدیث کی تعلیم دی جائے جیسے کہ آپ یہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ لوگوں تک علم حدیث کے ذخائر اور رہنمائی پہنچائی جائے۔

کیا آپ اردو رسالہ کا نام بتا سکتی ہیں جس میں رسول اللہ ﷺ کے [illegible] ذکر ہے؟

اس کا اردو نام مجھے یاد نہیں رہا۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ایک چھوٹے سے رسالہ میں اس کا ذکر ہے، جس کا عربی نام ہے۔ وہ اپنی کتابوں کا عربی نام رکھا کرتے تھے، لیکن رسالہ چھوٹا سا ہے، اردو میں ہے، غالباً تیس چالیس صفحات کا ہے۔ آج سے تیس چالیس سال قبل چھپا تھا، اور کوئی پینتیس چالیس سال پہلے میں نے پڑھا تھا۔

چالیس احادیث مختلف موضوعات پر بھی جمع کی جا سکتی ہیں اور ایک موضوع پر بھی۔ آپ کو اختیار ہے۔ حدیث ہر جگہ رہنمائی کرتی ہے وہ مجتمع ہو یا الگ الگ ہو۔

جن لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ ہم سنت کو صحیح مانتے ہیں اور ہم اللہ کو نعوذ باللہ غلط نہیں کہہ رہے ہیں، اللہ کہتا ہے کہ میں نے کھول کھول کر بیان کر دیا ہے اور وہ لوگ نماز کا طریقہ قرآن سے ثابت کرتے ہیں۔

ایک جملہ حضرت علیؓ نے ارشاد فرمایا تھا۔ جملہ بڑا زبردست ہے اور بہت سے معاملات پر صادق آتا ہے۔ جب خوارج نے آپ کے خلاف بغاوت کا فیصلہ کیا تو یہ عنوان اختیار کیا کہ قرآن پاک میں آیا ہے کہ إن الحکم إلا لله فیصلہ کرنے کا اختیار صرف اللہ کو ہے اور آپ نے دو ثالث مقرر کر دیے تو آپ نے قرآن پاک کی آیت کی خلاف ورزی کی۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ کلمة حق أريد بها الباطل، یہ جملہ تو حق ہے لیکن مراد اس سے باطل ہے۔ نیت اور عزائم برے ہیں جملہ درست ہے۔ تو یہ جملہ تو درست ہے کہ قرآن پاک میں ہر چیز کو کھول کھول کر بیان کر دیا گیا ہے۔ لیکن نیت اس سے باطل ہے۔ قرآن پاک کوئی نظری یا مجرد یا Abstract کتاب نہیں ہے کہ کسی خلا میں نازل ہوئی ہو۔ بلکہ قرآن مجید ایک کتاب ہدایت اور ایک دستور العمل ہے جس کے ساتھ اس کا پڑھانے والا بھی بھیجا گیا تھا۔ خود قرآن مجید میں یہ لکھا ہوا ہے۔ بلکہ اس پر بات کریں گے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہ اعتراض بے بنیاد ہے۔

حدیث کے متعلق جاننے کا بہت اچھا موقع ملا ہے۔ اللہ پاک آپ کو جزائے خیر دے، آمین۔ اس لیکچر کو لکھنے میں مشکل ہو رہی ہے۔ اگر آپ کی نظر میں کوئی خاص کتاب ہو جس کو ہم پڑھ سکیں یا کوئی اور طریقہ بتائیں جس سے ہم اصطلاحات کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔

اصل میں یہی طے ہوا تھا کہ یہ لیکچر ریکارڈ ہوں گے اور بعد میں ان کو ٹرانسکرائب کر کے میں ایڈٹ کروں گا تو شائع بھی کریں گے انشاء اللہ۔ اردو میں کوئی کتاب آپ پڑھنا چاہیں تو میں کل چیک کر کے بتا دوں گا۔ میں اکثر اردو کتابیں نہیں پڑھتا ہوں۔ زیادہ تر عربی کتابیں دیکھتا ہوں۔ وہی بتا سکتا ہوں۔ لیکن اردو میں اس پر ایک تو ڈاکٹر خالد علوی صاحب کی بڑی اچھی کتاب ہے 'حفاظت حدیث'۔ اور ایک کتاب علوم حدیث پر ہے، ایک جلد چھپی ہے دوسری جلد چھپنے والی ہے۔ 'اصول حدیث' پر بھی دو تین کتابیں موجود ہیں۔ ایک کتاب ہے نخبۃ الفکر، حافظ ابن حجرؒ کی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ اور بھی کئی ہیں میں کل چیک کر کے آپ کو مزید کتابوں کے نام بتا دوں گا۔

فقہی ترتیب سے کیا مراد ہے؟

فقہی ترتیب سے مراد ہے کہ فقہ کی کتابوں میں مضامین کو بیان کرنے کا ایک خاص انداز ہوتا ہے۔ سب سے پہلے اس میں طہارت کے احکام ہوتے ہیں۔ پھر نماز کے احکام ہوتے ہیں۔ پھر زکوٰۃ اور روزہ کے احکام ہوتے ہیں۔ پھر حج کے احکام ہوتے ہیں۔ پھر نکاح وطلاق کے احکام ہوتے ہیں۔ پھر وراثت، وصیت، پھر معاملات اور خرید وفروخت لین دین۔ یہ ترتیب فقہ کی سب کتابوں میں رائج ہے اور امام مالکؒ کے زمانے سے رائج ہے۔ احادیث کی وہ کتابیں جو اس ترتیب سے ہوں جن میں سب سے پہلے طہارت، نماز، روزے کے احکام ہوں وہ سنن کہلاتی ہیں، جن میں یہ ترتیب نہ ہو وہ سنن نہیں کہلاتیں۔ مثلاً صحیح بخاری میں یہ ترتیب نہیں ہے۔ صحیح بخاری میں جو پہلا باب ہے وہ ہے باب کیف کان بدء الوحی علی رسول اللہ ﷺ کہ رسول اللہ ﷺ پر وحی کا آغاز کیسے ہوا۔ سب سے پہلے یہ باب ہے پھر ایمان کا باب ہے پھر علم کا باب ہے۔ سنن ابن ماجہ میں پہلے علم کا باب ہے پھر بقیہ ابواب ہیں۔ ہر مصنف کی ترتیب الگ الگ ہے۔

کیا عورتوں کا محرم نہ ہو تو وہ گروپ کی شکل میں حج پر جا سکتی ہیں؟

یہ تو آپ کسی مفتی سے پوچھیں۔ لیکن فقہائے احناف کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اگر کوئی

خاتون مصر گئیں اور وہاں کی عدالتوں نے پچیس سال عمر مقرر کی ہے وہ بغیر محرم کے اس فریضہ کے ساتھ حج پر جاسکتی ہیں کہ ان کے ساتھ خواتین کی ایک بڑی تعداد ہو اور ان خواتین کے ساتھ ان کے محرم موجود ہوں۔ یہ تو فقہی جواب ہے۔ لیکن سعودی قانون کی رو سے بغیر محرم کے کوئی خاتون حج کے لئے نہیں جاسکتی اور ہمیں اس قانون کی پابندی کرنی چاہیے۔ میں تین سال حج کے انتظامات سے وابستہ رہا ہوں۔ میں نے حج کے انتظامات کو براہ راست دیکھا ہے۔ اس تجربہ کی روشنی میں میرا مشورہ یہ ہے کہ بغیر محرم کے کوئی خاتون کبھی حج پر نہ جائے۔ چاہے ان کی عمر کتنی ہی ہو اور شرعاً فقہا نے اجازت دی ہو یا نہ دی ہو۔ بہتر یہی ہے کہ وہ محرم کے ساتھ جائے۔ میں نے ایسے ایسے واقعات اور مثالیں دیکھی ہیں کہ محرم نہ ہونے کی وجہ سے خواتین کو کتنی مشکلات پیش آگئیں۔ یہ شریعت کا حکم ہے اور بہت رحمت و شفقت پر مبنی ہے۔ فقہائے اسلام نے سب نے لکھا ہے کہ اگر کسی خاتون کے ساتھ محرم نہ ہو یا اس کے پاس اتنے پیسے نہ ہوں کہ وہ محرم کو بھی ساتھ لے جاسکے تو اس پر حج فرض ہی نہیں ہے۔ اپنے پاس پیسے موجود ہوں لیکن محرم موجود نہ ہو تو بھی خواتین پر حج فرض نہیں ہے۔ حج فرض تب ہی ہوتا ہے جب محرم بھی ہو اور اس کے لئے بھی پیسے ہوں۔ اپنے پاس پیسے ہوں اور محرم جانے کے لئے تیار ہو، خاتون کے پاس پیسے ہوں کہ محرم کو لے جاسکے تبھی حج فرض ہوتا ہے۔ اس لئے کی اجازت۔ یہ فقہ کا واضح ہے اور اگر محرم ہو تو پھر جانا چاہئے اس کے بغیر بڑی مشکل پیش آتی ہے۔

سند کے ساتھ احادیث کو یاد کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ کوشش کی لیکن یاد نہیں رہتی۔

بڑی مشکل سے یاد ہوتی ہیں۔ میں نے بھی بہت کوشش کی لیکن مجھے بھی یاد نہیں ہوئیں۔ میں نے کسی زمانے میں کوشش کی تھی کہ کچھ حدیثیں مجھے سند کے ساتھ یاد ہو جائیں لیکن یاد نہیں ہوئیں۔ اللہ سے دعا کریں اپنے لئے بھی اور میرے لئے بھی، خدا کرے کہ ہم دونوں کو یاد ہو جائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

☆☆☆☆☆☆☆

تیسرا خطبہ

حدیث اور سنت بطور ماخذ شریعت

بدھ، 8 اکتوبر 2003

حدیث اور سنت

بطور ماخذ شریعت

اس سے پہلے دو نشستوں میں حدیث اور اس کی تعریف، سنت اور اس کی تعریف، حدیث اور اس کی اہمیت اور سنت اور اس کی ضرورت پر گفتگو کی گئی تھی۔ آج حدیث اور سنت پر اس اعتبار سے گفتگو کرنی ہے کہ یہ شریعت کا ماخذ ہے، قرآن مجید کی شارح ہے، وحی الٰہی کی تعبیر ہے۔ آج کی گفتگو کا مقصد یہ دیکھنا ہے کہ کلام ربانی کو سمجھنے میں اور شریعت کے احکام کی تفصیل بیان کرنے میں سنت اور حدیث کی اہمیت کیا ہے۔

گفتگو کو آگے بڑھانے سے پہلے ایک بنیادی بات ذہن میں رکھنی چاہئے۔ وہ یہ ہے کہ قرآن وسنت میں جو کچھ آیا ہے اس کو اصطلاح میں نصوص کہا جاتا ہے۔ نص کے لغوی معنی تو عبارت یا Text کے آتے ہیں۔ لیکن اصطلاح میں نصوص سے مراد قرآن پاک اور سنت رسول کے Text یا عبارتیں ہیں جو دراصل شریعت کا ماخذ اور مصدر ہیں۔

نصوص کی دو قسمیں ہیں۔ کچھ نصوص وہ ہیں جن کو قطعی الثبوت کہا جاتا ہے۔ یعنی ان کا ثبوت قطعی اور یقینی دلائل کے ساتھ ہمارے سامنے ہو چکا ہے۔ قرآن مجید سارے کا سارا قطعی الثبوت ہے۔ احادیث اور سنت میں بھی خاصا بڑا حصہ قطعی الثبوت ہے۔ مثلاً سب کی سب متواتر احادیث اور سنن ثابتہ قطعی الثبوت ہیں۔ متواتر احادیث کی تفصیل آج کی گفتگو میں آئے گی۔ لیکن کچھ احادیث ہیں جو تواتر کے کسی درجہ تک نہیں پہنچیں وہ قطعی الثبوت نہیں ہیں اور ان کا درجہ قرآن کریم اور سنت متواترہ سے کم ہے۔ اس پر بھی آگے چل کر بات ہوگی۔ گویا کچھ نصوص ہیں جو قطعی

الثبوت ہیں اور کچھ نصوص ہیں جو ظنی الثبوت ہیں۔ جن کے بارے میں ظن غالب یہ ہے کہ یہ شریعت کا نص ہے۔

اسی طرح سے معانی اور مطالب کے اعتبار سے بھی ان نصوص کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ ہے جو قطعی الدلالت ہے۔ جس کے معنی اور مفہوم بالکل قطعی اور حتمی ہیں اور جس میں کسی اختلاف رائے کی یا کسی دوسری تعبیر کی گنجائش نہیں ہے۔ مثلاً قرآن پاک میں ہے فیــــــوا فصلوۃ ، انماز قائم کرو۔ اب ہر شخص جو تھوڑی بہت بھی عربی جانتا ہے اور اسلام کی تعلیم سے تھوڑا سا بھی واقف ہے وہ یہ جانتا اور سمجھتا ہے کہ اقیموا الصلوۃ سے کیا مراد ہے۔ اس میں کسی دو تعبیروں کی گنجائش نہیں ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ کچھ نصوص ایسے ہیں جن میں ایک سے زیادہ تعبیروں کی گنجائش ہے۔ اور یہ گنجائش اللہ اور رسول نے ایک مصلحت سے رکھی ہے۔ جہاں اللہ اور رسول کی حکمت اور منشاء یہ تھا کہ شریعت کے احکام کو ایک سے زیادہ انداز سے سمجھا جائے وہاں انہوں نے ایسا اسلوب اور ایسا طرز بیان اختیار کیا جس میں ایک سے زائد تعبیرات کی گنجائش موجود ہے۔ قرآن مجید میں بہت سے الفاظ ہیں جو مشترک معنی کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ قرآن پاک فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ ترین معیار پر ہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی ایسا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے عربی زبان میں ایک سے زائد معنی ہیں اور وہاں سیاق و سباق میں کوئی ایسا قرینہ بھی نہیں رکھا گیا جس سے ایک معنی متعین ہو سکیں تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ قرآن مجید کی کچھ نصوص کو ایک سے زائد انداز میں سمجھا جائے جن میں ایک دو کی مثالیں میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔

اسی طرح سے حدیث پاک میں بھی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ ترین معیار پر ہیں۔ اس لئے کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام افصح العرب تھے۔ کسی کا یہ تصور کرنا انتہائی بے بنیاد اور مہمل بات ہوگی کہ نعوذ باللہ رسول اللہ ﷺ بات تو واضح کہنا چاہتے تھے لیکن کہہ نہیں سکے۔ واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ جس موقع پر جو بات ارشاد فرمانا چاہتے تھے آپ نے اس موقع پر وہی ارشاد فرمائی اور اس سے جو مفہوم نکلتا ہے وہی مفہوم حضور کا مقصود تھا۔ یہ کہنا بالکل غلط اور بے بنیاد ہے کہ رسول اللہ ﷺ تو کسی خاص حکم سے اپنے ذہن میں ایک خاص مقصد رکھتے تھے۔ لیکن چونکہ لغت کے اعتبار سے اس لفظ کے ایک سے زیادہ مفہوم نکل سکتے تھے

اس لئے لوگوں نے اس کو اس طرح سمجھ لیا جو حضور ﷺ کی منشا کے خلاف تھا۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے۔ جس چیز کو رسول اللہ ﷺ نے دوٹوک اور قطعی انداز میں ارشاد فرمانا چاہا اسے دوٹوک اور قطعی انداز میں ارشاد فرمایا اور جس چیز کے بارے میں حضور کا ارادہ یہ تھا کہ اس کو لوگ اپنے اپنے انداز سے سمجھیں وہ بات حضورؐ نے اس طرح ارشاد فرمائی کہ لوگ اس کو اپنے اپنے انداز سے سمجھے۔

ان دونوں کی ایک ایک مثال میں آپ کو دے دیتا ہوں۔ ایک قرآن پاک سے اور ایک حدیث سے۔ قرآن پاک میں ایک حکم آیا ہے کہ اگر کسی شوہر اور بیوی میں اختلاف ہو جائے اور شوہر بیوی کو طلاق دے دے تو جب تک وہ مطلقہ خاتون عدت میں ہے اس وقت تک اس مطلقہ خاتون کے اخراجات اس کے شوہر کے ذمہ ہوں گے۔ یہ مشہور معاملہ ہے جس کو متعہ الطلاق کہتے ہیں۔ اس موقع پر ارشاد ہوا ہے کہ علی الموسع قدرہ و علی المقتر قدرہ کہ خوشحال اپنی استطاعت کے مطابق اور نادار اپنی استطاعت کے مطابق۔ متاعا بالمعروف اس عورت کو اس زمانے کے معروف طریقے کے مطابق ضروری ساز و سامان دے۔ یہ الفاظ قرآن پاک میں آئے ہیں جن کے قطعی الثبوت ہونے میں کوئی شک نہیں۔ لیکن موسع سے کیا مراد ہے مقتر سے کیا مراد ہے؟ یہ ہر زمانے کے لحاظ سے الگ الگ طے ہو سکتا ہے۔ ایک غریب ماحول میں، ایک فقیر ملک میں دولت مند اور موسع کا مفہوم اور ہوگا اور نادار اور مقتر کا مفہوم الگ ہوگا۔ ایک انتہائی دولت مند ملک میں، مثلاً کویت میں اگر کہا جائے کہ دولت مند اپنی استطاعت کے مطابق دے اور نادار اپنی استطاعت کے مطابق دے۔ تو کویت کے ماحول میں نادار کے معنی اور ہوں گے پاکستان کے ماحول میں نادار کے معنی اور ہوں گے۔ پاکستان سے بھی زیادہ کوئی غریب فقیر ملک ہوگا تو وہاں نادار کے معنی اور ہوں گے۔

ایسا اس لئے رکھا گیا کہ اللہ کی مشیت اور منشا یہ تھا کہ چونکہ ناداری اور دولت مندی اضافی چیزیں ہیں اس لئے ان کو اپنے اپنے زمانے کے لحاظ سے سمجھا جائے اور اپنے اپنے زمانے کے لحاظ سے اس کے معنی متعین کئے جائیں۔ اس کے لئے معروف کی قید بھی لگا دی جس سے یہ بات مزید واضح ہوگئی کہ اس کی بہت سی تعبیریں ممکن ہیں۔ مثال کے طور پر پاکستان کے کسی دیہات میں اگر کسی خاتون کو یہ آزمائش پیش آجائے اور وہ متاع کا مطالبہ کرے تو غالباً یہ کافی ہوگا کہ اس کو رہنے کے لئے مکان دے دیا جائے۔ اس مکان میں ضروری ساز و سامان ہو۔ وہ وقت

کھانے کا انتظام ہو، ناشتہ کا انتظام ہو، کچھ برتن ہوں اور ضروری ساز و سامان ہو۔ شاید اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ ہمارے ہاں یہی معروف ہے۔ جو دولت مند ہوگا وہ پختہ مکان دے دے گا، غریب کچا مکان دے دے گا۔ دولت مند آدمی شاید گھر میں گھوڑا بھی رکھوادے۔ ہوسکتا ہے گاڑی بھی رکھوادے۔ غریب آدمی یہ چیزیں نہیں رکھ سکے گا۔

لیکن اگر یہی واقعہ کسی کے ساتھ یورپ میں پیش آجائے تو وہاں اس کے معنی اور مفہوم کے معنی اور ہوں گے۔ وہاں مطلقہ خاتون یہ مطالبہ کرسکتی ہے کہ گھر مجھے رہنے کے لئے دیا گیا ہے اس میں ریفریجریٹر بھی رکھا ہوا ہو، اس میں سینٹرل ہیٹنگ کا انتظام بھی ہو، اس میں ٹیلیفون کی لائن بھی لگی ہوئی ہو۔ اس لئے کہ یہ چیزیں وہاں ناگزیر ہیں اور ہر آدمی کے پاس ہوتی ہیں۔ وہاں نادار سے نادار آدمی بھی ان چیزوں کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتا۔ لیکن پاکستان میں کوئی نادار خاندان یہ مطالبہ کرے تو شاید وہ حق بجانب نہ ہو۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ شریعت کے احکام میں بعض جگہ اللہ کی حکمت ہی اس بات کی متقاضی رہتی ہے کہ اس کے معنی اور مطلب کو زیادہ سے زیادہ عمومی انداز میں رکھا جائے۔ اور ہر علاقے کے لوگ اپنے حالات کے لحاظ سے، ہر زمانے کے لوگ اپنے ماحول کے لحاظ سے اس کو سمجھ سکیں۔ یہ مثال ہے ظنی الدلالت کی، یعنی جس کے معانی اور دلالات کے مفاہیم ظنی ہیں۔ آپ اپنے ظن غالب، فہم و بصیرت اور قیاس سے شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے اس کے معنی اور مطالب متعین کریں۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے کسی نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ ہم بدوی لوگ ہیں، ریگستان میں سفر کرتے ہیں۔ ریگستان میں سب سے کمیاب چیز پانی ہوتی ہے۔ بعض اوقات ہم گزرتے ہیں، راستے میں کوئی تالاب یا گڑھا نظر آتا ہے، اس میں پانی جمع ہے، وہ کسی پہاڑ کے دامن میں پانی جمع ہے۔ اب ہمیں نہیں معلوم کہ یہ پانی پاک ہے کہ ناپاک ہے۔ اس میں کسی درندے نے منہ تو نہیں ڈالا۔ کسی ناپاک جانور نے اس کو ناپاک تو نہیں کیا تو ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ تو آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا۔ مختلف احادیث میں مختلف الفاظ آئے ہیں۔ ایک حدیث کے الفاظ ہیں الماء الکثیر لا ینجس، کہ زیادہ پانی ناپاک نہیں ہوتا۔ ایک اور جگہ فرمایا کہ الماء الکثیر طهور لا ینجسه شیء، کہ زیادہ پانی پاک ہے کوئی چیز اس کو ناپاک نہیں کرسکتی۔ اب ذرا غور فرمائیے کہ یہ الفاظ کہ زیادہ پانی ناپاک نہیں ہوتا رسول اللہ ﷺ نے واضح

العرب میں۔ آپ کی زبان مبارک سے ادا ہونے والے الفاظ سوچ سمجھ کر نکلے ہیں۔ یہاں آپ نے اصطلاح کی
حکمت تشریع کے پیش نظر ایسے معروف الفاظ استعمال فرمائے جن کی متعدد تعبیریں ممکن ہیں۔ آپ
چاہتے تو مثلاً یہ فرما دیتے کہ پانی اگر پانچ سو رطل (ایک پیمانہ) ہو تو ناپاک نہیں ہوتا۔ لیکن آپ
نے ماء الکثیر کے الفاظ استعمال فرمائے۔ ماء کثیر سے کیا مراد ہے؟ کتنا پانی۔ چھوٹا کنواں، بڑے
تالاب میں ہوتا ہے؟ اتنا پانی جتنا دریائے دجلہ میں ہے؟ یا اتنا پانی جتنا ایک ٹب میں
بھرا ہوتا ہے یا اتنا پانی جو ایک کنویں میں بھرا ہوا ہے؟ ماء الکثیر کے مفہوم میں قولی اعتبار سے یہ سب
شامل ہیں۔

ہمارے شہر کی شاید تمام ماء کثیر کا یہ مفہوم ہو کہ دس لیٹر پانی ہو تو کم سے کم پانی، ماء کثیر ہے۔ اس
لئے اس میں نہ پانچ سو رطل پانی ہے۔ لیکن جو چھوٹے سے بعض علاقوں میں جہاں دس دس میل پانی نہیں ملتا
وہاں کے لوگوں کے نزدیک ایک مشک بھر پانی بھی بہت ہے اور ماء کثیر ہے۔ بعض اور علاقے ایسے
ہوں گے جہاں ایک مٹکا پانی بھی بہت زیادہ سمجھا جاتا ہے۔ ماء کثیر جو اور جو چاہے کہہ لے۔ رسول اللہ ﷺ
نے جان بوجھ کر، سوچ سمجھ کر، حکمت کی وجہ سے یہ بات ارشاد فرمائی کہ ہر علاقے کے لوگ اپنے
حالات کے لحاظ سے اس اصطلاح کے معنی متعین کریں۔ چنانچہ امام ابوحنیفہؒ کے سامنے جب یہ
حدیث اور ماء کثیر کا مسئلہ آیا تو وہ کوفہ میں بیٹھے ہوئے تھے جہاں ایک طرف دریائے دجلہ بہتا
تھا دوسری طرف فرات بہتا تھا۔ تو ان کے ذہن میں ماء کثیر کا جو تصور آیا وہ یہ تھا کہ اتنا بڑا تالاب
کہ اگر کوئی ایک طرف سے ہلائے۔ اگر پانی ہلایا جائے تو اس کی لہر دوسرے کنارے تک نہ پہنچے۔ انہوں
نے ماء کثیر کا یہ مفہوم سمجھا۔ اس کے برعکس امام مالکؒ جو مدینہ منورہ میں تشریف فرما تھے جہاں
صرف دو کنویں تھے اور ان میں بھی ایک یہودی کا تھا۔ آپ نے سنا ہو گا، اس سے تنازع ہوتا تھا
۔ حضرت عثمانؓ نے پھر اس سے خرید کر وقف کر دیا۔ جہاں دو کنویں تھے ایک یہودی کا تھا اور پانی
کی قلت تھی۔ امام مالکؒ نے ایک اور روایت کے الفاظ سے استدلال کرتے ہوئے کہا کہ دو بڑے
بڑے مٹکے جو عرب میں پانی کے لئے رکھتے ہیں وہ اگر پانی سے بھرے ہوئے ہوں تو یہ ماء
کثیر ہے۔ انہوں نے اسی مقدار کو ماء کثیر سمجھا۔ اب آپ دیکھیں دونوں میں بڑا فرق ہے۔ اتنا بڑا
تالاب جس میں کم و بیش دس ہزار مٹکے آجائیں وہ تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک ماء کثیر ہے۔ اس کے
برعکس امام مالکؒ کے نزدیک ماء کثیر وہ ہے جو دو مٹکوں میں آجائے۔ یہ دونوں مسالک اپنی جگہ

مجید کی موجودگی میں کسی اور رہنمائی یا کسی اور ہدایت کی ضرورت نہیں۔ ان کے جواب میں آپ کے سامنے میں نے ایک حدیث بیان کی تھی کہ "الا انی اوتیت القرآن و مثله معه" یاد رکھو مجھے قرآن پاک بھی دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اس جیسی رہنمائی اور بھی دی گئی ہے۔ قرآن پاک کی متعدد آیات سے، جن کی تعداد سینکڑوں میں ہے، ان سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر نزول قرآن کے علاوہ بھی وحی ہوتی تھی جو سنت اور حدیث کی رہنمائی کی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔

کل میں نے اس آیت کا بھی حوالہ دیا تھا جس میں رسول اللہ ﷺ کے چار فرائض کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یتلوا علیهم آیاته و یزکیهم و یعلمهم الکتاب و الحکمة۔ یہ جو آخری تین فرائض ہیں یہ تلاوت کتاب سے ہٹ کر ہیں۔ تلاوت آیات سے مختلف چیزیں ہیں۔ تلاوت آیات تو قرآن پاک کا بیان کر دینا ہوا۔ پھر یعلمهم الکتاب و الحکمة و یزکیهم یہ تین کام ہیں، ان کا طریقہ کار کیا تھا۔ اس کے لئے رسول اللہ ﷺ جو ہدایات یا رہنمائی فرمایا کرتے تھے وہ رہنمائی کیا تھی؟ وہ رہنمائی سنت کی شکل میں آج ہمارے سامنے ہے۔

خود قرآن مجید میں تین چار مقامات پر قرآن کی تبیین کا فریضہ رسول اللہ ﷺ کے سپرد کیا گیا ہے۔ لتبین للناس ما نزل الیهم۔ تا کہ آپ وہ تمام چیزیں ان کے لئے بیان کر دیں جو ان کے لئے نازل کی گئی ہیں۔ یعنی قرآن پاک کی آیات اور مطالب کا بیان کریں۔ بیان سے مراد محض تلاوت آیات نہیں ہے، بلکہ بیان کرنے سے مراد یہ ہے کہ اس کے معانی و مطالب کو بیان کر دیا جائے۔ اس کے مقاصد کی تشریح کی جائے۔ اس میں جو بات پنہاں ہے اس کو روز روشن کی طرح واضح کر دیا جائے۔ اس میں جہاں جہاں انسانی ذہن کی نارسائی کی وجہ سے الجھاؤ کا امکان پیدا ہوسکتا ہے اس امکانی الجھاؤ کو دور کیا جائے۔ جہاں جہاں غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے، اس غلط فہمی کے راستوں کو بند کر دیا جائے۔ یہ ساری چیزیں بیان و تبیین میں شامل ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے جو بیان جاری ہوتا تھا، علماء اسلام نے اس کی قسمیں بیان کی ہیں۔ ان میں سے بعض اقسام کا ذکر میں آج کی گفتگو میں کرتا ہوں۔ ایک مشہور صحابی ہیں حضرت عمران بن حصینؓ۔ وہ ایک مرتبہ اپنے حلقہ درس میں کچھ سوال بیان فرما رہے تھے۔ اس زمانے میں خوارج میں سے بعض جاہل اور انتہا پسند لوگ اس طرح کی باتیں کیا کرتے

تھے جیسے آج کل کے منکرین حدیث کرتے ہیں۔ ان میں سے کوئی خارجی باہر سے آیا ہوا تھا۔ اس نے آکے کہا کہ "لا تحدثونا الا بالقرآن" آپ ہمیں احادیث نہ سنائیں صرف قرآن پاک کی باتیں بتائیں۔ حضرت عمران بن حصینؓ نے قدرے ناگواری سے فرمایا کہ میں قرآن ہی کی باتیں بیان کر رہا ہوں۔ قرآن میں اگر نماز کا حکم ہے تو تمہیں کہاں سے پتہ چلے گا کہ ظہر کی رکعتیں چار ہیں، عصر کی چار ہیں اور مغرب کی تین ہیں۔ یہ اگر میں سنت سے نکال کر بیان کروں گا تو تمہیں وہاں سے معلوم ہوگا۔ سنت سے بیان کروں گا تو یہ قرآن ہی کا بیان ہے۔ یہ قرآن ہی کا حصہ ہے قرآن سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ "خذوا عنا" آج یہ ساری معلومات ہم سے لے لو، اگر تم نہیں لو گے تو پھر تمہارے اندر بڑا اختلاف پیدا ہوگا اور تم ایسے معاملات اور مسائل میں الجھ جاؤ گے جن سے نکلنے کا تمہارے سامنے کوئی راستہ نہیں ہوگا۔

وحی کی اقسام

آگے چلنے سے پہلے ایک اور چیز ذہن میں رکھیں، وہ سنت کی ایک خاص قسم ہے۔ حدیث کی بقیہ اقسام پر تو تفصیل سے کل بات ہوگی لیکن ایک قسم ایسی ہے جس پر آج بات کرنا ضروری ہے۔ ہم نے یہ دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ پر وحی دو طریقوں سے آتی تھی۔ ایک وہ وحی ہوتی تھی جو وحی جلی کہلاتی ہے۔ یعنی جس کے الفاظ، جس کی عبارت، جس کے کلمات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے تھے اور جس میں رسول اللہ ﷺ کا کوئی دخل نہیں تھا۔ یہ وہ وحی تھی جس کے الفاظ اور کلمات معجز ہیں، جن کا اسلوب، جن کا معیار، جن کی فصاحت و بلاغت معجزہ کی سطح تک پہنچی ہوئی ہے۔ یہ وحی قرآن مجید کہلاتی ہے۔

اس کے علاوہ جو وحی آتی تھی وہ متعین الفاظ میں نہیں ہوتی تھی وہ سنت ہے۔ جس کے صرف معنی اور مفاہیم حضورؐ تک منتقل ہوتے۔ یہ وحی بعض اوقات جبریل امینؑ کے ذریعے سے نازل ہوتی۔ بعض اوقات کسی اور ذریعے سے بھی نازل ہوتی۔ حضورؐ نے خواب میں کوئی چیز دیکھی، یا اللہ نے دل میں کوئی چیز ڈال دی۔ سنت حضورؐ تک پہنچنے کے لئے وحی کی رہنمائی کے کئی طریقے تھے، جس میں وہ طریقے بھی شامل تھے جس طریقے پر قرآن مجید نازل ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی کئی طریقے شامل تھے۔ بہرحال وحی خفی کہلاتی ہے جس کو آپ انگریزی میں Tacit Revelation کہہ

سکتے ہیں۔ دوسری Express Revelation یا وحی جلی ہے۔ جو اپنے الفاظ کے ساتھ نازل ہوتی تھی۔ وحی خفی صرف معانی اور پیغام پر مشتمل ہوتی تھی جس میں الفاظ اللہ کی طرف سے نہیں ہوتے تھے بلکہ معانی حضورؐ پر نازل فرمائے گئے اور حضورؐ نے اپنے الفاظ میں ان کو بیان فرمایا۔

اس دوسری وحی یعنی وحی خفی میں ایک خاص قسم وہ ہے جو باقی تمام اقسام سے منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ تعداد میں بھی تھوڑی ہے، لیکن اس کا ایک خصوصی مقام ہے جس کی وجہ سے اس کو حدیث قدسی کہا گیا ہے۔ وہ دراصل اللہ تعالیٰ ہی کا کلام ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے ادا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ یا تو صیغہ واحد متکلم یا جمع متکلم میں ارشاد فرماتے ہیں لیکن بیان کرنے والے رسول اللہ ﷺ ہیں۔ اس کے الفاظ چونکہ رسول اللہ ﷺ کے ہیں اس لئے یہ وحی قرآن مجید میں شامل نہیں ہے، اس کی تلاوت نہیں ہوتی، وہ قرآن مجید میں نہیں لکھی جاتی۔ لیکن وہ اللہ کا کلام ہے۔ مثال کے طور پر صحیح بخاری میں ہے [illegible] میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرے سے قربت حاصل کرتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ جب وہ میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے تو میں ایک باع (اس فاصلے کو جو دونوں بازوؤں کو پوری طرح پھیلانے کے وقت ہاتھوں کی انگلیوں کے آخری سروں کے درمیان ہوتا ہے، اس کو عربی زبان میں باع کہتے ہیں، آپ کہہ سکتے ہیں کہ دو گز کا فاصلہ) اس کی طرف بڑھتا ہوں۔ جب وہ میری طرف آہستہ چلتا ہے تو میں لپک کے اس کی طرف چلتا ہوں۔ جو لپک کر میری طرف آتا ہے تو میں دوڑ کر اس کی طرف آتا ہوں۔ یہ ارشاد باری اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضورؐ نے صیغہ واحد متکلم میں ارشاد فرمایا۔ یہ حدیث حدیث قدسی کہلاتی ہے۔

احادیث قدسیہ کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ کل احادیث کی تعداد اگر پچاس ہزار ہو، جیسا کہ بعض لوگوں کا اندازہ ہے یا تیس ہزار ہو جیسا کہ کچھ اور لوگوں کا اندازہ ہے۔ تو ان میں سے چند سو احادیث ہیں جو احادیث قدسیہ کہلاتی ہیں۔ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ ان کی تعداد تین سو کے لگ بھگ ہے۔ احادیث قدسیہ کے مجموعے الگ سے بھی شائع ہوئے ہیں۔ تقریباً ایک درجن مجموعے ہیں جن میں احادیث قدسیہ الگ سے شائع کر دی گئی ہیں۔ ایک مجموعہ میں ایک سو کے قریب احادیث ہیں، ایک دوسرے مجموعہ میں دو سو بیس احادیث ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تعداد تین سو کے لگ بھگ ہے۔ یہ تین سو احادیث ایک طرف سے قرآن مجید سے ملتی جلتی

حرف ہے، لام الگ حرف ہے، میم الگ حرف ہے۔ یہ خصوصیت صرف قرآن پاک کی ہے جو
حدیث قدسی کو حاصل نہیں ہے۔ حدیث قدسی آپ پڑھیں تو اس میں اتنا اجر نہیں ہے جو قرآن
پاک کی تلاوت میں ہے۔

ساتواں بڑا فرق یہ ہے کہ قرآن پاک وحی جلی ہے اور حدیث قدسی وحی خفی ہے۔
آٹھواں فرق یہ ہے کہ قرآن پاک روح الامین جبرئیل لے کر نازل ہوتے تھے۔ جبکہ حدیث قدسی
کسی بھی طریقے سے آسکتی تھی۔ نواں فرق یہ ہے کہ قرآن وحی متلو ہے جس کی تلاوت ہوتی ہے۔
حدیث قدسی وحی متلو نہیں ہے۔ اس کی تلاوت نہیں ہوتی۔ دسواں فرق یہ ہے کہ قرآن مجید کے
الفاظ متواتر ہیں۔ ضروری نہیں کہ حدیث قدسی بھی متواتر ہو۔ اگرچہ ایک دو قدسی حدیثیں ایسی ہیں
جو کہ متواتر بھی ہیں، لیکن اکثر احادیث قدسیہ متواتر نہیں ہیں۔ گیارہواں فرق یہ ہے کہ قرآن پاک
مصاحف میں لکھا ہوا ہے اور یکجا موجود ہے۔ احادیث قدسیہ مصاحف میں نہیں ہیں اور کسی ایک
سرکاری یا باضابطہ مجموعہ میں یکجا موجود نہیں ہیں۔

احادیث اور سنت کا جو ذخیرہ ہمارے پاس موجود ہے یہ درجنوں نہیں بلکہ سینکڑوں
کتابوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتابیں جو آج کتب حدیث کی ہمارے پاس موجود ہیں ان کی دو قسمیں
ہیں۔ ان کی ترتیب اور تدوین کیسے ہوئی اس پر بعد میں بات ہوگی۔ لیکن اس وقت جو ذخیرہ جیسا کہ
موجود ہے اسی پر بات کریں گے۔ اگر ہم کسی بھی لائبریری میں جائیں تو وہاں جو کتابیں حدیث کی
موجود ہیں وہ دو طرح کی ہیں۔ کچھ کتابیں تو وہ ہیں جو حدیث کی اصلی اور بنیادی کتابیں کہلاتی
ہیں۔ اصلی اور بنیادی کتابیں وہ ہیں جن کو ان کتابوں کے مؤلف ائمہ کرام اور جلیل القدر مرتبین نے
براہ راست روایت کر کے مرتب کیا ہے۔ دوسری کتابیں وہ ہیں جن کی تعداد زیادہ ہے جو محدثین
نے براہ راست روایت کر کے مرتب نہیں کیں بلکہ دوسرے مجموعے سامنے رکھ کر ان مجموعوں سے
احادیث کا انتخاب کر کے ان کو دوبارہ مرتب کیا ہے۔

آخری کتاب جو براہ راست روایت کر کے مرتب ہوئی ہے وہ امام بیہقی کی سنن
الکبریٰ ہے۔ امام بیہقی اس اعتبار سے سب سے بڑے اور غالباً آخری محدث ہیں کہ ان کی کتاب آخری
کتاب ہے جو براہ راست روایت کر کے مرتب کی گئی ہے۔ ان کے بعد براہ راست حدیث
روایت کر کے مرتب کرنے والے دنیا سے ختم ہو گئے

درجے ہوں اصل حقیقت کے اعتبار سے ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے تین درجے قرار دیے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ درجہ اول میں وہ کتابیں شامل ہیں جن میں تمام احادیث صحیح ہیں، مستند ہیں۔ کوئی ایک حدیث بھی ان میں ایسی نہیں ہے جو صحت کے اعلیٰ ترین معیار سے کم ہو۔ اس درجہ کی کتابوں میں صرف مستند و صحیح احادیث شامل ہیں۔ وہ تقریباً تمام محدثین کے نزدیک اتفاق رائے سے تین کتابیں ہیں۔ 'تقریباً' کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا کہ شاید ایک آدھ کا کوئی جزوی اختلاف ہوگا۔

احادیث کی یہ تین کتابیں صحت کے اعلیٰ ترین درجہ پر فائز ہیں۔ موطا امام مالک، جس کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اصح الکتاب بعد کتاب اللہ ہے۔ کتاب اللہ کے بعد صحیح ترین کتاب بعض لوگوں کے خیال میں موطا امام مالک ہے۔ امام شافعی کی بھی یہی رائے ہے۔ امام شافعی جو بہت بڑے محدث بھی ہیں اور بہت بڑے فقیہ بھی ہیں، وہ موطا امام مالک کو اصح الکتاب بعد کتاب اللہ قرار دیتے ہیں۔ موطا امام مالک کے بعد صحیح بخاری کا درجہ ہے۔ جو مسلمانوں کی غالب ترین اکثریت کی نظر میں اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے۔ اللہ کی کتاب کے بعد صحیح ترین کتاب دنیائے اسلام میں صحیح بخاری ہے۔ تیسرا درجہ صحیح مسلم کا ہے جو بعض اہل مغرب کے نزدیک اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے۔ اہل مغرب سے مراد یورپ یا امریکہ والے نہیں ہیں، بلکہ اسلامی اصطلاح میں اہل مغرب سے مراد سپین، اندلس، مراکش، الجزائر اور تیونس کے علاقے ہیں۔ یہ مغاربہ یا اہل مغرب کہلاتے تھے۔ یہ پورا علاقہ دنیائے اسلام کے انتہائی مغرب میں تھا، اس لئے وہاں کے لوگوں کی رائے بیان کرنا ہو تو مغاربہ یا اہل مغرب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ تو بعض اہل مغرب کی رائے ہے کہ صحیح مسلم اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے۔

یہ بحث ہمیشہ مسلمانوں میں چلتی رہی کہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ ان تینوں میں سے کون سی کتاب ہے۔ جو حضرات موطا امام مالک کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ قرار دیتے ہیں ان کا کہنا یہ ہے کہ موطا امام مالک میں جتنی احادیث آئی ہیں وہ ساری کی ساری مستند ترین اور صحیح ترین احادیث ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ امام مالک ان تمام محدثین میں، جن کی کتابیں آج ہمارے سامنے ہیں اور مشہور و معروف ہیں اور جو اہم ترین مجموعہ حدیث کے مرتب ہیں، امام مالک سب سے زیادہ قریب رسول اللہ ﷺ کے زمانہ مبارک سے معروف صاحب تصنیف محدثین میں سے کسی دور

محدث کو حاصل نہیں تھی۔ علم حدیث میں ایک خاص اہتمام یہ کیا جاتا تھا کہ سند حتی الامکان چھوٹی سے چھوٹی ہو، یعنی راویوں کا بیان رسول اللہ ﷺ تک جتنا کم ہو اتنا اچھا ہے۔ ان میں اعلیٰ ترین سند وہ سمجھی جاتی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ تک کم سے کم واسطے ہوں۔ اور جتنے زیادہ واسطے ہوں اتنا ہی سند نازل مانی جاتی تھی۔ سند عالی یعنی اونچی سند وہ سمجھی جاتی تھی جس میں کم واسطے ہوں۔ اس کے مقابلہ میں سند نازل وہ ہوتی تھی جس میں زیادہ واسطے ہوں۔ امام مالکؒ کی جتنی سندیں ہیں وہ باقی سب محدثین کے مقابلہ میں عالی سندیں ہیں۔ ثلاثیات کتب حدیث میں انتہائی اعزاز کی بات سمجھی جاتی ہے۔ کتب حدیث میں ثلاثیات سے مراد وہ احادیث ہیں کہ جن کے مرتب کرنے والے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان صرف تین واسطے ہوں۔ تین سے زیادہ نہ ہوں۔ امام مالکؒ کی بیشتر سندیں ثلاثی ہیں اور کچھ سندیں ثنائی بھی ہیں جن میں صرف دو واسطے ہیں۔ ایک امام مالکؒ کے استاد اور ایک صحابی۔ چنانچہ امام مالکؒ کی موطا میں بہت سی احادیث ملیں گی مالک عن نافع عن ابن عمر۔ امام مالکؒ اپنے استاد نافع سے روایت کرتے ہیں، امام نافع اپنے استاد عبداللہ بن عمرؓ سے اور وہ رسول اللہ ﷺ سے۔ لہٰذا اس علو اسناد کی رو سے امام مالکؒ کی کتاب رسول اللہ ﷺ سے دور میں سب سے اقرب ترین کتاب ہے اور وہ اس لئے اصح یعنی صحیح ترین قرار دیئے جانے کی مستحق ہے۔

جمہور امت کی غالب ترین اکثریت کی رائے یہ ہے کہ صحیح بخاری اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے۔ صحیح بخاری اصح الکتب بعد کتاب اللہ جن اسباب کی وجہ سے ہے ان اسباب پر ابھی گفتگو کرتے ہیں۔ لیکن ایک بات ذہن میں رہے کہ موطا امام مالکؒ کی جتنی صحیح احادیث ہیں وہ ساری کی ساری نہیں تو ان کا بیشتر حصہ صحیح بخاری میں شامل ہو گیا ہے۔ اس لئے جب صحیح بخاری کو اصح الکتب کہا جائے گا تو موطا امام مالکؒ کی صحیح روایات خود بخود اصح الکتب بن گئیں۔ ایک دوسری وجہ موطا امام مالکؒ کو اصح الکتب قرار نہ دینے کی یہ بھی ہے کہ امام مالکؒ جب اپنی کتاب موطا تحریر فرما رہے تھے تو ان کا مقصد صرف اور صرف احادیث کا مجموعہ مرتب کرنا نہیں تھا بلکہ حدیث اور فقہ اور صحابہ اور تابعین کی سنت کو یکجا کرنا مقصود تھا۔ لہٰذا امام مالکؒ کی کتاب میں جہاں احادیث ہیں وہاں صحابہ کے اقوال بھی ہیں اور تابعین کے ارشادات اور آثار بھی ہیں اور اس موضوع پر امام مالکؒ کا اپنا مشاہدہ بھی شامل ہے کہ مدینہ منورہ کا عام طریقہ کیا تھا۔ تو گویا یہ ایک اصل کتاب ہے

جس کا میدان یا دائرہ کار کتب حدیث سے ذرا مختلف اور بڑھ کر ہے۔ یہ خالص حدیث کی کتاب ان معنوں میں نہیں ہے جن معنوں میں حدیث کی اور کتابیں ہیں۔ اس میں احادیث کے علاوہ بھی بہت سے مباحث ہیں۔ امام مالکؒ کے اپنے فتاویٰ بھی اس میں ہیں۔ بعض جگہوں پر امام مالک کے اپنے ارشادات بھی اس میں بیان ہوئے ہیں۔ تو گویا یہ فقہ اور حدیث دونوں کتابوں کا مجموعہ ہے۔ خالص حدیث کی کتابوں میں صحیح ترین کتاب صحیح بخاری ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک صحیح ترین کتاب صحیح مسلم ہے۔ بہرحال یہ تین کتابیں طبقہ اول کی کتابیں ہیں۔

طبقہ دوم کی کتابیں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی نظر میں چار ہیں۔ جامع ترمذی، سنن ابو داؤد، سنن نسائی اور مسند امام احمد۔ طبقہ دوم کی کتابیں وہ ہیں کہ جن کی بیشتر احادیث صحیح احادیث ہیں۔ اکثر و بیشتر احادیث سند کے اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔ کچھ احادیث ہیں جو صحت کے معیار سے ذرا کم ہیں۔ ان معیارات کا ابھی تذکرہ کرتے ہیں۔ اور بہت تھوڑی احادیث ہیں جو ضعیف ہیں یا جن کا ضعف بہت نچلے درجے کا ہے۔ ضعیف ہیں تو معمولی درجہ کا ضعف ہے اور زیادہ سنجیدہ انداز کا ضعف نہیں ہے۔ یہ درجہ دوم کی احادیث ہیں۔

درجہ دوم کی احادیث میں جو بنیادی خصائص ہیں وہ یہ ہیں کہ اگرچہ یہ صحیحین یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے درجہ تک تو نہیں پہنچتیں لیکن ان میں شامل بیشتر احادیث صحیح احادیث ہیں۔ ان کتابوں کے مصنفین اور مرتبین نے احادیث میں اپنے لئے جو شرائط مقرر کی ہیں اور جو معیار انتخاب انہوں نے حدیث کا رکھا اس میں انہوں نے کسی تساہل سے کام نہیں لیا۔ بلکہ اکثر و بیشتر اونچا معیار اپنے سامنے رکھا۔ پھر یہ احادیث جو ان چار کتابوں میں آئی ہیں یعنی ترمذی، ابوداؤد، امام احمد اور نسائی۔ ان احادیث کو امت میں قبول عام حاصل ہوا۔ ایک عام مقبولیت ان احادیث کو حاصل ہوگئی اور محدثین اور فقہا کا ایک اصول یہ ہے (محدثین اس سے اتفاق کم کرتے ہیں فقہا زیادہ کرتے ہیں۔) فقہا یہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی حدیث روایت کے اعتبار سے ذرا کمزور بھی ہو لیکن اس کو تلقی بالقبول حاصل ہو تو وہ حدیث قابل قبول ہے۔ تلقی بالقبول ایک اصطلاح ہے جس کا مطلب ہے امت کے عام اہل علم نے اس کو قبول کیا ہو اور اس پر عمل درآمد کرتے ہوں، وہ حدیث صحیح کی نشانی ہے۔ ورنہ اگر اس میں کوئی کمزوری ہوتی تو امت عام طور پر اس کو قبول نہ کرتی۔ تلقی بالقبول خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ حدیث اونچے درجہ کی حدیث ہے۔ تو یہ چاروں کتابیں وہ

ہیں جن میں درج احادیث کو تلقی بالقبول حاصل ہوئی۔

ان میں احکام شریعت کے تمام بنیادی اصول پائے جاتے ہیں۔ شریعت کے جتنے احکام احادیث میں آئے ہیں۔ وہ ساری احادیث بڑی تعداد میں، شاید ننانوے فیصد کے قریب ان کتابوں میں موجود ہیں۔ چنانچہ لوگوں نے لکھا ہے کہ سنن ابوداؤد میں احادیث احکام کا اتنا بڑا مجموعہ ہے کہ اگر کسی کے پاس یہ کتاب ہو تو گویا اس کے گھر میں ایک نبی موجود ہے۔ کسی سابقہ مصنف نے لکھا ہے کہ سنن ابوداؤد کی گھر میں موجودگی گویا گھر میں ایک بولتے نبی کی موجودگی ہے کہ نبی کے ارشادات ہر وقت آپ کے سامنے رہیں گے۔ اور احکام آپ کو معلوم ہوتے رہیں گے۔

ان کتابوں کے علاوہ احادیث کی جو بقیہ کتابیں ہیں وہ حضرت شاہ ولی اللہ کے نزدیک تیسرے اور آخری درجہ میں آتی ہیں۔ یہ وہ کتابیں ہیں جن میں ضعیف احادیث بڑی تعداد میں پائی جاتی ہیں۔ یہ وہ کتابیں ہیں جن کی سندوں میں بعض ایسے راوی آئے ہیں جو مجہول الحال ہیں، جن کی کیفیت معلوم نہیں کہ وہ مستند تھے کہ غیر مستند تھے۔ اس لئے ان احادیث پر صرف وہ لوگ اعتماد کر سکتے ہیں جو علم حدیث کے متخصص ہوں اور فن روایت اور علم رجال میں محقق ہوں۔ علم حدیث پر اچھی نظر رکھنے والے بھی ان احادیث میں کمزور یا غیر کمزور کو متعین کرنا بڑا دشوار ہے۔ عام آدمی کے لئے ان کتابوں سے استفادہ کرنا بڑا دشوار ہے۔ اس لئے ان احادیث سے غیر متخصص کو براہ راست استفادہ نہیں کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ بہت سی غلط چیزیں ہوں گی، مکرر چیزیں ہوں گی تو عام آدمی الجھ کر رہ جائے گا اور پریشان ہوگا۔ لہٰذا صرف اہل علم کو ان کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

شاہ ولی اللہ کے علاوہ بعض لوگ اس تیسری کیٹیگری کی دو قسمیں کرتے ہیں۔ ایک کیٹیگری تو وہ ہے کہ جس میں نسبتاً قابل اعتماد چیزیں موجود ہیں۔ مثلاً سنن دارقطنی، مصنف ابن ابی شیبہ، مصنف عبدالرزاق، سنن دارمی۔ یہ وہ ہیں کہ جن میں تھوڑی بہت کچی اور غیر مستند چیزیں مل جاتی ہیں۔

اس کے بعد چوتھا درجہ ان کتابوں کا ہے جن میں بالکل قصے کہانیاں اور ادھر ادھر کی باتیں ہیں۔ جن کا کوئی پس منظر اور دلیل نہیں ہے۔ جن کے پیچھے کوئی مضبوط سند نہیں ہے۔ وہ قصے کہانیوں کے انداز میں بیان ہوتی ہیں۔ مثلاً دیلمی ایک مشہور محدث ہیں، ان کا آپ نے نام سنا ہوگا، ان کی کتاب مسند دیلمی ہے، اسی طرح ابن مردویہ کی کتاب ہے۔ اسی طرح کے قصے کہانیوں کی بے شمار کتابیں ہیں۔ جن کا کوئی علمی مقام نہیں ہے اس لئے ان کو بالکل نظر انداز کر دینا

چاہئے۔ اس میں اگر کوئی صحیح چیز آ گئی ہے تو وہ محض اتفاق ہے ورنہ اکثر و بیشتر وہ قصے کہانیوں سے عبارت ہے۔

یہ جو پچھلے دو درجے ہیں جن میں پہلا درجہ تین بنیادی کتابوں کا اور دوسرا درجہ چار بنیادی کتابوں کا ہے۔ یہ جو چھ کتابیں ہیں یہ سات کہہ لیں کیونکہ موطا امام مالک کی ساری احادیث صحیح بخاری میں اور صحیح مسلم میں آ گئی ہیں اس لئے اس کو نکال دیتے ہیں۔ جو بقیہ چھ کتابیں ہیں یہ صحت کے اعلیٰ ترین معیار پر فائز ہیں۔ ان کتابوں کو صحاح ستہ کہا جاتا ہے۔ مسند امام احمد کی بجائے اس میں اکثر لوگ سنن ابن ماجہ کو شامل کرتے ہیں۔ بعض لوگ مسند دارمی کو شامل کرتے ہیں، بعض ابن ماجہ کو، لیکن بیشتر لوگ ابن ماجہ کو شامل کرتے ہیں۔ سنن ابن ماجہ کے ساتھ یہ چھ کتابیں ہیں جو کتب ستہ یا صحاح ستہ کہلاتی ہیں۔

اگر حدیث کی کسی کتاب میں کسی پہ الفاظ بیان ہوں کہ رواہ الستہ یعنی اس کو چھوں نے روایت کیا ہے تو وہ استناد کے اعلیٰ ترین معیار پر ہے۔ یعنی صحیح ترین حدیث جس کو چھ کے چھ بڑے محدثین نے بیان کیا ہو۔ وہ بلند ترین معیار کی کتاب ہو گی۔

کتب حدیث کی خصوصیات

ان میں سے ہر کتاب کے کچھ الگ الگ خصائص ہیں۔ امام بخاری کی کتاب کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ جو شخص امام بخاری کی کتاب کو غور و خوض سے پڑھ لے، اس میں ایک تفقہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس حدیث کے گہرے معانی اور حدیث میں پوشیدہ اور پنہاں اندرونی عبرتوں تک اس کی رسائی ہو جاتی ہے۔ یہ امام بخاری کی کتاب کی بنیادی خصوصیت ہے۔ امام بخاری نے احادیث کے ساتھ ساتھ مختلف حضرات کے بعض اقوال بھی بیان کئے ہیں۔ صحابہ کرام کے اقوال، تابعین کے اقوال، بعض اہل علم کے قول، جن کو بطور حدیث کے وہ نہیں لاتے، بطور حدیث کے نہیں بیان کرتے، بلکہ کسی چیز کے ثبوت یا تائید کے طور پر بیان کرتے ہیں کہ فلاں نے یہ کہا ہے۔ ان کو تعلیقات کہتے ہیں۔ امام بخاری کے ہاں تعلیقات کی تعداد چند سو ہے۔ تین سو سے زائد تعلیقات ہیں جو امام بخاری کی اصل کتاب کے متن کا حصہ نہیں ہیں۔ لیکن جب آپ ان کو شروع کرتے ہیں تو صاف دہ بات معلوم ہوتی ہے کہ فلاں شخص نے یہ کہا ہے جس سے اندازہ

سے آگے عرب، عراق، بغداد وغیرہ میں تشریف لے گئے اور وہاں انہوں نے اپنی یہ عظیم کتاب مرتب فرمائی۔ لہٰذا ہم اہل پاکستان صحاح ستہ کے مصنفین میں سے ایک مصنف یعنی امام ابوداؤد کے ہم وطن ہیں۔

امام نسائی کی کتاب کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے حدیث کے متن اور رسول اللہ ﷺ کے الفاظ مبارک کی صحت کا بڑا اہتمام کیا ہے۔ احادیث کے متن کو نقل کرنے میں کبھی کبھی اختلافِ روایات ہیں۔ ایک صحابی نے ایک طرح سے نقل کیا ہے، دوسرے صحابی نے دوسری طرح نقل کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وہ بات دو مرتبہ ارشاد فرمائی ہو۔ اور دو مرتبہ مختلف الفاظ میں ارشاد فرمائی ہو۔ ہو سکتا ہے ایک ہی مرتبہ ارشاد فرمائی ہو لیکن ان دونوں سننے والے صحابہ کا لہجہ الگ الگ ہو اور سننے والے نے اپنے لہجے میں بیان کر دیا ہو۔ دونوں چیزوں کا امکان ہے۔ اب ان حالات میں یہ تعین کرنا کہ رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے کون سا لہجہ نکلا تھا، یہ خاصی محنت اور تحقیق کا کام ہے۔ امام نسائی نے یہ کاوش کی ہے کہ صحت متن کا اہتمام کریں اور اس بات کو یقینی بنائیں کہ متن زیادہ سے زیادہ رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلنے والے الفاظ کے مطابق ہو۔ اسی لئے سنن پر جتنی کتابیں ہیں ان میں ضعیف احادیث کی سب سے کم تعداد سنن نسائی میں ہے۔ یہ نسائی نون کے زبر کے ساتھ ہے نسائی۔ اس کا نساء یعنی عورتوں سے کوئی تعلق نہیں۔ نسا وسط ایشیا میں کوئی شہر تھا جو آج کل غالباً ترکمانستان میں ہے۔ وہاں سے ان کا تعلق تھا۔ نسا سے نسبت ہے نسائی۔

سنن ابن ماجہ جو اکثر لوگوں کے خیال میں صحاح ستہ کی آخری کتاب ہے۔ اس کی ترتیب بڑی اچھی ہے۔ پہلے کون سی احادیث ہوں، پھر کون سی ہوں، پھر کون سا باب ہو، پھر بڑے ابواب میں ذیلی ابواب کی تقسیم ہے، پھر چھوٹے ابواب میں انفرادی موضوعات کی تقسیم ہے۔ اس حوالہ سے کسی محدث نے سب سے زیادہ مفید اور حسین ترتیب اختیار فرمائی تو وہ امام ابن ماجہ نے اختیار فرمائی۔ ابن ماجہ کی کتاب حسن ترتیب اور حسن تبویب کے اعتبار سے بہت عمدہ اور واضح انداز کی مانی جاتی ہے۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم، یہ دونوں صحیحین کہلاتی ہیں۔ یعنی دو صحیح کتابیں۔ جب صحیحین کا لفظ استعمال کیا جائے گا تو بخاری اور مسلم مراد ہوں گے۔ شیخین کا لفظ بولا جائے گا تو بھی بخاری و

کرتے اس لئے مشکل ہے۔

البتہ مسلم کے ہاں ساری احادیث یکجا مل جاتی ہیں۔ مثلاً امام مسلم جب ایمان پر بات کریں گے تو وہاں ایمان سے متعلق ساری احادیث یکجا مل جائیں گی۔ جہاں علم کی بات ہوگی وہاں علم سے متعلق ساری احادیث یکجا ہوں گی۔ جہاں نفاق سے متعلق بات ہوگی وہاں نفاق سے متعلق ساری احادیث یکجا ہوں گی۔ یہ فرق اور موازنہ ہے امام بخاری اور امام مسلم کی کتابوں کے درمیان۔

ایک چھوٹا سا فرق اور بھی ہے۔ بلکہ ایک اعتبار سے یہ ایک بڑا فرق ہے۔ وہ یہ کہ امام بخاری نے ضبط الفاظ پر نسبتاً کم زور دیا ہے۔ یعنی رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے الفاظ کیا تھے۔ جن راویوں نے حدیث کو بیان کیا ہے ان میں اگر کوئی Variation یا متن کا اختلاف ہے تو وہ کیا ہے، اس پر امام بخاری نے زیادہ زور نہیں دیا ہے۔ جبکہ امام مسلم نے اس پر بہت زور دیا ہے۔ مثال کے طور پر امام مسلم جب حدیث بیان کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ حدثنا حماد حدثنا عبداللہ واللفظ لعبداللہ کہ مجھ سے یہ حدیث حماد نے بھی بیان کی، یہ حدیث عبداللہ نے بھی بیان کی مثلاً عبداللہ بن مبارک نے۔ اور یہ الفاظ جو میں بیان کر رہا ہوں یہ عبداللہ بن مبارک کے ہیں۔ اس سے گویا اشارہ یہ دینا مقصود ہے کہ حماد نے بھی یہ حدیث بیان کی ہے۔ لیکن تھوڑے سے لفظی فرق کے ساتھ۔ دونوں روایات جب سامنے آئیں گی تو آپ کو اس فرق کا اندازہ ہو جائے گا۔ امام بخاری جب حدیث بیان کرتے ہیں تو یہ تعین نہیں ہوتا کہ آیا دونوں راویوں نے ایک جیسے سنے تھے یا دونوں کے الفاظ الگ الگ تھے۔ الگ الگ تھے تو یہ الفاظ کس راوی کے ہیں۔ یہ آپ کو امام بخاری کے ہاں نہیں ملتا۔ یہ چیز امام مسلم کے ہاں زیادہ تفصیل کے ساتھ ملتی ہے۔

دوسرا بڑا فرق یہ ہے جو اس پر تفصیل سے آگے بات کریں گے لیکن دونوں میں فرق کی بات چل رہی ہے اس لئے ضمناً اس کا ذکر کر دینا ضروری ہے) کہ بالکل ابتدائی دور میں، یعنی صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے دور میں اکثر و بیشتر لوگ بلکہ سو فیصد لوگ جنہوں نے کام کیا، سچے، دیندار، تقویٰ رکھنے والے اور خوف خدا سے سرشار ہوتے تھے۔ ان میں سے کسی کے بارے میں یہ شبہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ بیان کرنے میں کوئی کوتاہی کرے گا۔ لیکن بعد میں ایسے لوگ بھی میدان میں آگئے جن کے بارے میں یہ محسوس کیا گیا کہ شاید یہ پوری ذمہ داری سے کام نہیں۔

چونکہ محدثین کی معاشرے میں بہت عزت ہوتی تھی، لوگوں نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کا احترام بادشاہوں سے بھی زیادہ ہونے لگا تو بہت سے ایسے لوگ بھی میدان میں آگئے کہ جن کا مقصد دنیاوی عزت تھا یا کم از کم جزوی طور پر وہ دنیاوی عزت میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ جوں جوں ایسے لوگوں میں اضافہ ہوتا گیا محدثین اپنا معیار کڑا کرتے گئے بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کو مزید سخت کرتے گئے۔

اب تک حدیث بیان کرنے کے دو طریقے ہوتے تھے۔ ایک طریقہ یہ ہوتا تھا کہ طلبہ سامنے بیٹھ گئے۔ محدث، مثلاً امام بخاری نے اپنی یادداشت یا اپنے تحریری ذخیرے سے حدیث بیان کرنی شروع کر دی اور لوگوں نے لکھنا شروع کر دیا۔ لوگوں کی تعداد خاصی بڑی ہوتی تھی اور درمیان میں مستملی بھی ہوتے تھے۔ مثلاً ہر دو چار سو آدمیوں کے درمیان ایک آدمی بیٹھا ہوتا تھا جو بلند آواز سے ان الفاظ کو دہراتا تھا۔ جیسے مکبر اذان کے الفاظ دہراتا ہے یا نماز میں اللہ اکبر دہراتا ہے، اسی طرح مستملی ہوا کرتے تھے۔ بعض اوقات کئی کئی سو مستملی ہوا کرتے تھے جو ان الفاظ کو دہرایا کرتے تھے۔ محدث نے ایک لفظ زور سے کہا: انما الاعمال بالنیات۔ اب پہلے مستملی نے دہرایا، پھر دوسرے مستملی نے، پھر تیسرے نے، پھر چوتھے نے، اور کوئی چند منٹ میں سب لوگوں نے لکھ لیا۔ پھر انہوں نے اگلا جملہ بولا، پھر اس سے اگلا۔ ایک طریقہ تو یہ تھا۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ طلبہ کے پاس تحریری ذخیرے موجود ہیں۔ امام بخاری نے جو لکھوایا طلبہ نے اس کے تحریری نسخے پہلے ہی حاصل کر لئے۔ لیکن اب طالب علم امام بخاری کو سنا رہا ہے اور سننے کے دوران جہاں غلطی ہے وہ ٹھیک کر دیتے ہیں اور غلطی نہیں ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ ٹھیک ہے، میں نے اجازت دے دی ہے، اب تم میری طرف سے روایت کر سکتے ہو۔ بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ سب سے پڑھ کر سنتے تھے۔ اگر چار پانچ ہزار طلبہ ہوں تو سب سے پڑھوا کر نہیں سنا جا سکتا۔ اس میں تو ایک ایک حدیث کے لئے پورا سال چاہئے۔ اس کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ ایک طالب علم پڑھتا تھا اور بقیہ سنتے تھے اور پھر امام بخاری یا جو بھی محدث ہوتے تھے وہ اجازت دے دیتے تھے کہ اسی طرح سے آپ سب لوگوں کو پڑھنے کی اجازت ہے۔ درمیان میں بطور احتیاط کسی سے سن بھی لیا، کبھی ایک سے کبھی دوسرے سے، اور سب کے بارے میں اندازہ ہو گیا کہ سب نے پڑھا ہے۔

بعد میں محدثین نے ان تینوں طریقوں کے تین درجات مقرر کیے۔ یہ تین گویا الگ الگ درجات ہو گئے۔ ایک تو وہ کہ جس میں محدث نے خود پڑھا اور لوگوں نے سنا۔ دوسرے میں طالب علم نے خود پڑھا اور محدث نے سنا۔ تیسرے میں ایک طالب علم نے پڑھا اور محدث نے سنا لیکن دوسرے بہت سے طلبہ نے بھی سنا۔ امام مسلم کے ہاں ان تینوں میں الگ الگ فرق کیا گیا ہے۔ امام بخاری کے ہاں یہ فرق نہیں ہے۔ امام مسلم کی اصطلاح یہ ہے کہ اگر امام مسلم نے کہا کہ حدثنا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ امام مسلم کے استاد نے حدیث پڑھی، امام مسلم نے اور دوسروں نے سنی۔ اگر امام مسلم نے کہا کہ اخبرنا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ امام مسلم نے حدیث پڑھی، ان کے استاد نے سنی اور ان کو اجازت دے دی۔ اور اگر کہیں ایسا ہوا کہ امام مسلم اپنے استاد کے درس میں موجود تھے، کسی اور نے حدیث پڑھی، امام مسلم نے سنی تو امام مسلم کہتے ہیں کہ حدثنا فلان قرئ علیہ وانا اسمع، ان کے سامنے پڑھا جا رہا تھا اور میں سن رہا تھا۔ آپ دیکھیں کہ accuracy کی اس سے بہتر مثال دنیا میں کہیں نہیں مل سکتی۔ اگر آپ یہودیوں اور عیسائیوں کے سامنے یہ بیان کریں تو وہ دنگ رہ جائیں گے کہ کسی کام میں اتنی accuracy بھی ہو سکتی ہے کہ محدث نے خود نہیں پڑھا فلاں نے، قرئ علیہ وانا اسمع، میرے استاد کے سامنے پڑھا جا رہا تھا اور دوسرے طالب علم کے ساتھ ساتھ میں سن رہا تھا۔ استاد نے اسی طرح سن کر اس کی اجازت دی تھی۔ یہ ذرا سا فرق امام مسلم کے ہاں ہے اور امام بخاری کے ہاں نہیں ہے۔

احادیث نبوی کی تعداد

تعداد کے اعتبار سے صحیح مسلم کی احادیث زیادہ ہیں، صحیح بخاری کی احادیث کم ہیں۔ آپ کو پتہ ہے کہ حدیث کی ہر کتاب میں ایک ایک حدیث بار بار آتی ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں اگر خطبہ حجۃ الوداع کا ذکر آئے گا تو اس میں درجنوں موضوعات پر بات ہوئی ہے۔ تو جہاں عورتوں کے حقوق کا ذکر ہے وہاں خطبہ حجۃ الوداع کا بھی ذکر آئے گا، جہاں لوگوں کی برابری اور مساوات کا ذکر ہے وہاں بھی اس خطبہ کا حوالہ آئے گا۔ جہاں حج کے مناسک کا ذکر ہے وہاں بھی خطبہ کا کوئی نہ کوئی حصہ زیر بحث آئے گا۔ جہاں منیٰ کا ذکر ہے وہاں بھی آئے گا۔ جہاں عرفات کا ذکر ہے وہاں بھی آئے گا۔ اس طرح ایک حدیث کئی ابواب میں آئے گی۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث کی

کتابوں میں تکرار اور مکررات بہت ہوتے ہیں۔ مکررات کو نکالے بغیر اگر صحیح بخاری کی احادیث کو گنا جائے تو صحیح بخاری کی احادیث کی تعداد ۹ ہزار بیاسی ہے (9082)۔ یہ تعداد حافظ ابن حجر نے بیان کی ہے جن سے بڑا بخاری کا شارح پیدا نہیں ہوا۔ یہ بات میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ اس میں مکررات بھی شامل ہیں، تعلیقات بھی شامل ہیں، متابعات بھی شامل ہیں اور شواہد بھی شامل ہیں۔ مکررات کو اگر نکال دیا جائے اور صرف وہ احادیث جو براہ راست پوری سند کے ساتھ رسول اکرم ﷺ سے روایت ہوئی ہیں، وہ نکالی جائیں تو ۲ ہزار ۶ سو ۲ (2,602) ہیں۔ اس کے برعکس صحیح مسلم میں کل چار ہزار احادیث ہیں۔ گویا چار ہزار احادیث صحیح مسلم میں ہیں اور دو ہزار احادیث صحیح بخاری میں ہیں۔

احادیث کی کل تعداد کیا ہے؟ اس کے بارے میں کچھ کہنا بڑا دشوار ہے۔ لیکن ایک عام اندازہ یہ ہے کہ تکرار کو نکال لینے کے بعد کل متون تیس سے پچاس ہزار کے درمیان ہیں۔ آج کل کمپیوٹر کا زمانہ ہے۔ بہت سے لوگوں نے حدیث کی کتابیں کمپیوٹرائز کرنا شروع کی ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد جب ساری کتابیں کمپیوٹرائز ہو جائیں گی تو تمام احادیث کی اصل تعداد سامنے آ جائے گی۔ اس میں بھی قطعیت کے ساتھ تعداد کا تعین کرنا دشوار ہوگا۔ اس لئے کہ کمپیوٹر مکررات کی شناخت نہ کر سکے گا۔ ایک حدیث کے الفاظ اگر مختلف ہیں لیکن مفہوم ایک ہے تو کمپیوٹر اس کو دو احادیث قرار دے گا۔ لیکن حدیث کا طالب علم اس کو ایک ہی حدیث سمجھے گا۔ اس لئے قطعیت کے ساتھ کمپیوٹر کے لئے بھی دشوار ہوگا کہ بالکل درست تعداد دے سکے۔ تاہم یہ تعداد تیس اور پچاس ہزار کے درمیان ہے۔

حجیت سنت

حجیت سنت یعنی کہ سنت کتاب اللہ کے ساتھ حجت ہے اور قرآن مجید کے احکام کی شارح ہے۔ اس پر فقہائے اسلام نے بڑی تفصیل کے ساتھ غور کیا ہے۔ اور سنت کے کردار پر بات کی ہے۔ قرآن مجید میں بنیادی اصول یعنی اصول عامہ ہیں۔ سنت میں ان اصولوں کی تطبیق بیان کی گئی ہے۔ قرآن پاک میں اجمال ہے، سنت میں تفصیل بیان کی گئی ہے۔ مثلاً قرآن پاک میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا فریضہ یہ ہے کہ لتبین للناس ما نزل الیہم، کہ جو کچھ اللہ کی

ہے۔ لیکن بالواسطہ تراضی میں یہ بھی شامل ہے کہ اگر دونوں فریق راضی ہوں تو یہ ہو سکتا ہے۔ لہٰذا قرآن پاک میں اس طرح کی بالواسطہ بنیادیں تو ہیں لیکن براہ راست بنیاد کا تعین کرنا مشکل ہے۔

شفعہ کے بارے میں حدیث میں ہے کہ اگر آپ کے پڑوس میں کوئی جائداد بک رہی ہو، یا آپ کسی جائداد میں شریک ہوں، اس میں آپ کا حصہ ہو اور ایک حصہ دار اپنا حصہ بیچ رہا ہے تو پہلا حق آپ کا ہے بہ نسبت غیر آدمی کے۔ آپ نے اپنی زمین کے ساتھ مکان بنایا ہے اور یہ دونوں جڑے ہوئے ہیں۔ اب ایک اپنا حصہ بیچنا چاہتا ہے۔ بجائے اس کے کہ کوئی غیر آدمی آئے اور آپ کو اس سے زحمت ہو یا پردے کے مسائل پیدا ہوں یا اور کوئی مسئلہ ہو تو آپ کو شریعت نے یہ حق دیا ہے کہ آپ زمین یا کسی بھی شریک جائداد سے کہیں کہ یہ حصہ کسی اور کو بیچنے کے بجائے مجھے دے دو۔ اب یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ پہلے آپ کو ترجیح دے اور آپ کے ہاتھ فروخت کرے۔ یہ شفعہ کے بارے میں شریعت کا حکم ہے جو آج دنیا کے بہت سے قوانین میں مستعمل ہوتا ہے اور اب دنیا اس سے مانوس ہوگئی ہے۔ لیکن انگریز کے زمانے سے یہ اشکال کیوں چلا آرہا ہے کہ شہری جائداد پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔ کیوں نہیں ہوتا؟ ہونا چاہئے۔ شریعت کا جو منشا ہے وہ ہر جائداد پر حق شفعہ کے لاگو ہونے سے ہی پورا ہو سکتا ہے۔ یہاں شہری جائداد کا استثنا کر دیا گیا ہے اور غیر شہری جائداد پر ہی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

یہ اس موضوع پر گفتگو کا مختصر خلاصہ ہے کہ حدیث ماخذ شریعت ہے۔ کس طرح ماخذ شریعت ہے، اس سے احکام نکالنے میں احادیث کے درجات کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ صحت کے لحاظ سے، ثبوت کے اعتبار سے، معنی کے اعتبار سے احادیث کے جو مختلف درجات ہیں ان سب کو پیش نظر رکھ کر طے کیا جائے گا کہ کس حدیث سے کون سے احکام نکلتے ہیں۔ ان کے حساب سے احکام کا درجہ متعین ہوگا۔ جو حدیث متواتر کے درجہ کی ہے، جس پر کامل بات ہوئی، اس کا درجہ سب سے اونچا ہے۔ پھر آگے مختلف درجات ہیں جن پر ہم آئندہ بات کریں گے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

چوتھا خطبہ

روایت حدیث اور اقسام حدیث

جمعرات، 9؍5؍2003ء

روایت حدیث اور اقسام حدیث

علم حدیث بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم ہے۔ ایک حصہ وہ ہے جس کو علم روایت کہتے ہیں اور دوسرا حصہ وہ ہے جس کو علم درایت کہتے ہیں۔ علم روایت میں اس ذریعہ یا وسیلہ سے بحث ہوتی ہے جس کے ذریعے کوئی حدیث رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارک سے لے کر ہم تک پہنچا ہو۔

روایت اور درایت

روایت، سند، راوی، راوی کا سچا یا غیر سچا ہونا، راوی کا کردار، اس کا حافظہ یہ ساری چیزیں علم روایت میں زیر بحث آتی ہیں۔ علم درایت کی زیادہ توجہ حدیث کے متن اور الفاظ پر ہوتی ہے جو رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی سے عبارت ہے۔

میں آپ کے سامنے آج ایک کتاب لے کر آیا ہوں۔ اس میں سے بعض چیزیں مثال کے طور پر آپ کے سامنے رکھوں گا۔ یہ ایک ضخیم کتاب ہے اور ساری صحاح ستہ اس میں شامل ہیں۔ صحاح ستہ کا مکمل نسخہ ایک جلد میں ہمارے ایک دوست نے شائع کیا ہے۔ جس میں ساری کی ساری چھ کتابیں شامل ہیں۔

میں ایک حدیث پڑھتا ہوں اور پھر یہ بتاؤں گا کہ اس میں علم روایت سے کس جگہ بحث ہوتی ہے اور علم درایت سے کس جگہ بحث ہوتی ہے۔ یہ امام بخاری کی کتاب سے لی گئی ہے۔ کتاب الایمان کا باب نمبر پانچ ہے جس کا عنوان ہے 'باب ای الاسلام افضل' یعنی سب سے اچھا اور افضل اسلام کونسا ہے یا کس کا ہے۔

حدثنا سعید بن یحییٰ بن سعید القرشی قال حدثنا ابی قال حدثنا ابو بردة بن عبداللہ بن ابی بردة عن ابی بردة عن ابی موسیٰؓ قال: قالوا یا رسول اللہ ﷺ ای الاسلام افضل؟ قال من سلم المسلمون من لسانه ویده۔

یہ عبارت جو ابھی آپ کے سامنے پڑھی گئی ہے اس میں دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں بعض نام آئے ہیں۔ یہ ان راویوں کے نام ہیں جن کے ذریعے یہ حدیث امام بخاری تک پہنچی۔ سعید بن یحییٰ بن سعید القرشیؒ امام بخاری کے استاد ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حدثنی ابی، مجھ سے میرے والد نے بیان کیا۔ یحییٰ بن سعید القرشی نے، وہ کہتے ہیں کہ حدثنا ابو بردة بن عبداللہ بن ابی بردة، یہ ابو بردة مشہور صحابی حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے پوتے تھے، وہ اپنے دادا ابو بردة سے روایت کرتے ہیں۔ وہ اپنے والد حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت کرتے ہیں۔ یہاں تک یہ سند ہے اور سند سے متعلق جتنے بھی مسائل اور معاملات ہیں وہ علم روایت میں زیر بحث آتے ہیں۔ اس کو تاریخی مطالعہ حدیث یا تاریخی نقد حدیث بھی کہتے ہیں۔ یعنی حدیث سے باہر جو چیزیں ہیں ان کا مطالعہ کرکے اور حدیث کے سورس(Source) اور ماخذ کا مطالعہ کرکے یہ پتہ چلایا جائے کہ اس حدیث کا درجہ کیا ہے۔ یہاں یہ دیکھا جائے گا کہ یہ راوی جن سے یہ حدیث بیان ہوئی ہیں، یہ کون لوگ تھے؟ کن صفات کے حامل لوگ تھے؟ یعنی ان کی صفات کی بات کرتے ہیں۔ انہوں نے جس راوی سے روایت بیان کی ہے اس سے ان کی ملاقات ہوئی ہے کہ نہیں ہوئی ہے۔ امام بخاری پہلے یہ تحقیق کرتے ہیں کہ واقعۃً ملاقات ہوئی ہے اور تحقیقاً انہوں نے کسب فیض کیا ہے۔ امام مسلم کے نزدیک یہ تحقیق ضروری نہیں ہے۔ اگر یہ دونوں معاصر ہیں۔ اور ایک علاقہ میں رہتے تھے اور دونوں کی ملاقات ممکن تھی تو امام مسلم کے نزدیک قبول روایت کے لئے یہ کافی ہے۔ وہ آگے مزید تحقیق نہیں کرتے۔ اس کے برعکس امام بخاری یہ تحقیق بھی کرتے ہیں کہ ان کی ملاقات ثابت بھی ہوئی ہو۔ وہ اس کے بعد وہاں سے روایت لیتے ہیں۔ یہ سارے مسائل علم روایت میں زیر بحث آتے ہیں۔

متن حدیث

اس کے بعد متن حدیث کا معاملہ آتا ہے یعنی اس ارشاد گرامی کا متن جو آپ کے سامنے

پوچھا کہ یا رسول اللہ کون سا اسلام افضل ہے؟ آپ نے فرمایا وہ اسلام جس میں مسلمان ایک دوسرے کی زبان اور ہاتھ سے محفوظ رہیں۔ اس ارشاد ربانی کا مطالعہ کریں اس سے کیا چیز ثابت ہوئی ہے اور جو چیز ثابت ہوتی ہے وہ شریعت کے کون سے اصول اور تصورات کے مطابق ہے کہ نہیں۔ یہ ساری چیزیں جس فن کے ذریعے مطالعہ کی جائیں گی، اس فن کا نام ہے علم درایت۔ ہم پہلے علم روایت کی بات کرتے ہیں۔

علم روایت

علم روایت میں سب سے پہلے یہ چیز دیکھی جاتی ہے کہ راوی نے حدیث کا تحمل کیسے کیا۔ علم حدیث کے بارے میں راوی کے دو کردار ہیں۔ ایک کردار تو اس وقت آتا ہے جب اس نے وہ حدیث حاصل کی جو وہ بیان کر رہا ہے۔ دوسرا کردار اس وقت آتا ہے جب اس نے وہ حدیث آگے بیان کی۔ ایک کو تحمل کہتے ہیں اور دوسرے کو ادا کہتے ہیں۔ تحمل کا ترجمہ انگریزی میں آپ reception کر سکتے ہیں۔ تحمل کی اصطلاح یہاں بڑی معنی خیز ہے۔ تحمل کے لفظی معنی تو ہیں برداشت کرنا یا کسی بھاری چیز کو اٹھانا۔ یہاں تحمل حدیث کے معنی ہوں گے حدیث نبوی کی بھاری ذمہ داری یا امانت کو اٹھانا۔ ادا کا ترجمہ آپ delivery کر سکتے ہیں۔ جب اس نے حدیث کو اپنے شیخ سے receive کیا تو کہا جائے گا کہ راوی نے حدیث کا تحمل کیا۔ پھر جب راوی اس حدیث کو دوسرے لوگوں سے بیان کرے گا گویا دوسروں کو deliver کرے گا تو کہا جائے گا کہ اس نے حدیث کی یہ امانت ادا کر دی۔ ادا کے لفظ میں بھی امانت اور ذمہ داری کا مفہوم موجود ہے۔ یہ دو الگ الگ مراحل ہیں اور دونوں کے الگ الگ احکام اور الگ الگ شرائط ہیں۔

سماع

سب سے پہلے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ تحمل حدیث سے کیا مراد ہے۔ تحمل حدیث یعنی جب راوی حدیث کا مواد حاصل کر رہا ہے تو اس کے طریقے کیا کیا ہیں۔ سب سے پہلا طریقہ تو سماع کہلاتا ہے کہ انہوں نے براہ راست اپنے استاد یا شیخ کی زبان سے سنا ہو۔ شیخ نے حدیث پڑھ کر ان کو سنائی ہو اور سنانے کے بعد اجازت دی ہو۔ یہ طریقہ سماع کہلاتا ہے اور سب سے افضل طریقہ ہے۔

قراءت

اس کے بعد دوسرا طریقہ آتا ہے قراءت کا، جس میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ شاگرد نے استاد کے سامنے قراءت کی ہو اور قراءت سننے کے بعد استاد نے اجازت دی ہو کہ تمہاری قراءت درست ہے اب تم آگے میرے حوالے سے اس حدیث کو بیان کر سکتے ہو۔

اجازت

تیسرا درجہ اجازت کا ہے۔ اجازت سے مراد یہ ہے کہ استاد نے کسی صاحب علم کو، جس کے علم، تفقہ اور تقویٰ پر استاد کو بھروسہ ہو، یہ اندازہ کرنے کے بعد کہ یہ شخص حدیث کا علم رکھتا ہے، کسی خاص مجموعہ حدیث کے روایت کرنے کی اجازت اس کو دے دی ہو۔ اجازت کا یہ طریقہ آج بھی رائج ہے اور ماضی میں بھی رائج تھا۔ ایک دوسرے کو اجازت دینے کا یہ طریقہ تابعین اور تبع تابعین کے زمانہ سے چلا آرہا ہے۔

یہ تین درجے تو وہ ہیں جو بڑے معیاری سمجھے جاتے ہیں اور صحاح ستہ کی احادیث انہی تین طریقوں سے آئی ہیں۔ زیادہ تر سماع کے طریقے سے، اور کچھ حصہ قراءت کے ذریعے اور تھوڑا حصہ اجازت کے ذریعے۔ جو بہت تھوڑا ایک برائے نام سا ہے۔ ان تین طریقوں کے علاوہ صحاح ستہ میں کسی اور طریقہ تحمل سے آئی ہوئی کوئی حدیث شامل نہیں ہے۔

مناولہ

اس کے علاوہ ایک اور طریقہ مناولہ کا طریقہ ہے۔ مناولہ کے معنی ہوتے ہیں کسی کو کوئی چیز حوالے کرنا۔ مناولہ سے مراد یہ ہے کہ شیخ کے پاس احادیث کا ایک مجموعہ لکھا ہوا موجود ہے۔ جس میں ایک حدیث ہے یا سو ہیں یا پانچ سو ہیں، وہ حدیث کا مجموعہ تحریری طور پر کسی کے حوالے کر کے کہہ دیا جائے کہ میری یہ کتاب آپ کے حوالے کر رہا ہوں، اس میں میری روایات ہیں، آپ ان کو میری طرف سے بیان کر سکتے ہیں۔ مناولہ کا طریقہ تابعین اور تبع تابعین کے زمانے میں رائج نہیں تھا۔ بعد میں جب علم حدیث پوری طرح سے مدون ہو گیا، کتابیں مرتب ہو گئیں، مجموعے مستند طور پر تیار ہو گئے تو پھر مناولہ کا طریقہ بھی رائج ہو گیا کہ ایک شیخ اپنا لکھا ہوا مجموعہ کسی شاگرد کو دے دیا

کرتے تھے اور کہتے کہ یہ لو اور اس کی بنیاد پر تم روایت کر سکتے ہو۔ یہ طریقہ جیسا کہ آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا، کوئی معیاری طریقہ نہیں تھا، صحاح ستہ میں کوئی حدیث اس بنیاد پر نہیں ہے اور حدیث کی بڑی بڑی کتابیں جو طبقہ دوم کی کتابیں ہیں۔ ان میں بھی اکثر و بیشتر احادیث اس طریقہ کے مطابق نہیں ہیں۔ شاذ و نادر کوئی حدیث اس طریقے کے مطابق مروی ہو تو ہو گی۔

مکاتبہ

اس کے بعد پانچواں طریقہ تھا مکاتبہ۔ کہ کسی استاد نے شاگرد کو کوئی حدیث لکھ کے بھیج دی اور اس کے بعد اس کی اجازت بھی دے دی یا شاگرد نے استاد کو خط لکھ کر دریافت کیا کہ فلاں حدیث یا اس مضمون کی کوئی حدیث اگر آپ کے علم میں ہے تو براہ کرم مجھے مطلع فرمائیں۔ استاد نے تحریری طور پر خط کے ذریعے مطلع کر دیا۔ یہ طریقہ مکاتبہ کہلاتا تھا۔ بظاہر آپ میں سے بعض کو خیال ہوگا کہ اس کا درجہ تو پہلے ہونا چاہئے لیکن محدثین کے نزدیک اس کا درجہ بعد میں تھا۔ اس لئے کہ اس زمانے میں ذرائع آمد و رفت کے حساب سے جب خط تحریر کر کے کہیں بھیجتے اور سال سال لگ جایا کرتے تھے۔ یہ تعین بڑا دشوار تھا کہ ایک شخص کے پاس جو تحریر پہنچی ہے، وہ فرض کیجئے کہ نیشاپور یا سمرقند یا بخارا سے لکھ کر کسی نے ترکی اور قاہرہ میں کسی کے پاس آٹھ ماہ کے بعد پہنچی۔ اب قاہرہ میں بیٹھے ہوئے شخص کے لئے یہ تعین بڑا دشوار تھا کہ یہ تحریر اسی استاد یا شیخ کی تحریر ہے جس کی تحدیث جا رہی ہے یا کسی اور نے لکھ کر اس کی طرف منسوب کر دی ہے۔ چونکہ اس کا امکان موجود تھا۔ آج تو یہ امکان موجود نہیں ہے۔ آپ کا کوئی خط سعودی عرب سے آتا ہے تو آپ ٹیلیفون پر معلوم کر سکتے ہیں کہ واقعی یہ خط انہی بزرگ کا بھیجا ہوا ہے۔ اگلی مرتبہ جا کر تو تصدیق کر لیں۔ آج اس طرح کی تصدیق کرنا بہت آسان ہے۔ آج اگر تحریر کے ذریعے حدیث کی روایت ہوا کرتی تو اس کا درجہ بہت اونچا ہوتا۔ لیکن اس زمانے میں چونکہ جب یہ تصدیق اور تعین بہت دشوار تھا اس لئے محدثین نے اس درجہ کو بعد میں رکھا اور یہ پانچواں درجہ ہے۔

اعلام

چھٹا درجہ اعلام کہلاتا تھا۔ اعلام کے معنی ہیں مطلع کرنا اور بتا دینا۔ اصطلاح میں اعلام سے مراد شیخ کی طرف سے حدیث کے طالب علم کو یہ بتا دینا کہ فلاں جگہ فلاں تحریر یا فلاں شخص کے

ہوں۔ اس لئے آج اجازہ کا طریقہ بھی اتنا ہی قیمتی ہے جتنا کوئی بھی طریقہ قیمتی ہوسکتا ہے۔ چنانچہ آج میرے اور آپ کے لئے جائز ہے کہ ہم صحیح بخاری کا نسخہ سامنے رکھ کر اس میں سے حدیث بیان کریں اور یقین کے ساتھ یہ بات کہیں کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔

یہ آٹھ طریقے تحمل حدیث کے تھے اور یہی طریقے ادا کے طریقے بھی تھے۔

تحمل اور ادا ء

جب ایک شخص نے ان طریقوں سے حدیث حاصل کی تو یہ طریقے جس کے لئے تحمل کے طریقے تھے۔ لیکن جس شیخ سے ان طریقوں کے ذریعہ روایت لی گئی اس کے لئے یہ طریقے ادا کے طریقے تھے۔ جب یہ شیخ آگے چل کر دوسرے تک یہ حدیث پہنچائے گا اور کسی کو یہ معلومات deliever کرے گا تو اس کے لئے ادا ہوگا، اس کے لئے تحمل ہوگا۔ تحمل اور ادا دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ روایت احادیث کے طریقوں کی حد تک یہ ایک ہی چیز کے دو رخ ہیں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اجازت حدیث یا اجازہ کا طریقہ آج بھی رائج ہے، اس کی عملی صورت یہی ہوتی ہے کہ حدیث کے کسی بڑے مشہور شیخ یا استاد سے آپ کی ملاقات ہوئی، آپ نے ان کو یہ بتایا کہ آپ نے علم حدیث حاصل کیا ہوا ہے۔ انہوں نے آپ کا امتحان لے لیا۔ امتحان لینے کے بعد یہ یقین ہوگیا کہ اب آپ کی صلاحیت اور استطاعت آپ کو روایت حدیث کا اہل ثابت کرتی ہے۔ انہوں نے آپ سے مختلف جگہوں سے پڑھوا کر بھی سن لیا۔ اب چونکہ اس طریقہ سے روایت کرنے میں حدیث کے متن میں کسی کمی بیشی یا اختلاف کا امکان نہیں ہے۔ اس لئے کہ کتابیں مجموعی طور پر ہر جگہ بڑی کثرت سے موجود ہیں۔ اب صرف یہ تحقیق اور تعین باقی ہے کہ آپ کی یہ صلاحیت ہے کہ آپ حدیث پڑھ کر اس کا متن آگے بیان کرسکیں۔ یہ تحقیق کرنے کے بعد وہ لکھ کر آپ کو سند دیتے ہیں اور اجازت دیتے ہیں۔ اس طرح سندیں لوگ حاصل کرتے چلے آئے ہیں۔ میرے پاس بھی اس طرح کی بہت سی سندیں ہیں اور ایسے اہل علم سے ملاقات ہوتی رہتی ہے کہ جن سے سند لینا ایک شرف اور اعزاز کی بات ہوتی ہے۔

یہ چیز اجازہ یا اجازت کہلاتی ہے۔ اجازت متعین کتاب کی بھی ہوسکتی ہے کہ مثلاً انہوں نے صحیح بخاری کی کچھ احادیث آپ سے سنیں اور یقین کرنے کے بعد کہ آپ صحیح بخاری پڑھ

ورنہ محض کتاب کا ہدیہ یا اجازت کے معنی میں یا روایت کے معاملہ میں معتبر نہیں ہوگا۔

جہاں تک مکاتبت کا تعلق ہے تو مکاتبت کے ساتھ ساتھ اگر تحقیق کے ساتھ روایت کی اجازت بھی شامل ہے اور یہ بھی یقین ہو جائے کہ یہ تحریر انہی بزرگ کی ہے تو روایت کی اجازت دے دی جاتی تھی۔ ماضی میں اس کا تعین ایسے ہوتا تھا کہ مثلاً ایک محدث نے اپنے کسی بزرگ استاد کو خط لکھ کر کہ میں نے سنا ہے کہ آپ کے پاس فلاں فلاں حدیث کے فلاں فلاں انداز یا روایات موجود ہیں، آپ براہ کرم اس کا متن مجھے لکھ کر بھیج دیں۔ انہوں نے اپنے شاگرد کو متن لکھ کے بھیجا اور اس کے ساتھ دو آدمی بھی بطور گواہ بھیج دیئے۔ ان گواہوں نے جو مستند اور معتبر تھے ان کے شاگرد کے سامنے گواہی دی کہ ہمارے سامنے شیخ نے اپنے قلم سے یہ تحریر لکھی تھی اور انہی نے یہ مہر لگائی تھی اور ہم اس بات کے گواہ ہیں کہ یہ تحریر انہی محدث کی لکھی ہوئی ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر اس کی بنیاد پر روایت کی جا سکتی ہے۔

امام بخاری نے ایک دو مقامات پر مکاتبہ مع الاجازۃ مع الاشہادۃ کی اجازت دی ہے۔
گویا اجازت، دو شرطوں کے ساتھ ہے، گواہی بھی ہو اور اجازت بھی ہو۔ یہ دو چیزیں جب شامل ہوں گی تو پھر عام مکاتبت سے اس کا درجہ اونچا ہو جائے گا۔ اس لئے امام بخاری نے اس کی اجازت دی ہے۔ امام بخاری یا امام مسلم کے ہاں ایک دو احادیث جو مکاتبت کی بنیاد پر روایت ہوئی ہیں ان کے الفاظ یہ ہیں اخبرنی فلان کتابۃ یعنی فلاں بزرگ نے مجھے تحریری طور پر اطلاع دی یعنی اپنی Hand Writing میں یہ لکھ کر اجازت دی۔ بعض جگہ اس کا بھی التزام ہے کہ فلاں فلاں گواہوں کی موجودگی میں جنہوں نے میرے سامنے حلفیہ بیان کیا کہ یہ انہی بزرگ کی تحریر ہے اور انہوں نے اس کے مطابق آپ کو اجازت دی ہے۔

یہ تحمل کے طریقے تو علم روایت سے متعلق ہیں اور ان کا براہ راست تعلق علم روایت سے ہے۔ دوسرا شعبہ علم درایت کا ہے جس کا میں نے ابھی ذکر کیا۔ اس میں ایک محدث داخلی ذرائع سے یہ تعین کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ جو ارشادات رسول اللہ ﷺ سے منسوب کئے گئے ہیں وہ واقعی رسول اللہ ﷺ کے ارشادات ہیں۔ علم روایت کو خارجی نقد حدیث بھی کہتے ہیں اور علم درایت کو داخلی نقد حدیث بھی کہتے ہیں۔ خارجی نقد حدیث کا زیادہ دارومدار نقل پر ہوتا ہے کہ راوی کے بارے میں جو کچھ معلومات آپ کے پاس ہیں، راوی نے جو کچھ آپ سے بیان کیا، اس راوی

اونچے درجے کا انسان ہو۔ کم از کم جو بات اس نے سنی ہے اس کو سمجھ کر اس کو یاد رکھا ہو اور پوری سمجھ بوجھ کے ساتھ اس کو دہرایا ہو کہ کس سیاق و سباق کے ساتھ یہ بات ارشاد فرمائی گئی تھی اور اس کا مفہوم کیا تھا۔ بے عقل آدمی کی بات اور روایت قابل قبول نہیں ہے۔

یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوا کہ ایک چھوٹا بچہ جو تحمل کے وقت کم عمر تھا لیکن ادائیگی کے وقت اس کی عمر پختگی کو پہنچ گئی اور اس میں پختہ عقل و شعور پیدا ہو گیا، مثلاً پانچ چھ سال کا بچہ تھا، جب اس نے تحمل کیا، تو کیا اب دس بارہ سال کے بعد وہ اس کو ادا کر سکتا ہے؟ محدثین کی غالب ترین اکثریت کا خیال یہاں بھی وہی ہے جو اسلام کے بارے میں ہے۔ کہ صحابہ کے بارے میں یہ استثنا ہو سکتا ہے غیر صحابیؓ کے بارے میں نہیں ہو سکتا۔ اگر ایک بچہ پانچ سال کی عمر میں کسی تابعی سے یا تبع تابعی سے کوئی حدیث سنتا ہے اور بعد میں بالغ ہونے کے بعد بیان کرتا ہے تو اس میں ایک شک ضرور باقی رہتا ہے کہ بچے کو حدیث کا متن اور مفہوم صحیح طور پر یاد رہا کہ نہیں رہا۔ لیکن اگر کوئی صحابیؓ اپنا کوئی ایسا واقعہ بیان کرتے ہیں جو ان کے اپنے بچپن کا ہے لیکن رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد گرامی، یا تقریر یا عمل سے متعلق ہے، اور وہ بلوغ کے بعد بیان کرتے ہیں تو وہ قابل قبول ہے۔ اس لئے کہ صحابہ کرام میں حضرت علیؓ بن ابی طالب، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت ابو سعید خدریؓ اور اسی طرح کے بہت سے صحابہ کرام تھے جنہوں نے اپنے بچپن میں بارہا حضورؐ کی زیارت کی، بہت سے معاملات کو دیکھا اور بعد میں ان کو بیان کیا اور عام طور پر علماء اسلام نے ان کو قبول کیا۔ رسول اللہ ﷺ کے بہت سے واقعات اسلام کے فوراً بعد.. زیادہ تر حضرت علیؓ سے مروی ہیں۔ مکہ مکرمہ کے کئی واقعات حضرت علیؓ سے مروی ہیں جب ان کی عمر دس بارہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ حضرت ابن عباسؓ کی عمر حضورؐ کے انتقال کے وقت تیرہ سال تھی۔ انہوں نے بہت سے واقعات نقل کئے ہیں جو ان کے بچپن کے ہیں۔ یہ سب واقعات قابل قبول ہیں، اس لئے کہ ان کے راوی صحابیؓ ہیں، اور ان سے اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ وہ کوئی غلط چیز یا غلط یادداشت پر مبنی کوئی چیز بیان کر دیں گے۔ دوسرے تمام راویوں کے لئے یہ شرط ہے کہ انہوں نے تحمل بھی عقل کی حالت میں کیا ہو۔ البتہ تحمل کے لئے بلوغ شرط نہیں ہے۔ اگر بارہ سال کا بچہ ہو، یادداشت اچھی ہو، عربی جانتا ہو، اور ایسے لوگ ہر زمانے میں پائے جاتے ہیں، تو وہ حدیث قابل قبول ہے۔ تیرہ چودہ سال کی عمر کی حد تک قابل قبول ہے۔ لیکن اگر وہ تحمل کے وقت

اتنا کم سن بچہ ہو کہ اس میں عقل و شعور ہی نہ ہو تو اس کی روایت قابل قبول نہیں ہے۔

سب سے اہم شرط جو چوتھے نمبر پر ہے وہ ضبط ہے۔ ضبط سے مراد یہ ہے کہ راوی نے جو کچھ سنا اس کو پوری طرح سے یاد رکھا، پھر وہ چیز ہمیشہ اس کی یادداشت میں محفوظ رہی۔ کبھی اس کو بھلایا نہیں، کبھی اس میں التباس نہیں ہوا، کبھی اس میں کوئی شک نہیں ہوا اور روایت بیان کرنے تک تحمل سے لے کر ادا تک ضبط باقی رہا ہو، کسی مرحلہ پر ضبط میں کوئی کمزوری یا خلل واقع نہ ہوا ہو۔ اس بات کی تحقیق اور تعین سب سے مشکل کام ہے جس کا محدثین نے اہتمام کیا اور ایک ایک راوی کے بارے میں تحقیق کی کہ اس کا ضبط کس عمر سے تھا اور کس عمر تک رہا۔ بڑھاپے میں یادداشت کام نہیں کرتی۔ محدثین نے اس بارے میں بھی معلومات جمع کیں کہ کس راوی کی کتنی عمر ہوئی اور عمر کے کس حصے تک اس کی یادداشت محفوظ تھی اور اگر آخر عمر میں جاکر اس کی یادداشت جواب دے گئی اور خراب ہوئی تو کس عمر میں خراب ہوگئی۔ پھر علمائے رجال اور محدثین اس بات کا بھی اہتمام کرتے ہیں کہ راویوں کی یادداشت اور حافظہ کی تاریخ بھی معلوم کریں اور اس بات کی تحقیق بھی کریں کہ فلاں راوی کی یادداشت فلاں سن تک ٹھیک تھی۔ لہٰذا اس سن تک کی روایات قابل قبول ہیں۔ اس سن کے بعد ان کی یادداشت میں کمزوری آنی شروع ہوگئی۔ لہٰذا اس سن سے لے کر اس سن تک کی روایات کی اگر دیگر مآخذ سے تصدیق ہو جائے تو وہ قابل قبول ہیں اور فلاں سن میں ان کی یادداشت بالکل جواب دے گئی تھی۔ اس کے بعد کی روایت قابل قبول نہیں ہیں۔ چنانچہ آپ کو اتنی بے شمار مثالیں ملیں گی کہ ایک راوی کی ایک روایت قابل قبول ہے اور دوسری روایت قابل قبول نہیں ہے۔ اس لئے کہ پہلی روایات عالم ضبط میں تھیں اور دوسری روایات عالم ضبط کے زائل ہونے کے بعد تھیں۔ راوی کے یہ چار بنیادی شرائط ہیں جو ہر راوی میں پائی جانی چاہئیں۔ راوی کی ان چار شرائط کے بعد سند اور متن کے بارے میں تین شرائط اور ہیں جو اگر موجود ہوں تو وہ حدیث مکمل طور پر صحیح اور معیاری ہوگی۔

پہلی شرط یہ ہے کہ محدث سے لے کر مثلاً امام بخاری سے لے کر رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی تک متصل سند ہو اور درمیان میں کوئی سلسلہ ٹوٹا ہوا نہ ہو۔ اگر ایک سلسلہ بھی ٹوٹا ہوا ہے تو وہ حدیث پھر صحت کے اس معیار کی نہیں ہوگی۔ دوسری شرط یہ ہے کہ روایت شاذ نہ ہو۔ راوی مستند ہے، اس میں عقل بھی ہے، ضبط بھی ہے، مسلمان بھی ہے، اس میں عدالت بھی ہے اور سند بھی

متصل ہے لیکن وہ کوئی ایسی روایت ذکر کرے جو عام، مشہور، مستند اور متعدد روایات سے متعارض ہو اس کی روایت کو شاذ کہتے ہیں۔ اگر کوئی ثقہ اور مستند راوی ایسی چیز بیان کرے جو عام روات کی روایت کردہ روایات کے خلاف ہو اس کو شاذ کہتے ہیں۔ اور تیسری شرط اس باب میں یہ ہے کہ اس کے اندر کوئی ایسی چھپی ہوئی داخلی علت نہ ہو جو اس کے معیار کو متاثر کرے۔ علت سے مراد کوئی ایسی کمزوری ہوتی ہے جو بظاہر سند اور روایت میں نظر آتی ہے نہ متن میں۔ اور عام جیسے عامی لوگوں کو اس کا پتہ نہیں چل سکتا، لیکن ایک ماہر فن جو فن حدیث کا امام ہو اور علم حدیث کی باریکیوں کی جزوی اور کلی تفصیلات سے واقف ہو وہ پتہ لگا سکتا ہے کہ اس میں یہ کمزوری پائی جاتی ہے۔ اس پوشیدہ کمزوری یا خامی کو علت کہتے ہیں اور یہ علم حدیث کا سب سے مشکل فن ہے۔

علل الحدیث پر بھی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ معرفت علل الحدیث کے موضوع پر ائمہ حدیث نے بہت کام کیا ہے اور اس بات کے اصول طے کئے ہیں کہ حدیث میں اگر کوئی علت ہے تو اس کو کیسے دریافت کیا جائے۔ علت کے معنی آپ کمزوری کر سکتے ہیں کہ کوئی ایسی داخلی، اندرونی اور چھپی ہوئی کمزوری جس کا عام آدمی کو پتہ نہیں چلتا۔ یہ تینوں چیزیں اس میں موجود نہ ہوں اور راوی چاروں شرائط پر پورا اترتا ہو تو پھر وہ حدیث صحیح حدیث کہلائے گی۔

آپ میں سے کل کسی نے پوچھا تھا کہ صحیح حدیث کس کو کہتے ہیں تو حدیث صحیح اس کو کہتے ہیں، یعنی حدیث صحیح وہ ہے جس کی سند متصل ہو، اس میں کوئی علت نہ ہو، اس میں کوئی روایت شاذ نہ ہو، کوئی اندرونی خامی نہ پائی جاتی ہو اور راوی میں چاروں شرائط موجود ہوں۔ گویا راوی کی چار شرائط ہیں اور حدیث صحیح کی بھی چار شرائط ہیں۔ راوی کی چار شرائط اسلام، عدالت، عقل اور ضبط۔ یہ سات شرائط جس حدیث میں پائی جائیں گی وہ حدیث صحیح ہوگی۔

ضبط سے مراد جیسا کہ میں نے عرض کیا قوت یادداشت ہے۔ اور محدثین کہتے ہیں، وقت ملاحظہ۔ جب راوی یہ واقعہ دیکھ رہے تھے یا سن رہے تھے یا حدیث کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے تو ان کا مشاہدہ اتنا گہرا ہونا چاہئے۔ وقت ملاحظہ کے معنی ہیں keen observation یا minute observation کر رہے ہوں ایک ایک لفظ اور ایک ایک جز کو پوری طرح سمجھ لیں اور اس کے بعد بیان کریں۔

ان سات شرائط میں سے اگر کوئی ایک شرط ناپید ہو جائے یا دو شرائط یا بعض موجود نہ ہوں تو

میں ساری احادیث صحیح ہیں اور حدیث حسن کوئی نہیں ہے۔ ابوداؤد، ترمذی اور نسائی میں صحیح احادیث بھی ہیں اور حدیث حسن بھی بہت ہیں۔

ضعیف اور موضوع احادیث

دوسری طرف جو احادیث ناقابل قبول ہیں ان کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک ضعیف اور دوسری موضوع۔ موضوع کو مجازاً حدیث کہتے ہیں کیونکہ یہ وہ روایات ہیں جن کی نسبت رسول اللہ ﷺ سے درست نہیں ہے اور وہ حضورؐ کے ارشادات گرامی نہیں ہیں۔ موضوعات کے انیک مجموعے پائے جاتے ہیں۔ کئی لوگوں نے یہ مجموعے مرتب کئے ہیں جن کی تعداد درجنوں میں ہے۔ کم از کم پچیس تیس کتابیں ہیں جن میں موضوع احادیث جمع کردی گئی ہیں، تاکہ لوگوں کو پتہ چل جائے کہ یہ حضورؐ کے ارشادات نہیں ہیں۔

ضعیف حدیث وہ ہے کہ جس میں حدیث حسن کی شرائط میں سے بعض شرائط نہ پائی جاتی ہوں۔ مثلاً سند پوری کی پوری متصل ہے لیکن راوی یادداشت میں کمزور ہے یا عدالت میں کمزور ہے، راوی کمزور باتیں روایت کرتا ہو۔ گویا وہ کھلم کھلا جھوٹا تو مشہور نہیں ہے لیکن اس کی روایات میں کمزور باتیں شامل ہوتی ہیں۔ اگر اس کی شہرت جھوٹے کی ہے تو پھر تو وہ حدیث موضوع ہو جائے گی۔ لیکن اس کے کردار کے بارے میں لوگوں کو کچھ شکایات ہیں، وہ حدیث ضعیف حدیث کہلائے گی۔

یہ حدیث کی چار بڑی بڑی قسمیں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی ذیلی تقسیمات بے شمار ہیں۔ محدثین نے کم و بیش سو اقسام بیان کی ہیں۔ ان سو قسموں میں ہر ایک کے الگ الگ احکام ہیں۔ یہ وہ فن ہے جس کی تدوین میں کم و بیش چار پانچ سو سال لگے ہیں اور ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں بہترین دماغوں نے اور اعلیٰ ترین اور متقی ترین انسانوں نے اس کی تدوین اور اس کی خدمت میں وقت صرف کیا ہے۔ اس لئے جیسے جیسے غور و خوض ہوتا گیا اور تحقیق ہوتی گئی نئی نئی تقسیمیں سامنے آتی گئیں۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، نئے نئے مواقع اور نئے نئے امکانات سامنے آتے رہے۔ کم و بیش سو قسمیں محدثین نے بیان کی ہیں۔ مقدمہ ابن الصلاح، جو علوم حدیث کی مشہور کتاب ہے، اور اپنے زمانے کی ایک منفرد کتاب سمجھی جاتی تھی، اس میں علامہ ابن

تواتر کی تیسری قسم ہوتی ہے تواتر قدر مشترک۔ جہاں سب روایت کے الفاظ بھی الگ الگ ہوتے ہیں اور ان کا مفہوم بھی تھوڑا الگ ہوتا ہے، لیکن ان سب احادیث میں ایک حصہ قدر مشترک ہے جس سے ایک خاص بات ظاہر ہوتی ہے وہ تواتر قدر مشترک ہے۔ گویا یہ قدر مشترک حصہ اس طرح ثابت ہے کہ اس میں نہ کوئی احتمال ہے نہ کسی شک وشبہ کی گنجائش ہے۔ وہ تواتر قدر مشترک کہلاتا ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ مثال کے طور پر نمازوں کے اوقات کا معاملہ۔ اس بارے میں بہت سی احادیث ہیں۔ مختلف صحابہ نے اپنے اپنے انداز میں تفصیلات کو بیان کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے وقتاً فوقتاً مختلف الفاظ میں اس کو بیان کیا۔ صحابہ کرام نے مختلف سیاق وسباق میں اس کو بیان کیا۔ لیکن ان سب میں یہ بات قدر مشترک ہے۔ وہ یہ ہے کہ ظہر کی نماز اس وقت ہوگی جب سورج ڈھل جائے۔ فجر کا وقت اس وقت ہوگا جب صبح صادق طلوع ہو جائے۔ یہ الفاظ تو متعین طور پر متواتر احادیث میں نہیں آئے لیکن یہ قدر مشترک سینکڑوں احادیث میں موجود ہے۔ اس لئے یہ تواتر قدر مشترک کہلاتا ہے۔

اس کے بعد ایک درجہ ہے تواتر طبقہ کا۔ کہ ایک طبقہ نے، ایک پوری نسل نے ایک کام اس طرح کیا، اس کو دیکھ کر دوسری نسل نے، پھر تیسری نسل نے، پھر چوتھی نسل نے۔ یا کسی خاص طبقہ نے، لوگوں کے کسی خاص گروہ نے ایک عمل اس طرح کیا۔ مثال کے طور پر ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتا ہوں۔ احادیث میں مختلف ناپوں (Measures) کا ذکر ہے۔ مثلاً صدقہ فطر کے بارے میں ذکر ہے، یا زکوٰۃ کے بارے میں ذکر ہے۔ اب حدیث میں کچھ پیمانوں کا ذکر آیا ہے کہ صاع، نصف صاع وغیرہ۔ یعنی صدقہ فطر کے طور پر گندم کا نصف صاع دیا جائے۔ تو صاع سے کیا مراد ہے۔ اس زمانے میں ایسے پیمانے تو نہیں ہوتے تھے جو سرکاری طور پر سٹینڈرڈائزڈ ہوں۔ ہر علاقے میں ایک ہی نام کے مختلف اوزان رائج ہوتے تھے۔ مثلاً جس پیمانہ کو ہم آج تک سیر کہتے تھے اور اب کلو کہنے لگے ہیں۔ یہ سیر مختلف علاقوں میں مختلف مقدار کے ہوتے تھے مثلاً سیر عالمگیری، سیر شاہجہانی، پکا سیر، کچا سیر، فلاں سیر اور فلاں سیر وغیرہ۔ ہر سیر کا الگ الگ وزن متعین ہوتا تھا۔ کوئی اسی تولہ کا سیر ہے، کوئی چالیس تولے کا ہے، کوئی ۱۲۰ تولہ کا۔ اسی طرح سے عرب میں صاع مختلف انداز کے ہوا کرتے تھے۔ اب یہ بات کہ حدیث میں جس صاع کا ذکر ہوا ہے وہ کتنا ہے کہ اس کے مطابق آپ صدقہ فطر ادا کریں، ایک تحقیق طلب بات تھی۔

امام ابو یوسفؒ وفد کے ہمراہ تھے۔ انہوں نے کوفہ میں رائج صاع کی بنیاد پر فتویٰ دیا کہ
صدقۂ فطر ہر فرد کے لئے نصف صاع گندم کی ادائیگی کی جائے۔ جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو دیکھا کہ
یہاں کا صاع کوفہ کے صاع سے مختلف ہے۔ امام مالکؒ سے ملاقات ہوئی اور مختلف معاملات پر
تبادلہ خیال ہوا تو امام مالکؒ نے پوچھا کہ صدقۂ فطر کی آپ کیا مقدار قرار دیتے ہیں؟ امام
ابو یوسف نے فرمایا کہ آدھا صاع جیسا کہ حدیث میں ہے۔ امام مالک نے پوچھا کون سا صاع؟
انہوں نے فرمایا صاع۔ امام مالک نے کہا نہیں مدینہ کا صاع اور ہے اور دوسری جگہوں کا اور
جب اس پر امام ابو یوسفؒ کو تامل ہوا۔ امام مالکؒ نے اگلے دن مدینہ منورہ کے بازار سے بہت
سے خاندانوں کو یہ کہہ کر بلوایا کہ اپنا اپنا صاع جس سے آپ کا پیمانہ ہے لے کر آئیں۔ وہ اپنا اپنا صاع لے
آئے۔ انہوں نے پوچھا کہ یہ پیمانہ آپ کو کہاں سے ملا؟ جواب ملا کہ والد سے ورثے میں ملا ہے۔ پوچھا
والد کے پاس کہاں سے آیا؟ جواب دیا دادا کے زمانے سے۔ اس طرح سے یہ پتہ چلا کہ بہت
سے لوگوں کے پاس خاندانی صاع تھے جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ مبارک سے چلے آ رہے
تھے۔ یوں یہ ثابت ہو گیا کہ حضورؐ کے زمانے میں بھی یہی صاع رائج تھا۔

یہ تواتر طبقہ ہے کہ ایک خاص طبقہ میں مثلاً جو صاع کا مسئلہ ہے اور حضورؐ کے زمانہ
سے مدینہ میں تجارت کرتا تھا، ان میں تواتر کے ساتھ ایک چیز چلی آ رہی ہے۔ یہ بھی تواتر کی ایک
قسم ہے جس پر امام ابو یوسف نے اپنی رائے سے رجوع کیا اور امام مالکؒ کی رائے سے اتفاق فرمایا۔

تواتر طبقہ کی ایک اور مثال عرض کرتا ہوں۔ امام ابو یوسف اور امام مالکؒ ہی کا واقعہ ہے۔
اس کا پس منظر یہ ہے کہ حضور ﷺ جب فتح مکہ کے موقع پر مکہ مکرمہ تشریف لے گئے اور وہاں
بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا اور وہاں حضرت بلالؓ اذان دیتے تھے تو ایک کمسن نوجوان
تھے ابو محذورہ، ان کی آواز بڑی اچھی اور اونچی تھی، انہوں نے چاہا۔ پانچ دن میں جب تک
مسلمان وہاں رہے انہوں نے اذان یاد کر لی تھی۔ ابو محذورہ بہت کمسن تھے اور ان کی عمر چودہ سال تک
بھی نہیں تھی۔ آواز بڑی اچھی تھی اور اذان میں دلچسپی تھی تو رسول اللہ ﷺ نے ان کو مکہ کا
مؤذن مقرر کر دیا۔ اور یہ دیکھنے کے لئے کہ اذان کیسے دیتے ہیں، فرمایا کہ میں
تمہارے سامنے ہوں تم اذان کا ایک ایک جملہ کہتے جاؤ۔ وہ ایک جملہ زور سے کہتے تھے اللہ
اکبر اللہ اکبر تو حضورؐ تائید فرماتے تھے کہ ہاں ٹھیک ہے، پھر دوسرا کہتے تھے اللہ

اللہ اکبر اللہ اکبر۔ اس طرح سے پوری اذان کے الفاظ وہ ہر مرتبہ پہلے آہستہ کہتے اور جب حضور اس کے درست ہونے کی تصدیق فرما دیتے تو اس کے بعد وہ زور سے کہتے گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے دو تین مرتبہ یہ کیا کہ تو تشریف فرما ہوئے۔ ابو محذورہؓ نے آہستہ سے اذان کے الفاظ کہے۔ حضورؐ نے درست ہونے کا اشارہ کیا اور پھر انہوں نے زور سے اذان پڑھی۔

ابو محذورہ زندگی بھر اسی طرح سے اذان دیتے رہے۔ اور جو کوئی اذان کی روایت پوچھتا تھا وہ کہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے سکھایا کہ پہلے اس کو آہستہ سے کہو پھر زور سے کہو۔ اس کو ترجیع کہتے ہیں۔ یعنی لوٹانا، رجوع سے ہے۔ امام ابو یوسف حج کے لئے تشریف لے گئے۔ مکہ مکرمہ میں مختلف محدثین سے اذان کے احکام پوچھے۔ تو وہاں کے کئی لوگوں نے ان کو ترجیع کا طریقہ سکھایا کہ اذان کا سنت طریقہ یہ ہے کہ پہلے آہستہ کہو اس کے بعد بلند آواز سے کہو۔ امام ابو یوسف نے اس کی بنیاد پر فتوی دینا شروع کر دیا کہ اذان میں ترجیع سنت ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد ان کا مدینہ منورہ تشریف لانا ہوا جہاں امام مالکؒ سے ملاقات ہوئی۔ یہ نہیں معلوم کہ اس ملاقات میں یا کسی اور ملاقات میں۔ جب اذان پر بات ہوئی تو امام ابو یوسف نے فرمایا کہ اذان میں ترجیع سنت ہے۔ امام مالکؒ نے کہا کہ ترجیع نہ سنت ہے اور نہ شرط ہے۔ امام ابو یوسف نے فرمایا کہ مجھ سے فلاں محدث نے روایت کی ہے، انہوں نے فلاں سے روایت کی ہے انہوں نے فلاں سے روایت کی انہوں نے فلاں سے روایت کی تو انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے جب ابو محذورہ کو اذان سکھائی تو ترجیع کے ساتھ سکھائی تھی۔ امام مالکؒ نے فرمایا کہ یہ روایت میرے لئے قابل قبول نہیں ہے۔ اب امام ابو یوسفؒ کو حیرت ہوئی کہ میں حدیث صحیح کو پوری متصل سند سے بیان کر رہا ہوں۔ ساری کی ساری شرائط پوری ہیں اور امام مالکؒ کہتے ہیں کہ یہ میرے لئے قابل قبول نہیں ہے۔ امام ابو یوسفؒ نے پوچھا کہ آپ کے پاس کوئی ایسی حدیث متصل موجود ہے جس کی بنیاد پر آپ میری روایت کو نا قابل قبول قرار دے رہے ہیں۔ امام مالک نے کہا نہیں۔ امام ابو یوسف کو اور بھی حیرت ہوئی۔ امام مالکؒ نے کہا اچھا اس کا میں کل جواب دوں گا۔ اگلے دن جب امام ابو یوسف ملاقات کے لئے تشریف لائے تو امام مالکؒ کے ہاں بہت سے حضرات بیٹھے ہوئے تھے۔ امام مالکؒ نے ایک سے پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ انہوں نے کہا کہ میں مدینہ منورہ کی فلاں مسجد کا موذن ہوں۔ انہوں نے کہا کہ اذان دیجئے۔ انہوں نے

ان کا حکم شریعت میں کیا ہے۔ اور فقہاء، علماء اور محدثین کے دور سے لے کر آج تک اس پر عمل درآمد ہوتا چلا آرہا ہے۔ بعض محدثین کا خیال یہ ہے کہ اگر خبر واحد صحیح ہے تو ہر حال میں واجب التعمیل ہے اور اس پر عمل درآمد کیا جائے گا۔ بعض فقہا کا، جن میں حضرت امام ابوحنیفہؒ بھی شامل ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اگر خبر واحد طے شدہ سنت اور قیاس سے متعارض ہو تو قیاس اور طے شدہ سنت کو ترجیح دی جائے گی۔ اور خبر واحد کا کوئی اور مفہوم قرار دیا جائے گا۔ اس پر ظاہری معنوں میں عمل نہیں کیا جائے گا۔ اس میں صرف یہی دو رویے نہیں۔ بلکہ اور بھی آراء موجود ہیں اور دونوں کی بنیاد پر فقہی مسالک وجود میں آئے۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ میں صدر اسلام میں فقہی مسالک جتنے بھی بنے وہ اکثر و بیشتر 75 یا 80 فیصد خبر واحد کے بارے میں اختلاف ہی کی بنیاد پر وجود میں آئے ہیں حدیث کی باقی قسموں کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں۔

امام ابوحنیفہ اپنے اس نقطہ نظر کی تائید میں ایک واقعہ سے استدلال کرتے ہیں۔ ایک خاتون تھیں فاطمہ بنت قیسؓ۔ وہ صحابیہ تھیں اور بڑی عالمہ اور فاضلہ خاتون تھیں۔ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں طلاق کا ایک مقدمہ آیا۔ کسی شخص نے اپنی اہلیہ کو طلاق دے دی۔ اور طلاق دینے کے بعد کہا کہ میرے گھر سے نکل جاؤ۔ مطلقہ خاتون شکایت لے کر حضرت عمر فاروقؓ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور کہا کہ میرے شوہر نے مجھے طلاق دے دی اور گھر سے نکلنے کے لئے کہتے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ قرآن پاک میں مطلقہ کا حکم ہے جس کی رو سے شوہر نفقہ دینے کے بھی پابند ہیں اور رہائش دینے کے بھی پابند ہیں۔ جب تک تم عدت میں ہو یہ دونوں چیزیں ان کے ذمہ ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ اور تمام خلفائے راشدین کا طریقہ تھا کہ کوئی فیصلہ کرنے کے بعد تصدیق (Confirmation) کے لئے بقیہ صحابہ کرام سے پوچھتے تھے کہ کیا میں نے صحیح فیصلہ کیا ہے؟ اپنے سارے علم و فضل کے باوجود حضرت ابوبکر صدیقؓ کا بھی یہی طریقہ تھا، حضرت عمر فاروقؓ کا بھی، حضرت عثمانؓ کا بھی اور حضرت علیؓ کا بھی۔ کہ بقیہ صحابہ کرام سے جو وہاں موجود ہوتے تھے اس کو Verify کراتے تھے۔

چنانچہ یہ فیصلہ کرنے کے بعد حضرت عمرؓ نے صحابہ کرام سے، جو وہاں موجود تھے، پوچھا کہ کیا میں نے درست فیصلہ کیا ہے؟ سب صحابہ نے کہا کہ درست ہے۔ اس پر یہ خاتون جن کا میں نے ذکر کیا یعنی فاطمہ بنت قیس کھڑی ہوئیں اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں میرے

ہوں۔

7۔ پھر وہ جو امام بخاری کی شرطوں پر پوری ہیں لیکن بخاری میں نہیں ہیں۔

8۔ پھر وہ جو مسلم کی شرائط پر پوری ہیں لیکن مسلم میں نہیں ہیں۔

9۔ پھر وہ جن کو بقیہ چار اصحاب سنن نے روایت کیا ہو یعنی ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور نسائی نے۔

10۔ پھر وہ جن کو صرف نسائی نے روایت کیا ہو۔

11۔ پھر وہ جن کو بقیہ ائمہ نے روایت کیا ہو۔

یہ احادیث صحیح میں خبر واحد کے گیارہ درجات ہیں۔ جو متواتر احادیث ہیں وہ ان درجات سے ماوراء ہیں۔ ان کا درجہ سب سے اونچا ہے۔

حدیث حسن کہتے ہیں وہ صحیح کی وہ شکل ہے جس میں صحیح کی شرائط میں سے کوئی ایک آدھ شرط کم ہو۔ اس لئے اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ حدیث ضعیف کی بے شمار قسمیں ہیں۔ جیسا کہ ابھی میں نے عرض کیا کہ امام ابن الصلاح نے بیالیس قسمیں بیان کی ہیں۔ بعض حضرات نے اس سے بھی زیادہ قسمیں بیان کی ہیں۔ اور ان قسموں میں سے ہر ایک کا الگ الگ حکم ہے۔

چند قسمیں مثال کے طور پر میں بیان کرتا ہوں۔ آٹھ قسمیں بیان کر دیتا ہوں۔

حدیث ضعیف کی اقسام

مرسل حدیث

حدیث ضعیف میں سب سے اونچی قسم حدیث مرسل ہے۔ مرسل کے معنی چھوڑی ہوئی یا Open۔ لیکن اصطلاح حدیث میں مرسل سے مراد وہ حدیث ہے جس میں کسی تابعی نے براہ راست رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک یا آپ کا عمل مبارک نقل کیا ہو اور درمیان میں صحابی کا ذکر نہ کیا ہو۔ مرسل احادیث اکثر و بیشتر محدثین کی نظر میں قابل قبول نہیں ہیں۔ محدثین کی بڑی تعداد مرسل احادیث کو قابل قبول نہیں سمجھتی۔ البتہ فقہاء کی بڑی تعداد مرسل احادیث کو قابل قبول سمجھتی ہے بشرطیکہ وہ کسی ایسے تابعی سے منقول ہوں جو ثقہ اور شریعت میں گہرائی کی وجہ سے مشہور ہوں۔

اس کا درجہ اس کے حساب سے ہوگا۔ لیکن منقطع میں جو نام گرا ہوا ہے یہ معلوم ہے تو کہیں بھی ہو سکتا ہے کہ درمیان آتی ہے۔

معضل حدیث

اس کے بعد معضل حدیث کا درجہ آتا ہے۔ معضل وہ حدیث ہے جس میں دو راوی گر گئے ہوں۔ دو راوی گرے ہوں، دونوں متصل ہیں یا غیر متصل ہیں۔ یہ سارے امکانات موجود ہیں۔ ان کا ضبط کس درجہ کا تھا، حفظ کس درجہ کا تھا، تحمل کے وقت وہ مسلمان ہوئے تھے کہ نہیں ہوئے تھے، یہ سارے مسائل جو حدیث صحیح میں تھے وہ پیدا ہوں گے۔

مدلّس حدیث

اس کے بعد ایک قسم مدلس کی ہے۔ مدلس اس حدیث کو کہتے ہیں کہ جس میں روایت بیان کرنے والے نے جان بوجھ کر misrepresentation کی ہو۔ روایت حدیث میں تدلیس کا رواج دوسری صدی میں شروع ہوا۔ دراصل جب کسی چیز سے لوگوں کو عزت ملنا شروع ہوتی ہے تو اس کے حصول کے لئے ایک مقابلہ اور مسابقت شروع ہو جاتی ہے اور مسابقت میں ہر ایک کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنے کو نمایاں کرے۔ اب فرض کریں دورِ قرآن کی میں مثال دیتا ہوں کہ آپ ڈاکٹر فرحت ہاشمی سے پڑھتی ہیں، ان کا بڑا اونچا درجہ اللہ نے رکھا، بڑی شہرت عطا فرمائی، دین کو قبولیت حاصل ہوئی۔ اب فرض کریں کہ کسی اور نے بھی اس شہر میں دین کا حلقہ شروع کیا۔ اتفاق سے ان خاتون کو کسی وجہ سے وہ شہرت نہیں ملی، کیونکہ شہرت اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ اب اگر ان کے کچھ شاگرد کہیں اور جا کر بیٹھ جائیں اور ایک خاتون آپ کے ہاں سے جا کے پڑھانا شروع کر دیں اور دونوں جا کر فرض کریں لندن میں دین کا حلقہ قائم کریں۔ آپ کے ہاں سے جانے والی خاتون ہر جگہ جا کر فخریہ بیان کریں گی کہ انہوں نے ڈاکٹر فرحت کے ہاں سے پڑھا ہے۔ اس کے برعکس وہ دوسری خاتون جب اپنے استاد کا نام لیتی ہیں تو ان کو کوئی نہیں جانتا۔ ان کی طرف لوگ کم جاتے ہیں، آپ کی طرف زیادہ آتے ہیں۔ اب اگر وہ خاتون یہ کہیں کہ میں نے اسلام آباد کی ایک بڑی مستند خاتون سے علم قرآن حاصل کیا ہے تو سننے والا سمجھے گا کہ شاید ڈاکٹر فرحت سے علم حاصل کیا ہے۔ اس طرح کی غلط بیانی جھوٹ تو نہیں ہے لیکن ایک طرح

کی misrepresentation ضرور ہے، یا اس سے کم از کم misrepresentation کا امکان ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔ تو مدلس اس حدیث کو کہتے ہیں کہ جس میں راوی جان بوجھ کر ایسے الفاظ استعمال کرے کہ جس سے سننے والے کو یہ تاثر ملے کہ اس نے کسی مستند آدمی سے یا فلاں خاص آدمی سے روایت حاصل کی ہے۔ یا انہوں نے براہ راست حاصل نہ کی ہو، بیچ سے کوئی راوی ان کا ال گئی۔ اب وہ روایت کرتے ہیں کہ فلاں صاحب بیان کرتے ہیں۔ بیان ضرور کرتے ہیں، ہو سکتا ہے کسی سے بیان کیا ہو گا، لیکن آپ سے بھی بیان کیا ہے کہ نہیں اور آپ کو بیان کرنے کی اجازت دی ہے کہ نہیں۔ اس کو درمیان میں حذف کر دیا کرتے تھے۔ یہ نہیں کہتے تھے کہ اخبرنی یا حدثنی یعنی میں نے یہ سنا، یا مجھ سے انہوں نے یہ بیان کیا، وہ آ کے بیٹھے اور کہا کہ فلاں صاحب یہ حدیث بیان کرتے ہیں۔ یا فلاں صاحب سے روایت ہے، کس کی روایت ہے، کس کو انہوں نے تھوڑا سا چھپایا۔ اس طرح کی احادیث کو مدلس کہتے ہیں۔ اور کچھ لوگوں نے یہ کام کیا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ لیکن محدثین نے ان کو پکڑ لیا کہ یہ حدیث مدلس ہے۔ مدلس بھی حدیث ضعیف کی ایک قسم ہے۔

معلل حدیث

علت کا میں ذکر کر چکا ہوں کہ جس میں کوئی علت پائی جاتی ہو وہ حدیث معلل کہلاتی ہے۔ معلل حدیث کا پتہ چلانا خاصا مشکل ہوتا ہے۔ اور بڑی مشکل سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ کوئی حدیث معلل ہے کوئی نہیں۔ محدثین نے اس پر کتابیں لکھی ہیں۔ علل الحدیث کے نام سے ایک الگ فن ہے۔ اور علم حدیث کے فنون میں سب سے مشکل فن ہے۔

شاذ حدیث

اس کے بعد شاذ حدیث کا درجہ ہے۔ یہ وہ حدیث ہے جس میں باقی سب چیزیں تو بالکل ٹھیک ہیں لیکن بات جو بیان کی گئی ہے وہ ایسی ہے کہ قرآن پاک کے عام احکام کے خلاف ہے۔ ایک نئی چیز ہے جو حدیث کے احکام سے متعارض ہے۔ وہ شاذ کہلاتی ہے۔ اس کی تعریف یہ ہے کہ ما رواہ الثقۃ مخالفا للثقات۔ یعنی ایک ثقہ راوی بقیہ ثقہ راویوں کے مخالف کوئی چیز بیان کرے۔

منکر حدیث

اس کے بعد منکر حدیث کا درجہ ہے۔ کہ ایک ضعیف راوی دوسرے ثقہ راویوں کے خلاف کوئی چیز بیان کرے۔ شاذ اور منکر ایک ہی چیز ہے۔ شاذ وہ ہے کہ جو ثقہ راوی سے آئے، منکر وہ ہے جو غیر ثقہ راوی سے آئے۔

متروک حدیث

اور آخری درجہ متروک حدیث کا ہے یعنی وہ حدیث جس کو ترک کر دیا گیا ہو، جس کے بارے میں آپ یقین سے اور قطعیت کے ساتھ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ یہ موضوع ہے اور حضورؐ سے جھوٹ منسوب ہے۔ لیکن آپ کو یہ یقین ہے کہ یہ بات عمل کرنے کے قابل نہیں ہے۔ یا تو وہ راوی ایسا ہے کہ فسق و فجور میں مبتلا ہے، یا ایسا راوی ہے کہ اس کے بارے میں نام شہرت ہے کہ اس کی یادداشت درست نہیں ہے۔ ایک مخبوط الحواس قسم کا آدمی ہے، راوی یا شبہ نیک آدمی ہوں گے، بزرگ بھی ہوں گے، لیکن ذہنی طور پر اس درجہ کے نہیں ہیں کہ ان کی بات بھروسہ کے قابل ہو۔ ایسی روایت متروک کہلاتی ہے۔ یہ نا قابل قبول احادیث کی مختلف قسمیں تھیں۔

موضوع احادیث

آخری درجہ جس کو صرف مجازاً حدیث کہتے ہیں وہ حدیث موضوع ہے۔ موضوع سے مراد وہ بات یا وہ قول جو غلط طور پر رسول اللہ ﷺ سے منسوب ہو گیا ہو لیکن حضورؐ کا ارشاد یا حضورؐ کا عمل نہ ہو۔ آپ کے ذہن میں سوال پیدا ہوگا کہ اس کا پتہ کیسے چلے گا۔ محدثین نے اسی لئے یہ ساری کاوشیں کیں اور ان چیزوں کا پتہ چلایا کہ رسول اللہ ﷺ سے غلط طور پر جو چیزیں منسوب ہیں وہ کیا ہیں۔ اور ایک جملہ میں آپ سے عرض کرتا ہوں اس کو ہمیشہ یاد رکھئے گا کہ دنیا میں آج جتنی بھی مذہبی کتابیں موجود ہیں، بشمول بائبل نیا عہد نامہ، پرانا عہد نامہ اور دیگر ساری مذہبی کتابیں وہ تاریخی اور علمی حیثیت سے ہماری موضوع احادیث سے بھی کم درجہ کی ہیں۔ موضوع احادیث بھی تاریخی طور پر ثابت شدہ ہیں۔ کم از کم یہ تو پتہ ہے کہ یہ احادیث کس نے وضع کیں۔ کس زبان میں وضع کیں۔ جس نے وضع کیں وہ کس زمانے کا تھا، کس علاقہ میں وضع کیں، اس کے

الفاظ کیا تھے، وہ الفاظ بعینہٖ ہم تک پہنچے ہیں۔ بائبل کے بارے میں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ کس زمانے میں لکھی گئی۔ حتمی طور پر یہ بھی ابھی تک طے نہیں کہ موجودہ انجیل اول اول کس زبان میں لکھی گئی، کس نے لکھی، کہاں لکھی گئی۔ خلاصہ یہ کہ علمی اور تاریخی طور پر ہماری موضوع احادیث بھی ان کتابوں کی نسبت کہیں زیادہ مستند اور تاریخی طور پر ثابت شدہ ہیں جن کو آج لوگ مذہبی کتابیں مانتے ہیں۔ اس سے آپ ہمارے اداروں کے معیار کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

موضوع ہونے کا پتہ اس طرح بھی چلتا تھا کہ بعض اوقات لوگ خود اعتراف کر لیتے تھے۔ ایک شخص تھا، غالباً اس کا نام عبدالکریم بن ابی العوجا تھا۔ یہ شخص خلیفہ ہارون الرشید کے زمانے میں گرفتار ہوا۔ اس کے بارے میں شکایت تھی کہ یہ شخص جھوٹی حدیثیں گھڑ گھڑ کر لوگوں سے بیان کرتا ہے۔ تحقیق سے ثابت ہوا کہ واقعی ایسا ہی کرتا ہے۔ عدالت میں اس کے لئے سزائے موت کا حکم ہوا۔ اس زمانے میں طریقہ یہ تھا کہ سزائے موت خلیفہ کے پاس نے کنفرم ہوا کرتی تھی۔ آج بھی سزائے موت کو سربراہ مملکت کنفرم کرتا ہے۔ خلیفہ ہارون رشید نے اس کو بلایا اور خود بھی مزید تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ واقعی اس نے چار ہزار حدیثیں گھڑی ہیں۔ اس نے اعتراف بھی کرلیا۔ جب سزائے موت کے لئے لے جانے لگے تو اس نے خلیفہ سے کہا کہ آپ مجھے مروا تو رہے ہیں لیکن ان چار ہزار حدیثوں کا کیا کریں گے جو میں نے گھڑ کر پھیلادی ہیں۔ ان جعلی حدیثوں میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دے دیا گیا ہے۔ ہارون نے کہا کہ تم ان چار ہزار کی فکر نہ کرو، اگر چالیس ہزار بھی پھیلادیتے تو ہمارے ہاں شعبہ بن الحجاج جیسے لوگ موجود ہیں الذی یسعلہ نخلا، جو چھلنی میں سے چھان کر نکال دیتے ہیں کہ کیا چیز صحیح ہے کیا غلط ہے۔ گویا ایسے ماہر فن محدثین موجود تھے جن کا ہارون الرشید نے ذکر کیا مثلاً شعبہ بن الحجاج جیسے لوگ موجود ہیں جو چھان کر نکال دیں گے اور کھوٹے اور کھرے کو الگ الگ کردیں گے۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔ چنانچہ انہوں نے کھوٹے اور کھرے کو الگ الگ کردیا اور آج سب کے سامنے ہے کہ کیا چیز حضورؐ کا ارشاد ہے اور کیا آپؐ کا ارشاد نہیں ہے۔

یہ تو مثال اس کی ہے کہ جہاں وضع کرنے والے اور گھڑنے والے نے خود اعتراف کیا ہو کہ میں نے گھڑا ہے۔ لیکن اکثر وہ اعتراف نہیں کرتا تھا، یا پتہ نہیں چلتا تھا کہ کس نے سب سے پہلے گھڑی، یا گھڑنے کے بعد پھیلادی اور مرگیا، یا کسی فرضی نام سے پھیلادی۔ اس کی وجہ

نشانیاں اور کچھ پہچان علماء حدیث نے مقرر کی ہیں جو اکثر و بیشتر موضوعات کی کتابوں میں بھی موجود ہیں۔ موضوعات پر جن لوگوں نے کتابیں تیار کی ہیں اور موضوع احادیث کو الگ جمع کیا ہے ان کے شروع میں وہ اصول بیان کئے ہیں جن کے نتیجہ میں کسی حدیث کے موضوع ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

اس میں سب سے بڑی پہچان تو الفاظ کا جھول ہے یا غیر معیاری عبارت یا غیر معیاری الفاظ ہوں، رکاکۃ العبارۃ یا رکاکۃ اللفظ۔ رسول اللہ ﷺ فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ ترین معیار پر فائز تھے۔ حضورؐ افصح العرب ہیں اور دنیا نے تسلیم کیا ہے کہ حضورؐ افصح العرب ہیں۔ اس لئے کوئی ایسا جملہ جو گھٹیا قسم کا ہو، یا گھٹیا عبارت پر مبنی ہو یا عبارت جھول رکھتی ہو، اور فصاحت و بلاغت کے معیار سے گری ہوئی ہو وہ قطعاً رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نہیں ہو سکتی۔ جن حضرات نے پوری زندگی علم حدیث میں گزاری اور سالہا سال انہوں نے شب و روز حدیث کا مطالعہ رکھا ان کو ایک بصیرت اور ایک ملکہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ یہ اندازہ کر لیتے ہیں کہ یہ حدیث حضورؐ کا ارشاد نہیں ہو سکتی۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کوئی شخص اپنی ذاتی Subjective Opinion سے رائے دے دیتا تھا، ایسا نہیں تھا۔ بلکہ ماہرین حدیث کو محسوس ہو جاتا تھا کہ یہاں کوئی گڑبڑ ہے، پھر تحقیق سے بھی ثابت ہو جاتا تھا کہ یہاں واقعی گڑبڑ تھی۔

ایک محدث نے صحیح حدیث کے بارے میں لکھا ہے کہ لہ ضوء کضوء النہار، حدیث صحیح میں سے ایسی روشنی نکلتی معلوم ہوتی ہے جیسے سورج سے روشنی نکلتی ہے۔ اور حدیث موضوع کے بارے میں لکھا ہے لہ ظلمۃ کظلمۃ اللیل، حدیث موضوع میں ایسی تاریکی ہوتی ہے جیسے رات کی تاریکی ہوتی ہے۔ جب تحقیق کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ واقعی اس میں یہ جھول ہے۔

بعض چیزیں ایسی حضورؐ سے منسوب کر دی گئیں جو عام عقل اور مشاہدہ کے خلاف ہیں۔ اور بعض بڑی مضحکہ خیز قسم کی چیزیں مشہور کر دی گئی ہیں مثلاً ایک کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ کہ مرغا جب بولتا ہے تو فرشتے کو دیکھ کر بولتا ہے۔ بھلا مرغے کو فرشتے سے کیا تعلق ہے۔ بالبداہت غلط بات ہے۔ اس طرح کی اور بہت سی چیزیں جو بہت فضول قسم کی ہیں لیکن مشہور کر دی گئی ہیں۔

بعض چیزیں جو غیر اخلاقی اور بے حیائی کی چیزوں پر مشتمل ہوں وہ بھی موضوع ہیں۔ رسول اللہ کی زبان مبارک سے نعوذ باللہ کوئی ایسا لفظ نہیں نکل سکتا جو بے حیائی اور غیر اخلاقیات

چونکہ ہمارے سامنے بہت سی بے ہودہ اور بے تکی قسم کی چیزیں حضورؐ سے منسوب کر دی گئی ہیں۔ کس لئے یہ بے ہودہ چیزیں حضورؐ سے منسوب کر دیں؟ بعض لوگ خود بدکردار تھے، بعض نے محض کھیل میں کر دیں، شرارتاً کر دیں، کچھ نے ویسے ہی کر دیں، مختلف اسباب ہو سکتے ہیں جن کا ابھی ذکر آئے گا۔

ایک اور چیز ہے، ہمارے محدثین کے ہاں یہ اصول ہے کہ کسی چھوٹے عمل پر اتنے بڑے ثواب کا وعدہ ہو کہ جو غیر معمولی طور پر بڑا معلوم ہو تو اسے قبول نہیں کیا جائے گا۔ اگر آپ موضوعات پر نظر ڈالیں تو آپ کو اس کی مثالیں مل جائیں گی۔ مثلاً ایک جگہ لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص صبح اٹھنے کے بعد ایک مرتبہ کلمہ کہے تو اس کے ہر حرف سے ستر ہزار فرشتے پیدا ہوں گے۔ وہ ستر ہزار فرشتے اس کے لئے روزانہ دعا کریں گے اور ہر دعا سے ستر ہزار فرشتے نکلیں گے وہ دعا کریں گے اور قیامت تک اس کے لئے دعا کریں گے۔ یہ فضول سی بات ہے۔ مطلب یہ کہ آدمی کلمہ شہادت پڑھے، لا الہ الا اللہ پڑھے تو اس کا اجر و ثواب اپنی جگہ لیکن یہ بات کہ اس سے اتنے فرشتے پیدا ہوں گے وغیرہ وغیرہ، اس طرح کا کلام رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے نہیں نکلتا تھا۔ صحیح بخاری پوری پڑھ لیں آپ کو اس طرح کی کوئی فضول چیز نظر نہیں آئے گی، صحیح مسلم میں نظر نہیں آئے گی، موطا امام مالکؒ میں نہیں ملے گی۔ اس طرح کی فضول باتیں اور قصے کہانیوں میں، واعظوں کے بیانوں میں اور گاؤں اور دیہاتوں میں بڑی جلدی مقبول ہو جاتی ہیں۔ کم علم لوگ اس طرح کی چیزیں بیان کرتے ہیں، اس لئے وہاں اس طرح کی چیز ملے گی۔ حدیث کی صحیح کتابوں میں نہیں ملے گی۔ ایسی ہی کمزور باتوں میں جنت کی کیفیات اور جہنم کی کیفیات اور ان کی اتنی تفصیلات کہ جیسے کسی نے فلم بنائی ہو، اس طرح کی تفصیلات حدیث میں نہیں آ سکیں۔ یہ بھی موضوع حدیث کی ایک علامت ہے۔

موضوع احادیث کی تخلیق کے اسباب

موضوع حدیث کیوں ہمارے سامنے آئی اور کیسے وضع ہوئی؟ اس کے مختلف اسباب ہیں۔ یہ بات نہیں ہے کہ جنہوں نے موضوع حدیث بیان کی وہ سارے کے سارے بددیانت لوگ تھے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ ایک صحابیؓ کا قول ہے، صحابیؓ نے بیان کیا اور سننے والے

نے یہ سمجھا کہ شاید رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہوگا۔ انہوں نے غلط فہمی میں اس کو رسول اللہ ﷺ کی حدیث کے طور پر بیان کر دیا۔ حالانکہ وہ ارشاد کسی صحابی کا تھا۔ اس لئے محدثین اپنی اصطلاح میں اس کو موضوع حدیث قرار دیں گے۔ اس لئے کہ وہ حضورؐ کا ارشاد نہیں ہے لیکن اصل میں وہ کسی صحابی کا ارشاد ہوگا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ کسی بہت نیک اور اللہ والے انسان نے جو بڑے عبادت گزار اور مخلص آدمی تھے لیکن عقل میں ذرا کم تھے، انہوں نے کسی کو کوئی اچھی بات بیان کرتے ہوئے سنا اور سمجھے کہ یہ واقعی اچھی بات شاید حضورؐ نے فرمائی ہو اور اس کو حدیث کے طور پر بیان کرنا شروع کر دیا۔ بعض اوقات یہ بھی ہوا کہ کچھ لوگوں نے کسی سیاسی مصلحت سے اپنے اپنے سیاسی موقف کے حق میں احادیث بیان کرنی شروع کر دیں۔ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد اور پہلی صدی ہجری میں بہت سے ایسے واقعات پیش آئے۔ کچھ لوگوں نے بد نیتی کی بنیاد پر حضورؐ سے ارشادات منسوب کر دئے تاکہ اس کے ذریعے اپنے سیاسی موقف کے لئے حمایت حاصل کر سکیں۔ اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ حدیث حضورؐ کا ارشاد ہو سکتی ہے کہ نہیں۔

اسی طرح سے بعد میں جب فقہ یا کلام یا عقائد میں اختلافات ہوئے تو بعض حضرات نے اپنی اپنی پسندیدہ شخصیات کے بارے میں احادیث گھڑ کر حضورؐ کی ذات سے منسوب کر دیں۔ مثلاً ایک شخص نے امام ابو حنیفہؒ کے بارے میں حدیث گھڑ دی کہ میرے بعد ایک شخص ہوگا جس کا نام ابو حنیفہ ہوگا۔ هو سراج امتي، سراج امتي، سراج امتي یعنی وہ میری امت کا چراغ ہوگا، میری امت کا چراغ ہوگا، میری امت کا چراغ ہوگا۔ حضورؐ کا ایسا کوئی ارشاد نہیں ہے یہ بالکل جھوٹ اور فضول بات ہے۔

اسی طرح شاید کسی حنفی نے جو بڑا متعصب تھا اس نے امام شافعیؒ کے خلاف حدیث گھڑ دی کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میری امت میں ایک شخص آئے گا کہ جس کا نام محمد بن ادریس هو اضر علی امتی من ابلیس کہ خود بالله وہ میری امت کے لئے ابلیس سے زیادہ نقصان دہ ہوگا۔ امام شافعیؒ جیسے انتہائی متقی، بزرگ اور مجتہد کے بارے میں یہ فضول بات پھیلا دی۔ اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ حدیث موضوع ہے۔

موضوع حدیث کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے بعد آنے والے کسی انسان کا نام لے کر کوئی پیشین گوئی نہیں کی۔ جس حدیث میں نام کے ساتھ کوئی پیشین گوئی

بیان ہوئی ہے وہ ساری کی ساری احادیث موضوع ہیں۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے کسی خاص
قوم یا پیشہ کے لوگوں کی برائی بیان نہیں کی۔ کہ مثلاً بصرہ کے لوگ برے ہیں، اور کوفہ کے اچھے
ہیں، یا خراسان کے برے ہیں اور مصر کے اچھے ہیں۔ جہاں کسی علاقہ کی برائی حضورؐ سے منسوب
ہوئی ہے وہ حضورؐ کی زبان مبارک کے الفاظ نہیں ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ طریقہ نہیں تھا۔ قرآن
پاک میں ہے "لا یسخر قوم من قوم" کوئی قوم کسی دوسری قوم کے ساتھ تمسخر نہ کرے۔ حضورؐ
ایسا کیسے کر سکتے تھے۔ کسی قبیلہ کا نام لے کر برائی کہ فلاں قبیلے کے لوگوں میں یہ برائی ہے یا فلاں
علاقہ کے لوگوں میں یہ برائی ہے حضورؐ نہیں فرماتے تھے۔ اس طرح کی جتنی احادیث ہیں وہ سب
کی سب موضوع ہیں۔ یہ کچھ علامات اور پیمانے ہیں جو علم حدیث کے ماہرین نے مقرر کی ہیں
اور جن سے موضوع احادیث کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

محدث جب حدیث بیان کیا کرتے تھے تو اس کے بہت سے انداز ہوتے تھے۔ ان
سب کے درجات الگ الگ ہیں۔ سماع یعنی استاد کی زبان سے براہ راست سنا اور اس کی تصریح
کرنا تحمل کا سب سے اونچا درجہ ہے۔ محدث سے براہ راست سنا۔ پھر سننے کے بعد جب
شاگرد آگے بیان کرتا ہے تو بیان کرنے کے جو الفاظ ہیں اس کے مختلف درجات ہیں۔ سب سے
اونچا درجہ ہے سمعته یقول، کہ میں نے ان کو یہ بیان فرماتے سنا۔ اس میں کوئی شک نہیں
کہ انہوں نے براہ راست سنا اور وہ اپنی زبان سے بیان فرما رہے تھے۔ اس کی ایک مثال صحیح
بخاری کی پہلی روایت ہے۔ کتاب شروع ہوتی ہے "کتاب بدء الوحی" اور پہلا باب ہے "کیف
کان بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ" پھر آگے بیان کرتے ہیں: حدثنا الحمیدی قال
حدثنا سفیان عن یحیی بن سعید الانصاری قال اخبرنی محمد بن ابراہیم التیمی انہ
سمع علقمۃ بن وقاص اللیثی یقول، کہ انہوں نے علقمہ بن وقاص اللیثی کو یہ بیان کرتے
ہوئے سنا: سمعت عمر بن الخطاب علی المنبر یقول، کہ میں نے حضرت عمر فاروقؓ کو یہ
ارشاد فرماتے سنا، فرمایا سمعت رسول اللہ ﷺ یقول، وہ یہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ
ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا کہ "انما الاعمال بالنیات"۔ یہ سب سے اونچا درجہ ہے جس میں
محدث یہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے شیخ اور استاد کو سنا اور وہ یہ بیان فرما رہے تھے۔

دوسرا درجہ ہے "حدثنی" کہ انہوں نے مجھ سے بیان کیا۔ اس کے بعد ہے حدثنا کہ

دار ہیں، ان کا نیکی و وزن والے یا کوئی اور وزن نہیں لے سکتا۔ اس لئے کہ پہلے سے تو معلوم نہیں ہوتا کہ کوئی شخص کونسی حدیث بیان کرے گا۔ اس لئے اس بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔

حضرت امیر معاویہؓ کے بیٹے حضرت یزید کے بارے میں جو حدیث ہے کہ میری امت کی وہ جماعت جو قسطنطنیہ یعنی موجودہ استنبول کو فتح کرے گی، وہ جماعت جنت میں جائے گی اور اس جماعت کے سپہ سالار یزید تھے تو کیا یہ حدیث صحیح ہے؟ کیونکہ آپ نے ایک خاص جماعت کو اس میں تعظیم دی ہے۔

اس موضوع پر مسند امام احمد میں دو حدیثیں آئی ہیں۔ پہلی حدیث میں استنبول کی فتح کا عمومی ذکر ہے۔ اس میں یزید میرے خیال میں شامل نہیں ہیں۔ میں حدیث کے الفاظ بیان کر دیتا ہوں: لتفتحن مدينة قيصر، کہ تم ضرور بالضرور قیصر کے شہر کو فتح کرو گے، جو قسطنطنیہ کے نام سے مشہور تھا، فلنعم الامير اميرها و نعم الجيش ذلك الجيش۔ وہ امیر کتنا ہی اچھا امیر ہوگا اور وہ لشکر کتنا ہی اچھا لشکر ہوگا۔ قسطنطنیہ کی فتح 1492ء میں ہوئی تھی۔ بہت سے لوگ قسطنطنیہ پر حملہ کرنے جاتے رہے ہیں کہ شاید ان کے ہاتھوں فتح ہو جائے اور وہ اس بشارت کے مصداق بن جائیں۔ یزید نے بھی کوشش کی لیکن یہ فتح یزید کے مقدر میں نہیں تھی۔ بلکہ محمد الفاتح کے ہاتھوں مقدر تھی جو عثمانی حکومت کا ایک بادشاہ تھا اور اسی لئے اس کو فاتح کہا جاتا ہے کیونکہ اس نے استنبول فتح کیا تھا۔ فتح کے بارے میں ایک روایت تو یہ ہے۔

مسند امام احمد کی ایک دوسری روایت ہے جس میں ہے کہ اول جيش يغزو مدينة قيصر مغفور لهم۔ یا اس طرح کے کچھ الفاظ ہیں۔ کہ وہ پہلا لشکر جو قیصر کے شہر پر حملہ کرے گا وہ مغفور لہم ہوگا۔ اب اس میں یغزو کا لفظ ہے۔ کیا اس سے مراد محض حملہ کرنا ہے یا فتح کر لینا مراد ہے۔ بعض روایات میں فتح کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے حملہ کرنا مراد ہے تو پہلا حملہ جس لشکر نے کیا اس کی سربراہی یزید کے ہاتھ میں تھی اور اس میں بڑے بڑے صحابہ کرامؓ بھی شامل تھے۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ اسّی سال کی عمر میں اسی لئے تشریف لے گئے تھے کہ اس بشارت کے مصداق بن سکیں۔ چنانچہ وہاں محاصرہ ہی میں ان کا انتقال ہوا اور وہیں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ استنبول میں ان کا مزار آج بھی ہے۔ اور آپ میں سے جو وہاں گئے ہیں انہوں نے دیکھا ہوگا۔ میں نے بھی کئی بار ان کی زیارت کی ہے۔ اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہاں یغزو سے مراد کیا ہے، محض حملہ یا مکمل فتح۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے کہ کس کو اس کا مصداق

قرار دیتا ہے اور کسی کو نہیں۔

آپ نے کہا ہے کہ حضورؐ نے اپنے بعد آنے والے کسی شخص کا نام لے کر کوئی بات نہیں فرمائی لیکن قیامت کی نشانیوں میں کہ امام مہدی کا نام ملتا ہے؟

امام مہدی کے بارے میں جو احادیث ہیں ان کے بارے میں بڑی تفصیل سے بحث ہوئی ہے۔ اس میں دو ہی تواتر والی بات یاد رکھیں۔ یہ احادیث صحابہ کرام کی بڑی تعداد سے مروی ہیں اور صحابہ کے بعد بھی بڑی تعداد میں لوگوں سے مروی ہے۔ اگرچہ انفرادی طور پر یہ ساری احادیث اخبار آحاد ہیں لیکن ان میں کچھ باتیں قدر مشترک ہیں جن کو ہم تواتر قدر مشترک قرار دے سکتے ہیں۔ ان میں قدر مشترک کسی کا نام نہیں ہے۔ قدر مشترک یہ ہے کہ میرے بعد آخری زمانہ سے پہلے ایک ایسا قائد، ایک ایسا متدین اور ہدایت یافتہ امام مسلمانوں کو ملے گا جو میرے طریقے کو دوبارہ زندہ کر دے گا۔ تواتر قدر مشترک کے اصول پر اتنی بات مشترک ہے۔ باقی کوئی چیز قدر مشترک نہیں ہے۔ ان روایات میں بہت سی ضعیف بھی ہیں، بلکہ کچھ روایات ان میں سے موضوع بھی ہیں۔ اس لئے جہاں نام کے تعین کے ساتھ ذکر آیا ہے وہ بعض محدثین کے نزدیک موضوع ہے اور جو لوگ اس کو موضوع نہیں سمجھتے ان کے نزدیک وہ احادیث سب کی سب ضعیف یا زیادہ سے زیادہ حسن لغیرہ ہیں۔ اس لئے یہ اصول کہ نام کے ساتھ جو روایات آئی ہیں وہ قابل قبول نہیں ہیں، یہ اصول باقی رہتا ہے اور مہدی کی روایت سے ٹوٹتا نہیں ہے۔ مہدی کی احادیث تواتر قدر مشترک سے ثابت ہیں۔ ان میں نام والی احادیث کا درجہ کم ہے۔

شب برات کے موقع پر اجتماعات میں شب برات کی رات کو عبادت کی فضیلت کے بارے میں احادیث بھی بیان کی جاتی ہیں۔

نصف شعبان کے بارہ میں ایک حدیث آئی ہے جو کہ میرے خیال میں بہت ضعیف ہے اور ضعیف کے بھی بہت نچلے درجہ پر ہے۔ پندرھویں شعبان کی کوئی فضیلت حدیث کی مستند کتابوں میں نہیں آئی۔ اور قرآن پاک کی جس آیت کا لوگ حوالہ دیتے ہیں اس سے مراد کوئی اور رات نہیں ہے، بلکہ لیلۃ القدر ہے اور لیلۃ القدر ہی کا نام لیلۃ الفرقان ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ اپنا جسم نماز میں کتے کی طرح مت بچھاؤ۔ اس میں جسم خود بخود ہو جاتا ہے۔ اس کی وضاحت فرمائیں۔

کتے کی طرح بچھانے سے مراد یہ ہے کہ دونوں بازو زیادہ نہ پھیلائے جائیں بلکہ پسلیاں اوپر کو ہو جائیں۔ کتا جب بیٹھتا ہے دونوں بازو پھیلا کر بیٹھتا ہے تو اس کی ممانعت ہے لیکن خواتین اگر اس کو مناسب نہیں سمجھتیں اور کہنیاں زمین پر پھیلا کر رکھیں تو دونوں پر عمل ہو جاتا ہے۔

اجازہ اور مناولہ میں شیخ حدیث کی اجازت ضروری ہے تو قرآن پاک کی تفسیر یا متن سے علاوہ علم حدیث ہم پڑھا سکتے ہیں۔

میں نے عرض کیا تھا شاید آپ کو یاد نہیں رہا کہ اجازہ و مناولہ کے یہ طریقے اس وقت تک زیر بحث تھے جب تک کتب حدیث مرتب اور مدون ہو کر شائع نہیں ہوئی تھیں۔ اب جو چیز مرتب ہو کر شائع ہو چکی ہے اب اس میں کسی کی طرف سے اضافہ یا حذف ہونے کا امکان نہیں ہے۔ لہذا اجازہ بھی درست ہے اور مناولہ بھی درست ہے۔ اگر آپ کسی شیخ حدیث کے پاس جائیں اور وہ واقعی آپ کا امتحان لے کر محسوس کریں کہ آپ حدیث بیان کر سکتے ہیں تو پوری احتیاط سے آپ کو دے کر اجازت دے کر آپ سے کہہ سکتے ہیں کہ آپ روایت کریں یا کاغذ پر لکھ کر اجازت دے دیں۔ مجھے بھی ایک بزرگ نے پڑھنے کے بعد لکھ کر اجازت دی تھی کہ میں علم حدیث پڑھا سکتا ہوں۔ میرے پاس وہ تحریری اجازت موجود ہے اس لئے آج کی کیفیت اور ہے۔ یہ گفتگو جو مناولہ کے بارے میں میں نے کی ہے یہ اس زمانے کی بات ہے جب حدیث مرتب کر کے اس طرح سے چھپی ہوئی صورت میں سامنے نہیں آئی تھی۔

آپ نے فرمایا کہ وحی چوبیس ہزار مرتبہ نازل ہوئی۔

یہ جو چوبیس ہزار مرتبہ کا ذکر ہے یہ بعض کتابوں میں آیا ہے۔ علامہ سیوطی نے الاتقان میں بھی لکھا ہے اور علامہ زرکشی نے البرہان میں بھی لکھا ہے۔ جہاں جہاں وحی سے متعلق مباحث مفسرین قرآن نے بیان کئے ہیں وہاں چوبیس ہزار مرتبہ کا ذکر آیا ہے۔ اس لئے چوبیس ہزار مرتبہ کا ذکر اگر درست ہے تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ سنت بھی وحی کے ذریعے نازل ہوئی ہے اور یقیناً وحی کے ذریعے نازل ہوئی ہے۔ لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ سنت وحی کے کس خاص طریقے سے نازل ہوئی؟ کیا اس طریقہ سے جس سے قرآن پاک نازل ہوا؟ اس بارہ میں ہمارے لئے قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا دشوار ہے۔

روایت میں، جہاں حضور نے قوم کی تعریف کی

میں نے تعریف کا لفظ نہیں لیا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ اگر کسی روایت میں کسی قوم کی برائی ہوئی ہے تو وہ روایت صحیح نہیں، اس لئے کہ کسی قوم یا گروہ کی برائی حضور نے نہیں کی۔ تعریفیں تو بہت ساری کی ہیں۔ انصار کی تعریف کی ہے۔ یمن کی تعریف کی ہے۔ الایمان یمان والحکمة یمانیة۔ قریش کی تعریف بھی کی ہے۔ تعریفیں بہت ساری کی ہیں۔ لیکن اگر برائی کسی قوم کی کی ہو کہ فلاں قبیلے کے لوگ بڑے برے ہیں، فلاں قوم کے لوگ بڑے چور ہوتے ہیں یا حبشی بڑے نالائق ہوتے ہیں، اس طرح کی بات کبھی حضور نے نہیں کی ہے۔ البتہ تعریفیں بہت ساری کی ہیں۔

سوال: ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (سوال واضح نہیں کیا جا سکا، اس لئے کیسٹ میں موجود نہیں ہے۔)

لیکچر کے شروع میں قطعی الدلالت اور قطعی الثبوت تو کل میں نے بتا دیا تھا۔ کل میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن مجید یا حدیث یا سنت میں جو کچھ لکھا ہوا ہے اس کو اصطلاح میں نص کہتے ہیں۔ مثلاً یہ ایک حدیث کی عبارت ہے، حضور نے فرمایا کہ انما الاعمال بالنیات۔ یہ ایک نص ہے۔ قرآن کریم کی کوئی آیت بھی نص ہے۔ یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین، یہ بھی نص ہے۔ یہ جتنی نصوص ہیں وہ قرآن پاک میں آئی ہوں یا احادیث میں آئی ہوں، ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم ہے قطعی الثبوت، جس کا ثبوت قطعی اور یقینی طور پر ہمارے پاس موجود ہے کہ یہ نص قطعی ہے۔ پورا قرآن پاک قطعی الثبوت ہے۔ اور احادیث متواترہ اور نص ثابت قطعی الثبوت ہیں۔ تواتر کی پانچوں قسموں کے ساتھ ان کے ثابت ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اس کے علاوہ جو احادیث ہیں جو خبر واحد ہیں وہ ظنی الثبوت ہیں۔ یعنی اس بات کا امکان فی نفسہٖ بھی امکان ہے کہ بیان کرنے میں کسی سے کوئی بھول چوک ہو گئی ہو تو قطعیت ختم ہو گئی اور ظنیت آ گئی۔ تو گویا احادیث ظنی الثبوت ہیں اور کچھ احادیث اور پورا قرآن مجید قطعی الثبوت ہے۔

اس کے بعد یہ جو ساری احادیث اور آیات قرآن ہیں، ان دونوں قسموں کے ساتھ ساتھ ان کے معانی اور مطالب میں بھی کچھ آیات اور احادیث ہیں جن کے معانی اور مطالب قطعی ہیں اور یقینی ہیں۔ قرآن مجید میں ہے کہ اھدنا الصراط المستقیم۔ یہ بالکل واضح ہے کہ صراط مستقیم سے کیا مراد ہے۔ شریعت کا جو راستہ ہے وہ صراط مستقیم ہے۔ اس میں کوئی دو راستے مراد نہیں ہو سکتے

۔ اگر کوئی کہے کہ جو راستہ کامل ہو جو مراد لی جاتی ہے وہ صراط مستقیم ہے۔ تو یہ گمراہی نہیں، اس نے

کہ سب کو پتہ ہے کہ صراط مستقیم کیا ہے۔ اسی طرح احادیث میں مثلاً ان الشیطان

یجری من ابن آدم کہ شیطان تم میں سے ہر ایک کے پاس جاتا ہے اور فساد کرتا ہے۔ شیطان سے

کیا مراد ہے یہ ہر ایک کو معلوم ہے۔ اگر کوئی کہے کہ نہیں شیطان سے مراد تو فلاں آدمی ہے جو امریکہ یا

فلاں ملک میں بیٹھا ہوا ہے، تو یہ غلط ہوگا۔ سب کو پتہ ہے کہ شیطان سے کیا مراد ہے۔ یہ قطعی الدلالت

ہے۔ یہ قطعی کہلاتی ہے۔ اس لئے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ شیطان اور صراط مستقیم سے کیا

مراد ہے۔ اس میں کوئی دوسری رائے نہیں ہو سکتی۔ جو دوسری رائے پیش کرے گا وہ گمراہی

پھیلائے گا اور غلط کرے گا۔ لیکن بعض آیات قرآنی اور احادیث ایسی ہیں کہ جن کے ایک سے زائد

مفہوم نکل سکتے ہیں۔ مثلاً اذا بلغ الماء قلتین لم یحمل الخبث فرمایا دو قلے: پاک نہیں ہوتا۔ اب ایک مطلب یہ

ہے کہ اتنا پانی ہو جتنا ایک گھڑا ہوتا ہے، دوسرا مطلب یہ ہے کہ دو بڑے مٹکے مراد ہیں۔ ایک مطلب

ہے کہ اتنا زیادہ پانی ہو جتنا دو اونٹوں پر لادا ہوا ہے۔ یہ سارے مفہوم ممکن ہیں، لیکن ان میں سے

کوئی ایک مفہوم قطعی نہیں ہے۔ آپ نہیں کہہ سکتے کہ میرا بیان کردہ مفہوم سو فیصد درست ہے اور باقی سب

غلط ہیں تو ایسا نہیں ہے۔ یہ بھی صحیح ہو سکتا ہے وہ بھی صحیح ہو سکتا ہے۔ اس طرح کے مفہوم کو ظنی

الثبوت کہتے ہیں۔

قرآن پاک میں کئی جگہ ایسے الفاظ آتے ہیں کہ ایک مفسر نے اس کا ایک مطلب لیا ہے اور دوسرے نے دوسرا مفہوم سمجھا۔ اس لئے کہ قرآن پاک کے الفاظ میں دونوں کی گنجائش ہے۔ یہ ظنی الثبوت ہے۔ اس لئے کسی ایک مفہوم کے بارے میں قطعیت کا وہ معیار اختیار نہیں کیا جا سکتا جو خدا، صراط مستقیم کے بارے میں ہے، جو مثلاً صلوٰۃ، زکوٰۃ اور حج کے بارے میں ہے۔ تو یہ چیزیں ظنی الثبوت کہلاتی ہیں۔ تو نصوص کی چار قسمیں ہیں۔ سب سے اونچا درجہ ان نصوص کا ہے جو قطعی الدلالت اور قطعی الثبوت دونوں ہیں۔ دوسرا درجہ وہ ہے جو قطعی الثبوت اور ظنی الدلالت ہیں۔ تیسرا درجہ ان کا ہے جو ظنی الثبوت اور قطعی الدلالت ہے اور آخری درجہ ان نصوص کا ہے جو ظنی الدلالت ہیں اور ظنی الثبوت ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

☆☆☆☆☆☆☆

پانچواں خطبہ

علم اسناد و رجال

جمعۃ المبارک، 10 اکتوبر 2003ء

علم اسناد و رجال

آج کی گفتگو کا عنوان ہے علم اسناد اور علم رجال۔ ان دونوں کا آپس میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ اسناد سے مراد ہے کسی حدیث کی سند بیان کرنا۔ جبکہ سند سے مراد ہے راویوں کا وہ سلسلہ جو حدیث کے نقل کرنے والے راوی یا جامع سے لے کر رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی تک پہنچتا ہے۔ راوی کون لوگ ہیں، ان کا علمی درجہ کیا ہے، امانت اور ذہنی و فکری صلاحیت کیا ہے، یہ وہ امور ہیں جن پر کسی قدر تفصیل سے اظہار خیال ہوا ہے۔ لیکن ابھی یہ گفتگو باقی ہے کہ راویوں کے حالات جمع کرنے کا کام کب سے شروع ہوا، کس طرح یہ حالات جمع کئے گئے، اور کسی راوی کے قابل قبول یا ناقابل قبول، ضابط یا عدم ضابط ہونے کا فیصلہ کس بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ یہ وہ علم ہے جس کو علم اسماء الرجال یا علم رجال کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

علم اسناد اس وقت تک صحیح طور پر سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک علم رجال یا اسماء الرجال کی تفصیلات سامنے نہ ہوں۔ علم حدیث میں یہ مشکل ترین علوم و فنون میں شامل ہے۔ علم درایت میں علل کا موضوع سب سے مشکل ہے اور علم روایت میں رجال کا موضوع سب سے مشکل ہے۔ راویوں سے متعلق دو پہلو زیر بحث آتے ہیں۔ ایک عام معلومات، رجال کے بارے میں معلومات، راویوں کی شخصیت اور کردار کے بارے میں تفصیلات سے متعلق ہے جس پر آج گفتگو ہوگی۔ رجال کا دوسرا پہلو کسی راوی حدیث کے قابل قبول یا ناقابل قبول ہونے کا فیصلہ، ان کے اصول اور قواعد اور ان اصول و قواعد کی روشنی میں بالآخر کسی راوی کے قابل قبول یا ناقابل قبول ہونے کا حتمی فیصلہ جس فن کی روشنی میں کیا جاتا ہے اس فن کو علم جرح و تعدیل کہتے ہیں۔ اس پر گفتگو کل ہوگی۔

کو پتہ چلا کہ ایک اور صحابی حضرت عقبہ بن عامر جہنیؓ، جو رسول اللہ ﷺ کے خاص خدام میں شامل رہے، ان کے پاس کوئی خاص حدیث ہے، جو پہلے سے حضرت عبادہ بن صامت کے پاس پہنچی تھی، لیکن وہ اس کو کنفرم کرنا چاہتے تھے۔ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر ایک قافلے کے ساتھ کئی ماہ کی مسافت طے کر کے حضرت عقبہ جہنیؓ کے پاس پہنچے۔ ان کے مکان پر پہنچے تو شور مچ گیا کہ صحابی رسولؐ حضرت عبادہ بن صامت تشریف لائے ہیں، لوگ جمع ہو گئے۔ وہ سیدھے حضرت عقبہ کے مکان پر پہنچے، دروازہ کھٹکھٹایا، وہ باہر نکلے، وہیں کھڑے کھڑے سلام دعا کی اور پوچھا کہ اس حدیث کے اصل الفاظ کیا ہیں؟ انہوں نے حدیث کے الفاظ سنائے، جو ان کی یادداشت کے مطابق تھے تو انہوں نے کہا کہ الحمد للہ مجھ تک جس ذریعے سے یہ حدیث پہنچی تھی وہ بالکل درست ہے، اب میں جارہا ہوں، اور یہ کہہ کر اجازت لی اور رخصت ہو گئے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خود صحابہ کرام نے کس محنت سے اور کس محبت اور احترام سے احادیث رسولؐ کے بارے میں معلومات جمع کرنی شروع کیں۔

جس کو خارجی نقد حدیث کہا جاتا ہے، جس پر کل ذرا تفصیل سے گفتگو ہوئی تھی، اس کی اساس علم روایت پر اور علم روایت کی اساس سند پر اور سند کی اساس رجال پر ہے۔ گویا رجال وہ بنیادی مضمون ہے جس کی بنیاد پر اسناد کا تعین ہوتا ہے اور اسناد کی بنیاد پر کسی حدیث کی خارجی نقد پر بات ہوتی ہے۔ اور خارجی نقد پر بات کرنے کے بعد گویا تحقیق کا ایک پہلو مکمل ہو جاتا ہے اور یہ طے ہو جاتا ہے کہ خارجی وسائل اور نقد کے اعتبار سے اس حدیث کا کیا درجہ ہے۔ یہ ضرورت صحابہ کرام کے دور کے بعد پیش آئی جب صحابہ کرام دنیا سے اٹھ گئے اور بہت تھوڑی تعداد میں رہ گئے۔ کبار تابعین کا زمانہ بھی تقریباً ختم ہو گیا اور صغار تابعین کا زمانہ آ گیا۔ کبار تابعین کے زمانے تک بھی یہ امکان نہیں تھا کہ کوئی شخص رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی سے کوئی غلط بات منسوب کرے، لہٰذا بات منسوب کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اس کا امکان بہر حال موجود رہتا تھا کہ یادداشت میں کوئی کمزوری آ جائے، کوئی دو احادیث کا مضمون ایک دوسرے میں مل جائے یا ایک حدیث کا مضمون دو الگ الگ متنوں کے طور پر بیان ہو جائے۔ اس طرح کا امکان موجود تھا۔ صحابہ کرام کی حد تک تو اس امکان کی بھی گنجائش نہیں تھی اس لئے کہ ان کے پاس حدیث رسولؐ کو حاصل کرنے اور محفوظ رکھنے کا جو اہتمام تھا اس کا اندازہ آپ کو ان دو واقعات سے

ہو گیا ہو گا۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے جب کوئی پوچھتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے کیا فرمایا تو وہ براہ راست جواب نہیں دیا کرتے تھے، بلکہ اپنی فہم اور دانست کو بیان کیا کرتے تھے، اور جو بات ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ حدیث میں آیا ہے کہ من کذب علی متعمداً فلیتبوأ مقعده من النار، جو شخص جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں کرلے۔ اس لئے وہ حتی الامکان حدیث بیان کرنے سے احتراز کیا کرتے تھے کہ اس میں اگر ایک ذرا بھی غلطی کا امکان ہو تو اس وعید کے مستحق نہ بن جائیں۔ ایک مرتبہ ضرورت پڑی اور وہ حدیث کے الفاظ بیان کرنے لگے تو پریشانی اور گھبراہٹ کے عالم میں کھڑے ہوگئے اور حدیث بیان کرنے کے بعد کہا کہ او قریبا من ذلک او شبیھا من ذلک، یعنی تقریباً ایسی بات فرمائی تھی، اس سے ملتی جلتی بات فرمائی تھی یا اس سے مشابہ بات فرمائی تھی، اور پھر حدت کی پریشانی کا اظہار کیا کہ ہو سکتا ہے کہ میری یادداشت میں کوئی کمزوری رہ گئی ہو۔ غرض انتہائی غیر معمولی اہتمام کے ساتھ انہوں نے یہ چیز بیان فرمائی۔

کبار تابعین کا بھی یہی رویہ تھا، لیکن جب صغار تابعین کا دور آیا، اور یہ زمانہ پہلی صدی ہجری کا نصف دوم ہے، اس وقت اس کا امکان ہونے لگا کہ بعض لوگ احادیث بیان کرنے میں احتیاط اور تقویٰ کا وہ معیار برقرار نہیں رکھ پا رہے ہیں جو معیار صحابہ کرام نے رکھا تھا۔ اس وقت اس بات کی ضرورت پیش آئی کہ تابعین سے یہ پوچھا جائے کہ آپ نے کس صحابیؓ سے یہ روایت سنی۔ تابعین میں بھی جو کبار تابعین تھے جن کا علم اور تقویٰ غیر معمولی طور پر ضرب المثل تھا ان سے یہ پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ لیکن صغار تابعین سے، جو صحابہ کرام اور حضور ﷺ کے زمانے سے دور ہونے کی وجہ سے جن کے بارے میں یہ امکان موجود تھا کہ شاید ان کے ہاں حفظ و احتیاط برقرار نہ رہے۔ ان سے یہ پوچھا جاتا تھا کہ آپ نے یہ حدیث کس صحابیؓ سے یا کس تابعی سے لی ہے۔

سند کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟

حضرت سفیان ثوری جن کا شمار صغار تابعین میں ہوتا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ پہلے حدیث کی سند پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی لیکن لما استعمل الرواۃ الکذب استعملنا

لوم التاریخ"۔ جب حدیث کے راویوں نے غلط بیانیوں سے کام لینا شروع کیا تو ہم نے ان کے لئے تاریخ کا وسیلہ اور تاریخ کا ہتھیار استعمال کرنا شروع کر دیا۔ تاریخ کے ہتھیار سے مراد یہ ہے کہ جب کوئی صاحب کوئی حدیث بیان کرتے تھے۔ وہ زمانہ تابعین یا تبع تابعین کا تھا۔ تو ان سے پوچھا جاتا تھا کہ انہوں نے یہ حدیث کس صحابیؓ سے سنی۔ صحابیؓ کا نام لینے کے بعد وہ یہ تحقیق کرتے تھے کہ ان صحابیؓ کی وفات کس سن میں ہوئی اور وہ صحابیؓ کس علاقہ میں قیام پذیر رہے۔ اور اس طرح سے یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ بیان کرنے والے نے حدیث صحیح بیان کی ہے یا اس میں کوئی بھول رہ گیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک صاحب نے، جن کا تعلق تبع تابعینؒ سے تھا، انہوں نے کوئی حدیث بیان کی۔ سننے والوں نے پوچھا کہ آپ نے یہ حدیث کس سے سنی ہے؟ انہوں نے بیان کیا کہ فلاں تابعی سے سنی ہے۔ پوچھا گیا کہ کس سن میں سنی ہے تو انہوں نے کہا کہ سن ۱۰۸ھ میں سنی ہے۔ پوچھا گیا کہ سن ۱۰۸ھ میں کہاں سنی تھی تو انہوں نے کہا کہ آرمینیا میں سنی تھی۔ سوال ہوا کہ آرمینیا میں وہ کیا کرنے گئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ جہاد کرنے گئے تھے۔ پوچھنے والے بزرگ نے کہا کہ تم غلط بیان کر رہے ہو، جھوٹ بول رہے ہو۔ ان تابعی کا انتقال ۱۰۳ھ میں ہو گیا تھا اور ۱۰۸ھ میں وہ زندہ نہیں تھے۔ اور وہ جہاد کرنے کے لئے آرمینیا نہیں بلکہ روم تشریف لے گئے تھے۔ اب یہ معلومات کہ ان تابعی کا انتقال ۱۰۳ھ میں ہوا تھا اور انہوں نے جس جہاد میں حصہ لیا تھا وہ روم کی جہادی مہم تھی، آرمینیا کی نہیں تھی اور ان دونوں کے درمیان تقریباً دو ہزار میل کا فرق ہے۔ اس سوال و جواب بلکہ جرح سے یہ پتہ چلا کہ ان صاحب کو بیان کرنے میں یا تو یادداشت میں التباس ہو رہا ہے یا کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے، یا ممکن ہے انہوں نے دانستہ غلط بیانی کی ہو، اس بارے میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن اس بھول کی وجہ سے ان کی یہ روایت تبع تابعینؒ نے قبول نہیں کی۔

اس طرح سے جب یہ واقعات کثرت سے پیش آنے شروع ہوئے اور اس کا امکان وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا جا رہا تھا تو پھر یہ معلومات جمع کرنے کا عمل شروع ہوا کہ صحابہ کرام کہاں کہاں تشریف لے گئے تھے، کس کس علاقہ میں مقیم رہے، انہوں نے وہاں جا کر کیا کیا اور کس علاقہ میں کس طرح کی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ مثلاً جہاد کا معاملہ تھا۔ اب یہ بات کہ کسی خاص تابعی نے آرمینیا کے جہاد میں حصہ لیا یا روم کے جہاد میں حصہ لیا، اس کا براہ راست علم

حدیث سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن چونکہ روایت میں ان کا حوالہ دیا گیا کہ آرمینیا کے جہاد کے دوران ان سے یہ بات کہی، جب کہ انہوں نے آرمینیا میں جہاد نہیں کیا تھا تو اس سے یہ معاملہ واضح ہو گیا کہ کم سے کم اس تابعی کی حد تک یہ تحقیق ہو گیا کہ ان کے ذریعے سے یہ روایت نہیں آئی، کسی اور کے ذریعے سے آئی ہوگی۔

اس طرح سے علم حدیث میں ایک نئے شعبہ کا آغاز ہوا جس کو علم اسماء الرجال کہتے ہیں۔ اور علم اسناد کی بنیاد چونکہ سند پر ہے اور سند میں راویوں کا تذکرہ ہوتا ہے، راویوں کے حالات جمع کرنے کو علم رجال کہا گیا۔ علم رجال سے یہ نہ سمجھئے گا کہ اس سے صرف مرد مراد ہیں۔ یہ صرف ایک اصطلاح ہے اور میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ لا مشاحة فی الاصطلاح، اصطلاح میں کوئی اختلاف نہیں۔ علم رجال میں خواتین کا بھی تذکرہ ہوتا ہے۔ علم رجال کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جس میں خواتین راویوں کے تذکرے نہ ہوں۔ اس لئے رجال کے لفظ سے کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے۔ اس میں ان تمام راویوں اور راویات کا تذکرہ ہوتا ہے جنہوں نے علم حدیث کی روایت کی ہے۔ جیسے جیسے علم حدیث، روایات اور رجال کا دائرہ بڑھتا گیا، علم حدیث میں اختصاص (specialization) بھی پیدا ہوتا گیا۔ کچھ لوگ وہ تھے جو رجال کے فن میں زیادہ ماہر تھے۔ پھر رجال سے متعلق موضوعات جن میں جرح و تعدیل بھی ہے جس پر آگے چل کر بات ہوگی، یہ وہ لوگ اس کے متخصص ہوتے۔ کچھ لوگ درایت کے متخصص ہوتے کہ حدیث کی داخلی شہادت سے اندازہ لگاتے کہ حدیث کی داخلی شہادت سے اس کے قبول ہونے یا نہ ہونے کا پتہ چلتا ہے یا نہیں چلتا۔ کچھ حضرات تھے جو خارجی نقد روایت اور رجال میں زیادہ مشہور تھے۔ کچھ حضرات تھے جو داخلی نقد یا درایت میں زیادہ مشہور تھے۔ یعنی حدیث کی داخلی شہادت اور داخلی معیار نقد میں۔ کچھ حضرات تھے جو دونوں میں زیادہ مشہور تھے۔ جو دونوں میں زیادہ مشہور تھے ان میں حضرت امام مالکؒ کا نام نامی بھی شامل ہے۔ جو حضرات داخلی نقد درایت میں زیادہ مشہور تھے ان میں امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کا نام زیادہ مشہور ہے۔ جو نقد روایت میں مشہور ہیں ان میں محدثین کی بڑی تعداد شامل ہے۔ لیکن محدثین میں ایسے حضرات بھی شامل تھے مثلاً امام بخاری، امام ترمذی، جو دونوں میدانوں کے شہسوار تھے۔ جو روایت اور رجال کے بھی ماہر تھے اور نقد درایت کے بھی ماہر تھے۔ حدیث کی داخلی شہادت سے بھی ان کو بہت اچھا اندازہ ہو جایا کرتا تھا۔

رجال اور سند کی ضرورت پیش آنے کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ جہاں تک رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کا تعلق ہے صحابہ کرام ان کی روایت باللفظ کیا کرتے تھے۔ جو بات رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمائی اس کو اسی طرح یاد فرماتے تھے، اسی طرح لکھتے تھے اور آپس میں اپنے تحریری ذخائر کا ایک دوسرے سے تبادلہ اور تقابل کرتے رہتے تھے اور اپنی یادداشتوں کو ایک دوسرے سے چیک بھی کروایا کرتے تھے۔ صحابہ کرام کی یادداشت تک تو یہ التزام موجود تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کی روایت باللفظ ہو۔ لیکن جو معاملات رسول اللہ ﷺ کے عمل یا سنت تقریری سے تعلق رکھتے تھے، کہ حضورؐ کے سامنے کوئی کام ہوا اور آپ نے اس کی اجازت دے دی یا منع نہیں فرمایا اس کی روایت ہر صحابیؓ اپنے الفاظ میں کیا کرتے تھے۔ گویا ایک واقعہ کی تعبیریں مختلف صحابہ کرام نے مختلف انداز سے کیں۔ جس نے جس طرح سے دیکھا اور سمجھا اور جس پہلو کو زیادہ اہم سمجھا اس پہلو کو بیان فرمادیا۔

جب یہ چیز تابعین تک پہنچی تو انہوں نے اس بات کا اہتمام کیا کہ جس صحابیؓ نے جو چیز جن الفاظ میں بیان کی وہ ان کو انہی الفاظ میں آگے تک پہنچایا جائے اور اس کے الفاظ میں رد و بدل نہ کی جائے۔ روایت باللفظ کا یہ سلسلہ اہتمام کے ساتھ جاری رہا۔ اس میں اس حدیث نبویؐ سے بھی صحابہ کرام کو مدد ملی جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ 'نضر اللہ امرأ' اللہ تعالیٰ اس شخص کو سرسبز و شاداب رکھے 'سمع مقالتی' جس نے میری کوئی بات سنی 'فوعاھا کما سمعھا' اور جیسا اس کو سنا تھا ویسے ہی اس کو روایت کر دیا۔ اس سے روایت باللفظ کی اہمیت واضح ہوتی ہے کہ اگر جیسے سنا ویسا ہی ادا کرو گے تو تروتازگی کی یہ بشارت ملے گی اور اگر اس کے الفاظ یا مفہوم میں کوئی تبدیلی ہوگئی تو بظاہر مفہوم یہ نکلتا ہے کہ یہ بشارت اس طرح سے حاصل نہیں ہوگی۔

احادیث کی روایت باللفظ کا اہتمام

رسول اللہ ﷺ جب صحابہ کرام کو ہدایات دیتے، کوئی چیز بتاتے یا پڑھاتے یا یاد کروایا کرتے تھے تو اس بات کا اہتمام کرتے تھے کہ جو الفاظ آپ نے یاد کروائے ہوں صحابہ کرام انہی الفاظ میں ان کو یاد کریں۔ چنانچہ حضرت براء بن عازبؓ کا مشہور واقعہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک

مرتبہ ان سے پوچھا کہ اے براء! جب رات کو سونے کے لئے لیٹو تو یہ دعا کیا کرو۔ تو انہوں نے فرمایا کہ یارسول اللہ آپ بتائیں جو آپ فرمائیں گے میں وہ دعا پڑھا کروں گا۔ اس پر حضورؐ نے ان کو یہ دعا سکھائی جو مشہور ہے کہ "اللھم اسلمت وجھی الیک وفوضت امری الیک والجات ظھری الیک رغبۃ و رھبۃ الیک، لاملجا ولا منجا منک الا الیک آمنت بکتابک الذی انزلت وبنبیک الذی ارسلت" جب حضرت براء بن عازبؓ نے دوبارہ پڑھ کر رسول اللہ ﷺ کو سنائی تو آپ نے نبیک کی بجائے ورسولک الذی ارسلت کہا تو رسول اللہ ﷺ نے ان کو ہاتھ سے منع کیا، اشارہ کیا اور فرمایا کہ ٹھیک ہے وبنبیک الذی ارسلت کہا تھا۔ تو حضرت براء بن عازبؓ نے ہمیشہ یاد رکھا، وہ انتہائی محبت سے بیان کیا کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہاں ہاتھ سے اشارہ کر کے بتایا کہ وبنبیک الذی ارسلت۔ اس سے اس بات کی بھی تائید ہوتی ہے کہ جو بات حضورؐ نے ارشاد فرمائی ہو اس کو انہی الفاظ میں بیان کرنا چاہئے اس کا ہم معنی کوئی لفظ استعمال نہیں کرنا چاہئے۔ نبی اور رسول قریب قریب ایک ہی معنی کے حامل ہیں لیکن رسول ﷺ نے یہاں نبی کا لفظ استعمال فرمایا تھا اس لئے آپ نے تاکید فرمائی کہ یہی لفظ استعمال کیا جائے۔ چنانچہ صحابہ کرام کے زمانے سے اس کا التزام رہا اور رسول اللہ ﷺ کے قولی ارشادات تو تقریباً ۹۹ فیصد روایت باللفظ کے ساتھ منقول ہیں۔ البتہ حضورؐ کے اعمال، تقریرات یا افعال کا معاملہ ذرا مختلف ہے جن کو ہر صحابیؓ نے اپنے انداز میں بیان کیا۔ جس صحابیؓ نے جس طرح دیکھا اور جس طرح سے مناسب سمجھا بیان کیا۔ پھر تابعین نے صحابہ کرام کی اس روایت کو انہی کے الفاظ میں بیان کیا اور ہر صحابیؓ کی روایت ان کے اپنے منقول الفاظ کے ساتھ کتب حدیث میں موجود ہے۔

اس بات کی تائید اس مثال سے بھی ہوتی ہے کہ ایک حدیث میں کوئی صحابیؓ ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے دو قبیلوں کا ذکر کرتے ہیں اسلم اور غفار۔ قبیلہ اسلم اور قبیلہ غفار نے یہ کیا، ان کے ساتھ یہ معاملہ ہوا۔ کسی بھی سیاق وسباق میں ان کا ذکر ہے۔ اب جن تابعی نے ان سے سنا ان کو یہ التباس ہو گیا کہ صحابی رسول نے غفار کا لفظ پہلے بولا تھا یا اسلم کا پہلے بولا تھا۔ حالانکہ اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس سے معنی میں، مفہوم میں، پیغام میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن وہ تابعی جب بیان کرتے تھے تو یہ وضاحت ضرور کرتے تھے کہ انہوں نے غفار اور اسلم یا اسلم اور غفار

وھو ابن عیینۃ ۔ یعنی ترمذی کہتا ہے کہ وہ ابن عیینہ ہیں یا ثوری ہیں تاکہ واضح ہو جائے کہ یہ وضاحت میرے استاد حضرات کی زبان مبارک سے نہیں ہے بلکہ میری زبان سے ہے۔ یہ گویا ایک مثال ہے کہ روایت باللفظ میں کس قدر باریکی اور نزاکت کا اہتمام رکھا گیا۔

کیا روایت بالمعنی جائز ہے؟

کچھ وقت گزرنے کے بعد محدثین کے درمیان یہ سوال پیدا ہوا کہ روایت باللفظ سے ہٹ کر اگر روایت بالمعنی کی جائے تو جائز ہے یا نہیں؟۔ لیکن روایت بالمعنی کا سوال تدوین کے سلسلہ میں نہیں پیدا ہوا تھا۔ تدوین کی حد تک بخاری، مسلم، ترمذی اور باقی سب کتابوں میں جب روایتیں جمع کی گئیں تو جس طرح سے آئی تھیں اسی طرح سے لکھی گئیں۔ روایت باللفظ ہی کے انداز میں جمع ہوئیں۔

سوال وہاں پیدا ہوا جہاں کسی مجلس درس یا مجلس وعظ میں یا تبلیغ دعوت کے کسی عمل میں کوئی حدیث بیان کرنے کی ضرورت پیش آئے تو کیا وہاں بھی روایت باللفظ کی پابندی ضروری ہے یا روایت بالمعنی بھی ہو سکتی ہے۔ یہ سوال وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اہمیت اختیار کرنے لگا اور ہم ان تمام محدثین اور علماء کرام کے شکر گزار ہیں جنہوں نے یہ سوال اٹھایا اور اس معاملہ میں یہ گنجائش پیدا کی۔ اگر وہ حضرات روایت بالمعنی کی یہ گنجائش پیدا نہ کرتے تو آج دنیائے اسلام کے لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کے لئے حدیث رسول کا حوالہ دینا ناممکن ہو جاتا۔ اس لئے کہ ہم میں سے کتنے ہیں جو حدیث کے حافظ ہیں اور ایک ایک لفظ زیر زبر کی پابندی کے ساتھ اور ایک ایک شوشے کی پابندی کے ساتھ اسی طرح بیان کر سکتے ہیں جس طرح کی میں نے مثالیں دیں کہ وہ استاد کے نام کا اضافہ بھی ان سے منسوب نہیں کرتے۔ ایسا ہوتا تو پھر لوگ حدیث کا حوالہ دینا چھوڑ دیتے اور دوسرے لوگ اس سے استفادہ کرنا عملاً مشکل ہو جاتا بلکہ ناممکن ہو جاتا۔ اس لئے محدثین نے یہ سوال اٹھایا کہ کیا روایت بالمعنی جائز ہے؟ کچھ لوگوں کا پھر بھی یہی خیال رہا کہ روایت بالمعنی کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے۔ بلکہ جو لوگ بیان کرنا چاہیں وہ پہلے یاد کریں پھر اس کے بعد بیان کریں۔ لیکن علماء کرام کی اکثریت نے بعد کے سالوں میں تیسری، چوتھی اور پانچویں صدی ہجری کے سالوں میں کچھ شرائط کے ساتھ روایت بالمعنی کی اجازت دے دی۔

تیسری شرط تو یہ ہے کہ جو راوی اس کو روایت کرے وہ صرف و نحو اور علوم لغت کا عالم ہو۔ یعنی جب وہ روایت بالمعنی کرے تو اس کو پتہ ہو کہ جس لفظ کو وہ جن معنوں میں بیان کر رہا ہے وہ لفظ ان معنی میں استعمال ہوتا ہے کہ نہیں۔ اگر وہ اس معنی میں نہیں ہے اور بیان کرنے والا صرف و لغت کا عالم نہ ہو تو وہ کچھ کا کچھ بیان کردے گا۔

ایک صاحب کے بارے میں مشہور ہے کہ انہوں نے ایک حدیث کا ترجمہ پڑھا جس میں ام قوما فلیخفف کہ جو شخص کسی کی امامت کرے وہ ہلکی نماز پڑھائے۔ تو یہ ترجمہ لکھا ہوا دیکھ کر وہ سمجھے کہ شاید ہل کے پڑھائے اور نماز میں حرکت کرتا رہے۔ چنانچہ جب وہ امامت کرتے تو ہلتے رہتے تھے۔ کسی نے پوچھا کہ آپ نماز پڑھاتے ہوئے ہلتے کیوں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ حدیث میں آیا ہے۔ پوچھا کہ حدیث میں کہاں لکھا ہوا ہے کہ نماز میں ہلا کرو۔ ان امام صاحب نے ترجمہ دکھایا تو لکھا ہوا تھا کہ نماز ہلکی پڑھائے۔ انہوں نے ہلکے کو ہلکے پڑھا۔ یعنی اگر آدمی صرف و نحو اور لغت کا عالم نہ ہو تو اس طرح کی غلطیاں ہو سکتی ہیں۔

دوسری شرط یہ ہے کہ وہ الفاظ جو احادیث میں استعمال ہوتے ہیں اور ان کا جو معنی اور مفہوم رسول اللہ ﷺ کا مقصود تھا اس سے واقف ہو۔ اور دونوں الفاظ کے درمیان جو تفاوت ہے یعنی جو الفاظ وہ استعمال کر رہا ہے اور جو اصل میں استعمال ہوئے ہیں ان دونوں کے درمیان فرق سے واقف ہو۔ اور حدیث رسول کو غلطی کے بغیر بیان کرنے کی استطاعت رکھتا ہو۔ یہ شرائط تو ہر اس شخص کے لئے ہیں جو حدیث کا مفہوم بیان کرے گا۔

امام مالکؒ کی ایک بات مجھے بہت پسند آئی ہے۔ امام مالکؒ کا ارشاد یہ ہے کہ احادیث مرفوعہ میں تو روایت بالمعنی جائز نہیں ہے۔ یعنی کوئی چیز جو رسول اللہ ﷺ سے منسوب ہے اس میں تو روایت بالمعنی جائز نہیں ہے اور وہ روایت باللفظ ہی ہونی چاہئے۔ لیکن جو بقیہ احادیث ہیں جن میں صحابہ کرامؓ میں سے کسی کی رائے یا کسی کا مشاہدہ یا کسی کا فتویٰ یا کسی کی روایت بیان ہوئی ہے وہ روایت بالمعنی ہو سکتی ہے کیونکہ اس کے بارے میں یہ وعید نہیں آئی ہے کہ من کذب علی متعمدا فلیتبوأ مقعده من النار۔ یہ وعید صرف حضورؐ کے ارشادات کے بارے میں آئی ہے۔ یہ امام مالکؒ کی رائے ہے جو بہت معقول معلوم ہوتی ہے۔

اس سے ملتی جلتی ایک دوسری رائے یہ ہے کہ روایت بالمعنی صحابیؓ کے لئے تو جائز تھی

لیکن تبع تابعین کے لئے جائز نہیں ہے۔ اب اگر صحابہ کے لئے جائز تھی اور غیر صحابہ کے لئے جائز نہیں تو پھر ہمارے لئے تو پھر یہ اجازت بے کار ہے اور ہمارے لئے اس اجازت کا ہونا یا نہ ہونا بے معنی ہے۔ یہ تو ایک نظری یا تھیوریٹیکل بات ہوئی۔ لیکن جو عام محدثین ہیں ان کا بھی کہنا ہے کہ روایت بالمعنی ان شرائط کے ساتھ جائز ہے اور بعد میں لوگوں نے روایت بالمعنی کے طریقے کو اختیار کیا۔ آج کل آپ نے سنا ہوگا لوگ دینی گفتگو میں، تقریروں اور مضامین میں کثرت سے احادیث کا حوالہ مفہوم کے ساتھ دیتے ہیں۔ لیکن کوشش کرنی چاہئے کہ مفہوم کا حوالہ صحیح ہو اور کسی حدیث کا حوالہ بغیر تحقیق کے نہ دیا جائے۔ بعض اوقات گفتگو کے دوران اور بیان میں ایک چیز زبان پر آجاتی ہے اور آدمی اس کو حدیث کہہ کر بیان کر دیتا ہے اور بعد میں پتا چلتا ہے یا تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ وہ حدیث نہیں تھی بلکہ کسی اور کا قول تھا۔ ایسا کرنا احتیاط کے خلاف ہے۔ یہ چیز بڑی ذمہ داری کا تقاضا کرتی ہے اور اس معاملہ میں احتیاط کرنی چاہئے۔

علم روایت میں، جیسا کہ میں، روایت باللفظ اصل ہے اور روایت بالمعنی کی بعد میں اجازت دی گئی ہے۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے متعدد مواقع پر اپنے ارشادات کو دوسروں تک پہنچانے کا حکم دیا۔ ایک جگہ آپ نے فرمایا کہ بلغوا عني ولو آية کہ اگر میری طرف سے ایک آیت بھی تم تک پہنچی ہے تو اس کو دوسروں تک پہنچاؤ۔ اب جس شخص کے علم میں بھی رسول اللہ ﷺ کے ارشادات یا سنت کا علم آیا ہے وہ مکلف ہے کہ جہاں تک اس کے بس میں ہو اور جہاں تک اس کے لئے آسان ہو اسے دوسروں تک پہنچائے۔ اسی طرح خطبہ حجۃ الوداع دینے کے بعد آپ نے فرمایا کہ ألا هل بلغت کیا میں نے پہنچا دیا؟ لوگوں نے جواب دیا کہ جی ہاں آپ نے پہنچا دیا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ فليبلغ الشاهد الغائب کہ جو موجود ہے وہ یہ بات ان تک پہنچا دے جو موجود نہیں ہیں۔ اس لئے بہت بڑی تعداد میں ان صحابہ کرام نے خطبہ حجۃ الوداع کی روایت کی اور انہیں ان صحابہ تک پہنچایا جو وہاں موجود نہیں تھے اور ان تابعین تک جو بعد میں آئے کیونکہ فليبلغ الشاهد الغائب کا اطلاق علماء امت کے نزدیک ہر اس شخص پر ہوتا ہے جس تک یہ حدیث پہنچے۔ اس لئے جس مجلس میں یہ حدیث بیان کی جائے گی تو جو شخص وہاں موجود ہوگا وہ شاہد ہوگا اور جو وہاں موجود نہیں ہوگا وہ غائب ہوگا۔ تو موجود سے یہ موجود نہ ہونے والے تک پہنچے۔ اور جب کوئی شخص پہنچائے گا تو وہ ایک طرح سے راوی حدیث ہوگا۔

اس کا کردار اور اس کی شخصیت زیر بحث آئیں گے۔ جب زیر بحث آئیں گے تو علم رجال وجود میں آئے گا۔ اس لئے ان احادیث کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ راویوں پر رواۃ کے بارے میں بحث ہو۔ چونکہ رواۃ اور راویانِ حدیث اس ارشادِ نبوی پر عمل درآمد کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اگر راویان حدیث نہ ہوتے تو آج ہم ان ارشادات گرامی سے محروم ہوتے اور ان پر عمل نہ کر سکتے۔ راویان حدیث ہی کے وسیلے سے اور انہی کے واسطے سے یہ ہدایت اور رہنمائی ہم تک پہنچی ہے۔ اس لئے وہ اس عمل کا ایک لازمی حصہ ہیں۔ اور اس عمل کا حصہ ہونے کی وجہ سے ان کی شخصیت کا مطالعہ بھی علم حدیث ہی کا مطالعہ ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ وہ تمام مسلمان خواتین و حضرات جو روایت حدیث، نقل حدیث، کتابت حدیث، شرح حدیث اور درس حدیث میں مصروف ہیں وہ سب کے سب اس عمل کا حصہ ہیں۔ کہ فلیبلغ الشاهد الغائب پر وہ سب عمل کر رہے ہیں اور فلیبلغ الشاهد الغائب کے حکم پر عمل کرنے کے ساتھ ساتھ وہ راویان حدیث اور علم حدیث کا بھی حصہ بنتے جا رہے ہیں۔

چنانچہ اس طرح سے ایک ایک کر کے یہ نام سامنے آتے رہے اور یہ تحقیق شروع ہوتی گئی۔ سب سے پہلے تحقیق اور راویان حدیث کی چھان بین کا یہ عمل حضرت حسن بصری نے شروع کیا۔ حضرت حسن بصری اور محمد بن سیرین تابعین میں بڑا نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ تین تابعین کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ سید التابعین ہیں۔ ایک سعید المسیب، جو حضرت ابوہریرہؓ کے شاگرد خاص اور داماد تھے اور طویل عرصہ ان کے ساتھ رہے۔ دوسرے حضرت حسن بصری جن کے بارے میں کہا گیا کہ وہ سید التابعین ہیں۔ اور تیسرے حضرت محمد بن سیرین جو تابعین میں بڑا نمایاں مقام رکھتے تھے۔

علم طبقات اور علم رجال

ان مؤخر الذکر دو حضرات نے، یعنی حسن بصری اور محمد بن سیرین نے رجال کے کام کا آغاز کیا۔ اور ایک طرح سے یہ دونوں حضرات علم رجال کے بانی اور موسس ہیں۔ انہوں نے سب سے پہلے یہ معلومات جمع کیں کہ صحابہ کرام کہاں کہاں تشریف لے گئے۔ اس ضمن میں پہلا کام یہ تھا کہ صحابہ کرام کے بارے میں تمام معلومات جمع کی جائیں۔ مثلاً ہر صحابی کے بارے میں یہ

سب کو معلوم ہے۔ ان کے بارہ میں زیادہ تحقیق کی ضرورت نہیں پڑی۔ لیکن خطبہ حجۃ الوداع میں
ایک لاکھ چوبیس یا چالیس ہزار صحابہ کرام موجود تھے۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے صحابہ تھے جو اس
موقع پر حج کے لئے تشریف نہیں لائے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کو ہر شخص نہیں جانتا تھا۔ پہلا کام
تو یہ تھا کہ صحابہ کرام کے حالات کو جمع کیا جائے اور ان کے تذکروں پر مبنی کتابیں تیار کی جائیں
تاکہ یہ پتہ چل جائے کہ کون لوگ صحابی تھے اور کون نہیں تھے۔

لہٰذا سب سے پہلے صحابہ کرام کے تذکروں کی جمع و تدوین کا کام شروع ہوا۔ جن میں بعض
کی مثالیں میں ابھی دیتا ہوں۔ آگے چل کر جب صحابہ کرام مدینہ منورہ سے نکل کر کوفہ، بصرہ،
دمشق، مصر اور دیگر مختلف جگہوں میں آباد ہوئے تو اس بات کی بھی ضرورت پیش آئی کہ جو صحابی
جہاں جا کر بسے ہیں وہاں جا کر ان کا تذکرہ لکھا جائے۔ چنانچہ ان صحابہ پر الگ الگ کتابیں لکھی
گئیں جو کوفہ میں جا کر بسے، جو بصرہ میں جا کر بسے، جو دمشق اور قاہرہ میں جا کر بسے اور ان صحابہ
کے بارے میں ایک کتاب ہماری اردو زبان میں بھی ہے (اور عربی میں بھی) جو سندھ میں آ کر
بسے۔ ہندوستان کے ایک بزرگ تھے قاضی اطہر مبارکپوری، انہوں نے ایک کتاب لکھی جس میں
انہوں نے ان صحابہ کے حالات لکھے جو سندھ میں تشریف لائے اور سندھ میں یا مکران سے اور
کہیں ان کا انتقال ہوا۔ اس طرح سے ہر شہر اور علاقہ کے صحابہ پر الگ الگ کتابیں لکھی گئیں جس کے
بعد یہ ممکن نہیں رہا کہ کوئی شخص غلط طور پر یہ دعویٰ کرے کہ فلاں صحابی نے مجھ سے یہ بیان کیا۔ اسی
طرح یہ امکان بھی ختم ہو گیا کہ ایک صاحب صحابی نہ ہوں اور بعد میں یہ دعویٰ کر دیں کہ میں صحابی
ہوں۔ مثال کے طور پر کوئی شخص سمرقند جائے اور یہ دعویٰ کرے کہ میں صحابی رسول ہوں اور حضورؐ
نے یہ فرمایا ہے۔ اگرچہ ایسا نہیں ہوا۔ لیکن چونکہ امکان موجود تھا اس لئے اس امکان کا سدباب
کرنے کے لئے ان تابعین حضرات نے صحابہ کرام کے تذکرے الگ الگ جمع کئے۔ شہروں کے بھی
جمع کئے، قبیلوں کے بھی جمع کئے اور مختلف جنگوں کے حساب سے بھی جمع کئے کہ کس جنگ میں کون کون
سے صحابہ شریک ہوئے۔ تاکہ یہ پتہ چلے کہ کون سے صحابی سمرقند تشریف لے گئے تھے اور کون
سے صحابی آرمینیا تشریف لے گئے تھے۔ تاکہ وہاں اگر کوئی روایت ان کے نام سے آئے تو تحقیق
کی جا سکے کہ وہ وہاں تشریف لے بھی گئے تھے یا نہیں۔

ہندوستان میں ایک شخص تھا بابا رتن، جنوبی ہندوستان میں دکنی یا حیدرآباد دکن کا رہنے

والا تھا۔ اس کا نام بابا رتن تھا۔ ساتویں صدی ہجری میں تھا اور اس نے طویل عمر پائی تھی۔ ہمیں نہیں معلوم کہ وہ کتنا عمر رسیدہ تھا، لیکن غالباً سات سو سال اس کی عمر تھی۔ اس نے دعویٰ کیا کہ میری عمر سات سو سال ہے اور میں رسول ﷺ کے زمانہ میں موجود تھا۔ چنانچہ معجزہ شق القمر کے بعد جب میں نے دیکھا کہ چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے تو میں عرب پہنچا۔ اس وقت رسول ﷺ ہجرت کر کے مدینہ آ چکے تھے۔ میں مدینہ پہنچا، وہیں جا کر مسلمان ہوا اور آپ ﷺ کے پاس تین چار مہینے رہا، پھر آپ نے مجھ سے کہا کہ اپنے علاقہ میں جا کر تبلیغ کرو، تو میں واپس ہندوستان آ گیا۔ بہت سے لوگوں نے اس کی باتیں مان لیں اور اس کا بہت چرچا ہوا۔ لوگ دور دور سے اس کے پاس آ کر شریک ہوئے۔ اس کی خوب بڑی مریدی چلی اور بڑی شہرت ہوئی۔ اس پر محدثین کے سامنے سوال پیدا ہوا کہ اس شخص کے دعوے کی کیا حیثیت ہے۔ محدثین نے لکھا کہ یہ بالکل جھوٹ ہے، ایسا کوئی آدمی صحابی رسول قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن اس کے نام سے روایات مشہور ہونی شروع ہو گئیں۔ ہمارے برصغیر کے لوگ ایسے بھی بڑے خوش عقیدہ ہوتے ہیں اور مذہب کے نام پر بہت جلد لوگوں کی باتوں میں آ جاتے ہیں۔ علامہ اقبال نے ایک جگہ بات کہی ہے:

تاویل کا پھندا کوئی صیاد لگا دے
یہ شاخِ نشیمن سے اترتا ہے بہت جلد

کہ ہندوستان کے مسلمان تاویل کے پھندے میں بہت جلدی پھنس جاتے ہیں۔ یہ ہندوستان کے مسلمانوں کا ایک کمزور پہلو ہے۔ لیکن بابا رتن کے علاوہ ایک دوسرے شخص نے بھی ایسا ہی دعویٰ کیا لیکن محدثین نے بڑی صراحت اور قطعیت کے ساتھ کہا کہ دونوں جھوٹے ہیں اور ان دونوں کو دجال اور کذاب قرار دیا۔ ان کی کوئی بات نہ مانی جائے۔ چنانچہ بہت جلد وہ فتنہ ختم ہو گیا۔

صحابہ کرامؓ کے بعد جیسے جیسے زمانہ بڑھتا گیا علماء حدیث علم رجال پر معلومات جمع کرتے رہے اور بالآخر پانچویں صدی ہجری تک یہ معلومات مکمل طور پر جمع ہو گئیں۔ اس لئے پانچویں صدی ہجری کے بارے میں میں نے عرض کیا تھا کہ امام بیہقی آخری محدث ہیں جن کی وفات ۴۵۸ھ میں ہوئی ہے اور جنہوں نے براہ راست احادیث کی روایت کر کے اپنا مجموعہ مرتب کیا۔ ان کے بعد کے جو مجموعے ہیں وہ براہ راست روایت شدہ مجموعے نہیں ہیں۔ بلکہ سابقہ

جن لوگوں نے لکھا وہ کتابیں ہمارے سامنے ہیں اور ان کی بنیاد پر ہم بتا سکتے ہیں کہ اس کا آغاز کب ہوا۔

طبقات پر اہم کتابیں

سب سے پہلے طبقات ابن سعد کے نام سے بارہ تیرہ جلدوں میں ایک کتاب تیار ہوئی، کوئی ایڈیشن بارہ جلدوں میں ہے، کوئی تیرہ میں اور کوئی چودہ جلدوں میں ہے۔ یہ ایک بڑے مشہور محدث اور مورخ تھے۔ انہوں نے طبقات ابن سعد کے نام سے ایک کتاب لکھی اور اپنے زمانے تک صحابہ سمیت جتنے بھی راویان حدیث تھے ان سب کے حالات جمع کئے۔ اس کا پہلی دو جلدیں سیرت پر ہیں۔ انہوں نے سوچا کہ جس شخصیت کے راویوں کے حالات بیان کرنے ہیں پہلے اس شخصیت کا تذکرہ ہونا چاہئے۔ اس لئے پہلی دو جلدوں میں انہوں نے سیرت بیان کی اور بقیہ دس یا بارہ یا چودہ جتنی بھی جلدیں ہیں ان میں انہوں نے صحابہ کرام سے لے کر اپنے زمانہ تک کے تمام راویوں کے حالات بیان کئے۔

میں آپ سے یہ بھی عرض کر دوں کہ محدثین کی نظر میں ابن سعد کا درجہ اتنا زیادہ اونچا نہیں ہے۔ اس لئے نہیں کہ ابن سعد پر کوئی اعتراض تھا، لیکن یہ بات میں اس لئے عرض کرنا چاہ رہا ہوں کہ محدثین کے مشکل اور سخت معیار کا اندازہ ہو جائے جو انہوں نے راویوں کے لئے رکھا۔ وہ ابن سعد کو کم معیار کا اس لئے قرار دیتے ہیں کہ ابن سعد واقدی کے شاگرد تھے اور واقدی محدثین کی نظر میں قابل قبول نہیں تھے۔ کوئی محدث واقدی کی روایت قبول نہیں کرتا۔ کسی محدث نے، نہ بخاری نے، نہ مسلم نے، نہ ترمذی نے، نہ ابوداؤد نے، کسی نے ان کی روایت قبول نہیں کی۔

مجھے حیرت ہوتی تھی کہ جب ہم واقدی کی کتابیں پڑھتے ہیں تو وہ بڑے صاحب علم، فقیہ اور متدین انسان معلوم ہوتے ہیں تو آخر یہ محدثین ان کی روایت کیوں قبول نہیں کرتے؟ ان کا کردار کس درجہ کا تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی جتنی آمدنی تھی وہ ساری آمدنی اور اپنے وقت کا سارا حصہ طلبہ اور علم کے حصول میں لگایا کرتے تھے۔ علم حدیث کے بارے میں معلومات اور سیرت کے واقعات جمع کرنا ان کے مشاغل تھے۔ سیرت کے بڑے

نام تھے۔ مغازی یعنی حضورؐ کے غزوات کے واقعات جمع کرتے تھے۔ ہر اس قبیلہ میں جاتے تھے
جس نے کسی جنگ میں حصہ لیا ہو یا جس قبیلہ کے کسی آدمی نے حضورؐ کے ساتھ مل کر کسی جنگ میں
شرکت کی ہو اور وہاں سے واقعات جمع کرتے تھے کہ کیا ہوا اور کیسے ہوا اور آپ کے بزرگوں میں کیا
چیز مشہور ہے اور پھر اس کو لکھا کرتے تھے۔ ایک ایسا آدمی جس نے پوری زندگی اس کام میں
گزاری ہو تو آخر محدثین نے اس کو ناقابل قبول کیوں سمجھا؟

واقدی بڑی دولت کا بیشتر حصہ علم حدیث اور علم سیرت کے حصول کی خاطر، روزمرہ کے
ضروریات میں خرچ کرتے تھے۔ اس لئے وہ اکثر تنگ دستی کے شکار رہا کرتے تھے۔ ان کے پاس
پیسے نہیں ہوا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ عید کے موقع پر ان کی اہلیہ نے ان سے شکایت کی کہ گھر میں
پیسے نہیں ہیں، نہ کسی کے پاس کچھ رہ گئے ہیں اور نہ گھر میں عید کا اہتمام کرنے کے لئے کچھ ہے۔ آپ کہیں
سے بچوں کا کوئی بندوبست کریں۔ آپ کو معلوم ہے کہ خواتین اس معاملہ میں زیادہ حساس ہوتی
ہیں۔ پہلے تو واقدی نے کوئی توجہ نہیں دی۔ اس پر بیگم نے ناراضگی شروع کر کے ایک ہنگامہ
مچا دیا۔ یہ بیچارے کسی سے پیسے مانگنے کے لئے گئے۔ ان کے ایک دوست تھے ان سے جا
کر پیسے مانگے۔ انہوں نے دو ہزار درہم کی تھیلی لا کر دے دی۔ اب تھیلی لے کر بڑے خوش خوش
گھر آ رہے تھے کہ اب عید کی تیاری بہتر طریقے سے کریں گے۔ ان کے ایک ہاشمی دوست تھے جو
سادات میں سے تھے، وہ آئے اور انہوں نے آکر بیان کیا کہ میرے ایک ہاشمی دوست
ہیں، سادات میں سے ہیں، وہ کچھ پیسے قرض مانگنے آئے ہیں۔ بیگم سے پوچھا کیا ارادہ ہے؟ واقدی
نے کہا کہ آدھے ان کو دے دوں اور آدھے میں رکھ لوں گا۔ ایک ہزار میں ہم کام چلا لیں گے اور
ایک ہزار ان کو دے دیں گے۔ بیگم نے کہا واہ خدا کا بندہ! واقدی صاحب، تمہاری ساری عمر سیرت کے
مطالعہ کرنے میں گزر گئی ہے، اور تم حدیث کا طالب علم کہتے ہو، حضورؐ کے خاندان کا ایک آدمی
آیا ہے اور تم آدھی رقم خود رکھو گے؟ پوری رقم ان کو نہیں دو گے؟ چنانچہ وہ پوری کی پوری تھیلی ان کو دے
دی۔ انہوں نے پوری تھیلی ہاشمی صاحب کو دے دی۔ اب ہاشمی اس تھیلی کو دیکھ کر حیران ہوئے کہ یہ
کہاں سے آئی؟ دراصل وہ پیسے انہی ہاشمی بزرگ کے تھے۔ ان سے ان کے کسی اور دوست نے
مانگے تھے جو واقدی کے بھی دوست تھے۔ انہوں نے ہاشمی بزرگ سے شکایت کی تھی کہ میرے
پاس پیسے نہیں ہیں، عید کے لئے مجھے کچھ دے دیں۔ انہوں نے وہ تھیلی واقدی کے دوست کو دے

دی۔ واقدی نے جب اپنے دوست سے پیسے مانگے تو انہوں نے وہی تھیلی اٹھا کے جوں کی توں واقدی کو دے دی۔ واقدی سے ہاشمی نے مانگی انہوں نے جوں کی توں اٹھا کے ان کو دے دی۔ یہ بنی عباس کے زمانے کا ذکر ہے۔ جب یہ واقعہ وہاں کے وزیر یحییٰ بن خالد برمکی کو معلوم ہوا تو وہ بڑا خوش ہوا۔ اس نے کہا کہ یہ تو بڑی زبردست بات ہے۔ اس نے دو ہزار درہم واقدی کو دیے، دو ہزار درہم ہاشمی دوست کو دیے اور دو ہزار درہم غیر ہاشمی دوست کو دیے۔ اور کہا کہ یہ پیسے چونکہ واقدی کی بیوی کی وجہ سے ہاشمی کو واپس ہوئے اس لئے بیوی چار ہزار درہم کی مستحق ہے۔ دس ہزار درہم اس نے دیے اور اس طرح یہ قصہ ختم ہوا۔

واقدی اس درجہ کے انسان تھے لیکن محدثین ان کو قابل اعتماد نہیں سمجھتے۔ ان کی کتاب 'کتاب المغازی' تین جلدوں میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے غزوات کے بارے میں بڑی مستند اور معلومات افزا کتاب ہے۔ محدثین کا طریقہ یہ تھا کہ جس نے جو روایت بیان کی انہوں نے اسی طرح بالفاظ بیان کر دی۔ مجھ سے بیان کیا فلاں نے، ان سے فلاں نے، ان سے فلاں نے کہ غزوہ بدر میں مسلمانوں کی تعداد تین سو تیرہ تھی۔ پھر مجھ سے فلاں نے بیان کیا، فلاں سے فلاں نے کہ اونٹوں کی تعداد ۷۰ تھی۔ پھر مجھ سے بیان کیا فلاں نے کہ گھوڑے دو تھے، تلواریں اتنی تھیں۔ مجھ سے بیان کیا فلاں نے، ان سے فلاں نے کہ ہمارے پاس نیزے اتنے تھے۔ اس طرح کی معلومات وہ جمع کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہی طریقہ درست ہے۔

اس کے برعکس واقدی نے یہ کیا کہ ان ساری معلومات کو جمع کیا اور عنوان رکھا غزوہ بدر کے حالات۔ پھر یہ لکھا کہ غزوہ بدر کی یہ معلومات میں نے ان ان حضرات سے جمع کی ہیں۔ ان سب کے نام دیے ہیں اور نام دینے کے بعد اس پورے واقعہ کو ایک مربوط انداز میں بیان کیا۔ الگ الگ یہ نہیں بتایا کہ ان سب مجموعی معلومات میں سے کس سے کتنا حصہ معلوم ہوا ہے۔ محدثین کے ہاں تو یہ بڑا جرم تھا کہ یہ پتہ چلے کہ کس نے کیا بات روایت کی ہے۔ اس لئے محدثین نے واقدی کے اس اسلوب سے شدید اختلاف کیا اور ان کو ساری عمر کے لئے ناقابل قبول قرار دے دیا۔ اس سے صرف یہ اندازہ کرنا مقصود ہے کہ محدثین کا معیار کتنا کڑا تھا کہ انہوں نے ایک ایسے زبردست اور جید عالم کو اور ایسے طالب علم کو جس نے پوری زندگی عرب کے ریگستانوں میں گھوم پھر کر گزاری تھی اور سیرت کی ساری معلومات جمع کی تھیں، محض اس لئے ناقابل قبول قرار دے دیا

کہ ان کے ہاں احتیاط کا وہ اونچا اور غیر معمولی معیار موجود نہیں جس کی پابندی محدثین کرتے تھے۔ حالانکہ واقدی کی کتاب غزوات رسول کے سب سے بڑے ماخذوں میں شمار ہوتی ہے لیکن محدثین نے کہا کہ آپ نے یہ بے احتیاطی کی ہے اس لئے ہم آپ کی بات کو قابل قبول نہیں سمجھتے۔ بہر حال محدثین کے ہاں واقدی کا ذکر ہمیشہ اسی انداز میں آتا ہے۔

ابن سعد انہی واقدی کے شاگرد تھے۔ ابن سعد پر ویسا کوئی اعتراض نہیں تھا۔ لیکن چونکہ واقدی کے ساتھ رہتے تھے اس لئے محدثین نے کہا کہ جب تک کسی دوسرے ذریعے سے تصدیق نہ ہو ابن سعد کی بات بھی زیادہ قابل اعتماد نہیں۔ میری ذاتی رائے میں تو بطور مورخ دونوں قابل اعتماد ہیں اور تاریخی واقعات کی حد تک دونوں کی بات قابل قبول ہے۔ لیکن حدیث کی روایت کے بارے میں ان دونوں حضرات کی بات محدثین نے قبول نہیں فرمائی۔

طبقات ابن سعد کے بعد جن حضرات نے کتابیں لکھیں ان میں سب سے پہلی کتاب جو آج ہمارے پاس موجود ہے وہ امام بخاری کے استاد یحییٰ بن معین کی ہے۔ یحییٰ بن معین اتنے بڑے محدث تھے کہ اپنے زمانے میں امیر المؤمنین فی الحدیث کہلاتے تھے۔ امام بخاری کے اساتذہ میں سے تھے اور امام احمد بن حنبل کے دوستوں میں سے تھے۔ انہوں نے فن رجال پر کتاب لکھی ہے۔ ان کے بعد امام بخاری کے ایک اور استاد علی بن المدینی نے ایک کتاب لکھی۔

لیکن جس شخصیت نے علم رجال پر سب سے زیادہ کام کیا وہ خود امام بخاری تھے۔ امام بخاری کی کئی کتابیں ہیں ان میں سے کتاب التاریخ الکبیر اور کتاب التاریخ الصغیر دونوں چھپ چکی ہیں۔ یہ اس طرح سے ہسٹری کی کتابیں نہیں ہیں جس طرح آج ہسٹری کی کتابیں ہوتی ہیں۔ بلکہ یہ کتابیں اسماء الرجال پر ہیں۔ یعنی ان رجال کے حالات پر ہیں جن کا علم حدیث میں ذکر آتا ہے اور یہ کہ کب ان کی پیدائش ہوئی اور کب وفات ہوئی۔ وفات کا تذکرہ اس لئے ضروری ہے کہ یہ تعین کیا جائے کہ ان کی ملاقات اپنے شاگرد سے جو ان سے منسوب کر کے بیان کرتا ہے ہو سکتی تھی کہ نہیں ہو سکتی تھی۔ جب تک تاریخ وفات کا پتہ نہ ہو اس وقت تک یہ تعین بڑا دشوار ہے۔ پھر امام بخاری کی شرط تو اس سے بھی بہت آگے ہے کہ صرف معاصرت یعنی ہم عصری ہو بلکہ یہ بھی ثابت ہو کہ ان کی ملاقات ہوئی ہے۔ تو اس لئے امام بخاری یہ بھی تحقیق کرتے تھے کہ ان کے کن کن شاگردوں کی ان سے ملاقات ثابت ہے اور ان کے اپنے کن کن اساتذہ سے

ملاقات ثابت ہے۔ یہ معلومات امام بخاری نے جمع کی ہیں۔

امام بخاری نے ایک اور کتاب بھی لکھی ہے۔ یہ علم رجال کا ایک شعبہ ہے جس پر کم از کم ایک درجن کے قریب کتب آج دستیاب ہیں۔ وہ یہ کہ جب رجال پر معلومات کی یکجائی شروع ہوا تو یہ بھی پتہ چلا کہ اب ایسے لوگ بھی سامنے آرہے ہیں جو کمزور ہیں یا اس معیار کے نہیں ہیں جس معیار کے لوگوں کی روایت قبول کی جاتی ہے۔ ان راویوں کو ضعفاء یا متروکین کہا جاتا ہے۔ جب ضعفاء اور متروکین کی تعداد زیادہ ہوئی تو محدثین اور علماء رجال نے ان پر الگ کتابیں تیار کیں۔ امام بخاری نے سب سے پہلے ایک کتاب لکھی: کتاب الضعفاء الصغیر۔ یعنی چھوٹی کتاب جو ضعیف راویوں پر مشتمل ہے۔ اس میں انہوں نے ضعیف راویوں کی معلومات اور فہرست الگ سے دی ہے تاکہ لوگ کتاب کی مدد سے یہ تحقیق کر لیں کہ اگر ان میں سے کوئی راوی آرہا ہے تو وہ راوی ضعیف ہے اور اس کی روایت میں تامل کرنا چاہئے۔ جن لوگوں نے اس موضوع پر لکھا ہے ان میں امام مسلم بھی شامل ہیں۔ لیکن بعد کے محدثین میں جن کا کام اس میدان میں سب سے نمایاں ہے وہ امام دارقطنی ہیں۔ امام دارقطنی کی کتاب کئی جلدوں میں مشہور ہے۔ ان کی کئی کتابیں علم رجال اور جرح وتعدیل پر ہیں۔ جرح وتعدیل پر کتابوں کا تذکرہ آگے کریں گے۔

امام دارقطنی کے ایک معاصر اور امام مسلم کے ایک جونیئر معاصر ابوبکر بزار تھے جن کی مسند بزار مشہور ہے۔ انہوں نے بھی علم رجال پر ایک کتاب لکھی اور اس کتاب میں ان معلومات کو جمع کیا۔ امام نسائی جو صحاح ستہ میں سے ایک کتاب کے مصنف ہیں۔ ان کی کتاب ہے کتاب الضعفاء والمتروکین۔ یہ کتاب بھی مطبوعہ شکل میں موجود ہے اور چھپ چکی ہے۔ اس میں ان راویوں کے حالات ہیں جو ضعیف ہیں یا جن کی روایت کو ترک کر دیا جاتا ہے اور قبول نہیں کیا جاتا۔

حرمین اور اسپین کے دو اور بڑے نام علامہ ابن ابی حاتم اور حافظ ابن عبدالبر ہیں۔ ابن عبدالبر اسپین کے رہنے والے تھے۔ ان کا تعلق چوتھی پانچویں صدی ہجری سے ہے اور یہ حافظ اہل المغرب کہلاتے ہیں۔ یعنی اسپین، مراکش، اندلس، قیروان اور تیونس کے سب سے بڑے حافظ حدیث۔ ان سے بڑا محدث ان کے زمانے میں اور کوئی نہیں تھا۔ ان سے بڑے مشہور محدثین ان کے بعد پیدا ہوئے۔ لیکن ان کے اپنے زمانے میں ان سے بڑا کوئی محدث نہیں تھا۔ حافظ ابن عبدالبر نے بہت سی کتابیں لکھیں۔ ان میں موطا کے رجال پر ان کی کتاب بہت

کے نام سے ملتا ہے۔ انہوں نے جب حافظ مزی کی کتاب کو دیکھا تو ان کو پتہ چلا کہ اس میں تو بہت کمی رہ گئی ہے۔ انہوں نے اس کو مکمل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس کا تکملہ لکھا۔ یعنی اس کتاب کا ایک ضمیمہ تیار کیا۔ اصل کتاب بارہ جلدوں میں ہے جو تقریباً تیرہ جلدوں میں تیار ہوا۔ اس طرح سے یہ کتاب 'اکمال الکمال: تہذیب الکمال فی اسماء الرجال' کے نام سے حافظ مغلطائی نے لکھی۔ اب یہ کتاب اتنی طویل اور ضخیم ہو گئی کہ اس سے استفادہ مشکل ہو گیا۔ اس پر علامہ ذہبی نے جو حافظ مغلطائی کے ہم عصر تھے، اس کی تہذیب تیار کی اور 'تہذیب تہذیب الکمال فی اسماء الرجال' یعنی تہذیب الکمال کی تہذیب۔ انہوں نے ایک نیا نسخہ تیار کیا، وہ بڑا مقبول ہوا اور ہر جگہ ملتا ہے۔ اس کے بعد اس کتاب کو بے شمار لوگوں نے کم و بیش ایک درجن حضرات نے اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔ اس پر مزید تحقیق کی، اس کی شرحیں لکھیں، اس کے حواشی لکھے اور اس کو مزید بہتر بنایا، تا آنکہ ان کے تقریباً سو سال کے بعد بھی حافظ ابن حجر ہیں جن کا نام ہر حدیث کے حوالہ میں آتا ہے، وہ ایسے کم لوگ ہیں جن کا ذکر حدیث کی ہر گفتگو میں آئے اور حافظ ابن حجر ان میں سے ایک ہیں۔ انہوں نے تہذیب التہذیب کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ یہ بھی ہر جگہ ملتی ہے۔ پھر تہذیب التہذیب کا انہوں نے دو جلدوں میں خلاصہ لکھا 'تقریب التہذیب' یعنی لوگوں کے لئے تہذیب کو قریب بنانا۔

یہ علم حدیث میں علم رجال پر کام تھا جو وقتاً فوقتاً ہوا۔ اس پر مزید گفتگو بھی کرنی ہے لیکن چونکہ آج وقت ختم ہو گیا اس لئے رجال پر بقیہ گفتگو جرح و تعدیل کے سیاق و سباق میں ہوگی۔

صحابہ کرام پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ صحابہ کرام کے تذکرہ پر ہی آج کی گفتگو ختم کرتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا صحابہ کرام پر اس تحقیق کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ غیر صحابی کو کسی غلط فہمی یا کسی بد نیتی کی وجہ سے صحابی نہ سمجھ لیا جائے۔ تو پہلے صحابہ کرام پر مختلف تذکرے تیار ہوئے۔ ان میں سب سے قدیم تذکرہ جو آج بھی دستیاب ہے وہ علامہ ابن عبدالبر کا ہے جن کو حافظ اہل المغرب کہا جاتا ہے۔ علامہ ابن عبدالبر کی وفات ۴۶۳ھ میں ہوئی تھی۔ پانچویں صدی ہجری کے آدمی ہیں۔ انہوں نے کتاب لکھی تھی 'الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب' یعنی صحابہ کی پہچان کی ایک جامع کوشش۔ الاستیعاب کے معنی ہیں comprehensive survey اس کتاب میں انہوں نے کم و بیش ساڑھے سات ہزار صحابہ کا تذکرہ کیا ہے۔

اس کے بعد علامہ ابن حجر عسقلانی نے ایک کتاب لکھی 'الاصابہ فی تمییز الصحابہ' جس میں تقریباً بارہ ہزار صحابہ کا تذکرہ ہے۔ ان سے پہلے ایک کتاب علامہ ابن اثیر جزری نے لکھی تھی 'اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ'۔ صحابہ کے تذکرے پر یہ تین بڑی بڑی کتابیں ہیں جو آج ہر جگہ دستیاب ہیں۔ خود صحابہ کے بارے میں براہ راست معلومات کا مستند ترین، جامع ترین اور بہترین ذخیرہ تین کتابیں ہیں، چوتھی کتاب طبقات ابن سعد جس کا میں نے ذکر کیا۔ ان چار کتابوں سے صحابہ کرام کی زندگی کا پورا نقشہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ اب کسی کے لئے یہ ممکن نہیں رہا کہ کسی غیر صحابی کو صحابی کہہ کر کوئی غلط بات اس کے حوالہ سے حضورؐ کی ذات گرامی سے منسوب کر دے۔ دو کتابیں ان کے علاوہ ہیں جو مختلف شہروں یا مختلف علاقوں کے لحاظ سے لکھی گئیں، دمشق کے صحابہ کرام، فارس، مصر کے صحابہ کرام وغیرہ۔

ایک آخری کتاب کا ذکر کر کے بات ختم کرتا ہوں۔ ایک بزرگ تھے علامہ ابن عساکر جو بڑے محدث تھے۔ ابن عساکر کی کتاب تاریخ دمشق فن تاریخ کی چند عجائب روزگار کتابوں میں سے ایک ہے۔ میں مبالغہ نہیں کر رہا بلکہ کوئی کتب خانہ ہو تو میں آپ کو دکھا بھی سکتا ہوں۔ انہوں نے پوری زندگی اس کام میں لگائی کہ دمشق شہر میں کون کون سے محدثین آئے۔ دمشق میں کس کس حدیث کی روایت ہوئی۔ یہاں کون کون سے صحابہ کرام آئے، یہاں حدیث پر کتنا کام ہوا۔ علم حدیث سے متعلق دمشق میں کتنا کام ہوا۔ علم حدیث کی زبان پر کیا کام ہوا۔ لغات پر کیا کام ہوا۔ انہوں نے یہ لکھی تھی تاریخ دمشق کے نام سے۔ دمشق میں ایک بڑی فاضل اور معمر خاتون ہیں۔ میری ان سے ملاقات ہوئی ہے۔ وہاں ایک مجمع اللغۃ العربیۃ ہے جو ۱۹۲۱ء سے قائم ہے۔ عرب دنیا کا قدیم ترین علمی ادارہ ہے۔ میں بھی الحمدللہ اس کا رکن ہوں۔ عربی زبان کے مشہور ماہر مولانا عبدالعزیز میمن بھی اس کے رکن تھے۔ میرے استاد مولانا محمد یوسف بنوری جو بڑے مشہور محدث تھے وہ بھی اس کے رکن تھے۔ وہاں وہ کتاب شائع ہو رہی ہے۔ اس کی اسی (80) جلدیں اب تک چھپ چکی ہیں اور ہر جلد خاصی ضخیم ہے۔ ابھی وہ کتاب مکمل نہیں ہوئی ہے۔ ان خاتون کا کہنا تھا کہ اگر یہی رفتار رہی تو شاید ۱۲۰ جلدوں میں یہ کتاب مرتب ہو جائے گی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ محدثین نے کتنی معلومات جمع کی ہیں۔ یہ ایک کتاب صرف دمشق شہر کے بارے میں ہے۔

خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد لکھی تھی جو متعدد جلدوں میں کئی بار چھپی ہے اور اب ایک اور مزید تحقیق کے ساتھ چھپ رہی ہے۔ اس کی بھی درجنوں جلدیں ہوں گی۔ وہ اس میں بھی معلومات بغداد کے بارے میں ہیں۔ بغداد میں جتنے تابعین گزرے ہیں، صحابہ تو وہاں کم گئے صحابہ کے بعد بغداد بنا، لیکن تابعین، اور زیادہ تر تبع تابعین تھے۔ تبع تابعین کے دور سے وہاں علم حدیث کا زیادہ چرچا شروع ہوا۔ تابعین کے دور سے معمولی، جو تابعین یا تبع تابعین وہاں گئے ان سے لے کر پانچویں صدی ہجری میں خطیب بغدادی کے زمانے تک بغداد میں آنے والے ہر محدث ہر خادم حدیث اور ہر عالم کا تذکرہ اس میں موجود ہے۔

سوالات کل کریں گے اس لئے کہ آج جمعہ کا دن ہے اور وقت تنگ ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

چھٹا خطبہ

جرح وتعدیل

ہفتہ، 11 اکتوبر 2003

جرح و تعدیل

جرح و تعدیل کی قرآنی اساس

اس سے پہلے علم اسناد اور اس سے متعلق چند ضروری مسائل پر گفتگو ہوئی تھی اور اس میں یہ عرض کیا گیا تھا کہ خود قرآن مجید اور سنت رسول کی رو سے یہ بات ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے جو چیز منسوب کی جائے وہ ہر لحاظ سے قطعی اور یقینی ہو۔ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو اور ہر مسلمان جو تاقیام قیامت دنیا میں پیدا ہو اس کو پورے اطمینان اور شرح صدر کے ساتھ یہ بات معلوم ہو جائے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کے لئے کیا بات ارشاد فرمائی ہے۔ کیا چیز جائز قرار دی ہے، کیا ناجائز ٹھہرائی ہے، کن چیزوں پر ایمان لانا اس کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے اور کن چیزوں کے بارے میں اس کو آزادی دی گئی ہے۔ اس اصول کی بنیاد قرآن مجید کی وہ آیات ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب بھی کوئی اطلاع یا خبر تم تک پہنچے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو۔ ان جاءکم فاسق بنبأ فتبینوا 'جب کوئی فاسق شخص تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کر لو۔ اس لئے کہ اگر بغیر تحقیق کے اس خبر کو قبول کر لو گے تو ہو سکتا ہے کہ کسی ایسی قوم کے خلاف تم کوئی کارروائی کر گزرو جس کے خلاف کارروائی کرنے میں تم حق بجانب نہ ہو۔

اگرچہ اس آیت مبارکہ کا براہ راست تعلق روایت حدیث سے نہیں ہے، لیکن اس سے یہ اصول ضرور نکلتا ہے کہ ہر خبر کی تحقیق ضرور کر لینی چاہئے۔ جب دنیاوی معاملات میں تحقیق کی یہ اہمیت ہے تو وہ خبر جو رسول اللہ ﷺ کے قول، فعل یا تقریر کے بارے میں دی گئی ہو اس کی اہمیت

چونکہ بہت زیادہ ہے اس لئے اس کی تحقیق کرنا اور پہلے سے اس بات کا یقین ہونا کہ یہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے، انتہائی ضروری ہو جاتا ہے۔

ایک اور جگہ قرآن مجید کی سورۃ ممتحنہ میں آیا ہے۔ ممتحنہ کا نام بھی ان کے تحقیق سے ان میں امتحان لینے یا آزمانے کا ذکر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: یا ایہا الذین آمنوا اذا جاءکم المؤمنات مہاجرات فامتحنوہن۔ جب تمہارے پاس مومن عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو ان کو آزما کر دیکھو۔ یہ آیت صلح حدیبیہ کے بعد نازل ہوئی تھی جب بڑی تعداد میں مکہ مکرمہ سے خواتین نے ہجرت کر کے مدینہ منورہ آنا شروع کیا اور ہر آنے والی خاتون نے یہ کہا کہ چونکہ میں نے اسلام قبول کر لیا ہے، لہٰذا اس کو مدینہ منورہ میں شہریت دے دی جائے اور یہاں رہنے کی اجازت عطا فرما دی جائے۔ اس وقت یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا ہر آنے والی خاتون کے اس دعویٰ کو قبول کر لیا جائے یا اس کی تحقیق اور تصدیق کی جائے۔ ایک اعتبار سے یہ معاملہ بڑا اہم تھا اس لئے کہ آنے والی خاتون یہ بیان کر رہی تھی کہ اس نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اور حالت اسلام میں جب رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی تو وہ صحابیہ ہو گئی۔ گویا ایک صحابیہ کی طرف سے یہ کہا جا رہا ہے کہ اس نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اس کے باوجود فامتحنوہن کا حکم دیا جا رہا ہے کہ ان کا امتحان لو اور آزمائش کر کے دیکھو کہ کیا انہوں نے واقعی اسلام قبول کیا ہے یا نہیں۔ اس سے عام طور پر یہ سبق نکلتا ہے کہ اگر کسی شخص کا یہ دعویٰ ہو کہ وہ صحابی ہے تو اس دعویٰ کی تحقیق کرنی چاہئے، اگر کسی شک وشبہ کا امکان ہو۔

کل میں نے آپ میں سے کسی کے سوال کے جواب میں بابا رتن ہندی کی مثال دی تھی جس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ اس کی عمر چھ سو سال ہے اور اس نے رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی تھی۔ اہل علم نے اس کی تحقیق کی اور ثابت کیا کہ دعویٰ جھوٹا ہے۔ اور بابا رتن کے بارے میں تمام اوہام وخرافات اور روایات کی تردید کر دی۔ قرآن مجید کی ان دونوں آیات سے اسناد اور راویوں کی تحقیق کا اصول ملتا ہے۔

مزید برآں جیسا کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا، جس کا کئی بار حوالہ دیا جا چکا ہے، کفی بالمرء کذبا ان یحدث بکل ما سمع۔ کسی شخص کے جھوٹا ہونے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ جو بات سنے اس کو آگے بیان کر دے۔ اس میں بھی اس بات کی تلقین ملتی ہے کہ جب کوئی بات

سنو تو پہلے اس کی تحقیق کر لو اور اگر یہ ثابت ہو جائے تو پھر آگے بیان کرو۔ اور کسی سنائی بات کو بغیر تحقیق کئے آگے بیان نہ کرو۔ جب عام باتوں کے بارے میں یہ حکم ہے تو پھر روایت حدیث تو دینی اہمیت رکھنے والا معاملہ ہے۔ اس میں تحقیق کرنے کا حکم کیوں نہیں دیا جائے گا۔ لازماً دیا جائے گا اور یقینی طور پر تحقیق کرنا لازمی ہوگا۔

صحابہ کرام اور جرح کی روایت

جب تک معاملہ صحابہ کرام کے ہاتھ میں رہا تو اس کی تحقیق کی یہ شکل تھی کہ ایک صحابی جو روایت بیان کرے ہم اسے اس کو صحیح طور پر سمجھا ہی چاہئے لیکن بعض اوقات صحابہ کرام تحقیق و تصدیق سے اس لئے نظر انداز بھی کر دیا کرتے تھے۔ نظر انداز وہیں کیا کرتے تھے جہاں سو فیصد یقین ہوتا تھا کہ صحابی رسول جو بات بیان کر رہے ہیں وہ اپنے ذاتی یقین اور مشاہدہ کی بنیاد پر بیان کر رہے ہیں۔ اس میں کسی بھول چوک کا امکان نہیں۔ نعوذ باللہ صحابہ کرام کے بارے میں غلط بیانی کا امکان تو تھا نہیں۔ لیکن بھول چوک یا کسی ایک چیز کو کسی دوسرے سیاق و سباق میں سمجھ لینے کا امکان بہرحال تقاضائے بشری موجود تھا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کے بارے میں تمام اہل علم نے تصدیق کی ہے کہ وہ سب سے پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے سندوں اور راویوں کے بارے میں تحقیق کرنے کی روش اختیار کی۔ ظاہر ہے جناب صدیق اکبرؓ کا زمانہ تو ابتدائی سا زمانہ تھا رسول اللہ ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے کوئی دو ڈھائی سال بعد ان کا بھی انتقال ہوگیا۔ اس لئے جو لوگ ان سے احادیث بیان کر رہے تھے وہ تقریباً سب کے سب صحابہ ہی تھے۔ لیکن اس کے باوجود جناب صدیق اکبرؓ نے ان سے بھی تصدیق و تحقیق کی روش اپنائی اور یہ چاہا کہ اس بات کو لوگوں کے ذہن نشین کریں کہ کوئی چیز رسول اللہ ﷺ کی ذات سے غلط منسوب نہ ہونے پائے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زندگی میں ایسے کئی واقعات ملتے ہیں کہ ان کے سامنے کسی صحابیؓ نے کوئی حدیث بیان کی تو انہوں نے اس حدیث کو فوراً نہیں قبول کیا، صحابیؓ سے کہا کہ اس کے لئے مزید شہادت پیش کریں اور اس مزید شہادت و ثبوت کے بعد انہوں نے حدیث کو قبول کیا۔

کسی سے ملنے کے لئے جائے تو دوسرا آدمی ہر وقت اس سے ملنے کے لئے تیار ہو۔ اس کی مصروفیات بھی ہو سکتی ہیں، اس کے آرام کا وقت بھی ہو سکتا ہے، وہ کسی ایسے کام میں مصروف ہو سکتا ہے جو زیادہ اہم ہو۔ اس پر حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے کہا جو بات آپ نے حضور علیہ السلام کے حوالہ سے بیان کی ہے اس پر کوئی گواہ ہے؟ حضرت ابو موسیٰ اشعری بڑے بڑے صحابہ میں شمار ہوتے تھے۔ کم عمر تھے۔ بالکل ابتدائی دور میں مسلمان ہوئے تھے۔ انہوں نے اس کو محسوس کیا کہ میں نے ایک حدیث بیان کی اور حضرت عمر فاروقؓ اس کو قبول کرنے میں تامل کر رہے ہیں۔ لیکن ان کے حکم پر انہوں نے ایک دوسرے صحابی، جو اتفاق سے اس وقت موجود تھے، حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ چلیں حضرت عمرؓ کے دربار میں گواہی دیں کہ اس ارشاد کے موقع پر آپ بھی موجود تھے۔ چنانچہ حضرت ابو سعید خدریؓ نے گواہی دی اور فرمایا کہ جب رسول اللہ ﷺ نے یہ بات ارشاد فرمائی تھی تو میں بھی موجود تھا اور میں اس کا گواہ ہوں۔

اب حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے شکایت کی تو فرمایا کہ "کنت امینا علی حدیث رسول الله ﷺ" خدا کی قسم میں رسول اللہ ﷺ کی احادیث کے معاملہ میں بڑا امانت دار ہوں اور میں پوری ذمہ داری سے یہ بات بیان کر رہا تھا۔ اس کے باوجود آپ نے گویا میری بات قبول نہیں کی اور ایک گواہ طلب کر لیا۔ اس پر حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا کہ "اجل"۔ یقیناً ایسا ہی ہے۔ میں آپ کو بہت دیانت دار سمجھتا ہوں "ولکنی احببت ان اتثبت" لیکن میں یہ چاہتا تھا کہ مزید تحقیق اور مزید تصدیق کر لوں۔

ایسے ہی ایک موقع پر جب حضرت عمر فاروقؓ نے دوسری گواہی طلب کی تو آپ نے فرمایا کہ "اما انی لم اتھمک" دیکھئے میں نے آپ پر کوئی الزام نہیں لگایا۔ میں آپ پر تہمت نہیں لگا رہا کہ خدانخواستہ آپ غلط بیانی کر رہے ہیں "ولکنی خشیت ان یتقول الناس علی رسول الله ﷺ" لیکن مجھے یہ ڈر ہوا کہ آپ لوگوں کو بار بار احادیث بیان کرتے دیکھ کر اور ہمیں آسانی سے قبول کرتے دیکھ کر لوگوں میں یہ جرات پیدا ہو جائے کہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں جو چاہیں ہر وقت بیان کر دیں۔ لوگوں کو اس طرح کی تربیت دینے کے لئے کہ جو بات بیان کریں بہت اہتمام اور تحقیق کے ساتھ بیان کریں، میں نے آپ سے گواہی کا مطالبہ کیا۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں روایت آتا ہے کہ ان کے سامنے

جب کوئی شخص حضور ﷺ کی حدیث بیان کرتا تھا تو وہ اس سے قسم لیا کرتے تھے کہ قسم کھاؤ کہ تم نے اپنے ہی سنا ہے۔ حالانکہ وہ بیان کرنے والے بھی صحابی ہوتے تھے۔ دراصل حضرت علیؓ یا حضرت عمر فاروقؓ یا حضرت ابوبکر صدیقؓ دوسرے صحابہ پر شک نہیں کر رہے تھے۔ بلکہ دوسرے لوگوں کو تربیت دینے اور غیر صحابہ کو اس بات کی مشق کرانے کے لئے کہ ارشاد رسول کی روایت کی کتنی اہمیت ہے، وہ صحابہ کرام سے بھی قسم لیا کرتے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ کی یہ سنت ہے کہ راوی کے بارے میں تحقیق کی جائے اور جب کوئی راوی روایت بیان کرے تو اس کی تحقیق میں جتنی امکان ہو بھی تدابیر اختیار کی جا سکتی ہیں وہ اختیار کی جائیں۔

صحابہ کرام تحریری شہادت قبول نہیں کیا کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک خط یا ایک تحریر دوسری تحریر کے مشابہ ہو سکتی ہے۔ اب اگر مدینہ منورہ سے کوفہ میں کسی صحابی کے نام کوئی خط گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ بات ارشاد فرمائی تھی تو کوفہ میں بیٹھے ہوئے صحابی کو کیسے پتہ چلے گا کہ یہ خط واقعی مدینہ سے فلاں صحابی ہی نے بھیجا ہے۔ یا کوفہ کے کسی صحابی نے شام اور مصر میں کسی کے نام خط لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ بات فرمائی تھی اور مجھ سے فلاں صحابی نے بیان کی تو اس کی تصدیق کون کرے گا کہ یہ خط انہی صحابی کے قلم کا لکھا ہوا ہے جن سے منسوب کیا جا رہا ہے۔ اس میں کسی غلطی، ملاوٹ یا گڑبڑ کا ایک امکان بہرحال موجود تھا۔ اس لئے اس وقت یہ طے کیا گیا تھا کہ صرف تحریری دستاویز یا محض نوشتہ کی بنیاد پر کوئی حدیث قبول نہیں کی جائے گی، جب تک اس کے حق میں کوئی زبانی گواہی موجود نہ ہو۔ یا تو کوئی ایسا زبانی گواہ موجود ہو جو آکر اس بات کی گواہی دے کہ یہ تحریر میرے سامنے فلاں صاحب نے لکھی تھی، پھر ان کی گواہی بھی سند میں شامل ہو گئی کہ فلاں صاحب نے یہ گواہی دی۔ مثلاً فلاں صحابیؓ نے میری موجودگی میں میرے روبرو یہ حدیث لکھی اور یہ لکھا کہ یہ بات رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمائی۔ اس طرح سے تحریری اور زبانی دونوں گواہیوں کو ملا کر ایک گواہی بن جاتی تھی۔

یہ سلسلہ صحابہ کرامؓ کے زمانے تک جاری رہا۔ اور صحابہ کرامؓ نے اس سے زیادہ کسی اہتمام کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس لئے کہ روایت کرنے والے سب صحابیؓ تھے۔ صحابہ ایک دوسرے کو جانتے تھے، بڑے بڑے صحابہ جو مدینہ منورہ میں رہتے تھے، یا مکہ مکرمہ میں رہتے تھے، یا کوفہ اور دمشق جا کر بس گئے تھے، وہ سب ایک دوسرے سے واقف تھے۔ ایک ہی برادری اور ایک

اسناد کا عمل نہ ہوتا لقال من شاء ما شاء۔ یہ جملہ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کا ہے جو امیر المومنین فی الحدیث کہلاتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ سند دین کا حصہ ہے، اگر اسناد کا عمل نہ ہوتا تو دین کے بارے میں جس کا جو جی چاہتا وہ کہہ دیا کرتا اور کوئی پوچھنے والا نہ ہوتا۔ اس لئے اس بات کو یقینی بنانے کے لئے کہ رسول اللہ ﷺ سے کوئی غلط بات منسوب نہ ہو جائے اسناد کے عمل کو لازمی قرار دیا گیا۔ اور یہ بات مسلمانوں کے علمی مزاج کا حصہ بن گئی کہ جو علمی بات کسی کے سامنے کی جائے وہ پوری سند کے ساتھ کی جائے۔ یہ روایت مسلمانوں کے علاوہ کسی قوم میں موجود نہیں۔ بلا استثنا اور بلا خوف تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ سند کا یہ تصور صرف اور صرف مسلمانوں کی روایت میں پایا جاتا ہے کسی اور قوم کی مذہبی یا غیر مذہبی روایت میں سند کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔

اسناد کی پابندی کی اسلامی روایت

مسلمانوں کے ہاں نہ صرف علم حدیث میں، بلکہ تمام علوم وفنون میں اسناد کی پابندی لازمی سمجھی گئی۔ آپ تفسیر کی پرانی کتابیں اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ آج ہی جا کر تفسیر طبری دیکھیں۔ اس میں ہر بات اور تفسیر سے متعلق ہر جملہ پوری سند کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ ابن جریر طبری نے یہ جملہ یا قول کس سے سنا۔ انہوں نے کس سے سنا، انہوں نے کس سے سنا؟ یہاں تک کہ یہ بات یا صحابہ کرام تک یا رسول اللہ ﷺ تک یا جہاں تک وہ بیان کرنے والا بیان کرنا چاہتا ہے وہاں تک پہنچتی ہے۔ طبری کی تفسیر میں بغیر حوالہ اور بغیر سند کے ایک جملہ بھی نقل نہیں کیا گیا۔ الا یہ کہ وہ بات ابن جریر طبری کی اپنی رائے ہو۔ ایک سے زائد احادیث پر جہاں وہ تبصرہ کرتے ہیں وہاں لکھتے ہیں: قال ابن جریر "اور ابن جریر کا کہنا یہ ہے" یا: "قلت" میں نے کہا یا اقول "میں یہ کہتا ہوں"۔ گویا جہاں ان کی اپنی رائے ہے وہاں اپنا حوالہ ہے اور جہاں ان کی اپنی رائے نہیں ہے، وہ مکمل حوالہ اور سند کے ساتھ روایات کرتے ہیں۔

سیرت کی پرانی کتابیں اٹھا کر دیکھیں۔ سیرت کی ساری پرانی کتابوں میں، ابن اسحاق کی سیرت ہو، جو اب چھپ گئی ہے یا عروہ بن زبیر کی کتاب المغازی ہو، گو کہ واقدی ہوں جو اتنے مستند نہیں سمجھے جاتے، یا ابن سعد ہوں، ان میں سے ہر کتاب میں ہر واقعہ کی پوری سند موجود ہے۔ ایک ایک جملہ کی مکمل سند بیان کی گئی ہے۔ حتیٰ کہ ادب، شعر، فصاحت، بلاغت،

صرف، نحو اور لغت ان سب کی سندیں موجود ہیں۔

حتی کہ یہ بات کہ امرؤ القیس نے کوئی شعر کس طرح کہا تھا اور کیا کہا تھا اس کی بھی پوری سند بیان ہوئی ہے۔ ایک شاعر اور ادیب تھے مفضل ضبی۔ انہوں نے عربی شاعری کے بہت سے قصائد جمع کیے اور دینی زندگی کے سا تھ سا تھ اس میں لگا رہے کہ عرب قبائل میں پھر پھر کے لوگوں سے پرانے اشعار سنے، اور جمع کیے اور پھر پوری سند کے ساتھ بیان کیے کہ انہوں نے کس سے سنا، جس سے سنا اس نے کس سے سنا؟ حالانکہ شعر و ادب میں اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ اگر آپ سے کوئی کہے کہ موجودہ دیوان غالب کی سند کیا ہے تو پوچھنے والا بھی اس سوال کو مضحکہ خیز سمجھے گا اور جس سے پوچھا جائے گا وہ بھی اس کو فضول بات سمجھے گا۔ حالانکہ مرزا غالب اتنے پرانے نہیں ہیں۔ ڈیڑھ سو سال پہلے کے ہیں۔ لیکن ان کے دیوان کی کوئی سند ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔ ہمیں کوئی پتہ نہیں کہ مرزا غالب کے نام سے جو دیوان مشہور ہے یہ واقعی پورے کا پورا انہی کا دیوان ہے کہ نہیں۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

واقعی انہوں نے ہی کہا تھا یا کسی اور نے کہا تھا۔ اس کا بہر حال عقلی طور پر پورا امکان موجود ہے کہ کسی نے غلط چھاپ دیا ہو اور یہ مطلع مرزا صاحب سے غلط طور پر منسوب کر دیا ہو۔ اب کوئی ایک ایسا آدمی موجود نہیں ہے جو قسم دے کر گواہی دے کہ مرزا غالب نے میرے سامنے یہ غزل کہی تھی اور پھر انہوں نے آگے بیان کی ہو یا پھر کسی اور نے بیان کی ہو۔ یہ چیز مسلمانوں کے علاوہ کسی اور قوم کے پاس موجود نہیں ہے۔

یہ صرف علم حدیث کی دین ہے کہ علم حدیث نے مسلمانوں میں ایک ایسا ذوق پیدا کر دیا کہ انہوں نے نہ صرف دینی علوم بلکہ شعر و ادب، بلاغت اور صرف و نحو کی ایک ایک چیز کی، ایک ایک قاعدہ کلیہ کی، ایک ایک شعر کی، ایک ایک ضرب المثل کی سند کے ساتھ حفاظت کی اور وہ کتابیں آج ہمارے پاس موجود ہیں۔ پڑھنے والوں کو بعض اوقات الجھن بھی ہوتی ہے کہ ادب کی کتاب میں تو روانی تب آتی ہے جب مسلسل عبارت ہو۔ ادب کی کتب میں درمیان میں سندیں آ رہی ہوں تو پڑھنے والوں کو الجھن ہوتی ہے۔ لیکن اس مواد کی تاریخی حیثیت اور اس کے

استناد اور authenticity کو محفوظ رکھنے کے لئے جس کا التزام وہاں بھی کیا گیا۔

جیسا کہ آپ میں سے ہر ایک کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ وقت گزرنے کے ساتھ سند لمبی بھی ہوتی گئی۔ رسول اللہ ﷺ سے زمانہ جتنا دور ہوگا سند اتنی ہی لمبی ہوگی۔ سب سے مختصر سندیں موطا امام مالکؒ میں ہیں جو اکثر و بیشتر دو ناموں پر مشتمل ہیں۔ امام مالکؒ، ان کے استاد اور ایک صحابی۔ مثلاً مالک عن نافع عن ابن عمرؓ۔ حضرت نافعؒ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ دو آدمی ہیں۔ کہیں کہیں موطا امام مالکؒ میں تین راوی بھی آتے ہیں لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ اسی طرح سے جیسے جیسے زمانہ بڑھتا گیا راویوں کی تعداد بھی بڑھتی گئی۔ سب سے لمبی سند امام بیہقی کی ہے جو آخری محدث ہیں۔ ۴۵۸ھ میں ان کی وفات ہوئی ہے۔ اس لئے ان کی سند لمبی ہوتی ہے۔ کبھی سات نام ہوتے ہیں، کبھی آٹھ ہوتے ہیں اور کبھی کبھی نو ہوتے ہیں۔

راویوں کے طبقات

جب یہ سلسلہ آگے بڑھا تو جو علماء رجال تھے اور جنہوں نے راویوں کے حالات پر کتابیں لکھی تھیں، انہوں نے راویوں کے طبقات مقرر کئے اور بتایا کہ راویوں کے طبقات کون سے ہیں۔ تاکہ ہر طبقے کے حالات الگ الگ بیان کئے جا سکیں اور یہ پتہ چل سکے کہ کونسا طبقہ کس طبقے کے ساتھ شمار ہوتا ہے۔ اب مثلاً اگر کسی غیر محدث سے، جو حدیث کا طالب علم نہ ہو، یہ کہا جائے کہ امام بیہقی نے امام مالکؒ سے روایت کی ہے اور وہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ یہ محض فرضی بات کر رہا ہوں۔ مثلاً اگر کوئی ایسی سند سے کوئی بات بیان کرے تو غیر محدث یا ایسا آدمی جو حدیث کا طالب علم نہ ہو اس کو پتہ نہیں چلے گا کہ امام بیہقی اور امام مالکؒ کے درمیان جو طویل زمانہ گزرا ہے، ان دونوں کے درمیان کم و بیش پانچ چھ واسطے ہوں گے۔ امام بیہقی امام مالکؒ سے براہ راست روایت کر ہی نہیں سکتے۔ امام مالکؒ تو تبع تابعین میں شامل ہیں اس لئے وہ براہ راست رسول اللہ ﷺ سے روایت ہی نہیں کر سکتے۔ صحابہ سے بھی روایت نہیں کر سکتے۔

اب جو شخص علم حدیث کو جانتا ہے وہ سمجھ لے گا کہ یہ روایت گڑبڑ ہے۔ جو علم حدیث کو نہیں جانتا اس کو پتہ ہی نہیں چلے گا کہ یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس کو نہ امام بیہقی کے سن وفات کا پتہ ہے، نہ امام مالکؒ کے سن وفات کا پتہ ہے، نہ صحابہ کرامؓ کے دور کا پتہ ہے۔ اس لئے

سہولت کی خاطر طبقات مقرر کر دیے گئے کہ صحابہ کرام کا ایک طبقہ ہے جس سے اس بات کا واضح طور پر اندازہ ہو جائے گا کہ صحابہ کرام کس دور سے کس دور تک رہے۔ آخری صحابی بھی حضرت محمود بن لبید تو میرے ہم نام تھے، ان کی وفات ۹۹ھ میں ہوئی ہے۔ وہ آخری صحابی ہیں۔ وہ حضور ﷺ کے انتقال سے چند ماہ پہلے خدمت اقدس میں لائے گئے۔ ان کی عمر چار پانچ سال تھی۔ وہ صرف ایک واقعہ بیان کرتے ہیں اس کے علاوہ کوئی روایت ان سے نہیں ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں بچہ تھا، میرے والد یا دادا مجھے حضور کی خدمت میں لائے۔ رسول اللہ ﷺ نے مجھے گود میں بٹھایا اور پانی لے کر تھوڑا پیا اور پھر مجھے پلایا اور پھر تھوڑی سی کلی کر کے پھر مجھے پلائی اور میرے سر پر ہاتھ پھیر کر مجھے دعا دی۔ بس اس کے علاوہ اور کوئی روایت ان سے منقول نہیں ہے۔ یہ آخری صحابی ہیں جن کے بعد صحابہ کرام دنیا سے رخصت ہو گئے، پھر کوئی ایسا آدمی روئے زمین پر باقی نہیں رہا جس نے رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی ہو۔

اب یہ بات کہ صحابہ کرام کا دور کب تک ہے اور بڑے صحابہ کا زمانہ کب تک ہے، درمیانی عمر کے صحابہ کا زمانہ کب تک ہے، صغار صحابہ کا زمانہ کب تک ہے۔ یہ تمام باتیں جاننا ضروری ہے۔ صغار صحابہ سے مراد وہ صحابہ ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد بچے تھے اور ان کا شمار بچوں میں ہوتا تھا۔ پھر یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ جب انہوں نے پہلی بار حضور کی زیارت کی تو وہ کس عمر میں تھے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو آخری بار کس عمر میں دیکھا، یہ جاننا اس لیے ضروری ہے کہ اگر کوئی شخص مثال کے طور پر محمود بن لبید سے کوئی حدیث بیان کرے، اور یہ دعویٰ کرے کہ ان کا نام صحابہ میں شامل ہے اور الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب میں لکھا ہوا ہے کہ یہ صحابی تھے۔ اب اس بنیاد پر ان سے کوئی لمبی چوڑی حدیث روایت کرے تو جو آدمی طبقات صحابہ کے علم کو نہیں جانتا وہ دھوکے میں پڑ سکتا ہے کہ واقعی محمود بن لبید صحابی تھے اور ان سے یہ بات منسوب ہے۔ لیکن جو جانتا ہے وہ سمجھے گا کہ جتنی بھی روایات ان سے منسوب ہیں وہ غلط منسوب ہیں۔ اس لیے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو پانچ چھ سال کی عمر میں دیکھا تھا یا شاید اس سے بھی کم عمر میں۔ اور اس واقعہ کے علاوہ کوئی روایت ان سے مروی نہیں ہے۔ اس بات کو جاننے کے لیے صحابہ کے طبقات کو جاننا ضروری ہے۔ اس لیے پہلا طبقہ صحابہ کرام کا ہے جس پر الگ بہت سی چھوٹی بڑی سی کتابیں موجود ہیں۔

ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ کا شمار بھی، باختلاف روایات، صغار تابعین کی اس دوسری کیٹیگری میں ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کی تحقیق کے مطابق امام ابوحنیفہ کا شمار صغار تابعین کی اس کیٹیگری میں ہے۔ جنہوں نے کچھ صحابہ سے روایت بھی کی ہے۔ انہوں نے بعض اصحاب رسول کو دیکھا ضرور ہے۔
وہ اپنے لڑکپن میں اپنے والد کے ساتھ حج کے لئے گئے۔ خود بیان کرتے ہیں کہ میری عمر بارہ تیرہ سال تھی۔ مکہ مکرمہ میں ایک جگہ دیکھا کہ بڑا ہجوم لگا ہوا ہے اور لوگ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش میں ہیں۔ میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ یہ کیا ہورہا ہے؟ انہوں نے کہا کہ صحابی جلیل حضرت انس بن مالک حج کے لئے تشریف لائے ہیں، لوگ ان کو دیکھنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ میں اپنے والد سے انگلی چھڑا کر ہجوم میں گھسا اور دیکھا کہ حضرت انس کھڑے تھے اور لوگ ان سے سوالات کررہے تھے۔ بعض روایت میں آتا ہے کہ انہوں نے بھی کوئی سوال پوچھا، بعض روایات میں آتا ہے کہ انہوں نے کچھ نہیں پوچھا، بعض روایات میں آتا ہے کہ انہوں نے کوئی بات سنی اور آگے نقل کی، بعض روایات میں آتا ہے کہ سنی تو تھی لیکن یاد نہیں رہی۔ لیکن دیکھنا ثابت ہے۔ بہر حال یہ وہ صغار تابعین ہیں جو تابعین کے سب سے چھوٹے طبقہ میں آتے ہیں۔

اس کے بعد اتباع تابعین ہیں یعنی تبع تابعین میں سب سے بڑا طبقہ ہے ان اتباع تابعین کا جنہوں نے بڑے تابعین کو دیکھا۔ پھر اسی طرح سے تبع تابعین کا طبقہ وسطی یعنی درمیانی طبقہ۔ پھر تبع تابعین کا سب سے چھوٹا طبقہ جنہوں نے چھوٹے تابعین کو دیکھا مثلاً امام شافعی۔ اس کے بعد وہ طبقہ جس نے تبع تابعین کو دیکھا اور ان سے روایت کی۔ پھر وہ طبقہ جس نے متوسطین تبع تابعین کو دیکھا اور آخر میں جس نے آخری عمر میں، جب تبع تابعین تھوڑے رہ گئے، ان کو دیکھا۔ یہ رواۃ کے بارہ طبقات ہیں۔

طبقات رواۃ کی افادیت

بظاہر کسی حدیث کے سلسلہ میں ان طبقات کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ لیکن اس سے اس بات میں مدد مل جاتی ہے کہ کسی راوی کے طبقہ کا تعین کیا جاسکے کہ اس کا تعلق کس طبقہ سے ہے۔ جب طبقہ کا تعین ہوجائے گا تو زمانے کا تعین آسان ہوجائے گا۔ جب زمانہ کا تعین آسان

ہوگا تو پھر یہ بات طے کرنا آسان ہو جائے گا کہ ان تابعی یا ان راوی نے کس طبقہ کے راوی سے روایت کی ہے وہ روایت ممکن بھی ہے یا نہیں ہے۔ مثال کے طور پر تبع تابعین کے چھوٹے طبقہ کا کوئی راوی تابعین کے بڑے طبقہ سے روایت کرے تو یہ ممکن نہیں ہے۔ اس لئے فوری طور پر یہ پتہ چل جائے گا کہ اس روایت میں کہیں کوئی بھول ہے۔ مثال کے طور پر امام بخاری امام زہری سے روایت کریں تو یہ روایت درست نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ امام بخاری نے امام زہری کا زمانہ نہیں پایا۔ امام زہری کی وفات غالباً ۱۲۴ھ میں ہوئی جبکہ امام بخاری کی ولادت ہی ۱۹۴ھ میں ہوئی ہے۔ اب ۱۹۴ھ کی ولادت اور ۱۲۴ھ کی وفات میں تو ستر اسی سال کا فرق ہے۔ اس لئے ان چیزوں سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ روایت میں کوئی بھول ہے اور فوراً اس کا تعین ہو جاتا ہے۔

یہ طبقے تو تھے راویوں کے، جس سے گویا زمانی اعتبار سے تعین کیا جا سکتا ہے کہ کس خاص طبقہ کے راوی نے کس زمانے میں وقت گزارا ہوگا اور کس زمانے میں وہ زندہ ہوں گے۔ اس کے بعد بارہ طبقات یعنی درجات راویوں کے آتے ہیں۔ ان میں ایک تو طبقات یعنی Classes ہیں یا جیسا میں نے اردو میں کہا تھا کہ ایک پیڑھی، پھر دوسری پیڑھی، زمانے کے اعتبار سے۔ ایک درجہ ہے ثقہ یا غیر ثقہ ہونے کے اعتبار سے۔ کچھ راوی ہیں جو بڑے اونچے درجے کے ہیں جن کا نام سنتے ہی ہر شخص گردن جھکا دے گا کہ یہ انتہائی اونچے درجے کے راوی ہیں۔ عبداللہ بن مبارک کا میں کئی بار نام لے چکا ہوں، ان کا جب نام آئے گا تو کسی تحقیق کی ضرورت نہیں کہ کس درجے کے راوی ہیں۔ امام بخاری، امام ترمذی، امام احمد بن حنبل کا نام آئے گا تو ہر شخص بلا تامل ان کی روایت کو قبول کرے گا۔ لیکن اس درجے کے راویوں کا تعین کیسے ہوگا؟ اس کام کے لئے علم جرح و تعدیل کے قواعد مقرر کئے گئے۔

اس ضمن میں سب سے پہلا اصول تو یہ ہے کہ صحابہ کرام سب کے سب عدول ہیں۔ الصحابۃ کلھم عدول، وہ سب ایک درجہ میں ہیں۔ یہ تحقیق تو ہو سکتی ہے کہ فلاں صاحب صحابی ہیں کہ نہیں ہیں۔ لیکن یہ تحقیق ہونے کے بعد کہ وہ صحابی تھے، پھر مزید تحقیق نہیں ہوگی کہ وہ عادل تھے کہ نہیں، اس لئے کہ صحابہ کے بارے میں یہ بات متفق علیہ ہے کہ وہ سب کے سب عادل تھے۔ صحابہ کرام میں بھی یقیناً درجات ہیں اور اس سے کوئی مسلمان انکار نہیں کرتا۔ مثلاً جو درجہ حضرت ابوبکر صدیق کا ہے وہ اور صحابہ کا نہیں ہے، جو درجہ حضرت عمر فاروق کا تھا وہ بقیہ صحابہ

کا نہیں ہے۔ جو درجہ عشرہ مبشرہ کا تھا وہ دوسرے صحابہ کا نہیں ہے۔ لیکن علم حدیث کی روایت کی حد تک سب کا درجہ برابر مانا جاتا ہے۔

صحابہ کرامؓ کے بعد بقیہ راویوں کا جو سب سے اونچا درجہ ہے، وہ ان لوگوں کا درجہ ہے جن کے لئے اصطلاح استعمال کی جاتی ہے یا تو اثبت یا اوثق یا متفق علی جلالۃ قدرہ وشانہ۔ رجال کی اکثر کتابوں میں آتا ہے۔ مثلاً یحییٰ بن معین اور ان کے درجہ کے لوگوں کے بارہ میں ملے گا متفق علی جلالۃ قدرہ وشانہ۔ کہ تمام محدثین ان کے مرتبہ کی بلندی پر اور ان کی اعلیٰ شان پر متفق ہیں۔ گویا یہ سب سے اونچے درجہ کے راوی ہیں۔ اگر میں الفاظ کی مثالیں دینے پر آؤں تو بات بہت لمبی ہو جائے گی اس لئے میں ان کو یہیں پر چھوڑ دیتا ہوں۔ ہر درجہ کے لئے الگ الفاظ ہیں جو راوی کا درجہ بیان کرنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں اور جن سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ راوی کا کیا درجہ ہے۔ میں صرف دو تین درجات کے نمونے دوں گا باقی میں چھوڑ دیتا ہوں۔

ان کے بعد تیسرا درجہ ان راویوں کا ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ثقہ متقن۔ یعنی یہ ثقہ اور قابل اعتماد راوی ہیں۔ اس کے بعد چوتھا درجہ ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ لا بأس بہ، کوئی حرج نہیں ہے۔ یعنی جیسے انگریزی میں not bad کہتے ہیں۔ گویا اب کمزوری شروع ہو گئی۔ کمزور تو نہیں ہیں لیکن کمزوری سے اوپر جو درجات ہیں ان میں سے یہ آخری درجہ ہے۔ اس کے بعد جو درجہ آتا ہے وہ ہے صدوق، وہ سچی بات کہا کرتے تھے، بات سچی کہا کرتے تھے۔ یعنی گویا ان کی سچائی کے بارے میں تو گواہی ہے لیکن یادداشت اور حافظے کے بارے میں کچھ نہیں کہا گیا۔ اس کے بعد اگلا درجہ ہے کہ صدوق سیء الحفظ، یعنی نیت کے اعتبار سے تو وہ سچے تھے لیکن حافظہ برا تھا۔ اس طرح سے ایک ایک کر کے بارہ درجات ہیں جن میں سے آخری چار درجے کمزور اور ضعیف راویوں کے ہیں۔ آخری درجہ اس جھوٹے راوی کا ہے جو جھوٹی احادیث وضع کرتا تھا، جس کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے کہ یہ جھوٹا راوی تھا۔ ان لوگوں کے الگ سے تذکرے موجود ہیں۔

یہ جو بارہ درجات یا بارہ طبقات ہیں یہ تقریباً تمام علماء حدیث کے متفق علیہ ہیں۔ یہ تفصیل جو میں نے بیان کی ہے یہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے اپنی کتاب تقریب التہذیب میں دی ہے۔ تقریب التہذیب بہت اہم لیکن نسبتاً مختصر کتاب ہے جو ایک جلد میں بھی چھپی ہے اور

جلدوں میں بھی چھپی ہے اور تین جلدوں میں بھی چھپی ہے۔ میرے پاس اس کا چھپا ہوا ایک جلد کا نسخہ ہے۔ اس میں ایک جلد میں انہوں نے تمام کتب رجال کا گویا نچوڑ دے دیا ہے۔ جس سے آپ کو ایک سرسری اندازہ ہو جائے گا کہ کس راوی کی حیثیت کیا ہے۔ کتب رجال پر مواد کا اتنا بڑا ذخیرہ موجود ہے کہ اگر اس کو جمع کیا جائے تو پوری لائبریری اس سے تیار ہو سکتی ہے۔ دس دس جلدوں میں، بیس بیس اور چوبیس چوبیس جلدوں میں بڑی بڑی کتابیں لکھی گئیں۔ یہ کتابیں دوسری صدی ہجری سے لکھی جانی شروع ہو گئیں اور تقریباً آٹھویں نویں صدی ہجری تک لکھی گئیں اور اس کے بعد بھی لوگوں نے ان کو مرتب کیا۔ یہ کتابیں مختلف انداز اور مختلف سطحوں کی ہیں۔ ان میں سے بعض مصنفین وہ ہیں کہ جو بڑے سخت تھے اور جن کا معیار بہت اونچا تھا جیسے امام بخاری اور امام مسلم کا معیار بہت زیادہ تھا۔ انہوں نے جب رجال پر کتاب لکھی تو بہت اونچے معیار کے ساتھ لوگوں کو جانچا۔ ماہرین علم رجال میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے کہ جنہوں نے بڑی نرمی سے کام لیا اور ان کا تساہل مشہور ہے۔ انہوں نے بعض کمزور راویوں کو بھی صحیح قرار دے دیا۔ اور ان میں کچھ لوگ تھے جو معتدل تھے اور وہ بھی۔ ہم ان سب کا تذکرہ وقتاً فوقتاً کریں گے۔

علم رجال کی شاخیں

رجال پر شروع میں جو کتابیں لکھی گئیں وہ مختلف علاقوں پر الگ الگ کتابیں تھیں مثلاً مرو کے راویوں پر، دمشق کے راویوں پر، کوفہ کے راویوں پر، کسی خاص قبیلہ کے راویوں پر۔ جیسے جیسے مواد جمع ہوتا گیا زیادہ ہوتا گیا اور زیادہ مکمل کتابیں سامنے آتی گئیں۔ جن لوگوں نے زیادہ مکمل کام کیا ان میں دو نام بڑے نمایاں ہیں۔ ایک حافظ ابن حجر عسقلانی کا ہے اور دوسرا نام امام ذہبی کا ہے۔ امام ذہبی کی چار کتابیں ہیں: تذکرۃ الحفاظ، طبقات الحفاظ، میزان الاعتدال فی نقد الرجال اور المغنی فی اسماء الرجال۔ یہ چاروں کتابیں عام ملتی ہیں اور ان میں سے ہر کتاب کا الگ الگ مقصد ہے اور ہر کتاب کے قاری اور مستفیدین الگ الگ ہیں۔ مختلف لوگوں کی ضروریات کے لحاظ سے انہوں نے یہ چار کتابیں تیار کیں۔

امام نووی اپنے زمانے کے مشہور محدثین میں سے تھے، صحیح مسلم کے شارح ہیں۔ ان کی کتاب ریاض الصالحین کا نام آپ نے سنا ہوگا، بڑی مقبول ہوئی۔ ان کی اربعین نووی بھی

ذکر ہوگا۔ علم حدیث کی کوئی کتاب امام مالکؒ کے تذکرہ سے خالی نہیں ہو سکتی۔ امام اوزاعی کا ذکر فقہ کی ہر کتاب میں ہوگا۔ لیکن علم حدیث میں بھی ان کا ذکر ہوگا۔ اس لئے طبقات اور علم رجال کی کتابوں میں بہت سی چیزیں مشترک ہیں۔

علم رجال کی کتابوں کی ایک اور صنف ہے جس کو مشیخہ کہتے ہیں۔ اس سے مراد وہ کتابیں ہیں جن میں کسی ایک محدث نے اپنے شیوخ کا تذکرہ لکھا ہو۔ اس زمانے میں لوگ ایک یا دو یا تین یا دس آدمیوں سے علم حدیث حاصل نہیں کرتے تھے بلکہ ایک ایک آدمی سینکڑوں محدثین کے پاس علم حدیث حاصل کرنے کے لئے جاتا تھا۔ کیوں؟ اس کا ذکر میں آگے کروں گا۔ اب ایک شخص نے اگر سو آدمیوں سے حدیث سیکھی ہے تو ان سو کا تذکرہ اس نے مرتب کر لیا۔ اس تذکرہ کو مشیخہ کہتے تھے۔ اس طرح کے مشیخے بڑی تعداد میں ہیں۔ امام سخاوی جن کا تعلق دسویں صدی ہجری سے تھا اور اپنے زمانے کے بڑے محدث تھے انہوں نے لکھا ہے کہ مشیخے پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ ایک ہزار سے زیادہ ہیں جو مختلف محدثین نے اپنے اپنے شیوخ کے بارے میں لکھیں۔ یہ ساری کی ساری کتابیں فن رجال کا جز ہیں۔ پھر جیسے جیسے فن رجال پھیلتا گیا اس کی شاخیں بنتی گئیں۔

اس کے علاوہ فن رجال کی کئی شاخیں تھیں۔ مثلاً آپ کو معلوم ہے کہ عربی زبان میں لوگوں کا نام الگ ہوتا ہے، لقب الگ ہوتا ہے اور کنیت الگ ہوتی ہے۔ مثلاً امام بخاری کو بخاری کے لقب سے تو ہم سب جانتے ہیں۔ لیکن بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ ان کا نام محمد بن اسماعیل تھا۔ اگر آپ کسی کتاب میں پڑھیں کہ قال محمد بن اسماعیل تو شاید بہت کم لوگوں کو یہ پتہ چلے کہ اس سے مراد امام بخاری ہیں۔ اسی طرح سے کچھ لوگ اپنی کنیت سے مشہور ہوتے تھے۔ مثلاً اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ حضرت عبداللہ بن عثمان نے یہ فرمایا تو شاید آپ میں سے بہت سے لوگوں کو یہ پتہ نہ چلے کہ میری مراد کیا ہے۔ عبداللہ بن عثمان حضرت ابوبکر صدیقؓ کا نام تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا نام عبداللہ اور ان کے والد ابوقحافہ کا نام عثمان تھا۔ لیکن دونوں اپنی اپنی کنیت سے اتنے مشہور ہوئے کہ اصل نام بہت کم لوگوں کو معلوم ہو سکا۔ اس سے راویوں میں یہ مسئلہ بہت پیدا ہوتا ہے کہ ایک راوی نے ایک جگہ جب حدیث بیان کی تو ایک شاگرد نے اس کو کنیت سے لکھ دیا۔ مثلاً حدثنی البخاری، دوسرے نے لکھ دیا کہ حدثنی محمد، تیسرے نے لکھ دیا حدثنی

محمد بن اسماعیل، چوتھے نے لکھ دیا کہ حدثنی ابو عبداللہ۔ اب یہ سب ایک شخصیت کے حوالے ہیں۔ لیکن جو شخص نہیں جانتا کہ امام بخاری کی کنیت ابو عبداللہ تھی، لیکن وہ مشہور تھے بخاری کے لقب سے، نام ان کا محمد تھا، والد کا نام اسماعیل تھا اس لئے محمد بن اسماعیل بھی کہلاتے تھے، وہ تو زبردست التباس اور الجھن کا شکار ہوگا۔ لہٰذا کوئی ایسی کتاب ہونی چاہئے جس کی مدد سے یہ پتہ چل جائے کہ کس کی کنیت کیا ہے۔ یہ فن "موضح" کہلاتا ہے۔ موضح الرجال یعنی رجال کی وضاحت کرنے والا۔ جس میں ان لوگوں کا تذکرہ جمع کیا گیا جن کا نام کچھ اور، بعض وہ اپنی کنیت سے مشہور ہوں، یہ نام سے مشہور ہوں، کنیت کچھ اور ہو۔ تو کہیں کنیت اور نام میں فرق کی وجہ سے التباس نہ ہو اس پر بہت سی کتابیں ہیں۔

اسی طرح سے ایک خاص صنف یا میدان ہے جس کو "المؤتلف والمختلف" کہتے ہیں۔ المؤتلف والمختلف پر کم از کم ایک درجن کتابیں موجود ہیں۔ یعنی ملتے جلتے ناموں کی تحقیق۔ بعض نام ملتے جلتے ہوتے ہیں جس کی وجہ سے التباس پیدا ہوسکتا ہے۔ یہاں اتنی خواتین بیٹھی ہوئی ہیں۔ اگر پتہ کریں تو آپ میں سے کم وبیش ایک درجن نام مشترک نکلیں گے۔ ثریا ایک کا نام بھی ہے، دوسری کا بھی نام ہے، تیسری کا بھی نام ہے۔ محدثین اور راویوں میں بھی اشتراک اسم ہوسکتا تھا اور ہوتا تھا۔ اب یہ بات کہ اگر ایک دور میں ایک سے زیادہ محمد بن اسماعیل ہیں تو کون سے محمد بن اسماعیل مراد ہیں۔ خود صحابہ کرام میں عبداللہ نام کے کم وبیش ایک درجن صحابہ ہیں۔ ان میں سے جو چار مشہور عبداللہ ہیں وہ "عبادلہ اربعہ" کہلاتے ہیں۔ ان عبادلہ اربعہ میں راوی بیان کرتا ہے حدثنی عبداللہ، مجھ سے عبداللہ نے بیان کیا۔ اب کون سے عبداللہ نے بیان کیا؟ یہ اس وقت تک پتہ نہیں چل سکتا جب تک ان میں سے ہر عبداللہ کے شاگردوں کی فہرست آپ کے پاس موجود نہ ہو۔ عبداللہ بن مسعودؓ سے کسب فیض کرنے والے کون کون ہیں۔ ان کے نمایاں ترین شاگرد مثلاً علقمہ ہیں۔ علقمہ کے شاگردوں میں نخعی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ جو ایک اور مشہور عبداللہ تھے ان سے ان کے پوتے شعیب بن عبداللہ روایت کرتے ہیں۔ شعیب بن عبداللہ سے ان کے بیٹے عمرو بن شعیب روایت کرتے ہیں۔ اب اگر آپ سے کوئی حدیث بیان کرے کہ مجھ سے ابراہیم نخعی نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں کہ میرے استاد نے عبداللہ سے پوچھ کر فلاں معاملہ کس طرح ہوا۔ اب آپ کو فوراً معلوم ہوجائے گا کہ یہاں عبداللہ سے عبداللہ بن مسعود

مراد ہیں، عبداللہ بن عمرو بن العاص مراد نہیں ہوں گے۔ آپ کو آسانی سے ایک ابتدائی presumption قائم ہو جائے گی۔ ورنہ اگر یہ کہا جائے کہ عمرو بن شعیب نے بیان کیا، وہ روایت کرتے ہیں عبداللہ سے، تو یہاں آپ کو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ یہاں عبداللہ سے مراد عبداللہ بن عمرو بن العاص ہیں۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباسؓ ایک اور عبداللہ ہیں۔ مثلاً کوئی کہے کہ مجاہد نے بیان کیا، مجاہد عبداللہ سے نقل کرتے ہیں، تو جاننے والوں کو اندازہ ہو جائے گا کہ چونکہ مجاہد عبداللہ بن عباس کے شاگرد ہیں اس لئے یہاں عبداللہ سے مراد عبداللہ بن عباس ہوں گے۔ اس لئے مؤتلف والمختلف کے نام سے جو فن ہے، یہ اس کی ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ صحابہ میں یہ التباس زیادہ نہیں ہوتا، لیکن باقی لوگوں میں بہت ہوتا ہے۔ تابعین میں کم، تبع تابعینؒ میں اس سے بھی زیادہ اور اس کے بعد اس سے بھی زیادہ۔ جیسے جیسے راویوں کی تعداد بڑھتی جائے گی اس التباس کے امکانات بڑھتے جائیں گے۔ اس التباس کو دور کرنے کے لئے کچھ حضرات نے پوری زندگی اس کام میں لگائی کہ ایسے راویوں کے حالات جمع کریں جن کے نام اور کنیتیں ملتی جلتی ہیں۔ بعض جگہ ایسا ہے کہ صرف اپنا نام بلکہ والد کا نام اور دادا تک کے نام ایک جیسے ہیں۔ اب تین ناموں سے بھی پتہ نہیں چلتا کہ کون مراد ہے۔ پھر یہاں کنیت سے پتہ چلے گا۔ کہیں وطن کی نسبت سے پتہ چلے گا جیسے نیشاپوری، مالکی، مصری یا استاد سے پتہ چلے گا۔ اس پر قدیم ترین کتاب امام دارقطنی کی ہے جو مشہور محدث ہیں۔ حضرت خطیب بغدادی جن کا میں نے ذکر کیا ہے، بغداد کے ہیں۔ ان کی بھی اس موضوع پر کتابیں ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ کچھ کتابیں ایسی ہیں جو الگ الگ کتابوں کے راویوں پر مشتمل ہیں۔ مثلاً صحیح بخاری میں جتنے راوی ہیں ان پر الگ کتابیں ہیں: اسماء رجال صحیح البخاری۔ صحیح بخاری کے جتنے رجال ہیں وہ کون کون ہیں۔ صحیح مسلم کے رجال پر کتابیں ہیں۔ موطا امام مالکؒ کے رجال پر کتابیں ہیں۔ مسند امام احمد کے رجال پر کتابیں ہیں۔ امام ابو داؤد کی سنن پر کتابیں ہے۔ حدیث کی تقریباً تمام کتابوں کے راویوں پر الگ الگ کتابیں موجود ہیں جن میں وہ سارا مواد یکجا مل جاتا ہے۔ اس میں تلاش کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ اب اگر رجال کی ساری کتابیں ایک جگہ ہوتیں اور الگ الگ کتابوں کے رجال پر مواد نہ ہوتا تو تلاش کرنا مشکل ہو جاتا۔ اگر ابو داؤد کا راوی آپ کو معلوم ہے تو رجال ابو داؤد میں تلاش کر لیں آسانی سے مل جائے گا۔

شاگردوں میں بڑا نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ دونوں امام ابوحنیفہ کے نوے فیصد اجتہادات انہوں نے ہی مدون کئے ہیں۔ آج فقہ حنفی امام محمد کی کتابوں کی بنیاد پر قائم ہے۔ امام محمد نے ابتدائی کسب فیض اپنے ہم سبق امام ابو یوسف سے کیا تھا۔ امام ابو یوسف کی عمر زیادہ تھی امام محمد کی عمر کم تھی۔ جب امام ابوحنیفہ کا انتقال ہوا تو امام محمد کی عمر کوئی اٹھارہ انیس سال تھی۔ بقیہ تکمیل انہوں نے امام ابو یوسف سے کی اور چند سال انہوں نے مدینہ منورہ میں امام مالکؒ سے بھی کسب فیض کیا اور مکہ مکرمہ میں حدیث کی تکمیل کرنے کے بعد وہ کوفہ آ گئے۔ جب وہ کوفہ آئے تو امام ابو یوسف اس وقت چیف جسٹس بن چکے تھے۔ امام محمد اور ان کے درمیان تھوڑی سی غلط فہمی ہو گئی جو عام طور پر انسانوں میں ہو جاتی ہے۔ جس دور میں ان دونوں کے درمیان غلط فہمی ہوئی اس دوران امام محمد جب کسی روایت میں امام ابو یوسف کا حوالہ دیتے ہیں تو اس میں اس غلط فہمی یا بدمزگی کے باوجود امام ابو یوسف کا پورا احترام ملحوظ رکھتے ہیں۔ اگرچہ اس بشری بدمزگی کی وجہ سے وہ امام ابو یوسف کا نام نہیں لیتے لیکن جو بات بیان کرتے ہیں اس سے ان کے اعلیٰ ترین اخلاقی معیار اور اعلیٰ ترین ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ حدثنی من اثق فی دینه وامانته، مجھ سے اس شخص نے بیان کیا جس کے دین اور امانت پر مجھے پورا اعتماد ہے۔ ناراضگی کی وجہ سے نام نہیں لیتے لیکن ناراضگی کے باوجود یہ بیان کرتے ہیں کہ مجھے ان کے دین اور امانت پر پورا اعتماد ہے۔ حدثنی من اثق فی دینه وامانته، حدثنی الثقة، حدثنی الثبت، حدثنی الحجة الثقة۔ مجھ سے ایک ایسے راوی نے بیان کیا جو حجت ہے، ثبت ہے اور ثقہ ہے۔ اور سب کو معلوم ہوتا تھا کہ اس سے امام ابو یوسف مراد ہیں۔ اس لئے یہ حدیث مبہم یا مدلس نہیں ہے۔ لیکن اس سے یہ اندازہ کر لیں کہ کتنا اونچا اور ذمہ داری کتنی غیر معمولی تھی۔ اس طرح کی ایک دو مثالیں بھی میں پیش کرنے والا ہوں جس سے آپ کو غیر معمولی اور عظیم ذمہ داری کا احساس ہوگا جو راویان حدیث نے ملحوظ رکھی اور اس ذمہ داری کا ثبوت دیا جو آج ناقابل تصور ہے۔

ایک کتاب اعلام النساء بھی ہے۔ اس میں سیکڑوں خواتین ہیں جو روایت حدیث سے متعلق رہی ہیں اور ان کا سارا تذکرہ پانچ جلدوں پر مشتمل ایک کتاب میں دستیاب ہے۔ بقیہ تذکروں میں بھی ہے۔ رجال کی ہر کتاب میں مرد راویوں کے ساتھ خواتین راویوں کا تذکرہ بھی موجود ہے۔

جیسے جیسے یہ مواد سامنے آتا گیا، وہ مرتب ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ چوتھی پانچویں صدی ہجری تک سارا کام مکمل ہو گیا۔ یہ تحقیق کہ فلاں فلاں میں سے کس راوی پر کیا اعتراض ہے یا کس راوی پر کوئی اعتراض نہیں ہے، اس پر الگ کتابیں لکھی جانی شروع ہوئیں۔ یہ وہ علم ہے جس کو علم جرح و تعدیل کہتے ہیں۔ جرح کے معنی زخمی کر دینا اور جرح کے معنی بھی زخمی کر دینا ہیں۔ لیکن عربی زبان میں زخمی کر دینا دو مفاہیم میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک مفہوم تو کسی چھری یا ہتھیار سے جسم پر زخم لگا دینا ہے۔ اس کے لئے عربی زبان میں جرح کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ایک زخم لگانا دل پر ہے کہ کوئی ایسی بات کہہ دی جو دل کو زخمی کر دے۔ اس کے لئے بھی جرح کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

جراحات السنان لها التیام

ولا یلتام ما جرح اللسان

تلوار کا زخم تو بھر جاتا ہے لیکن زبان اور الفاظ کا جو زخم ہوتا ہے وہ مندمل نہیں ہوتا، وہ ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ لہٰذا جرح کے یہ معنی کئے گئے، کسی کے بارے میں ایسی بات کہہ دے تو اس کو برا لگے۔ لیکن اصطلاحی اعتبار سے اس سے مراد یہ ہے کہ حدیث کے کسی راوی کا کوئی ایسا عیب بیان کرنا جس کی وجہ سے وہ عدالت کے مرتبے سے ساقط ہو جائے اور اس کی بیان کردہ روایات ضعیف حدیث شمار ہو جائیں یا کسی راوی کی کسی ایسی کمزوری کو بیان کرنا جس کی وجہ سے اس راوی کی عدالت ختم ہو جائے یا صداقت کا معیار کم ہو جائے اور اس کی بیان کردہ روایات ضعیف حدیث شمار ہو جائیں۔ یہ ہے جرح کی تعریف۔ علامہ ابن اثیر جو ایک بڑے مؤرخ اور محدث ہیں اور لغت حدیث پر ان کی کتاب النہایہ فی غریب الحدیث بڑی مشہور ہے، اس میں وہ کہتے ہیں کہ جرح سے مراد وہ وصف ہے کہ جس کسی راوی سے جب نسبت کر دی جائے تو اس کا اعتبار ختم ہو جائے اور اس کی بات پر عمل کرنا لازمی نہ رہے۔ اس عمل کو جرح کہتے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ دوسرا عمل ہے تعدیل کا، کہ کسی راوی کے بارے میں یہ تحقیق کر کے بتا دیا جائے کہ یہ راوی عادل ہے۔ یہ راوی ان چیزوں کا حامل تھا جو ایک شریف آدمی کی تمام ذیلی قسمیں ہیں، یعنی ساری شرائط کو پورا کرتا ہے کہ یہ راوی مسلمان تھا، عاقل تھا، یعنی ان تمام اخلاقی اور روحانی خوبیوں اور اچھائیوں کا حامل تھا جو ایک راوی حدیث کے لئے ضروری ہیں۔ اس

کا حافظہ اچھا تھا، اس کا ضبط اچھا تھا، اس کی بیان کردہ روایت میں کوئی علت نہیں ہے، اس کی سند کے واسطے میں کوئی کاٹ، اور بیچ میں کوئی خلا نہیں ہے اور یہ دیکھ کر وہ انسان ثقہ ہے۔ جب ان ساری چیزوں کی تحقیق ہو جائے تو تحقیق کے اس عمل کو تعدیل کہتے ہیں۔ جرح سے معنی کمزوری بیان کرنا اور تعدیل کے معنی عدالت بیان کرنا۔ گویا جرح اور تعدیل کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ ایک راوی کی کمزوریوں کے مفروضے میں یہ ہے اور آپ نے پتہ لگایا کہ یہ راوی جھوٹا ہے تو اس کی عدالت سلب ہو گئی۔ یا آپ نے کہا کہ جھوٹا تو نہیں لیکن بعض لوگوں نے اس پر جھوٹا ہونے کا الزام لگایا ہے تو وہ مشکوک ہو گیا۔ یا آپ نے اس کے بارے میں تحقیق کرکے پتہ چلایا کہ فاسق ہے اور بعض ایسے عمل میں مبتلا ہے جن کو کرنے والا فاسق ہو جاتا ہے۔ نعوذ باللہ شراب پیتا ہے، یا جھوٹ بولتا ہے، یا کسی ایسی بڑی بدعت میں مبتلا ہے جس کے بدعت ہونے پر اتفاق ہے۔ ایک تو وہ بدعت ہے جس کے بدعت ہونے میں اختلاف ہے، بعض لوگ اس کو بدعت سمجھتے ہیں بعض نہیں سمجھتے۔ بعض ایک عمل کو سنت سمجھتے ہیں، بعض بدعت سمجھتے ہیں۔ ایسا نہیں بلکہ بدعت کے کسی ایسے عمل میں شریک ہے جس کے بدعت ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔ یا یہ مجہول ہے، غیر معلوم ہے، پتہ نہیں کون ہے، کس زمانے کا ہے، کس قسم کا ہے، اس کا اتا پتا کون ہے۔ علم حدیث کی رو سے اصطلاح میں یہ مجہول الحیثیت اور مجہول الحال ہے۔ یا ذات تو معلوم ہے کہ فلاں آدمی ہے، فلاں کا بیٹا ہے، فلاں شہر کا ہے، لیکن اس کی صفات کا پتہ نہیں کہ کس قسم کا آدمی ہے، اچھا ہے کہ برا ہے۔ ان میں سے اگر کوئی چیز اس میں کم ہو تو اس کی عدالت ختم ہو جاتی ہے اور عدالت ختم ہونے سے وہ راوی مستند نہیں رہے گا۔ اس طرح اگر تعدیل ختم ہو گئی تو جرح ہو گئی۔ اس عمل کو جرح کہتے ہیں۔

اسی طرح ضبط کا معاملہ ہے کہ آپ کی تحقیق میں آیا کہ ان کا حافظہ اچھا تھا، تحمل اور ادا دونوں کے وقت اور ہمیشہ اچھا رہا، تحمل سے لے کر ادا تک سب باتیں ٹھیک ٹھیک یاد رہیں۔ لیکن بعد میں تحقیق سے پتہ چلا کہ ان کا حافظہ ختم ہو چکا تھا۔ شروع سے ختم ہو گیا تھا یا بعد میں ختم ہو گیا، شروع سے خراب تھا یا بعد میں خراب ہو گیا تھا، یہ مزید تحقیق سے ثابت ہوگا۔ یا مثلاً کسی راوی کے بارے میں تحقیق سے پتہ چلا کہ ان کا حافظہ تو ٹھیک تھا، لیکن بعض اوقات وہ ایک آدمی اور دوسرے آدمی میں اشتباہ کر دیا کرتے تھے یا ایک بات اور دوسری بات میں اختلاط کر دیتے تھے۔ یا یہ ثابت ہو کہ حافظہ تو ٹھیک ہے لیکن جو روایتیں بیان کرتے ہیں وہ عام ثقہ اور مستند راویوں سے مختلف کوئی

چیز بیان کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر کوئی ایسی بات بیان کرے جو سب راویوں کے بیان سے
مختلف ہو۔

مثلاً اکثر راوی یہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز پڑھا کرتے تھے تو یہاں (ناف پر) ہاتھ باندھا کرتے تھے۔ کچھ لوگوں نے بیان کیا کہ یہاں (ناف کے نیچے) باندھا کرتے تھے۔ کچھ نے یہ بیان کیا کہ یہاں (سینے کے اوپر) باندھا کرتے تھے۔ کچھ نے یہ بیان کیا کہ ہاتھ چھوڑ کر پڑھا کرتے تھے۔ اب یہ چار روایتیں مستند راویوں کے ذریعے آئی ہیں۔ ان چاروں کے بارے میں یہ اختلاف تو ہو سکتا ہے کہ ان میں بہتر عمل کون سا ہے۔ کچھ کے خیال میں یہاں افضل ہے، کچھ کے خیال میں یہاں افضل ہے، کچھ کے خیال میں چھوڑنا افضل ہے۔ جو مستند اور ثقہ راوی ہیں وہ ان چار میں محدود ہیں۔ اب اس کے علاوہ کوئی شخص کچھ اور بیان کرے مثلاً یہ کہ رسول اللہ ﷺ (نعوذ باللہ) یہاں (گردن پر) ہاتھ باندھا کرتے تھے، بالفرض اگر ایسی روایت ہو تو یہ ثقات کے خلاف ہے۔ راوی کا درجہ چاہے کتنا ہی اونچا ہو یہ روایت قابل قبول نہیں ہوگی۔ ایسا غیر ثقہ بیان بھی راوی کی عدالت کو ساقط کر دیتا ہے اور ایسا راوی مجروح ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ اگر سچا ہوتا تو ایسی بات کیوں بیان کرتا جو معلوم پر کسی نے بیان نہیں کی۔ یا کسی راوی کے بارے میں یہ ثابت ہو کہ آخر میں کثرت سے اس کی کیفیت پیش آنے لگی تھی جس میں وہ باتوں کو بھول جایا کرتے تھے۔ بڑھاپے میں کثرت سے ایسا ہوتا ہے کہ بعض وقت حافظہ اچھا ہوتا ہے اور بعض اوقات کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ آپ نے اسی نوے سال کی عمر کے بزرگوں میں دیکھا ہوگا کہ پورے پورے ہفتے ایسے گزر جاتے ہیں کہ یادداشت ٹھیک رہتی ہے اور بعض اوقات اچانک ایسی کیفیت ہو جاتی ہے کہ کچھ یاد نہیں رہتا۔ اپنے گھر والوں کو بھی نہیں پہچانتا۔ تو یہ تحقیق ہوتی ہے کہ کسی راوی کی یہ کیفیت تھی کہ نہیں تھی۔ بعض اوقات ایک راوی وقتی طور پر غلطی کرتا ہے اور وہ ایسی غلطیاں ہوتی ہیں جن سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس طرح کی چند غلطیاں ثابت ہو جائیں تو اس کو بھی عدم تعدیل یا جرح قرار دیں گے اور وہ راوی غیر مستند اور مجروح ہو جائے گا۔

یہ ساری کی ساری اہمیت علم اسناد اور علم جرح وتعدیل کی ہے۔ ذخیرہ حدیث کا بیشتر دارومدار ان حضرات کی تحقیق اور علم رجال کی تفصیلات پر ہے۔ علم حدیث کے جو ذیلی علوم ہیں ان میں سب سے بڑا اور مرکزی ستون، اگر کسی خیمے کے درمیانی ستون سے مثال دیں تو وہ علم

چاہتے ہیں کہ ان تین راویوں کا درجہ جرح وتعدیل کی میزان میں کیا ہے۔ اب وہ یہ کریں گے کہ ایک ایک آدمی کے پاس جا کر ملاقات کریں گے کوئی مدینہ میں ہے تو کوئی مکہ میں ہے، کوئی کوفہ میں ہے تو کوئی بصرہ میں ہے۔ چھ چھ مہینے سفر کرکے ان کے پاس پہنچیں گے۔ اور جا کر ان شاگردوں کے شاگردوں کو ڈھونڈیں گے۔ ان سے ان احادیث کی روایت کریں گے۔ تین آدمیوں سے روایت کا یہ عمل ظاہر ہے کہ ایک دو سال میں مکمل نہیں ہوا ہوگا۔ اس میں بہت وقت لگا ہوگا۔ دس دس سال میں کہیں جا کر مکمل ہوا ہوگا، بیس سال میں ہوا ہوگا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ کتنا وقت لگا ہوگا۔ جب یہ عمل مکمل ہو جائے گا تو پھر وہ ان روایات کا باہم تقابل کرکے دیکھیں گے۔ اگر وہ یہ دیکھیں کہ انیس راویوں کی روایت ایک جیسی ہے اور بیسواں راوی مختلف بات کہتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ بیسویں راوی سے یا تو بھول چوک ہوئی یا اس کا حافظہ اس میں کام نہیں کرتا تھا، یا اس نے نعوذ باللہ جان بوجھ کر کوئی چیز ملاوٹ کی ہے۔ اب اگر وہ اختلاف یا تبدیلی جو اس نے کی ہے معنی ایسی ہے جس سے معنی ومفہوم میں فرق پڑتا ہے تو یہ اس راوی کے خلاف جائے گا اور اس کی عدالت کمزور ہو جائے گی۔ اور اگر اس اضافہ یا تبدیلی سے معنی اور مفہوم میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا، صرف لغت یا الفاظ کا فرق ہے، تو اس سے اس راوی کے حافظے کے بارہ میں رائے پر اثر پڑے گا۔ اور کہا جائے گا کہ گویا اس کا حافظہ اتنا اچھا نہیں تھا۔ ورنہ جب انیس راوی ایک طرح سے بیان کر رہے ہیں تو پھر بیسواں دوسری طرح کیوں بیان کر رہا ہے؟ اب یا تو اس کے حافظے میں کمی ہے یا پھر اس کی نیت میں فتور ہے۔ اگر معنی میں فرق پڑتا ہے تو نیت میں اور اگر صرف الفاظ میں فرق ہے تو حافظہ میں فتور ہے۔ اب گویا یہ مفروضہ ہے کہ اس راوی کے حافظہ یا نیت میں سے کسی ایک چیز میں فتور ہے۔ اب وہ محقق اس راوی کی بقیہ روایات کی تحقیق کریں گے۔ ان راویوں کے ساتھ بیٹھ کر وہ پانچ دس سال کسب فیض کریں گے۔ پانچ سال میں ان کی ساری احادیث جمع کرنے کے بعد ان کے جو اساتذہ ہیں ان کے پاس جائیں گے۔ ان سے ان کی تصدیق کریں گے تو اس میں بھی پچیس تیس سال لگیں گے۔ ان پچیس تیس سالوں میں کہیں جا کر یہ ثابت ہوگا کہ واقعی ان صاحب کے حافظہ میں کمزوری تھی یا نیت میں فتور تھا۔ پھر ان کی جرح کی باری آئے گی اور یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ یہ راوی مجروح ہے۔ یہ کام آسان نہیں تھا۔ اس پر لوگوں کی نسلوں کی نسلوں نے کام کیا اور اس طرح سے مختلف روایات کی variations جمع کیں۔ ان

سے حاصل کی۔ ایک دوسرے سے کولیٹ (Collate) کیا۔ پھر ان میں سے جو بہترین سند تھی اس کو انہوں نے اپنی کتاب میں نقل کیا۔ ساری روایتیں اور ساری سندیں نقل کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اگر وہ ایک ایک حدیث کی ساری سندیں نقل کرتے تو شاید پوری صحیح بخاری اس ایک حدیث، انما الاعمال بالنیات کی سندوں سے بھر جاتی۔ انہوں نے تمام اسانذہ سے تصدیق کرنے کے بعد سب سے بہترین سند کا انتخاب کر کے نقل کر دی اور باقی کو نقل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ لہٰذا جب امام بخاری یہ کہتے ہیں کہ میں نے چار لاکھ احادیث میں سے صحیح بخاری منتخب کی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک ایک حدیث کو میں نے سینکڑوں مرتبہ دریافت کیا، درجنوں شیوخ اور صحابہ کی روایات کو جمع کیا اور پھر ان میں سے جو سند مجھے سب سے زیادہ بہترین لگی میں نے اس کو اختیار کر لیا اور باقی سندوں کو نظر انداز کر دیا۔ لہٰذا جب تعداد بیان کی جاتی ہے تو اس سے یہ مراد ہوتی ہے۔

امام یحییٰ بن معین جو صحابہ کے بعد محدثین کے سب سے اونچے درجے میں شمار ہوتے ہیں۔ اور اپنے زمانے میں امیر المومنین فی الحدیث کہلاتے تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب تک مجھے کوئی حدیث تیس طرق سے نہ مل جائے، میں اپنے کو یتیم سمجھتا ہوں۔ میں اس حدیث کے بارے میں یتیم ہوں جس کے تیس طرق یا تیس سندیں میرے پاس موجود نہ ہوں، زیادہ ہوں تو اچھا ہے اور جتنی زیادہ ہوں اتنا اچھا ہے۔

ایک بزرگ تھے حضرت ابراہیم بن سعید، جو امام مسلم کے اساتذہ میں سے تھے۔ امام مسلم نے ان سے روایات لی ہیں۔ ان سے ایک محدث ملنے کے لئے گئے اور ان سے کہا کہ میں آپ سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی فلاں روایت سننا چاہتا ہوں۔ آپ کی سند سے وہ کیسے پہنچی۔ گویا یہ ویلیڈیشن اور ری ویریفکیشن کی ایک قسم تھی۔ انہوں نے اپنی ملازمہ سے کہا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی جو روایات ہیں ان کی 23 ویں جلد لے آؤ۔ اب ان صاحب نے حیرت کے ساتھ سوچا کہ حضرت ابوبکرؓ کی ساری روایات ملا کر بھی شاید چالیس اور پچاس سے زیادہ نہیں بنتیں۔ جو زیادہ سے زیادہ دس پندرہ صفحات کے ایک کتابچے میں آسکتی ہیں۔ تو یہ تیسویں جلد کہاں سے آ گئی؟ انہوں نے پوچھا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تو ساری روایات مل کر چالیس پچاس کے لگ بھگ بنتی ہیں، ان کی مرویات کی تیسویں جلد کہاں سے آ گئی؟ انہوں نے کہا کہ جب تک میرے

نے مجھ سے یہ حدیث بیان کی ہے اور پوری سند کے بعد حدیث بیان کی۔ امام ابن ابی حاتم نے خاموشی سے پوری حدیث سنی اور پھر کہا کہ اس میں یہ کمزوری ہے، یہ کمزوری ہے اور یہ کمزوری ہے۔ فلاں کی روایت فلاں سے ثابت نہیں ہے، فلاں کی روایت فلاں واسطے سے ہے اور فلاں کی فلاں واسطے کے بغیر ہے۔ کوئی آدھ درجن کمزوریاں بتائیں۔ ان صاحب نے کہا کہ آپ نے تو چیک کیے بغیر یہ سب کمزوریاں بیان کر دیں۔ آخر آپ نے یہ سب چیزیں کس بنیاد پر بتائیں؟ گویا ان صاحب کو شبہ ہوا کہ شاید ایسے ہی کہہ دیا ہو۔ اس پر امام ابن ابی حاتم نے کہا کہ اگر آپ کو میری بات میں کوئی شک یا شبہ ہے تو امام ابوزرعہ رازی، جو لیجنڈ اور امام تھے، وہ بھی اسی دور کے امام ہیں اور انہوں نے بھی جرح و تعدیل پر ایک کتاب لکھی ہے، ان کے پاس چلے جائیں اور جا کر پوچھ لیں۔ وہ امام ابوزرعہ کے پاس چلے گئے۔ ان سے وہی حدیث بیان کی۔ انہوں نے بھی فوراً ہی کوئی حوالہ یا کتاب چیک کیے بغیر یہی ساری کی ساری باتیں وہ بتائیں جو اس سے قبل امام ابن ابی حاتم نے بتائی تھیں۔ اب ان صاحب کو بڑی حیرت ہوئی کہ انہوں نے بھی وہی بات بتائی جو ابن ابی حاتم نے بتائی تھی۔ انہوں نے حیرت سے پوچھا کہ آخر آپ دونوں کس بنیاد پر بتا رہے ہیں؟ آپ کو کیسے پتہ چلا ہے؟ انہوں نے کہا کہ جب تم کسی سنار کے پاس کوئی کھوٹا دینار لے کر جاتے ہو اور وہ اس کو دیکھ کر کہتا ہے کہ یہ کھوٹا ہے تو کیا اس سے یہ پوچھتے ہو؟ جیسے سنار کو کھوٹے کھرے کا اندازہ ہو جاتا ہے کیا ہمیں نہیں ہوتا؟ سنار کو ایک بار ہاتھ میں لے کر اندازہ ہو جاتا ہے اور اس کو فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ سونا کھوٹا ہے کہ کھرا۔ ایک محدث کو جس کی عمر اسی پہچان میں گزری، وہ اس کو بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ کیا کھرا ہے اور کیا کھوٹا۔

جرح و تعدیل کے مشہور ائمہ

وہ حضرات جنہوں نے جرح و تعدیل میں اپنا مقام پیدا کیا ان کے نام اگر بیان کیے جائیں تو بات بڑی لمبی ہو جائے گی۔ اور اگر جرح و تعدیل میں ان کا اسلوب بھی بیان کیا جائے تو بات بہت زیادہ لمبی ہو جائے گی۔ لیکن میں مختصراً صرف برکت کے لئے اس نیت سے کہ اللہ تعالیٰ روز قیامت جب ان کا حشر کرے تو ہمیں بھی ان کے ساتھ شامل کرے، صرف اس جذبے سے محض ان کے نام دہرا رہا ہوں۔

ائمہ جرح و تعدیل کے درجات

علم حدیث اور جرح و تعدیل میں ائمہ فن کا ایک طبقہ بڑا متشدد اور سخت مشہور ہے۔ وہ ذرا سی بات میں راوی کو مجروح قرار دے دیتے ہیں۔ وہ جب کسی راوی کو عادل قرار دیتے ہیں تو بہت مشکل سے عادل قرار دیتے ہیں۔ وہ کسی کو آسانی سے عادل قرار نہیں دیتے۔ ان متشددین میں یحییٰ بن معین اور ابن ابی حاتم رازی نمایاں ہیں۔ یحییٰ بن معین اور ابو حاتم رازی کے بارے میں لوگوں نے لکھا ہے کہ اگر یہ کسی کو عادل قرار دے دیں تو اس راوی کو دانت سے پکڑلو۔ عضوا علیہ بالنواجذ۔ یعنی اس روایت کو مضبوطی سے پکڑا جا سکتا ہے، اس طرح پکڑلو اس لئے کہ وہ بہت پکا راوی ہے۔ جب ان جیسے لوگ کسی کو عادل قرار دے دیں تو پھر اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ اور یہ طبقہ اگر کسی کو مجروح قرار دے تو دیکھو کہ دوسرے لوگ بھی اس کو مجروح قرار دے رہے ہیں یا نہیں۔ اگر دوسرے لوگ بھی اس کو مجروح قرار دے رہے ہیں تو پھر ان کی جرح قابل اعتماد ہے۔ اور اگر دوسرے لوگ مجروح قرار نہیں دے رہے اور صرف یہی متشدد حضرات اس کو مجروح قرار دے رہے ہیں تو پھر دیکھو کہ ان کی جرح کی بنیاد کیا ہے۔ اگر وہ جرح کی کوئی ٹھوس اور معقول وجہ بتا رہے ہیں تو پھر ان کی جرح قابل قبول ہے، راوی کو مجروح قرار دے دینا چاہئے۔ لیکن اگر یہ لوگ اپنی جرح کی کوئی بنیاد یا وجہ نہیں بتا رہے ہیں تو پھر یہ کہیں گے کہ ان کے معیار کی سختی کی وجہ سے وہ راوی ان کے نزدیک پورا نہیں اترا ہوگا۔ اب ایسا ہوتا ہے کہ کوئی آدمی اپنے باپ کو مجروح قرار دے دے، یہ ایسے ہی کسی سختی کے تحت ممکن ہے۔ اس لئے احتیاط اچھی چیز ہے لیکن اعتدال ہونا چاہئے۔ لیکن اگر یہ حضرات اپنی جرح کی کوئی وجہ بتا رہے ہیں کہ فلاں نے اس کو فلاں کام میں جھوٹ بولتے دیکھا یا فلاں جگہ غلطی کی یا جان بوجھ کر غلط بیانی کی تو پھر ٹھیک ہے۔ وہ جرح جس کی وجہ بیان کی گئی ہو اس کو جرح مفسر کہتے ہیں یعنی وہ جرح جس کی تفسیر بیان کی گئی ہو۔ ان حضرات کی جرح غیر مفسر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ معتبر نہیں ہے۔ جرح مفسر معتبر ہے۔

ایک طبقہ ہے متساہلین کا جو تساہل سے کام لیتے ہیں۔ ان حضرات کا انداز یہ ہے کہ انہوں نے اپنے انتہائی تقویٰ کی نظر سے سب کو دیکھا، جو بظاہر ٹھیک اور متقی نظر آیا انہوں نے اس کو اپنے پرتو کی بنیاد پر رکھا، یہ بھی قابل اعتماد ہے۔ ان کی جرح غیر مفسر معتبر ہے، تعدیل غیر مفسر معتبر

چلا کہ گھر میں تو کچھ بھی نہیں ہے سب ختم ہو گیا ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ وہ پیسہ کہاں خرچ ہو گیا تو انہیں بتایا گیا کہ ایسے کاروبار میں لگا دیا گیا ہے جو بڑا مفید کاروبار تھا۔ انہوں نے کہا کہ وہ مفید کاروبار کہاں ہے، اس کے اثرات تو کہیں نظر نہیں آرہے ہیں۔ گھر میں تو فقر و فاقہ کا منظر نظر آرہا ہے۔ تو جواب دیا کہ وہ آپ ہی کا بیٹا ہے جو مسجد میں درس دے رہا ہے۔ وہ آپ ہی کا صاحبزادہ ہے اور میں نے سارا پیسہ اس کی تعلیم پر خرچ کر دیا ہے۔

اس طرح سے لوگ اپنی عمر بھر کی کمائی علم پر خرچ کر دیا کرتے تھے۔ لیکن ایسے حضرات بھی تھے جو ایک سال تجارت کرتے تھے اور ایک سال علم حدیث کے لئے سفر کیا کرتے تھے۔ کچھ لوگ یہ کرتے تھے کہ ایک بھائی نے کاروبار کیا اور دوسرے بھائی کو حدیث کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ ابتدائی دس بارہ سال علم حدیث میں لگائے پھر چند سال کاروبار میں لگائے۔ پھر علم حدیث میں چند سال لگائے۔ اس لئے کہ علم حدیث میں کے لئے طویل طویل سفر کرنے پڑتے تھے، اور یہ کام پیسے کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔ پیسہ حاصل کرنے کے لئے محنت کرنی پڑتی تھی۔

اگر ہم علم حدیث حاصل کرنا چاہیں تو ایسے ادارے کہاں کہاں موجود ہیں جو اس علم کی تعلیم کے لئے رہنمائی کر دیں۔

علم حدیث کے الگ اداروں کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ البتہ دینی اداروں میں ہر جگہ حدیث پڑھائی جاتی ہے۔ بعض جگہ اچھی، بعض جگہ کمزور، لیکن اس کے لئے آپ کو پہلے آٹھ سال ابتدائی علوم پڑھنے پڑیں گے۔ پھر علم حدیث کا نمبر آئے گا۔ اس لئے آپ عربی سیکھ کر پہلے یہاں خود پڑھنا شروع کر دیں۔ یہ تو عمر بھر کا کام ہے۔

حضرات کو آپ نے بتایا ایک مجموعہ کتاب لائے تھے ان کا نام دیں۔

وہ صحاح ستہ یعنی بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ اور نسائی کا مجموعہ تھا۔

بخاری کی احادیث کے عنوانات میں کوئی ترتیب ہو؟ نظر نہیں آتا

یہ بات بظاہر صحیح معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث ہے اوصانی خلیلی بثلاث۔ اس کو بخاری میں دو عنوانات کے تحت بیان کیا گیا ہے باقی کہیں بیان نہیں کیا گیا۔ یہ بڑی غور و خوض کی بات ہے۔ اس موضوع پر لوگوں نے الگ سے کتابیں لکھی ہیں۔ امام بخاری جب

کوئی عنوان بیان کرتے ہیں تو وہ عنوان بڑی گہری بصیرت پر دلالت کرتا ہے۔ بعض اوقات حدیث کے الفاظ میں وہ چیز نہیں ہوتی لیکن حدیث کے معنی پر غور کریں تو وہ چیز سامنے آجاتی ہے۔ مثلاً میں نے صحیح بخاری کی آخری حدیث پڑھی تھی جس کا عنوان امام بخاری نے دیا ہے: باب قول الله عز وجل و نضع الموازين القسط ليوم القيامة و ان اعمال بني آدم و قولهم يوزن. یعنی اس باب کا عنوان ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے باب میں کہ ہم روز قیامت برابر کا ایک ترازو رکھیں گے اور اس اعلان میں کہ بنی آدم کے اعمال تولے جائیں گے۔ یہ عنوان ہے اور حدیث ہے كلمتان خفيفتان على اللسان حبيبتان الى الرحمن ثقيلتان في الميزان سبحان الله و بحمده سبحان الله العظيم۔ گویا وہ زبان سے نکلنے والا عمل میزان میں بھاری کیسے ہوگا؟ یہ ذرا سا جملہ جو زبان سے نکلا تو اس کو کیسے تولا جائے گا۔ کیا اس کے تولے جانے کی کوئی شکل ہے؟ جب اس کے تولے جانے کی کوئی شکل ہے تو اعمال کے تولے ہونے کی بھی یقیناً کوئی نہ کوئی شکل ممکن ہے۔ جب اعمال کے تولے جانے کا ذکر ہے تو موازین قسط کے معنی معلوم ہو گئے۔ اس طرح سے امام بخاری بالواسطہ طور پر بتاتے ہیں کہ ان کی مراد کیا ہے۔ صحیح بخاری کے عنوانات پر لوگوں نے الگ سے کتابیں لکھی ہیں اور درجنوں جلدوں میں بعض اوقات سینکڑوں صفحات کی کتابیں لکھی گئی ہیں اور بخاری کے تراجم ابواب کی تفسیر کی گئی ہے۔ مولانا محمد ادریس کاندھلوی لاہور کے ایک مشہور محدث تھے۔ انہوں نے "تحفة القاری فی حل تراجم البخاری" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو ابھی تک چھپی نہیں ہے، لیکن ان کے صاحبزادگان جن کے پاس وہ کتاب ہے، ان کا کہنا ہے کہ اگر وہ چھپی تو بیسیوں جلدوں میں آئے گی۔ اس میں صرف بخاری کے عنوانات کی تشریح ہے۔ اصل کتاب کی تشریح نہیں بلکہ صرف عنوانات کی تشریح ہے۔

بدعت کے حوالے سے لوگوں کے جو عقائد ہیں ان کو کیسے درست کیا جائے؟

لوگوں سے ان کے عقائد کے بارے میں لڑنا جھگڑنا نہیں چاہئے۔ لوگ عقائد کے معاملے میں خاصے متشدد ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ اختلاف میں شدت پیدا ہو جائے تو پھر کوئی آپ کی بات نہیں سنتا۔ آپ آہستہ آہستہ نرمی سے بیان کریں۔ جو لوگ شب برات پر کچھ عبادات وغیرہ کرتے ہیں وہ بھی یہ سمجھ کر کرتے ہیں کہ حدیث میں شب برات کی عبادت کا ذکر آیا ہے۔ حالانکہ کسی صحیح حدیث میں تو نہیں آیا ہے۔ اس لئے آہستہ آہستہ ان کو قائل کریں۔ اگر پہلے ہی دن تعلیم

روایات کم کیوں تھیں؟

یہ بڑا اچھا سوال ہے۔ بات یہ ہے کہ روایات کی ضرورت اس وقت محسوس کی گئی جب صحابہ کرامؓ کی تعداد کم ہوتی گئی۔ چونکہ عام طور پر صحابہ کرامؓ کو معلوم تھا کہ فلاں معاملہ میں حضور ﷺ کا فیصلہ کیا تھا اس لئے صحابہ کو آپس میں حدیث بیان کرنے کی زیادہ ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ حدیثیں بیان کرنے کی ضرورت اس وقت پیش آئی جب تابعین کا دور آیا اور تابعین کو رہنمائی کی ضرورت پیش آئی۔ صحابہ کرامؓ نے ان سے بیان کیا کہ کس معاملہ میں حضورؐ کی راہنمائی اور تعلیم کیا تھی۔ جب تک رہنمائی کی ضرورت پیش نہیں آئی تو صحابہ کرامؓ نے روایات بیان نہیں کیں۔ ان حالات میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کس سے روایت کو بیان کرتے۔ اس لئے جو صحابی جتنے متقدم ہیں یعنی جن کا زمانہ جتنا قدیم ہے ان سے روایات اتنی ہی کم ہیں۔ اور جن صحابہ کا زمانہ جتنا بعد کا ہے ان سے روایات اتنی ہی زیادہ ہیں۔ آپ دیکھیں کہ زیادہ روایات کرنے والے صحابہ وہ ہیں جن کی وفات سن ساٹھ، پچاس، ستر ہجری یا اس کے بعد ہوئی۔ اس لئے کہ ان کو زیادہ ضرورت پڑی، لوگوں نے زیادہ رجوع کیا۔ حضرت عمرؓ سے اسی لئے روایات کم ہیں۔

کیا جرح و تعدیل کے بھی درجات ہیں؟

جی ہاں جرح و تعدیل کے بھی درجات اور طبقات ہیں۔ جن بارہ طبقات کا میں نے حوالہ دیا وہ مراتب رواۃ کہلاتے ہیں۔ ان میں پہلے چھ طبقات تو مقبول راویوں کے ہیں اور بقیہ چھ طبقات کمزور راویوں کے ہیں جن میں سے آخری چار متروک راوی ہیں اور ان کی روایت قبول نہیں کی جاتی۔ یہ خلاصہ آپ علامہ حافظ ابن حجر کی تقریب التہذیب کے مقدمہ میں دیکھ لیں اس میں لکھا ہوا ہے۔

حدیث میں مرغے کے بولنے کے وقت کی دعا سکھائی گئی ہے؟

میرے خیال میں یہ دعا سکھائی گئی ہے یہ بھی ایک ضعیف یا موضوع حدیث ہے۔ مجھے اس کی تحقیق نہیں ہے اس لئے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

اگر علم حدیث کے شعبہ میں داخلہ لینا ہو تو کیا شرط ہے۔ عربی میں ماسٹرز کرنا ہوگا؟

اگر آپ علم حدیث میں ماسٹر کرنا چاہتی ہیں تو ہمارے ہاں بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں داخلہ لے لیں۔ یہاں اصول الدین میں ١٩٨٢ سے کلیہ ہے۔ حدیث اور تفسیر میں ایک

سیکشن ہے جس میں حدیث کے بنیادی کورسز پڑھائے جاتے ہیں۔ پہلے بی اے آنرز میں اصول الدین کرنا ہوگا جو کہ انٹرمیڈیٹ کے بعد چار سال کا کورس ہے۔ اس میں بھی علم حدیث کے کورسز ہوتے ہیں۔ اس کے بعد دو سال کا ماسٹرز لیول کا کورس ہے پھر تین سال کا تخصص ہے جس میں آپ علم حدیث کے Intensive کورسز کر سکتے ہیں۔

کیا آج حدیث کی مستند کتب جس طرح چھاپی جاتی ہیں ان میں تحقیق کی حد پوری کی جاتی ہے جتنی کہ کی جانی چاہیے؟

میرے خیال کی حد تک ویسی ہی تحقیق کی جاتی ہے جتنی ہونی چاہیے۔ اگر آپ دیکھیں کہ بخاری کا جو نسخہ اس وقت ہندوستان اور پاکستان میں رائج ہے اس کی پروف ریڈنگ مولانا احمد علی سہارنپوری نے چھ مرتبہ کی تھی، جو اپنے زمانے کے صف اول کے محدثین میں سے تھے۔ برصغیر کے محدثین دو طرح کے مسلک سے تعلق رکھتے ہیں۔ علماء دیوبند کے مسلک سے یا اہل حدیث مسلک سے۔ لیکن ان میں بہت سے بالواسطہ یا بلاواسطہ مولانا احمد علی سہارنپوری کے شاگرد ہیں۔ انہوں نے صحیح بخاری کی پروف ریڈنگ کی تھی۔ اسی طرح سے ہمارے ایک دوست مصر کی ایک کتاب کا حوالہ دے رہے تھے ان کی تحقیق میں ان کا نام ڈاکٹر مصطفیٰ الاعظمی ہے۔ وہ تقریباً بیس سال سے ابن ماجہ کے متن پر کام کر رہے تھے۔ ابن ماجہ کا متن اب انہوں نے شائع کر دیا ہے۔ اس کی تصحیح کا جتنا زیادہ سے زیادہ انسانی طور پر ممکن ہو سکتا ہے اس امکان کی حد تک انہوں نے کام کیا ہے۔ اسی طرح سے بعض کتابوں پر جن میں ابوداؤد اور ترمذی شامل ہیں اور شاید باقی بھی ہوں گی ان پر علامہ ناصر الدین البانی نے طویل عرصے تک کام کیا ہے اور بہت عرصے تک کام کرنے کے بعد انہوں نے ان کتابوں کے نئے ایڈیشن چھپوائے ہیں۔ ان سب کتابوں پر کم و بیش بارہ سو سال سے مسلسل تحقیق کا کام ہو رہا ہے۔ اس لئے آپ اعتماد کے ساتھ ان کتابوں پر بھروسہ کر سکتی ہیں۔

کیا خاتون بغیر محرم کے حج پر جا سکتی ہے؟

جب محرم نہیں ہے تو آپ پر حج بھی فرض نہیں ہے۔ آپ محرم کے ساتھ حج کریں تو زیادہ بہتر ہے۔ میرا مشورہ یہی ہے۔ آپ کسی کے مشورے پر نہ جائیں اور اسی مسلک پر عمل کریں۔ بغیر محرم کے حج نہیں ہوتا۔

☆☆☆☆☆☆☆

جا سکتا ہے۔ لیکن اگر یہ شبہات کسی جگہ پیدا ہوتے ہیں اور اسلام کے بارے میں کسی بدگمانی کو پیدا کرنے کی کوشش کا ایک حصہ ہیں تو پھر یہ ایک بہت بڑا جرم ہے۔ اخلاقی جرم بھی ہے، علمی جرم بھی ہے اور دینی اور مذہبی جرم بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو اس جرم کے اثرات سے محفوظ رکھے جو اس غلط فہمی کا شکار ہیں۔ یہ شبہات دہرائے گئے ہیں۔

کہنے والے یہ کہتے ہیں کہ حدیث کے نام سے آج ذخیرۂ علم و ہدایت مسلمانوں کے پاس موجود ہے وہ تاریخی اعتبار سے استناد کا وہ درجہ نہیں رکھتا جو کسی قطعی روایت کے لئے ضروری ہے۔ یہ بات سب سے پہلے مسلمانوں میں سے کسی نے نہیں کہی بلکہ اس کا آغاز مغربی مستشرقین نے کیا۔ مغربی مستشرقین یعنی یورپ اور امریکہ کے ان اہل علم نے جنہوں نے اسلامیات اور اسلامی علوم و فنون کو موضوع بنایا، سب سے پہلے ذات رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نشانہ بنایا۔ سترھویں اور اٹھارویں صدی عیسوی میں اور کسی حد تک انیسویں صدی کے آغاز میں جو کتابیں لکھی گئیں ان میں بیشتر حملے رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی پر ہوتے تھے۔ ایک مسلمان ان بے بنیاد اور غلط باتوں کو نقل بھی نہیں کر سکتا جو مغربی مصنفین ذات رسالت مآب ﷺ کے بارے میں اپنی کتابوں میں لکھا کرتے تھے۔ لیکن بہت جلد ان کو اندازہ ہو گیا کہ یہ الزامات اتنے بودے، اتنے کمزور، اتنے غیر علمی اور اتنے غیر عقلی ہیں کہ کوئی سنجیدہ اور منصف مزاج شخص ان الزامات سے متاثر نہیں ہو سکتا۔

جب یہ بات واضح ہو گئی یا پھر خود ان کو احساس ہو گیا ہو گا کہ جو باتیں وہ کہہ رہے ہیں وہ غلط ہیں اس لئے انہوں نے اس بے بنیاد مہم کو چھوڑ دیا اور حملہ کا رخ قرآن پاک کی طرف کر دیا۔ یعنی اب توپوں کا رخ قرآن مجید کی طرف موڑ دیا۔ قرآن مجید کے بارے میں بہت سی بحثیں اور غلط فہمیاں پیدا کی گئیں۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے شروع میں قرآن پر انگریزی، فرانسیسی، جرمنی اور بہت سی دوسری زبانوں میں بہت کچھ لکھا گیا۔ ان تحریروں میں قرآن پاک کے بارے میں ہر طرح کی غلط فہمیاں پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ چالیس پچاس سال کے بعد ان کو اندازہ ہو گیا کہ یہ حربہ بھی بہت کمزور ہے اور قرآن پاک کی مضبوط بنیادوں پر قائم ہے کہ ان بنیادوں کو کسی طرح کے کمزور الزامات کی بنیاد پر ہلانا ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ انہوں نے قرآن مجید کو بھی چھوڑ دیا اور اپنی توپوں کا رخ حدیث نبوی کی طرف کر دیا۔ اب بڑے زور و شور

سے اس موضوع پر دنیائے مغرب میں کتابیں آنی شروع ہوئیں جن سے مشرق میں بھی بڑی تعداد میں لوگ متاثر ہونے لگے۔

میں نام نہیں لوں گا، ان میں بہت سے لوگ دنیا سے چلے گئے ہیں، لیکن مغربی محققین کو جو لوگ حرفِ آخر سمجھتے ہیں، دور کی انگریزی یا کسی مغربی مصنف کے قلم سے نکلی ہوئی کسی بھی تحریر اور بات کو تحقیق کا سب سے اونچا معیار قرار دیتے ہیں، وہ لوگ بڑی تعداد میں مستشرقین کی تحریروں سے متاثر ہوئے اور انہوں نے حدیث کے بارے میں وہ غلط فہمیاں دہرانا شروع کردیں جو مغربی مصنفین دہرایا کرتے تھے۔ الحمدللہ یہ دور بھی گزر گیا اور اب مغربی مصنفین نے بھی تسلیم کرلیا کہ علم حدیث کی بنیاد اتنے مضبوط اور گہرے ستونوں پر قائم ہے کہ کوئی اس کو ہلا نہیں سکتا۔ اب ان کا زور دوسری چیزوں پر آگیا۔

علم حدیث کے بارے میں ان حضرات کا دعویٰ یہ تھا کہ پہلے سنت کا کوئی تصور تھا نہ حدیث کو رسول اللہ ﷺ نے بطور ماخذ شریعت اور ماخذ قانون کے کبھی بیان کیا۔ نہ حدیث کے نام سے کوئی فن موجود تھا۔ نہ حدیث اور سنت کی حفاظت کے لئے وہ سب کچھ کیا گیا جو بتایا جاتا ہے۔ بلکہ یہ سب کچھ بعد کا گھڑا ہوا ہے۔ یہ میں مغربی مصنفین کی بات کر رہا ہوں، ذرا غور سے سن لیجئے گا۔

ان کا مفروضہ یہ تھا کہ تیسری چوتھی صدی ہجری میں مسلمانوں میں سے بعض لوگوں نے مختلف اقوام سے اچھی اچھی چیزیں حاصل کیں، دوسروں سے کچھ اچھے اچھے اصول اپنائے اور ان کو ایک مذہبی تقدس دینے کے لئے رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی سے منسوب کردیا۔ یہ ساری چیزیں بعد میں جعل سازوں نے گھڑی گئیں اور پھر بالقصد لوگوں سے منسوب کردی گئیں۔

جو آدمی علم حدیث کے بارے میں اتنا بھی جانتا ہو جتنا سمندر میں انگلی ڈال کر پانی حاصل کیا جاسکتا ہے تو وہ اس بات کے بے بنیاد ہونے کا اتنا ہی قائل ہوگا جتنا کسی بھی بداہت کا انکار کیا جائے تو آدمی اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ جن لوگوں کو علم حدیث سے واقفیت نہیں تھی یا مغرب سے بہت زیادہ متاثر اور مرعوب تھے انہوں نے اس بات کو اسی طرح دہرانا شروع کیا کہ بڑی تعداد میں مسلمان اس سے متاثر ہونا شروع ہوگئے۔ کہا جانے لگا کہ احادیث کی بنیاد محض زبانی طور پر سنی سنائی باتوں پر ہے۔ امام بخاری نے اپنے زمانے میں ادھر ادھر کی جو باتیں سنیں وہ جمع کردیں جو سب فضول ہیں اور ان کا کوئی اعتبار نہیں۔

کے لئے کوئی تیار نہیں ہوگا۔ یونانیوں کا سارا ذخیرہ آج آپ تک کیسے پہنچا؟ جو لوگ یونانیوں کے علوم وفنون پر اظہار تعجب کرتے ہیں ان سب کو اس ذخیرہ سے ہاتھ دھو لینے چاہئیں اور اس سارے ذخیرہ کو دریا برد کر دینا چاہئے۔ کیا آج افلاطون کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مکالمات کا کوئی نسخہ موجود ہے؟ کیا آج منطق پر ارسطو کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی کوئی کتاب دستیاب ہے؟ کیا اس کی تحریریں یا بطلیموس وغیرہ موجود ہیں؟ کیا حکیم افلاطون اور جالینوس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخے آج موجود ہیں؟ اگر یہ سب چیزیں آج موجود نہیں ہیں تو جس بنیاد پر علم حدیث پر شک وشبہ کا اظہار کیا جا رہا ہے اسی بنیاد پر ان تمام علوم وفنون کا انکار کر دینا چاہئے؟ اور کہنا چاہئے کہ یہ نسخے افلاطون اور جالینوس نے نہیں بلکہ بعد کے کسی آدمی نے مرتب کئے تھے اور پچھلے لوگوں سے غلط منسوب کر دیئے گئے؟ یہ بات تو بڑی عجیب ہے کہ جو بات اہل مغرب سے منسوب کی جائے وہ چاہے کتنی ہی کمزور ہو ہر صورت میں قابل قبول ہے۔ اور جو چیز مسلمانوں سے نسبت رکھتی ہو اور رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی سے منسوب ہو، وہ کتنی ہی روز روشن کی طرح ثابت ہو، کتنے ہی اعلیٰ سلسلے سے منسلک ہو اس کا انکار کر دیا جائے۔ یہ بات قابل قبول نہیں ہے۔

پھر مزید برآں جو چیز تاریخی طور پر ثابت ہے اور نہ صرف ثابت ہے بلکہ پندرہ سو سال سے بھی زیادہ مدت تک لوگ اس سے اتفاق کرتے رہے ہیں، وہ عربوں کے حافظہ کا معاملہ ہے۔ عربوں کا حافظہ ضرب المثل تھا۔ عربوں نے اپنے حافظہ کی بنیاد پر جو خاکے محفوظ رکھے، اسلام سے پہلے کے وہ خاکے، جن کی بنیاد پر مغربی مستشرقین اسلام پر بہت سے اعتراضات کرتے چلے آئے ہیں جن کی بنیاد پر ان کو یہ پتہ چلا کہ کفار مکہ اسلام پر کس قسم کے اعتراضات کیا کرتے تھے، وہ خاکے آج ہم تک کس ذریعے سے پہنچے ہیں؟ اب یہ بات کہ اگر کفار مکہ نے اسلام پر کوئی اعتراض کیا ہے تو وہ اعتراض تو پتھر کی لکیر ہے اور قطعی دلیل ہے کہ کفار مکہ نے اعتراض کیا تھا اس لئے کہ وہ انہی محدثین کی مرتب کردہ تاریخ میں موجود ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کونسی تاریخ میں موجود ہے؟ انہی تاریخوں میں تو موجود ہے جو بقول مغربی محققین محض زبانی روایات کی بنیاد پر ہم تک پہنچی ہیں۔ مسلمانوں نے دیا۔ کہ سامنے رکھیں۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ وہ روایت تو قابل قبول ہے جس میں کہا گیا کہ ابوجہل نے یہ کہا اور ابولہب نے وہ کہا اور عبداللہ بن ابی نے یہ کہا، لیکن وہ روایت مشکوک ہے جس میں کہا گیا ہو کہ سیدنا ابوبکر صدیق نے اس طرح

محاسن ہوں، وہ تو احادیث بجز قرآن پاک کو کیوں محفوظ نہیں رکھ سکی؟

پھر یہ مفروضہ بھی اپنی جگہ غلط ہے کہ کسی چیز کو محفوظ رکھنے کے لئے جب تک تحریری شہادت نہ ہوں وہ محفوظ نہیں رہ سکتی۔ حالانکہ اگر کسی تاریخی حقیقت یا واقعہ کی بنیاد صرف تحریری شہادت ہو تو وہ بھی مشکوک ہے۔ خود تحریری شہادت کے بارے میں یہ کیسے پتہ چلے گا کہ یہ وہی تحریر ہے جو فلاں سن میں لکھی گئی۔ فرض کیجئے کہ آج رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کا کوئی مجموعہ جو سیدنا ابو ہریرہؓ نے لکھا موجود ہوتا تو جن لوگوں کے مقدر میں ہدایت نہیں ہے وہ اس مجموعہ کے بارہ میں بھی اسی طرح شکوک وشبہات کا اظہار کرتے جیسے آج کر رہے ہیں۔ مستشرقین کہتے کہ نہیں یہ وہ مجموعہ نہیں ہے جو حضرت ابو ہریرہؓ سے منسوب کیا جاتا ہے، بلکہ یہ تو بعد میں کسی نے لکھ کر آپؓ سے منسوب کر دیا ہے۔ پھر کیا ہوتا؟ انکار کرنے والا اس کا بھی انکار کرتا۔ ماننے والے اس کے بغیر بھی مانتے ہیں۔ انکار کرنے والے اس کے باوجود ہر چیز کا انکار کر سکتے ہیں۔ انکار کرنے والے تو قرآن کا بھی انکار کرتے ہیں جو ہر طرح سے تواتر کے ساتھ پہنچا ہے۔ اس لئے کسی موافق یا مخالف کے انکار سے بات نہیں بنتی۔ بات اور دلیل اس بنیاد پر قائم ہوتی ہے کہ جو چیز پہنچائی گئی وہ کتنے استناد کے ساتھ پہنچائی گئی۔ کتنی قوت اور اہتمام کے ساتھ اس کو محفوظ رکھا گیا۔ اس کے متن کی جو اصالت یعنی purity اور pristine character ہے۔ اس کو آگے کس طرح سے منتقل کیا گیا۔

جس طرح سے اللہ نے عربوں کو حافظے سے نوازا اسی طرح سے یہ اللہ تعالیٰ کی عجیب وغریب سنت ہے اور میں اس کی بات اپنا مشاہدہ آپ سے بیان کر سکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی یہ عجیب وغریب سنت رہی ہے کہ جو شخص علم حدیث میں دلچسپی لیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے حافظہ میں برکت عطا کر دیتا ہے۔ اس دور میں بھی جن لوگوں کا آپ نے بہترین حافظہ دیکھا ہوگا یا آئندہ دیکھنے کا موقع ملے گا وہ علم حدیث سے وابستہ ہوں گے اور جن کا علم حدیث کے ساتھ اختصاص کا تعلق ہوگا وہ حافظہ اور یادداشت میں دوسروں سے نمایاں طور پر ممتاز نظر آئے گا۔ محدث جلیل مولانا انور شاہ کشمیری کے حافظہ کے واقعات ہم سب نے کثرت سے سنے ہیں۔ ماضی قریب میں شیخ عبدالعزیز بن باز اور شیخ ناصر الدین البانی کے حیرت انگیز حافظہ کا مشاہدہ کرنے والے کثرت سے موجود ہیں۔

کرام کو لکھنے کی اجازت دی گئی۔ آپؐ کی موجودگی میں اور آپؐ کی مجالس میں صحابہ کرامؓ آپؐ کے
ارشادات کو لکھا کرتے تھے اور ان کے مجموعے مرتب کیا کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن
العاصؓ کی روایت سنن دارمی میں منقول ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں
بیٹھا ہوتا تھا اور جو کچھ آپؐ ارشاد فرمایا کرتے تھے وہ لکھا کرتا تھا۔ مجھ سے قریش کے بعض ذمہ دار
حضرات نے یہ کہا کہ تم رسول اللہ ﷺ کی ہر بات لکھتے ہو۔ ممکن ہے بعض اوقات آپؐ غصہ میں
ہوں، بعض اوقات مزاج کا موڈ ہو سکتا ہے اور وہ کوئی بات مزاح کے طور پر ارشاد فرما سکتے ہیں۔ تو
تم ہر بات کیوں لکھتے ہو؟ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ
ﷺ سے عرض کیا کہ لوگ ایسا کہتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ تم ضرور لکھو فوالذی نفسی بیدہ
ما خرج منہ الا حق۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے میری زبان سے حق
کے علاوہ کوئی اور بات نہیں نکلتی۔ اب دیکھئے کہ آپؐ نے قسم کھا کر فرمایا کہ جو میں کہتا ہوں وہ حق
کہتا ہوں لہٰذا لکھو۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ جو بات سنتے تھے وہ لکھ لیتے تھے۔ ایک روایت
کے مطابق انہوں نے ایک ہزار احادیث اس مجموعے میں لکھیں۔ یہ مجموعہ صحیفہ صادقہ کہلاتا ہے۔
اس مجموعہ کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ اس مجموعہ کی تاریخ پر اگر بات شروع کی جائے تو گفتگو بہت لمبی
ہو جائے گی۔ یہ مجموعہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے کے حصہ میں
آیا۔ انہوں نے اپنے والد سے پڑھنے کے بعد اس کو روایت کرنے کی اجازت حاصل کی۔ وہ
آگے اس کو بیان کیا کرتے تھے۔ ان کے بعد یہ مجموعہ ان کے پوتے کے حصہ میں آیا جن کا نام
شعیب تھا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے عمرو کے حصہ میں آیا اور وہ اس کی روایت کیا کرتے
تھے۔ کتب حدیث میں آپ نے یہ روایت پڑھی ہوگی۔ مسند امام احمد اور ترمذی کے ساتھ
ساتھ اور بھی کئی کتابوں میں ہے۔ عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ عن [illegible]
[illegible] یعنی عمرو بن شعیب اپنے والد سے وہ اپنے دادا سے۔ یعنی والد اپنے دادا سے۔ یہاں دادا کی
نسبت عمرو کی طرف نہیں ہے شعیب کی طرف ہے کہ شعیب اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں یعنی
حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے یہ بات اس طرح
فرمائی۔ یہ ایک ذخیرہ تھا جو صحابہ کے زمانے میں پہلے ایک صحابیؓ نے حضورؐ کی مجلس میں مرتب کیا۔

رہتے تھے۔ جیسا کہ مروان بن حکم خلیفہ نے ایک مرتبہ چیک کیا تھا اور چیک کرنے کے بعد عین وہی نکلا تھا جو پہلے سے لکھا ہوا تھا۔ لہٰذا حضرت ابو ہریرہؓ جو حضورؐ کے انتقال کے بعد پچاس سال تک زندہ رہے، اور اپنی زندگی کے اگلے پچاس سال تک جو بھی روایات بیان فرماتے رہے، ان میں کسی ایک روایت اور ان کے تحریری ذخیرہ میں اختلاف نہیں ہوا۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ قیدوا العلم بالکتاب 'کہ جو علم تم مجھ سے حاصل کرتے ہو اس کو تحریر میں قید کرو، صحیفہ تحریر میں لاؤ۔ یہ تیسری مثال ہے کہ حضورؐ نے لکھنے کی نہ صرف اجازت دی بلکہ حکم ارشاد فرمایا۔ حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے علامہ سیوطی نے تدریب الراوی میں نقل کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ ہم آپ سے بہت سی چیزیں سنتے ہیں تو کیا ان کو لکھ لیا کریں؟ آپؐ نے فرمایا 'اکتبوا ولا حرج' لکھ لیا کرو اس میں کوئی حرج نہیں۔ اس کے بعد رافع بن خدیج بھی لکھنے لگے۔ یہ ایک اور صحابیؓ کی مثال آپ کے سامنے آئی۔ کہ صحابہ حضورؐ کے ارشادات حضورؐ کے زمانے ہی میں حضورؐ کی اجازت سے لکھا کرتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ جب فتح مکہ کے موقع پر مکہ میں داخل ہوئے تو آپ کو معلوم ہے کہ تمام کفار مکہ آپؐ کے سامنے موجود تھے۔ آپؐ نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔ جب آپؐ یہ خطبہ ارشاد فرما چکے تو یمن سے آنے والے ایک صحابیؓ تھے جن کا نام ابو شاہ تھا، انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ نے خطبہ میں بہت اچھی باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔ یہ خطبہ اگر کوئی مجھ کو لکھ کر دے دے تو بڑا ہی اچھا ہوگا۔ صحیح بخاری کی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا 'اکتبوا لابی شاہ' ابو شاہ کو لکھ کے دے دو۔ لوگوں نے ابو شاہ کو خطبہ کا مکمل متن لکھ کر دے دیا جو ان کے پاس محفوظ ہوا موجود تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے حکم سے آپؐ کا پورا خطبہ لکھ کر ایک صحابیؓ کو دے دیا گیا۔

یہ کہنا کہ حضورؐ نے تمام احادیث کو لکھنے کی ممانعت کر دی تھی یہ ایک بالکل بے بنیاد اور غلط بات ہے۔ جامع ترمذی کی روایت ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، جو ایک بڑے صحابی تھے، ہجرت سے پہلے مدینہ کے سرداروں میں شمار ہوتے تھے، قبیلہ خزرج کے بڑے سرداروں میں سے تھے اور اتنے بڑے سردار تھے۔ اتنے بڑے سردار تھے کہ رسول اللہ ﷺ کا جب انتقال ہوا تو انصار کو یہ خیال ہوا کہ ان کو رسول اللہ ﷺ کا جانشین ہونا چاہیے۔ اور رسول اللہ ﷺ

اللہ سے کتابیں موجود ہیں جو صدر اسلام سے آج تک لکھی جا رہی ہیں۔ لوگ ان پر کام کر رہے ہیں۔ اس لئے ان مثالوں کے بعد یہ کہنا کہ رسول اللہ ﷺ نے حدیث لکھنے کی ممانعت کی تھی یہ بات فضول اور بے بنیاد ہے۔

ایک سوال پھر بھی پیدا ہوتا ہے کہ جو ممانعت والی احادیث آئی ہیں ان کا کیا مفہوم ہے۔ ان کے تین مختلف مفاہیم ہیں۔ سب سے پہلے تو رسول اللہ ﷺ نے اسلام کے بالکل آغاز کے دور میں ممانعت فرمائی۔ جب حضورؐ ایسے ماحول میں تھے جہاں لکھنے والے بہت تھوڑے تھے۔ آغاز اسلام میں مکہ مکرمہ میں تمام لکھنے والوں کی تعداد سترہ تھی جیسا کہ بلاذری نے لکھا ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے تو بارہ تیرہ آدمیوں کے سوا کوئی لکھنا نہیں جانتا تھا۔ ان لکھنے والوں میں سے جن لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا وہ تعداد میں اور بھی تھوڑے تھے۔ سب نے تو اسلام قبول نہیں کیا۔ مثلاً ابوجہل لکھنا پڑھنا جانتا تھا لیکن اس نے تو اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ ابولہب لکھنا جانتا تھا، عبداللہ بن ابی بھی لکھنا جانتا تھا لیکن انہوں نے تو اسلام قبول نہیں کیا۔ اس لئے اسلام قبول کرنے والوں میں جو لکھنا جانتے تھے ان کی تعداد اور بھی کم تھی اور رسول اللہ ﷺ انہی سے قرآن پاک لکھوانے کا کام لیا کرتے تھے۔ اس لئے اگر شروع میں قرآن پاک اور احادیث دونوں چیزیں یہی حضرات لکھا کرتے تو اس بات کا بڑا امکان تھا کہ قرآن اور احادیث کے مضامین آپس میں مخلوط ہو جائیں اور کسی کو آگے چل کر یہ شبہ ہو جائے کہ یہ قرآن پاک کی آیت ہے یا حدیث ہے۔ مثلاً حضرت عمر فاروقؓ لکھنا جانتے تھے۔ لیکن اگر رسول اللہ ﷺ شروع میں حضرت عمر فاروقؓ کو اس کی اجازت دیتے کہ ایک کاغذ کے ایک سرے پر قرآن پاک لکھیں، جو تھوڑا تھوڑا نازل ہو رہا تھا۔ اور دوسرے سرے پر حدیث لکھیں اور یہ ذخیرہ حضرت عمر فاروقؓ کے خاندان میں چلا آتا تو سو ڈیڑھ سو سال کے بعد اس بات کا امکان تھا کہ وہ دونوں کاغذ کسی ایسے آدمی کو ملیں جو قرآن کا حافظ نہیں ہے اور وہ حدیث کو بھی قرآن کا حصہ سمجھ لے۔ اس کا امکان تو بہر حال موجود رہتا۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ نے شروع میں قرآن پاک کے علاوہ کوئی اور چیز لکھنے کی ممانعت فرمائی۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ صحابہ کی یہ تربیت فرما رہے تھے کہ جو حضورؐ کو کرتا دیکھیں اس پر خود بخود عمل درآمد شروع کر دیں بجائے صحیفہ پر لکھنے کے اس کو سینوں میں اتار لیں

تاکہ وہ عمل کے ذریعے محفوظ ہوجائے۔ قرآن پاک الفاظ کے ذریعے محفوظ ہوجائے، سنت آپ کے عمل کے ذریعے محفوظ ہوجائے، اور لوگوں کے رگ و پے میں سما جائے۔ لوگوں کے طرز عمل اور شب و روز کی نشست و برخاست کا حصہ بن جائے۔ اس لئے شروع میں رسول اللہ ﷺ نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں فرمائی کہ حدیث و سنت کو لکھا جائے۔

اس کے بعد دوسری ممانعت آپ نے کاتبانِ وحی کے لئے فرمائی۔ جو لوگ باقاعدہ کاتبین وحی تھے ان کے لئے فرمایا کہ وہ قرآن پاک کے علاوہ کوئی اور چیز نہ لکھیں۔ اس لئے کہ اگر کاتبانِ وحی کوئی اور چیز لکھیں گے تو ان کے بارے میں التباس کا زیادہ امکان ہے۔ اگر دوسرے حضرات لکھیں مثلاً حضرت ابو شاہؓ کے پاس لکھی ہوئی چیز موجود تھی اور ابو شاہؓ کاتبانِ وحی میں سے نہیں تھے، اس لئے ابو شاہؓ کے ذخیرے میں کوئی چیز ملے تو اس میں یہ غلط فہمی نہیں ہوسکتی تھی کہ یہ قرآن پاک کی آیت ہے جو لکھی ہوئی ہے۔ ایک فی لاکھ بھی اس کا امکان نہیں تھا۔ لیکن مثلاً حضرت زید بن ثابتؓ کے پاس اگر کوئی اور چیز ہوتی تو مغالطہ کا امکان تھا۔ اس لئے حضورؐ نے کاتبانِ وحی کو منع فرمایا۔

تیسری چیز جو بڑی اہم ہے وہ یہ کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ جس نے قرآن کے علاوہ کوئی چیز لکھی ہے وہ اس کو مٹا دے۔ بعض صحابہ یہ کرتے تھے، اور ایک مرتبہ حضورؐ نے دیکھا کہ وہ ایسا کر رہے تھے کہ قرآن پاک کے اپنے نسخے میں تفسیری حواشی لکھ لیتے تھے یا اسی کاغذ پر جو جگہ بچتی اس پر آپؐ کے ارشادات گرامی لکھ لیا کرتے تھے۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ قرآن کے علاوہ کوئی چیز لکھی ہے تو مٹا دو۔ اس لئے کہ اگر ایک ہی کاغذ پر ایک ہی چیز ہوگی تو اس سے آگے چل کر بڑی الجھن پیدا ہوسکتی ہے۔ اس لئے آپؐ نے مٹانے کا حکم دیا، صرف منع کرنے پر اکتفا نہیں فرمایا۔

یہ وہ چیز ہے جس کے بارے میں لوگ جان بوجھ کر یا غلط فہمی کی بنیاد پر شبہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ حضورؐ نے لکھنے کی ممانعت فرمائی تھی۔ لکھنے کی ممانعت بہت آغاز کے سالوں میں تھی، کاتبین وحی کے لئے تھی اور قرآن پاک جس چیز پر لکھا ہوا تھا اس پر حدیث لکھنے سے منع کرنے کی ہدایت تھی۔ اس ایک پہلو کے علاوہ حضورؐ نے خود احادیث لکھنے کی اجازت دی۔ آپؐ کی محفل میں احادیث لکھی گئیں۔ آپ کی اجازت سے لکھی گئیں۔ آپؐ نے خود لکھوا کر لوگوں کو دیں۔ بہت سی دستاویزات اور وثائق آپؐ نے تیار کروائے جو آج کتب حدیث میں موجود ہیں اور ان

ہوا ہے کہ کسی مسلمان کو کافر کے بدلے میں قتل نہ کیا جائے۔ یہ بعض خاص حالات میں حضورؐ نے ہدایت فرمائی تھی۔ یہ تین قسم کے مسائل اس صحیفہ میں لکھے ہوئے جو حضورؐ کے زمانہ میں لکھے ہوئے مجھے دیئے گئے تھے۔ اس کے علاوہ کوئی اور چیز خاص طور پر مجھے نہیں دی گئی جو باقی صحابہ کو نہ ملی ہو، مجھے بھی ملی۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ ایک صحیفہ حضورؐ کے زمانے کا لکھا ہوا حضرت علیؓ کے پاس بھی موجود تھا جس میں دیت، قیدیوں کی رہائی کے احکام اور یہ بات کہ مسلمان اور کافر کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں قتل کیا جا سکتا ہے کہ نہیں، اس کے بارے میں بعض ہدایات دی گئی تھیں۔

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰؓ ایک صحابیؓ تھے جو سب سے آخر میں انتقال کرنے والے صحابہ میں سے تھے۔ مجھے صحیح سن یاد نہیں لیکن سن اکیاسی نوای ہجری کے لگ بھگ ان کا انتقال ہوا۔ چند آخری صحابہ میں سے ہیں۔ ان کے پاس ایک صحیفہ یعنی احادیث کا لکھا ہوا مجموعہ موجود تھا جس میں سے وہ روایت کیا کرتے تھے۔ حضرت سمرہ بن جندب مشہور صحابی ہیں، آپ نے ان کا کام جمع ہو گا، ان کے بارے میں حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ "جمع فیہا احادیث کثیرۃ" اس رسالہ یا کتاب میں انہوں نے بہت سی احادیث جمع کی تھیں۔ حافظ ابن حجر نے تعداد نہیں بتائی۔ لیکن احادیث کثیرۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑی تعداد میں احادیث جمع کی تھیں۔ حضرت ابورافعؓ رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے اور آپؐ کے ساتھ بہت طویل عرصہ تک رہے۔ ان کے پاس ایک تحریری ذخیرہ موجود تھا جس میں نماز کے بعض احکام لکھے ہوئے تھے۔ یہ بھی ایک صحابیؓ کا لکھا ہوا ذخیرہ ہے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کا مرتب کیا ہوا ایک مجموعہ آج بھی دستیاب ہے اور استنبول کے کتب خانہ سعید علی پاشا میں اس کا مخطوطہ موجود ہے۔ مشہور صحابیؓ حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ کے دست مبارک کا لکھا ہوا ایک اور مجموعہ اسی کتب خانہ سعید علی پاشا میں موجود ہے جس میں حج کے احکام لکھے ہوئے ہیں۔ یہ وہ چند نمونے ہیں جو صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں لکھے گئے۔ ایک اور نمونہ حضرت ابوطیبہ حجیؓ کا مرتب کیا ہوا مجموعہ بھی آج موجود ہے۔ استنبول میں ایک اور کتب خانہ ہے جو کتب خانہ فیض اللہ کہلاتا ہے وہاں موجود ہے۔ دمشق کا ایک کتب خانہ دارالکتب الظاہریہ ہے جو بہت بڑا اور نفیس کتب خانہ ہے اور اب اس کی ایک جدید ترین عمارت بنائی گئی ہے، اس میں یہ کتب خانہ موجود ہے۔ الملک الظاہر بیبرس کی ایک حکمران تھا جس نے یہ کتب خانہ بنایا تھا اور قدیم

بھی ایک مجموعہ مرتب کیا اور اس کو لے کر حضرت عمر بن عبدالعزیز کے پاس آئے تو ان سے بہتر نہیں
عہد بن عبدالعزیز۔ عمر بن عبدالعزیز نے وہ مجموعہ بھی ایک جامع مجموعہ تھا۔ امام زہری صحف
اول کے محدثین میں سے ہیں۔ بہت سے محدثین ان کے شاگرد ہیں۔ امام مالک جیسے محدث
کا تعلق ان کے تلامذہ سے ہے۔ ان کا مجموعہ بہت جامع مجموعہ تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے
نسخے اسی طرح دوسرے دفاتر میں دفتر دارالحکومت میں اس کا ایک نسخہ یا نقل تیار کرا کے بھیجی گئی اور
لوگوں کے پاس یہ مجموعے مرتب ہو چکے تھے۔ یہ مجموعے صحابہ کرام کے بعد تابعین کے دور میں
مرتب ہوئے۔

تدوین حدیث تبع تابعین کے دور میں

تبع تابعین کے ابتدائی دور میں اور صغار تابعین کے دور میں کتنے مجموعے مرتب ہوئے، ان کی تعداد بیان کرنا بڑا دشوار ہے۔ ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی نے صرف تابعین دور کے [illegible] مجموعوں کا پتہ چلایا ہے۔ وقتاً فوقتاً دوسرے محققین بھی ان کا پتہ چلاتے رہتے ہیں۔ ان کی دو مثالیں دینے پر میں اکتفا کرتا ہوں۔

محمد بن اسحاق جن کا تعلق تبع تابعین کی پہلی نسل سے ہے۔ اور بعض لوگوں نے ان کو صغار تابعین میں بھی شمار کیا ہے۔ ان کا مجموعہ آج مطبوعہ شکل میں موجود ہے۔ انہوں نے ان احادیث کو جمع کیا جن کا تعلق سیرت سے، رسول اللہ ﷺ کے غزوات اور آپ کی ذات گرامی سے ہے۔ وہ ساری احادیث محمد بن اسحاق کے مجموعے میں آج مطبوعہ شکل میں موجود ہیں اور اردو اور انگریزی زبانوں میں اس مجموعے کا ترجمہ بھی دستیاب ہے۔

ایک اور مثال حضرت معمر بن راشد کی ہے جو یمن کے ایک بڑے محدث تھے۔ انہوں نے ایک کتاب الجامع المسند کے نام سے لکھی تھی۔ الجامع اس لئے کہ اس میں حدیث کے تمام ابواب کا تذکرہ تھا اور المسند اس لئے کہ وہ صحابہ کی ترتیب پر تھی۔ انہوں نے اس کتاب کو کئی حصوں میں مرتب کیا تھا جس کی آخری پانچ جلدیں آج بھی قلمی شکل میں ترکی کے ایک کتب خانہ میں موجود ہیں۔ معمر بن راشد کا تعلق تابعین کے متوسط دور سے ہے۔ معمر بن راشد کے براہ راست شاگرد عبدالرزاق بن ہمام تھے۔ عبدالرزاق بن ہمام نے ان سے احادیث روایت کیں۔

معمر کے مجموعے کی جو آخری پانچ جلدیں آج دستیاب ہیں ان میں جو احادیث ہیں وہ ساری کی
ساری مصنف عبدالرزاق میں بھی موجود ہیں۔ مصنف عبدالرزاق آج مطبوعہ موجود ہے۔ گویا مصنف
عبدالرزاق کی حد تک ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ معمر بن راشد نے جو احادیث تحریری طور پر
مرتب کی تھیں ان کا تعلق صغار تابعین کے عہد سے تھا۔ وہ ساری کی ساری احادیث تحریری اور زبانی طور پر
عبدالرزاق کو منتقل ہوئیں۔ عبدالرزاق بڑے بڑے محدثین کے استاد ہیں۔ امام بخاری کے بھی
استاد ہیں۔ امام مسلم کے بھی استاد ہیں۔ وہ اس زمانے کے بہت سے محدثین خصوصاً امام احمد بن حنبل
ان کے تلامذہ میں شامل ہیں۔ ان کی جو احادیث تھیں ان کا بہت بڑا حصہ عبدالرزاق کے ذریعے آیا۔
ان میں وہ احادیث بھی شامل ہیں جو معمر بن راشد کے مجموعہ میں شامل تھیں۔

تدوین حدیث تیسری صدی ہجری میں

صحیح بخاری جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ تیسری صدی ہجری میں لکھی گئی، ایک
بزرگ نے صحیح بخاری کی ان روایات کو جمع کیا جو آج کل جرمنی میں رہتے ہیں، بہت فاضل انسان
ہیں جو ترکی اور اکیسویں صدی کے ہمارا اس وقت فاضل ترین اہل علم میں سے ہیں۔ اگر مجھ سے
کہا جائے کہ اس دور کی تین فاضل ترین شخصیات کے نام بتاؤ تو میں سب سے پہلے ان کا نام
بتاؤں گا۔ ڈاکٹر فواد سزگین۔ انہوں نے چند درجن جلدوں میں ایک کتاب لکھی ہے اور ہر جلد بہت
ضخیم ہے۔ ہزاروں صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب انہوں نے جرمن زبان میں لکھی ہے جس میں
انہوں نے صدر اسلام سے گزشتہ چودہ صدیوں میں تمام اسلامی علوم وفنون کی تاریخ بیان کی ہے۔
قرآن، حدیث، تفسیر، فقہ، کلام، تصوف اور عربی ادب، غرض ہر فن کی تاریخ لکھی ہے۔ اس موضوع
پر اس سے زیادہ جامع کتاب کوئی نہیں ہے۔ اس کتاب کی پہلی جلد پوری حدیث پر ہے۔ علم حدیث
کی تاریخ پر جتنا مواد اس کتاب میں ہے کسی اور کتاب میں نہیں ہے۔ بڑی بیش قیمت کتاب ہے۔
ان کے پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالے کا موضوع تھا کہ صحیح بخاری کے مآخذ کیا تھے۔ اس میں انہوں نے اور
بھی بہت سی مثالیں دیں اور عبدالرزاق کا بھی حوالہ دیا۔ انہوں نے کہا کہ امام بخاری کی وہ روایات
جو انہوں نے عبدالرزاق سے لی ہیں وہ ساری کی ساری عبدالرزاق کی مصنف میں موجود ہیں۔ مصنف
عبدالرزاق کی وہ تمام احادیث جو معمر بن راشد سے لی ہیں وہ ساری کی ساری معمر کی جامع میں

موجود ہیں۔ انہوں نے ایک ایک کر کے بتایا کہ بغیر کسی حرف یا لفظ کے اختلاف کے، زیر زبر کا بھی اس میں فرق نہیں۔ لہٰذا یہ کہنا کہ یہ سلسلہ صرف زبانی یادداشت کی بنیاد پر چل رہا تھا یہ بالکل بے بنیاد ہے۔ انہوں نے اس پر پوری کتاب لکھی ہے۔ میں نے اصل کتاب نہیں پڑھی، وہ جرمن اور ترکی زبان میں ہے، لیکن ان کے خطوط دیکھے ہیں، اور خود ان سے ملاقات کا موقع ملا تو ان سے یہ باتیں معلوم ہوئیں۔

اس بات کی تردید کرنے کے لئے یہ چند مثالیں کافی ہیں کہ احادیث زبانی روایت ہوتی رہی تھیں، سنی سنائی باتیں تھیں اور تیسری صدی ہجری کے محدثین نے ان کو جوں کا توں نقل کیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ جن کا تعلق تبع تابعین کے اونچے طبقے سے ہے، ان کے اپنے دست مبارک کی مرتب کی ہوئی دو مطبوعہ کتابیں آج موجود ہیں۔ ایک 'کتاب الزہد' ہے جس میں زہد سے متعلق احادیث ہیں اور دوسری 'کتاب الجہاد' ہے جس میں جہاد سے متعلق احادیث ہیں۔ امام مالکؒ جن کا تعلق بعض روایات کے مطابق صغار تابعین سے ہے، اور اکثر روایات کے مطابق ان کا تعلق تبع تابعین کے اونچے طبقے سے ہے، ان کی کتاب موطا سے تو ہم سب واقف ہیں۔ جن حضرات نے تابعین میں سے کتابیں لکھیں اور وہ آج ہمارے پاس موجود ہیں ان میں حضرت ہشام بن عروہ بن زبیر بھی شامل ہیں جو حضرت عائشہؓ کے بھانجے کے بیٹے تھے۔ حضرت عائشہؓ سے بہت سی روایات عروہ بن زبیر کرتے ہیں۔ ان کا مرتب کیا ہوا مجموعہ ترکی کے شہید علی کتب خانہ میں موجود ہے۔

حضرت ابو بردہ، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے پوتے تھے، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کا مجموعہ ان کو ملا اور بہت سی باتیں ان کو ملیں جن کی بنیاد پر وہ روایت کیا کرتے تھے۔ ان کا مرتب کیا ہوا مجموعہ دمشق کے کتب خانہ ظاہریہ میں موجود ہے۔ سنن مالک، الجعدی الجعد فی الجزء محمد بن مسلم الاسعدی۔ یہ وہ چند صغار تابعین ہیں جن کے مجموعے آج کتب خانوں میں موجود ہیں۔

ان حضرات کے علاوہ تبع تابعین میں سے متعدد تبع تابعین کا طبقہ یعنی مشہور محدثین سے پہلے کا طبقہ، ان کی جو کتابیں آج ہمارے پاس موجود ہیں، ان میں قدیم ترین کتب میں سے امام ابو داؤد طیالسی کی مسند ہے جو مسند ابی داؤد طیالسی کے نام سے بار بار چھپ چکی ہے۔ ان کا انتقال 204

ایک ابھی آپ نے یہ بھی فرمایا کہ قرآن تو پورا کا پورا قطعی الثبوت ہے لیکن دوسرے ہی ایک سوال کے جواب میں آپ نے کہا کہ قرآن کی بعض آیات ایسی ہیں جن کا ایک سے زیادہ مفہوم نکل سکتا ہے۔

نہیں، آپ کو سمجھنے میں غلطی ہو رہی ہے۔ جہاں کسی ایک لفظ میں ایک سے زیادہ مفہوم نکل رہے ہوں، وہ ظنی الدلالت کہلاتے ہیں۔ میں نے دو چیزیں بیان کی تھیں۔ ایک یہ کہ قرآن پاک سارا کا سارا قطعی الثبوت ہے اور اس کا قرآن ہونا ثابت ہے۔ اس باب میں تو پورا قرآن الحمد سے لے کر والناس تک ایک ایک حرف، ایک ایک شوشہ اور ایک ایک زیر زبر قطعی الثبوت ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ احادیث کا بھی بہت بڑا حصہ قطعی الثبوت ہے اور اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہے۔ لیکن قرآن مجید کی بعض آیات ہیں جن کا ایک سے زیادہ مفہوم نکل سکتا ہے، وہ ظنی الدلالت ہیں، یعنی جن کے مفہوم میں ایک سے زائد معانی اور مذاہب کی گنجائش ہے اور علماء حدیث یا علماء تفسیر نے ان کے ایک سے زائد مطالب قرار دیئے ہیں۔ وہ سارے مطالب ظنی الدلالت ہیں۔ ان میں سے ہر مطلب بیک وقت صحیح ہو سکتا ہے، اس لئے میں نے ظنی الدلالت لفظ بولا تھا، ظنی الثبوت کا نہیں بولا تھا۔ قرآن پاک پورے کا پورا قطعی الثبوت ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے احادیث کیوں روایت نہیں کی گئیں؟

میں یہ بات پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ احادیث کو بیان کرنے کا زیادہ موقع اس وقت ملا جب صحابہ کرام ایک ایک کر کے دنیا سے اٹھتے جا رہے تھے۔ صحابہ کرام کو آپس میں احادیث بیان کرنے کا بہت کم موقع ملتا تھا، اس لئے کہ انہیں اس کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ احادیث بیان کرنے کی زیادہ ضرورت اس وقت پیش آئی جب تابعین کی تعداد بڑھ گئی اور صحابہ کرام کی تعداد کم ہوتی گئی۔ حضرت فاطمۃ الزہراؓ کا انتقال رسول اللہ ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے چھ ماہ کے اندر اندر ہو گیا تھا اور ان چھ مہینوں میں انہوں نے جس پریشانی اور کرب میں اپنا وقت گزارا وہ سب کو معلوم ہے۔ وہ چھ ماہ کے اس زمانے میں جو اشعار دہرایا کرتی تھیں ان میں سے ایک یہ تھا:

صبت علی مصائب لو انہا

صبت علی الایام صرن لیالیا

مجھ سے غلطی ہوئی ہو گی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے وہ یہ کہ مرغ کی بانگ اور دعا کے بارے میں جتنی احادیث ہیں وہ ساری کی ساری ضعیف ہیں۔ لیکن اگر یہ روایت موجود ہے تو صحیح ہوگی میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے اس خاص روایت کی تحقیق نہیں ہے۔ لیکن میں نے موضوعات کی کسی کتاب میں یہ پڑھا تھا کہ مرغ کو دیکھنا اور دعا کرنے کے بارے میں جتنی احادیث ہیں وہ ساری کی ساری ضعیف ہیں۔ میں دوبارہ دیکھ کر بتاؤں گا ممکن ہے میری یادداشت سے غلطی ہوئی ہو۔

سوال: [illegible]
مستشرقین حضرت ابوہریرہ پر اعتراض کرتے ہیں۔

ہمارے مستشرقین نے حدیث میں بہت زیادہ دلچسپی لی ہے۔ وہ تمام باتیں مغربی دنیا کی طرف سے کی جاتی رہتی ہیں۔ ہمارا کوئی منکر حدیث دریافت نہیں ہوا جس نے کوئی نئی بات اپنی طرف سے نکالی ہو۔ جرمنی کا ایک شخص تھا جو انیسویں صدی کے اواخر میں اور بیسویں صدی کے اوائل میں تھا گولڈ زیہر۔ سب سے پہلے اس نے حدیث پر کام کا آغاز کیا تھا۔ اور اس کا ایک شاگرد تھا جوزف شاخت، وہ بھی جرمن تھا۔ یہ دونوں یہودی اور دونوں جرمن تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے حدیث کے بارے میں یہ غلط فہمی پھیلائی۔ ایک یہ غلط فہمی پھیلائی کہ حضرت ابو ہریرہ نے تو سن سات ہجری میں اسلام قبول کیا اور سات ہجری کے بعد تو صرف تین سال ان کو حضور ﷺ کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ ان سے جو روایات ہیں وہ ساڑھے پانچ ہزار بتائی جاتی ہیں۔ دوسرے صحابہ کی روایات تھوڑی ہیں جو طویل عرصہ حضور کے ساتھ رہے۔ جو آدمی صرف تین سال ساتھ رہا اس نے تو ساڑھے پانچ ہزار روایات بیان کی ہیں اور جو تئیس تئیس، چوبیس چوبیس سال اور پوری زندگی ساتھ رہے ان سے مروی احادیث بہت تھوڑی ہیں۔ یہ گویا اس بات کا ثبوت ہے کہ حضرت ابو ہریرہ خود سے گھڑ لیا کرتے تھے۔ یہی اعتراضات ان لوگوں نے دہرایا۔ ہمارے ہاں لوگوں نے بھی یہی دہرایا۔

ہمارے ساتھی ایک ادیب صاحب ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی عمر میں برکت دے۔ بڑے عالم فاضل انسان ہیں۔ علم حدیث پر انہوں نے بہت کام کیا ہے۔ وہ بھی ہندو گھرانے سے آئے ہیں، اور مصطفیٰ اعظمی کی طرح اعظمی ہیں لیکن ان کا اسم گرامی ہے ضیاء الرحمن اعظمی۔ ان کا ایک قصہ ہے یہ ہے کہ یہ پندرہ سال کی عمر تک ہندو تھے اور پھر اسلام میں داخل ہوئے تو ان کے رشتہ داروں نے

ان پر غیر معمولی مظالم ڈھائے اور ایسے مظالم کئے کہ ان کی تفصیل سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ نہ صرف اسلام پر قائم رہے، بلکہ علم دین حاصل کیا، علم حدیث میں تخصص پیدا کیا۔ سعودی عرب پہنچ گئے اور اب گزشتہ تقریباً پچیس تیس سال سے مدینہ منورہ میں قیام پذیر ہیں۔ سعودی عرب کی شہریت ان کو ملی ہوئی ہے۔ مدینہ منورہ کی جامعہ اسلامیہ میں حدیث کے استاذ ہیں اور حدیث پر انہوں نے بہت سی کتابیں لکھیں۔ انہوں نے علم حدیث پر جو کام کیا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ انہوں نے حضرت ابوہریرہؓ کی احادیث پر کام کیا۔

حضرت ابوہریرہؓ کی احادیث پر جو اعتراضات جوزف شخت اور گولڈ تسیہر نے اٹھائے تھے وہی اعتراضات مصر کے ایک منکر حدیث محمود ابوریہ نے بھی اٹھائے ہیں۔ محمود ابوریہ نے ایک کتاب لکھی 'ابو ھریرۃ و مرویاتہ'، ابوہریرہؓ اور ان کی روایات، اور اس میں وہی باتیں دہرائیں جو وہ لوگ کہتے تھے۔ ہمارے ہاں بھی کچھ لوگوں نے یہی باتیں بار بار دہرائی ہیں۔ ڈاکٹر ضیاء الرحمن اعظمی نے کمپیوٹر کی مدد سے حضرت ابوہریرہؓ کی ساری روایات کو جمع کیا۔ ان کے تمام طرق کو جمع کیا اور یہ ثابت کیا کہ جو متون ہیں وہ کل پندرہ سو کے قریب ہیں، باقی سارے طرق ہیں۔ پندرہ سو متون کا ایسے آدمی کے لئے یاد رکھنا جو لکھتا بھی ہو تین سال میں کوئی مشکل بات نہیں۔ روزانہ اوسطاً دو تین حدیثیں بھی نہیں بنتیں۔ تو ایک آدمی تین چار یا پانچ احادیث تو روزانہ لکھ سکتا ہے اور یاد بھی کر سکتا ہے اس میں ایسی کوئی بڑی بات نہیں۔ یہ ضیاء الرحمن اعظمی کی کتاب میں تمام تفصیل موجود ہے۔ اس کتاب کا نام بھی 'ابو ھریرۃ و مرویاتہ' ہے۔ مستشرقین اور منکرین حدیث کو چونکہ حضرت ابوہریرہؓ کے واسطے سے حدیث پر اعتراض کا موقع ملتا ہے اس لئے حضرت ابوہریرہؓ کو زیادہ نشانہ بناتے ہیں۔

احادیث کے ضعف کے بھی درجے ہوتے ہیں؟

یقیناً ہوتے ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ضعیف احادیث کی بیالیس قسمیں ہیں جن میں سے چند میں پہلے بیان کر چکا ہوں، ان سب کے الگ الگ درجات ہیں۔ ضعیف احادیث کو بالکل مسترد نہیں کیا جاتا۔ بعض شرائط کے ساتھ قبول کیا جاتا ہے لیکن اس قبولیت کا دار و مدار ضعف پر ہے۔ زیادہ ضعف ہو تو قبول نہیں کی جاتی، جو کم ضعف والی ہو اس کو پہلے دیکھا جاتا ہے کہ آیا دوسری ضعیف احادیث سے اس کی تائید ہوتی ہے؟ اگر دوسری ضعیف احادیث سے تائید ہوتی ہو تو

آٹھواں خطبہ

رحلہ اور محدثین کی خدمات

منگل، 14 اپریل 2003ء

رحلہ اور محدثین کی خدمات

آج کی گفتگو کا عنوان ہے: رحلہ فی طلب الحدیث یعنی علم حدیث کے حصول اور تدوین کی غرض سے سفر۔ یوں تو حصول علم کے لئے دور دراز علاقوں کا سفر کرنا مسلمانوں کی روایت کا ہمیشہ سے ایک اہم حصہ رہا لیکن علم حدیث کے حصول کی خاطر سفر کا ایک منفرد مقام ہے۔ محدثین کرام نے علم حدیث کے حصول، احادیث کی تحقیق، راویوں کی جرح و تعدیل اور رجال کے بارے میں معلومات جمع کرنے کی خاطر جو طویل اور مشقت انگیز سفر اختیار فرمائے ان سب کی داستان نہ صرف دلچسپ اور حیرت انگیز ہے بلکہ علم حدیث کی تاریخ کا ایک بڑا نمایاں اور منفرد باب ہے۔ محدثین میں جس شخصیت نے جتنے زیادہ سفر کئے ہوں، تذکرہ حدیث اور تذکرہ محدثین میں اسی اہتمام سے اس محدث کا ذکر کیا جاتا ہے۔ محدثین نے تذکرے میں رحال، اکثر بہت زیادہ سفر کرنے والا اور جوّال، بہت زیادہ گھومنے والا، یہ صفات بہت کثرت سے ذکر کی ہیں۔ بعض محدثین کے بارے میں تذکرہ نگار لکھتے ہیں۔ طاف البلاد، انہوں نے مختلف ملکوں کا چکر لگایا تھا۔ جاب الآفاق، انہوں نے چاروں طرف عالم میں سفر کئے تھے۔ انہوں نے مشرق و مغرب کے شہر اور علاقے علم حدیث کی تلاش میں چھان مارے۔ یہ عبارتیں اور الفاظ تذکرہ محدثین میں عام ہیں۔

القاب محدثین

علم حدیث میں محدثین کے لئے جو القاب استعمال ہوتے ہیں ان میں سے ایک لقب رحال بھی ہے۔ مثال کے طور پر حدیث کی کسی کتاب میں آپ کو ملے گا: حدثنا یحییٰ [illegible] کے شروع

سے اشارہ کرتے اور کہتے کہ اس کو نکالو۔ جب چوتھی پانچویں مرتبہ ایسا ہوا تو ابو نعیم مسکرائے اور کہا
کہ تم امتحان لینا چاہتے ہو۔ پھر کہا کہ یہ اس دوست نے تو یہ شرارت میرے ساتھ نہیں کی۔
تم کیوں ایسا کرنا چاہتے ہو۔ یحییٰ ان کو اپنی روایات اور حافظہ پر اتنا اعتماد تھا کہ ایک دو مرتبہ تک تو
ان کو اندازہ نہ ہوا کہ یہ شخص غلطی کیوں کر رہا ہے آزمانا مقصود ہے۔ یہ سن کر وہ دونوں بزرگ، امام احمد
اور یحییٰ بن معین نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ان سے اجازت لے کر واپس آگئے۔ امام
احمد نے کہا کہ میں نے آپ سے نہیں کہا تھا کہ یہ بہت قابل اعتماد ہیں اور ان کو چیک کرنے کی
ضرورت نہیں۔ لیکن اس تحقیق کے بعد یحییٰ بن معین نے اپنی کتاب میں درج کیا کہ ابو نعیم
مستند راوی ہیں۔

رحلہ

رحلہ ایک اصطلاح ہے جس کے لفظی معنی تو سفر کے ہیں لیکن یہاں علم حدیث کی
اصطلاح میں علم حدیث حاصل کرنے کے لئے سفر کرنا رحلہ کہلاتا ہے۔ رحال ان محدثین کو کہتے
ہیں جو بہت زیادہ سفر کرتے ہوں اور رحلہ وہ محدث جن کے پاس سفر کر کے جایا جائے۔ بعض حضرات
نے قرآن مجید میں سورۃ التوبہ میں جو آیت آئی ہے السائحون یعنی سفر کرنے والے سے طلب
علم کا سفر مراد لیا ہے۔ اس لفظ کے بارے میں بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہاں سفر کرنے والے
سے مراد وہ سفر کرنے والے ہیں جو کسی نیک مقصد کی خاطر سفر کریں۔ مثلاً جہاد کے لئے، دعوت
دین کے لئے یا پھر مثلاً طلب علم کے لئے۔ اور یہ آخری قول جن لوگوں کا ہے ان میں حضرت
عکرمہؓ (حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے شاگرد) بھی شامل ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ السائحون
سے مراد حدیث کے طلبہ ہیں۔ گویا اگر حدیث کے طلباء اس سے مراد ہوں جیسے کہ
حضرت عکرمہ کی رائے ہے تو طلب حدیث کے لئے گھر سے نکلنا اور سفر اختیار کرنا قرآن مجید سے
براہ راست بھی ثابت ہے۔

لیکن بالواسطہ طور پر قرآن مجید کی ایک آیت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شریعت
میں طلب علم کے لئے گھر سے نکلنے اور سفر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ سورۃ توبہ کی آیت ہے:
فلولا نفر من كل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا في الدين ولينذروا قومهم اذا رجعوا اليهم

اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان صرف دو واسطے ہیں: مالک عن نافع عن ابن عمرؓ۔ امام بخاری کی عالی
اسناد کے بارے میں ایک دو روز قبل مجھ سے غلطی ہوگئی تھی۔ میں اس کی اصلاح کر دیتا ہوں۔ آپ
بھی اپنی یادداشتوں میں اصلاح کر لیں۔ امام بخاری کے ہاں جو سندیں سب سے اعلیٰ ہیں وہ
ثلاثیات کہلاتی ہیں جن میں امام بخاری اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان تین واسطے ہیں۔ میں نے
غالباً یہ کہا تھا کہ ثلاثیات کا بیشتر حصہ علی بن مدینی سے منقول ہے۔ یہ غلطی ہوئی۔ علی بن مدینی
سے نہیں، بلکہ امام بخاری کی بیشتر ثلاثیات مکی بن ابراہیم سے منقول ہیں۔ مکی بن ابراہیم اور علی بن
مدینی دونوں امام بخاری کے اساتذہ ہیں۔ لیکن ثلاثیات کی بڑی تعداد مکی بن ابراہیم سے منقول
ہے۔ علی بن مدینی سے منقول نہیں ہے۔

اس علو اسناد کے بارے میں امام احمد کا ارشاد ہے کہ "طلب علو الاسناد من الدين"
کہ علو اسناد کو حاصل کرنا بھی دین کا ایک حصہ ہے۔ یہ چیز دین کا حصہ اس لئے ہے کہ سند میں
اور واسطے جتنے کم ہوں گے بات اتنی یقینی ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات جتنے یقینی انداز میں
کسی تک پہنچیں گے اتنا ہی زیادہ اس پر عمل درآمد کے لئے جذبہ پیدا ہوگا۔ جتنا عمل درآمد کا جذبہ
پیدا ہوگا اتنی ہی دقت نظر کے ساتھ انسان عمل کرے گا۔ اس لئے علو اسناد کا حصول بھی دین کا ایک
حصہ ہے۔ جب علو اسناد کے لئے انسان سفر اختیار کرے گا تو وہ بھی دین کا ایک حصہ ہوگا اور اللہ
تعالیٰ کی بارگاہ سے اس کا اجر ملے گا۔

آپ نے مشہور بزرگ اور صوفی ابراہیم بن ادھمؒ کا قصہ سنا ہوگا۔ ان کا زمانہ وہ ہے
جب محدثین کرام طویل اور مسلسل سفر اختیار فرمایا کرتے تھے اور علم حدیث کے بارے میں
معلومات جمع کیا کرتے تھے۔ ایک موقع پر حضرت ابراہیم بن ادھم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس
امت سے جو بلائیں اور آزمائشیں اٹھائی ہیں اس کی ایک وجہ محدثین کرام کے طویل سفر بھی ہیں،
یعنی محدثین جو طویل سفر اختیار فرماتے ہیں اور جو مشقت برداشت کرتے ہیں اس کی برکت سے
اور اس کی پسندیدگی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس امت کی بہت سی بلائیں ہٹا دی ہیں اور ختم کر دی
گئیں۔

تھا کہ وہ آپ کے پاس ہے۔ اس کے الفاظ کیا ہیں اور آپ نے رسول اللہ ﷺ سے کن الفاظ میں اس حدیث کو سنا تھا؟ انہوں نے دہرایا کہ ان الفاظ میں سنا تھا۔ انہوں نے کہا الحمد للہ صرف اس غرض سے لئے آیا تھا اس کے علاوہ اور کوئی غرض نہیں ہے۔ اونٹ کی باگ موڑ دی اور واپس مدینہ منورہ کی طرف چل پڑے۔

حضرت جابر بن عبداللہؓ کو ایک مرتبہ ایک اور حدیث کے حصول کے لئے مصر جانے کا موقع ملا۔ مصر میں ایک صحابی کے بارے میں انہوں نے سنا کہ ان صحابی کے علم میں کوئی حدیث ہے اور ان کے علاوہ کوئی اور صحابیؓ اس وقت ایسے نہیں ہیں جو اس حدیث کا علم رکھتے ہوں۔ وہ اونٹ پر سوار ہوئے اور مدینہ منورہ سے سفر کر کے مصر پہنچے۔ وہ صحابیؓ مصر کے گورنر تھے۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ ملازم نکلا تو بولے کہ گورنر سے کہو کہ باہر آئے۔ ملازم کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ کون شخص ہے اس لئے کہ اس طرح تو کوئی نہیں کہتا۔ لوگ تو درخواست لے کر آتے ہیں کہ میں گورنر سے ملنا چاہتا ہوں، کس وقت ملاقات کا موقع مل سکتا ہے وغیرہ۔ یہ کون شخص ہے جو گورنر سے باہر آنے کا کہہ رہا ہے۔ اس نے جا کر کہا کہ باہر ایک بدو آیا ہے اور کہتا ہے کہ گورنر سے کہو کہ باہر آئے۔ وہ بھی اپنے ساتھیوں کے مزاج شناس تھے۔ سمجھ گئے کہ کوئی صحابیؓ ہوں گے۔ کہا کہ جا کر نام پوچھ کر آؤ۔ انہوں نے کہا جابر۔ انہوں نے کہا کہ ان سے پوچھو کہ جابر بن عبداللہ ہیں؟ دوڑتے ہوئے باہر آئے، گلے ملے اور پوچھا کہ کیسے آنا ہوا۔ انہوں نے کہا کہ آپ کے پاس ایک حدیث ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ من ستر عورة مسلم فكانما احيا موءودة، جس نے کسی مسلمان کی کمزوری کو چھپایا وہ ایسا ہی ہے جیسا کسی نے زندہ درگور کی جانے والی بچی کو زندگی بخشی۔ کسی مسلمان کی کسی کمزوری کو چھپانا ایسا ہی کار ثواب ہے جیسا کسی کی جان کو بچالینا جس کو اس کے رشتہ دار زندہ درگور کرنے کے لئے آمادہ ہوں۔ گورنر صاحب نے تصدیق کی اور دوبارہ حدیث کے الفاظ دہرا دیئے۔ انہوں نے یہ الفاظ سنے، نعرہ تکبیر بلند کیا، اللہ اکبر کہا اور واپس تشریف لے گئے۔

حضرت ابو ایوب انصاریؓ کو پتہ چلا کہ یہی حدیث دوسرے الفاظ میں ایک صحابیؓ کے پاس ہے۔ انہوں نے بھی مدینہ منورہ سے مصر کا سفر اختیار کیا۔ ان صحابیؓ کے مکان پر دستک دی اور یہ حدیث ان الفاظ میں سنی کہ من ستر مومنا في الدنيا ستره الله يوم القيامة، جو شخص اس دنیا میں کسی مومن کی پردہ پوشی کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی کرے گا۔ انہوں

نے اللہ اکبر کہا، الحمد للہ کہا اور اپنی سواری کی باگ موڑ کر واپس تشریف لے گئے۔

ایک صحابی جن کا نام عبداللہ بن عدیؓ ہے۔ ان کا تعلق رسول اللہ ﷺ کے قبیلہ بنی عبد مناف سے تھا۔ ان کو پتہ چلا کہ حضرت علیؓ کے پاس کوئی حدیث ہے جو ان تک نہیں پہنچی۔ یہ مدینہ منورہ سے چلے، کوفہ پہنچے، حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان سے حدیث سنی، سیکھی، یاد کی، نوٹ کر لی اور واپس چلے گئے۔

حضرت جابر بن عبداللہؓ نے دو سفر کیے۔ ایک شام کا اور ایک مصر کا۔ دونوں سفروں میں صرف دو احادیث سن کر واپس آ گئے۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے بھی ایک سفر مصر کے لئے اختیار کیا۔ حضرت عقبہ بن عامر الجہنیؓ جو مصر میں تھے، ان سے علم حدیث کے بارے میں کوئی روایت معلوم کی اور واپس آ گئے۔ صحابہ کرامؓ کے اور بھی واقعات ہیں جن میں انہوں نے کسی حدیث کی تحقیق کے لئے سفر اختیار کیے۔ ان چند واقعات سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ انہوں نے ایک ایک روایت کی تحقیق کی خاطر کتنے سفر اختیار کیے۔

علم حدیث کے لئے تابعین کے سفر

جب تابعین کا زمانہ آیا تو یہ روایت اور بھی زیادہ عام ہو گئی۔ اتنی عام ہوئی کہ ایک ایک لفظ اور ایک ایک بات سیکھنے کے لئے تابعین طویل سفر اختیار فرمایا کرتے تھے۔ امام شعبی جن کی وفات 104ھ میں ہوئی اور وہ امام ابو حنیفہ کے اساتذہ میں سے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص شام کے انتہائی شمالی علاقہ سے سفر کرے اور یمن کے انتہائی جنوبی علاقہ تک جائے اور کسی حدیث کا ایک لفظ یاد کر کے واپس آ جائے، محفوظ کلمۃ کوئی ایک کلمہ سن کر آ جائے، تسمع ما ینفعہ، جو مستقبل میں اس کے لئے مفید اور کارآمد ہو تو میرا یہ خیال ہے کہ اس کا یہ سفر ضائع نہیں ہوا۔ یہ سفر کامیاب اور کامران و مفید ہے۔

حضرت علقمہ اور اسود دو مشہور اور بڑے تابعین میں سے ہیں اور ان کا درجہ تفقہ میں اور شریعت کے فہم اور بصیرت میں بہت اونچا مانا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ امام ابو حنیفہ نے ایک بار ارشاد فرمایا کہ اگر شرف صحابیت اور احترام صحابیت مانع نہ ہوتا تو میں یہ کہتا کہ علقمہ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بڑھ کر ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں کوفہ میں تھے۔ علقمہ اور اسود بھی دونوں حضرت

نیکیاں لکھ دیتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا کہ سننے والے سے غلطی ہوئی۔ صحیح الفاظ یہ نہیں ہیں۔ اب ان کو بڑی مایوسی ہوئی کہ میرے پاس ایک بہت حوصلہ افزا اور ایمان افروز حدیث تھی جس کی تصدیق حضرت ابو ہریرہؓ نے نہیں کی۔ فوراً ان کے دل میں مایوسی کی ایک کیفیت طاری ہوگئی۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا: اصل الفاظ یہ ہیں: ان اللہ لیعطی لعبدہ المومن بالحسنة الواحدة الفی الف حسنة 'اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندے کو ایک نیکی کے مقابلہ میں بیس لاکھ نیکیاں دیتے ہیں۔ اب انہوں نے حیرت سے دیکھا کہ ایک نیکی کے مقابلہ میں بیس لاکھ نیکیاں کیسے ہوسکتی ہیں۔ اس پر حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ قرآن مجید میں آیا ہے کہ جو لوگ اللہ کو قرض دیں گے، قرضا حسنا فیضٰعفہ لہ اضعافا کثیرا تو اللہ تعالیٰ ان کے لئے اس کو بہت گنا بڑھا دیں گے۔ تو انہوں نے کہا کہ ہمارے تمہارے لئے دس بیس لاکھ تھوڑی رقم ہے۔ اللہ کے لئے تو اضعافا کثیرا ہے۔ بہت گنا۔ تو اللہ تعالیٰ کے لئے دس لاکھ بیس لاکھ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ وہ اس اضافہ اور ترمیم کے ساتھ خوشی خوشی واپس آئے اور یہ حدیث انہوں نے ایک واسطہ کم کرکے براہ راست صحابی رسولؐ سے سن لی۔

ایک تابعی تھے ابن الدیلمی، فلسطین میں رہتے تھے۔ ان کو پتہ چلا کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ، جو صحیفہ صادقہ کے مصنف ہیں، مدینہ منورہ آئے ہوئے ہیں اور ان کے پاس ایک ایسی روایت ہے جس سے شراب خور کے بارے میں کوئی وعید ثابت ہوتی ہے۔ وہ فلسطین سے سفر کرکے مدینہ منورہ پہنچے۔ مدینہ میں لوگوں نے بتایا کہ وہ تو مکہ مکرمہ چلے گئے ہیں۔ وہ سفر کرکے مکہ مکرمہ چلے گئے۔ وہاں پہنچے تو کسی نے بتایا کہ حضرت عبداللہ طائف میں اپنے باغ کی دیکھ بھال کے لئے گئے ہیں اور وہیں پر مقیم ہیں۔ چنانچہ یہ طائف پہنچے، اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے پوچھا کہ کیا آپ نے رسول اللہ ﷺ سے کوئی حدیث شراب خور کی وعید کے بارے میں سنی ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں، سمعت رسول اللہ ﷺ یقول، میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا من شرب الخمر، جس نے شراب پی، لم تقبل لہ صلوٰۃ اربعین صباحاً، تو چالیس دن تک اس کی نماز قبول نہیں ہوگی۔

ایک صاحب امام اوزاعی کے پاس علم حدیث سیکھنے کے لئے تشریف لائے۔ چار پانچ دن امام اوزاعی کے پاس رہے۔ صبح سویرے امام کی خدمت میں حاضر ہو جاتے تھے اور رات تک

ان کی خدمت میں رہتے تھے۔ امام اوزاعی ایک دن میں ایک ہی حدیث سنانے پر اکتفا کرتے
تھے۔ چار پانچ دن کے بعد انہوں نے قدرے ناگواری سے عرض کیا کہ میں چار دن سے آپ کے
ساتھ ہوں اور آپ نے چار دنوں میں مجھے چار ہی حدیثیں سنائی ہیں۔ امام اوزاعی غالباً یہی بات
ان سے کہلوانا چاہتے تھے۔ انہوں نے حضرت جابرؓ کا قصہ سنایا کہ انہوں نے ایک اونٹ
خریدا اور پہلے دمشق جا کر ایک روایت کی تصدیق (confirmation) کی۔ پھر ایک دوسرے
موقع پر سفر کر کے مصر گئے اور وہاں ایک دوسری روایت verify کرائی۔ انہوں نے کہا کہ
صحابہ کرامؓ ایک ایک روایت کے حصول کے لئے نہیں، کیونکہ روایت تو ان کو پہلے سے حاصل ہوتی
تھی، بلکہ صحابیؓ سے براہ راست سننے کے لئے ایک ایک اور دو دو مہینے کا سفر کیا کرتے تھے۔
تم چار دن میں چار احادیث کے سننے پر خوش ہو۔ غالباً اس کام کی اہمیت ان کو جتانا مقصود تھا۔
اس لئے انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا اور ان کو پڑھایا۔

ایک اور تابعی ہیں حضرت ابو علی بغدادی الاصمعی۔ ان کو پتہ چلا کہ خراسان میں کوئی
تابعی ہیں۔ خراسان بہت بڑا صوبہ کہا جاتا تھا جس کی حدود موجودہ ایران میں مشہد سے لے
کر پورے افغانستان کے شمالی حصہ اور وسط ایشیا کے جنوبی حصہ یعنی موجودہ تاجکستان کے علاقہ تک
پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ پورا علاقہ خراسان کہلاتا تھا۔ آج وسط ایشیا میں جو علاقہ تاجکستان ہے یہ
خراسان کہلاتا تھا۔ امام ابو علی بغدادی کو یہ پتہ چلا کہ خراسان میں کسی صاحب کے پاس ایک
حدیث ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے حضرت معاویہؓ کو ایک خط لکھا تھا
اور اس میں یہ لکھا تھا کہ رسول اللہ ﷺ یہ دعا کیا کرتے تھے: لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک
له، له الملك وله الحمد وهو على كل شيء قدير، اللهم لا مانع لما اعطيت ولا معطي لما منعت ولا
ينفع ذا الجد منك الجد۔ انہوں نے کہا کہ یہ دعا رسول اللہ ﷺ نے مجھے سکھائی تھی تم بھی پڑھا
کرو۔ حضرت معاویہؓ سے پھر بقیہ تابعین نے اس دعا کو پایا۔ یہ روایت ان تابعی سے براہ
راست سننے کی غرض سے انہوں نے بغداد سے خراسان کا طویل سفر اختیار کیا۔

ایسی روایات بھی ہیں جن میں دو صحابی ایک دوسرے سے روایت کرتے ہیں۔ عموماً
ایک صحابی رسول اللہ ﷺ سے روایت کر کے تابعین کو بتاتے ہیں۔ لیکن ایسی مثالیں بھی ہیں کہ
ایک صحابی نے دوسرے صحابی سے حدیث روایت کی ہے اور یہ حدیث اس کی ایک مثال ہے کہ

حضرت معاویہؓ حضرت مغیرہ بن شعبہ سے روایت کرتے ہیں۔ اس حدیث کو براہ راست ان تابعی
کی زبان سے سننے کے لئے جنہوں نے حضرت معاویہؓ کی زبان مبارک سے سنا تھا انہوں نے
بغداد سے خراسان کا سفر اختیار کیا اور خراسان جا کر اس حدیث کا ایک واسطہ کم ہو گیا اور یہ حدیث
انہوں نے اختیار کی۔

آپ نے حضرت زر بن حبیش کا نام سنا ہوگا۔ زر بن حبیش ایک مشہور تابعی ہیں۔
قرات کے فن میں بہت بڑے امام ہیں۔ حضرت ابی بن کعبؓ کے خصوصی تلامذہ میں سے ہیں۔
حضرت ابی بن کعبؓ وہ صحابی ہیں جن کو حضورؐ نے یہ اعزاز عطا فرمایا کہ آپؐ کے بارے میں یہ
گواہی دی کہ اقرؤھم ابی۔ میرے صحابہ میں سب سے اچھے قاری اور سب سے اچھا قرآن پڑھنے
والے ابی بن کعبؓ ہیں۔ حضرت ابی بن کعبؓ قرآن فہمی اور قرآن خوانی میں سب صحابہ کرامؓ میں
ممتاز تھے۔ جتنے قرات اور تجوید کے سلسلے ہیں وہ سارے کے سارے یا اکثر و بیشتر حضرت ابی بن
کعب تک پہنچتے ہیں۔ جو بڑے بڑے قرا ہیں، جو قراء سبعہ کہلاتے ہیں ان میں سے بیشتر کی
روایت حضرت ابی بن کعب تک پہنچتی ہے۔ ان کے شاگردوں میں بڑا نمایاں نام حضرت زر بن
حبیش کا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں حضرت عثمان بن عفان کی خلافت کے زمانے میں کوفہ سے مدینہ
منورہ آیا اور اس پورے سفر کا مقصد صرف حضرت ابی بن کعبؓ سے ملاقات اور دوسرے صحابہ کرامؓ
کی زیارت تھی۔ وانما حملنی علی الافادة اور مجھے اس لمبے سفر پر آمادہ کیا لقی ابی بن
کعب۔ ابی بن کعب کی ملاقات نے، اس کے علاوہ میرا کوئی اور مقصد نہیں تھا۔

حضرت ابو العالیہ جن کا ابھی میں نے ذکر کیا، وہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ یعنی تابعی
حضرات کسی شیخ حدیث سے ملاقات کے لئے کئی کئی روز کا سفر کر کے پہنچتے تھے، یا تو کسی حدیث کی
تحقیق کی خاطر، یا سابقہ حدیث کی سند کو مزید بہتر بنانے کی خاطر، یا ایک نئے طریقے کا اضافہ
کرنے کی خاطر، یا کسی راوی کے کردار اور حافظہ کی تحقیق کی خاطر۔ سفر کرنے کے بعد جب ہم
منزل پر پہنچتے تھے تو سب سے پہلے ہم یہ دیکھتے تھے کہ ان کے ہاں نماز کا اہتمام کتنا ہے۔ اگر وہ نماز
کا اہتمام مکمل طور پر کرتے تھے تو ہم وہاں ٹھہر کر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور حدیث کے
بارے میں جو کچھ ہوتا تھا وہ سیکھ لیتے تھے۔ اور اگر یہ دیکھتے تھے کہ نماز میں کمزوری پائی جاتی ہے تو
ہم الٹے پاؤں واپس آ جاتے تھے اور ان سے نہیں ملتے تھے اور ہمارا یہ خیال تھا کہ جو نماز سے

بارے میں اہتمام نہیں کرتا اور نمازوں کو ضائع کرتا ہے وہ باقی چیزوں کو بھی ضائع کرتا ہوگا۔

ایک اور مثال ہیں جن کا شمار تبع تابعین یا صغار تابعین میں ہے، زید بن الحباب، یا تبع تابعین میں سے ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ مجھے ایک روایت ملی جس کے بارے میں پتہ چلا کہ اس کو تین بزرگوں نے روایت کیا ہے۔ ایک روایت کے راوی کوفہ میں، دوسری روایت کے راوی مدینہ میں اور تیسری روایت کے راوی مصر میں ہیں۔ میں پہلے کوفہ گیا۔ وہاں شیخ سے مل کر اس کی تصدیق کی اور ان سے روایت کو حاصل کیا۔ اس کے بعد دوسرا سفر میں نے مدینہ منورہ کا اختیار کیا۔ مدینہ منورہ میں جو شیخ تھے ان سے اس روایت کو لیا اور وہاں سے مصر پہنچا تو معلوم ہوا کہ جن سے ملنا ہے انہوں نے ان سے ملاقات کے اوقات مقرر کیے ہیں اور ان مقررہ اوقات کے علاوہ وہ کسی سے نہیں ملتے۔ فعلست علی بابه، میں ان کے دروازے پر بیٹھ گیا۔ جب وہ باہر نکلے تو انہوں نے دیکھا کہ ایک آدمی دروازے پر بیٹھا ہوا ہے۔ پوچھا کہ کس لئے آئے ہو، بتایا کہ اس غرض سے آیا ہوں۔ انہوں نے حدیث پڑھ کر سنائی اور حدیث کے الفاظ کو verify کیا کہ یہی الفاظ تھے: فرق ما بین صیامنا و صیام اهل الکتاب أکلة السحر، کہ ہمارے اور اہل کتاب کے روزوں میں ایک اہم فرق ہے وہ سحری کا ہے۔ اہل کتاب جب روزہ رکھتے ہیں تو سحری نہیں کھاتے اور ہم جب روزہ رکھتے ہیں تو سحری کھا کر رکھتے ہیں۔

اس روایت کے ان الفاظ کے تعین اور تیقن کے لئے انہوں نے تین بڑے شہروں کا سفر اختیار کیا۔ اس میں کتنا وقت لگا ہوگا، کتنے پیسے لگے ہوں گے، کتنے وسائل خرچ ہوئے ہوں گے، اس کا ہم صرف اندازہ ہی کر سکتے ہیں۔ یقین سے تو نہیں کہہ سکتے۔ افسوس کہ کسی محدث نے اپنا حساب کتاب لکھ کے نہیں چھوڑا، ورنہ ہمیں شاید یہ بھی پتہ چلتا کہ راستے میں کتنا خرچ ہوا، کتنی منزلیں آئیں اور کہاں کہاں ٹھہرے۔ وہ اس کام کو صرف اللہ کے لئے کرنا چاہتے تھے، اس لئے انہوں نے شاید اپنا حساب نہیں رکھا۔ اگر حساب کسی نے لکھا ہوتا تو آج شاید اس بہن کے سوال کا جواب بھی مل جاتا جنہوں نے پوچھا تھا کہ ان کے اخراجات کیسے اور کہاں سے پورے ہوتے تھے۔

جن حضرات نے علم حدیث سیکھنے اور سکھانے کے آداب پر کتابیں لکھی ہیں ان میں طلبہ کے آداب پر بھی کتابیں لکھی ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا تھا کہ جب جی چاہا منہ اٹھا کر چل پڑے اور جب جی چاہا واپس آگئے بلکہ پورے آداب اور قواعد کی پابندی لازمی سمجھی جاتی تھی۔

خطیب بغدادی کی ایک کتاب ہے جس کا نام [illegible] ہے اور ایک دوسری کتاب ہے الرحلة فی طلب الحدیث۔ اس میں خطیب بغدادی نے بہت سے قواعد و ضوابط بیان کئے ہیں کہ علم حدیث کے طالب علم کو کن آداب اور قواعد کی پابندی کرنی چاہئے۔ ایک اور کتاب ہے الجامع فی اخلاق الراوی و آداب السامع۔ یہ کتاب دو جلدوں میں ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ راوی کے اخلاق کیسے ہونے چاہئیں اور جو حدیث سننے والا ہے یعنی روایت کرنے والا ہے اس کو کن آداب کی پابندی کرنی چاہئے۔ یہ کتاب دو ضخیم جلدوں میں ہے جس میں ایک ایک مرحلہ کے آداب الگ الگ تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ ان میں بعض کا ذکر علوم حدیث کے باب میں ہوگا۔ اسی طرح سے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جب راوی شیخ کی خدمت میں جا کر بیٹھے تو اس بیٹھنے کے آداب کیا ہوں۔ اس پر ایک الگ کتاب بھی ہے جس کا نام ہے [illegible] ـــــــــ الاستملاء، املاء اور استملاء کے آداب۔

جیسا کہ میں نے بتایا کہ جب ہزاروں لوگ بیک وقت موجود ہوتے تھے تو شیخ کی حدیث کا ایک جملہ پڑھتے تھے تو آگے مستملی بیٹھا ہوتا تھا وہ اس کو بلند آواز سے دہراتا تھا۔ پھر آگے ایک اور مستملی بیٹھا ہوتا تھا وہ پھر بلند آواز سے دہراتا تھا۔ یہاں تک کہ تمام حاضرین تک بات پہنچ جاتی۔ اس کے آداب کیا تھے اس پر بھی کتابیں موجود ہیں۔

علم حدیث کے لئے سفر کے آداب

اختصار کے ساتھ رحلہ کے جو آداب بیان کئے گئے ہیں وہ یہ ہیں۔

(1) سب سے پہلا ادب یہ بیان کیا گیا ہے کہ طالب علم سب سے پہلے اپنے شہر کے علمائے حدیث سے علم حدیث حاصل کیا جائے۔ اپنے شہر کے اساتذہ کے پاس جو ذخیرہ علم ہے اس کو چھوڑ کر دور کا سفر اختیار کرنا اس نعمت کی ناقدری ہوگی۔ علم حدیث اگر اپنے شہر میں دستیاب ہے تو جتنا ذخیرہ وہاں دستیاب ہے پہلے اس کو حاصل کیا جائے۔ اس کے بعد دور کا

سفر اختیار کیا جائے۔ یہ حدیث رسول ﷺ کے ادب و احترام کے خلاف سمجھا گیا کہ قریب کے محدثین وغیرہ کو نظر انداز کر کے دوسرے کسی علاقے میں دستیاب ذخیرہ کو حاصل کرنے کے لئے سفر شروع کیا جائے۔

(۲) دوسرا ادب یہ تھا کہ جب اپنے علاقے میں حدیث کے ذخیرہ حدیث کے مشائخ سے پورے کا پورا علم حاصل کر لیا جائے اور دوسرے کسی علاقے کا سفر اختیار کیا جائے تو جلد کے تعین اور ترتیب میں احتیاط سے کام لیا جائے۔ یہ دیکھا جائے کہ زیادہ بڑا ذخیرہ کہاں دستیاب ہے۔ مشائخ کس علاقہ میں بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ حدیث کے ذخیرے زیادہ جس علاقے کے مشائخ کے پاس زیادہ ہیں۔ پہلے اس کو منتخب کیا جائے۔ اس کے بعد بتدریج جس علاقہ میں حدیث کی روایات جتنی زیادہ ہوں اس علاقہ کا سفر پہلے اختیار کیا جائے۔

(۳) تیسرا ادب بڑا دلچسپ اور اہم ہے کہ جب سفر اختیار کیا جائے اور کسی علاقہ میں جا کر وہاں کے مشائخ کی خدمت میں حاضری دی جائے تو کثیر روایات پر زور دیا جائے۔ کثیر مشائخ پر زور نہ دیا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس راوی کے پاس شیوخ کی تعداد زیادہ ہوتی تھی اس کو زیادہ شہرت ملتی تھی اور اس کی عزت زیادہ ہوتی تھی کہ فلاں نے بہت بڑے اساتذہ سے علم سیکھا ہے۔ فلاں محدث نے دو ہزار اساتذہ سے علم سیکھا ہے۔ تو یہ شہرت اپنے بارے میں قائم کرنا اور لوگوں میں ایک جذبہ پیدا کرنا پیدا ہو رہا تھا۔ یہ اخلاص کے خلاف تھا اور اس سیرت کے خلاف تھا جو ایک ایسے صاحب علم میں ہونا چاہئے جو صرف اللہ کی رضا کی خاطر حدیث کو حاصل کرتا ہو اور اس کا مقصد دنیاوی شہرت حاصل کرنا نہ ہو۔ اس لئے روایات کی تعداد بڑھانے پر زور دیا گیا بہ نسبت شیوخ کی تعداد بڑھانے کے۔ مثلاً اگر ایک حدیث کے بارے میں بیس روایات ایک شیخ کے پاس ہیں تو بہتر یہ ہے کہ بیس روایات اسی شیخ سے حاصل کی جائیں بہ نسبت اس کے کہ بیس شیوخ سے ایک ایک روایت حاصل کی جائے۔

(۴) چوتھا ادب یہ تھا کہ روایات پر جب عبور حاصل ہو جائے تو پھر دقت نظر اور اس علاقے کے محقق اہل علم کے ساتھ تعلق پیدا کیا جائے۔ جو احادیث آپ نے لکھی ہیں اور جو کسی اور راوی سے سیکھی ہیں تو اب دونوں راوی ان کا مذاکرہ کریں۔ وہ آپ کو پڑھ کر سنائیں آپ ان کو پڑھ کر سنائیں۔ جو مطلب انہوں نے سمجھا وہ آپ سے بیان کریں اور جو آپ نے سمجھا ہے آپ ان سے

بیان کریں۔ راویوں کے بارے میں جو معلومات آپ کو ملی ہیں وہ آپ ان سے بیان کریں اور جو اُن کو ملی ہیں وہ آپ سے بیان کریں تاکہ ایک دوسرے کا علم پختہ ہو اور اس میں مزید علم اور نکتے سامنے آئیں اور دونوں کا علم کمال تک پہنچ جائے۔

(۵) پانچواں ادب یہ تھا کہ جب سفر اختیار کیا جائے تو شریعت میں سفر کے جو آداب بیان ہوئے ہیں ان کا لحاظ رکھا جائے۔ سفر کے بہت سے آداب ہیں۔ جن کا علم حدیث کے موضوع سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن ان آداب کی پابندی جب ہر سفر میں ضروری ہے تو طلب حدیث کے لئے کئے جانے والے سفر میں بطریق اولیٰ ان آداب کی پابندی ہونی چاہئے۔ چنانچہ جب سفر اختیار کیا جائے تو اللہ کی رضا مقصود ہونی چاہئے۔ دنیاوی شہرت مقصود نہیں ہونی چاہئے۔ صرف رسول اللہ کی احادیث کا تحفظ اور بقا مقصود ہو کوئی مادی منفعت مقصود نہ ہو۔ جس پیسے سے سفر اختیار کیا جائے وہ جائز پیسہ ہو اور اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ ہو۔ جو ہمراہی اختیار کئے جائیں وہ متقی اور پرہیزگار لوگ ہوں۔ اگر ایک سے زیادہ آدمی سفر کررہے ہیں تو ایک کو اپنا امیر مقرر کرلیا جائے اور باقی ان کی امارت میں سفر کریں۔ جہاں ٹھہرنا ہو وہ جگہ صاف ستھری ہونی چاہئے۔ حلال وحرام کا خیال رکھیں۔ یہ وہ آداب ہیں جو ہر سفر پر منطبق ہوتے ہیں۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ شریعت میں سفر کے جتنے بھی آداب بیان ہوئے ہیں ان سب کا لحاظ رکھا جائے۔

یہ وہ آداب تھے جن کا تمام راویان حدیث اور محدثین کرام لحاظ رکھتے تھے۔ انہوں نے دور دور کے سفر اختیار کئے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ ایک محدث طویل سفر اختیار کرکے ایک جگہ پہنچے اور پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ جن کی خدمت میں حاضر ہونے آئے ہیں وہ تو انتقال فرما گئے ہیں۔

اس طرح کے حوصلہ شکن واقعات کی ایک بڑی مثال ایک صحابی عبدالرحمن بن عسیلہ صُنابحیؓ کی ہے۔ وہ صحابی تو نہیں ہیں تابعی ہیں۔ صحابہ کے تذکروں میں ان کا نام تبرکاً لکھا جاتا ہے۔ وہ بہت دور سے یمن سے رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہونے۔ نیا نیا اسلام قبول کیا تھا۔ بڑے اشتیاق اور وارفتگی کے ساتھ تیز رفتاری سے یمن سے مدینہ کی طرف آرہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری دیں گے۔ جب مدینہ منورہ تک ایک رات کی مسافت رہ گئی تو کہیں پڑاؤ کیا۔ صبح سویرے اٹھ کر دربار رسالت میں حاضری کی غرض سے نہانے دھونے کا اہتمام کررہے تھے۔ اپنے پاس موجود کپڑوں میں سے بہترین لباس پہن لیا۔ خوشبو لگائی اور دربار رسالت میں حاضری

کے خیال سے خوش ہو رہے تھے۔ ابھی سفر شروع کر رہے تھے کہ مدینہ کی سمت سے کچھ لوگ آتے دکھائی دیئے۔ انہوں نے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو۔ بتایا کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں جا رہا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ہم تو آپ کو رسول اللہ ﷺ کی تدفین سے فارغ ہو کر آ رہے ہیں۔ اب ان پر جو گزری ہوگی اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ اس کی ایک بڑی مثال ہے کہ علم حدیث کے حصول کے لئے کس طرح شوق سے آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہے تھے اور عین وقت پر جا کر پتہ چلا کہ جب لب بام ایک ہاتھ رہ گئی تو کمند ٹوٹ گئی۔

حصول علم حدیث کے لئے محدثین کی قربانیاں

امام اوزاعی جو امام اہل شام کہلاتے ہیں۔ اتنے بڑے امام ہیں کہ ان کا درجہ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کے برابر قرار دیا جاتا ہے۔ علم حدیث میں امام مالک کے برابر کا درجہ رکھتے تھے۔ بیروت میں رہتے تھے جہاں آج بھی ان کا مزار موجود ہے اور جس علاقہ میں ان کا مزار ہے وہ محلہ امام اوزاعی کہلاتا ہے۔ یہ کوفہ اور بصرہ کے سفر کے لئے روانہ ہوئے۔ ارادہ یہ تھا کہ حضرت حسن بصری اور محمد بن سیرین سے علم حدیث کی روایت حاصل کریں گے۔ جب وہاں پہنچے تو پتہ چلا کہ حسن بصری کا تو انتقال ہو گیا ہے اور محمد بن سیرین بیمار ہیں۔ ان کے ہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ بستر پر لیٹے ہوئے ہیں۔ طبیبوں نے آرام کا مشورہ دیا ہے اور لوگوں سے ملنے کی ممانعت کر دی ہے۔ انہوں نے جا کر دیکھا، حضرت سے سلام کیا، عراق میں کچھ دن مقیم رہے تاکہ روز جا کر دیکھتے رہے، چند دن بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا اور یہ بغیر کچھ حاصل کئے بیروت واپس چلے گئے۔ یہ اس طرح کی بے شمار مثالوں میں سے صرف چند ایک ہیں۔ ایک تابعی کی مثال ہے جو صحابی بنتے بنتے رہ گئے اور ایک بڑے مشہور تابعی کی جو بیک وقت محدث اور فقیہ دونوں تھے۔

ابن ابی حاتم رازی جو بہت مشہور ہیں اور جن کا میں پہلے بھی کئی بار تذکرہ کر چکا ہوں۔ ان کی کتاب علل الحدیث بڑی مشہور ہے۔ یہ رے کے رہنے والے تھے جو موجودہ تہران کے قریب واقع تھا۔ اب یا تو ختم ہو گیا یا تہران کا حصہ بن گیا۔ وہاں سے یہ سفر کر کے بصرہ پہنچے اور وہاں کے کچھ شیوخ حدیث سے کسب فیض کے لئے وہاں کچھ دن مقیم رہے۔ ایک سال کی نیت سے بصرہ پہنچے تھے۔ آٹھ ماہ میں جمع پونجی ختم ہو گئی۔ اب کسی سے مانگنا انہوں نے اپنی شان

دو مسافروں کو اپنے قافلے میں لے جایا کرتے تھے۔ علامہ مقدسی سے پیسے لیے تو راستے میں ختم ہو گئے۔ جس منزل تک انہوں نے پیسے دیے تھے وہ منزل آ گئی تو انہوں نے کہا کہ اب ہم آپ کو آگے نہیں لے جائے اور انہیں راستے میں چھوڑ دیا۔ محمد بن طاہر نے سوچا کہ چلو اب جو صورت بنا گا۔ یہ پیدل ہی روانہ ہو گئے۔ اگر بیت المقدس اور بغداد کے درمیان کا راستہ آپ کے سامنے ہو تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ایک بہت بڑا صحرا راستے میں آتا ہے جو بڑا مشکل اور دشوار گزار ہے۔ یہ گھوڑے اور اونٹ کی پشت پر بھی بہت کم لوگ اس کو عبور کر پاتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں نے اپنی پشت پر کتابیں لادیں اور پیدل چل پڑا۔ چلتے چلتے جوتے گھس کر پھٹ گئے تو ننگے پاؤں چلنا پڑا۔ گرمی کا زمانہ تھا اوپر سے جلتی ہوئی دھوپ اور نیچے سے تپتا ہوا صحرا۔ پیسے نہیں تھے تو کھانے پینے کا انتظام بھی ختم ہو گیا۔ پشت پر کتابوں اور کاغذات کا بوجھ۔ طبیعت اتنی خراب ہوئی کہ خون کا پیشاب آنے لگا۔ ان تمام تکالیف کے باوجود بغداد پہنچ گئے۔ اس وقت گزارا مزدوری کرکے کچھ پیسے کمائے اور کام کرتے آگے۔ مکہ مکرمہ میں بھی یہی کیفیت ہوئی وہاں بھی مزدوری کرکے کچھ پیسے کمائے اور پھر اپنے وطن واپس پہنچ گئے۔

امام ابو نصر عبیداللہ سجزی ایک اور محدث ہیں۔ ان کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ طوف فی الآفاق انہوں نے کائنات کے چکر لگائے۔ آفاق زمین کے کونوں کے چکر لگائے اور اسی چکر میں وہ مختلف جگہوں پر گئے تھے۔ ہوتے ہوتے کسی شہر میں جا نکلے۔ وہاں پر کہ شہرت ہوئی کہ علم حدیث کے بڑے ماہر آئے ہیں۔ لوگ ان سے علم حدیث حاصل کرتے تھے۔ یہ لوگوں سے حاصل کرتے تھے۔ رات کو مزدوری کرتے تھے اور دن میں کسب علم کرتے تھے۔ کوئی خاتون بیچاری بہت غریب تھی اور بڑے اچھے خاندان کی تھی۔ اس نے دیکھا کہ یہ عالم ہیں، محدث ہیں۔ حدیث پڑھاتے ہیں۔ رات کو مزدوری کرتے ہیں۔ تعلیم حاصل بھی کرتے ہیں اور کرتے بھی ہیں۔ وہ ایک مرتبہ ان کے گھر گئی جس میں یہ شاگرد موجود تھے۔ خاتون نے دروازہ پر دستک دی۔ شاگرد نے دروازہ کھول کر دیکھا تو اطلاع دی کہ ایک خاتون آئی ہوئی ہے۔ انہوں نے پوچھا کیا کام ہے؟ اس نے ایک تھیلی دی کہ یہ میں آپ کے لیے لے کر آئی ہوں۔ اس میں ایک ہزار دینار ہیں۔ کہا کہ میں آپ سے شادی کرنا چاہتی ہوں اور صرف آپ کی خدمت کرنے کے لیے ایسا کرنا چاہتی ہوں۔ میرا اور کوئی مقصد یا کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کا محرم

بن کر آپ کی خدمت کرنا چاہتی ہوں۔ اس پیسے سے آپ اپنا گزارہ کریں اور علم حدیث کے لئے اپنا وقت لگائیں۔ یہ پیسہ اور میری خدمات آپ کے لئے حاضر ہیں۔ انہوں نے کہا کہ بی بی تمہارا بہت بہت شکریہ، لیکن میں نے یہ طے کیا تھا کہ میں صرف اللہ کے لئے علم حاصل کروں گا۔ صرف اللہ ہی سے اس کا اجر مقصود ہے۔ میں دنیا میں کوئی اجر نہیں چاہتا، لہٰذا مجھے تمہاری خدمت اور پیسوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے، تمہاری اس پیشکش کا بہت شکریہ۔ جو کچھ یہ گزر رہی ہے یہ گزر جائے گی اور مجھے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے اجر ملے گا۔

علامہ ابو حاتم الرازی علم حدیث کے بہت بڑے امام تھے۔ ان کے صاحبزادے بھی علم حدیث اور فن طبقات، جرح وتعدیل کے بہت بڑے امام ہیں جو ابن ابی حاتم الرازی کہلاتے ہیں اور نام ان کا عبدالرحمٰن ہے۔ ان کا یہ واقعہ میں خطیب بغدادی کی اس کتاب 'الرحلۃ فی طلب الحدیث' سے پڑھ کر سناتا ہوں۔ وہ کہتے ہیں میں نے اپنے والد کو یہ ارشاد فرماتے سنا کہ جب میں پہلی مرتبہ طلب حدیث کے لئے نکلا تو میں سات سال سفر میں رہا۔ میں جتنا پیدل چلتا تھا میں اس کو شمار کرتا جاتا تھا، جب ایک ہزار فرسخ سے زیادہ ہو گیا۔ (اور جن صاحب نے یہ کتاب ایڈٹ کی ہے وہ بھی بڑے عالم ہیں، انہوں نے حاشیہ میں لکھا ہے کہ ایک فرسخ موجودہ پانچ کلومیٹر سے تھوڑا زیادہ ہوتا تھا۔) جب میں نے ایک ہزار فرسخ کا سفر پیدل طے کر لیا یعنی ساڑھے پانچ ہزار کلومیٹر کے لگ بھگ چل لیا تو اس کے بعد میں نے گننا چھوڑ دیا۔ لیکن جو میں چلا وہ یہ تھا کہ کوفہ اور بغداد کے درمیان جو سفر میں نے کیا مجھے یاد نہیں کہ کتنی مرتبہ کیا۔ جب کوفہ میں سنا کہ کوئی محدث آیا ہے تو کوفہ چلا گیا، پھر سنا کہ کوئی محدث بغداد آ گیا ہے تو میں بھی بغداد چلا گیا۔ اور مکہ اور مدینہ کے درمیان بہت مرتبہ اور بحرین (جو مشرقی سعودی عرب کے قریب ہے وہاں) سے جو صلا شہر کے قریب تھا مصر گیا۔ اس وقت ہوائی جہاز میں تین گھنٹے لگتے ہیں۔ اور مصر سے رملہ، موجودہ فلسطین کی جو اقتاری ہے اس کے دارالحکومت رملہ میں، جس کو اخبار والے رام اللہ کہتے ہیں۔ اور رملہ سے بیت المقدس پیدل گیا اور بیت المقدس سے عسقلان اور رملہ سے طبریہ جو وہیں کا ایک شہر ہے اور طبریہ سے دمشق اور دمشق سے حمص اور حمص سے انطاکیہ اور انطاکیہ سے طرسوس، یہ بھی شام کا ایک شہر ہے، پھر طرسوس سے حمص واپس آیا اور ابو الیمان جو ایک مشہور محدث تھے ان کی احادیث میں سے کچھ چیزیں رہ گئی تھیں وہ میں نے حمص سے حاصل کیں، پھر حمص سے بیسان پیدل آیا، جو

کیا شب برات کی فضیلت میں کیا احادیث ضعیف ہیں؟

بھئی شب برات کو چھوڑ دیجئے، جو آپ کا جی چاہے وہ کر لیجئے۔ ایک اصولی بات میں عرض کرنا چاہتا ہوں اس کو آئندہ بھی یاد رکھیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ کچھ احادیث ہیں جو قطعی الثبوت ہیں، کچھ احادیث ظنی الثبوت ہیں۔ ظنی الثبوت وہ ہیں جن کے حدیث صحیح ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ وہ اکثر خبر واحد یا اخبار آحاد ہیں۔ ان میں شروع سے علماء اور محدثین کے درمیان اختلاف رہا ہے۔ ایک محدث ایک حدیث کو ثابت شدہ مانتے ہیں، ان کی نظر میں وہ صحیح ہے۔ دوسرے محدث اپنی تحقیق میں اس کو ضعیف مانتے ہیں۔ ان کی نظر میں وہ ضعیف ہے۔ جو ضعیف مانتے ہیں وہ اس پر عمل نہیں کرتے، کیونکہ ان کی تحقیق کے مطابق وہ ضعیف ہے۔ جو اپنی تحقیق میں اس کو صحیح سمجھتے ہیں وہ اس پر عمل کرتے ہیں۔ اس لئے اگر کوئی کسی ضعیف حدیث پر عمل کر رہا ہے تو یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ اور جو کوئی اس پر عمل نہیں کر رہا ہے تو یہ بھی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔

اعتراض یا نکیر صرف وہاں کرنا چاہئے جہاں شریعت کے کسی واضح، قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت حکم کی خلاف ورزی ہو رہی ہو۔ اس لئے اگر کوئی شب براۃ کی احادیث پر عمل کرتا ہے تو آپ کا کیا جاتا ہے، کرنے دیجئے۔ اگر آپ کی تحقیق میں وہ احادیث کمزور ہیں یا ان لوگوں کی تحقیق میں کمزور ہیں جن کے علم پر آپ کو اعتماد ہے تو آپ ان پر عمل نہ کیجئے۔ لیکن اگر کچھ اور لوگ ایسے ہیں جن کی تحقیق پر آپ کو اعتماد نہیں ہے لیکن وہ ان احادیث کو ثابت شدہ سمجھ کر ان پر عمل کر رہے ہیں تو آپ ان پر اعتراض مت کیجئے۔ یہ ایک جزوی سی چیز ہے اس پر زیادہ بحث اور اختلاف کی ضرورت نہیں ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے کہا کہ مجھے نبی کریم ﷺ نے دو باتیں بتائیں کہ اگر میں اس وقت ان میں سے ایک کو لوگوں کے سامنے بیان کر دوں تو میرا قتل مسلمانوں پر واجب ہو جائے اور وہ مجھے قتل کر دیتے۔

یہ نہیں کہا کہ میرا قتل مسلمانوں پر واجب ہو جاتا۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ بہت سی چیزیں میرے علم میں ایسی ہیں کہ اگر میں ان کو کھلم کھلا بیان کر دوں تو شاید لوگ مجھے قتل کر دیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جب علم حدیث یا علم دین بیان کیا جائے تو تدریج اور ترتیب کے ساتھ بیان

کیا جائے۔ دین طرح بیان نہ کیا جائے کہ سننے والے لوگ پہلے ہی مرحلے میں اس کا انکار کردیں۔ آپ پہلے اسلام کے عقائد کو پھر اخلاق پھر تربیت اور تعلیم اور پھر احکام بتائیں۔ یہ وہی چیز ہے جو حضرت عائشہؓ نے فرمائی کہ رسول اللہ ﷺ اگر پہلے ہی دن یہ کہتے کہ شراب نوشی چھوڑ دو تو شاید عرب میں بہت کم لوگ آپؐ کی بات مانتے۔ آپ نے تدریج کے ساتھ پہلے ان کو مکارم اخلاق سکھائے، پھر نماز سکھائی پھر ایک ایک کر کے باقی چیزیں سکھائیں۔ آخر میں کہا کہ شراب نوشی اور فلاں فلاں قسم کے گناہ چھوڑ دو تو لوگوں نے چھوڑ دیئے کیونکہ تربیت ہو چکی تھی۔ یہی بات حضرت ابوہریرہؓ نے کہی کہ میں ایسا علم بھی رکھتا ہوں کہ اگر میں بیان کروں تو شاید لوگ مجھے قتل کر دیں اس لئے کہ ابھی ان کی وہ تربیت نہیں ہوئی اور شاید وہ ان کو سننے کے لئے تیار نہ ہوں۔ اس کے علاوہ اس کا کوئی اور مطلب نہیں ہے اور منکرین حدیث اس سے جو مطلب نکالنا چاہتے ہیں وہ درست نہیں ہے۔

کل آپ نے ڈاکٹر حمید اللہ کی کتاب خطبات بہاولپور کا ذکر کیا اس کا کچھ حصہ میں پڑھ چکی ہوں۔ اس میں انہوں نے بارہ لیکچرز کو بارہ مہینوں سے تشبیہ دی ہے جن کا ذکر قرآن پاک میں ہے۔ میں بھی ان خطبات کو پڑھ رہی ہوں اور مجھے ڈاکٹر حمید اللہ سے ملنے کی خواہش رہتی تھی۔ لیکن یہ بہت زیادہ خوش قسمتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ان بارہ خطبوں سے مستفید ہونے کا موقع دیا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ مجھے بھی ایسا ہی اخلاص عطا فرمائے جو ڈاکٹر حمید اللہ کو عطا فرمایا تھا۔ ان خطبات کا علمی درجہ وہ نہیں ہے جو ڈاکٹر حمید اللہ صاحبؒ کے خطبات کا تھا۔ ان خطبات کے دینے والے کا نہ وہ علمی مقام ہے نہ روحانی نہ اخلاقی جو ڈاکٹر صاحب کا تھا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ان خطبات اور ڈاکٹر صاحب کے خطبات بہاولپور میں ایک اور ایک ہزار کی نسبت بھی نہیں ہے۔ لیکن ایک ادنیٰ مشابہت ضرور ہے کہ وہ بھی بارہ تھے یہ بھی بارہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو قبول فرمائے۔ آمین

کیا آپ انگریزی میں کسی ایسی اچھی کتاب کا نام بتا سکتے ہیں جو علم حدیث کے اہم موضوعات سے متعلق ہو اور اس بارے میں ہماری رہنمائی کر سکے۔

افسوس کہ اس وقت انگریزی میں کوئی ایسی کتاب میرے ذہن میں نہیں ہے۔ لیکن اگر آپ نے ان خطبات کے کچھ حصے انگریزی میں بنائے ہوں تو ان کو ایک ترتیب دے کر ایک اچھی

ذرا ایسے ذہن میں آپ نے ذکر کیے گئے تاکہ سنت کی جانب ذہن کو توجہ دی جائے۔

منکرین حدیث میں دو طرح کے لوگ ہیں۔ کچھ وہ ہیں جن کو واقعی کوئی غلط فہمی ہے۔ ان لوگوں کو کتابیں دی جا سکتی ہیں۔ اس مقصد کے لیے شام کے ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی کی ایک عربی کتاب ہے "السنة ومكانتها في التشريع الاسلامي"۔ اس کے دو اردو تراجم ہیں۔ ایک پروفیسر غلام احمد حریری کا کیا ہوا اور دوسرا ڈاکٹر احمد حسن کا کیا ہوا ہے۔ یہ دونوں ترجمے آپ ان لوگوں کو دے سکتی ہیں۔ ایک ہمارے دوست اور بہت بزرگ اور فاضل دوست مولانا محمد تقی عثمانی کی انگریزی کتاب ہے The Authority of Sunnah۔ یہ آپ منکرین حدیث سے متاثر افراد کو دے سکتی ہیں۔ اسی طرح سے ایک چھوٹی سی کتاب ہے مولانا بدر عالم مہاجر مدنی کی۔ ان کی کتاب کا نام ہے "حجیت حدیث"۔ وہ بھی اس سلسلہ میں مفید ہے۔ تحقیقی اعتبار سے بہترین کتاب Studies in the Early Hadith Literture ہے جو ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی کی ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

نواں خطبہ

نظام حدیث

مورخہ 15 اگست 2003

علوم حدیث

علم حدیث کا آغاز اور ارتقا

آج کی گفتگو کا عنوان ہے علوم حدیث۔ آج تک جتنی بحث ہوئی ہے اس سب کا تعلق ایک اعتبار سے علوم حدیث ہی سے ہے۔ یہ سب موضوعات علوم حدیث ہی کے موضوعات تھے۔ لیکن علوم حدیث پر الگ سے گفتگو کرنے کی ضرورت اس بات پر زور دینے کے لئے پیش آئی کہ جن موضوعات کو علوم حدیث کہتے ہیں وہ ایک بہت بڑی، ایک منفرد اور نئی علمی روایت کے مختلف حصے ہیں۔ یہ روایت مسلمانوں کے علاوہ کسی اور قوم میں کہیں نہیں پائی جاتی۔ علوم وفنون کے اس مجموعہ کو لاتعداد اہل علم نے اپنی زندگیاں قربان کرکے مرتب کیا۔ اور ان تمام موضوعات سے متعلق مواد جمع کیا جس کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے احوال، اقوال اور شخصیت مبارکہ سے تھا۔ انہوں نے اس مواد کی تحقیق کی اور اس کو مرتب انداز اور نت نئے اسالیب میں پیش کیا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ موضوعات پھیلتے گئے۔ ان میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان میں سے ہر جزوی موضوع پر الگ الگ کتابیں لکھی گئیں۔ پھر ان کتابوں کی شرحیں لکھی گئیں، شرحوں کے حواشی لکھے گئے، پھر ان کتابوں کی تلخیصیں تیار ہوئیں۔ مختلف اہل علم نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق ان کتابوں کے ایڈیشنز تیار کئے۔ اس طرح وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ سب علوم نئے نئے عنوانات کے تحت مرتب ہوتے گئے۔ ان سب موضوعات کے مجموعہ کو علوم حدیث کہا جاتا ہے۔ گویا علوم حدیث سے مراد علم وفن کی وہ پوری روایت ہے جس کا محدثین کرام نے

اہتمام کیا۔ وہ اہل علم کی ایک بہت بڑی تعداد، بلکہ اہل علم کی درجنوں نسلوں نے اس مواد کو فراہم کر کے مرتب و منظم کیا، کئی سو سال کے تسلسل کے ساتھ اس کی تہذیب و تنقیح کی۔

علم حدیث کے موضوعات

ان میں سے بعض موضوعات جو نسبتاً زیادہ اہم تھے ان پر گزارشات پیش کی گئیں۔ یہ موضوعات اس اعتبار سے اہمیت رکھتے ہیں کہ ان پر الگ سے ایک دو نہیں بلکہ درجنوں کتابیں لکھی گئیں۔ بعض محدثین نے ان میں اختصاص پیدا کیا اور یوں یہ موضوعات اس اختصاص کا موضوع قرار پائے۔ علم حدیث میں مختلف پہلوؤں سے اس اختصاص سے کام لیا گیا۔ بعض ایسے موضوعات کا ابتدائی، مختصر اور سرسری تعارف آج مقصود ہے۔

معرفت صحابہ

ان میں سب سے اولین موضوع جس کا اختصار کے ساتھ پہلے بھی تذکرہ کیا جا چکا ہے، وہ معرفت الصحابہ ہے۔ سب سے پہلے صحابہ کرامؓ کی نشاندہی، پھر ان کی سیرت و سوانح کی تدوین ایک ایسا بڑا موضوع ہے جس سے واقفیت کسی بھی حدیث کا درجہ متعین کرنے کے لئے ضروری ہے۔ کسی حدیث کا کیا مقام و مرتبہ ہے، اس کا تعین کرنے میں علم معرفت صحابہ کا بنیادی کردار ہے۔ اگر کوئی روایت کسی صحابیؓ سے مروی ہے اور صحابیؓ تک سند مکمل اتصال اور تسلسل کے ساتھ پہنچ جاتی ہے تو پھر اس حدیث کا درجہ یقیناً زیادہ ہوگا۔ لیکن اگر اس حدیث کی سند اس صحابیؓ تک نہیں پہنچتی تو پھر ظاہر ہے کہ اس کا درجہ وہ نہیں ہوگا جو صحابیؓ کی روایت کا ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے جس سے حدیث کا ہر طالب علم فوری طور پر اتفاق کرے گا۔ مشکل وہاں پیش آتی ہے جہاں کسی شخصیت کے صحابیؓ ہونے یا نہ ہونے میں اختلاف ہو، یا اس کے صحابیؓ ہونے یا تابعی ہونے کے بارے میں دو مختلف رائے پائی جاتی ہوں۔ دوسری مشکل وہاں پیش آئے گی جب کسی صحابیؓ کے سن وفات میں اختلاف ہوگا۔

اس تعین کی ضرورت اس لئے پیش آتی ہے کہ اگر کوئی تابعی یہ بیان کریں کہ انہوں نے فلاں صحابیؓ سے یہ حدیث سنی اور صحابیؓ کا انتقال ایک خاص سن میں ہو جانا متعین ہو چکا ہو تو پھر یہ تعین کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ ان تابعی کی ملاقات ان صحابیؓ سے ہوئی تھی کہ نہیں۔ مثال کے طور پر

ایک صاحب نے سن 195ھ میں ایک حدیث بیان کی اور دعویٰ کیا کہ انہوں نے ایک صحابیؓ سے اس حدیث کو سنا ہے۔ وہاں ایک بڑے محدث بھی موجود تھے۔ انہوں نے پوچھا کہ حضرت آپ کی عمر کیا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ میری عمر 115 یا 120 سال ہے۔ ان محدث نے فوراً بتادیا کہ آپ کے دعوے کے مطابق اگر آپ کی عمر 120 سال بھی مان لی جائے تو بھی آپ کی پیدائش سے پانچ سال پہلے ان صحابیؓ کا انتقال ہو چکا تھا جن سے آپ روایت بیان کر رہے ہیں۔

یہ جو تحقیق کی جاتی ہے اور فوری طور پر اس بات کا تعین حاصل کر لیا جاتا ہے کہ کسی تابعی کو کسی صحابیؓ سے تلمذ حاصل ہے کہ نہیں، یا کسی تابعی نے کسی صحابیؓ سے کسبِ فیض کیا ہے کہ نہیں، اس کا دارومدار بڑی حد تک اس بات پر ہے کہ صحابہ کرامؓ کے بارے میں معلومات مکمل، یقینی اور واضح طور پر ہمارے پاس موجود ہوں۔

صحابی کی تعریف

ائمہ حدیث کے نزدیک صحابیؓ کی بالاتفاق تعریف یہ ہے کہ صحابی وہ خوش نصیب شخصیت ہیں جنہوں نے حالت ایمان میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زیارت کی ہو اور آپ کو دیکھا ہو۔ چاہے یہ سعادت کتنے ہی تھوڑے اور مختصر وقت کے لئے حاصل ہوئی ہو، لیکن اگر یہ سعادت حالت ایمان میں حاصل ہوئی اور وہ صاحب حالت ایمان میں زندہ رہے اور اسی حالت ایمان میں وفات پا گئے تو وہ صحابیؓ شمار ہوں گے۔ اس میں چھوٹا سا مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ کچھ لوگ ایسے بدنصیب بھی تھے جو رسول ﷺ کے زمانہ مبارک میں اسلام لائے اور آپ کی زیارت سے مشرف ہوئے لیکن آپ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد کسی غلط صحبت یا کسی غلط فہمی یا کسی دوسری گمراہی کی وجہ سے اسلام سے پھر گئے۔ کسی مدعی نبوت کے ساتھ ہو گئے اور خدانخواستہ اسی حالت میں مر گئے۔ ایسے لوگوں کے صحابی ہونے کا تو کوئی سوال نہیں۔ کیونکہ مسلمان کی حیثیت سے اور اسلام کی حالت میں وفات نہیں ہوئی۔ لیکن ان لوگوں میں بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جو بعد میں اللہ کی توفیق سے دوبارہ مسلمان ہو گئے، وہ بھی صحابیؓ نہیں کہلائیں گے۔ اگرچہ انہوں نے حالت ایمان میں حضورؐ کی زیارت کی اور حالت ایمان ہی میں وفات پائی، لیکن چونکہ حالت ایمان کا تسلسل قائم نہیں رہا اس لئے وہ صحابیت کے شرف سے خارج ہو گئے۔

لیکن بعض کا خیال ہے کہ ایسے لوگوں کو بھی صحابی کہا جائے گا۔ مجھ کو خیال ہے کہ نہیں کہا جائے گا۔ محدثین کا عام رجحان یہ ہے کہ ایسا کوئی شخص صحابی نہیں کہا جا سکے گا جو حالت ایمان پر قائم نہ رہا ہو اور درمیان میں کسی گمراہی، کفر یا شرک کا وقفہ آ گیا ہو۔

شرف صحابیت کے حصول میں نہ تو بالغ ہونا شرط ہے اور نہ روایت کرنا شرط ہے۔ کسی نے رسول اللہ ﷺ سے کوئی روایت نہیں کی، صرف آپ کو دیکھا تو ان کو بھی شرف صحابیت حاصل ہے اور کئی ایسے لوگ ہیں کہ ان کو معاملات، احادیث، احکام اور شریعت کی بہت زیادہ سمجھ بوجھ بھی نہ تھی لیکن یہ بات کہ چونکہ انہوں نے بچپن میں حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی زیارت کی تھی، تو وہ بھی شرف صحابیت سے مشرف مانے جائیں گے۔ ایسے بہت سے حضرات ہیں جو حضور ﷺ کی رحلت کے وقت بہت کم عمر تھے۔ حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت محمود بن لبید، حضرت ابوطفیل عامر بن واثلہ اور ان کے علاوہ بھی ایسے کئی حضرات ہیں جو بہت بچے تھے اور پانچ، چھ یا سات سال کی عمر میں انہوں نے حضور کو دیکھا اور بعد میں وہ کچھ یادداشتیں جو ان کے ذہن میں تھیں وہ بھی ان کو بیان کرنے لگے۔ یہ شرف صحابیت کے لیے کافی ہے۔

صحابی کی تعریف اور تعیین کے بارے میں محدثین اور علمائے اصول میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔ علمائے اصول یعنی اصول فقہ کے علما صحابی کی تعریف کچھ اور کرتے ہیں۔ میں اس کو چھوڑ دیتا ہوں، البتہ محدثین کے نزدیک صحابی کی تعریف وہ ہے جو میں نے ابھی بیان کر دی۔

صحابہ کرامؓ کی اس تعریف میں یکسانیت کے باوجود صحابہ کے درجات میں فرق ہے۔ بعض صحابہ کو بعض صحابہ پر فوقیت حاصل ہے جس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ صحابہ پر بات کرتے وقت دو چیزیں الگ الگ شمار ہوں گی۔ ایک صحابہ کے طبقات ہوں گے اور دوسری صحابہ کی فضیلت کے معیارات ہوں گے۔ طبقات صحابہ سے مراد ہے صحابہ کرامؓ کی زمانی اعتبار سے تقسیم کہ کن صحابہ کی کتنی عمر ہوئی اور محدثین نے زمانوں کے لحاظ سے ان کو کتنے طبقات میں تقسیم کیا۔ یہ ایک الگ چیز ہے جو ابھی آئے گی۔

فضیلت کے لحاظ سے صحابہ کے درجات

جہاں تک صحابہ کے فضائل کا تعلق ہے تو اس اعتبار سے صحابہ کرامؓ کے مختلف درجات

ہیں۔ سب سے پہلا درجہ جس کی قرآن مجید سے تائید ہوتی ہے اور قرآن مجید میں کئی مرتبہ اس کا ذکر بھی آیا ہے وہ السابقون الاولون ہے۔ اس سے مراد وہ صحابہ ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی تبلیغ دین کے ابتدائی تین سالوں کے دوران اسلام میں داخل ہوئے۔ ابتدائی تین یا چار سال میں جب رسول اللہ ﷺ نے صرف مکہ مکرمہ تک محدود رکھا اور مکہ مکرمہ میں بھی اپنے قریبی رشتہ دار احباب تک اپنی دعوت کو پہنچایا، اور وہ لوگ اسلام میں داخل ہوئے جو حضور ﷺ سے بالواسطہ یا بلا واسطہ قبائلی رشتہ کی وجہ سے یا خونی رشتہ داری کی وجہ سے وابستہ تھے۔ یہ حضرات السابقون الاولون کہلاتے ہیں۔ ان میں خلفائے اربعہ، سیدنا زید بن حارثہؓ، حضرت خدیجہ الکبریٰؓ اور وہ تمام صحابہ جو ابتدائے اسلام کے چند سالوں میں اسلام میں داخل ہوئے، شامل ہیں۔ یہ تقسیم امام حاکم نے کی ہے جن کی کتاب معرفت علوم الحدیث بڑی مشہور ہے۔ بقیہ محدثین بھی قریب قریب اس سے اتفاق کرتے ہیں۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اسلام کی دعوت شروع کی اس وقت سے لے کر جب تک آپ نے اعلیٰ طور پر دار الندوہ میں، جو قریش کا ایک طرح سے اسمبلی ہال تھا، وہاں جا کر علی الاعلان دعوت نہیں دی، اس وقت تک جو لوگ اسلام میں داخل ہوئے وہ السابقون الاولون کہلاتے ہیں۔

جب سیدنا عمر فاروقؓ نے اسلام قبول کر لیا اور ان کے قبول اسلام کے ذریعے اللہ نے اسلام اور مسلمانوں کو قوت عطا فرمائی تو حضرت عمر فاروقؓ کی تجویز پر رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام کو لے کر نکلے اور دار الندوہ میں یعنی قریش کے مرکز میں جا کر علی الاعلان اسلام کا کلمہ بلند کیا۔ اس مرحلہ پر بہت سے لوگ جو مسلمان ہوئے وہ اور جو بعد میں مسلمان ہوئے، وہ صحابیت کے دوسرے درجہ پر فائز کہلاتے ہیں اور ان کے لئے امام حاکم نے اصحاب دار الندوہ کی اصطلاح رکھی ہے۔ یعنی وہ صحابہ کرام جو دار الندوہ میں دعوت کے نتیجہ میں یا اس کے بعد مسلمان ہوئے۔

صحابہ کرام میں تیسرا درجہ ان حضرات کا ہے جنہوں نے حبشہ کی طرف ہجرت فرمائی یا اس ہجرت کے دوران اسلام میں داخل ہوئے۔ یہ زمانہ ہجرت حبشہ سے لے کر ہجرت مدینہ تک چلتا ہے جب رسول اللہ ﷺ نے خود مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔

اس کے بعد انصار مدینہ میں ان خوش نصیبوں کا درجہ ہے جو بیعت عقبہ اولیٰ میں شامل رہے۔ یہ گویا انصار کے سابقون الاولون ہیں۔ انصار میں سابقین الاولین وہ حضرات ہیں جو پہلی

بیعت عقبہ میں شامل رہے۔ اس کے بعد وہ حضرات جو دوسری بیعت عقبہ میں شامل رہے۔

بیعت عقبہ کے بارے میں بعض سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ دو مرتبہ ہوئی اور بعض نے لکھا ہے کہ تین مرتبہ ہوئی۔ ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ یہ صرف اصطلاح کا فرق ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عقبہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ سے مدینہ منورہ کے تین مختلف وفود کی ملاقات تین مرتبہ ہوئی۔ پہلی مرتبہ چھ حضرات سے ملاقات ہوئی۔ اس میں کوئی باقاعدہ معاہدہ یا اتفاق رائے نہیں ہوا کہ رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے جائیں یا مدینہ منورہ میں اسلام کی دعوت کے کام کو باقاعدہ کیسے مرتب کیا جائے۔ بعض سیرت نگار حضرات نے اس کو بیعت کا نام نہیں دیا۔ لہٰذا وہ اس کو بیعت عقبہ اولیٰ قرار نہیں دیتے۔ وہ دوسری بیعت عقبہ کو بیعت عقبہ اولیٰ اور تیسری کو بیعت عقبہ ثانیہ قرار دیتے ہیں۔ کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ اس موقع پر عقبہ کے مقام پر رسول اللہ ﷺ اور مدینہ کے چھ لوگوں کے درمیان باقاعدہ ملاقات ہوئی تھی۔ چھ صحابہ کرامؓ مدینہ منورہ سے وہاں تشریف لائے تھے اور انہی سے مدینہ منورہ میں دعوت اسلامی کا آغاز ہوا۔ اس لئے یہ پہلی بیعت عقبہ ہے۔ اور جو بیعت دوسرے اہل علم کے نزدیک پہلی بیعت کہلاتی ہے وہ ان حضرات کے نزدیک دوسری ہے اور جو دوسری ہے وہ دراصل تیسری ہے۔ یہ محض گنتی اور شمار کا فرق ہے ورنہ واقعات کی اس ترتیب میں کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ تو گویا پہلی یا دوسری یا جو بھی تقسیم آپ پسند کریں، ان میں جو حضرات شریک ہوئے ان کا درجہ چوتھا ہے اور جو دوسری یا تیسری بیعت میں شریک ہوئے ان کا درجہ پانچواں ہے۔

اس کے بعد وہ حضرات ہیں جو مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے گئے یا مدینہ کے قرب و جوار کے رہنے والے یا مدینہ منورہ میں رہنے والے حضرات جو رسول اللہ ﷺ کے قیام قبا کے دوران اسلام میں داخل ہوئے۔ حضورؐ نے چند دن قبا میں قیام فرمایا جہاں بہت سے حضرات نے اسلام قبول کیا۔ بہت سے صحابہ نے ہجرت کر کے حضورؐ کے ساتھ مدینہ میں جا کر مل گئے۔ ان کا طبقہ وہ ہے جو امام حاکم کے نزدیک درجہ اور فضیلت کے اعتبار سے صحابہ کرامؓ کا چھٹا طبقہ ہے۔ ابھی بطور حافظ حدیث یا محدث یا راوی حدیث کے بات نہیں ہو رہی ہے بلکہ ابھی صرف صحابی ہونے کی درجات اور فضیلت کی بات ہو رہی ہے۔

پھر ساتواں درجہ ان کا ہے جو اصحاب بدر ہیں۔ ممکن ہے آپ کے ذہن میں یہ سوال

پیدا ہو کہ ہم تو ابھی تک یہ پڑھتے آرہے ہیں کہ اصحاب بدر کا درجہ سب سے اونچا ہے۔ یہ ساتواں درجہ کیوں بتایا جارہا ہے۔ اس سوال پر میرا پہلا جواب تو یہ ہے کہ یہ میں نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ امام حاکم بتا رہے ہیں۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ جو پہلے تمام درجات ہیں اصحاب بدر ان میں شامل ہیں۔ سابقون اولون میں سے کوئی نہیں جو غزوہ بدر میں شامل نہ ہو۔ اصحاب دار الندوہ میں کوئی نہیں جو بدر میں شامل نہ ہوا ہو۔ یہ سارے کے سارے اصحاب بدر میں شامل ہیں۔ اس لئے جب ہم اصحاب بدر کے درجہ کا ذکر کریں گے تو ایک آدھ کے استثنٰی کے ساتھ یہ سارے کے سارے اس میں شامل ہوں گے۔

اصحاب بدر کے بعد صلح حدیبیہ سے پہلے اسلام میں داخل ہونے والے ان خوش نصیبوں کا درجہ ہے جو ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔ ان کا درجہ اس لئے اونچا ہے کہ صلح حدیبیہ سے پہلے پہلے مکہ مکرمہ کے لوگوں اور مسلمانوں کے درمیان شدید جنگ اور کشمکش کی کیفیت تھی اور تمام اہل مکہ اور ان کی وجہ سے بقیہ قبائل کے بہت سے لوگ مسلمانوں کے شدید دشمن تھے۔ لہٰذا جو شخص مکہ مکرمہ یا کسی اور قبیلے سے اپنا وطن چھوڑ کر اسلام قبول کرتا ہے اور مدینہ منورہ آکر گویا اپنی سابقہ شہریت کو منسوخ کر کے مسلمانوں کی برادری میں شامل ہو جاتا ہے وہ پوری برادری اور گھر بار چھوڑ کر پورے عرب سے دشمنی مول لے کر مدینہ منورہ کی بستی میں آتا ہے تو اس کا درجہ بعد والوں سے بلاشبہ اونچا ہونا چاہئے۔

صلح حدیبیہ کے بعد صورت حال بدل گئی۔ کفار مکہ سے جنگ بندی کا معاہدہ ہوا۔ دوسرے قبائل سے بھی معاہدات ہوئے، کچھ قبائل سے دوستی کے عہد و پیمان ہوئے۔ مسلمانوں کے لئے حالات نسبتاً بہتر ہو گئے اور اب دشمنی کی وہ کیفیت نہیں رہی۔ ان حالات میں جو اصحاب تشریف لائے ان کی قربانی پہلے آنے والے حضرات کے مقابلہ میں نسبتاً کم درجے کی ہے۔ اس لئے آٹھواں درجہ ان کا ہے جو صلح حدیبیہ کے بعد اور بیعت رضوان سے پہلے پہلے تشریف لائے۔ پھر بیعت رضوان میں جو لوگ شریک ہوئے قرآن مجید میں ان کا ذکر موجود ہے لقد رضی اللہ عن المؤمنین اذ یبایعونک تحت الشجرۃ۔ اللہ تعالیٰ راضی ہو گیا ان لوگوں سے جو درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے۔ اب قرآن مجید کی اس گواہی کے بعد تو کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ ان کا درجہ کیا ہے۔

کا موقع ملا۔ ظاہر ہے کہ جن تابعین کو اکابر صحابہ سے کسب فیض کا موقع ملا، مثلاً اگر کسی تابعی نے سیدنا عمر فاروقؓ سے روایت نقل کی یا کسی تابعی نے صدیق اکبرؓ سے روایت نقل کی تو ان کے تابعی ہونے کا درجہ بھی بڑا ہوگا۔ اس اعتبار سے صحابہ کرامؓ کے تین طبقات علماء حدیث نے بیان کئے ہیں۔

کبار صحابہ

سب سے پہلا یا سب سے اونچا اور بڑا درجہ کبار صحابہ کا ہے۔ ان میں وہ صحابہ کرامؓ شامل ہیں جن کو ایک طویل عرصہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں گزارنے، آپ کی سنت کا مشاہدہ کرنے، آپ سے حدیث کو حاصل کرنے اور آپ کے زیر سایہ براہ راست اور مکمل تربیت حاصل کرنے کا موقع ملا۔ یہ کبار صحابہ ہیں جن میں خلفائے اربعہ، عشرہ مبشرہ، امہات المومنین کے علاوہ مہاجرین کی بڑی تعداد شامل ہے۔ ان میں انصار اور مہاجرین دونوں گروہوں سے حضورؐ کے قریب ترین وہ اصحاب شامل ہیں جو شب و روز آپؐ کے ساتھ رہے۔ ظاہر ہے کہ ان کی تعداد تھوڑی ہے لیکن تعین کے ساتھ گنتی کر کے بتانا دشوار ہے کہ ان سے صحابہ کبار صحابہ میں سے ہیں اور کون سے نہیں۔ آخر میں کبار صحابہ اور اوساط صحابہ کے درمیان جو Dividing Line آئے گی وہاں تھوڑا سا اختلاف ہوگا اور وہاں آ کر قطعی طور پر یہ تعین کرنا دشوار ہوگا کہ یہ وہ لکیر ہے جو کبار صحابہ کو باقی صحابہ سے الگ کرتی ہے تو یہ لکیر کھینچنا بہت مشکل ہے۔ البتہ اس تقسیم سے کبار صحابہ کے بارے میں ایک عمومی اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔

اوساط صحابہ

اس کے بعد اوساط صحابہ کا درجہ ہے۔ یہ وہ صحابہ ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں اپنے ہوش و حواس میں تھے، نوجوان تھے، جن کو حضور ﷺ کو دیکھنے کے خاصے مواقع ملے لیکن نوجوان اور کم سن ہونے کی وجہ سے اتنے قریبی اور خصوصی مواقع نہیں ملے جتنے مثلاً حضرت عمر فاروقؓ یا حضرت علیؓ کو ملے یا امہات المومنین کو ملے۔ مثال کے طور پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا شمار مدینہ منورہ کے ابتدائی سالوں میں کم سن بچوں میں ہوتا تھا۔ جب حضورؐ دنیا سے تشریف لے گئے تو ان کی عمر کوئی بائیس تئیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضورؐ

کے پاس دس سال کی عمر میں تشریف لائے، اس لئے ان جیسے نو عمر صحابہ کرامؓ کا شمار کبار صحابہ میں تو نہیں ہو سکتا۔ لیکن دس سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے ان کو غیر معمولی فہم، سمجھ بوجھ اور عقل و دانش سے نوازا تھا۔ انہوں نے تین سالوں میں اتنا کچھ حاصل کر لیا تھا کہ بہت سے اور حضرات حاصل نہیں کر سکے۔ اس لئے ان کا شمار اوساط صحابہ میں ہے۔ جب حضورؐ کا انتقال ہوا تو حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ کی عمر تیرہ یا ساڑھے تیرہ سال کی۔ ان کے علاوہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ ہیں۔ جب غزوہ احد ہوا تو جو صحابہ کرامؓ غزوہ احد میں شرکت کے لئے ہتھیار اور سامان جنگ لے کر نکلے، حضورؐ نے مدینہ سے باہر جا کر فوج کا معائنہ فرمایا۔ اس وقت ایک ہزار کے قریب لشکر تھا۔ بعض لوگوں کو آپؐ نے کم سن قرار دے کر واپس بھیج دیا۔ ان میں حضرات عبد اللہ بن عمرؓ، ابو سعید خدریؓ اور چند اور حضرات شامل تھے۔ آپؐ نے ان سے کہا کہ تم ابھی کم سن ہو، جنگ میں شریک نہیں ہو سکتے اس لئے چلے جاؤ۔ وہ بہت بوجھل دل اور افسوس کے ساتھ واپس چلے گئے کہ حضورؐ کے ساتھ جہاد میں شرکت کی اس سعادت عظمیٰ کے حصول کا موقع نہیں ملا۔ اس وقت ان کی عمر کیا ہو گی؟ ظاہر ہے یہ وہ تیرہ یا چودہ سال کے لگ بھگ ہو گی۔ ایسی عمر کی کہ ان کا شمار بچوں میں تھا نہ بڑوں میں۔ خود اپنی دانست میں یہ جنگ میں حصہ لینے کے قابل تھے لیکن رسول اللہ ﷺ نے از راہ شفقت اور از راہ مہربانی اور از راہ بزرگی ان کو اس کا اہل نہیں سمجھا کہ وہ جنگ میں شرکت جیسی اہم ذمہ داری انجام دے سکیں۔

یہ سارے حضرات جو غزوہ احد میں نوجوان تھے ان کو غزوہ خندق میں آپؐ نے شرکت کا موقع عطا فرمایا اور وہ اس میں شریک ہوئے۔ یہ اوساط صحابہ کہلاتے ہیں۔ ان میں سے متعدد حضرات نے لمبی عمر پائی اور جن کی عمر زیادہ طویل ہوئی زیادہ تر روایات انہی سے ہیں۔ تابعین نے زیادہ تر انہی حضرات سے استفادہ کیا۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ، حضرت انس بن مالکؓ، حضرت زید بن ثابتؓ اور ان کے ہم عمر حضرات اوساط صحابہ میں شمار ہوتے ہیں۔

صغار صحابہ

تیسرا طبقہ صحابہ کرامؓ میں صغار صحابہ کا ہے جو حضور ﷺ کی حیات کے زمانہ میں بہت بچے تھے اور ان کی جوانی کا زمانہ آپؐ کی حیات کے بعد شروع ہوا۔ مثلاً حضرات حسنینؓ سے کوئی

روایت منقول نہیں ہے۔ بہت عام قسم کی دو ایک باتیں ان سے منقول ہیں۔ مثلاً حضورؐ کے حلیہ
مبارک کے بارے میں، آپؐ کی کسی عام طرز عمل کے بارے میں، کا کوئی روایت ہوگی۔ ورنہ عام
طور پر ان حضرات سے کوئی روایت نہیں ہے۔ حضرت محمود بن لبید جن کا ذکر ہو چکا ہے، ابو الطفیل
عامر بن واثلہ، یہ وہ حضرات ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا تو سہی لیکن روایت کرنے یا
صحبت میں رہنے یا کوئی طویل استفادہ کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ ان کی اکثر روایتیں دوسرے
صحابہ کرامؓ سے ہیں۔ یہ صحابی ہوتے ہوئے بھی صحابہ سے روایت کرنے والے لوگ ہیں۔

ان طبقات سے یا زمانے کے اس تعین سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ کس صحابی کا زمانہ
کس زمانے تک آتا ہے۔ چونکہ صحابہ کے طبقات پر الگ الگ کتابیں لکھی گئی ہیں اور طبقات صحابہ میں
مورخین اور محدثین نے زمانے کا تعین بھی کیا ہے اس سے اس بات کا پتہ چلانا بہت آسان ہے کہ
اگر کسی تابعی نے کسی صحابی سے روایت کی ہو تو اس روایت کا درجہ کیا ہے اور وہ روایت متصل بھی ہے
کہ نہیں۔

صحابہ کرام کی کل تعداد

صحابہ کرامؓ کی تعداد ایک لاکھ سے اوپر ہے۔ بعض لوگوں نے یہ تعداد ایک لاکھ چوبیس
ہزار بتائی ہے۔ بعض لوگوں نے کم و بیش بتائی ہے۔ ان تمام حضرات کی تعداد جن کو شرف صحابیت
حاصل تھا وہ بہت زیادہ تھی۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار تو وہ تھے جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ 9 ذی الحج
سن 10ھ کو میدان عرفات میں موجود تھے۔ بہت سے حضرات ایسے بھی ہوں گے جو اس موقع پر
حج کے لئے حاضر نہیں ہو سکے ہوں گے، انہوں نے بھی اس سے پہلے یا بعد میں حضورؐ کو دیکھا
ہوگا لہٰذا وہ بھی صحابی ہیں۔ اس لئے صحابہ کی تعداد کے بارے میں قطعی طور پر کچھ کہنا تو بہت مشکل
ہے۔ البتہ وہ صحابہ کرامؓ جن کے اسمائے گرامی معلوم ہوئے اور کسی نہ کسی اعتبار سے محدثین کے علم
میں آئے ان کی تعداد امام ابو زرعہ رازی نے ایک لاکھ چودہ ہزار بتائی ہے۔ صحابہ کے جو تذکرے
آج موجود ہیں مثلاً "الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب"، "الاصابہ فی
تمییز الصحابہ"، "اسد الغابہ" اور "طبقات ابن سعد"۔ ان سب کتابوں میں جن صحابہ کرامؓ کا ذکر
ہے ان کی مجموعی تعداد چودہ پندرہ ہزار کے درمیان ہے۔ یہ وہ حضرات ہیں جن سے یا تو کوئی نہ کوئی

روایت منقول ہے۔ ہجرت سے متعلق کسی واقعہ میں ان کا ذکر آتا ہے۔ باقی ان سے کوئی روایت منقول نہیں ہے۔ انہوں نے حضورؐ کو دیکھا ضرور لیکن ایسا کوئی موقع نہیں آیا کہ وہ کوئی روایت بیان کرسکیں۔

علم حدیث کا ایک طے شدہ اصول ہے کہ صحابہ کرامؓ سب کے سب عادل ہیں۔ لہذا کسی صحابی کے عادل یا غیر عادل ہونے کے بارے میں بحث غیر ضروری ہے۔ یہ بحث تحصیل حاصل ہے۔ امام ابوزرعہ رازی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ 'اذا رأیت الرجل ینتقص احدا من اصحاب رسول اللہ ﷺ' جب تم کسی کو دیکھو کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ میں سے کسی کی تنقیص کررہا ہے 'فاعلم انہ زندیق' تو جان لو کہ وہ زندیق ہے۔ یعنی بے دین اور دہریہ ہے۔ اس لئے کہ قرآن مجید صحابہ کرامؓ کے واسطے سے ہی ہم تک پہنچا۔ سنت کے ذخائر صحابہ کرامؓ ہی کے واسطے سے آئے۔ اگر صحابہ کرامؓ کا ایمان خود ہی مشکوک ٹھہرا دیا جائے، صحابہ کرامؓ کے کردار اور عدالت پر چھینٹے اڑا دیئے جائیں تو پھر قرآن مجید بھی مشکوک ہے، حدیث بھی مشکوک ہے اور پورا دین مشکوک ہے۔ اسی وجہ سے بالاتفاق محدثین، فقہائے اسلام اور مفسرین قرآن تمام صحابہ کرامؓ کو عادل قرار دیتے ہیں۔

صحابہ کرامؓ سے جو روایات آئی ہیں ان صحابہ اور ان روایت کے نقطہ نظر سے بھی صحابہ کرامؓ کے تین طبقات ہیں

۱۔ ایک طبقہ وہ ہے جو کبار صحابہ سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن ان سے کوئی روایت منقول نہیں ہے۔ مثلاً حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جن کا تعلق صحابہ کے طبقہ اول کے بھی طبقہ اولیٰ سے ہے۔ لیکن ان سے کوئی روایت منقول نہیں ہے۔ ان کا انتقال مکہ مکرمہ میں ہوا۔ ان کو کسی تابعی نے دیکھا ہی نہیں۔ ان کا سارا واسطہ صحابہ ہی سے رہا۔ ان صحابہ کرامؓ میں سے کسی کو ضرورت اس چیز کی نہیں آئی کہ ان سے کوئی روایت معلوم کرتا۔ صحابہ کرامؓ کا جو طبقہ زمانی اعتبار سے جتنا زیادہ متقدم تھا ان سے روایتیں اتنی ہی کم ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے روایتیں بہت ہی کم ہیں۔ مسند امام احمد کو آپ کھول کر دیکھ لیں، شاید تیس پینتیس صفحات سے زیادہ کی روایات نہیں ہوں گی

۲۔ زیادہ روایتیں ان صحابہ کرامؓ سے ہیں جن کا تعلق اصاغر صحابہ میں سے طبقہ

پھر وہ حضرات ہیں جنہوں نے کوفہ اور مدینہ منورہ دونوں کے اہل علم سے استفادہ کیا اور ان دونوں روایتوں کو یعنی مدینہ اور کوفہ کی روایت کو جمع کیا۔ مدینہ اور کوفہ یعنی عراق کی روایت کو جس شخصیت نے ترویج کیا وہ امام شافعی تھے۔ امام شافعی کے ہاں یہ دونوں روایتیں جمع ہو گئیں۔ امام شافعی نے طویل عرصہ تک مکہ مکرمہ میں رہ کر وہاں کے علماء سے کسب فیض کیا۔ اس کے بعد وہ مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ مدینہ منورہ میں انہوں نے امام مالکؒ سے کسب فیض کیا۔ امام مالکؒ سے کسب فیض کرنے کے بعد وہ عراق گئے اور وہاں۔ بغداد اور عراق کے بقیہ علماء سے کسب فیض کیا جن کے پاس حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا علم تھا۔ اس طرح سے وہ دونوں روایتوں کے جامع بن گئے تو ایک تیسرا مکتب فکر وجود میں آگیا۔

پھر امام شافعی سے جن حضرات نے کسب فیض کیا ان میں بعض لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کی طرف سے ان دونوں روایتوں کے جمع کرنے سے اہل علم کا ایک طبقہ سامنے آیا ہے جس کا زیادہ تر زور عقلیات و استدلال پر ہے۔ لہذا عقلیات اور رائے کے ساتھ ساتھ احادیث اور سنت پر زیادہ سے زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے۔ جب زیادہ زور دینے کی اس ضرورت کا احساس جب پیدا ہوا تو امام احمد بن حنبل کا مکتب فکر وجود میں آیا۔ ان چاروں مسالک سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ چاروں مکاتب فکر وجود میں آئے ہیں یہ ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور نہ صرف یہ کہ الگ نہیں کیا جا سکتا بلکہ جن صحابہ کرامؓ کے علمی اثرات اور اجتہادی بصیرت اور غور و فکر کے نتیجہ میں یہ مکاتب فکر وجود میں آئے وہ آپس میں اس طرح مربوط ہیں کہ ایک دوسرے سے کسب فیض کرتے ہیں اور سب کا علم گھوم گھوم کر ایک جگہ پہنچتا ہے۔

صحابہ کرامؓ پر یہ مباحث ایک پورے فن کا موضوع ہے۔ اس پر کتابیں ہیں، درجنوں کتابیں کئی کئی جلدوں میں لکھی گئی ہیں ان کا انتہائی مختصر ترین خلاصہ بلکہ خلاصہ کا خلاصہ ہے جو میں نے آپ کے سامنے رکھا۔

تابعی کی تعریف

جس طرح صحابہ کرامؓ پر بحث ہوتی ہے اسی طرح سے تابعین پر بھی بحث ہوتی۔ تابعین

قرآن پاک میں پیشین گوئی آئی ان کی تکمیل صحابہ کرامؓ کے ہاتھوں ہوئی۔ اس لئے قرنی جس کو حضورؐ نے اپنا زمانہ کہا وہ دراصل صحابہ کرامؓ کا زمانہ ہے۔ ثم الذین یلونہم پھر ان کا زمانہ جو ان کے بعد آئیں گے۔ یلونہم میں ضمیر جمع کی ہے جس سے اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ اگر حضورؐ کا اپنا زمانہ مراد ہوتا تو آپؐ فرماتے کہ ثم الذین یلونی پھر وہ لوگ جو میرے بعد آئیں گے۔ لیکن آپؐ نے ایسا نہیں فرمایا بلکہ فرمایا ثم الذین یلونہم۔ گویا اس میں قرنی سے مراد صحابہ کا زمانہ ہے۔ اسی لئے آپؐ نے جمع کی ضمیر کا استعمال فرمایا ہے۔ ثم الذین یلونہم پھر ان کا زمانہ جو ان کے بعد آئیں گے یعنی تبع تابعین۔ تو پہلا یلونہم تابعین اور دوسرا یلونہم تبع تابعین کے متعلق ہوا۔

ایک بزرگ نے ایک لطیف نکتہ کے طور پر لکھا کہ قرنی سے دور صحابہ مراد ہے۔ اس کے شواہد میں سے ایک چیز یہ بھی ہے کہ چاروں خلفائے راشدین کے ناموں کا مخفف بھی آگیا ہے۔ ق سے صدیق، ر سے عمر، ن سے عثمان، ی سے علی۔ خلفائے راشدین کے ناموں کے آخری حروف لیں تو قرنی بنتا ہے۔ یہ محض ایک نکتہ ہے۔ اگر آپ کا جی چاہے تو اتفاق کریں اور نہ چاہے تو نہ کریں۔ لیکن خود حدیث کے الفاظ یلونہم سے بھی یہ اشارہ ملتا ہے کہ اس سے مراد صحابہ کا دور ہے۔ اس لئے کہ وہ حضورؐ ہی کے دور کی ایک توسیع اور تسلسل ہے۔

اس پر بڑی بحث ہوئی ہے کہ تابعین میں سب سے افضل شخصیت کون ہیں۔ اگر کسی ایک شخصیت کو منتخب کرنا ہو تو سب سے افضل کس کو قرار دیا جائے گا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ اس بارے میں ہم قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اللہ تعالیٰ ہی اس کا فیصلہ کرے گا۔ کچھ حضرات نے کہا کہ افضل ترین تابعی حضرت قیس بن ابی حازمؒ ہیں جنہوں نے عشرہ مبشرہ سے روایت کی ہے۔ تاہم بہت بڑی تعداد میں علمائے حدیث کا کہنا ہے کہ افضل التابعین حضرت سعید بن المسیب ہیں جنہوں نے طویل عرصہ تک حضرت ابوہریرہؓ سے اور دیگر بہت سے صحابہ کرامؓ سے کسب فیض کیا۔ بعض کا خیال ہے کہ افضل التابعین یا سید التابعین حضرت اویس قرنی ہیں جن کا ذکر صحیح مسلم میں ہے اور رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے ان کا نام آیا ہے۔ کچھ کا خیال ہے کہ حضرت عطا بن ابی رباحؒ افضل التابعین ہیں جو مکہ مکرمہ میں سالہا سال قرآن اور حدیث کا درس دیتے رہے۔ جو اور مکہ مکرمہ میں رہنے والے صحابہ کرامؓ کی بڑی تعداد سے انہوں نے کسب فیض کیا۔ کچھ کا خیال ہے

کہ افضل ترین تابعی حضرت قاسم بن محمدؒ ہیں جو سیدنا صدیق اکبرؓ کے پوتے اور ان کے بیٹے حضرت محمد بن ابوبکرؓ کے صاحبزادے ہیں۔ کچھ کا کہنا ہے کہ افضل ترین تابعی حضرت عروہ بن زبیرؒ ہیں جو حضرت عائشہؓ کے بھانجے ہیں جنہوں نے حضرت عائشہؓ سے بہت کسب فیض کیا اور جنہوں نے اسلامی تاریخ میں سب سے پہلے سیرت پر کتاب لکھی ہے۔ سیرت پر سب سے پہلا علمی کام انہوں نے کیا جس میں انہوں نے اپنی خالہ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایات جمع کیں اور ان کو ایک کتاب کی صورت میں مرتب کیا۔ وہ اپنی خالہ کے پاس جایا کرتے تھے۔ ان کے ہاں رہا کرتے تھے۔ خالہ نے ان کو بچپن سے رکھا اور ان کی تربیت کی۔ اس لئے ان کے پاس جو علم تھا وہ بہت کم لوگوں کے پاس ہو سکتا ہے۔ کچھ کا خیال ہے کہ حضرت حسن بصریؒ افضل التابعین ہیں۔ کچھ کا خیال ہے کہ محمد بن سیرینؒ افضل التابعین ہیں۔ کچھ کا خیال ہے کہ حضرت ابو ادریس الخولانیؒ ہیں۔ ابو ادریس الخولانی کا معاملہ بھی بالکل اسی طرح کا ہے جو حضرت عبدالرحمن الصنابحیؒ کا ہے۔ وہ حضورؐ کے زمانے میں اسلام لا چکے تھے لیکن مدینہ منورہ آنے کا موقع نہیں ملا۔ جب مدینہ منورہ آنے کا موقع ملا تو حضورؐ دنیا سے تشریف لے جا چکے تھے۔ اس لئے عمر کے اعتبار سے تو وہ صحابہ کرامؓ کے ہم سن تھے البتہ منصب اور رتبہ کے اعتبار سے وہ تابعین کے اہم رکن تھے۔

تابعی اور تبع تابعی کا تعین

یہ سارے معاملات کہ تابعین اور تبع تابعین کا تعین کیسے ہو۔ ان کا دارومدار اکثر و بیشتر ایک خاص فن پر ہے، جس پر علمائے حدیث نے بہت کام کیا۔ وہ ہے تواریخ الرواۃ۔ یہ ویسے تو ایک ہلکا اور مختصر موضوع معلوم ہوتا ہے لیکن یہ موضوع جلد ہی اتنا پھیل گیا اور اس پر اتنا مواد جمع ہو گیا کہ محدثین نے اس پر الگ الگ کتابیں لکھیں۔ ایک کتاب کے بعد دوسری، پھر تیسری، پھر چوتھی۔ ایک بہت اہم کتاب اس موضوع پر امام بخاریؒ کی کتاب التاریخ الکبیر ہے جو غالباً آٹھ جلدوں میں ہے۔ اس کے علاوہ اور لوگوں کی بھی اس پر کتابیں ہیں جن میں انہوں نے یہ پتہ چلانے کی کوشش کی کہ کس تابعی کا انتقال کس سن میں ہوا، کس تبع تابعی کا انتقال کس سن میں ہوا اور تبع تابعین کے شاگردوں میں کس کا انتقال کس سن میں ہوا۔ یہ بات جاننا اس لئے ضروری ہے کہ احادیث اور سندوں کی تحقیق میں بہت سے معاملات ایسے پیش آتے کہ اس تعین سے کسی

حدیث کے قابل قبول یا ناقابل قبول ہونے کا اندازہ ہو گیا۔

غالباً علامہ ابن الجوزی کے زمانے میں جو چھٹی صدی ہجری کا زمانہ ہے، شام کے کچھ یہودی کوئی دستاویز لے کر عباسی خلیفہ کے پاس آئے۔ وہ دستاویز بظاہر پرانی معلوم ہوتی تھی۔ قدیم خط میں لکھی ہوئی تھی۔ انہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ یہ وہ دستاویز ہے جو رسول اللہ ﷺ نے فتح خیبر کے موقع پر ہمیں دی تھی۔ اس میں یہ لکھا ہوا تھا کہ ہمیں فلاں فلاں معاملات سے مستثنیٰ کر دیا جائے گا۔ بہت سی مراعات کا اس میں ذکر تھا اور دعویٰ کیا گیا تھا کہ حضورؐ نے یہ مراعات ہمیں دی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ مراعات حضورؐ کے زمانے تک ہمیں حاصل رہیں۔ لیکن بعد میں جب ہمیں خیبر سے جلاوطن کر کے شام بھیجا گیا تو یہ مراعات بھی ہم سے لے لی گئیں۔ لہٰذا آپ یہ مراعات ہمیں دوبارہ دیں۔ خلیفہ وقت نے وہ دستاویز اس زمانے کے سب سے بڑے محدث علامہ عبدالرحمن ابن الجوزی (جو صف اول کے محدثین میں سے تھے۔) کو بھیجی کہ بتائیں اس دستاویز کے بارے میں کیا فیصلہ کیا جائے؟ انہوں نے دستاویز سامنے رکھی اور اسے دیکھا تو پہلی ہی نظر میں معلوم ہو گیا کہ جعلی ہے۔ انہوں نے خلیفہ کو خط لکھا کہ یہ دستاویز جعلی ہے۔ لوگوں نے بڑی حیرت کا اظہار کیا کہ حضور ﷺ سے منسوب ایک دستاویز آئی ہے، خاصی پرانی ہے جس پر صحابہ کرامؓ کی گواہیاں ہیں اور آپ نے ایک ہی نظر دیکھنے کے بعد کہہ دیا کہ جعلی ہے۔ خلیفہ نے علامہ ابن الجوزی کو بلایا کہ ذرا تشریف لائیے۔ وہ آئے تو پوچھا کہ آپ کس بنیاد پر یہ بات کہہ رہے ہیں کہ دستاویز جعلی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس دستاویز میں لکھا ہوا ہے کہ اس کے گواہان میں حضرت معاویہؓ اور حضرت سعد بن معاذؓ بھی شامل ہیں اور دعویٰ یہ کیا جا رہا ہے کہ یہ دستاویز رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں کو فتح خیبر کے موقع پر عطا کی۔ غزوہ خیبر ۶ھ میں ہوا تھا۔ ۶ھ تک حضرت معاویہؓ اسلام قبول کر کے مدینہ منورہ نہیں آئے تھے۔ وہ فتح مکہ سے پہلے اور صلح حدیبیہ کے بعد اسلام لانے والے صحابہ میں سے ہیں۔ غزوہ خیبر کے وقت حضرت معاویہؓ مسلمان ہی نہیں ہوئے تھے لہٰذا اس وقت ان کا خیبر جانا اور اس معاہدہ پر بطور صحابی رسول مسلمانوں کی طرف سے دستخط کرنا خارج از امکان ہے۔ اسی طرح حضرت سعد بن معاذؓ کا انتقال غزوہ احد کے وقت ہو گیا تھا۔ وہ غزوہ احد میں شدید زخمی ہو گئے تھے اور اس کے فوراً بعد انہی زخموں کی وجہ سے کچھ ہی دن میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ بھی غزوہ خیبر کے موقع پر اس وقت دنیا میں موجود نہیں تھے۔ لہٰذا ان

روشنی کو ایجوں سے پتہ چلا کہ دستاویز جعلی ہے۔ یہ فن تب سے صحابہ کرامؓ، تابعین اور تبع تابعین اور
بقیہ راویوں کے سن پیدائش اور سن وفات کا تعین کرنے کا۔

امام سفیان ثوری جو بڑے مشہور محدث ہیں وہ یہ کہتے ہیں (اور یہ قول کئی کتابوں میں
نقل ہوا ہے) کہ لما استعمل الرواة الكذب جب راویوں نے جھوٹ سے کام لینا شروع
کیا استعملنا لهم التاريخ تو ہم نے ان کا مقابلہ کرنے کے لئے تاریخ کا استعمال شروع
کر دیا۔ یعنی ہمیں تاریخ کے استعمال سے پتہ چل جاتا ہے کہ کون کس زمانے میں زندہ تھا اور اس
سے کس کی روایت ممکن ہے اور کس کی روایت ممکن نہیں ہے۔

حضرت خالد بن معدان مشہور تابعی ہیں۔ ان کی وفات 104ھ میں ہوئی تھی۔ ان سے
ایک صاحب نے کوئی حدیث روایت کی اور دعویٰ کیا کہ سن 108ھ میں آرمینیا کی جنگ میں میں
نے ان سے یہ حدیث لی تھی۔ ایک مجلس میں ایک صاحب احادیث بیان کر رہے تھے۔ دوران
روایت انہوں نے بیان کیا کہ مجھ سے ایک بڑے ثقہ راوی نے یہ روایت بیان کیا ہے۔ جب ان
سے پوچھا گیا کہ یہ ثقہ راوی کون ہیں۔ انہوں نے پھر کہا کہ ثقہ راوی نے بیان کیا ہے۔ بار بار
اصرار کیا گیا کہ اس ثقہ راوی کا نام بتائیں۔ تو انہوں نے کہا کہ خالد بن معدان نے بیان کیا تھا۔
پوچھنے والے نے پوچھا کہ آپ نے کس سن میں ان سے یہ روایت لی تھی؟ انہوں نے بتایا کہ 108
ھ میں۔ پوچھا گیا کس جگہ؟ تو انہوں نے بتایا کہ وہ آرمینیا کی جنگ میں شریک تھے۔ جو محدث یہ
سوالات کر رہے تھے انہوں نے کہا کہ یہ روایت سراسر جعلی ہے، اس لئے کہ خالد بن معدان کا
انتقال 104ھ میں ہو گیا تھا اور وہ آرمینیا کی جنگ میں نہیں بلکہ روم کی جنگ میں شریک ہوئے تھے۔

ایک اور راوی تھے ابو خالد السقاء، انہوں نے دعویٰ کیا کہ انہوں نے حضرت انسؓ اور
حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کی ہے۔ یہ دعویٰ انہوں نے سن 209ھ میں کیا۔ امام ابو نعیم
اصفہانی جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے، وہ وہاں موجود تھے۔ انہوں نے پوچھا کہ آپ کی عمر کیا ہے۔
ابو خالد انہوں نے جواب دیا کہ 125 سال ہے۔ حضرت ابو نعیم نے کہا کہ پھر آپ کی پیدائش سے
پانچ سال پہلے حضرت عبداللہ بن عمرؓ وفات پا چکے تھے۔ یہ سن 209ھ بہت ہی متاخر تابعین کا
زمانہ ہے یہ اصاغر تابعین کا زمانہ نہیں ہے۔ تابعین کا زمانہ صحابہ کرامؓ کے زمانے سے لے کر اسی
نوے سال کے بعد تک کا ہے۔ صحابہ کا آخری دور 110ھ تک ہے۔ اس کے بعد اسی یا نوے سال

گا ئیں تو تقریباً 190 یا 200 ھ کے لگ بھگ بیشتر تابعین کا زمانہ ختم ہو گیا۔

ان حضرات کا بیشتر ذخیرہ امام بخاری، حضرت علی بن المدینی، ابو حاتم رازی اور امام نسائی کی کتابیں ہیں۔ ان میں سب سے بڑا ماخذ حضرت امام بخاری کی کتاب التاریخ الکبیر ہے جو آٹھ جلدوں میں ہے۔

ان راویوں کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کا تعین کرنے کے ساتھ ساتھ اور ان کے ضبط، حافظہ، عدالت اور کردار کا تعین کرنے کے ساتھ ساتھ ایک مسئلہ یہ بھی پیدا ہوا کہ ان کی رشتہ داریوں پر بھی بحث کی جائے اور یہ پتہ چلایا جائے کہ کون کس کا بھائی تھا اور کون کس کی بہن تھی وغیرہ وغیرہ۔ اس کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ اگر ایک راوی مثلاً ایک ثقہ راوی کے دو بیٹے ہوں۔ ایک بیٹا بہت باکردار اور سچا راوی ہو اور دوسرا بیٹا اس درجہ کا نہ ہو اور روایت اس طرح کی جائے کہ ابن فلاں نے روایت کی تو یہ جاننا بہت ضروری ہوگا کہ یہاں ابن فلاں سے کون سا بیٹا مراد ہے۔ پہلا بیٹا مراد ہے کہ دوسرا بیٹا مراد ہے۔ اگر ایک ہی بیٹا ہے تو پھر تو ابن فلاں کی روایت قبول کرنے میں کوئی شک و احتمال نہیں ہے۔ لیکن اگر دو بیٹے ہیں تو پھر تحقیق کرنی پڑے گی کہ کون سے بیٹے کی روایت ہے اور کس بیٹے کا درجہ کیا تھا۔ اس تحقیق کی ضرورت وہاں وہاں پیش آئی جہاں یہ ثابت ہو جائے کہ کسی راوی کے دو یا تین یا چار بیٹے تھے۔ یہی حال بیٹیوں کا ہے۔ مثلاً عمرہ بنت عبدالرحمن ایک انتہائی مستند راویہ ہیں۔ انہوں نے احادیث کا ایک مجموعہ بھی مرتب کیا تھا۔ عمرہ بنت عبدالرحمن سے روایت کرنے والی ان کی صاحبزادی ہوں۔ مثال کے طور پر فرض کریں کہ ان کی دو بیٹیاں ہوں اور آپ کے پاس اگر کوئی کہے کہ بنت عمرہ نے یہ روایت کی ہے۔ اب بنت عمرہ سے مراد کون سی بیٹی ہے؟ وہ بیٹی جس کا حافظہ اور کردار اچھا تھا یا وہ بیٹی جس کا حافظہ اچھا نہیں تھا۔ اس تحقیق کی ضرورت تب پیش آئے گی جب یہ پتہ ہو کہ عمرہ کی دو صاحبزادیاں راویات تھیں۔ اس موضوع پر امام مسلم نے ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام الاخوہ والاخوات ہے۔ امام ابو داؤد نے، امام نسائی نے اور امام بخاری کے استاد علی بن المدینی نے بھی اس موضوع پر الگ سے کتابیں لکھیں۔

ایک اور چیز جس کا مختصر تذکرہ پہلے بھی ہو چکا ہے۔ وہ حدیث ضعیف کی تفصیل، واقفیت اور معرفت ہے۔ علم حدیث میں جو مشکل ترین میدان ہے وہ حدیث ضعیف کا تعین ہے۔

محدثین نے حدیث ضعیف کے بہت سے درجے بتائے ہیں۔ بعض حضرات بیالیس یا انچاس
درجات بتاتے ہیں۔ بعض نے چوالیس چھپن اور بعض نے اس سے بھی زیادہ بتائے ہیں۔ پچاس
سے لے کر سو کے قریب قسمیں حدیث ضعیف کی بتائی گئی ہیں۔ جن میں سے ہر ایک کے الگ
احکام ہیں اور ہر ایک کا الگ درجہ ہے۔ لیکن ایک بات پر سب متفق ہیں کہ اسباب ضعف
مساوی نہیں۔ ضعف کے درجات متفاوت ہیں۔ یعنی ان احادیث میں ضعف کے اعتبار سے کمی
بیشی ہو سکتی ہے۔ ایک ضعف کم درجہ کا ہوگا، دوسرا ضعف زیادہ درجہ کا ہوگا۔ زیادہ ضعف میں بھی
پھر کئی درجات ہو سکتے ہیں۔ بعض اوقات کسی حدیث میں ضعف کا ایک سبب ہوگا، بعض اوقات
ایک سے زائد اسباب ہوں گے۔ کچھ اسباب ہلکے ہوں گے اور کچھ شدید قسم کے ہوں گے۔ ان
سب اسباب ضعف اور مراتب پر بھی بحث ضروری ہے۔ ان میں سے اہم پہلوؤں کا اختصار کے
ساتھ بیان میں کر چکا ہوں۔ اب دہرانے کی ضرورت نہیں۔

ضعیف حدیث پر عمل

کیا حدیث ضعیف پر عمل کیا جانا چاہئے؟ یا نہیں کیا جانا چاہئے؟ اس کے بارے میں
اہل علم میں تین نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں۔ یہاں جب میں اہل علم کا لفظ استعمال کر رہا ہوں تو
اس سے مراد محدثین بھی ہیں، فقہائے کرام بھی ہیں اور وہ حضرات بھی ہیں جو بیک وقت محدثین
بھی ہیں اور فقیہ بھی ہیں، مثلاً امام شافعی اور امام مالک وغیرہ۔ وہ حضرات بھی مراد ہیں جو صرف
محدث ہیں مثلاً امام نسائی یا امام علی بن المدینی یا امام ابو حاتم رازی۔ اسی طرح وہ حضرات بھی
یہاں مراد ہیں جن کی شہرت صرف فقیہ کی ہے، مثلاً امام ابو حنیفہ۔ ان سب نقطہ ہائے نظر کو تین
اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

۱۔ ایک نقطہ نظر وہ ہے جو آخر و بیشتر ان حضرات کا ہے جو صرف محدث ہیں اور علم
حدیث میں زیادہ نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ... حدیث
ضعیف پر مطلق عمل نہیں کرنا چاہئے۔ نہ احکام میں، نہ فضائل میں، نہ کسی اور چیز میں۔ اس لئے کہ
جس بات یا قول کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے کہ اس کی نسبت رسول اللہ ﷺ سے کمزور ہے۔
اس بات کی نسبت حضورؐ سے کرنا ایک اعتبار سے رسول اللہ ﷺ سے غلط چیز منسوب کرنے کے

مترادف ہے۔ جب اس کی نسبت ہی بگڑ گئی ہے تو حضورؐ سے آپ کیسے اس کو منسوب کر سکتے ہیں اور بطور حدیث رسول اس پر کس طرح عمل کر سکتے ہیں۔ یہ نقطۂ نظر امام یحییٰ بن معین، امام بخاری، امام مسلم اور امام ابن حزم کا ہے۔ ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ اگر کسی حدیث کا ضعیف ہونا ثابت ہو گیا تو اس پر عمل درآمد نہیں ہوگا۔

۲۔ ایک دوسرا نقطۂ نظر درمیانہ درجہ کے کچھ لوگوں کا ہے یعنی ان حضرات کا جو حدیث اور فقہ دونوں میں دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ ضعیف حدیث پر عمل کیا جائے گا یعنی مطلقاً ہر حال میں عمل کیا جائے گا۔ یہ رائے امام ابو داؤد اور امام احمد بن حنبل سے منسوب ہے۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ حدیث ضعیف بھی اگر مل جائے تو وہ ہماری تمہاری رائے سے زیادہ بہتر ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم اپنی یا کسی انسان کی رائے پر عمل کریں یہ اس سے بہتر ہے کہ حدیث ضعیف پر عمل کر لیں۔ وہ رسول اللہ ﷺ سے منسوب ایک چیز موجود ہے۔ اگرچہ اس کی نسبت متردد ہے لیکن پھر بھی اس پر عمل کیا جانا چاہئے۔ یہ ایک طرح سے عشق اور ایک والہانہ تعلق کی بات ہے۔

۳۔ تیسرا نقطۂ نظر جو اکثر ائمہ فقہا کا نقطۂ نظر ہے اور محدثین میں سے بھی بعض حضرات کا یہی نقطۂ نظر ہے۔ وہ یہ ہے کہ فضائل کے باب میں حدیث ضعیف پر کچھ شرائط کے ساتھ عمل کیا جائے گا۔ یہ شرائط اگر موجود ہوں تو فضائل، مناقب اور دعاؤں کے باب میں اس پر عمل کیا جائے گا۔ پہلی شرط یہ ہے کہ اس حدیث ضعیف سے نہ کوئی حلال حرام ثابت ہوتا ہو نہ کوئی حرام حلال ثابت ہوتا ہو اور نہ اس سے شریعت کا کوئی حکم ثابت ہوتا ہو۔ یعنی حکم شرعی اور حلال، حرام جیسے معاملات حدیث ضعیف کی بنیاد پر طے نہیں ہو سکتے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ حدیث ترہیب یا ترغیب کے موضوع پر ہو۔ یعنی اس میں کسی نیک کام کی ترغیب دلائی گئی ہو یا کسی برے کام کے انجام سے ڈرایا گیا ہو۔ اس میں ایک بات ملحوظ رکھئے کہ کسی فعل کا اچھا فعل ہونا اس سے ثابت نہیں ہوگا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی ضعیف حدیث میں یہ بتایا گیا ہو کہ فلاں فعل اچھا ہے اس کو اختیار کریں اور آپ اس ضعیف حدیث کی بنیاد پر اس فعل کو اچھا فعل قرار دے دیں۔ بلکہ وہ فعل جس کا اچھا ہونا پہلے سے ثابت ہو اس فعل کی ترغیب دلائی گئی ہو اور کسی ایسے فعل کے انجام سے ڈرایا گیا ہو جس کا برا ہونا پہلے سے ثابت ہو۔ اس کا انجام بتایا گیا ہو۔ تیسری شرط یہ ہے کہ اس کا

ہیں۔ اس لئے اگر کوئی شخص عمل کرتا ہو تو اس پر اعتراض نہ کریں۔

جو حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ حدیث ضعیف پر عمل نہیں کرنا چاہئے مثلاً علی بن المدینی اور اسی طرح ان کے ہم مسلک دوسرے حضرات اس پر متفق ہیں کہ اس پر عمل نہ کریں۔ جو حضرات سمجھتے ہیں کہ حدیث ضعیف پر ہر صورت میں عمل کرنا چاہئے ان میں سے بہت سے عمل کر رہے ہیں۔ آپ کا نقطۂ نظر کوئی پوچھے تو آپ بیان کر دیجئے کہ ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے۔ اس کے دلائل پوچھے تو وہ بھی بیان کر دیجئے۔ لیکن ان معاملات میں جن میں صحابہ کرامؓ اور تابعین کے زمانے سے امت میں ایک سے زیادہ آرا چلی آرہی ہیں امت میں تفریق پیدا نہیں کرنی چاہئے۔ امت کی وحدت اور اتفاق قرآن پاک کی نص قطعی سے ثابت ہے۔ قطعی الدلالت اور قطعی الثبوت ہے کہ ان ھذہ امتکم امۃ واحدۃ۔ سنت سے قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت نصوص سے ثابت ہے کہ امت کی وحدت کا تحفظ کرنا چاہئے۔ لہٰذا اس طرح کے اختلافی معاملہ میں جہاں تابعین کے زمانے سے متعدد آرا چلی آرہی ہوں، اور بڑے بڑے محدثین اور بڑے بڑے علما کے نقطہ ہائے نظر تین طرح کے پائے جاتے ہیں تو ایسے معاملات میں نکیر نہیں کرنی چاہئے۔ آج بھی اگر دو تین آرا موجود ہوں تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ اس کی بنیاد پر اگر کوئی اختلاف اپنے پیدا نہیں ہونا چاہئے کہ جس سے امت میں کوئی تفریق ہو جائے۔

ضعیف حدیث سے متعلق ایک دو مسائل اور ہیں جو علم حدیث کے طلبہ کو خاص طور پر یاد رکھنے چاہئیں۔ مثال کے طور پر اگر آپ کوئی کتاب پڑھ رہی ہوں۔ فرض کریں کہ آپ جامع ترمذی پڑھ رہی ہوں یا ابو داؤد کی سنن کا مطالعہ کر رہی ہوں۔ اور پڑھتے پڑھتے آپ کو حاشیہ میں کسی کی تعلیق یا حاشیہ نظر آئے کہ 'ضعیف' کہ یہ حدیث ضعیف ہے تو اس کے بارے میں فوراً یہ فیصلہ نہ کیجئے کہ یہ حدیث ناقابل اعتبار ہے اور کلیتہً ضعیف ہے۔ اس لئے کہ جب محدثین یہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے تو ان کی مراد وہ طریقہ یا وہ روایت یا وہ سند ہوتی ہے جس سے وہ بیان ہوئی ہے۔ اس روایت میں طریقہ بھی شامل ہے اور متن بھی شامل ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس روایت یا اس سند کو کمزور کہہ رہے ہوں اور متن کمزور نہ ہو۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث ایک سند سے قوی اور صحیح ہے اور دوسری سند سے ضعیف ہے۔ اب اگر محدث ایک سند کو ضعیف قرار دے رہا ہے تو ضروری نہیں کہ متن بھی ضعیف ہے۔ یہ تحقیق کرنی چاہئے کہ بقیہ طرق

سے بھی یہ متن جو پہنچا ہے تو سارے طرق ضعیف ہیں یا بعض طرق ضعیف ہیں اور بعض قوی ہیں۔ پھر اگر سند کے سارے طرق ضعیف ثابت ہوں تو پھر اس کو حتمی درجہ مقرر کیا جائے گا۔ اگر بہت سارے طرق ضعیف مل جائیں اور ان سب میں ضعف الگ الگ قسم کا ہو تو پھر اس حدیث کا درجہ عام ضعیف سے مختلف ہوگا۔

یہ ایک لمبی بحث ہے۔ مثلاً اگر مثالیں دوں گا تو بات اور بھی لمبی ہو جائے گی۔ ضعف الگ الگ قسم کا ہو اور مختلف درجات اور مراتب میں ضعف ہو تو وہ ایک دوسرے کو جبر کر دیتا ہے یعنی یہ دو قسم کا ضعف ایک دوسرے کو compensate کر دیتا ہے۔ پھر وہ حدیث حسن کے درجہ پر پہنچ جاتی ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ سب جگہ پر ایک ہی درجہ اور ایک ہی قسم کا ضعف ہے تو وہ حدیث ضعیف ہے۔ فرض کریں ایک حدیث روایت ہوئی جس میں راوی الف نے بیان کیا کہ انہوں نے راوی ب سے یہ حدیث سنی۔ راوی ب نے بیان کیا کہ انہوں نے راوی ج سے سنی۔ راوی ج بیان کرے کہ انہوں نے راوی د سے سنی۔ راوی د بیان کرتا ہے کہ انہوں نے فلاں صحابیؓ سے سنی اور فلاں صحابیؓ نے رسول اللہ ﷺ سے سنی۔ اب راوی د جو ہیں ان کی روایت یا سماع کسی صحابیؓ سے ثابت نہیں ہے اور وہ مثال کے طور پر تابعین میں سے نہیں ہیں۔ اب اگر بعد میں کوئی اور سند ایسی دستیاب ہو جائے جس میں ایک تابعی اسی حدیث کو کسی اور صحابیؓ سے روایت کرتے ہیں جن سے ان کی ملاقات ثابت ہے تو پھر یہ حدیث صحیح ہوگی اور جو کمزوری تھی وہ دور ہوگئی۔ گویا وہ خاص سند کمزور تھی، لیکن چونکہ متن دوسری صحیح سندوں سے بھی آیا ہے اس لئے متن اپنی جگہ درست قرار پا گیا۔ اس کے بارہ میں سمجھا جائے گا کہ اس کمزور روایت سے جو متن آیا ہے وہ حسن لغیرہ ہے۔ لیکن دوسری روایت سے جو آیا ہے وہ صحیح ہے۔

اگر تحقیق سے یہ پتہ چلے کہ جہاں جہاں تابعی سے صحابیؓ کا سلسلہ جڑ کر بیان کیا جاتا ہے وہاں یہ خلا پایا جاتا ہے۔ یا تو یہی ایک راوی ہو جو مختلف صحابہ سے بیان کرتا ہے اور اس کی ملاقات کسی صحابیؓ سے ثابت نہیں تو اس کا درجہ بہت نیچے چلا جائے گا۔ اس کو متہم بالکذب کہا جائے گا، جو موضوع سے ایک درجہ اونچا ہے اور جو ضعف کی سب سے نچلی قسم ہے۔ اگر کچھ تابعین ایسے ہیں جن کی روایت صحابہ کرام سے ممکن ہے یا ثابت ہے تو پھر سمجھا جائے گا کہ ضعف ذرا اونچے درجے کا ہے۔ اس لئے کسی حدیث کو حتمی طور پر ضعیف قرار دینے میں بہت احتیاط سے کام لیا جاتا ہے۔

یہ بات بتانا میں نے اس لئے ضروری سمجھی کہ بعض محدثین نے علم حدیث کی الگ الگ کتابوں کا جائزہ لے کر ان کی روایات کو بالکل ایک ایک کر کے یہ تعیین کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کا درجہ صحیح کا ہے، ضعیف کا ہے یا موضوع کا ہے۔ کسی حدیث کا موضوع ہونا تو واضح ہے۔ لیکن جب وہ کسی روایت کو صحیح یا حسن یا ضعیف قرار دیتے ہیں تو وہ صرف اس روایت کو ضعیف وغیرہ قرار دے رہے ہوتے ہیں جو اس طریق سے اس کتاب میں بیان ہوئی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ متن اگر مثلاً صحیح بخاری میں کسی اور طریق سے آیا ہو تو وہ بھی ضعیف ہو، وہ طریق ظاہر ہے ضعیف نہیں ہوگا۔ یہ وضاحت میں نے اس لئے کی کہ میں نے بہت سے لوگوں کو خود دیکھا ہے کہ ان کے سامنے ایک حدیث بیان ہوئی اور انہوں نے فوراً بھوں چڑھا کر کہہ دیا کہ یہ حدیث ضعیف ہے، اس لئے کہ فلاں بزرگ نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔ وہ دراصل بھول جاتے ہیں کہ جو ضعیف ہے وہ اس روایت کے ساتھ اس کتاب میں ضعیف ہے۔ لیکن اگر وہی روایت کسی اور روایت اور سند سے کسی اور کتاب میں آئی ہے تو ضروری نہیں کہ وہ بھی ضعیف ہو، ہو سکتا ہے کہ صحیح ہو، ہو سکتا ہے کہ حسن ہو، حسن لغیرہ ہو یا حسن لغیرہ ہو، بہرحال حتمی رائے دینے سے پہلے یہ دیکھ لینا چاہئے۔

چنانچہ حدیث کی وہ قسم جو ضعیف سند سے لوگوں تک پہنچی ہو لیکن اس کا ضعف ذرا ہلکی قسم کا ہو۔ جب آپ اس حدیث کو کسی جگہ بیان کریں اور آپ کے علم میں ہو کہ یہ حدیث ضعیف ہے تو بہترین طریقہ یہ ہے اور ذمہ داری کا تقاضا بھی ہے کہ یہ بیان کر دیں کہ یہ ضعیف حدیث ہے۔ لیکن اس ضعیف حدیث میں فلاں بات ارشاد فرمائی گئی ہے جو بظاہر درست ہے اس لئے اس پر عمل کرنا چاہئے۔ بہت سے لوگ اس بات کا اہتمام نہیں کرتے، کیوں نہیں کرتے، اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ جو لوگ ایسا نہیں کرتے ان کو کم از کم اتنا ضرور کرنا چاہئے اور اسی پر محدثین نے زور دیا ہے کہ وہ یہ نہ کہیں کہ قال رسول اللہ ﷺ، رسول اللہ ﷺ نے یہ بات ارشاد فرمائی۔ بلکہ اگر اس کو بیان کرنا ہی ہو تو صرف یہ کہنے پر اکتفا کریں کہ روایت میں آتا ہے کہ یہ بات ارشاد فرمائی گئی۔ یا بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ حضورؐ نے یہ بات ارشاد فرمائی، یا حضورؐ سے یہ منسوب ہے کہ آپؐ نے یہ بات ارشاد فرمائی، یا فلاں کتاب میں اس طرح آیا ہے، ترمذی شریف میں آیا ہے کہ فلاں کام اس طرح ہے۔ اس طرح آپ براہ راست رسول اللہ ﷺ سے نسبت کرنے سے بچ جاتے ہیں اور یوں ایک کمزور چیز کی نسبت حضورؐ سے نہیں ہو سکے گی۔

بعض محدثین اتنے اونچے درجے کے ہیں کہ ان سے اونچا درجہ علم حدیث میں اللہ نے بہت کم لوگوں کو عطا فرمایا۔ ان میں سے ایک نام یحییٰ بن معین ہیں۔ امام احمد بن حنبل ہیں، امام ابوزرعہ ہیں، امام بخاری ہیں۔ یہ لوگ بڑے اونچے درجہ کے ائمہ حدیث ہیں۔ جب اتنے اونچے درجے کے محدث یہ کہیں کہ لا اعرف هذا الحديث کہ میں اس حدیث سے واقف نہیں، یا مجھے نہیں پتہ کہ یہ حدیث کیا ہے تو پھر اس بات کے باور کرنے کے قوی امکانات ہیں کہ یہ حدیث صحیح یا حسن نہیں ہے، یا تو بالکل ہی ضعیف ہے یا موضوع ہے۔ لیکن کیا محض کسی ایک محدث کے کہنے سے ہم یہ کہہ دیں کہ حدیث موضوع ہے؟ یہ بھی احتیاط کے خلاف ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلاں بڑے محدث نے اس حدیث کے جاننے سے انکار کردیا ہے، لہٰذا یہ تفرد روایت معلوم ہوتی ہے۔ اس میں احتیاط سے کام لینا چاہئے اور مزید تحقیق کرلینی چاہئے۔

علل حدیث

یہ علم حدیث کا ایک اور اہم میدان ہے جو بڑا مشکل ہے، میں اس کی تفصیلی مثالیں دینا چاہتا تھا۔ لیکن ایک مثال دینے کے لئے بھی بڑی تفصیلی گفتگو چاہئے۔ امام ابوحاتم رازی کی کتاب علل الحدیث دو جلدوں میں چھپی ہوئی موجود ہے میں آج وہ ساتھ لانا چاہتا تھا لیکن پھر اس لئے نہیں لایا کہ کتاب سامنے رکھ کر علل پر گفتگو شروع کی تو بات بہت لمبی ہو جائے گی اور باقی موضوعات رہ جائیں گے۔ علل الحدیث سے مراد کسی حدیث میں متن یا سند کے اعتبار سے وہ کمزوری ہے جس کا عام طالب حدیث یا عالم حدیث کو پتہ نہ چلے اور جس کا پتہ چلانے کے لئے بڑی گہری بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ہے خلاصہ علل الحدیث کا۔ اور سب سے مشکل فن علم حدیث میں یہی ہے۔ یہاں ایک بات یاد رکھنی چاہئے۔ محدثین نے لکھا ہے کہ الحديث الصحيح لا يعلل بالضعيف یعنی ایک حدیث جو پہلے سے صحیح ہے، روایت کے اعتبار سے بھی صحیح ہے، سند اور متن کے اعتبار سے بھی صحیح ہے، درایت کے اعتبار سے بھی صحیح ہے اور آپ نے ان سب پہلوؤں سے تحقیق کرنے کے بعد یہ صحیح نتیجہ نکال لیا کہ یہ صحیح حدیث ہے۔ اب اسی موضوع پر کوئی کمزور یا معلل حدیث آپ کے سامنے آئی تو اس حدیث کے معلل ہونے کی وجہ سے پہلے سے صحیح ثابت شدہ اس حدیث پر اثر نہیں پڑے گا۔ بلکہ اس کے صحیح ہونے کی وجہ سے اس

معلل یا ضعیف حدیث کی علت دور ہو جائے گی۔ کمزور قوی کو متاثر نہیں کر سکتا، البتہ قوی کمزور کو متاثر کر سکتا ہے۔ یہ بھی ایک عقلی بات ہے۔

علم حدیث کے آداب

علم حدیث پر جن حضرات نے کتابیں لکھی ہیں ان میں علامہ خطیب بغدادی کی دو کتابیں بھی شامل ہیں۔ آپ میں سے جو لوگ عربی جانتے ہیں وہ ضرور یہ دونوں کتابیں پڑھیں۔ ان میں یہ بتایا گیا ہے کہ حدیث پڑھنے والوں کو کن آداب کی پیروی کرنی چاہئے۔ کل میں نے سفر یعنی رحلہ کے آداب کا ذکر کیا تھا۔ لیکن خود علم حدیث کے پڑھنے میں کن آداب کی پیروی کرنی چاہئے، محدث کے آداب کیا ہیں، طالب حدیث کے آداب کیا ہیں۔ لکھنے والے کے آداب کیا ہیں، املا کے آداب کیا ہیں، املا لینے اور دوسروں کو املا دینے کے آداب کیا ہیں۔ ایک تو مستملی وہ ہے جو شیخ سے املا لے کر آگے لوگوں کو بتا رہا ہے، اور دوسرا مستملی وہ ہے جو خود اپنے لئے لکھ رہا ہے۔ دونوں کے الگ الگ آداب ہیں اور اس پر الگ الگ کتابیں ہیں۔ امام خطیب بغدادی کی دو کتابیں اہم ہیں 'الکفایہ فی علم الروایۃ' اور 'الجامع فی آداب الراوی و اخلاق السامع'۔ ان میں انہوں نے راوی اور سامع کے آداب بتائے ہیں۔ الجامع دو جلدوں میں ہے اور الکفایہ ایک ضخیم جلد میں ہے۔ ان دونوں کتابوں میں انہوں نے جو آداب بتائے ہیں ان کی تلخیص امام غزالی نے احیاء العلوم میں کی ہے جس کے اردو اور انگریزی دونوں تراجم ملتے ہیں۔ انگریزی ترجمہ جو ہمارے ملک میں چھپا ہے، بڑا ناقص ہے۔ اس کو بھی آپ دیکھنا چاہیں تو دیکھ لیں، اس میں آپ کو آداب مل جائیں گے۔ اس نسخے میں اس کا حوالہ دے کر اس بات کو یہیں چھوڑ دیتا ہوں۔ اسی طرح کی ایک کتاب علامہ سمعانی کی ہے جس میں انہوں نے 'ادب الاملاء والاستملاء' بیان کئے ہیں، کہ املا کے آداب کیا ہیں اور استملاء کے آداب کیا ہیں اور جو شخص املا لے کر آگے بیان کرے گا یعنی مستملی، اس کے آداب کیا ہیں۔ اس کے علاوہ طالب حدیث کے آداب کیا ہیں، ان کا خلاصہ بھی امام غزالی نے دیا ہے وہاں سے دیکھ لیں۔

درس حدیث کی اقسام

ابتدا ہی سے حدیث پڑھانے کے تین انداز اور اسالیب مروج رہے ہیں۔ اور یہ بڑی

عجیب بات ہے۔ جب میں نے پہلی مرتبہ ان کے بارے میں پڑھا تو مجھے بہت حیرت ہوئی اور کسی حد تک وہ حیرت آج بھی موجود ہے۔ ان تینوں طریقوں کا بہت سے اہل علم نے ذکر کیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے استاد تھے شیخ ابوطاہر الکردی، جب آخر میں اپنی سند بیان کروں گا تو ان کا بھی نام آئے گا۔ اس لئے بالواسطہ طور پر وہ میرے بھی استاد ہیں۔ انہوں نے بھی ان تین طریقوں کی تفصیل بیان کی ہے۔

۱۔ ایک طریقہ ہے السرد کا۔ سرد کے معنی ہیں بیان کرنا یعنی simple naration۔ یہ طریقہ اہل علم کے لئے ہے، یعنی وہ لوگ جو حدیث کا اچھا علم رکھتے ہیں۔ اس طریقہ کے تحت شیخ کا کام یہ ہے کہ وہ حدیث کو بیان کرتا جائے، خود پڑھ کر سنائے یا طالب علم سے پڑھوا کر سنے یا ایک طالب علم پڑھے اور بقیہ طلبہ سنیں، یا ایک ایک کرکے سب سنائیں، یہ طریقہ سرد کہلاتا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر شیخ کا اور کوئی کام نہیں ہوتا۔ اس نے ایک کتاب پڑھ کر سنائی اور آپ کو اجازت دے دی۔ یا آپ نے پڑھ کر سنائی۔ اس نے سن کر آپ کو اجازت دے دی۔ یا ایک ایک کرکے سب نے پڑھ کر سنائی اور سب کو اجازت دے دی۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ یہ طریقہ علماء اور خواص کے ساتھ مخصوص ہے اس لئے کہ وہ پہلے سے علم حدیث پڑھ چکے ہیں۔ علم حدیث کے معانی اور مطالب کو جانتے ہیں۔ علمی سطح پر اس درجہ کے لوگ ہیں کہ علم حدیث کے سارے مباحث ان کے سامنے ہیں۔

۲۔ دوسرا طریقہ کہلاتا ہے طریق الحل والبحث۔ یعنی حدیث کی مشکلات حل کرنے اور مسائل پر بحث کرنے کا طریقہ۔ کہتے ہیں کہ یہ طریقہ حدیث کے طلبہ کے لئے ہے اور جو حدیث کے طلبہ ہوں ان کے لئے یہی طریقہ ہونا چاہئے۔ یہاں علم حدیث کے لغوی، فنی اور فقہی مباحث کا ذکر ہوگا۔ فنی مباحث سے مراد علم روایت اور علوم حدیث سے متعلق مباحث ہیں اور فقہی مباحث سے مراد ہے ان احادیث کی خصوصی تحقیق جہاں فقہ سے متعلق مسائل کا ذکر ہو، کلامی مباحث یعنی عقیدہ سے متعلق اور لغوی مباحث یعنی جہاں کوئی مشکل لفظ آگیا ہے اس پر بحث۔ یہ طریقہ طلبہ کے لئے ہے۔ ان اہل علم نے لکھا ہے کہ اس میں اعتدال اور توازن سے کام لینا چاہئے۔ زیادہ تفصیلی بحث نہیں کرنی چاہئے۔

۳۔ تیسرا طریقہ امعان کا ہے۔ امعان یعنی گہرائی سے کوئی کام کرنا۔ امعان کی

میں تعارض ہے تو وہ کے کر آ جاتا ہے۔ گویا اس کی بنا پر میں ایسی کوئی احادیث نہیں پائی جو تمام پہلوؤں سے ایک درجہ کی ہوں اور صحت کے بہت اونچے درجہ کی ہوں اور ان میں تعارض ہو۔

لیکن بظاہر بعض احادیث میں تعارض معلوم ہوتا ہے۔ یہ تعارض جو محسوس ہوتا ہے اس کو کیسے دور کیا جائے؟ اس کے لئے بڑی بڑی کوششیں ہوئی ہیں۔ کچھ وجوہ ترجیح یعنی grounds of preferance محدثین نے بیان کئے ہیں۔ اس علم نے تلاش کر کے ان کا پتہ چلایا کہ ان کی نشاندہی کی کہ وہ وجوہ ترجیح یعنی grounds of preferance کیا ہیں جو ائمہ حدیث اور فقہائے مجتہدین نے اختیار کئے ہیں۔ ان میں سے کچھ اسباب ترجیح تو وہ ہیں جو اسناد کے اعتبار سے ہیں، کچھ اسباب وہ ہیں جو متن سے تعلق رکھتے ہیں اور کچھ وہ ہیں جو مدلول کے اعتبار سے ہیں یعنی اس متن سے کیا بات ظاہر ہوتی ہے، اور کچھ حدیث سے متعلق دیگر پہلوؤں کے اعتبار سے ہیں۔ گویا وجوہ ترجیح یا اسباب ترجیح کی چار قسمیں ہیں۔

سند کے اعتبار سے ترجیح کی وجوہ تیرہ ہیں۔ متن کے اعتبار سے چھ ہیں۔ مدلول یعنی مفہوم کے اعتبار سے چار ہیں اور خارجی اسباب کے اعتبار سے سات ہیں۔ نمونہ کے طور پر ایک دو مثالیں دے دیتا ہوں۔

سند کے اعتبار سے وجوہ ترجیح سے مراد کیا ہے اور وہ وجوہ کیا ہیں؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر دو حدیثیں ایسی ہیں کہ دونوں سند اور متن ہر اعتبار سے اس درجہ کی ہوں جس پر کوئی صحیح حدیث ہوتی ہے۔ دونوں کے مندرجات سے یہ پتہ نہ چلتا ہو کہ دونوں حدیثیں کس زمانے کی ہیں۔ دونوں حدیثوں میں کوئی اندرونی شہادت ایسی نہ ہو جس سے کوئی اور مفہوم یا سیاق قطعی طور پر ظاہر ہوتا ہو تو پھر یہ دیکھا جائے گا کہ سند کس کی زیادہ قوی ہے۔ زیادہ راوی کس کے ہیں، بہتر راوی کس حدیث میں زیادہ ہیں اور جو کمتر راوی کس حدیث میں ہیں۔ کبار صحابہ سے کوئی حدیث مروی ہے اور صغار صحابہ سے کون سی ہے۔ کبار تابعین سے کون سی حدیث مروی ہے اور صغار تابعین سے کون سی مروی ہے۔ اس اعتبار سے تقریباً تیرہ وجوہ ترجیح ہیں جن کی بنیاد پر ان دونوں میں ایک کو ترجیح دی جائے گی اور دوسری پر عمل نہیں کیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک اجتہادی فیصلہ ہی ہو سکتا ہے جس کی بنیاد پر محدث یا فقیہ کو کوئی فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔

ضروری نہیں کہ یہ فیصلہ ہر صورت میں بالکل معروضی یا objective فیصلہ ہو۔ اس

میں ایک سے زیادہ قوی امکان ہوں گی۔ اس میں اختلاف رائے بھی ہوگا۔ ایک محدث کی نظر میں ایک حدیث کو ترجیح حاصل ہوگی تو دوسرے کی نظر میں دوسری حدیث کو ترجیح حاصل ہوگی۔ اس لئے ان مسائل پر زندگی میں کسی بھی لڑنے کا نہیں۔

مثال کے طور پر وجوہ ترجیح میں سے بعض کبار فقہا کے نزدیک ایک اہم وجہ ترجیح یہ ہے کہ اگر دونوں روایتیں برابر درجہ کی ہوں تو اس صحابی کی روایت کو زیادہ ترجیح دی جائے گی جن کو رسول اللہ ﷺ کی قربت زیادہ حاصل رہی ہوگی، بہ نسبت ان صحابی کی روایت کے جو حضور ﷺ کے اتنے قریب نہیں رہے۔ یہ بڑی معقول بات معلوم ہوتی ہے اور اس سے اختلاف کرنا بہت مشکل ہے۔

ایک اور وجہ ترجیح جو ایک معقول رائے پر مبنی ہے کہ جو بعد کا طرز عمل ہے اس کو ترجیح دی جائے گی، بہ نسبت پہلے کے طرز عمل کے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک عمل پہلے اختیار فرمایا اور دوسرا بعد میں اختیار فرمایا۔ دونوں احادیث بظاہر متعارض معلوم ہوں تو ایسے میں بعد والی حدیث کو ترجیح دی جائے گی، پہلی والی کو چھوڑ دیا جائے گا۔ امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں جہاں دونوں احادیث کے ترتیب صدور کی تعیین ممکن نہ ہو وہاں ان صحابی کی رائے کو ترجیح دی جائے گی جو حضور ﷺ کے زیادہ قریب رہے ہیں۔ جو صحابی حضور ﷺ سے زیادہ قریب نہیں رہے یا کم عرصہ قریب رہے ان کی روایت کو ترجیح نہیں دی جائے گی۔ چنانچہ رفع یدین کے مسئلہ پر لوگ بہت جھگڑتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ رفع یدین کی روایت نہیں کیا کرتے تھے اور بغیر ہاتھ اٹھائے رکوع میں جایا کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ دست مبارک اٹھا کر رکوع میں جایا کرتے تھے اور گویا رفع یدین کے ساتھ نماز پڑھا کرتے تھے۔ دونوں صحابی ہیں، دونوں کا درجہ بہت اونچا ہے، دونوں کی روایت کا درجہ بالکل برابر ہے۔ امام ابوحنیفہ کا ارشاد گرامی یہ ہے کہ یہاں ان صحابی کی روایت کو ترجیح دی جائے گی جو حضورؐ کے زیادہ قریب رہے۔ وہ صحابی جو مکہ مکرمہ کے چوتھے پانچویں سال اسلام میں داخل ہوگئے اور حضورؐ کے اتنے قریب تھے کہ باہر سے آنے والے ان کو اہل بیت میں سے سمجھتے تھے ان کی روایت کو ترجیح دی جائے گی، بہ نسبت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت کے جو غزوہ احد میں اس لئے واپس کردیئے گئے کہ کم سن تھے اور ابھی بچے تھے۔

یہ بہر حال امام ابو حنیفہؒ کی ایک رائے ہے جس کی ایک مضبوط عقلی بنیاد بھی موجود ہے۔

اس معاملہ میں ہر محدث اور ہر فقیہ کو ایک دلیل کی بنیاد پر رائے قائم کرنے کا اختیار ہے۔ اس بارے میں یہ کہنا کہ فلاں فقیہ کا طرز عمل سنت کے خلاف ہے، یا یہ عمل سنت سے متعارض ہے اور بدعت ہے، ایسا کہنا درست نہیں۔ یہ بھی سنت ہے اور وہ بھی سنت ہے۔ محدثین اپنے غیر معمولی علم وبصیرت اور اپنے غیر معمولی اخلاص وتقویٰ اور فقہاء اپنے غیر معمولی تفقہ کی وجہ سے ایک رائے کو زیادہ قوی اور دوسری رائے کو نسبتاً کم قوی سمجھتے ہیں اور ان میں سے جس نے جس رائے کو قوی تر سمجھا اس کو اختیار کر لیا۔

اسی طرح سے کچھ وجوہ ترجیح متن کے اعتبار سے ہیں کہ ایک حدیث کے متن میں کوئی عام اصول بیان ہوا ہے۔ اور ایک دوسری حدیث میں کسی خاص specific situation کے بارے میں کوئی بات بیان ہوئی ہے۔ یہاں یہ کہا جائے گا کہ ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ جہاں خاص صورت حال ہے وہاں یہ خاص حدیث قابل عمل ہوگی اور جہاں عمومی صورت حال ہوگی وہاں وہ عمومی حدیث قابل عمل ہوگی۔ دونوں مدلول کے اعتبار سے ایک دوسرے کو compensate کریں گی۔ مثال کے طور پر ایک حدیث وہ ہے جس میں احتیاط کا پہلو زیادہ سامنے آتا ہے اور ایک وہ ہے جس میں احتیاط کا پہلو نسبتاً کم ہے۔ مثلاً ایک حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ فلاں فعل جائز ہے اور ایک اور حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ یہ عمل جائز نہیں ہے۔ اب احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو ترک کیا جائے۔ مثال کے طور پر ایک جگہ آیا ہے کہ شیشہ کے گلاس میں پانی پینا مکروہ ہے، جبکہ ایک دوسری حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ مکروہ نہیں ہے۔ اب اس میں یہ تو نہیں کہا گیا ہے کہ شیشہ کے گلاس میں پانی ضرور پیا کرو۔ اس لئے احتیاط یہ ہے کہ نہ پیا جائے۔ جو شکل ہے کہ مکروہ ہو تو احتیاط کا تقاضا ہے کہ بلا ضرورت شیشہ کے قیمتی گلاس میں پانی نہ پیا جائے۔ یہ بعض لوگوں کی رائے ہے یہ ہے کہ یہاں اس حدیث پر عمل کیا جائے گا جس میں احتیاط زیادہ ہے بہ نسبت اس کے جس میں احتیاط کم ہے۔ اس طرح مدلول یا مفہوم کے اعتبار سے بھی کچھ اصول ہیں۔

کچھ اصول ہیں جو خارجی ہیں۔ یعنی حدیث کے الفاظ میں نہیں لیکن خارجی شواہد کی بنیاد پر اس سے ان اسباب کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً دو حدیثیں ہیں۔ ان میں سے ایک حدیث میں

جو بات ارشاد فرمائی گئی ہے وہ ائمہ اربعہ یا خلفائے اربعہ کا نقطہ نظر بھی ہے تو خلفائے راشدین کا نقطۂ نظر اس کے ساتھ شامل ہو گیا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسکی حدیث نسبتاً زیادہ قوی ہے اس پر عمل کیا جائے گا۔ یا مثلاً ایک وہ روایت ہے جس پر عمل اہل مدینہ بھی موجود ہے اور دوسری روایت ایسی ہے جس کی تائید کسی ایسے اجتماعی عمل سے نہیں ہوتی۔ اب یہاں دو روایتیں ہیں۔ دونوں اصول روایت، سند وغیرہ کے اعتبار سے برابر ہیں تو عمل اہل مدینہ والی روایت کو ترجیح دی جائے گی۔ میں نے اذان میں ترجیع سے متعلق امام ابو یوسف کی مثال دی تھی۔ امام ابو یوسف نے اپنی روایت کو چھوڑ کر اس کو قبول کیا، حالانکہ دونوں روایتیں صحیح تھیں۔ لیکن انہوں نے عمل اہل مدینہ کی وجہ سے اپنی روایت کو ترک کر دیا۔ اب یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ امام مالک اور امام ابو یوسف نعوذ باللہ حدیث کے تارک ہو گئے۔ نہیں حدیث کے تارک نہیں ہوئے، بلکہ دو برابر کی حدیثوں میں ترجیح اس کو دی جس کے حق میں عمل اہل مدینہ کی تائید بھی حاصل ہو رہی تھی۔

علم ناسخ اور منسوخ

علم حدیث میں آخری چیز علم ناسخ اور منسوخ ہے۔ رسول اللہ ﷺ جب دنیا میں بطور نبی اور پیغمبر کے تشریف لائے تو آپ کی چار ذمہ داریاں تھیں، یتلوا علیھم آیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ۔ یہ جو تزکیہ کا عمل تھا کہ لوگوں کا تزکیہ فرماتے تھے تو یہ افراد کا تزکیہ بھی تھا، خاندانوں کا تزکیہ بھی تھا، دل اور مزاج کا تزکیہ بھی تھا، لوگوں کے اوقات کا تزکیہ بھی تھا، نظام اور معاشرہ کا تزکیہ بھی تھا، ہر چیز کا تزکیہ تھا۔ کوئی چیز آپ نے تزکیہ کے بغیر نہیں چھوڑی، ہر چیز کو پاکیزہ اور ستھرا بنایا۔

اس ستھرا بنانے کے عمل میں ایک تدریج اور اعتدال حضورؐ نے پیش نظر رکھا۔ جو چیزیں بنیادی تھیں وہ پہلے بیان فرمائیں۔ جن کا اندازہ عمارت کی بنیادوں کے اوپر اٹھنے والی دیواروں کا تھا وہ آپ نے بعد میں بیان فرمائیں۔ جو دیواروں سے آگے بڑھ کر چھت کی نوعیت کی تھیں وہ آپ نے اس کے بعد بیان فرمائیں۔ جو بات ستون کی حیثیت رکھتی تھی وہ اپنے مقام پر بیان فرمائی۔ جو اس انداز کی تھی کہ مکان بننے کے بعد اس کی تکمیل کیسے ہو وہ آخر میں بیان فرمائی۔ یہ ایک منطقی ترتیب حضورؐ نے پیش نظر رکھی۔ جیسے ایک طبیب جب کسی پیچیدہ مرض کا علاج کرتا ہے تو پہلے ایک

دوا دیتا ہے، پھر دوسری پھر تیسری، پھر چوتھی اور بقیہ دواؤں کو ایک ایک کر کے چھڑوا دیتا ہے۔ پھر پرہیز بتا دیتا ہے اور بعد میں اس پرہیز کو ختم کر دیتا ہے کہ ٹھیک ہے اب کھاؤ۔

اسی طرح سے رسول اللہ ﷺ کے ارشادات میں یہ تدریج پائی جاتی ہے۔ اس تدریج میں جب کسی عمل کی ضرورت نہیں رہی تو وہ عمل ختم ہو گیا، وہ حدیث گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ منسوخ ہو گئی۔ مثال کے طور پر جب اسلام آیا تو عرب میں شراب نوشی بڑی کثرت سے رائج تھی۔ ہر جگہ شراب نوش اور مے خوار پائے جاتے تھے۔ شراب کی حرمت کا ذکر قرآن پاک میں تدریج کے ساتھ آیا اور جب مکمل حرمت آ گئی تو رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو شراب نوشی سے بالکل پاک اور صاف کرنے کے لئے بعض دوسری چیزوں کی بھی ممانعت کر دی۔ لیکن حضور کی یہ ممانعت وقتی طور پر کی تھی۔ صحیح مسلم میں ایک روایت ہے جو صحیح بخاری میں بھی ہے۔ ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ ہمارے قبیلے کا وفد جب حضور کی خدمت میں آیا تو آپ نے ہمیں فلاں فلاں چیزوں کا حکم دیا اور ان چیزوں سے روکا۔ ونہانا عن النقیر والمزفت والنتما۔ ہمیں چار چیزوں سے روکا۔ یہ چار قسم کے برتن ہوا کرتے تھے جن میں شراب رکھی جاتی تھی اور بنائی جاتی تھی۔ کسی برتن میں فی نفسہٖ کوئی اچھائی یا برائی نہیں ہے۔ لیکن ایک برتن ہوتا تھا جو کدو سے بنتا تھا۔ اس زمانے میں جو پلاسٹک کی چیزیں نہیں ہوتی تھیں، اس کے بجائے ایک بڑا کدو لے کر اس کو خشک کر دیا کرتے تھے۔ وہ کدو خشک ہونے کے بعد لکڑی کی طرح سخت ہو جاتا تھا۔ اندر سے اس کا ریشہ نکال کر اس کو کھوکھلا کرتے تھے۔ اس میں کھجور یا انگور کا رس بھر کے اس کو اوپر سے بند کر کے درخت سے لٹکا دیتے تھے۔ وہ کئی دن تک لٹکا رہتا تھا۔ ہوا کی ٹھنڈک اور دھوپ کی نرمی سے اس میں خمیر پیدا ہو جاتا تھا اور وہ شراب بن جاتی تھی۔ بعد میں اس برتن کو دیگر مقاصد کے لئے بھی استعمال کرتے تھے۔ اس کو دباء کہتے تھے۔ اب بظاہر اس میں کوئی قباحت نہیں کہ آپ کدو لیں اور اس کو خشک کر کے برتن بنا لیں۔ لیکن چونکہ یہ برتن خاص شراب نوشی اور شراب سازی کے لئے استعمال ہوتا تھا اس لئے حضور ﷺ نے اس کی بھی ممانعت فرما دی۔ جب شراب کا بالکل خاتمہ ہو گیا اور لوگوں نے مکمل طور پر شراب چھوڑ دی پھر ان برتنوں کی ممانعت کی ضرورت نہیں رہی۔ اب اگر کوئی شخص کدو کا برتن بنانا چاہے تو بنا سکتا ہے۔

اسی طرح سے ایک موقع پر آپ نے فرمایا کہ "کنت نہیتکم عن زیارۃ

دسواں خطبہ

کتب حدیث - شروح حدیث

جمعرات، 16 اکتوبر 2003ء

کتب حدیث - شروح حدیث

آج کی گفتگو میں حدیث کی چند مشہور کتابوں اور ان کی شرحوں کا تعارف مقصود ہے۔ یہ تعارف دو حصوں پر مشتمل ہوگا۔ حدیث کی وہ بنیادی کتابیں اور ان کی وہ شرحیں جو برصغیر سے باہر لکھی گئیں، ان پر آج کی نشست میں گفتگو ہوگی۔ وہ کتب حدیث اور شرحیں جن کی تصنیف کا کام برصغیر میں ہوا ان میں سے چند ایک کے بارہ میں کل بات ہوگی۔

علم حدیث جس کی تدوین، تاریخ اور علوم وفنون کا تذکرہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ گزشتہ دنوں میں ہوا ہے، اس سے بخوبی یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ محدثین کرام نے جو بے مثال کام کیا ہے وہ امت کی طرف سے کتنے شکر اور کتنے غیر معمولی امتنان واعتراف کے مستحق ہیں۔ اللہ رب العزت نے ان لوگوں کو جس اہم اور عظیم الشان کام کے لئے منتخب فرمایا وہ صرف اسلام کی تاریخ میں بلکہ پوری انسانیت کی تاریخ میں ایک نہایت منفرد نوعیت کا کام ہے۔ انہوں نے ایک ایسا کارنامہ انجام دیا جس کی مثال انسانوں کی فکری، علمی، مذہبی اور تہذیبی تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ سارا کام جو در اصل امت مسلمہ کی فکری اور تہذیبی بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے، آج ہم میں سے بہت سے لوگوں کے سامنے نہیں ہے۔

ان حضرات نے یہ قربانیاں دیں، یہ قربانیاں دے کر دنیا سے تشریف لے گئے۔ بعض حضرات نے یہ مشقتیں برداشت کیں، وہ مشقتیں اللہ کی بارگاہ میں یقیناً قبول ہوئی ہوں گی۔ ان سب مشقتوں کی تفصیل ان سب حضرات کے حالات میں لکھی ہوئی ہے۔ ان بے پناہ مشقتوں کا علم یا صرف اللہ کو ہے یا ان حضرات کو ہے جنہوں نے یہ مشقتیں برداشت کیں۔ ہمارے سامنے

قارئین کے لئے یا علم حدیث کے عام طلبہ کے لئے وہ مجموعے زیادہ دلچسپی اور زیادہ اہمیت رکھتے ہیں جو عام طور پر کتب خانوں میں دستیاب ہیں، جو اپنی ترتیب کی خوبی اور جامعیت کی وجہ سے دوسرے قدیم تر مجموعوں سے زیادہ مفید اور مقبول ہیں۔

موطا امام مالکؒ

ان میں معروف اور متداول ہونے کے اعتبار سے قدیم ترین مجموعہ امام مالک کی موطا ہے۔ موطا سے پہلے بھی مجموعے تیار ہوئے اور ان میں سے بعض آج بھی موجود ہیں لیکن وہ مقبول اور متداول مجموعے نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ذکر عام طور پر علم حدیث کے سیاق و سباق میں کم ہوتا ہے۔ متداول اور معروف و مقبول اور مشہور مجموعوں میں قدیم ترین مجموعہ امام مالک کی موطا ہے۔ موطا کے لفظی معنی تو ہیں: Beaten Track یعنی وہ راستہ جس کو لوگوں نے بے در بے چل کر اتنا ہموار کر دیا ہو کہ بعد والوں کے لئے اس پر چلنا آسان ہو گیا ہو۔ امام مالک نے جب موطا مرتب کی تو انہوں نے کوشش کی کہ وہ تمام احادیث، صحابہ کرامؓ کے آثار، تابعین کے اجتہادات اور عمل اہل مدینہ پر معلومات و تحقیقات کے وہ خزائن اس میں جمع کر دیے جائیں جن پر مسلسل عمل درآمد ہو رہا ہے اور جو ایک لمحے کے لئے بھی عمل سے خالی نہیں رہے۔ پھر امام مالک نے اس کتاب کو مرتب کرنے کے بعد اپنے ہم عصر جید ترین اہل علم کی بڑی تعداد کو، جن کے بارے میں بعض حضرات کا خیال ہے کہ ان کی تعداد ستر تھی، ان کو دکھایا اور ان کی منظوری اور پسند کے بعد امام مالک نے اس مجموعے کو مشتہر کیا۔

یہ بات کہ امام مالک کو یہ مجموعہ مرتب کرنے کا خیال کیوں آیا۔ اس کے بارے میں بعض روایات کتب حدیث اور کتب تاریخ میں بیان ہوئی ہیں۔ ایک بات جو عام طور سے مشہور ہے جو بظاہر درست معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ امام مالک نے یہ مجموعہ عباسی خلیفہ منصور کے کہنے پر مرتب کیا تھا۔ منصور عباسی خاندان کا ایک نہایت نامور، ذہین اور صاحب علم فرد تھا۔ اس نے خود ایک طویل عرصہ مدینہ منورہ میں گزارا تھا۔ امام مالک کا ہم درس تھا اور امام مالک کے ساتھ مل کر بہت سے اہل علم سے اور بہت سے محدثین اور فقہاء سے اس نے کسب فیض کیا تھا۔ اس نے خلیفہ بننے کے بعد امام مالک سے یہ درخواست کی کہ اس وقت دنیائے اسلام میں، جو اس وقت

ایک ہی مملکت پر مشتمل تھی، ایک کتاب کی ضرورت ہے جس کی تمام عبارتیں مفتی صاحبان اور فقہ اسلامی پر کام کرنے والے تمام لوگ پیروی کریں، اتنی مختصر ہو کہ ہر شخص اس سے استفادہ کر سکے، اتنی چھوٹی بھی نہ ہو کہ لوگ اس سے استفادہ نہ کر سکیں اور نہ اتنی ضخیم بھی نہ ہو کہ اس کو پڑھنے وقت طلب ہو جائے۔ اس میں ان تمام سنتوں اور احادیث کو جمع کیا جائے جن پر حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے زمانے سے عمل ہوتا آیا ہے۔ صحابہ کرامؓ اور تابعین کے وہ اقوال بھی اس میں شامل ہوں جن سے قرآن پاک اور احادیث کے مفہوم کو سمجھنے میں مدد ملے۔ نہ اس میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے شواذ ہوں، نہ عبداللہ بن عباسؓ کی رخصتیں ہوں اور نہ عبداللہ بن عمرؓ کی سختیاں ہوں بلکہ وہ ایک درمیانی راستے کو بیان کرتی ہو۔

امام مالک نے اس تجویز کے مطابق مؤطا کی تصنیف شروع کی اور ایک طویل عرصہ تک اس کے لئے مواد جمع کرتے رہے۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ انہوں نے چالیس سال اس کام میں لگائے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ چالیس سال منصور کے کہنے کے بعد نہیں لگے ہوں گے۔ وہ پہلے سے علم حدیث پر جو کام کر رہے تھے اور جو یادداشتیں وہ مرتب کر رہے تھے، امام مالک نے انہی کو سامنے رکھ کر منصور کی تجویز کے مطابق مجوزہ کتاب پر کام شروع کر دیا۔

امام مالک اس کام کے لئے یقیناً اپنے زمانے کی موزوں ترین شخصیت تھے۔ علم حدیث میں بھی ان کو بڑا نمایاں مقام حاصل تھا اور علم فقہ میں بھی وہ اتنا نمایاں مقام رکھتے ہیں کہ چار بڑے مسالک فقہ میں سے ایک کے بانی ہیں۔ امام مالک نے مدینہ منورہ میں جن اصحاب علم سے سب سے زیادہ استفادہ کیا وہ تمام جلیل القدر صحابہ کرامؓ کے علوم و فنون کے جامع تھے۔ حضرات شیخین یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت علی بن ابی طالبؓ، حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہ صحابہ کرامؓ میں ان سے زیادہ حدیث اور سنت کی سختی سے پیروی کرنے والا مشکل سے ملے گا، حضرت عبداللہ بن عباسؓ جو ترجمان القرآن اور حبر الامۃ یعنی امت کے سب سے بڑے عالم کہلاتے تھے، حضرت ابوہریرہؓ جو ایک طویل عرصہ مدینہ منورہ میں حدیث کی روایت کرتے رہے اور جو سب سے بڑی تعداد میں احادیث کے راوی ہیں۔ حضرت زید بن ثابتؓ جو کاتب وحی اور دربار رسالت کے سیکرٹری تھے۔ ان سب کے علوم و فنون مدینہ منورہ میں موجود تابعین تک پہنچے۔ امام مالک نے ان سب تابعین سے کسب فیض کیا اور یہ سارے علوم ان تک منتقل ہوئے۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، مدینہ منورہ میں صحابہ کرامؓ کے بعد جو نسل بہت نمایاں ہوئی ان میں فقہائے سبعہ کا مقام بہت بلند ہے۔ فقہائے سبعہ وہ حضرات ہیں جو مدینہ منورہ میں علم حدیث اور علم فقہ میں سب سے نمایاں تھے۔ دنیا بھر سے لوگ ان کے پاس استفادہ اور تحقیق کے لئے آیا کرتے تھے۔ یہ حضرات مدینہ منورہ کے صحابہ کرامؓ کے علوم وفنون کے امین اور جامع تھے۔ امام مالک کو ان حضرات کا علم بھی پہنچا۔ انہوں نے ان حضرات کے تلامذہ سے اور ان کی تحریروں سے استفادہ کیا۔ ان کے اساتذہ میں نافعؒ بھی شامل تھے جو تیس سال حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ شب و روز رہے۔ سفر میں بھی ساتھ رہے اور حضر میں بھی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے علاوہ انہوں نے دوسرے مدنی صحابہ سے بھی کسب فیض کیا۔ دنیائے اسلام کے دوسرے شہروں میں بھی گئے

امام مالک نے بہت بچپن میں، کم سنی میں امام نافع کی صحبت اختیار کر لی تھی اور ایک طویل عرصہ جس کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چوبیس سال یا اس کے لگ بھگ ہے، وہ امام نافع کے پاس رہے۔ امام نافع کے انتقال کے بعد ہی امام مالک نے اپنا حلقہ درس قائم کیا۔ اس کے علاوہ امام مالک نے اپنے زمانے کے بڑے بڑے اساتذہ اور مدینہ منورہ کے صف اول کے محدثین اور فقہا سے علم حاصل کیا۔ امام زہری، امام جعفر صادق، یحییٰ بن سعید انصاری، امام لیث بن سعد جو امام شافعی کے بھی استاد ہیں اور جن کا مزار مصر میں ہے، اور ربیعۃ الرائے جو امام مالک کے اساتذہ میں بڑا نمایاں مقام رکھتے ہیں، ان سب کے علوم وفنون سے استفادہ کرنے کے بعد امام مالک نے موطا امام مالک لکھی۔

امام مالک کے بارے میں ایک چیز بڑی نمایاں ہے، وہ یہ کہ ان کے شیوخ کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ بقیہ محدثین کے تذکروں میں آپ نے سنا ہوگا کہ کسی نے ہزاروں محدثین سے استفادہ کیا، کسی نے اتنے سو سے کسی نے ہزار سے۔ امام مالک کے شیوخ کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ ان کے شیوخ کی تعداد چار سو ہے۔ کسی نے کہا کہ [illegible] ہے۔ کسی نے اس سے کم و بیش بیان کی ہے۔ بعض نے نوے اور سو کے درمیان ان کے شیوخ کی تعداد بیان کی جاتی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ امام مالک نے پہلے دن سے یہ طے کیا تھا کہ میں صرف ان شیوخ سے

کسب فیض کیا ان کا جو علم حدیث کے ساتھ ساتھ تفقہ میں بھی بڑا اونچا مقام رکھتے تھے؛ دین اور حدیث کے فہم اور اس کی انطباق اور اس سے نکلنے والے مسائل پر بھی ان کی گرفت مضبوط ہو۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں کہ میں کسی غیر فقیہ کی محفل میں نہیں بیٹھا اور جن کی محفل میں بیٹھ کر استفادہ کیا وہ سب کے سب جید فقہا تھے۔ خود ایک جگہ فرمایا کہ میں نے محض کسی کے زہد و اتقاء کی بنیاد پر اس کی شاگردی اختیار نہیں کی بلکہ صرف ان حضرات کی شاگردی اختیار کی جو زہد و اتقاء کے ساتھ ساتھ علم حدیث اور روایت میں اونچا مقام رکھتے تھے، اور تفقہ اور بصیرت میں بہت آگے تھے۔ انہوں نے صرف ایسے ہی لوگوں سے کسب فیض کیا۔ ایک جگہ لکھا کہ میں نے مدینہ منورہ میں ایسے ایسے لوگ دیکھے کہ اگر ان کا نام لے کر دعا کی جاتی تو شاید اللہ تعالیٰ بارش برسا دیتا، گویا دین، تقویٰ اور روحانیات میں وہ اس درجہ کے لوگ تھے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ ان میں سے کچھ تفقہ میں اونچا مقام نہیں رکھتے تھے اس لئے میں ان کے حلقہ درس میں نہیں بیٹھا۔ یہی وجہ ہے کہ امام مالک کے اساتذہ کی تعداد نسبتاً تھوڑی ہے۔ لیکن وہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے کہ جب ایک مرتبہ یہ ثابت ہو جاتا تھا کہ فلاں شیخ امام مالک کے استاد ہیں تو پھر محدثین ان کے حفظ و ضبط اور عدالت وغیرہ کی مزید تحقیق نہیں کرتے تھے۔ امام یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ کوئی راوی امام مالک کے اساتذہ میں شامل ہے تو میں اس راوی کی مزید تحقیق نہیں کرتا۔ امام احمد بن حنبل کا کہنا ہے کہ اگر کسی شیخ سے امام مالک نے روایت لی ہو تو پھر اس شیخ کی روایت قبول کرنے میں مجھے کوئی تامل نہیں۔

ایسے برگزیدہ شیوخ سے روایتیں لے کر امام مالک نے موطا مرتب فرمائی جو ایک لاکھ احادیث میں سے انتخاب ہے۔ آپ کو احادیث کے متون تھوڑے ہیں روایات اور سندیں زیادہ ہیں۔ ایک لاکھ طریقوں سے جو روایات پہنچی تھیں ان میں سے امام مالک نے انتخاب کیا جس میں کم و بیش ایک ہزار سے کچھ کم احادیث ہیں اور دو ہزار کے قریب صحابہ اور تابعین کے اقوال، ارشادات اور آثار ہیں۔ یہ سارے کے سارے اندراجات وہ ہیں جو خالص عملی مسائل سے متعلق ہیں۔ روزمرہ کی زندگی میں انسان کو روزانہ انفرادی اور اجتماعی معاملات میں جن چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے وہ سارے کے سارے معاملات امام مالک کی موطا میں موجود ہیں۔ اس میں جتنی بھی احادیث ہیں جو ایک ہزار کے لگ بھگ ہیں، وہ ساری کی ساری صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں موجود ہیں۔ محدثین نے تحقیق کرکے اس بات کی تصدیق کی ہے وہ سب کی سب صحیح اور مرفوع

روایات ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی صحت کے اعلیٰ درجہ سے نیچے نہیں ہے۔ اسی لئے صحیحین سے پہلے کے زمانے میں جب صحیح مسلم اور صحیح بخاری مرتب نہیں ہوئی تھیں عام طور پر لوگوں کا کہنا یہ تھا کہ موطا امام مالک اصح کتب بعد کتاب اللہ ہے۔ امام شافعی کا یہ ارشاد بہت سی کتابوں میں منقول ہے کہ کتاب اللہ کے بعد صحیح ترین کتاب موطا امام مالک ہے، اس لئے کہ اس وقت صحیح بخاری اور صحیح مسلم موجود نہیں تھیں۔ بعد میں چونکہ یہ سارا ذخیرہ بخاری اور مسلم میں شامل ہوگیا، اس میں مزید صحیح احادیث بھی شامل ہوگئیں اور صحابہ اور تابعین کے اقوال جو موطا امام مالک میں تعلیقات یا بلاغات کے طور پر آئے تھے ان کتابوں میں براہ راست سند کے ذریعے بیان ہوگئے اس لئے ان دونوں کتابوں میں سے کسی ایک کتاب کو (زیادہ تر حضرات نے صحیح بخاری کو) اصح الکتب بعد کتاب اللہ قرار دیا ہے۔

امام مالک ایک طویل عرصہ تک موطا پڑھاتے رہے۔ طلبہ دور دور سے ان کے پاس آیا کرتے تھے اور موطا امام مالک کا درس لیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے امام مالک کو جو مرتبہ عطا فرمایا اس کا اندازہ دو چیزوں سے ہوتا ہے۔ ایک حدیث ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا کہ عنقریب ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ لوگ اونٹ کی پشت کو کستے ہوئے دور دور کا سفر کریں گے اور علم دین کی تلاش میں نکلیں گے لیکن مدینہ کے عالم سے بڑا کوئی عالم انہیں نہیں ملے گا۔ اکثر محدثین اور علمائے حدیث کی بڑی تعداد کے نزدیک اس حدیث کا مصداق امام مالک ہیں۔ اس لئے کہ ان کے زمانے میں ایسا کوئی عالم نہیں تھا جس کی خدمت میں لوگ دور دور سے آئیں۔ تین براعظموں سے لوگ امام مالک کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ افریقہ، ایشیا اور یورپ۔ چنانچہ اسپین سے امام یحیٰ بن یحیٰ المصمودی جو ان کے شاگردوں میں سب سے نمایاں مقام رکھتے ہیں اور موطا امام مالک کے سب سے مقبول نسخہ کے راوی ہیں، ان کا تعلق یورپ سے تھا۔ ایشیا میں خراسان اور سمرقند جیسے دور دراز علاقوں سے لوگ ان کی خدمت میں آئے اور موطا امام مالک کا درس لے کر گئے۔

اللہ تعالیٰ نے امام مالک کو غیر معمولی عزت اور بڑے مال و دولت سے نوازا تھا۔ وہ جس مکان میں رہتے تھے وہ ایک زمانہ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا مکان رہ چکا تھا اور جس مکان میں درس حدیث کی محفل لگتی تھی وہ حضرت عمر فاروقؓ کا مکان تھا۔ درس حدیث کے لئے

وہاں بڑا ہی پُرتکلف اہتمام ہوتا تھا۔ صفائی نہایت اہتمام سے کرائی جاتی تھی۔ عود وغیرہ وہاں کی خوشبو جلائی جاتی تھی۔ امام مالک غسل کرتے اور عمدہ لباس پہن کر آتے تھے اور تمام حاضرین مؤدب ہو کر بیٹھتے تھے۔ ایک مرتبہ امام ابوحنیفہ حاضر ہوئے اور بقیہ عام طلبہ کی طرح مؤدب ہو کر بیٹھ گئے۔ اسی طرح جو بھی آتا تھا وہ چھوٹا ہو یا بڑا، اسی طرح مؤدب ہو کر بیٹھ جاتا تھا۔ امام شافعی بھی طالب علم کی حیثیت سے اس درس میں شریک ہوتے رہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ کتاب کا ورق بھی اتنا آہستہ پلٹتے تھے کہ ورق پلٹنے کی آواز نہ ہو۔ آواز ہوگی تو محفل کے سکون اور کیفیت میں خلل پڑے گا۔

ایک دیکھنے والے نے بیان کیا کہ یہاں دربار شاہی جیسا رعب و داب ہوا کرتا تھا۔ جب پڑھنے والے پڑھ کر نکلتے تھے تو دروازے پر سواریوں کا ہجوم ایسا ہوتا تھا جیسے شاہی دربار برخاست ہو گیا ہو اور سواریاں نکل نکل کر جا رہی ہوں۔ کسی بھی آدمی کو وہاں کوئی خصوصی یا نمایاں مقام حاصل کرنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ خلفائے وقت مہدی، ہارون اور منصور تینوں کو اپنے اپنے زمانے میں امام مالک کے درس میں بیٹھنے کا موقع ملا۔ یہ لوگ اس درس میں آئے تو عام آدمی کی طرح طالب علم کی حیثیت سے بیٹھے اور اسی طرح مؤدب ہو کر بیٹھے رہنے کے بعد چلے گئے۔ خلیفہ مہدی نے ایک مرتبہ گزارش کی کہ میں مدینہ منورہ آیا ہوں۔ میری تین گزارشات ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ مجھے موطا امام مالک کی اجازت عطا فرمائیں، دوسری یہ کہ میرے دونوں بیٹوں کو درس میں حاضری کا موقع دیں، اور تیسری یہ کہ میرے بیٹوں کے لئے خصوصی محفل کا اہتمام فرمائیں۔ امام مالک نے کہا کہ پہلی دونوں درخواستیں قبول ہیں تیسری قابل قبول نہیں ہے۔ صاحبزادے محفل میں آئیں جہاں جگہ ملے بیٹھ جائیں اور درس لے کر چلے جائیں۔ چنانچہ مہدی کے دونوں بیٹے، اس فرمانروا کے بیٹے جس کی حکومت اسپین سے لے کر سمرقند اور بخارا تک اور آرمینیا اور آذربائیجان سے لے کر سوڈان تک پھیلی ہوئی تھی، اس کے بیٹے امام مالک کے درس میں عام لوگوں کی طرح بیٹھے اور درس لے کر چلے گئے۔ آپ نے فرمایا اور یہ جملہ مشہور ہے کہ العلم یؤتی ولا یأتی۔ علم کی خدمت میں حاضر ہوا جاتا ہے، علم کسی کی خدمت میں حاضر نہیں ہوتا۔

کچھ زمانے کے بعد خلیفہ ہارون ان کے دربار میں آیا اور گزارش کی کہ امام مالک کوئی حدیث پڑھ کر سنا دیں تاکہ میں [illegible] اور حدثنا کی اسلوب پر۔ مجھے حدیث پڑھنے کی اجازت دے دیں۔ امام مالک نے کہا کہ میرا اسلوب حدثنا کا نہیں بلکہ اخبرنا کا ہے۔ موطا کا نسخہ مجھ سے

مجھے پڑھ کر سنائیے میں ان کی اجازت دے دوں گا۔ میرا طریقہ یہ ہے جس کو میں خلیفۂ وقت کی کے لیے بھی بدل نہیں سکتا۔ چنانچہ ہارون الرشید نے بیٹھ کر موطا امام مالک پڑھی اور پڑھ کر اجازت لی جیسے کہ باقی شاگرد اجازت لیا کرتے تھے۔

امام شافعی جب امام مالک کی خدمت میں حاضر ہوئے تو امام مالک کا آخری زمانہ تھا۔ امام مالک ان دنوں صرف خصوصی طلبہ کو موطا کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ عام درس انہوں نے بند کر دیا تھا۔ امام مالک کی عمر پچانوے برس کے قریب ہو گئی تھی۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب ان کی عمر نوے یا ترانوے سال تھی۔ صحت اجازت نہیں دیتی تھی کہ زیادہ پڑھانے پر طلبہ کو درس دیں۔ امام مالک کی خدمت میں حاضری سے پہلے امام شافعی نے مکہ مکرمہ کے گورنر سے مدینہ منورہ کے گورنر کے نام سفارشی خط لیا کہ نوجوان محمد بن ادریس شافعی کو امام مالک کے دربار میں پہنچا دیا جائے اور اجازت دلوائی جائے کہ یہ موطا کے درس میں شریک ہوں۔ امام شافعی گورنر مدینہ کے پاس گورنر مکہ کا وہ خط لے کر گئے اپنا تعارف کرایا، خط پیش کیا اور امام مالک کے درس میں شریک ہونے کے لئے سفارش چاہی۔ گورنر نے کہا کہ چلیں میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔

جب دونوں امام مالک کے دردولت پر پہنچے تو ملازم نے کہا کہ یہ ان کے آرام کا وقت ہے۔ آپ کو ملنا ہو تو فلاں وقت پر آسکتے ہیں۔ گورنر صاحب واپس چلے گئے۔ امام مالک کے اٹھنے کا وقت ہوا تو یہ دونوں دوبارہ پہنچے وہاں جا کر گورنر نے بہت ادب اور احترام سے درخواست کی اور اپنی شرمندگی دور کرنے کی غرض سے مکہ کے گورنر کا خط بھی پیش کر دیا کہ میں اس سفارش کے سلسلے میں حاضر ہوا ہوں۔ امام مالک نے خط دیکھ کر پھینک دیا اور کہا کہ اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث گورنروں کی سفارشوں پر پڑھائی جایا کرے گی اور ناخوشی کا اظہار کیا۔ گورنر نے معذرت کی۔ امام شافعی نے عرض کیا کہ میرا تعلق رسول اللہ ﷺ کے خاندان سے ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ امام شافعی مطلبی تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے پردادا جناب ہاشم کے بھائی مطلب کی اولاد میں سے تھے۔ مطلب جناب ہاشم کے بھائی تھے اور امام شافعی ان کی اولاد میں سے تھے۔ یہ نسبت سن کر امام مالک نے اجازت دے دی۔ مکہ اور مدینہ کے گورنروں کی سفارش کو تو انہوں نے درخور اعتنا نہیں سمجھا لیکن رسول اللہ ﷺ کے خاندان کی نسبت کا لحاظ کر کے اجازت دے دی۔

اس سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ وہ کس شان کا درس ہوتا ہوگا اور کیسے لوگ موطا کا درس لیتے ہوں گے۔ موطا کا درس کتنے لوگوں نے لیا؟ اس کا تعین کرنا بہت دشوار ہے۔ بلا شبہ وہ ہزاروں لوگ ہوں گے۔ جن لوگوں کو تحریری طور پر باقاعدہ اجازت عطا ہوئی ان کی تعداد بھی سیکڑوں میں ہے، ایک ڈیڑھ ہزار کے قریب ہے۔ ہر علاقہ میں یہ حضرات موجود تھے۔ تمام بڑے بڑے محدثین بالواسطہ یا بلاواسطہ امام مالک کے شاگرد ہیں۔ امام احمد، امام بخاری، امام ابوداود، امام ترمذی اور امام نسائی یہ سب حضرات ایک ایک واسطے سے امام مالک کے شاگرد تھے۔ ائمہ فقہ میں سے امام شافعی اور امام محمد بن حسن شیبانی براہ راست امام مالک کے شاگرد تھے۔ اتنا غیر معمولی مقام و مرتبہ جس شخص کو حاصل ہو جائے پھر اللہ تعالیٰ اس کے تواضع، خود اس کے کردار اور جواب دہی کے احساس کو برقرار رکھے، یہ بہت بڑی بات ہے۔

ایک مرتبہ ایک بڑی محفل میں مکہ مکرمہ تشریف فرما تھے۔ غالباً حج کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ مکہ مکرمہ میں جس طرح اور جس پیمانے پر شائقان علم کا رجوع ہوا ہوگا اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ بڑی تعداد میں لوگ جمع ہوئے۔ اس محفل میں جہاں بڑے بڑے لوگ موجود تھے، امام مالک سے چالیس سوالات کئے گئے۔ اڑتیس سوالات کے جواب میں فرمایا: لا ادری، مجھے نہیں پتہ۔ صرف دو سوالات کا جواب دیا کہ ہاں ان کا جواب میں جانتا ہوں۔

ایک مرتبہ ایک شخص چھ ماہ کی مسافت کا طویل سفر کر کے پہنچے۔ غالباً اندلس سے آئے تھے اور کوئی مسئلہ پوچھا۔ امام مالک نے بتایا کہ میں نہیں جانتا۔ یہ بات میرے علم میں نہیں ہے۔ اس نے تھوڑا سا ناخوشی کا اظہار کرنے کے لئے کہا کہ میں چھ مہینے کا سفر کر کے آیا ہوں، لوگوں نے آپ سے یہ مسئلہ پوچھنے کے لئے مجھے بھیجا ہے۔ میں جب واپس جاؤں گا تو ان لوگوں کو کیا جواب دوں گا۔ آپ نے کہا کہ ان سے کہنا کہ مالک نے کہا ہے کہ مجھے معلوم نہیں۔ جس چیز کے بارے میں مکمل اور سو فیصد تحقیق نہیں ہوا کرتی تھی اس کا جواب نہیں دیا کرتے تھے۔

موطا امام مالک کم و بیش 140ھ کے لگ بھگ مرتب ہوئی۔ جب موطا امام مالک مرتب ہوئی اور اس کو مقبولیت حاصل ہوئی تو اور بھی کئی لوگوں نے، جن میں کئی حضرات استناد اور ثقاہت کے اعتبار سے زیادہ بلند مرتبے کے نہیں تھے، کتابیں لکھنی شروع کر دیں۔ لوگوں نے امام مالک سے کہا کہ فلاں بھی کتاب لکھ رہا ہے، فلاں بھی کتاب لکھ رہا ہے، فلاں بھی لکھ رہا ہے۔ آپ نے

ایک بات اتنی فرق کی کہ آج جس کی تصدیق سب کے سامنے ہے۔ آپ نے فرمایا کہ حسن نیت کو بقا ہے۔ جس نے اچھی نیت سے لکھی ہوگی اس کی کتاب کو بقا ہوگی۔ آج کسی کو نہیں معلوم کہ وہ کتابیں کہاں گئیں۔ تذکروں میں ذکر ملتا ہے کہ لوگوں نے امام مالک کے مقابلہ میں کتابیں لکھی تھیں۔ لیکن وہ سب کتابیں فنا کا شکار ہو گئیں۔ لیکن بقا موطا امام مالک کو حاصل ہوئی۔

امام مالک کی کتاب میں چالیس ثنائیات ہیں۔ ثنائیات سے مراد وہ احادیث ہیں جن میں حضور اور امام مالک کے درمیان صرف دو واسطے ہوں۔ ایک امام مالک کے استاد اور دوسرے کوئی صحابی رسول ﷺ۔ ان میں سے ایک سند وہ بھی ہے جس کا میں کئی بار ذکر کر چکا ہوں۔ مالک عن نافع عن ابن عمر۔ امام مالک امام نافع سے روایت کرتے ہیں، وہ عبداللہ بن عمر سے۔ صرف دو واسطے ہیں۔

امام مالک سے موطا کا املا لینے والوں میں ہزاروں حضرات شامل تھے۔ سننے والے اور عمومی استفادہ کرنے والے تو پتہ نہیں کتنے ہوں گے، شاید لاکھوں ہوں گے۔ لیکن جن لوگوں نے پوری موطا امام مالک پڑھ کر اس کی باقاعدہ اجازت لی اور سند حاصل کی ان کی تعداد چودہ سو کے قریب ہے۔ ان چودہ سو میں سے تیس حضرات جو اپنی اپنی جگہ بڑے نامور صاحب علم ہوئے۔ حدیث اور فقہ کے امام ہوئے۔ انہوں نے اپنے اپنے لئے موطا کے نسخے تیار کئے۔ ان تیس نسخوں میں سے سترہ نسخے مشہور رہے ہیں۔ ان سترہ نسخوں میں سے جو سب سے متداول اور معروف نسخہ ہے وہ امام مالک کے شاگرد خاص یحییٰ بن یحییٰ کا ہے۔

یحییٰ بن یحییٰ اندلس سے تشریف لائے تھے۔ طویل عرصہ امام مالک کی خدمت میں رہے۔ موطا امام مالک کے اصل نسخہ کے راوی وہی ہیں۔ انہی کے نسخہ کو موطا کہا جاتا ہے۔ جب کہا جاتا ہے کہ موطا امام مالک میں یہ ہے تو مراد ہوتی ہے یحییٰ بن یحییٰ کا نسخہ۔ باقی نسخے ان کے مرتبین کی طرف منسوب ہوتے ہیں، مثلاً موطا امام محمد۔ تو یہ موطا امام محمد کی کتاب نہیں ہے بلکہ یہ امام مالک کی موطا کا وہ نسخہ ہے جو امام محمد نے تیار کیا۔ اسی طرح موطا قعنبی بھی ہے۔ قعنبی نے خود کوئی موطا تیار نہیں کی تھی بلکہ یہ موطا امام مالک کا وہ نسخہ ہے جو قعنبی نے تیار کیا۔ اسی طرح باقی نسخے ان کے تیار کرنے والوں کے ناموں سے مشہور ہوئے۔ یحییٰ بن یحییٰ کا نسخہ امام مالک کے نام سے منسوب ہوا۔

اس کا دوسرا ایڈیشن بھی آیا ہے۔ یہ بارہ جلدیں مصنف کے نام سے مشہور ہیں۔ مصنف اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں احادیث کے ساتھ ساتھ صحابہ اور تابعین کے اقوال اور فتاویٰ بھی موجود ہوں۔ اس لئے مصنف عبدالرزاق صحابہ اور تابعین کے فتاویٰ کا ایک بہت بڑا ماخذ ہے۔ اس میں تابعین کے فتاویٰ کے ساتھ ساتھ جو فتاویٰ تبع تابعین ہیں اور ان میں بھی جو بڑے فقہا ہیں جن میں خود امام عبدالرزاق بھی شامل ہیں، ان کے فتاویٰ کا ایک بڑا مجموعہ شامل ہے۔ امام عبدالرزاق بہت سے محدثین کے استاد ہیں۔ بہت سے محدثین نے ان سے کسب فیض کیا۔ علم حدیث اور علم فقہ دونوں میں ان کا بہت اونچا مقام ہے۔

امام عبدالرزاق کے بعد ایک اور مُصنَّف۔ (مُصنِّف سے مراد تو وہ آدمی ہے جس نے کوئی کتاب تصنیف کی ہو۔ لیکن مصنَّف نون کے زبر کے ساتھ کا مطلب ہے وہ کتاب جو تصنیف کی گئی ہو۔ علم حدیث کی اصطلاح میں مصنَّف سے مراد حدیث کی ایک خاص انداز والی کتاب ہے جس میں تمام ابواب پر حدیثیں مرتب کی گئی ہوں اور صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے اجتہادات اور اقوال سب موجود ہوں۔) ابوبکر بن ابی شیبہ کی مصنف بھی ہے جس کے کئی ایڈیشن نکلے ہیں کوئی بارہ جلدوں میں ہے کوئی دس میں ہے کوئی چودہ میں ہے کوئی سولہ میں ہے۔ ابوبکر بن ابی شیبہ کی وفات 235ھ میں ہوئی۔ اس لئے یہ دوسری صدی ہجری کے اواخر اور تیسری صدی ہجری کے اوائل کے محدث ہیں۔ ان کے اساتذہ میں امام سفیان بن عیینہ، عبداللہ بن مبارک، وکیع بن الجراح، امام شافعی کے استاد اور یحییٰ بن سعید قطان جیسے جید ترین محدثین شامل ہیں۔ ان کے براہ راست تلامذہ میں امام احمد، امام بخاری، امام مسلم، ابن ماجہ، ابوزرعہ اور ابوحاتم رازی جیسے لوگ شامل ہیں۔ مصنف ابی بکر بن ابی شیبہ کی ترتیب فقہی ابواب پر ہے۔ یعنی وہ مسائل جو فقہی نوعیت کے ہیں۔ مثلاً پہلے طہارت کے ابواب ہیں، پھر وضو کے ابواب ہیں، پھر نماز کے، پھر روزے کے، پھر حج کے پھر نکاح وطلاق وغیرہ کے ابواب ترتیب سے موجود ہیں۔ کل مسائل کے متعلق ابواب کی ترتیب کے ساتھ یہ کتاب فقہیات حدیث کا بہت بڑا ماخذ ہے اور احادیث احکام کا سب سے بڑا اور جامع مجموعہ ہے اور اتنا ضخیم ہے کہ چودہ سولہ جلدوں میں آیا ہے۔ اس لئے احادیث احکام ساری کی ساری اس میں آگئی ہیں۔

امام احمد کی یہ کتاب غیر معمولی علمی مقام رکھتی ہے۔ لیکن اس سے استفادہ بڑا مشکل تھا۔ آج بھی اس کتاب سے براہ راست استفادہ بڑا مشکل ہے۔ اس لئے کہ یہ مسند ہے اور مسند حدیث کی اس کتاب کو کہتے ہیں جس کی ترتیب صحابہ کرامؓ کی بنیاد پر ہو۔ اس کتاب میں سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی مرویات ہیں، پھر حضرت عمر فاروقؓ کی اور بقیہ عشرہ مبشرہ کی، پھر بقیہ صحابہ کرامؓ کی۔ اب کوئی آدمی جو علم حدیث سے زیادہ واقف نہیں ہے، وہ مسند امام احمد میں کوئی حدیث تلاش کرنا چاہے تو پہلے اس کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اس حدیث کے اصل راوی کون سے صحابیؓ ہیں۔ جب تک یہ معلوم نہ ہو مسند امام احمد میں کسی حدیث کا تلاش کرنا بڑا دشوار کام ہے۔ لیکن الحمدللہ اب یہ کام بہت آسان ہو گیا۔ اس لئے کہ ایک تو ونسنک کی انڈیکس آ گئی ہے۔ ونسنک کی انڈیکس ضرور دیکھ لیجئے گا۔ ونسنک ایک ڈچ مستشرق تھا جس نے مستشرقین کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ مل کر صحاح ستہ سمیت بڑی حدیث کی نو بڑی کتابوں کا ایک انڈکس تیار کیا جس میں صحاح ستہ، مسند امام احمد اور موطا امام مالک اور سنن دارمی شامل ہیں۔ ان نو کتابوں کا اس نے ایک Word Index تیار کیا ہے۔ حدیث کا کوئی ایک لفظ بھی آپ کو یاد ہو تو حروف تہجی کی ترتیب سے وہ اس میں شامل ہے۔ آپ اس انڈکس کی مدد سے اسے تلاش کر سکتے ہیں۔

اس انڈکس میں ان نو کتابوں کے ایک ایک مخصوص ایڈیشن کا حوالہ دیا گیا ہے۔ وہ ایڈیشن جن کا حوالہ ونسنک نے دیا ہے، وہ پچھلی صدی کے چھپے ہوئے ایڈیشن تھے، تیرھویں صدی کے اواخر یا چودھویں صدی کے بہت شروع کے چھپے ہوئے تھے۔ آج وہ ایڈیشن نہیں ملتے۔ حال ہی میں کسی ادارہ نے، غالباً کسی عرب ملک میں اس پرانے ایڈیشن کا ایک نیا ایڈیشن فوٹو کاپی سے چھاپ دیا ہے اور وہ ساری کی ساری نو کتابیں تیس جلدوں میں ایک ساتھ چھاپ دی ہیں تاکہ اگر اس انڈکس سے استفادہ کرنا ہو تو اس نئے ایڈیشن کی مدد سے آپ استفادہ کر سکیں۔ اس نئے ایڈیشن سے کام نسبتاً آسان ہو گیا ہے۔

لیکن ایک اور بڑا کام مسند امام احمد پر چودھویں صدی کے وسط میں ہوا۔ یہ کام مشہور مجاہد اسلام، داعی اسلام اور شہید اسلام شیخ حسن البنا کے والد احمد عبدالرحمن البنا نے کیا۔ حسن البنا شہید کے والد احمد عبدالرحمن البنا الساعاتی جو اپنی روزی کے لئے گھڑی سازی کا کام کرتے تھے۔ (ایک بجن نے پوچھا تھا کہ محدثین کماتے کہاں سے تھے تو حسن البنا کے والد نے پوری زندگی علم حدیث

کی خدمت کا کام کیا۔ لیکن گھڑیوں کی ایک دکان تھی جس سے ان کی آمدنی ہوتی تھی۔ چند گھنٹے وہاں بیٹھا کرتے تھے اس کے بعد باقی وقت علم حدیث کی خدمت میں صرف کرتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کا لقب الساعاتی پڑ گیا۔) انہوں نے مسند امام احمد کو ایک نئی ترتیب سے مرتب کیا جس کا نام ہے "الفتح الربانی في ترتيب المسند الإمام أحمد بن حنبل الشيباني"۔ الفتح الربانی میں انہوں نے ان تمام احادیث کو ایک نئے موضوعاتی انداز میں مرتب کر دیا۔ اب آپ اس میں سبجیکٹ وائز احادیث تلاش کر سکتے ہیں۔ اسی طرح سے انہوں نے ان احادیث کی ایک شرح بھی لکھی جس کا نام انہوں نے رکھا "بلوغ الأماني"۔ یہ بلوغ الامانی اور فتح الربانی دونوں ایک ساتھ بہت ساری جلدوں میں چھپی ہیں اور کتب خانوں میں عام طور پر مل جاتی ہیں۔

امام احمد ابن حنبل کی مسند کے ساتھ ساتھ ایک اور مسند کا حوالہ اور تذکرہ بھی ملتا ہے۔ لیکن افسوس کہ وہ مسند آج موجود نہیں ہے اور صرف تاریخ کی کتابوں میں اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ وہ مسند امام بقی بن مخلد نے مرتب کی تھی۔ بقی بن مخلد کا تعلق اسپین سے تھا۔ قرطبہ کے رہنے والے تھے۔ ان کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ انہوں نے چھ مرتبہ مشرق و مغرب کا سفر کیا۔ مشرق و مغرب سے مراد یہ ہے کہ سپین سے نکلے اور سمرقند و بخارا تک گئے۔ اس طرح انہوں نے پوری دنیائے اسلام کا چھ مرتبہ سفر کیا اور احادیث کا سب سے بڑا مجموعہ مرتب کیا۔ وہ مجموعہ افسوس کہ ضائع ہو گیا اور ہم تک نہیں پہنچا۔ لیکن اس کے بارے میں جو تفصیلات احادیث کی کتابوں میں ملتی ہیں وہ بڑی عجیب و غریب ہیں۔ اس کتاب کی ضخامت کا اندازہ ہم اس بات سے کر سکتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل نے جن صحابہ کی احادیث اپنی مسند میں جمع کیں ان کی تعداد ۹۰۴ ہے۔ جبکہ امام بقی بن مخلد نے اپنی مسند میں سولہ سو صحابہ سے احادیث جمع کی تھیں۔ تقریباً دوگنی سے زیادہ۔ اس کی جلدیں بھی اسی طرح اور احادیث کی تعداد بھی اسی حساب سے دوگنے سے زائد ہوگی۔

الجامع الصحیح للامام بخاری

امام احمد بن حنبلؒ کی مسند کے بعد جو اہم ترین، مقبول ترین اور اعلیٰ ترین مجموعہ ہے وہ امام بخاری کی الجامع الصحیح ہے۔ امام بخاری کی وفات 256ھ میں ہوئی۔ ایک مصرعہ یاد رکھنے کا کسی نے لکھا ہے:

پہنا چکے تھے۔ جب امام بخاری ایک طویل سفر کے بعد آخری مرتبہ اپنے وطن بخارا واپس
تشریف لے گئے تو پورے شہر نے ان کا استقبال کیا۔ شہر کے لوگوں کو اس کا اندازہ تھا کہ انہیں کیا
اعزاز حاصل ہوا ہے کہ امت کی طرف سے ان کے شہر کے ایک فرزند کو امیر المومنین فی الحدیث کا
لقب دیا گیا اور ان کی مرتب کی ہوئی کتاب اصح الکتب بعد کتاب اللہ قرار پائی۔ اس لئے پورا
شہر خوشی کے عالم میں تھا۔ کہ ان کے استقبال کے لئے نکل آیا۔ لوگوں نے بڑی مسرت سے ان کے
قافلے پر درہم اور دینار نچھاور کئے۔ اور اس طرح امام بخاری اپنے وطن واپس تشریف لے آئے۔

ایک مجلس میں، جہاں امام بخاری احادیث بیان فرما رہے تھے، امام مسلم بھی حاضر تھے
۔ امام مسلم کا درجہ بھی کم نہیں ہے۔ امام مسلم درس کے دوران خوشی سے اتنے بے تاب ہو گئے کہ بے
اختیار کہا اے امیر المومنین مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کے پاؤں چوم لوں۔ اس سے آپ
اندازہ کر سکتے ہیں کہ امام بخاری کس درجے کے انسان ہوں گے۔ دوسرے کا احترام امام احمد بن حنبل کا
کہنا ہے۔ اور یہ گواہی کسی عام انسان کی نہیں بلکہ امام احمد بن حنبل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ابھی
خراسان نے محمد بن اسماعیل سے بڑھ کر کوئی انسان پیدا نہیں کیا۔ یہ محمد بن اسماعیل امام بخاری تھے۔

آپ کو معلوم ہے کہ پرانے زمانے میں ہر بڑی تصنیف میں کتاب کے نام سے موضوع
کا عنوان ہوتا تھا۔ کتاب الصلوٰۃ، کتاب الزکوٰۃ وغیرہ۔ اسی طرح صحیح بخاری میں جو کتابیں ہیں ان
کی تعداد 160 ہے۔ کتاب بدء الوحی، کتاب العلم، کتاب الصلوٰۃ، کتاب الزکوٰۃ وغیرہ وغیرہ۔ یہ
کتابیں 160 ہیں۔ ہر کتاب میں کئی کئی ابواب ہیں۔ مجموعی طور پر کل تین ہزار چار سو پچاس
(3450) ابواب ہیں۔ احادیث کی کل تعداد مکررات کو نکال کر دو ہزار چھ سو ہے۔ جن میں سے
بائیس ثلاثیات ہیں۔

کتاب کی ترتیب کے ضمن میں امام بخاری نے پہلے یہ کیا کہ اس کتاب کے ابواب کا
ایک خاکہ مرتب کیا کہ اس کتاب میں کیا کیا ابواب ہوں گے۔ ان تمام ابواب کا خاکہ مرتب کرنے کے بعد
مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ مسجد نبوی میں گئے اور روضہ رسول ﷺ پر حاضری دی۔ وہاں دو
رکعت نماز پڑھ کر انہوں نے اس کتاب کو لکھنے کا آغاز کیا اور وہ سالہا سال اس کتاب کو لکھتے رہے اور
احادیث کی چھان پھٹک کرتے رہے۔ بعض ابواب ایسے ہیں کہ جن کے عنوانات ہی سے عبارت
ہیں۔ ان میں کوئی حدیث نہیں ہے۔ آپ صحیح بخاری دیکھیں تو کئی بار ایسے ابواب ملیں گے کہ

جہاں امام بخاری نے صرف باب کا لفظ لکھا ہے یا صرف عنوان دیا ہے لیکن حدیث کوئی نہیں لکھی۔ وجہ یہ ہے کہ جس درجہ کی سند اور جس معیار کی روایت وہ دینا چاہتے تھے اس معیار کی کوئی روایت نہیں ملی اس لئے انہوں نے باب کا عنوان خالی چھوڑ دیا اور حدیث نہیں لکھی۔

امام بخاری نے جتنی احادیث نقل کی ہیں وہ سب کی سب صحیح لذاتہ ہیں۔ اس میں حدیث غریب بھی کوئی نہیں ہے۔ اکثر احادیث مستفیض ہیں۔ مستفیض صحیح لغیرہ کی اس قسم کو کہتے ہیں جن کو ہر درجہ میں کم سے کم تین راویوں نے روایت کیا ہو۔ تین صحابیوں نے لفظاً یا معناً روایت کیا ہو، پھر تین تابعین نے پھر تین تبع تابعین نے۔ اس لئے اس کی بیشتر احادیث بڑی تعداد میں مستفیض ہیں۔ صحیح بخاری کی کچھ احادیث عزیز ہیں۔ عزیز ان احادیث کو کہا جاتا ہے جن کو ہر درجہ میں دو راویوں نے روایت کیا ہو اور بہت تھوڑی احادیث ہیں جو اخبار آحاد ہیں۔ خبر واحد یا اخبار آحاد ان احادیث کو کہتے ہیں جن کو کسی ایک یا دو درجوں میں صرف ایک راوی نے روایت کیا ہو۔

صحیح بخاری میں مکررات وغیرہ کو ملا کر کل احادیث نو ہزار بیاسی 9082 ہیں۔ ان مکررات وغیرہ کو نکال کر کل احادیث کی کل تعداد دو ہزار چھ سو دو 2602 ہے اور جو تعلیقات ہیں ان کی تعداد بھی کئی سو ہے۔ موقوفات یعنی اقوال صحابہ کا بعض لوگ شمار کرتے ہیں بعض نہیں کرتے۔

صحیح بخاری کو جو مقبولیت حاصل ہوئی اس کی کوئی مثال امت مسلمہ کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ دیگر اقوام کا میں نہیں کہہ سکتا، لیکن بظاہر اور واقعۃً ان میں بھی ایسا نہیں ہوگا۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسانی تاریخ میں کسی انسان کی علمی کاوش کو اتنی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی جتنی امام بخاری کی کتاب کو حاصل ہوئی۔ اس کی سینکڑوں شرحیں لکھی گئیں جن میں سے 53 شرحیں وہ ہیں جن کا ذکر حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں کیا ہے۔ حاجی خلیفہ آج سے دو سو سال پہلے کے ترکی عالم گزرے ہیں۔ انہوں نے اسلامی علوم وفنون کی تاریخ اور ببلیوگرافی پر ایک کتاب کئی جلدوں پر مشتمل لکھی ہے جس کا نام کشف الظنون ہے۔ اس میں انہوں نے 53 شرحوں کا ذکر کیا ہے۔ امام بخاری کے ایک شارح ہیں مولانا عبدالسلام مبارکپوری جن کی ایک کتاب 'سیرت البخاری' مشہور ہے۔ اس میں انہوں نے 143 شرحوں کا ذکر کیا ہے۔ میں نے اس کتاب کو کچھ دن پہلے دیکھا۔ بعض اردو کی شرحیں جو ان کے زمانے میں لکھی جا چکی تھیں اس کتاب میں ان کا ذکر نہیں ہے اور یہ کتاب 'سیرت البخاری' بھی کم و بیش ستر سال پہلے لکھی گئی تھی۔ اس دوران بھی کئی شرحیں لکھی

گئیں جن کا ذکر بھی اس کتاب میں نہیں ہے۔ اس لئے ہم یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ آج امام بخاری
کی اس کتاب کی کم وبیش دو سو شرحیں موجود ہوں گی۔ یہ ایک محتاط اور محفوظ اندازہ ہے جو کا
کیا جا سکتا ہے۔ یہ شرحیں عربی، فارسی، اردو، انگریزی، فرانسیسی اور ترکی زبانوں میں لکھی گئی ہیں۔
ان چھ زبانوں میں تو بہت سی شرحیں میرے علم میں ہیں اور ان میں سے بیشتر کو میں نے خود دیکھا
ہے اس لئے میں کہہ سکتا ہوں۔ لیکن ممکن ہے دوسری زبانوں میں بھی صحیح بخاری کی شرحیں موجود ہوں
جن کا مجھے علم نہیں۔

صحیح بخاری کی عربی زبان میں چار شرحیں مشہور ہیں۔ جو چار مختلف پہلوؤں کا احاطہ
کرتی ہیں۔ سب سے مشہور شرح، جس کے بارے میں میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ The
Commentary par excellence ہے، وہ حافظ ابن حجر کی فتح الباری ہے۔ ابن خلدون
نے لکھا تھا۔ ابن خلدون کا زمانہ حافظ ابن حجر سے ذرا پہلے کا ہے۔ انہوں نے جہاں یہ بحث کی کہ
صحیح بخاری افضل ہے یا صحیح مسلم افضل ہے، اور یہ بتایا کہ صحیح بخاری افضل ہے، اس کے ساتھ
ہی یہ بھی لکھا کہ یہ کتاب جس درجہ کی ہے اس درجہ کی شرح ابھی تک نہیں لکھی گئی اور یہ امت مسلمہ
کے ذمہ ایک قرض کفایہ ہے کہ اس کتاب کی ایک شرح لکھے۔ جب ابن خلدون کے کم وبیش نصف
صدی بعد فتح الباری لکھی گئی تو لوگوں نے بالاتفاق کہا کہ جس قرض کا ذکر ابن خلدون نے کیا تھا وہ
حافظ ابن حجر نے امت کی طرف سے چکا دیا۔ حدیث کی کسی شرح میں جو معیارات ہونے
چاہئیں، جس معیار اور پایہ کی شرح ہونی چاہئے اس معیار اور پایہ کی شرح حافظ ابن حجر نے فتح
الباری کی شکل میں لکھ دی اور صحیح بخاری کی شرح کا حق ادا کر دیا۔ علم روایت، علم درایت، طرق اور
علوم حدیث کی جتنی قسمیں میں نے آپ کے سامنے ان گزارشات کے دوران بیان کی ہیں اور
جتنی بیان نہیں کیں وہ سب کی سب صحیح بخاری کی شرح فتح الباری میں استعمال ہوئی ہیں۔

آج سے چند سال پہلے بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں یہ تجویز آئی تھی کہ
اس کی شرح کا اردو ترجمہ کیا جائے۔ چنانچہ ہم نے بہت غور وخوض کے بعد اس ترجمہ کا ایک فارمیٹ
تیار کیا اور اس کے بعض اجزا کا ترجمہ کرایا جو آج کل ایڈٹ ہو رہا ہے۔ ان شاء اللہ جلد شائع
ہوگا۔ اس طرح اردو میں وہ مواد یا اس کا ایک نمونہ ہمارے سامنے آ جائے گا جو حافظ ابن حجر نے صحیح
بخاری کی شرح میں امت کے سامنے رکھا ہے۔

فتح الباری کے درجنوں ایڈیشن دنیائے اسلام میں نکلے ہیں اور شاید دنیا میں اسلامیات کا کوئی ایسا کتب خانہ نہیں ہے جو فتح الباری سے خالی ہو۔ حافظ ابن حجر جامعہ ازہر میں پڑھاتے تھے اور یہ جامعہ ازہر کے لئے بڑی فضیلت کی بات ہے کہ حافظ ابن حجر وہاں استاد رہے ہیں۔ حافظ ابن حجر کے رفیق کار، ان کے معاصر اور آتے جاتے ہی رہتے تھے فقیہ اور محدث علامہ حافظ بدرالدین عینی تھے۔ انہوں نے بھی صحیح بخاری کی شرح لکھی عمدۃ القاری۔ وہ بھی جامعہ ازہر میں استاد تھے۔ ان کی شرح بھی بڑی غیر معمولی اور بہت مقبول ہے۔ لیکن اللہ نے جو درجہ حافظ ابن حجر کی فتح الباری کو عطا فرمایا وہ غالباً عمدۃ القاری کو حاصل نہیں ہوا۔

عمدۃ القاری میں فقہی مباحث پر زیادہ زور دیا گیا اور صحیح بخاری کے ابواب کے جو عنوانات ہیں جنہیں تراجم ابواب کہتے ہیں علامہ بدرالدین عینی نے ان پر غیر معمولی توجہ دی۔ بدرالدین عینی خود ایک بہت بڑے محدث تھے۔ انہوں نے صحیح بخاری کی اس شرح کے ساتھ ساتھ سنن ابی داؤد کی بھی شرح لکھی اور بھی بہت سا علمی کام کیا۔ لیکن ان کی کتاب عمدۃ القاری بہت مشہور ہے۔ ضخامت کے اعتبار سے عمدۃ القاری زیادہ بڑی کتاب ہے۔ لیکن معیار اور کیفیت کے لحاظ سے فتح الباری کا درجہ بہت اونچا ہے۔ ایک حدیث ہے 'لا ھجرۃ بعد الفتح' فتح مکہ کے بعد ہجرت کی ضرورت نہیں۔ اس پر بعض لوگوں نے کہا کہ 'لا ھجرۃ بعد الفتح' یعنی فتح الباری کے بعد علم حدیث کے لئے اب ہجرت کرنے کی ضرورت نہیں۔ فتح الباری کا یہ مقام و مرتبہ ہے۔

صحیح مسلم

صحیح بخاری کے بعد صحیح مسلم کا درجہ آتا ہے۔ امام مسلم کے اساتذہ میں خود امام بخاری، امام احمد بن حنبل اور امام شافعی کے ایک براہ راست شاگرد حرملہ بن یحییٰ بھی شامل ہیں۔ اس لئے امام مسلم کو دو بڑے محدثین سے براہ راست اور ایک بڑے فقیہ سے بالواسطہ کسب فیض کا موقع ملا۔ امام شافعی سے ان کے شاگرد کے ذریعے اور امام احمد سے براہ راست۔ امام صاحب نے امام اسحاق بن راہویہ سے بھی براہ راست کسب فیض کیا۔ لیکن ان کے خاص اساتذہ قتیبہ بن سعید اور ابوالولید القعنبی تھے۔ مسلم میں ان دونوں کی روایات کثرت سے ملیں گی۔ آپ دیکھیں گے حدثنی القعنبی، اخبرنی القعنبی، حدثنا قتیبۃ بن سعید۔ ان دونوں شیوخ کی بہت

احادیث آپ کو صحیح مسلم میں کثرت سے نہیں ملیں گی۔ یہ امام مسلم کے خاص اساتذہ میں سے تھے۔ امام مسلم کی صحیح میں بلا تکرار چار ہزار احادیث ہیں۔ صحیح مسلم کے بعض خصائص کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے موازنے کے بارے میں بھی بات ہوگئی ہے۔

صحیح مسلم کی دو شرحیں مشہور ہیں۔ ایک کا ذکر کل کریں گے۔ دوسری مشہور شرح امام نووی کی ہے جو بہت مشہور اور مقبول ہے۔ چھپی ہوئی ہے اور ہر جگہ دستیاب ہے اور مسلم کی شرحوں میں ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ امام مسلم کی کتاب صحیح بخاری کے بعد بلند ترین درجہ رکھتی ہے۔ بعض علما کا کہنا ہے کہ وہ صحیح بخاری سے بھی افضل ہے، چنانچہ مغرب کے بعض علما کا یہی خیال تھا کہ وہ صحیح بخاری سے افضل ہے۔

صحیح مسلم کے بعد جو چار کتابیں ہیں ان میں مختلف حضرات نے مختلف کتابوں کا درجہ مختلف رکھا ہے۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ سب سے اونچا درجہ سنن ابوداؤد کا ہے، بعض کا کہنا ہے کہ جامع ترمذی کا ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ سنن نسائی کا درجہ اونچا ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ مختلف خصوصیات کے باعث ان تینوں کتابوں کا درجہ اپنی اپنی جگہ اونچا ہے۔ سنن ابوداؤد اس اعتبار سے خاص مقام رکھتی ہے کہ وہ احادیث احکام کا ایک بڑا مجموعہ ہے جو ایک جگہ دستیاب ہے اور احادیث احکام میں صحیح ترین احادیث کا مجموعہ ہے۔ سنن ابوداؤد کا اس لحاظ سے درجہ بہت اونچا ہے۔ علم حدیث کے مختلف علوم و فنون کو ایک ساتھ سمونے کے اعتبار سے جامع ترمذی کا درجہ اونچا ہے اور صحت متن اور صحت نقل کے اعتبار سے سنن نسائی کا درجہ ہے۔ اس لئے جس ترتیب سے بھی بیان کریں ان تینوں میں سے کوئی نہ کوئی کتاب اس کی مستحق ہوگی کہ صحیحین کے بعد اس کا درجہ ہو۔ امام ابوداؤد صف اول کے محدثین میں سے ہیں۔ ہمارے بلوچستان کے علاقہ ضلع قلات یا خضدار سے ان کا تعلق ہے اس لئے پاکستانی ہیں۔ ان کے اساتذہ میں امام احمد، یحییٰ بن معین، قتیبہ بن سعید (جو امام مسلم کے بھی استاد ہیں)، ابوبکر بن ابی شیبہ اور اسحاق بن راہویہ شامل ہیں اور بڑے محدثین میں سے امام نسائی ان کے شاگرد ہیں۔ کچھ لوگ امام ابوداؤد کو پہلے لکھتے ہیں کہ ترمذی اور نسائی ان کے شاگردوں میں ہیں۔ اس لئے استاد کا ذکر پہلے اور شاگرد کا ذکر بعد میں کیا جاتا ہے۔

سنن ابوداؤد

امام ابوداؤد اس کتاب کے علاوہ بھی کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کا علمی مقام اس کتاب سے پہلے بھی بہت غیر معمولی اور مشہور و معروف تھا۔ جب وہ بصرہ تشریف لائے تو بصرہ کا گورنر ان سے ملنے کے لئے حاضر ہوا اور کہا کہ میری تین گزارشات اگر آپ قبول کریں تو میں بہت شکر گزار ہوں گا۔ ایک یہ کہ آپ بصرہ میں کچھ دن قیام فرمائیں تا کہ اہل بصرہ آپ سے استفادہ کر سکیں۔ دوسرا یہ کہ آپ اہل بصرہ کے لئے خاص طور پر علم حدیث کی درس و تدریس کا کوئی حلقہ قائم کریں۔ اور تیسری گزارش یہ ہے کہ میرے دو بچوں کو الگ سے کوئی وقت دے دیں کہ جس میں آ کر وہ آپ سے علم حدیث پڑھا کریں۔ آپ نے فرمایا کہ پہلی دو گزارشات قبول ہیں تیسری گزارش مسترد۔ بچوں کو چاہئے کہ باقی لوگوں کے ساتھ آ کر حدیث پڑھیں۔

سنن ابوداؤد میں پانچ لاکھ احادیث میں سے چار ہزار آٹھ سو 4800 کا انتخاب کیا گیا۔ یہ احادیث صرف سنن اور احکام سے متعلق ہیں۔ صحاح ستہ میں فقہی احادیث کا سب سے بڑا ماخذ یہی کتاب ہے۔ صحاح ستہ میں یہی وہ کتاب ہے جس میں فقہی احادیث اتنی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ اس میں تکرار برائے نام ہے۔ کہیں کہیں کوئی حدیث دوبارہ نقل ہوگئی ہے ورنہ ایک حدیث دوبارہ نقل نہیں کی گئی ہے۔ اس لئے چار ہزار آٹھ سو احادیث میں اکثر و بیشتر وہ ہیں جو ایک ہی بار بیان ہوئی ہیں۔

یہ کتاب جب سے لکھی گئی ہے بہت مقبول رہی ہے۔ علماء و طلبہ نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ایک محدث نے کہا کہ جس کے پاس سنن ابوداؤد ہے اس کے پاس گویا ایک ایسا پیغمبر ہے جو ہر وقت اس کی رہنمائی کر رہا ہے۔ یوں تو یہ بات حدیث کی ہر کتاب کے بارے میں کہی گئی ہے۔ لیکن جس نے بھی یہ سنن ابوداؤد کے بارے میں کہی اس نے سنن ابوداؤد کے خاص مقام کو سامنے رکھ کر کہی۔

سنن ابوداؤد کی بھی بہت سی شرحیں لکھی گئیں جن میں سے ایک قدیم شرح امام خطابی کی ہے جو معالم السنن کے نام سے مشہور ہے۔ امام خطابی کا زمانہ امام ابوداؤد سے کم و بیش سو سال بعد کا ہے۔ امام ابوداؤد کا انتقال 275ھ میں ہوا اور امام خطابی کا انتقال 388ھ میں ہوا۔ پھر ایک امام منذری تھے جنہوں نے اس کتاب کی تلخیص کی اور اس تلخیص کی شرح علامہ ابن قیم نے

لکھی۔ ایک شرح علامہ بدرالدین عینی کی ہے جو نامکمل ہے۔ یہ نامکمل شرح بھی چھ یا سات جلدوں میں ہے۔ ابھی حال ہی میں عرب دنیا اور پاکستان میں چھپی ہے اور ہر جگہ ملتی ہے۔

علامہ سیوطی نے بھی سنن ابو داؤد کی شرح میں ایک کتاب لکھی "مرقاۃ الصعود الی شرح ابی داؤد" مرقاۃ الصعود سے مراد وہ سیڑھی ہے جس پر چڑھ کر آدمی بلندی کی طرف جاتا ہے۔ بارھویں صدی ہجری میں ایک عالم علامہ ابوالحسن سندھی تھے جو سندھ کے رہنے والے۔ انہوں نے ایک مختصر شرح لکھی تھی جو فتح الودود کے نام سے مشہور ہے اور کئی بار چھپ بھی ہے۔ ابوداؤد کی چار مشہور شرحیں برصغیر میں لکھی گئیں جن کے بارے میں کل تفصیل سے بات ہوگی۔ اس کا انگریزی ترجمہ بھی ہے جو ہمارے ایک سابق رفیق کار اور محترم دوست ڈاکٹر احمد حسن مرحوم نے کیا تھا، کئی بار چھپ چکا ہے اس پر انگریزی میں حواشی بھی ہیں اور مختصر شرح بھی ہے۔ امام مسلم کی صحیح کا بھی انگریزی ترجمہ ہو چکا ہے جس کی تفصیل کل آئے گی۔ یہ ترجمہ پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم نے کیا تھا۔

جامع ترمذی

سنن ابوداؤد کے بعد جامع ترمذی کا درجہ آتا ہے۔ امام ترمذی امام بخاری اور امام مسلم دونوں کے براہ راست شاگرد ہیں۔ امام ابوداؤد کے بھی شاگرد ہیں۔ قتیبہ بن سعید جو امام مسلم کے استاد ہیں وہ امام ترمذی کے بھی استاد ہیں۔ جامع ترمذی جامع ہے۔ یعنی حدیث کے آٹھوں ابواب اس میں شامل ہیں۔ اس میں عقائد، اخلاق، احکام، تفسیر، فضائل، فتن، اشراط قیامت، علامات قیامت یہ سب موضوعات شامل ہیں۔ اس لئے اس کا درجہ جامع کا ہے اور اس طرح سے وہ امام بخاری کی جامع کے برابر ہے۔ صحاح ستہ میں امام بخاری اور ترمذی دونوں کی کتابیں جامع ہیں۔

جامع ترمذی کے جو اہم خصائص یا مباحث ہیں ان میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ حدیث کے درجہ کا تعین بھی کرتے ہیں۔ وہ پہلے حدیث بیان کرتے ہیں اور پھر اس کا درجہ بیان کرتے ہیں جیسے ہذا حدیث حسن، ھذا حدیث صحیح، ھذا حدیث غریب۔ اس میں امام ترمذی اپنی اصطلاحات بھی استعمال کرتے ہیں اور کچھ اصطلاحات باقی محدثین کی لیتے ہیں۔ اس طرح سے ہر حدیث کے بعد پڑھنے والوں کو پتہ چل جاتا ہے کہ امام ترمذی نے اس

حدیث کو کس وجہ پر لکھا ہے۔ پھر امام ترمذی یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ اس حدیث سے جو احکام نکلتے ہیں ان احکام میں بقیہ محدثین اور فقہا کی رائے کیا ہے۔ مثلاً اس بارے میں امام شافعی کیا کہتے ہیں، امام سعد کیا کہتے ہیں، امام احمد بن حنبل کیا کہتے ہیں، امام مالک کیا کہتے ہیں اور امام ابوحنیفہ کیا کہتے ہیں گویا تمام فقہا کی آرا بھی قاری کے سامنے آجاتی ہیں۔ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو حدیث کی کسی اور کتاب میں نہیں پائی جاتی۔

ایک اور اہم بات یہ ہے کہ امام ترمذی ایک باب میں جو احادیث بیان کرتے ہیں وہ بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ وفی الباب عن فلان و فلان و فلان، کہ اس موضوع پر فلاں فلاں صحابی کی احادیث بھی ہیں۔ ان احادیث کو انہوں نے اپنی کتاب میں شامل نہیں کیا۔ یا تو اس کی سند جو امام ترمذی تک پہنچی وہ اس درجہ کی نہیں تھی یا امام ترمذی نے محسوس کیا کہ جو مضمون تو وہ بقیہ احادیث میں آگیا۔ کسی اور وجہ سے انہوں نے ان احادیث کو شامل نہیں کیا لیکن جو لوگ پڑھنا چاہیں کہ اس موضوع پر فلاں احادیث بھی موجود ہیں۔ تلاش کرنے والے تلاش کر سکتے ہیں۔ چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تکرار بہت کم ہے۔ جو حدیث ایک بار آگئی امام ترمذی اس کو دوبارہ نہیں دہراتے۔ پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ امام ترمذی نے راویوں کے نام اور کنیت پر بڑی بحث کی ہے۔ اس لئے کہ بعض راوی کنیت سے بہت مشہور ہیں اور بعض نام سے مشہور ہیں۔ اگر ایک جگہ کنیت آئی ہو اور دوسری جگہ نام آیا ہو تو یہ التباس ہو سکتا ہے کہ دو آدمی ہیں یا ایک ہی آدمی ہے۔ تو امام ترمذی وضاحت کر دیتے ہیں کہ یہ نام جس بزرگ کا ہے یہ وہی شخصیت ہیں جن کی کنیت یہ ہے۔ مثلاً ابوعمرو، ابوعمرو کا نام عبدالرحمن تھا۔ یا امام اوزاعی۔ کہیں اوزاعی آتا ہے کہیں عبدالرحمن آتا ہے۔ اب جہاں عبدالرحمن آیا ہے وہاں یہ پتہ چلانا کہ یہ امام اوزاعی ہیں ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ امام ترمذی اس کی نشاندہی کر دیتے ہیں۔

جامع ترمذی کے ضمن میں ایک بات خاص طور پر قابل غور ہے۔ وہ یہ کہ امام ترمذی ان محدثین میں سے ہیں کہ جن کا تساہل جرح و تعدیل میں مشہور ہے۔ امام ترمذی راوی کو عادل قرار دینے میں نرمی سے کام لیا کرتے تھے۔ محدثین نے امام ترمذی اور امام حاکم دونوں کی تعدیل کے بارے میں یہ کہا ہے کہ ان کی رائے قبول کرنے میں احتیاط سے کام لینا چاہئے اور جس راوی کو امام ترمذی اور امام حاکم عادل قرار دیں اس کی عدالت کی دوسری جگہ سے بھی تحقیق کر لینی چاہئے۔

اگر دوسرے محدثین بھی اس کو عادل قرار دیتے ہیں تو وہ عادل ہیں اور اگر دوسرے محدثین اسے مجروح قرار دیتے ہیں تو پھر محض امام ترمذی کی تعدیل پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔ اگر یہ بات ہے تو امام ترمذی نے جن راویوں کو عادل قرار دے کر ان سے احادیث نقل کی ہیں ان احادیث میں بھی کلام ہو سکتا ہے۔ اس لئے امام ترمذی کی تحسین، حسن قرار دی ہوئی احادیث میں سے بھی کئی احادیث کے بارے میں کلام ہوا ہے۔ تئیس (23) روایات وہ ہیں جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ شدید درجہ کی ضعیف ہیں۔ اس موضوع پر لوگوں نے کام کیا ہے۔ کئی لوگوں نے زمانہ حال میں جامع ترمذی کے کئی ایڈیشن بھی شائع کئے ہیں جن میں ہر حدیث کی الگ سے نشاندہی کر دی گئی ہے۔

لیکن یہ محض ایک اختلافی رائے ہے۔ اگر آج کا کوئی آدمی امام ترمذی جیسے عالم امام حدیث کی رائے اور ان کی تصحیح و تعدیل سے اختلاف کر سکتا ہے تو آج کے آدمی سے بھی اختلاف ہو سکتا ہے۔ امام ترمذی جیسا انسان اگر اپنے زمانے میں کسی حدیث کو ضعیف یا حسن قرار دیں اور آج کا کوئی آدمی یہ کہے کہ اسے امام ترمذی کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے اور وہ حدیث حسن یا صحیح نہیں بلکہ ضعیف ہے۔ تو پھر آج کے آدمی سے بھی کل کے لوگ اختلاف کر سکتے ہیں۔

یہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میں نے بعض لوگوں کو دیکھا ہے کہ زمانہ حال کے ایک بزرگ جن کا چند سال قبل انتقال ہوا ہے ان کے شاگردوں میں بڑی شدت پائی جاتی ہے۔ جس حدیث کو ان کے استاد نے ضعیف قرار دیا ہے تو ان کے شاگرد اس کو ضعیف منوانے کے لئے لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک عرب ملک میں کسی جگہ میری گفتگو یا تقریر تھی۔ میں نے کوئی حدیث بیان کی تو وہاں ایک صاحب علم جو چوبیس یا پچیس سال کی عمر کے تھے، وہ ان بزرگ سے نسبت تلمذ رکھتے تھے۔ انہوں نے محفل میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا کہ یہ حدیث تو ضعیف ہے اور ہمارے فلاں استاد نے فلاں تحقیق کی ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں آپ کے استاد کی تحقیق کے بارے میں کوئی منفی بات نہیں کہتا۔ مگر محققوں پر ظاہر ہے ان کا علم، مرتبہ اور مقام ایسا ہے کہ جو بات وہ کہیں گے وہ قابل احترام ہے۔ لیکن اگر آپ کے استاد کو امام ترمذی سے اختلاف کرنے کا حق پہنچتا ہے تو دیگر حضرات کو آپ کے استاد سے بھی اختلاف کرنے کا حق حاصل ہے۔ چنانچہ ان کی اس تحقیق پر بھی لوگوں نے کتابیں لکھی ہیں۔ ابھی حال ہی میں ایک کتاب دمشق

کے ایک عالم نے لکھی ہے جو غالباً چار پانچ جلدوں میں ہے جس میں انہوں نے ان بزرگ کی تصحیح یا تضعیف سے اختلاف کیا ہے۔

میں نام لے کر ہی دیتا ہوں۔ علامہ شیخ ناصر الدین البانی، بڑے مشہور اور صف اول کے محدثین میں سے تھے۔ چند سال پہلے ان کا انتقال ہوا ہے۔ اگر بیسویں صدی میں عالم اسلام کے چند عظیم ترین علمائے حدیث کے نام چنے ہوں تو یقیناً ایک نام ان کا ہوگا۔ انہوں نے تمام کتب حدیث کا از سر نو جائزہ لیا اور اپنی تحقیق میں جہاں جہاں جس حدیث کو صحیح یا ضعیف یا حسن قرار دیا وہیں کی نشاندہی کر دی۔ اب اگر علامہ ناصر الدین البانی امام ترمذی سے اختلاف کر سکتے ہیں تو آج کے اہل علم کو علامہ البانی سے اختلاف کا حق ہونا چاہئے۔ ہمارے لئے تو دونوں سر آنکھوں پر۔ ہمارے لئے تو دونوں ایسے ہیں کہ وہ آئیں تو بقول امام مسلم کے ہم ان کے پاؤں چوم لیں۔ لیکن اگر علامہ ناصر الدین البانی امام ترمذی سے اختلاف کر سکتے ہیں تو کوئی اور آنے والا علامہ ناصر الدین البانی سے بھی اختلاف کر سکتا ہے۔ اس سے احترام میں کمی یا خدانخواستہ مقام ومرتبہ میں کمی کا سوال نہیں۔ مقام اپنی جگہ، اختلاف رائے اپنی جگہ۔

جامع ترمذی کی بہت سی شرحیں لکھی گئیں۔ برصغیر کی شرحوں کا کل ذکر کریں گے۔

برصغیر سے باہر کی شرحوں میں دو شرحیں مشہور ہیں۔ ایک علامہ ابوبکر بن العربی کی جو ایک مشہور مالکی فقیہ ہیں۔ ان کی کتاب ہے 'عارضۃ الاحوذی'۔ یہ مختصر شرح ہے لیکن اچھی شرح ہے۔ دوسری شرح علامہ سراج الدین بلقینی کی ہے۔ یہ مصر کے رہنے والے تھے۔ مسلکاً شافعی تھے۔ ابوبکر بن العربی مالکی تھے۔ تو ایک شرح مالکی عالم نے کی ہے اور دوسری شرح شافعی عالم نے کی ہے۔ حنفی عالم کی شرح کا ذکر کل کریں گے۔ یہ دونوں شرحیں بڑی مشہور ہیں۔ علامہ سراج الدین بلقینی کی شرح ہے 'العرف الشذی'۔ علامہ بلقینی قاہرہ کے رہنے والے تھے۔ وہیں ان کا مزار ہے اور وہیں دفن ہوئے۔ امام ترمذی کی اور بھی کئی کتابیں علم حدیث پر ہیں جن کا تذکرہ میں چھوڑ دیتا ہوں۔ ان کی ایک مشہور کتاب 'شمائل ترمذی' ہے جس میں انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے شمائل کو بیان فرمایا ہے۔ یہ جامع ترمذی ہی کا ایک باب ہے جو الگ سے چھپا ہے۔ گویا ترمذی ہی کی کتاب کا ایک حصہ ہے۔ بعض حضرات نے اس کو الگ بھی چھاپا ہے، اس کی شرحیں بھی لکھی گئیں ہیں اور بہت سی شرحوں کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے۔

سنن نسائی

ترمذی کے بعد درجہ ہے امام نسائیؒ کی کتاب کا۔ امام نسائی نے دراصل 'السنن الکبریٰ' کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی تھی۔ امام نسائی کی وفات 303ھ میں ہوئی ہے۔ یہ صحاح ستہ کے مصنفین میں زمانہ کے اعتبار سے سب سے آخری آدمی ہیں۔ یعنی ترتیب زمانی میں سب سے آخر میں آتے ہیں۔ لیکن کتاب کی اہمیت اور صحت کی ترتیب میں پانچویں نمبر پر یا تیسرے یا چوتھے نمبر پر آتے ہیں۔ اس بارے میں اختلاف ہوسکتا ہے۔ تیسرے، چوتھے اور پانچویں میں سے ایک پر آتے ہیں۔ ان کی کتاب 'السنن الکبریٰ' دراصل بڑی کتاب تھی۔ جب وہ لکھی جاچکی اور شائع ہوئی تو رملہ جو فلسطین کا شہر ہے جس کو آج کل رام اللہ کہا جاتا ہے وہاں کا گورنر ایک بہت صاحب علم آدمی تھا۔ امام صاحب کے پاس کسب فیض کے لئے آیا کرتا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ آپ سے گزارش کی کہ لوگوں کے لئے اتنی بڑی کتاب کا پڑھنا اور اس کا نقل کرانا تو بہت دشوار ہوگا، پھر اس میں بعض احادیث ضعاف بھی آگئی ہیں اور بعض حسن لغیرہ ہیں۔ اس لئے آپ اس کا ایک مختصر نسخہ تیار کریں جس میں صرف صحیح احادیث ہوں اور جو تکرار ہے یا جو احادیث قوی نہیں ہیں وہ آپ نکال دیں۔ آپ نے 'السنن المجتبیٰ' کے نام سے اس کتاب کا خلاصہ تیار کیا۔ یہی وہ کتاب ہے جو آج کل مروج ہے اور سنن نسائی کہلاتی ہے۔

سنن نسائی اس اعتبار سے بڑی ممتاز ہے کہ صحیحین کے بعد سب سے کم ضعیف حدیثیں اس میں ہیں۔ صحیحین میں تو کوئی نہیں ہے۔ بقیہ دونوں کتابوں، ابوداؤد اور ترمذی میں ضعاف کی تعداد سنن نسائی کی نسبت زیادہ ہے۔ اس کے رجال یا راوی سنن کی بقیہ کتابوں کے مقابلے میں زیادہ ہیں۔ بقیہ چار کتابوں میں یعنی ابوداؤد، ابن ماجہ، ترمذی اور نسائی میں نسائی کے رجال سب سے قوی ہیں، اس کے راوی سب سے مستند ہیں اور اس کی شرائط بخاری اور مسلم کی شرائط کے بہت قریب ہیں۔

امام نسائی کو علل الحدیث میں بڑی مہارت تھی۔ انہوں نے علل الحدیث کی جابجا نشاندہی کی ہے۔ امام ترمذی نے بھی علل کی نشاندہی کی ہے لیکن امام نسائی اس میں زیادہ نمایاں ہیں۔ امام ترمذی کی طرح وہ اسماء اور کنی (کنیتوں) کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ اسی طرح سے

وہ امام ترمذی سے ملتے جلتے ہیں۔ انہوں نے غریب الاحادیث کی بھی شرح کی ہے۔ جہاں مشکل الفاظ آئے ہیں ان کی شرح کی ہے۔ گویا یہ وہ کتاب ہے جو ابوداؤد اور ترمذی دونوں کی خصوصیات اپنے اندر رکھتی ہے اور ایک اعتبار سے صحیحین کے بعد اسی کا درجہ آتا ہے۔ اس لئے کہ ضعیف حدیثیں اس میں سب سے کم ہیں یہی وجہ ہے کہ بعض حضرات نے اس کو صحیحین کے بعد کا درجہ دیا ہے۔

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس کتاب کی اس کے شایانِ شان کوئی شرح نہیں لکھی گئی۔ میں نے بہت تلاش کیا لیکن کسی قدیم شرح کا کوئی سراغ نہیں ملا آج۔ سے نہیں بلکہ تیس پینتیس سال پہلے مجھے خیال ہوا کہ اس کتاب کی کوئی باقاعدہ اور مفصل شرح نہیں ہے۔ کسی نے ایک فقیر قسم کے آدمی سے پوچھا کہ آج کل کیا کر رہے ہو۔ اس نے کہا کہ بادشاہ کی لڑکی سے شادی کی فکر میں ہوں۔ پوچھنے والے نے کہا اچھا، کتنا کام ہو گیا۔ اس نے جواب دیا کہ آدھا کام ہو گیا ہے اور آدھا باقی ہے۔ اس نے کہا کہ آدھا کیا کام ہو گیا ہے؟ فقیر نے جواب دیا کہ میں تو راضی ہوں اور شہزادی کا راضی ہونا ابھی باقی ہے۔ میرا آج سے پینتیس سال پہلے سے یہ خیال ہے کہ مجھے اگر موقع ملا تو سنن نسائی کی شرح لکھوں گا۔ اس میں آدھا کام تو ہو گیا کہ میں تیار ہوں۔ بقیہ آدھا ہونا ابھی باقی ہے یعنی شرح لکھی نہیں گئی ہے۔

اس کی جو شرحیں مشہور ہیں وہ صرف دو ہیں۔ ایک علامہ محمد بن عبدالہادی سندھی تھے، جن کی وفات 1138ھ میں ہوئی ہے، ان کا ایک حاشیہ ہے جو عام چھپی ہوئی کتابوں میں ملتا ہے۔ اس وقت پاکستان میں سنن نسائی کے جو نسخے ملتے ہیں وہ علامہ سندھی کی اس شرح کے ساتھ ملتے ہیں۔ یہ بڑی مختصر شرح ہے جو صرف حاشیہ پر آئی ہے۔ دوسری شرح 'زہر الربیٰ' علامہ سیوطی نے لکھی ہے۔ وہ بھی بڑی مختصر ہے اور کہیں کہیں حاشیوں پر چھپی ہوئی تھی ہے۔ ان دو کتابوں کے علاوہ کوئی شرح ایسی قابل ذکر مجھے نہیں ملی جو مخطوطہ کی شکل میں ہو یا مطبوعہ شکل میں موجود ہو۔ اس لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ اس کی شرح لکھی جائے جو اسی انداز کی ہو جس انداز کی حدیث کی بقیہ کتابوں کی شرحیں ہیں۔ جن میں سے بعض کا تذکرہ کل ہوگا۔

سنن ابن ماجہ

صحاح ستہ کی آخری کتاب امام ابن ماجہ کی ہے۔ محمد بن یزید بن ماجہ کی وفات 273ھ میں ہوئی۔ اس لئے یہ امام ابوداؤد کے قریب قریب ہم عصر ہیں۔ امام ابوداؤد کی وفات 275ھ

میں ہوئی۔ ان کی وفات 273ھ میں ہوئی۔ زمانہ اگرچہ دونوں کا قریب قریب ایک ہے۔ لیکن امام ابن ماجہ کی کتاب کا درجہ سب سے آخر میں ہے۔ اس لئے کہ اس میں کمزوری کے اعتبار سے بعض ایسی چیزیں ہیں جو حدیث کی بقیہ کتابوں میں نہیں پائی جاتیں۔ اس میں جو ترتیب اختیار کی گئی ہے وہ احادیث احکام کی یعنی سنن کی ترتیب ہے۔ اس میں بتیس کتابیں، تین سو چودہ ابواب اور چار ہزار احادیث ہیں۔ حسن ترتیب کے اعتبار سے یہ تمام صحاح ستہ میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔ اس کی ترتیب بہت اچھی ہے۔ تکرار بہت کم ہے۔ اس میں سندیں کم اور متون زیادہ ہیں۔ انہوں نے سندیں صرف متون کے برابر رکھی ہیں اور بعض جگہ ایک سند سے ایک سے زائد متن بھی بیان کئے ہیں۔ ایک سند بیان کی ہے اور کہا ہے کہ اسی سند سے میں نے فلاں فلاں روایات فلاں استاد سے لی ہیں۔

اس کتاب کے آنے سے پہلے اور اس کے بعد بھی یہ بحث جاری رہی کہ صحاح ستہ کی چھٹی کتاب کون سی ہے۔ اگرچہ محدثین کی اکثریت سنن ابن ماجہ کو ہی صحاح ستہ کا حصہ سمجھتی ہے، لیکن بعض حضرات نے سنن ابن ماجہ کو صحاح ستہ میں شامل نہیں کیا۔ کچھ حضرات کا خیال ہے کہ سنن دارمی صحاح ستہ میں شامل ہے۔ کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ موطا امام مالک صحاح ستہ میں شامل ہے۔ لیکن علما کی غالب اکثریت سنن ابن ماجہ کو صحاح ستہ میں شامل سمجھتی ہے۔

سنن ابن ماجہ میں حدیث کی بقیہ کتابوں کے مقابلہ میں ضعیف احادیث زیادہ ہیں۔ ان کی ٹھیک ٹھیک تعداد کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا دشوار ہے۔ کچھ کا خیال ہے کہ ان کی تعداد چھتیس ہے، کچھ کا خیال ہے کہ ایک سو کے قریب ہے، کچھ کا خیال ہے کہ ایک سو بیس یا ایک سو پچیس کے قریب ہے۔ پھر ضعیف کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا ویسے بھی بہت مشکل ہوتا ہے۔ ایک محدث کی رائے میں ایک حدیث ضعیف ہے، دوسرے کی رائے میں وہ ضعیف نہیں ہے یا اتنی ضعیف نہیں ہے۔ پھر ضعاف کے بھی مختلف درجات ہیں۔ بہر حال اس کتاب میں ضعاف کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے۔ بعض وہ ہیں جن کا ضعف بہت شدید ہے۔ وہ تقریباً تیس پینتیس کے قریب ہیں۔ بقیہ وہ ہیں جو ضعف کے ہلکے درجے پر ہیں۔

اس کتاب کی شرحیں بھی نسبتاً کم لکھی گئیں۔ برصغیر میں اس کی ایک دو شرحیں لکھی گئیں جن کا ذکر آگے کیا جائے گا۔ برصغیر سے باہر جو شرحیں لکھی گئیں ان میں ایک کتاب ہے علامہ سیوطی

کی مصباح الزجاجہ فی شرح سنن ابن ماجہ۔ دوسری ہے ما تمس الیہ الحاجۃ لمن یطالع سنن ابن ماجہ"۔

یہ علم حدیث کی بنیادی کتابوں کا مختصر تعارف تھا جس میں صحاح ستہ بھی آگئیں اور ان کے علاوہ بقیہ کچھ کتابیں بھی آگئیں۔ آج کی گفتگو میں یہیں ختم کرتا ہوں۔ ہمارے پاس پندرہ منٹ ہیں سوال جواب کے لئے۔ کل کے سوالات بھی آپ پوچھنا چاہیں تو پوچھ سکتے ہیں۔ کل جمعہ کا دن ہے بچا کھچا وقت کم ہوگا لیکن علم حدیث پر برصغیر میں جو کام ہوا ہے اس کا تذکرہ کروں گا۔ ان شاء اللہ برصغیر میں اسلام کے آنے سے لے کر 2003 تک علم حدیث پر جو کام ہوا ہے اس کا تذکرہ اختصار کے ساتھ کروں گا۔ عرض یہ ہے یہ بتانا مقصود ہے کہ علم حدیث کی خدمت میں برصغیر کے لوگ دنیائے اسلام کے دوسرے علاقوں سے پیچھے نہیں رہے۔ برصغیر میں علم حدیث اور اس کے متعلقات پر بہت سا کام ہوا ہے بلکہ برصغیر کے لوگوں نے ایک زمانے میں دنیائے اسلام کے دوسرے علاقوں کے لوگوں کے مقابلہ میں علم حدیث پر زیادہ کام کیا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

طریقہ یہ بھی ہو سکتا تھا۔ لیکن قرآن مجید میں اس طرح سے کوئی متعین مقدار یا quantity مقرر کرکے نہیں بتائی بلکہ ایک عمومی بات بتائی جس کو اپنے اپنے تمدن کے لحاظ سے لوگ سمجھیں اور اس کی تعبیر کر دیں۔ چونکہ تعبیروں کا اختلاف اسلام کی بنیادی خصوصیات میں شامل ہے اس لئے حضورؐ نے اس کی اجازت دی۔ قرآن پاک میں اس کی گنجائش رکھی گئی۔ مختلف فقہاء نے مختلف تعبیریں کیں اور جو شخص جس فقیہ کے علم اور تقویٰ پر اعتماد کرتا ہے اس کی بات مان لیتا ہے۔ اس زمانے میں جب یہ سارے محدثین اور فقہاء موجود تھے اس وقت جن حضرات کو امام شافعی کے علم اور تقویٰ پر اعتماد تھا وہ امام شافعی کے اجتہادات کو سر آنکھوں پر تسلیم کرتے تھے۔ امام شافعی اتنے اونچے درجہ کے انسان تھے کہ اگر آج وہ آئیں اور ہم میں سے کوئی ان کے پاؤں چومنے کی کوشش نہ کرے تو بڑا بدبخت ہوگا۔

امام احمد بن حنبلؒ سے ہر مسلمان کو محبت اور عقیدت ہے۔ لیکن امام احمد بن حنبل کے اجتہادات کو دنیائے اسلام میں بہت تھوڑے لوگ قبول کرتے ہیں۔ مسلمانوں میں مشکل سے ایک فیصد لوگ ہوں گے جو فقہی معاملات میں امام احمد کی رائے اور اجتہاد پر عمل کرتے ہیں۔ بقیہ ننانوے فیصد دوسرے فقہاء کی پیروی کرتے ہیں۔ لیکن امام احمد کے احترام میں وہ کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ تقلید سے مراد صرف یہ ہے کہ کسی شخص کے علم اور تقویٰ پر اعتماد کرکے اس کی بات کو مان کر اس پر عمل کر لیا جائے۔ اس کو تقلید کہتے ہیں۔ امام احمد کی تقلید تو تھوڑے لوگوں نے کی۔ لیکن احترام سب کرتے ہیں۔ تقلید کا تعلق احترام سے نہیں ہے۔ احترام تو ہر صاحب علم کا ہوتا ہے۔ صحیح بخاری دنیائے اسلام میں ہر جگہ پڑھائی جاتی ہے۔ اس وقت دنیائے اسلام میں امام ابوحنیفہ کی پیروی کرنے والے کم وبیش پینسٹھ فیصد مسلمان ہیں۔ پورا وسط ایشیا، پورا افغانستان، پورا ترکی، پورا مشرقی یورپ، پورا ہندوستان، پورا پاکستان، پورا بنگلہ دیش، پورا چین۔ یہ دنیائے اسلام کے تقریباً ساٹھ پینسٹھ فیصد بنتے ہیں اور امام ابوحنیفہ کی تقلید کرتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی امام بخاری کے احترام اور عقیدت میں کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ امام بخاری نے کم سے کم بیس مقامات پر امام ابوحنیفہ پر تنقید کی ہے جو بعض مقامات پر خاصی سخت ہے۔ سر آنکھوں پر۔ اگر باپ اور چچا میں اختلاف ہو تو بچوں کا یہ حق نہیں کہ وہ باپ کا ساتھ دے کر چچا کے خلاف کچھ آواز اٹھائیں۔ دادا اور دادا کے بھائی میں اختلاف ہو تو پوتوں اور نواسوں کا یہ کام نہیں کہ وہ ایک کی

حمایت میں انہیں اور دوسرے کی مخالفت کریں۔ ہم امام بخاری کا بھی احترام کرتے ہیں اور امام ابوحنیفہ کا بھی احترام کرتے ہیں۔ ان کا ایک علمی اختلاف ہے۔ جس کو امام بخاری کے دلائل زیادہ مضبوط معلوم ہوں وہ ان کی پیروی کرے اور جس کو امام ابوحنیفہ کے دلائل مضبوط معلوم ہوتے ہیں وہ ان کی پیروی کرے اور احترام دونوں کا کرے۔

کیا صحیح بخاری میں ایک ہی باب کے اندر آنے والی دو قولی احادیث کے الفاظ ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتے ہیں؟

ایسا ہو سکتا ہے۔ اس کا امکان موجود ہے کہ ایک باب میں ایک ہی صحابی سے آنے والی روایت کے الفاظ مختلف ہوں۔ اس کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں۔ ایک سبب تو یہ ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہی ایک بات کوئی بار بیان فرمایا ہو۔ دو صحابہ نے دو مختلف اوقات میں اس کو سنا اور دونوں الفاظ نوٹ کر کے یاد کر لئے اور آگے بیان کر دیا۔ لیکن زیادہ ایسا ہوا ہے کہ کسی عملی معاملہ کو یعنی حضور کے قولی ارشاد کو نہیں بلکہ کسی طرز عمل کو صحابہ نے دیکھا اور ایک صحابیؓ نے اپنے الفاظ میں بیان کر دیا اور دوسرے نے اپنے الفاظ میں۔ تو واقعہ تو ایک ہے لیکن دیکھنے والے صحابی اس کو ایک سے زیادہ قسم کے الفاظ میں بیان کر سکتے ہیں۔ صحابیؓ کے لئے ضروری نہیں ہے کہ جو واقعہ وہ دیکھے اس کے لئے بھی ایک ہی طرز بیان اختیار کرے۔ مثلاً عبد اللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ میں غزوہ بدر میں گیا تو رسول اللہ ﷺ نے مجھے اور میرے ساتھ کئی لوگوں کو کمسنی کی بنیاد پر واپس کر دیا۔ اب اس واقعہ کو حضرت عبد اللہ بن عمرؓ جب بھی بیان کریں گے ضروری نہیں کہ ایک ہی طرح کے الفاظ میں بیان کریں۔ لیکن ان سے جو تابعی سنیں گے وہ انہی الفاظ میں لکھیں گے جن الفاظ میں ان سے حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے بیان کیا ہے۔ ان الفاظ میں وہ تابعی اپنی طرف سے کوئی رد و بدل نہیں کریں گے۔ البتہ جس صحابیؓ نے اپنی آنکھوں سے ایک واقعہ دیکھا ہے اس کے الفاظ میں رد و بدل ہو سکتا ہے۔ اس طرح ایک ہی واقعہ کے الفاظ میں فرق ہو سکتا ہے۔

امام بخاری کی کتاب کا مکمل نام کیا ہے؟

امام بخاری کی کتاب کا مکمل نام ہے: 'الجامع الصحیح المسند المختصر من امور رسول اللہ ﷺ و سننه وایامه'

کیا موطا امام مالک بھی دوسری کتابوں کی طرح مختلف جلدوں میں ہے؟

موطا امام مالک کی ایک ہی جلد ہے۔ بعض لوگوں نے دو جلدوں میں بھی چھاپی ہے۔ لیکن زیادہ تر ایک ہی جلد میں چھپی ہے۔ اگر حواشی زیادہ ہیں تو کتاب دو جلدوں میں ہو گئی۔ اور اگر حواشی نہیں ہیں یا مختصر ہیں تو ایک ہی جلد میں آ جائے گی۔ مجھے پتہ ہے موطا امام مالک کے تین نسخے ہیں۔ ایک نسخہ جس میں حواشی بہت ہیں، وہ دو جلدوں میں چھپا ہے اور دو نسخے ایک ایک جلد میں ہیں۔

سوال: یہ بتائیے کہ اہل حدیث کون ہیں ان کی کیا تاریخ ہے؟

آپ کا مقصد ہے تو ہر مسلمان اہل حدیث ہے۔ کیا کوئی مسلمان یا کوئی ایک ادنیٰ ترین درجہ کی تعداد میں دنیا میں ملتے ہیں کہ ہم حدیث رسول پر عمل نہیں کرتے؟ سب حدیث پر عمل کرتے ہیں۔ اس لیے ہم سب اس مفہوم میں تو اہل حدیث ہیں۔ لیکن اہل حدیث کے نام سے جو حضرات برصغیر میں مشہور و معروف ہیں، یہ اصل میں وہ حضرات ہیں (اس پر تفصیل سے بات تو کل ہو گی) اور حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہید کے زمانے میں، اور ان سے پہلے بعض فقہی لوگوں کی روشنی میں کچھ احادیث پر عمل کرنے لگے تھے اور ان احادیث پر عمل کرنے کی وجہ سے باقی لوگوں سے ان کا تھوڑا سا اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ یہ لوگ شروع میں تو کسی خاص نام سے مشہور نہیں تھے لیکن جب حضرت سید احمد شہید کی سربراہی میں تحریک جہاد شروع ہوئی اور مولانا شاہ اسماعیل شہید اس میں شریک ہوئے تو وہ سارے کے سارے لوگ انگریزوں کی تحریروں میں وہابی کہلائے گئے۔ انگریزوں نے ان کو وہابی کے نام سے مشہور کیا اور ایک طرح سے ان کا لقب وہابی پڑ گیا۔ وہابی کے لفظ کو انگریزوں اور کچھ دوسرے لوگوں نے غلط معنوں میں استعمال کیا تو جب یہ لوگ وہابی کے نام سے مشہور ہوئے تو ان کو بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ انگریزوں نے ان کو بہت persecute کیا اور ان کی persecution کے بہت قصے مشہور ہیں اور بڑے دردناک اور سبق آموز ہیں۔ جب یہ مرحلہ ختم ہوا آگے بڑھا تو کچھ لوگوں نے سوچا کہ ہم وہابی کی بجائے کسی اور نام سے جانے جائیں تو شاید اچھا ہو۔ انہوں نے یہ طے کیا کہ ہمارا مسلک حدیث پر مبنی ہے۔ انہوں نے اہل حدیث کے لفظ کو رواج دے دیا تو وہ اہل حدیث کے نام سے مشہور ہو گئے۔ ان میں وہ حضرات بھی شامل ہیں جو مولانا شاہ اسماعیل شہید کے طریقے پر عمل کرتے تھے اور ان میں وہ حضرات شامل ہیں جن کا سلسلہ حضرت میاں نذیر حسین محدث دہلوی سے ملتا ہے۔ جو بعد میں حضرت میاں نذیر حسین محدث دہلوی کے ارشادات اور طریقہ کار پر چلتے تھے۔ میاں صاحب

اتنے بڑے انسان ہیں کہ اپنے زمانے میں وہ شیخ الکل کہلاتے تھے، یعنی سب کے استاد، پورے ہندوستان کے استاد۔ اور واقعی وہ علم حدیث میں شیخ الکل تھے۔

علوم الحدیث کی کسی جامع کتاب کا نام بیان کردیں۔

اس موضوع پر سب سے جامع کتاب ڈاکٹر خالد علوی کی ہے جس کا نام علوم الحدیث ہے اور دو جلدوں میں چھپی ہے۔ ایک جلد اس کی چھپ چکی ہے۔

حدیث کے تعارض میں جو ترجیحی وجوہ کا ذکر ہوا ہے اس میں مفہوم کے اعتبار سے جو ہیں اس کی وضاحت کردیں۔

اگر دو احادیث میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہو تو اس کو دور کرنے کے چار وجوہ یا چار طریقے ہیں۔ ان میں سے ایک سند ہے، دوسرا متن ہے، تیسرا مفہوم ہے اور چوتھا خارجی امور ہیں۔ مفہوم میں بھی چار پانچ چیزیں شامل ہیں۔ مفہوم کا ایک اصول یہ ہے جو سب سے پہلے محدثین نے وضع کیا بعد میں دنیا کے سب لوگ اس کو ماننے لگے۔ وہ یہ ہے کہ ایک حدیث میں کوئی چیز عمومی انداز میں بیان ہوئی ہے۔ جنرل مفہوم ہے جس کو اصطلاح میں حدیث عام کہا جاتا ہے۔ اور ایک دوسری حدیث خاص ہے اور وہ کسی خاص حالت کو بیان کرتی ہو۔ تو بظاہر ان میں تعارض ہوگا لیکن درحقیقت ان میں تعارض نہیں ہے۔ جو عام کو بیان کرتی ہے وہ عام مسائل کو بیان کرتی ہے جو خاص ہے وہ اس خاص particular category کو regulate کرتی ہے۔ تو ہم یہ کہیں گے کہ یہ جو خاص حدیث ہے یہ اس عام کے اس پہلو کو مستثنیٰ کرتی ہے جس کا ذکر اس حدیث میں کیا گیا ہے۔ یہ دو احادیث کے درمیان تعارض دور کرنے کا ایک طریقہ ہے۔

اس سلسلہ میں ایک مثال عرض کرتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا لا تبع ما ليس عندك یہ سنن کی اکثر کتابوں میں موجود ہے۔ کہ وہ چیز مت بیچو جو تمہارے پاس موجود نہیں ہے۔ یہ ایک عام حدیث ہے۔ آپ گندم بیچیں اور آپ کے پاس موجود نہ ہو تو مت بیچیں۔ آپ کے پاس جوتا نہیں ہے تو جوتا مت بیچیں، میز نہیں ہے تو میز مت بیچیں، گلاس نہیں ہے تو گلاس مت بیچیں۔ یہ ایک عام چیز ہے۔ لیکن ایک خاص چیز ہے کہ کسی کے پاس فیکٹری لگی ہوئی ہے۔ وہ مثلاً فرنیچر بناتا ہے۔ اور آپ پیسے دیں کہ یہ پیسے لیجئے اور مجھے دو چارپائیاں بنا کر دے دیں۔ جیسے آپ نے دے دیئے خرید و فروخت مکمل ہوگئی اور چارپائیاں اس شخص کے پاس موجود نہیں ہیں۔ تو اس حدیث کی رو

سے وہ آپ کو تپائیاں نہیں بیچ سکتا۔ نہ آپ سے پیسے لے سکتا ہے۔ پہلے وہ تپائیاں بنائے، جب بن جائیں تو پھر آپ کو فروخت کرے۔ لیکن ایک طریقہ شروع سے یہ رائج رہا ہے کہ جو لوگ سپلائرز ہیں یا مینوفیکچررز ہیں، اسلام سے پہلے بھی یہ ہوتا تھا آج بھی ہوتا ہے۔ آپ مینوفیکچر یا سپلائیر سے کوئی معاملہ کرلیں اور پہلے اس کو پیسے دے دیں۔ وہ جس طریقے سے سپلائی کرتا ہے آپ کو سپلائی کردے گا۔ اس وقت تو وہ چیز موجود نہیں ہے لیکن بعد میں موجود ہو جائے گی۔ وہ آپ کو دے دے گا۔ یہ ایک خاص حکم ہے جو اس خاص صورت حال کے لئے ہے۔ یہ اس عام حکم سے مستثنیٰ ہے۔ اب آپ کہیں کہ بظاہر تو تعارض ہے۔ وہ چیز موجود نہیں ہے تو وہ کیسے بیچے گا۔ لیکن یہ ایک خاص حدیث ہے ایک خاص صورت حال کو بیان کرتی ہے۔ مینوفیکچرر یا Grower کو آپ کہیں کہ فلاں تاریخ کو آپ مجھے دس من گندم دے دیں۔ یا قصائی ہے جانور خرید کر لاتا ہے اور گوشت سپلائی کرتا ہے۔ آپ کے ہاں کوئی تقریب ہے اور آپ اس سے کہیں کہ فلاں تاریخ کو دس من گوشت سپلائی کردو تو وہ کردے گا اس لئے کہ وہ سپلائر ہے۔ تو سپلائیر، مینوفیکچرر یا Grower کے لئے حضورؐ نے اجازت دی ہے اس لئے کہ یہ طریقہ چلا آرہا تھا۔ یہ مخصوص صورت حال ہے اور اس کو اسی پر محدود رکھا جائے گا اور بقیہ عام حدیث بقیہ معاملات پر منطبق ہوگی۔ ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں رہا۔ یہ ہے مفہوم کے لحاظ سے تعارض دور کرنا۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

گیارھواں خطبہ

برصغیر میں علم حدیث

جمعۃ المبارک، 17 اکتوبر 2003

برصغیر میں علم حدیث

برصغیر میں علم حدیث پر گفتگو کی ضرورت دو وجوہات کی بنا پر ہے۔ ایک بڑی وجہ تو یہ ہے کہ برصغیر میں ایک خاص دور میں علم حدیث پر بہت کام ہوا۔ یہ کام اتنے وسیع پیمانے پر اور اتنی جامعیت کے ساتھ ہوا کہ عرب دنیا میں بہت سے حضرات نے اس کا اعتراف کیا اور اس کے اثرات وسیع پیمانے پر عرب دنیا میں بھی محسوس کیے گئے۔ مصر کے ایک نامور عالم اور مفکر علامہ سید رشید رضا نے یہ لکھا کہ اگر ہمارے بھائی برصغیر کے مسلمان نہ ہوتے تو شاید علم حدیث دنیا سے ختم ہو جاتا۔ یہ فقرہ دراصل اٹھارویں صدی کی صورت حال کا تذکرہ ہے۔ برصغیر کے علمائے کرام نے اس دور میں علم حدیث کا پرچم بلند کیا جب دنیائے اسلام اپنے مختلف مسائل میں الجھی ہوئی تھی۔ مسلمانوں کی علمی اور تہذیبی روایتیں ایک ایک کر کے ختم ہو رہی تھیں۔ مسلمانوں کے تعلیمی ادارے ایک ایک کر کے بند ہوتے جا رہے تھے۔ اس لیے جہاں اور بہت سی روایات ختم ہو رہی تھیں وہاں علم حدیث کی روایت بھی کمزور پڑ رہی تھی۔ اس دور میں برصغیر کے اہل علم نے اس روایت کو دوبارہ تھاما، اور اس کو اس طرح زندہ کر دیا کہ اس کے اثرات پوری دنیا میں ہر جگہ محسوس کیے گئے۔

دوسری وجہ برصغیر میں خاص طور پر علم حدیث پر گفتگو کرنے کی یہ ہے کہ برصغیر میں علم حدیث کی تاریخ کا معروضی مطالعہ یعنی objective study کم ہوئی ہے اور یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ برصغیر میں صف اول کے اہل علم اور بڑے اہل علم کو بھی ان کے علمی کارناموں کو عرب دنیا کے صف اول کے اہل علم اور محققین نے اور مغربی دنیا کے اہل علم نے تعظیم کی نظر سے نہیں بلکہ مسلکی تقسیم کا نشانہ بنا دیا گیا۔ میں نے ایسے بہت سے حضرات کو دیکھا ہے جو صف اول کے بعض محدثین کے

علم حدیث میں برصغیر کا contribution تابعین اور تبع تابعین کے زمانے سے شروع ہو گیا تھا۔ ایک بزرگ تھے ابو معشر نجیح السندی، جن کے لقب کے ساتھ سندی یا سندھی لگا ہوا ہے۔ ان کی روایات اور ان کی بیان کردہ احادیث اور سیرت کا مواد کتب حدیث اور کتب سیرت میں کثرت سے ملتا ہے۔ اس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ برصغیر میں اس روایت نے اتنی تیزی سے جڑیں پکڑیں کہ یہاں کے ایک نامور صاحب علم کا تذکرہ عراق، حجاز اور مصر کے نامور اصحاب علم کے ساتھ ہونے لگا۔

علم حدیث کے ارتقاء اور برصغیر میں علم حدیث پر ہونے والے کام کی رفتار اور اسلوب و انداز کے اعتبار سے دیکھا جائے تو برصغیر کی علمی تاریخ کے سات ادوار بنتے ہیں۔

برصغیر میں علم حدیث کا پہلا دور

سب سے پہلا دور وہ ہے جو محمد بن قاسم کی فتح سندھ کے ساتھ شروع ہوا اور اس وقت تک جاری رہا جب دہلی میں مسلمانوں کی خودمختار اور مستقل بالذات سلطنت کا دارالحکومت قائم ہوا۔ یہ وہ دور ہے جس میں مسلمانوں کے علمی روابط زیادہ تر عرب کے ساتھ بالعموم اور عراق کے ساتھ بالخصوص قائم ہوئے۔ عراق کے لوگ بڑی تعداد میں یہاں آئے۔ اسی طرح دوسرے عرب ممالک سے بھی لوگ بڑی تعداد میں یہاں برصغیر میں آکر بسے۔ ان میں اہل علم بھی شامل تھے، محدثین بھی شامل تھے۔ ان محدثین کے جزوی تذکرے تاریخ کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ یہ محدثین بڑی تعداد میں آتے رہے اور یہاں علم حدیث کی نشر و اشاعت اپنی مقدور بھر کوششوں کے ذریعے تصنیفی اور تحقیقی کام کرتے رہے۔ لیکن ان میں سے بیشتر کا کوئی مفصل تذکرہ نہیں ملتا۔ اس دور کے اہل علم کے بارہ میں اگر کوئی مواد ملتا بھی ہے تو وہ انتہائی مختصر اور محدود ہے۔ اس قلت معلومات کی ایک بڑی اور اہم وجہ یہ بھی ہے کہ کوئی بڑا اور نمایاں تصنیفی اور تحقیقی کام اس دور میں ایسا نہیں ہوا کہ جو کسی قابل ذکر کتاب کی شکل میں یا تصنیف کی شکل میں ہو اور ہم تک پہنچا ہو۔

برصغیر میں علم حدیث کا دوسرا دور

اس کے بعد جب دہلی میں مسلمانوں کی سلطنت قائم ہوئی۔ اور وہ دور شروع ہوا جس کو دور سلطنت کہتے ہیں۔ اس وقت بڑی تعداد میں علمائے کرام برصغیر میں آئے جن میں علم

حدیث پر جو کام کیا وہ کئی سو سال تک پوری دنیائے اسلام میں بہت مشہور و معروف اور مقبول رہا۔ ان کا اسم گرامی تھا امام حسن بن محمد صغانی لاہوری۔ امام صغانی لاہوری کے نام سے مشہور ہیں۔ لاہور میں طویل عرصہ تک قیام کرنے کی وجہ سے وہ لاہوری کہلائے۔ اگرچہ ان کے بارے میں یہ بات مختلف فیہ ہے کہ وہ اصل میں کہاں کے رہنے والے تھے۔ بعض بزرگوں کا کہنا ہے کہ ان کا تعلق بدایون سے تھا جو یوپی کا ایک شہر ہے۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ ان کا تعلق پنجاب ہی کے کسی علاقے سے تھا۔ تاہم اس پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ لاہور میں قیام پذیر رہے۔ لاہور ہی کو انہوں نے اپنا وطن بنایا۔ پھر ایک طویل عرصہ کے بعد وہ لاہور سے دنیائے عرب چلے گئے اور حجاز میں سکونت اختیار فرمائی۔ اور مکہ مکرمہ ہی میں ان کا انتقال ہوا۔ حدیث پر ان کی کتاب ہے مشارق الانوار النبویہ فی صحاح الاخبار المصطفویہ۔ جس کو مختصراً مشارق الانوار کہا جاتا ہے۔

مشارق الانوار برصغیر میں کئی سو سال تک حدیث کی ایک مستند کتاب کے طور پر مروج رہی ہے۔ مدرسوں میں پڑھائی جاتی رہی ہے۔ بہت سے حضرات نے اس کے ترجمے کئے اور اس کی شرحیں لکھیں۔ اس کا اردو ترجمہ بھی ایک قدیم ترین کتاب کے طور پر موجود ہے۔ جب برصغیر میں طباعت اور نشر و اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا اسی وقت سے بارھویں صدی ہجری کے اواخر میں یا تیرھویں صدی ہجری کے شروع میں مشارق الانوار کا اردو ترجمہ شائع ہوا تھا۔

مشارق الانوار ایک مختصر کتاب ہے جس میں صحیحین کی قولی احادیث کا انتخاب ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں جتنی احادیث ہیں ان میں فعلی اور تقریری احادیث کو انہوں نے نکال دیا ہے اور قولی احادیث یعنی رسول اللہ ﷺ کے قولی ارشادات گرامی کا انتخاب کرکے اور سند حذف کرکے انہوں نے جمع کر دیا ہے۔ گویا وہ یہ چاہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات گرامی روایت اور سند کے فنی مباحث سے ہٹ کر عام قارئین تک پہنچ جائیں تاکہ عام لوگ ان کا مطالعہ کر سکیں۔

یہ مشکوٰۃ سے پہلے لکھی جانے والی ایک کتاب تھی۔ امام صغانی لاہوری کی وفات 650ھ میں ہوئی تھی۔ ظاہر ہے انہوں نے اس سے پہلے یہ کتاب لکھی ہوگی۔ ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں لکھی جانے والی یہ کتاب برصغیر میں طویل عرصہ تک مروج رہی۔ اس کی شرحیں بھی لکھی گئیں۔ بعد میں استنبول میں جو علوم و فنون سات سو برس تک دنیائے اسلام کا سیاسی مرکز اور

تخریج کی ہے۔ یہ کتاب ایک اعتبار سے ان کی شرح ہے۔ تو یہ کتاب اساتذہ کرام یا علم حدیث کی مبادی کتابوں کے بارے میں پڑھنے والے کو بہت کچھ واقفیت ہو سکتی ہے۔ بہت سے اہل علم نے اس کی تعریف کی ہے اور اس کا ذکر مختلف تذکروں میں ملتا ہے۔ یہ ایک ایسا اچھوتا کام ہے جو اس انداز میں برصغیر کے علاوہ کسی اور ملک میں نہیں ہوا۔

صوبہ گجرات کے دو بڑے محدثین اور تھے جن میں ایک محدث سے ہر عرب اور علم حدیث کا ہر طالب علم اور پوری دنیائے اسلام واقف ہے۔ وہ ہیں شیخ علی المتقی الہندی۔ اگر کہا جائے کہ شیخ علی متقی دنیائے اسلام میں اپنے زمانے کے سب سے بڑے محدث تھے تو شاید غلط نہیں ہوگا۔ وہ گجرات سے ہجرت کر کے مکہ مکرمہ چلے گئے تھے۔ وہ وہیں مدفون ہیں۔ انہوں نے ایک ایسا کام کیا جو اپنی نوعیت کا ایک بہت بڑا اور منفرد کام تھا۔ انہوں نے یہ چاہا کہ تمام احادیث رسول کو، جو جو دستیاب مجموعوں میں موجود ہیں، حروف تہجی کے اعتبار سے جمع کر دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے 'کنز العمال' کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ کنز العمال میں تمام صحاح ستہ، مسند امام احمد، معجم طبرانی، مسند ابوداؤد طیالسی اور حدیث کی جتنی کتابیں ان کو دستیاب ہوئیں، ان سب کی احادیث کو انہوں نے حروف تہجی کے حساب سے جمع کر دیا ہے۔

یہ کتاب کئی بار چھپی ہے۔ پہلی بار قدیم انداز سے چھپی تھی۔ کتاب کے قدیم ایڈیشنوں میں احادیث کی تعداد کا کوئی بندوبست نہیں تھا کہ ان کو ترتیب وار نمبر شمار لگا کر شمار کر لیا جائے۔ لوگوں نے انفرادی طور پر manually اس کی گنتی کی تو بعض لوگوں کے مطابق اس میں 52,000 احادیث ہیں۔ بعض اور لوگوں کے اندازہ کے مطابق اس سے کم اور بعض کے اندازہ کے مطابق اس سے زیادہ ہیں۔

چند سال پہلے یہ کتاب عرب دنیا میں بڑی تحقیق اور اہتمام کے ساتھ دوبارہ شائع ہوئی اور کتاب کے مرتب و محقق نے ہر حدیث کا نمبر بھی ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ یہ بات میرے علم میں نہیں کہ پوری کتاب مکمل ہو گئی کہ نہیں ہوئی۔ اس کے بعض اجزا تو شائع ہوئے تھے اور میں نے دیکھے تھے۔ اگر مکمل ہو گئی ہے تو صحیح تعداد کا اندازہ ہو گیا ہوگا جس کا مجھے پتہ نہیں ہے۔ لیکن یہ ایک بڑی اہم کتاب ہے جو ایک طویل عرصہ تک طلبہ حدیث کے مطالعہ کا موضوع رہی۔ یہ اس لئے کہ اس میں حدیث کو تلاش کرنا اور اس کا حوالہ دینا بڑا آسان ہے۔ اگر حدیث کے شروع کا حصہ

آپ کو یاد ہو تو حروف تہجی کی ترتیب سے کتاب شروع کردیں۔ نہ یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ اس کے راوی کون ہیں، نہ یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ دراصل یہ حدیث کس کتاب میں ہے اور نہ یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ اصل اور ابتدائی راوی کون ہیں۔ اگر پہلا لفظ آپ کو یاد ہے تو مزید کچھ بھی جاننے کی ضرورت نہیں۔ اس حساب سے یہ کتاب طلبہ، محققین، واعظین، مقررین اور عام مسلمانوں کے لئے بڑی مفید ہے۔ سب نے اس سے استفادہ کیا اور بہت جلد یہ مقبول ہوئی۔

شیخ علی المتقی کے بعد علم حدیث میں نمایاں کام کرنے والے انہی کے شاگرد تھے شیخ عبدالوہاب المتقی، جو ایک بہت بڑے محدث تھے۔ وہ بھی ہجرت کر کے ہندوستان سے مکہ مکرمہ چلے گئے تھے۔ انہوں نے مکہ مکرمہ میں علم حدیث کو بہت بڑے پیمانے پر عام کیا۔ گجرات اور برصغیر کا نام ان کی وجہ سے ہر جگہ روشن ہوا۔ دنیائے اسلام کے مختلف گوشوں سے آنے والوں نے ان سے کسب فیض کیا۔ ان سے استفادہ کرنے والوں میں برصغیر کے لوگ بھی شامل تھے اور باہر کے لوگ بھی۔ یہ تین شخصیات تو ان لوگوں میں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں جن کا تعلق برصغیر سے تھا اور جنہوں نے اس کام کو اس طرح سے انجام دیا کہ پوری دنیا میں اس کے اثرات محسوس کئے گئے۔

برصغیر میں علم حدیث کا تیسرا دور

دور مغلیہ جو دور سلاطین کے بعد آیا، اس کو ہم علم حدیث کے اعتبار سے ایک نئے دور کا آغاز کہہ سکتے ہیں۔ علم حدیث پر ایک نئے انداز سے اور نئے جوش و خروش سے دور مغلیہ میں کام کا آغاز ہوا۔ اگرچہ اس نئے جوش و خروش کا مغل حکمرانوں سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اس کا اعزاز ان کو نہیں جاتا، لیکن چونکہ یہ کام مغل حکمرانوں کے زمانے میں ہوا اس لئے ان کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ یہ دور دو بڑی شخصیات سے عبارت ہے۔ وہ دو بڑی شخصیات جن کے تذکرے کے بغیر برصغیر میں علم حدیث کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان میں ایک شخصیت تو ایسی ہے کہ دنیائے اسلام میں حدیث کی تاریخ ان کے تذکرہ کے بغیر مکمل نہیں ہے تو درست ہے۔ ان میں سے پہلی شخصیت تو شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی ہے اور دوسری شخصیت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے تذکرے کے بغیر علم حدیث کی کوئی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ برصغیر کے مسلمانوں کے امیر المومنین فی الحدیث ہیں تو غلط نہیں ہوگا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا تعلق دہلی سے تھا۔ علم حدیث سے ان کی دلچسپی اور علم حدیث میں ان کی خدمات اس درجہ کی ہیں کہ محدث دہلوی کا لفظ ان کے نام کا حصہ بن گیا ہے۔ آپ نے دہلی کے رہنے والے بہت سے لوگوں کے نام کے ساتھ حقی کا لفظ سنا ہوگا، وہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی اولاد میں سے ہیں، اس لئے حقی کہلاتے ہیں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے خاصی طویل عمر پائی۔ یہ اکبر کے زمانے میں پیدا ہوئے اور شاہجہان کے زمانے میں ان کا انتقال ہوا۔ جہانگیر ان سے متاثر تھا۔ اس نے انہیں اپنے دربار میں آنے کی دعوت دی۔ وہ جہانگیر سے ملنے کے لئے اس کے دربار میں تشریف لے گئے اور جہانگیر سے ملے۔ جہانگیر ان کی شخصیت سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اپنے روزنامچے میں، جو تزک جہانگیری کے نام سے مطبوعہ موجود ہے، ان کا ذکر کیا اور بڑے تعریفی انداز میں لکھا ہے کہ ایسے لوگ بہت کم ہیں۔ میں ان کی شخصیت اور کردار سے بڑا متاثر ہوا ہوں۔ یعنی ایسی شخصیت کہ جن کا بادشاہوں نے نوٹس لیا اور بادشاہوں نے اپنی تحریروں میں جن کا ذکر کیا ان میں شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ شامل ہیں۔

شیخ عبدالحق نے حرمین کا سفر کیا اور تین سال وہاں بسر کئے۔ حرمین کے بہت سے مشائخ سے بھی کسب فیض کیا، سندیں اور اجازت حاصل کی اور اس کے بعد واپس ہندوستان آ گئے۔ یہاں آنے سے پہلے اور آنے کے بعد انہوں نے یہ محسوس کیا کہ برصغیر کی بہت سی خرابیوں اور گمراہیوں کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ یہاں براہ راست قرآن مجید، حدیث اور سیرت کا مطالعہ کم ہوتا جا رہا ہے۔ عقلیات اور معقولات پر زیادہ زور ہے جس کی وجہ سے لوگوں میں تدین، خشیت الٰہی اور تعلق مع اللہ کی وہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی جو براہ راست قرآن مجید، حدیث اور سیرت کے مطالعہ سے پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں اکبری گمراہی عام تھی۔ علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ

تخم الحادے کہ اکبر پرورید

باز اندر فطرت دارا دمید

اکبر کا دین الٰہی جو کہ اس نے بنایا تھا وہ دربار داروں کی خدمت میں اس کے سامنے آگیا تھا۔ گویا
اکبر کا الحاد ایک ضرب المثل ہے۔ اس کی وضاحت یا تشریح کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ بہت ہی
بدقسمتی کا دور الحاد کا زمانہ تھا جس کے منفی اثرات مسلم معاشرہ پر مرتب ہونا شروع ہوگئے تھے۔ اس
دور میں اور ان حالات میں تین حضرات نے اس صورت حال کو بدلنے کے لئے قدم اٹھایا۔ ان میں
سے ایک بڑا نمایاں نام حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا بھی ہے۔

حضرت شیخ محدث دہلوی نے تین بڑے کام کئے۔ ایک بڑا کام تو یہ کیا کہ دہلی میں علم
حدیث کا ایک بہت بڑا حلقہ شروع کیا جہاں سے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں طلبہ اور اہل علم نے ان
سے کسب فیض کیا اور علم حدیث کا ایک نیا رجحان دارالحکومت دہلی میں شروع ہوا جس کے اثرات
باقی معاشرہ پر بھی ہوئے۔ ان کے تلامذہ ان سے پڑھ کر دوسرے شہروں میں گئے۔ دوسرے
شہروں میں علم حدیث کے حلقے قائم ہوئے اور علم حدیث کی ایک نئی خوشبو، ایک تازہ ہوا اور ایک نئی
نسیم جاں فزا ہندوستان میں پھیلنا شروع ہوئی جس کے محرک اول شیخ عبدالحق محدث دہلوی تھے۔

شیخ عبدالحق نے دوسرا کام یہ کیا کہ علوم نبوت پر چھوٹے چھوٹے رسالے اور کتابیں
لکھنا شروع کیں جن کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں ذات رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام سے
تعلق استوار ہو۔ رسول اللہ ﷺ کی ذات سے محبت پیدا ہو۔ حضورؐ کی شخصیت پر، آپؐ کے شمائل پر،
نبوت پر اور مدینہ منورہ کے فضائل جیسے موضوعات پر انہوں نے فارسی میں مختلف چھوٹے بڑے
رسائل لکھے جو بہت مقبول بھی ہوئے اور ان کے بھی بہت اچھے اثرات مرتب ہوئے۔

اس کے ساتھ ساتھ ان کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے برصغیر میں حدیث کی تعلیم
کی ایک باقاعدہ روایت پیدا کی۔ اس روایت کو مضبوط علمی بنیادوں پر قائم کیا اور اس طرح قائم کیا
کہ ان کے انتقال کے کئی سو سال بعد تک بھی وہ جاری رہی۔ انہوں نے حدیث کی مشہور کتاب
'مشکوٰۃ المصابیح' کی شرحیں تیار کیں جو فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں تیار ہوئیں۔ مشکوٰۃ
المصابیح آٹھویں صدی میں لکھی گئی تھی اور یہ حدیث کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس کی اپنی ایک حیثیت
ہے۔ ایک طویل عرصہ مشکوٰۃ درسی کتاب کی حیثیت سے رائج رہی ہے اور آج بھی بہت سے
اداروں کے نصاب میں شامل ہے۔ اس کتاب کو برصغیر میں متعارف کرانے والے اور بطور نصابی
کتاب کے اختیار کرنے والے شیخ عبدالحق محدث دہلوی ہیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اس

تھے تو شاہ صاحب نے یہ شعر پڑھا۔

نصبت بکل طریق کنت اعرفہ

لاعرف منک ان اہتدی الی رشد

میں ہر راستہ بھول چکا ہوں سوائے اس راستے کے جو آپ کے گھر تک آتا ہے۔

لیکن شیخ ابوطاہر کردی نے کہا کہ جلدی میں کوئی فیصلہ نہ کرو۔ بلکہ ابھی غور کرلو۔ انہوں نے خود بھی چند روز غور کرنے کے بعد شاہ ولی اللہ سے کہا کہ تم یہاں نہ رہو اور واپس ہندوستان چلے جاؤ۔ شیخ ابوطاہر نے باصرار شاہ صاحب کو واپس بھیج دیا۔ اس وقت شاہ صاحب بڑے بوجھل دل کے ساتھ واپس تشریف لے آئے۔ لیکن واپس تشریف لانے کے بعد شاہ صاحب نے جو کارنامے انجام دیئے اور جن کا سلسلہ آج تک چلا آ رہا ہے ان کو دیکھنے سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ ابوطاہر کردی نے کس خاص نیت سے ان کو بھیجا تھا اور شاہ صاحب کو بھی اس کا اندازہ ہو گیا تھا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے برصغیر میں علم حدیث اور علوم حدیث کی ایک نئی روایت کو پروان چڑھایا جو نہایت مضبوط تھی اور اخلاص کی ایسی مضبوط بنیادوں پر استوار تھی کہ آج بھی ان کی رکھی ہوئی بنیادیں موجود ہیں۔ ان کے لگائے ہوئے چمنستان حدیث کے گلہائے معطر کی خوشبو ڈھائی سو سال سے برصغیر کو معطر کئے ہوئے ہیں۔ ان کے جاری کئے ہوئے کام کے اثرات آج بھی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہیں جن سے آج تک لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔

شاہ صاحب نے علم حدیث کی تدریس کا ایک حلقہ قائم کیا اور اعلیٰ ترین سطح پر علم حدیث کی تعلیم دی۔ اپنی خاص نگرانی میں ماہرین حدیث کی ایک جماعت تیار کی۔ ان کو ہندوستان کے مختلف گوشوں میں متعین کیا اور جگہ جگہ حدیث کی تعلیم کے ادارے قائم کئے۔ خود انہوں نے علوم حدیث پر متعدد کتابیں تصنیف کیں جو فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے علوم حدیث میں ایک نئے فن کی بنیاد ڈالی۔ یہ لفظ شاید درست نہ ہو اس لئے کہ ان سے پہلے بھی کئی حضرات نے اس موضوع پر قلم اٹھایا تھا، لیکن جس انداز سے شاہ صاحب نے قلم اٹھایا تھا، اس کی مثال نہیں ملتی۔

شاہ صاحب نے علم حدیث کی تاریخ کا ایک قابل ذکر کام یہ کیا کہ حدیث نبوی کے پورے ذخیرہ کو جمع کرکے اور اس کا مطالعہ کرکے اس میں جو اسرار دین اور شریعت کے بنیادی اصول

بیان ہوئے ہیں، ان کو اس طرح اجاگر کیا کہ پورے علوم حدیث اور علوم نبوت کی روح پڑھنے والے کے سامنے آجاتی ہے۔ یہ کارنامہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی جس کتاب میں ہے اس کا نام "حجۃ اللہ البالغہ" ہے جس کا اردو اور انگریزی ترجمہ دونوں دستیاب ہیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے فرانسیسی زبان میں بھی ترجمہ کیا تھا لیکن وہ شائع نہیں ہوا ہے۔ عربی میں اصل کتاب دنیائے عرب اور عجم میں درجنوں مرتبہ چھپی ہے اور دنیا کے ہر گوشے کے اہل علم نے مراکش سے لے کر انڈونیشیا اور جنوبی افریقہ سے لے کر انتہائی شمال تک جہاں جہاں مسلمان بستے ہیں، اس سے استفادہ کیا۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے موطا امام مالک کو علم حدیث کی بنیادی کتاب کے طور پر اختیار کیا۔ وہ موطا امام مالک کے بڑے مداح تھے۔ وہ اس کو صحیحین سے افضل اور راجح قرار دیتے تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو موطا امام مالک کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال یہ تھا کہ جتنے مکاتب فقہ ہیں وہ سارے کے سارے بالواسطہ اور بلاواسطہ موطا امام مالک سے متاثر ہیں اور موطا امام مالک میں ان تمام مکاتب فکر کی جڑ موجود ہے جن کی بنیاد پر فقہی مکاتب اور حدیثی اسکول مرتب ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ تمام بڑے بڑے محدثین بالواسطہ اور بلاواسطہ امام مالک کے شاگرد ہیں۔ اس لئے ان کے حدیثی کام پر امام مالک کے اثرات نمایاں ہیں۔

امام شافعی، براہ راست ان کے شاگرد ہیں، امام محمد ابن حسن شیبانی جو فقہ حنفی کے مدون اول ہیں، وہ ان کے براہ راست شاگرد ہیں اور امام احمد بن حنبل ایک واسطہ سے ان کے شاگرد ہیں۔ اس لئے چاروں مکاتب فکر امام مالک سے بالواسطہ یا بلاواسطہ متعلق اور متاثر ہیں۔ لہٰذا موطا امام مالک کو دین وشریعت کی ساری تعلیم کی بنیاد ہونا چاہئے تاکہ سب مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جا سکے۔ اہل فقہ، اہل حدیث اور تمام اہل علم سب امام مالک کی ذات کے گرد ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو سکتے ہیں۔ یہ شاہ صاحب کا نقطہ نظر تھا جو انہوں نے جگہ بڑی تفصیل سے لکھا بھی ہے۔ اس لئے شاہ صاحب نے موطا امام مالک کا درس دینا شروع کیا۔ برصغیر میں پہلی مرتبہ موطا امام مالک کا درس انہوں نے ہی شروع کیا۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے موطا امام مالک کی دو شرحیں لکھیں۔ جیسے شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے مشکوٰۃ کی دو شرحیں لکھی تھیں اسی طرح شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے موطا امام مالک کی دو شرحیں لکھیں۔ ایک فارسی میں اور ایک عربی میں لکھی۔ عربی میں "المسوی" ہے جو

مفصل ہے اور فارسی میں ہے۔ المسوّیٰ عربی میں لکھی جو مختصر ہے۔ المسوّیٰ حدیث کے ماہرین اور طلبہ کے لئے ہے اور المصفّٰی عام تعلیم یافتہ مسلمانوں کے لئے ہے۔

ان دو شرحوں کے ساتھ ساتھ شاہ صاحب نے علم حدیث پر اور بھی کتابیں لکھیں۔ ان میں سے ایک بڑی کتاب جو امام بخاری کی ان بحثوں کے بارے میں ہے جو دلچسپی کا باعث ہوئی جن میں سے امام بخاری کے ابواب کے عنوانات کے بارے میں سوال کیا گیا تھا۔ یہ تراجم ابواب بخاری کی شرح ہے جس کا نام ہے شرح تراجم ابواب البخاری۔ امام بخاری نے مختلف ابواب کے جو عنوانات قائم کئے ہیں ان میں کیا مفہوم اور حکمت پنہاں ہیں۔ اس پر بہت سے لوگوں نے کتابیں لکھیں جن میں ایک شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی بھی ہے۔

شاہ عبدالعزیزؒ

شاہ صاحب کے یوں تو بہت سے شاگرد اور طلبہ تھے لیکن ان کے شاگردوں اور طلبہ میں جو سب سے نمایاں نام ہے وہ ان کے اپنے صاحبزادے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا ہے۔ شاہ ولی اللہ کی عمر تو شاید اکسٹھ یا باسٹھ سال ہوئی۔ لیکن شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی عمر زیادہ ہوئی۔ تقریباً اسی بیاسی سال ان کی عمر ہوئی اور انہوں نے کم وبیش ساٹھ ستر سال تک ہندوستان میں درس حدیث دیا۔ جب ان کے والد کا انتقال ہوا تو شاہ عبدالعزیز کی عمر اٹھارہ یا انیس سال تھی اور وہ اسی وقت فارغ التحصیل ہو کر نئے نئے مدرس ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے والد کی جگہ سنبھالی اور علم حدیث اور درس قرآن کا سلسلہ شروع کیا۔ آج برصغیر میں عوامی سطح پر درس قرآن کے جو حلقے جاری ہیں ان کے بانی شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ہیں۔ ان سے پہلے اس طرح عوامی سطح پر درس قرآن نہیں ہوا کرتا تھا۔ محدود درس قرآن کا آغاز شاہ عبدالعزیز کے دادا شاہ عبدالرحیم صاحب نے کیا تھا، پھر شاہ ولی اللہ نے اس کو جاری رکھا، لیکن وہ محدود اہل علم کے لئے تھا۔ عوامی سطح پر جس میں ہزاروں لوگ شریک ہوتے تھے وہ شاہ عبدالعزیز کا درس قرآن ہوتا تھا جو ہفتہ میں دو مرتبہ ہوتا تھا۔ اس میں مغل حکمرانوں کے اہل خانہ، شہزادے اور اعلیٰ حکام بھی شریک ہوتے تھے۔ ایک آدھ مرتبہ شاہ عبدالعزیز نے مغل بادشاہ کے ہاں جا کر بھی درس دیا اور مغل بادشاہوں نے بھی ان کے درس میں شرکت کی۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے ستر سال تک درس حدیث دیا اور 1824ء میں دار
دنیا سے رخصت ہو گئے۔ چونکہ انھوں نے طویل عمر پائی تھی اس لیے جب ان کا انتقال ہوا تو ان
کے بیٹے بھی جن کی تعداد چار تھی اور بھائی تھے وہ سب ان سے پہلے دنیا سے جا چکے تھے۔ اب ان کے
جانشین ان کے نواسے حضرت شاہ محمد اسحاق تھے۔ انھوں نے بھی کم و بیش چالیس یا پچاس سال
ہندوستان میں درس حدیث دیا اور ہزاروں تلامذہ ان سے درس حدیث پڑھ کر فارغ ہوئے۔ ان
کے تلامذہ میں یہ کہنا کہ کون نمایاں ہیں اور کون نمایاں نہیں، یہ بڑا دشوار ہے۔ شاہ محمد اسحاق دہلوی
کے ہزاروں شاگرد تھے جنہوں نے ہندوستان کے کونے کونے میں علم حدیث کو عام کیا۔

حضرت میاں نذیر حسین محدث دہلوی

ان کے شاگردوں میں تین حضرات بڑے نمایاں ہیں۔ سب سے نمایاں ہیں جن کا نام سب سے
روشن ہے کہ جن کے طلبہ ہندوستان کے ہر علاقے میں پھیلے۔ ان کے ایک شاگرد تھے جو شیخ الکل
یعنی ہر فن کے استاد اور سب کے استاد کہلاتے تھے۔ وہ تھے حضرت میاں نذیر حسین محدث دہلوی۔
شاہ محمد اسحاق 1857 کے ہنگامے کے کچھ سال بعد ہجرت کر کے مکہ مکرمہ چلے گئے۔ باقی زندگی
وہیں گزاری اور وہیں ان کا انتقال بھی ہو گیا۔ ان کے بعد ان کی جانشینی ہندوستان میں جن
حضرات نے کی ان میں ایک تو میاں نذیر حسین محدث دہلوی تھے جن سے تلامذہ کا ایک طویل
سلسلہ چلا۔ میاں صاحب کے تلامذہ میں جو لوگ نمایاں ہیں ان میں سے دو کے نام میں عرض
کر دیتا ہوں۔ ایک علامہ وحید الزمان تھے جنہوں نے علم حدیث کی تقریباً تمام کتابوں کا اردو
ترجمہ کیا اور اردو زبان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ صحیح بخاری، مسلم، ترمذی، موطا امام مالک اور حدیث
کی بہت سی کتابیں اردو ترجمے کے ساتھ سامنے آگئیں۔ گویا اردو زبان میں حدیث کی کتابوں کے
پہلے مترجم علامہ وحید الزمان ہیں جو حضرت میاں نذیر حسین محدث دہلوی کے شاگرد ہیں۔ ہندو
پاکستان میں ان کتب کے تراجم کی اشاعت سے علم حدیث کتنا عام ہوا اس کا اندازہ آپ کر سکتے ہیں۔

میاں نذیر حسین کے دوسرے شاگرد تھے علامہ شمس الحق عظیم آبادی۔ یہ اتنے بڑے
محدث ہیں کہ اگر یہ کہا جائے کہ ان کے زمانے میں ان سے بڑا محدث کوئی نہیں تھا، یا اگر تھے
تو ایک دو ہی تھے، تو شاید یہ مبالغہ نہیں ہوگا۔ انھوں نے دو کارنامے انجام دیے جو بہت نمایاں

تھے۔ ان کا ایک کارنامہ تو یہ تھا کہ انہوں نے "غایۃ المقصود" کے نام سے سنن ابوداؤد کی شرح لکھی جو بتیس جلدوں میں تھی۔ بہت افسوس کی بات ہے کہ یہ شرح چھپ نہیں سکی۔ انہوں نے اس کی جلد اول شائع کی تو بعض لوگوں نے کہا کہ اتنی طویل شرح کون پڑھے گا۔ اس کو کیسے چھاپیں گے۔ پھر نہیں آپ کی زندگی میں چھپ سکے گی یا نہیں۔ انگریزوں کا دور تھا۔ مسلمانوں کے پاس وسائل نہیں تھے، فقر و فاقہ تھا۔ نہ چندہ دینے والے تھے اور نہ کوئی مسلمان بڑی رقم بطور چندہ دینے کی پوزیشن میں تھا۔ اس لئے انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی اور ایک دو شاگردوں کو اس کی تلخیص کے کام پر لگا دیا۔ یہ تلخیص "عون المعبود" کے نام سے شائع ہوئی اور آج چھپی ہوئی ہر جگہ ملتی ہے جو سنن ابوداؤد کی بہترین شرحوں میں سے ایک ہے۔ عون المعبود برصغیر، ایران، بیروت، مصر اور باقی عرب دنیا میں بھی چھپی ہے اور اس کے درجنوں ایڈیشن نکلے ہیں۔

علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوریؒ

علامہ شمس الحق عظیم آبادی کے ایک شاگرد اور ان کے سلسلے کے ایک اور بزرگ علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوری تھے۔ علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوری صف اول کے محدث تھے۔ انہوں نے سنن ترمذی کی ایک شرح لکھی جس کا نام "تحفۃ الاحوذی" ہے۔ اس کے بارے میں اگر میں یہ عرض کروں کہ یہ سنن ترمذی کی اتنی ہی بہترین شرح ہے جتنی بہترین شرح صحیح بخاری کی فتح الباری ہے، تو شاید یہ مبالغہ نہ ہوگا۔ جامع ترمذی کی اس سے بہتر کوئی اور شرح موجود نہیں ہے اور یہ برصغیر کے ایک صاحب علم کا اتنا بڑا کارنامہ ہے جو دنیائے اسلام میں سمجھا بھی جاتا ہے اور اس کا اعتراف بھی کیا جاتا ہے۔ اس کتاب کا بیروت، تہران، مصر، ہندوستان، پاکستان اور کئی دوسری جگہوں پر بار بار چھپنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کتاب کو دنیائے اسلام میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا ہے۔ برصغیر میں اس کا جو ایڈیشن شائع ہوا تھا وہ پانچ جلدوں تک ہے۔ عرب دنیا میں شائع ہونے والے ایڈیشنوں کی جلدیں مختلف ہیں۔ کوئی سولہ جلدوں میں ہے، کوئی چودہ میں اور کوئی بیس میں۔ لیکن یہ ترمذی کی بہترین شرح ہے اور اگر کوئی اس سے اتفاق نہ کرے کہ یہ جامع ترمذی کی سب سے بہتر شرح ہے، تو یہ تو بلا شک و شبہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب جامع ترمذی کی چند بہترین شرحوں میں یقیناً ہے اور اس سے کوئی اختلاف نہیں کرے گا۔

مولانا عبدالرحمن مبارکپوری کے تلامذہ بہت کثرت سے ہیں۔ میں نے بھی ایک بزرگ سے اجازت حدیث لی تھی جو براہ راست مولانا عبدالرحمن مبارکپوری کے شاگرد تھے اور گویا میں نے ایک واسطے سے مولانا مبارکپوری سے اجازت حاصل کی ہے۔ وہ بزرگ درمیان میں ہیں اور انہوں نے مولانا مبارکپوری سے علم حدیث کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ہمارے برصغیر کے مشہور عالم اور مفسر قرآن مولانا امین احسن اصلاحی بھی علم حدیث میں مولانا مبارکپوری کے شاگرد تھے۔

مبارکپور اعظم گڑھ کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ میں 1982 میں اس گاؤں کو دیکھنے کے لئے صرف اس وجہ سے گیا تھا کہ مولانا عبدالرحمن مبارکپوری کا گاؤں ہے اس لئے دیکھنا چاہیے۔ وہ مدرسہ اب بھی قائم ہے جہاں مولانا مبارکپوری حدیث پڑھایا کرتے تھے۔ وہ کچا سا مکان اب بھی موجود ہے جس میں وہ کام ہوا جو پوری دنیائے اسلام میں جامع ترمذی کی خدمت کے بعد نہیں ہوا تھا۔

شاہ محمد اسحاق کے دوسرے شاگردوں کا ایک دوسرا سلسلہ ہے جن میں ایک بڑے مشہور بزرگ تھے شاہ ابوسعید مجددی۔ جو حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں تھے اور شاہ محمد اسحاق کے شاگردوں میں تھے۔ ان سے ایک نیا سلسلہ شاہ اسحاق کے تلامذہ کا نکلا جن کے شاگرد تھے مولانا شاہ عبدالغنی۔ ان کے شاگرد تھے مولانا مملوک علی۔ مولانا مملوک علی طویل عرصہ تک علم حدیث کے استاد رہے۔ ان کے تلامذہ میں ایک گروہ ہے جو علماء دیوبند کہلاتا ہے اور دوسرا وہ ہے جو سرسید احمد خان اور ان کے ہم راہی ہیں۔ سرسید احمد خان بھی مولانا مملوک علی کے شاگرد تھے اور علماء دیوبند میں مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی شامل ہیں۔

مولانا رشید احمد گنگوہی اور ان کے تلامذہ

مولانا رشید احمد گنگوہی زندگی بھر حدیث پڑھاتے رہے۔ ان کے امالی یعنی حدیث میں ان کی تقریروں اور درسوں کو بہت سے لوگوں نے جمع کر کے مرتب کیا اور شائع کرایا۔ صحیح بخاری کی شرح لامع الدراری کے نام سے ایڈٹ ہوئی۔ اور بھی متعدد کتابوں کی شرحیں ایڈٹ ہوئیں اور ان کے نام سے یہ چیزیں شائع ہوئیں جو آج موجود ہیں۔ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے شاگردوں میں دو شخصیات بہت نمایاں ہیں۔ ایک کا اسم گرامی تھا مولانا محمد یحیٰ اور دوسرے کا نام گرامی تھا

انور شاہ کشمیری کے ایک اور شاگرد مولانا محمد اشفاق الرحمٰن تھے جو مولانا محمد ادریس کے بھی استاد تھے۔
ان کی دو کتابیں ہیں۔ ایک ترمذی کی شرح ہے جو غیر مطبوعہ ہے اور دوسری موطا امام مالک کی
شرح ہے جو پاکستان میں کئی بار چھپی ہے اور موطا امام مالک کی مختصر اور جامع شرحوں میں سے ایک
نمایاں مقام رکھتی ہے۔ مولانا انور شاہ کشمیری کے کئی شاگردوں نے علم حدیث کے مختلف
موضوعات پر کام کیا۔ ذخیرہ حدیث کا ایک پورا ترجمہ وہ انہوں نے ہندوستان میں چھوڑا۔ خود
مولانا کے داماد اور شاگرد مولانا احمد رضا بجنوری نے صحیح بخاری پر اپنے شیخ کے امالی کو اردو میں
اٹھارہ جلدوں میں مرتب کیا۔ ان کی یہ کتاب 'انوار الباری' کے نام سے پاکستان اور ہندوستان
میں کئی بار چھپ چکی ہے۔ علامہ انور شاہ کشمیری کا کام اتنا وسیع ہے کہ اگر اس کی تفصیل بیان کی
جائے تو اتنا وقت درکار ہے کہ شاید پورا ایک دن بھی اس کے لئے کافی نہ ہوگا۔ مولانا عبدالرحمٰن
مبارکپوری اور مولانا شمس الحق عظیم آبادی کے عظیم الشان کام کو میں نے بہت اختصار کے ساتھ
بیان کیا۔ اگر اس کی تفصیل بیان کی جائے تو بہت وقت درکار ہوگا۔

فرنگی محلی علماء

ایک اور بزرگ تھے بلکہ ایک اور روایت تھی جس کا میں دو تین جملوں میں ذکر
کرتا ہوں۔ اس روایت سے وابستہ اہل علم کی بھی علم حدیث میں بڑی غیر معمولی خدمات ہیں۔ یہ
روایت علماء فرنگی محل کی ہے۔ لکھنؤ میں ایک بہت بڑا مکان تھا۔ ایک حویلی تھی جو جہانگیر نے انگریز
تاجروں کو دی تھی۔ انگریز تاجر جہانگیر کے زمانے میں آئے تھے انہوں نے تجارتی مرکز قائم کرنے
کی اجازت مانگی۔ جہانگیر نے ان کو دو تجارتی کوٹھیاں دے دیں۔ ہندوستان میں جہاں جہاں
انگریزوں نے اپنے مرکز قائم کئے ان میں سے ایک لکھنؤ میں بھی تھا۔ وہ حویلی فرنگی محل کہلاتی تھی
کیونکہ فرنگی وہاں رہا کرتے تھے۔ جب ان کی سازشیں اور حرکتیں برداشت کی حدوں سے باہر
ہو گئیں تو اورنگزیب عالمگیر نے ان کے خلاف ایکشن لیا۔ ان کو وہاں سے نکال دیا۔ وہ فرنگی محل کی
عمارت ان سے خالی کروائی اور ملا نظام الدین سہالوی ایک عالم تھے، ان کو دے دی کہ اس میں
کوئی دینی ادارہ قائم کر دیں۔ اس طرح فرنگی محل میں ایک دینی ادارہ قائم ہو گیا اور جتنے بھی علماء
وہاں کے فارغ التحصیل ہیں وہ فرنگی محلی کے نام سے مشہور ہیں۔ ان میں کئی علماء پیدا ہوئے جن

اگر مل جائے تو یہ آسان ہے۔ ابھی حال ہی میں ادارہ تحقیقات اسلامی (آئی آر آئی) نے اس کا انگریزی ترجمہ شائع کیا ہے۔ اس کے ایک حصہ کا انگریزی ترجمہ میرے چھوٹے بھائی ڈاکٹر غزالی صاحب نے کیا تھا، وہ بھی مطبوعہ موجود ہے لیکن ایک مکمل ترجمہ دو جلدوں میں ایک امریکی نو مسلم خاتون، جن کا اصل نام ماریہ بیٹلسن ہے، انھوں نے دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ وہ انگریزی ترجمہ بہت اچھا ہے اور یہاں ملتا ہے۔ اردو پڑھنا چاہیں تو مولانا عبدالحق حقانی کا ترجمہ پڑھ لیں۔

آج کے دور کے برصغیر کے محدثین کے بارے میں چند گزارشیں

وہ اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا تذکرہ کرنا بڑا دشوار ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی کاوشوں میں برکت دے، لیکن اس درجہ کا کوئی آدمی نہیں ہے جس درجہ کے علامہ انور شاہ کشمیری یا علامہ شمس الحق عظیم آبادی، یا مولانا عبدالرحمن مبارکپوری تھے۔ ابھی ایک بزرگ ہندوستان میں ہیں اور غالباً حیات ہیں اور بہت معمر ہوں گے۔ ان کی ایک شرح بخاری 'انوار الباری' کے نام سے چھپی ہے۔ کراچی میں بھی چھپی ہے۔ بہت اچھی کتاب ہے۔ یہ مولانا انور شاہ کشمیری کے داماد اور شاگرد تھے۔ انھوں نے ان کی تقریروں کے نوٹس مرتب کیے ہیں۔ جو مجھے بہت اچھے معلوم ہوئے۔ اگرچہ اس میں مسلکی چیزیں بہت ہیں جو نہیں ہونی چاہیے تھیں لیکن اس کے باوجود کتاب بہت اچھی ہے۔ ایک ہمارے دوست مولانا تقی عثمانی ہیں۔ انھوں نے مولانا شبیر احمد عثمانی کی شرح صحیح مسلم کی تکمیل کی ہے۔ فتح الملہم مولانا شبیر احمد عثمانی کے قلم سے صحیح مسلم کی شرح ہے۔ یہ نامکمل تھی اور کتاب الرضاع تک ہی لکھی جا سکی۔ اس کی بقیہ جلدیں مولانا محمد تقی عثمانی نے لکھی ہیں۔ اسی طرح اور حضرات کی کتابیں بھی ہیں جن کی تفصیل بیان کرنے کا موقع نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆☆

بارھواں خطبہ

علوم حدیث - دور جدید میں

ہفتہ 18 اکتوبر 2003ء

اپنے اپنے نمونے دنیا کے سامنے رکھے ہیں جن کو علم حدیث کی تاریخ میں ایک نئے دور کا نقطۂ آغاز کہا جا سکتا ہے۔ عرب دنیا میں بہت سی جامعات کے شعبہ ہائے اسلامیات نے اور بہت سی جامعات اسلامیہ نے علم حدیث کے موضوع پر ایسے نئے مقالات تیار کرائے ہیں جنہوں نے علم حدیث کے ان تمام گوشوں کو از سر نو زندہ کر دیا ہے جن کو ایک طویل عرصہ سے لوگوں نے نظر انداز کر دیا تھا۔

ایک عام تاثر یہ تھا کہ رجال اور جرح و تعدیل پر جتنا کام ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔ احادیث مرتب ہو چکیں۔ مدون ہو چکیں اور کتابی شکل میں ہم تک پہنچ چکیں۔ اب از سر نو رجال پر غور کرنے یا جرح و تعدیل کے مباحث کو دوبارہ چھیڑنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور نہ اب اس کی ضرورت ہے۔ جزوی طور پر یہ بات درست ہے اور ایک حد تک میں بھی اس سے اتفاق کرتا ہوں کہ احادیث مرتب ہو چکیں، کتابوں کی شکل میں مدون ہو چکیں، احادیث کا درجہ متعین کیا جا چکا ہے اور محدثین نے فیصلہ احادیث کے بارے میں یہ تحقیق ہو چکی ہے کہ ان میں سے کس حدیث کا روایت کے اعتبار سے فن رجال اور سند کے اعتبار سے کیا درجہ ہے۔ اس لئے اس موضوع پر کسی نئی تحقیق یا کسی نئے نتیجہ کا سامنے آنا بہت بعید از امکان ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خود علم رجال اپنی اہمیت کھو چکا ہے۔ علم جرح و تعدیل کی اب کوئی اہمیت نہیں رہی اور یہ ماضی کا ایک بھولا بسرا علم ہے جس کو ایک تاریخ کے طور پر تو پڑھا جا سکتا ہے، ایک زندہ علم اور ایک مسلسل حرکت پذیر علم کے طور پر اب اس کی اہمیت نہیں رہی۔ میں اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ علم رجال، علم روایت، علم سند اور علوم حدیث آج بھی ویسے ہی زندہ علوم ہیں جیسے آج سے ایک ہزار سال پہلے یا بارہ سو سال پہلے تھے۔ ان علوم میں تحقیق کے ایسے ایسے گوشے اب بھی موجود ہیں جو اہل علم کی اور طلبہ حدیث کی توجہ کے مستحق ہیں۔ علامہ اقبال کا ایک فارسی شعر ہے جو شاید انہوں نے ایسے ہی کسی موقع کے لئے کہا ہوگا۔

گماں مبر کہ بپایاں رسید کار مغاں

ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است

یہ مت سمجھو کہ انگور کے خوشے سے شراب نچوڑنے والے کا کام ختم ہو چکا ہے۔ ابھی تو انگور کے خوشوں میں ہزاروں شرابیں ہیں جو نچوڑی جانی ہیں اور ان کو نکال کر ابھی لوگوں کے

کیا گیا اور صحیح ترین نسخے کے تعین کا اہتمام کیا گیا۔ یہ اہتمام کس حد تک پہلے بھی ہوتا رہا تھا لیکن اب زیادہ سائنسی اور علمی انداز میں ہونے لگا ہے۔

اس طرح سے اگر کتاب میں کسی سابقہ کتاب کا حوالہ ہے تو اس کتاب سے تلاش کر کے اس حوالہ کی نشاندہی کی جاتی ہے تاکہ آسانی ہو جائے اور اصل کتاب سے موازنہ کر کے رجوع کیا جا سکے۔ یہ طریقہ مغرب میں رائج ہوا اور دنیائے اسلام نے اس کو اپنایا۔ بلاشبہ یہ ایک اچھا طریقہ ہے۔ اس کے مطابق حدیث کی بہت سی کتابیں شائع ہوئی ہیں جن سے استفادہ کرنا بہت آسان ہو گیا ہے۔

تاریخ حدیث پر ہونے والا کام

بیسویں صدی میں تاریخ حدیث پر بھی ایک بڑا اہم کام ہوا جس کا تذکرہ میں اختصار کے ساتھ پہلے کر چکا ہوں۔ یہ کام جن صاحب علم بزرگ نے شروع کیا وہ مولانا سید مناظر احسن گیلانی تھے جو حیدر آباد دکن میں جامعہ عثمانیہ میں اسلامیات کے استاد اور بڑے عالم اور مشہور مفکر تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے تاریخ تدوین حدیث کے نام سے ایک کتاب مرتب کی۔ تاریخ تدوین حدیث مرتب کرتے ہوئے انہوں نے مستشرقین کے ان اعتراضات کو سامنے رکھا جن میں یہ کہا گیا تھا کہ علم حدیث سارے کا سارا محض زبانی اور سنی سنائی باتوں پر مشتمل ہے۔ اس کے پیچھے کوئی مضبوط تحریری و علمی روایت نہیں ہے۔ اس لئے جو ذخیرہ حدیث کے نام سے آج پیش کئے جاتے ہیں وہ سارے کے سارے مشکوک ہیں۔ یہ بات مستشرقین بیسویں صدی کے شروع میں کہا کرتے تھے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے تدوین حدیث پر ایک بڑی ضخیم کتاب مرتب کی جو غالباً آٹھ نو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں انہوں نے اس اعتراض کو سامنے رکھ کر تدوین حدیث کی تاریخ کو اپنے انداز سے مرتب کیا کہ یہ اعتراض خود بخود ختم ہو جاتا ہے اور وہ سارے شواہد سامنے آ جاتے ہیں جن سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مستشرقین کا یہ اعتراض کتنا کمزور ہے، کتنا بے بنیاد ہے اور کتنا غیر علمی ہے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی کے اس کام کو ان کے شاگردوں نے آگے بڑھایا۔ ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم ان کے براہ راست شاگرد تھے۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے صحیفہ ہمام بن منبہ کو ایڈٹ کیا۔ یہ

ہو گئیں۔ مصنف عبدالرزاق انہوں نے اپنے خرچ سے شائع کی اور پوری دنیا میں مفت تقسیم کرادی۔ آج مصنف عبدالرزاق کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں اور یہ کتاب دنیا کے ہر کتب خانہ میں موجود ہے۔

اسی طرح سے امام حمیدی جو امام بخاری کے استاد تھے، ان کی ایک کتاب تھی جو مسند الحمیدی کے نام سے بڑی مشہور تھی۔ وہ عام طور پر نہیں ملتی تھی۔ کہیں کہیں اس کے مخطوطے اور نسخے موجود تھے۔ مولانا حبیب الرحمن اعظمی نے اس کو بھی ایڈٹ کیا اور کسی بزرگ نے اپنے خرچ پر اس کو بھی شائع کرا دیا۔ آج وہ دنیا کی ہر لائبریری میں موجود ہے۔

امام ابوبکر بزار جو ایک بڑے مشہور محدث تھے۔ ان کی کتاب مسند بزار ہے۔ ان کے زوائد پر ایک پرانی کتاب بنی ہوئی تھی جس کا نام تھا کشف الاستار عن زوائد البزار۔ وہ بھی مولانا حبیب الرحمن اعظمی نے ایڈٹ کر کے شائع کرا دی۔ اس طرح حدیث اور علوم حدیث کی درجنوں بڑی اور بیش قیمت کتابیں ہیں جن پر آج بڑی تعداد میں اہل علم نے کام کیا ہے۔ اگر میں ان کے صرف نام ہی لینے لگوں تو لسٹ بہت لمبی ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر دے۔

چودھویں صدی اس اعتبار سے علم حدیث کی تاریخ میں نمایاں ہے کہ وہ مواد جو ابتدائی دو تین صدیوں میں جمع ہوا تھا، تیسری چوتھی صدی ہجری تک آگیا تھا۔ وہ بعد کے سالوں میں یعنی پانچویں چھٹی صدی سے لے کر تیرھویں صدی تک لوگوں کے لئے بالعموم دستیاب نہیں رہا اور عام لوگوں کو ملتا نہیں تھا۔ بعض بعض کتب خانوں میں موجود تھا اور اہل علم جا کر استفادہ بھی کیا کرتے تھے لیکن چودھویں صدی میں یہ سب کتابیں چھپ کر عام ہو گئیں اور لوگوں تک پہنچ گئیں۔

شام کے ایک بزرگ ڈاکٹر نورالدین عتر ہیں۔ انہوں نے علم حدیث پر بڑا قابل قدر کام کیا ہے اور کئی پرانی کتابیں ایڈٹ کر کے شائع کرائی ہیں۔ خطیب بغدادی کی کتابیں چودھویں صدی میں شائع ہوئیں۔ اسی طرح سے ہمارے سابق مشرقی پاکستان مرحوم (بنگلہ دیش) کے ایک بزرگ ڈاکٹر معظم حسین تھے، جو وہاں شعبہ عربی کے صدر تھے۔ انہوں نے امام حاکم کی معرفۃ علوم الحدیث ایڈٹ کر کے شائع کرائی تھی اور قاہرہ سے شائع ہوئی تھی۔ وہ اب ہر جگہ عام ہے۔

علم حدیث پر نئے علوم کی روشنی میں کام

بیسویں صدی میں بعض نئے موضوعات پر لوگوں نے کام کیا تو علم حدیث کا ایک نئے انداز سے مطالعہ کیا۔ اس سلسلے کی ایک مثال بہت دلچسپ ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ علم حدیث پر اس نئے انداز سے بھی کام شروع ہوا ہے۔ آپ نے مشہور فرانسیسی مصنف ڈاکٹر موریس بوکائی کا نام سنا ہوگا۔ وہ ایک زمانہ میں غالباً پورے فرانس کی میڈیکل ایسوسی ایشن کے صدر تھے۔ سائنسدان ہیں اور بہت بڑے سرجن سپیشلسٹ ہیں۔ وہ شاہ فیصل مرحوم کے ذاتی معالج تھے اور شاہ فیصل مرحوم کا علاج کرنے کے لئے ان کو وقتاً فوقتاً ریاض بلایا جاتا تھا۔

ایک مرتبہ ان کو ریاض بلایا گیا تو سرکاری مہمان کے طور پر ہوٹل میں ٹھہرے اور کئی روز تک شاہ فیصل سے ملاقات کا انتظار کرتے رہے۔ ظاہر ہے کہ کسی بھی وقت بادشاہ کی طرف سے ملاقات کا بلاوا آسکتا تھا اس لئے کہیں آ جا بھی نہیں سکتے تھے۔ ہر وقت اپنے کمرے میں رہتے تھے کہ اچانک کوئی فون کال آئے تو پہنچ جائیں گے۔ وہاں ہوٹل کے کمرے میں قرآن پاک کا ایک نسخہ انگریزی ترجمے کے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ انہوں نے وقت گزاری کے لئے اس کی ورق گردانی شروع کردی۔ عیسائی تھے، ان کے ظاہر ہے کبھی قرآن پاک پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس انگریزی ترجمے کی ورق گردانی کے دوران خیال ہوا کہ قرآن پاک میں بعض ایسے بیانات پائے جاتے ہیں جو سائنسی نوعیت کے ہیں۔ مثلاً بارش کیسے ہوتی ہے، انسان کی ولادت کن مراحل سے گزر کر ہوتی ہے، اسی طرح اور بھی کئی چیزوں کی تفصیلات کا تذکرہ تھا۔

چونکہ وہ خود میڈیکل سائنس کے ماہر تھے اور سائنس ہی ان کا مضمون تھا اس لئے انہوں نے ان بیانات کو زیادہ دلچسپی کے ساتھ پڑھنا شروع کیا۔ ایک بار پڑھنے کے بعد قرآن پاک کو انہوں نے دوبارہ پڑھا تو ان مقامات پر نشان لگاتے گئے جہاں سائنس سے متعلق کوئی بیان تھا۔ چند دن وہاں رہے تو پورے قرآن پاک کا ترجمہ کئی بار پڑھا اور اس طرح کے بیانات نوٹ کرتے گئے۔ اس سے ان کے ذہن میں خیال پیدا ہوا کہ اس طرح کے بیانات بائبل میں بھی ہوں اور ان کے ساتھ قرآن پاک کے بیانات کا تقابل کیا جائے تو دلچسپ چیز سامنے آسکتی ہے۔ انہوں نے واپس جانے کے بعد اسی مشغلے کو جاری رکھا۔ وہ بائبل میں جو اس طرح کے

مکھیوں کو تجربہ کرنے کے دوران نے ایک ایک جز کا معائنہ کر کے لیبارٹری میں چالیس پچاس سال لگا کر یہ بتائیں کہ ان میں کسی مکھی کے پر میں کسی بھی قسم کی شفا نہیں ہے تب تک آپ یہ مفروضہ کیسے قائم کر سکتے ہیں کہ مکھی کے پر میں بیماری یا شفا نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر موریس بکائی نے اس سے بھی اتفاق کیا کہ واقعی مجھ سے غلطی ہوئی۔

پھر ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اگر آپ تحقیق کر کے پتا بھی کر دیں کہ مکھی کے پر میں شفا نہیں ہوتی تو یہ کیسے پتہ چلے گا کہ چودہ سو سال پہلے اس کی مکھیوں میں نہیں ہوتی تھی۔ ہو سکتا ہے ہوتی ہوں، ممکن ہے ان کی نسل ختم ہو گئی ہو۔ جانوروں کی نسلیں تو آتی ہیں اور ختم بھی ہو جاتی ہیں۔ روز کا تجربہ ہے کہ جانوروں کی ایک نسل آئی اور بعد میں وہ ختم ہو گئی۔ تاریخ میں ذکر ملتا ہے اور خود سائنسدان بتاتے ہیں کہ فلاں جانور اس شکل کا اور فلاں اس شکل کا ہوتا تھا۔ ڈاکٹر موریس نے اس کو بھی درست تسلیم کیا۔

پھر ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے کہا کہ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ حضورؐ نے اونٹ کا پیشاب پینے کا حکم دیا، حالانکہ شریعت نے پیشاب کو ناپاک کہا ہے۔ بالکل ٹھیک ہے۔ یہ حدیث بیان کا مستند ذکر دوسرا ہے۔ یہ بھی درست ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میں بطور ایک عام آدمی (layman) کے یہ سمجھتا ہوں کہ بعض بیماریوں کا علاج تیزاب سے بھی ہوتا ہے۔ دواؤں میں کیا ایسڈ شامل نہیں ہوتے۔ جانوروں کے پیشاب میں کیا ایسڈ شامل نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے کہ بعض علاج جو آج خالص اور آپ کے بقول پاک ایسڈ سے ہوتا ہے تو اگر عرب میں اس کا رواج ہو کہ کسی نیچرل طریقے سے لیا ہوا کوئی ایسا لیکوئیڈ جس میں تیزاب کی ایک خاص مقدار پائی جاتی ہو، وہ بطور علاج کے استعمال ہوتا ہو تو اس میں کوئی بات بعید از امکان اور غیر سائنسی ہے۔

پھر ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ آج سے کچھ سال پہلے میں نے ایک کتاب پڑھی تھی۔ ایک انگریز سیاح تھا جو پورے جزیرہ عرب کی سیاحت کر کے آیا تھا۔ اس کا نام تھا ڈاؤٹی۔ 1924، 25-26 میں اس نے پورے عرب کا دورہ کیا تھا اور دو کتابیں لکھی تھیں جو بہت زبردست کتابیں ہیں اور جزیرہ عرب کے جغرافیہ پر بڑی بہترین سمجھی جاتی ہیں۔ ایک کا نام Arabia Deserta اور دوسرے کا نام Arabia Petra ہے۔ یعنی جزیرہ عرب کا صحرائی حصہ اور جزیرہ عرب کا پہاڑی حصہ۔ انہوں نے کہا کہ اس شخص نے اتنی کثرت سے یہاں سفر کیا

احادیث میں سابقہ کتب کا ذکر

علم حدیث کا جو دائرہ لوگوں نے نئے انداز سے مطالعہ شروع کیا ہے جس پر ابھی کام کا آغاز بھی صحیح معنوں میں نہیں ہوا۔ وہ یہ ہے کہ بہت سی احادیث میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ سابقہ کتابوں کے حوالے ہیں کہ تورات میں یہ آیا ہے، انجیل میں یہ آیا ہے، فلاں کتاب میں یہ آیا ہے، سابقہ کتابوں میں یہ آیا ہے۔ آج ان کتابوں میں وہ حوالے نہیں ملتے۔ اس سے مطالعہ مذاہب کا اور مذاہب کی تاریخ پر کام کرنے کا ایک نیا راستہ کھلتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے وحی کی بنیاد پر سابقہ کتابوں کے مندرجات پر جو باتیں ارشاد فرمائیں اور کس حد تک آج کل کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں اور نہیں پائی جاتیں تو اس کے اسباب کیا ہیں۔ اس سے پتہ چل جاتا ہے کہ ان کتابوں میں تحریف یا تبدیلی ہوئی تو کہاں کہاں ہوئی اور کن راستوں سے ہوئی۔ اس سے سابقہ کتابوں کے مطالعہ کی ایک نئی جہت ہمارے سامنے آتی ہے۔

اسی طرح سے مطالعہ مذاہب میں حدیث کے ذریعے وہ گوشے بھی سامنے آتے ہیں جن میں مذاہب کی وہ تعلیمات جو اللہ تعالیٰ اور انبیا کی طرف سے تھیں، مذاہب کے ماننے والوں کی تحریفات اور اضافوں سے پہلے جو تعلیمات تھیں، ان کا واضح پتہ احادیث سے چلتا ہے۔ مثلاً تورات میں یہ تھا، بائبل میں یہ تھا، فلاں پیغمبر کی تعلیم میں یہ تھا، فلاں پیغمبر کی تعلیم میں یہ تھا۔ اس سے دنیا کی دوسری قوم کے سامنے بھی مطالعہ کی ایک نئی جہت روشن ہوتی ہے۔ جس سے وہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

مسلمانوں میں جو اجتماعی علوم پیدا ہوئے۔ سوشل سائنسز پیدا ہوئے، تاریخ کا فن پیدا ہوا، ریاست اور معاشرت کے مطالعہ کا فن پیدا ہوا، اس کی بہت بڑی بنیاد علم حدیث سے آتی ہے۔ علم حدیث ایک نئی تہذیب کا منادی ہے۔ علم حدیث نے ایک نئی تہذیب کو جنم دیا جس کی بنیاد تعلیم، فکر اور مطالعہ پر تھی جس کے نمونے آپ نے دیکھے۔ علم حدیث نے علم تاریخ کو ایک نئی جہت سے نوازا۔ اسلام سے پہلے دستاویزی کارروائی یا تاریخ نویسی کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اسلام نے پہلی مرتبہ علم حدیث کے ذریعے انسان کو یہ پیغام دیا کہ سابقہ اقوام کے بارے میں معلومات اور تاریخ کو جمع کرنے کے لئے کتنی احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ یہ وہ چیز ہے جس کی بنیاد پر

مسلمانوں نے ایک نیا فن تاریخ مرتب کیا۔ ابن خلدون اور امام سخاوی کا میں نے ذکر کیا تھا جو ہسٹوریوگرافی میں ایک نئی جہت اور ایک نئے اسلوب کو شروع کرنے والے ہیں۔ یہ وہ نئے میدان ہیں جو علم حدیث کے مطالعہ کے راستے ہمارے سامنے کھولتے ہیں۔

بیسویں صدی میں علم حدیث کے نئے مجموعے بھی مرتب ہوئے۔ نئے مجموعے ہر دور میں مرتب ہوتے رہے ہیں۔ جیسے جیسے انسانوں کے مسائل بڑھتے جائیں گے، نئے نئے مسائل پیش آتے جائیں گے، ان کو علم حدیث کے موضوعات کو نت نئے طریقوں سے مرتب کرنے کی ضرورت پیش آتی جائے گی۔

ان میں سے کون سے مجموعے قابل ذکر ہیں ان کا حوالہ دینا بھی بڑا دشوار ہے۔ اس لئے کہ وہ لاتعداد ہیں۔ ان کی فہرست بھی بیان کرنا مشکل ہے۔ بیسویں صدی میں مختلف زبانوں میں انگریزی، اردو، فارسی، فرانسیسی، عربی، ترکی اور جرمن زبانوں میں مرتب ہوئے اور انہوں نے ہزاروں لاکھوں انسانوں تک علم حدیث کے ذخائر اور معلومات کو پہنچایا۔

نئے انداز سے کام کرنے کی راہیں

آج جو نئے اور قابل ذکر مجموعے مرتب ہو رہے ہیں اور جن پر کام کرنے کی ضرورت ہے وہ نئے مسائل کے بارے میں ہیں۔ مثال کے طور پر آج معیشت نئے انداز سے مرتب ہو رہی ہے۔ حدیث نبوی کی بنیادی کتابوں میں اور احادیث نبوی کے ذخائر میں ہزاروں ایسے ارشادات اور ہدایات موجود ہیں جن کا انسان کی انفرادی اور اجتماعی معاشی زندگی سے، یعنی Micro Economics اور Macro Economics کے پہلو سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ بعض حضرات نے بعض ایسے مجموعے مرتب کئے ہیں۔ محمد اکرم خان صاحب ہمارے ایک دوست ہیں۔ انہوں نے علم حدیث کے ذخائر کو تلاش کر کے وہ احادیث دو جلدوں میں یکجا کی ہیں جو معاشیات سے متعلق ہیں۔ لیکن ابھی اس پر طویل کام کی ضرورت ہے۔ نئے نئے مجموعے جو اب شائع ہوئے ہیں ان کو مستقل کر کے اس مواد کو ایک ساتھ کرنے کی ضرورت ہے۔

آج سے کچھ سال پہلے ایک شخص نے یہ کام کیا تھا کہ علم حدیث کے تمام بنیادی مآخذ سے کام لے کر وہ تمام احادیث جمع کی تھیں جن کا تعلق ریاست اور حکومت سے ہے۔ تو اتنا

جو ذخیرہ تیار ہوا کہ جس میں سیکڑوں بلکہ شاید ہزاروں احادیث موجود ہیں جو بالواسطہ یا بلاواسطہ ریاست اور بین الاقوامی اداروں سے متعلق ہیں۔ بظاہر حدیث کی کتابیں آپ پڑھیں تو سو سو احادیث میں مشکل سے ایک حدیث ایسی ملے گی جس کا تعلق حکومت اور ریاست سے ہو۔ لیکن ان سارے مجموعوں کا جائزہ لیا جائے تو اتنی تعداد میں احادیث دستیاب ہو جائیں گی جن سے کئی جلدیں مرتب ہو سکتی ہیں۔ یہی معاملہ بقیہ موضوعات کا ہے کہ ترتیب تازہ کریں۔

تہذیب و تمدن کی اساس کی بنیاد بدلتی ہے۔ تو سوال کا طرز و انداز بدل جاتا ہے۔ سابقہ محدثین نے اپنی کتابیں مرتب کرتے وقت اپنے سامنے یہ موضوعات نہیں رکھے۔ انہوں نے اپنے زمانہ اور اپنی ضروریات کے لحاظ سے عنوانات تجویز کئے اور موضوعات رکھے۔ لیکن سارے موضوعات کو اس طرح سے Re-arrange کریں تو نئے نئے عنوانات سامنے آئیں گے۔ اس لئے شاید آج علم حدیث کے مجموعے مرتب کرنے کی ضرورت ہے جن میں آج کے دور کے تہذیبی، تمدنی، سیاسی، معاشی، اجتماعی، انفرادی اور معاشرتی ضروریات کے مطابق ابواب کی ترتیب اور مضامین کی تقسیم کی جائے اور یوں مجموعے مرتب کئے جائیں۔

ابتدائی صدیوں میں جب اسلام کے عقائد پر فقہائے اسلام اور متکلمین اسلام کام کر رہے تھے تو اسلام کے عقائد پر جو اعتراضات یا شبہے یونانیوں کی طرف سے ہو رہے تھے یا جو شبہات ایرانی اور ہندوستانی فلاسفہ کا طبقہ بیان کر رہا تھا، ان اعتراضات کا جواب علما اور متکلمین نے احادیث کی روشنی میں دیا۔ آج اسلام اور اسلام کے عقائد پر وہ اعتراضات نہیں ہو رہے ہیں۔ قدیم یونانی فلسفہ ختم ہو گیا، قدیم ایرانی اور ہندوستانی تصورات دنیا سے مٹ گئے۔ آج نئے انداز سے حملے ہو رہے ہیں۔ آج اسلامی عقائد اور تعلیمات پر مغربی نظریہ علم کے حوالہ سے۔ اسلام پر دوسری انداز کے اعتراضات ہو رہے ہیں۔ آج مغربی نفسیات نبوت پر اعتراض کر رہی ہے۔ آج کی سائنس وحی اور نبوت کو بطور ماخذ علم نہیں مانتی۔ وحی کو بطور مصدر علم نہیں مانتی۔ لہٰذا آج علم حدیث کے نئے انداز سے مرتب کرنے کی ضرورت ہے کہ اسلام کا فلسفہ علم اور نظریہ معرفت مکمل طور پر ہمارے سامنے آ جائے۔ جو اعتراضات اسلام کے عقائد پر ہو رہے ہیں ان کا جواب ان احادیث کے ذریعے سامنے آ جائے۔

اسی طرح سے علم حدیث میں آپ نے دیکھا ہوگا۔ حدیث کی کوئی بھی کتاب آپ

اٹھا کر دیکھ لیں اس میں سابقہ انبیا اور ان کے واقعات کا ذکر ہے۔ سابقہ اقوام کا ذکر ہے۔ انبیاء کے معاصر زمانے کے ماننے والے اور انکار کرنے والے دونوں کے تذکرے ملتے ہیں۔ آج کل کے مستشرقین فن تاریخ کے نقطۂ نظر سے، آرکیالوجی کے نقطۂ نظر سے اور آثار قدیمہ کے نقطۂ نظر سے ان پر اعتراضات کر رہے ہیں۔ ان اعتراضات کا جواب بھی حدیث کی کتابوں میں مل جاتا ہے۔ لیکن ان احادیث میں ان جوابات کو سامنے لانے کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے نئی ترتیب درکار ہے۔ نئے مجموعے مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ وہ چند مثالیں ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ نئے انداز سے احادیث کے نئے مجموعوں کی ضرورت پیش آتی رہے گی۔ آخذ یعنی قدیم کتابیں اور بنیادی ماخذ وہی ہیں گے جو ائمہ اسلام نے 458ھ تک مرتب کر کے ہمیں دے دیئے تھے۔ پانچویں صدی ہجری تک جو مجموعے مرتب ہو گئے وہ تو بنیادی ماخذ ہیں، وہ تو ایک طرح سے Power Houses ہیں جہاں سے آپ کو Connection ملتا رہے گا۔ لیکن اس کنکشن سے آپ نئی نئی مشینیں چلائیں، نئے نئے کام کریں، نئے نئے انداز سے روشنی پیدا کریں، نئے نئے راستے روشن کریں۔ یہ کام ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ وہ پاور ہاؤس اپنی جگہ موجود رہیں گے۔

جس طرح سے متن حدیث کو نئے انداز سے مرتب کرنے کی ضرورت ہے اسی طرح فہم حدیث کی نئی شرحیں لکھنے کی بھی ضرورت ہے۔ پرانی شرحیں پرانے سیاق وسباق میں ہیں۔ نئی شرحیں نئے سیاق وسباق میں ہونا چاہئیں۔ ان میں جو پرانی شرحیں ہیں ان کو نئے انداز سے پیش کرنے کا کام بھی ہوگا اور نئے مسائل کی نئی شرحیں اور نئے اعتراضات کے نئے جواب بھی ہوں گے۔ پرانے اعتراضات کے پرانے جواب بھی ہوں گے اور پرانے اعتراضات کے نئے جواب بھی ہوں گے۔ یہ ایک نئی دنیا ہے جس پر ابھی کام کا شاید آغاز بھی نہیں ہوا ہے اور اگر آغاز ہوا ہے تو محض آغاز ہی ہے۔ ابھی تو محض پہلا قدم اٹھایا گیا ہے۔ کتنے دن اور کتنے سال یہ عمل چلے گا ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔

تدوین حدیث غیر مسلموں کے لئے

پھر ایک نئی چیز جو علم حدیث میں کرنے کی ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے تمام سابقہ آخذ ہو

کو سمو دیا گیا ہے۔ اس میں تمام صحاح ستہ، مسند امام احمد اور حدیث کی دوسری بڑی کتابیں موجود ہیں اور کمپیوٹر کے ذریعے چند منٹ میں آپ کے سامنے آسکتی ہیں۔ چھوٹی سی سی ڈی جیب میں رکھیں اور کہیں بھی کمپیوٹر کے ذریعے اس کو دیکھیں۔ یہ ایک مفید چیز ہے۔ لیکن ابھی حدیث کے متون بھی سارے کے سارے کمپیوٹرائز نہیں ہوئے۔ حدیث کی چند کتابیں ہی کمپیوٹرائز ہوئی ہیں۔ یہ سارے بنیادی مآخذ جو تیسری صدی میں شائع ہوئے یا اس سے پہلے شائع ہوئے لیکن زیادہ متداول نہیں تھے وہ سارے کے سارے کمپیوٹرائز ہونے باقی ہیں۔

لیکن اس سے بھی زیادہ جو مشکل کام ہے وہ رجال کی کمپیوٹرائزیشن کا کام ہے۔ جیسے ان کو افراد کے بارے میں تفصیلات، معلومات کے اس قدر ذخیرے کے ساتھ جو علمائے رجال اور جرح وتعدیل کے ائمہ نے جمع کیا ہے۔ ان کو کمپیوٹرائز کرنا انتہائی اہم، مشکل اور لمبا کام ہے۔ اس کے لئے ایک نئے سافٹ ویئر کی ضرورت ہے۔ وہ سافٹ ویئر وہ آدمی بنا سکتا ہے جو خود بھی محدث ہو۔ علم حدیث بھی جانتا ہو اور پروگرامنگ بھی جانتا ہو۔ اگر علم حدیث نہ جانتا ہو تو شاید اس کے لئے سافٹ ویئر بنانا بہت مشکل ہوگا۔ مثال کے طور پر میں نے عرض کیا تھا کہ بعض محدثین تعدیل اور جرح میں متشدد ہیں، بعض متساہل ہیں اور بعض معتدل ہیں۔ تو ان تینوں کو الگ الگ نمبر دینا ہوگا۔ متساہل کا کوڈ الگ ہوگا، متشدد کا الگ اور معتدل کا الگ ہوگا۔ پھر متشددین میں لوگوں کے درجات ہیں ان کو اسی سطح پر رکھنا ہوگا۔ اس کے لئے کمپیوٹر میں سافٹ ویئر کی تیاری کی ضرورت ہے۔ جب یہ سارا کام ہو جائے تو پھر اس کی مدد سے رجال کے سارے ذخیرے کو ایک نئے انداز سے دیکھنا پڑے گا۔ مثلاً علم حدیث میں رجال میں ایک اصطلاح 'مدار سند' استعمال ہوتی ہے۔ مدار سند اس کو کہتے ہیں کہ ایک محدث تک ایک حدیث مختلف راویوں اور مختلف سندوں سے پہنچی لیکن اوپر جا کر درمیان میں راوی ایک ہی ہے۔ پھر آگے چل کر اسی ایک راوی سے آگے بات چلتی ہے۔ اس کو مدار سند کہتے ہیں۔ مدار سند اگر کمزور ہیں تو سند کے بقیہ حصوں میں اگر اوپر نیچے اور نیچے راوی بھی موجود ہوں تو وہ irrelevant ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ مدار سند سے آگے بات کمزور ہے تو اگر نیچے کی سطح پر لوگ بہت مستند بھی ہیں تو بھی ان کا مستند ہونا کوئی خاص فائدہ نہیں رکھتا۔ مدار سند اگر مضبوط ہے تو پھر ان لوگوں کی مضبوطی بہت فائدہ دے گی۔ اس لئے مدار سند کی بہت اہمیت ہے۔ مدار سند کا پتہ غیر معمولی یادداشت اور طویل مطالعہ سے ہی چل سکتا ہے۔

میرا کافی عرصہ سے یہ خیال ہے کہ کمپیوٹرائزیشن سے ہر اسناد کی تحقیق بہت حد تک آسان ہو جائے۔ اس کے لیے کمپیوٹر میں آپ حدیث کی ہر سند کو فیڈ کر دیں گے اور فیڈ کرنے کے بعد یہ معلوم ہو جائے گا کہ یہ نام کہاں کہاں مشترک ہے۔ کمپیوٹر سے یہ پتہ چل جائے گا کہ ہر سند کون سی ہے اور کہاں کہاں وہ اسناد ہیں۔ پھر تو کمپیوٹر والے ہی بتا سکتے ہیں کہ ہر اسناد کے لیے کیا کچھ کرنا پڑے گا۔ اس کا سافٹ ویئر کیسے بنایا جا سکتا ہے۔

اسی طرح سے جرح و تعدیل کا مواد جو لاکھوں صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں سے انتخاب کرنا اس کا درجہ متعین کرنا، پھر اس کو فیڈ کر کے اس کے نتائج کمپیوٹر سے معلوم کیے جائیں۔ پھر حدیث کو ضعف، صحت اور حسن میں جو درجہ ہے یہ سارا کام کمپیوٹرائزیشن کے ساتھ ابھی ہونا باقی ہے اور اس میں وقت لگے گا۔ جب ایسے ماہرین سامنے آئیں گے جو حدیث کے علوم سے بھی کسی طرح واقفیت رکھتے ہوں اور کمپیوٹر میں کم از کم سافٹ ویئر بنانے کے بھی ماہر ہوں تو وہ اس کام کو کر سکتے ہیں۔

انکار حدیث کا مقابلہ

علم حدیث پر بیسویں صدی میں جو کام ہوئے ہیں ان میں ایک بڑا موضوع تھا انکار حدیث کی تردید کا رہا ہے۔ انکار حدیث پر منکرین حدیث نے دور جدید میں جو کچھ لکھا ہے وہ بیسویں صدی ہی میں لکھا ہے۔ اس سے پہلے انکار کا لوگوں کی طرف سے بہت تھوڑا سا لکھا گیا ہے جس کا زیادہ اثر نہیں تھا۔ بیسویں صدی میں لوگوں نے اتنے زور و شور سے انکار حدیث پر لکھا کہ بہت سے لوگ اس سے متاثر ہو گئے۔ اور مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اس لٹریچر سے متاثر ہو گئی۔ اس نے علم حدیث پر لکھنے والوں کا ایک میدان پیدا کیا کہ منکرین حدیث اور مخالفین حدیث کے اعتراضات کو دور کیا جائے۔ منکرین حدیث کے نہ صرف بھی بڑے باہمت لوگ ہیں اور بڑے حوصلے والے ہیں۔ ایک اعتراض کا جواب ملتا ہے تو دوسرا اٹھا دیتے ہیں۔ اس کا جواب ملتا ہے تو پھر تیسرا، پھر چوتھا اور پانچواں۔ اس حوصلہ مندی کے ساتھ تھوڑے سے [illegible] بھی معروف ہوتے ہیں۔ بہت سے ایسے اعتراضات جن کا جواب دیا جا چکا، ان کو اس خیال سے وہ بار بار ناواقف لوگوں کے سامنے دہراتے رہتے ہیں کہ شاید اس شخص کو وہ جواب معلوم نہ ہو۔ اگر

آپ کو وہ جواب معلوم ہوا اور آپ متاثر نہ ہوں تو وہ کسی اور کے سامنے اسی بات کو دہرا دیتے ہیں۔
وہ تسلسل کے ساتھ ایک ہی بات کو بار بار دہراتے رہتے ہیں۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے
کہ ان جوابات کو بھی بار بار بیان کیا جائے اور ان غلط فہمیوں کی بار بار تردید کی جائے۔

علم حدیث پر انیسویں صدی کے وسط میں جو بنیادی اعتراض کئے گئے تھے ان سب کی اصل بنیاد یہ غلط فہمی تھی کہ ذخیرہ احادیث تاریخی طور پر ثابت شدہ نہیں ہے اور غیر مستند ہے۔ اس غلط فہمی کی تو اچھی طرح وضاحت ہو گئی۔ اب اس اعتراض کو نہیں دہرایا جاتا اور جو لوگ اس اعتراض کو دہراتے ہیں وہ کم پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ کوئی ذمہ دار مستشرق یا پڑھا لکھا منکر حدیث اب حدیث کی تاریخی سندوں کو نشانہ نہیں بناتا۔ لیکن ہمارے یہاں بعض کم علم لوگ ابھی تک اسی لکیر کو پیٹ رہے ہیں۔

اب دوسرے اعتراضات جو بعض لوگ آج کل علم حدیث پر کرتے ہیں وہ حدیث کے مندرجات پر ہو رہے ہیں۔ کچھ لوگ نیک نیتی سے کرتے ہیں جس کی دو مثالیں میں نے موریس بکائی کی دیں۔ کچھ لوگ کم فہمی سے اور کچھ بدنیتی سے کرتے ہیں۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان سب اعتراضات کا کسی انداز میں جائزہ لے کر ان کا جواب دیا جائے۔ میں اعتراضات کا جواب دینے کے اس طریقے کو صحیح نہیں سمجھتا کہ پہلے آپ اعتراض نقل کریں اور پھر اس کا جواب دیں۔ آپ اصل بات کو اس طرح بیان کریں کہ اعتراض پیدا ہی نہ ہو۔ یہ زیادہ دیرپا اور زیادہ موثر طریقہ ہے۔ اعتراضات بیان کر کے ان کا جواب دینا صحیح طریقہ نہیں ہے۔

علم حدیث پر بعض اعتراضات ایسے ہیں جو کم فہمی یا علم حدیث کی اہمیت سے ناواقفیت کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ اس طرح کے اعتراضات آج سے نہیں بلکہ شروع سے ہو رہے ہیں۔ سنن ابو داؤد میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک روایت ہے۔ جب آپؓ سے کسی یہودی نے بڑے طنز و استہزا اور مذاق سے پوچھا کہ کیا تمہارے رسول تمہیں ہگنے موتنے کا طریقہ بھی بتاتے ہیں۔ انہوںؓ نے کہا کہ ہاں بتاتے ہیں۔ آپؐ نے بتایا کہ استنجا کرو تو اس طرح کرو وغیرہ۔ انہوںؓ نے اس پر کوئی ناراضگی کا اظہار نہیں کیا، نہ شرمندگی ظاہر کی، بلکہ اس کے طنز کو فخر کے طور پر قبول کیا اور کہا کہ ہمارے پیغمبر ہمیں ہر اچھی بات سکھاتے ہیں۔ حدیث رسول پر اعتراض کرنے کی جو ذہنیت ہے یہ یہودی ذہنیت ہے۔ یہ حضرت سلمان فارسیؓ کے زمانے سے آج تک

جعلی آدمی ہے اور ہر زمانے میں یہودی اسی طرح کے سوالات کرتے رہے ہیں۔ یہاں تمام لوگوں کی ذمہ داری ہے جو حدیث کا علم رکھتے ہیں یا اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو علم حدیث سے دلچسپی عطا فرمائی ہے اور جن کو اللہ تعالیٰ نے علم حدیث کا دفاع کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہے۔

یہ چند باتیں تھیں جن کو میں آج کہنا چاہتا تھا۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے یہ موقع عنایت فرمایا۔ دعا کریں کہ جو کچھ میں نے یہاں کہا اللہ تعالیٰ اس کو اخلاص سے کہنے کی توفیق کے ساتھ ساتھ اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے۔ جو کچھ کہا اس پر مجھے بھی عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور آپ کو بھی عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ جو غلطیاں ہوئی ہوں ان کو اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔ جو صحیح بات ہوئی ہو اس کو قائم و دائم رکھے۔

☆☆☆☆☆

بھی۔ کا پردہ عام ہو جو منہ پہ نہ ہو، لپٹ سکتی ہے۔ باقی خود امام کا انہماک سے کچھ یہ خیال ہے۔

دیکھئے، چہرے کے پردے کے بارے میں شروع سے ایک گفتگو چلی آ رہی ہے جس میں صحابہ اور تابعین کے زمانے سے یہ بحث ہو رہی ہے۔ قرآن پاک کی جس آیت میں آیا ہے کہ پردہ کرو، اس میں آیا ہے کہ الا ما ظھر منھا سوائے اس کے کہ جو ظاہر ہو۔ تقریباً مفسرین، صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کی ایک بہت بڑی تعداد کا کہنا ہے کہ الا ما ظھر منھا یعنی سوائے اس کے کہ جو ظاہر ہو جائے، اس میں جسم کی ساخت اور قد و قامت شامل ہے جس کو نہیں چھپایا جا سکتا۔ جب ایک خاتون نکل کر کہیں جائے گی تو لوگ دیکھیں گے کہ دبلی ہے، پتلی ہے، موٹی ہے، بھاری ہے تو یہ ظاہر ہو جائے گا اور جسم کی ساخت کا بھی اندازہ ہو جائے گا تو یہ تو نہیں چھپایا جا سکتا۔ اس لئے اس میں یہ شامل ہے باقی سب چیزیں چھپائی جائیں۔

کچھ اور حضرات کا کہنا ہے کہ اس میں جسم کے وہ اعضاء بھی شامل ہیں جن کو بعض اوقات کھولنا ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً کسی کام کے لئے خاتون جا رہی ہے، سفر پر جا رہی ہے تو ہاتھ کھلا ہوگا، پاؤں کھلے ہوں گے، کسی مزدوری کے لئے ضرورت پڑ گئی تو ہاتھ کھولنا پڑے گا۔ اس میں کچھ لوگ چہرہ کھولنے کو بھی شامل سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ چہرہ کا پردہ واجب ہے کہ نہیں اس میں تو اختلاف شروع سے چلا آ رہا ہے۔ اس لئے کچھ لوگ جو چہرے کے پردے کو لازمی سمجھتے ہیں ان میں ہمارے امام احمد بن حنبل اور سعودی علماء شامل ہیں۔ وہ ہر حال میں چہرے کے پردے کو لازمی سمجھتے ہیں۔ کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ چہرے کا پردہ عام حالات میں تو کرنا چاہئے لیکن اگر کسی خاتون کو کوئی ناگزیر ضرورت ایسی پیش آ جائے جس میں اسے وقتی یا مستقل طور پر چہرہ کھولنے پر مجبور ہو تو چہرہ، ہاتھ اور پاؤں کھولنے کی اجازت ہے۔

تیسرا نقطہ نظر یہ ہے جو مجھے بھی ذاتی طور پر دلائل وغیرہ دیکھ کر درست معلوم ہوتا ہے لیکن آپ کا جو جی چاہے وہ آپ اختیار کریں۔ وہ یہ ہے کہ چہرے کا ڈھکنا تو افضل اور عزیمت ہے لیکن کھولنے کی اجازت ہے۔ چہرہ کھولنا رخصت ہے۔ اگر وہ خاتون یہ سمجھتی ہیں کہ چہرہ نہ کھولنے سے اس کے لئے مشکلات ہیں تو وہ کھول سکتی ہیں۔ اور یہ مسائل بعض اوقات یورپ اور دیگر مغربی ممالک میں پیش آتے ہیں۔ جہاں ہماری بہت سی بہنوں کو نوکری کرنے کی ضرورت پڑتی ہے اور باہر جانا پڑتا ہے۔ وہاں کے ماحول میں ان کو سر ڈھانکنے کی اجازت بھی بڑی مشکل سے ملتی ہے تو

میرے خیال میں علمی فائدہ (Academic interest) ان کا محرک تھا۔ بہت
سے لوگ خالص علمی جذبے سے بھی کام کرتے تھے۔ انہوں نے علمی سہولت کے لئے یہ کام کیا۔ یہ
ایک اچھا ٹول ہے، ایک اچھا وسیلہ ہے جس سے کام لے کر حدیث کی کتابوں سے استفادہ آسان
ہو جاتا ہے۔

ایک اور بہن نے دعا کی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ایسے مواقع اور بھی دے۔ آمین

یہ کیسٹ کہاں دستیاب ہوں گی؟

مجھے نہیں معلوم۔ اگر الہدیٰ کے لوگوں نے کوئی کیسٹ بنائی ہے تو آپ ان سے پوچھ لیجئے۔

پوچھنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ کی تقاریر کی ریکارڈنگ کہاں دستیاب ہوں گی؟

میری تو ابھی کوئی کیسٹس کسی خاص جگہ پر دستیاب نہیں ہیں۔ نہ میں نے کبھی بنوائی
ہیں۔ کسی پروگرام میں اگر کوئی خود تیار کر لے تو میں کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ میں خود کو اس قابل نہیں
سمجھتا کہ میری تقریریں اور مواعظ ٹیپ ہوں اور لوگ پڑھیں۔ لیکن اگر اس پروگرام کے کیسٹس بن
گئے ہیں تو میری طرف سے آپ کے لئے ہدیہ ہے۔ کوئی نقل کرنا چاہے تو ضرور کرے۔

ابھی علوم حدیث کی بہت سی جہتیں باقی ہیں۔ آپ ضرور رابطہ کریں۔ میں اسلامی
یونیورسٹی میں بیٹھتا ہوں جس کو بھی ہو مجھ سے رابطہ کرے۔

آپ نے جو مسندین کی مجلس سند کی ایک کڑی بن سکتی ہے۔

بالکل بن سکتی ہے۔ میں ایک کاپی الہدیٰ میں دے دوں گا۔

ایک اور بہن نے دعا کی ہے جزاک اللہ

صحیح بخاری، صحیح مسلم، ... میں جو احادیث بیان ہوئی ہیں کیا وہ سب صحیح ہیں؟

جی ہاں وہ سب صحیح ہیں۔ ان میں کوئی حدیث ضعیف یا حسن کے درجہ کی نہیں ہے وہ
سب کی سب صحیح ہیں۔

اس بات کی وضاحت کیجئے کہ مسلمانوں نے حدیث کو ذخیرہ کتنے عرصے تک بغیر تحریر کے محفوظ کیا؟

یہ جو چند دنوں میں اتنی داستان بیان کی گئی تو بتانے کے لئے بیان کی۔ ہر دور میں
ہزاروں انسانوں نے ان کو زبانی یاد کیا۔ لاکھوں انسانوں نے ایک ایک آدمی کا نام محفوظ کیا جس
کے ذریعے یہ ان تک پہنچا ہے۔ ان میں سے ہر آدمی کی تاریخ محفوظ ہے۔ ہر دور کے تحریری

امام بخاری پر بہت ساری کتابیں لکھی گئی ہیں۔ دو کتابوں کا میں ذکر کروں گا جو مجھے اچھی لگیں۔ ایک کتاب تو "تذکرۃ المحدثین" دو جلدوں میں ہے۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی ہندوستان کے ایک بزرگ تھے ان کی لکھی ہوئی ہے۔ ہندوستان میں چھپی تھی۔ وہ آپ دیکھ لیں اس میں بڑے محدثین کا تذکرہ ہے۔ دوسری کتاب ہے جو مدینہ یونیورسٹی کے پڑھے ہوئے ایک بزرگ ڈاکٹر تقی الدین مظاہری کی لکھی ہوئی ہے۔ اردو میں ہے۔ کتاب کا نام ہے "محدثین کرام اور ان کے کارنامے"۔

ایک اور ہیں ڈاکٹر محمد عثمان اشتاق۔ ہندوستان کے، ان کی بھی تذکرہ محدثین پر ایک کتاب ہے۔

مورس بکائی مسلمان ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنے قبول اسلام کا کوئی تیس سال پہلے اعلان کر دیا تھا۔

کیا امام ابو حنیفہ نے دور سے حضرت انس کو دیکھا تھا؟

جی ہاں امام صاحب نے حضرت انس کو دیکھا تھا۔ امام ابو حنیفہ اپنے والد کے ساتھ حج کے لئے گئے تھے۔ اس وقت ان کی عمر تیرہ یا چودہ سال تھی۔ حضرت انسؓ مکہ مکرمہ میں تشریف لائے ہوئے تھے۔ اور امام ابو حنیفہ بیان کرتے ہیں کہ جب میں حج کے لئے گیا تو مسجد حرام کے باہر ہجوم تھا۔ بہت سے لوگ جمع تھے۔ ہر شخص لپک کر اس ہجوم کے مرکز تک پہنچنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ انہوں نے کسی سے پوچھ کر بتایا کہ صحابی رسول حضرت انسؓ آئے ہوئے ہیں اور لوگ ان کو دیکھنے کے لئے جمع ہو رہے ہیں۔ تو امام ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ میں بھی لوگوں کے درمیان سے نکل کر ان تک پہنچ گیا اور میں نے ان کی زیارت کی۔

کیا استخارے میں خواب کا آنا ضروری ہے؟

نہیں استخارے میں خواب کا آنا ضروری نہیں ہے۔ استخارے کے معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے طلب خیر کی جائے۔ استخارہ کا مطلب ہے خیر طلب کرنا۔ جب آپ کے سامنے دو کام ہوں۔ دونوں جائز ہوں، یہ نہیں کہ ایک جائز ہو اور ایک ناجائز کہ سود کھاؤں کہ نہ کھاؤں، اور استخارہ کرنے لگے، یہ استخارہ نہیں ہوگا۔ استخارہ وہاں ہوگا جہاں دو جائز کام درپیش ہوں اور انتخاب میں مشکل پیش آ رہی ہو۔ مثلاً مکان خریدنے کا پروگرام ہے۔ دو مکان مل رہے ہیں اور آپ کے لئے

ایسی ہے جو کمزور ہے، مثلاً امام ترمذی کی کتاب جو میرے سامنے ہے جس میں پندرہ شعبان کو
عبادت کرنے کا ذکر ہے لیکن ضعیف حدیث ہے۔ اکثر محدثین اس کو ضعیف سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں
کہ اس پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ حدیث ضعیف ہے اور اس کا ضعف بڑے
کمزور درجہ کا ہے۔ جو حضرات سمجھتے ہیں کہ اس کا ضعف کمزور درجہ کا نہیں وہ اس پر عمل کرنے کو جائز
سمجھتے ہیں۔ اس لئے جو حدیث پر عمل کرنے کی نیت سے اس کام کو کرتے ہیں وہ بدعت نہیں
ہے۔ لہٰذا اگر کوئی پندرہ شعبان کی رات کو عبادت کرتا ہے یا دن کو روزہ رکھتا ہے تو وہ نعوذ باللہ
بدعت نہیں ہے۔ لیکن جو پندرہ شعبان کو حلوہ ضروری سمجھا جاتا ہے وہ یقیناً بدعت ہے۔ جو سمجھتا ہے کہ پندرہ
شعبان کو حلوہ پکانا ضروری ہے وہ یقیناً بدعت ہے۔ جو پندرہ شعبان کو چراغاں کرتا ہے وہ یقیناً
بدعت ہے کیونکہ اس کو کوئی براہ راست یا بالواسطہ کسی حدیث میں، کسی ضعیف میں بھی نقل نہیں
آیا۔ یہ فرق ہے بدعت اور غیر بدعت میں۔ کسی چیز کا صحیح ہونا، سنت ہونا یا ثابت ہونا یہ الگ چیز ہے
اور اس کا بدعت ہونا یا نہ ہونا الگ چیز ہے۔

آپ نے کہا جس کے دلائل بہتر ہوں اور جن کو صحیح سمجھتے ہوں ان کی پیروی کرتی رہیں، کیا ہم لوگ،
جو ابھی تعلیمی میدان میں مبتدی ہیں، اس قابل ہیں کہ ہم خود فیصلہ کرسکیں کہ کس پر عمل کرنا چاہئے اور کس پر
نہیں ....

اسی لئے میں نے کہا کہ جو اب تک کرتے آئے ہیں وہی کرتے رہیں۔ جو اب تک کرتی
رہی ہیں وہ کرتی رہیں۔

یہ اسلام کی بڑی خدمت ہوگی اگر آپ سائیکالوجی پڑھ کر اس کی روشنی میں دلائل سے
اسلامی عقائد اور نظریات کی تشریح کریں اور بتائیں کہ ان دلائل سے بھی یہ عقائد درست ہیں تو یہ
بہت بڑی خدمت ہوگی، آپ ضرور کریں۔

آج کل دم یا قرآن پڑھ کر جو دم کر کے علاج کیا جاتا ہے اور ان کے پیسے وصول کئے جاتے ہیں
اس بارے میں کچھ بتائیں۔ سورۃ فاتحہ سے ایک صحابی نے علاج وغیرہ کا کام کر کے رقم لینے کی روایت
ہے، اگر اس کی اجازت دی گئی ہے تو کیا ہم اسی طرح سے پیسے وصول کرنے کے لئے اس طرح کے
کلینک کھول سکتے ہیں؟

میرے خیال میں تو کلینک کھولنے کا راستہ تو بڑا خطرناک ہوگا۔ نہ کلینک کھولیں نہ پیسے

لیں۔ صحابہ نے کوئی کلینک نہیں کھولا تھا وہ بعد میں بھی سو سال تک رہے۔ 110ھ تک صحابہ کرامؓ زندہ رہے مگر کسی نے کلینک نہیں کھولا۔ اس لئے کلینک کھولنا سنت کے مزاج کے خلاف ہوگا۔ کلینک تو میڈیکل سائنس کی بنیاد پر کھولے جاتے ہیں۔ یہ تو ایک صحابیؓ نے اس یقین سے کہ اللہ کی کتاب میں شفا ہے، قرآن پاک میں اس کو شفا کہا گیا ہے کہ فیہ شفاء لما فی الصدور، تو اس یقین سے اس کو پڑھ کر پھونک دیا اور اس قبیلے کے سردار نے ہدیہ کے طور پر کچھ پیسے بھی دے دیئے اور انہوں نے لے لئے۔ وہ معاوضہ کی بات نہیں تھی کہ انہوں نے پہلے فیس مقرر کی ہو کہ پانچ سو روپے لیں گے اور پانچ سو روپے لے کر پھونک دیں۔ یہ کسی صحابیؓ یا تابعی نے نہیں کیا اس لئے دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

دی بائبل: قرآن اینڈ سائنس کے ڈاکٹر موریس بکائی Manurice اس کو فرنچ میں مورس پڑھتے ہیں اور بکائی کے ہجے ہیں Bucaille یہ فرنچ میں بکائی پڑھا جاتا ہے فرنچ میں جہاں بھی ڈبل ایل ای آئے اس کو ی پڑھتے ہیں۔

شوق بے اندازہ ہے مطالعہ کا جیسے کتاب پڑھی ہوں، کوئی ٹپ بتادیں۔

میرے علم میں تو کوئی ایسی ٹپ نہیں ہے لیکن ایک بزرگ تھے آپ نے نام سنا ہوگا مولانا ابوالخیر مودودی صاحب، سید ابوالاعلیٰ مودودی کے بڑے بھائی تھے۔ ان کے پاس میں بہت جایا کرتا تھا اور کتابوں پر تبادلہ خیال ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ میں ان کے پاس گیا۔ میں نے ان سے ایک سوال کیا جو شاید آپ کی دلچسپی کا بھی ہو، اگرچہ اس کا جواب نہیں ملا۔ میں نے ان سے پوچھا تھا کہ اب بھی لوگوں سے پوچھتا رہتا ہوں، تلاش بھی کرتا رہتا ہوں۔ جب یہ پوچھا تھا تو اس کو کوئی چھتیس سال ہو گئے ہیں۔ 1971 میں پوچھا تھا کہ رسول اللہ ﷺ تو جنوں اور انسانوں دونوں کے لئے بھیجے گئے تھے اور جنوں اور انسانوں دونوں کے لئے حضورؐ کے نبی ہونے کا ذکر قرآن پاک میں آتا ہے۔ تو انسانوں نے تو حدیث کے یہ سارے ذخائر جمع کئے، فقہ مرتب کی، اصول حدیث اور اصول فقہ پر کتابیں لکھیں، تو کیا جنوں نے بھی ایسا کوئی کام کیا کہ حضورؐ کے سارے ارشادات جمع کئے ہوں؟ یا وہ بھی انسانوں کے کئے ہوئے کے پابند ہیں؟ اگر انسانوں کے کئے ہوئے کے پابند ہیں تو اس کی دلیل کیا ہے؟ یعنی کیوں جنات انسانوں کے فقہ، علم حدیث اور علم جرح و تعدیل کی پیروی کریں؟ یا ان کے اپنے بھی چند لوگ تھے؟ تو انہوں نے کہا کہ بھئی میں نے تو کبھی نہیں

سوچا لیکن کتابوں میں تلاش کرتے ہیں۔ تو انہوں نے مجھے چند کتابوں کے نام بتائے جو میں نے دیکھے اور نہیں ملے تو کئی سال بعد جب ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے پوچھا کہ فلاں فلاں کتابیں دیکھی تھیں؟ میں نے کہا جی دیکھی تھیں لیکن ملی نہیں۔ کہنے لگے انڈکس میں دیکھا تھا؟ میں نے کہا کہ جی انڈیکس میں اور فہرست میں۔ تو انہوں نے ایک مشورہ دیا جو میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ جب کوئی کتاب پڑھو تو بسم اللہ کی ب سے لے کر تمت کی ت تک پڑھو۔ تو پہلی ٹپ تو یہ ہے کہ بسم اللہ کی ب سے لے کر تمت کی ت تک پڑھیں۔ دوسری ٹپ یہ ہے کہ روزانہ مطالعہ کے لئے کوئی نہ کوئی وقت ضرور رکھیں۔ ایک دو، تین گھنٹے جتنا آپ سہولت سے کر سکیں۔

نماز عصر کا وقت کیسے معلوم کر سکتے ہیں؟ حدیث میں تو ہے جب کسی چیز کا سایہ برابر ہو جائے تو اس کے عصر کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔

کچھ لوگوں نے اس کی مستقل جنتریاں بنا رکھی ہیں جس میں ہر علاقہ کے اوقات درج ہیں کہ سورج کا سایہ دوگنا کب ہوتا ہے اور ایک گنا کب ہوتا ہے۔ میرے پاس ایک ایسی جنتری ہے جس میں ہر شہر کی الگ الگ بنی ہوئی ہے۔ اس طرح کی کوئی جنتری آپ کو مل جائے تو اس سے آسان ہو جائے گا۔

کیا آپ کو کوئی شاگرد آپ سے حدیث۔

نہیں میرا کوئی شاگرد نہیں ہے نہ میں حدیث بیان کرنے والا استاد ہوں۔ اس لئے میرے حوالے سے کوئی حدیث بیان نہ کریں۔ مجھے یہ حق نہیں پہنچتا کہ میں علم حدیث کی سند اس طرح بیان کروں جیسے بڑے بڑے باقی لوگ بیان کرتے ہیں۔ آپ کسی اچھے اور مستند صاحب علم سے اجازت لیں اور ان کی سند سے حدیث بیان کریں۔

حدیث میں آیا ہے کہ اسلام میں سرپرست ولی کے بغیر شادی نہیں ہو سکتی لیکن علماء نے پختہ عمر والوں کے لیے ان کی رضامندی کی صورت میں عورت کی شادی کو جائز قرار دیا ہے۔

دیکھئے کچھ احادیث ایسی ہیں جن میں حضورؐ نے فرمایا کہ بیٹی ادا ہوا سے پوچھے بغیر اس کا نکاح نہ کرو۔ الفاظ مجھے یاد نہیں لیکن مفہوم یہ ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ جب تم کسی بچی کی شادی کرو تو اس سے اجازت لے لو۔ تو صحابہ نے سمجھا دار بچی کی خاموشی اس کی اجازت ہے اور

ایک دلچسپ مثال ہے کہ کسی صاحب نے چچا زاد یا خالہ زاد خاتون یا بیٹی کا نکاح کر دیا اور اس نے اعتراض کیا تو حضورؐ نے اس نکاح کو ختم کروا دیا۔ اور ان سے کہا کہ جس سے یہ چاہیں ان کا نکاح کر دو۔ اور ایسی بھی مثالیں ہیں کہ ایما امرأۃ نکحت بغیر اذن ولیها فنکاحها باطل باطل باطل۔ کہ جو کوئی خاتون اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرے تو وہ باطل ہے باطل ہے باطل ہے۔ اب بظاہر یہ دو احادیث ہیں اور ان میں تعارض ہے۔ میں نے اس سے پہلے بتایا تھا کہ علماء نے تعارض کو حل کرنے کے لئے کئی بنیادی اصول مقرر کئے ہیں۔ ان میں سے ان اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ جن احادیث میں ولی کی اجازت کے بغیر نکاح نہ کرنے کا ذکر ہے۔ ان احادیث کو ترجیح دی جائے گی اور ولی کی اجازت کے بغیر جو نکاح ہوگا وہ باطل ہوگا۔

امام ابو حنیفہ نے ان دونوں کو ایک دوسرے سے تطبیق دینے کی کوشش کی ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ جہاں ولی کی اجازت کے بغیر نکاح نہ کرنے کا ذکر ہے وہاں اس کے اخلاقی پہلو کو حضورؐ نے بیان کیا ہے کہ اخلاقی طور پر ایک مسلمان خاتون کو یہ زیب نہیں دیتا کہ باپ سے پوچھے بغیر جہاں چاہے نکاح کرے اور باپ کو بعد میں پتہ چلے وہ بیچارہ پریشان ہو۔ اس طرح نہیں کرنا چاہئے۔ یہ بہت مضبوط اخلاقی ہدایت ہے۔ لیکن کیا اگر کوئی خاتون نکاح کرے تو کیا وہ نکاح Valid اور Legally ہوا کہ نہیں ہوا؟

یہ بڑا نازک سا معاملہ ہے۔ فرض کریں ایک خاتون نے نکاح کر لیا اور گھر والوں کو اطلاع نہیں دی۔ ان کو دس سال بعد پتہ چلا۔ میں ایک مثال دیتا ہوں۔ ایک لڑکی یہاں سے پڑھنے کے لئے انگلستان گئی۔ وہاں اپنے کسی کلاس فیلو سے شادی کر لی۔ ماں باپ کو پتہ نہیں چلا۔ دس سال بعد آئی تو شوہر صاحب بھی ساتھ آئے اور تین بچے بھی ساتھ تھے۔ اب بتایئے کہ جو فقہا کہتے ہیں کہ نکاح جائز نہیں ہے ان بچوں کو کیا کہیں گے؟

امام ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ یہ نکاح تو جائز ہے لیکن ان کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ ان کو آپ سزا دیں۔ جرمانہ کریں، قید میں بھی ڈال دیں، تنبیہ بھی کر دیں اس لئے کہ انہوں نے ایک ایسا کام کیا ہے جس کی اجازت حدیث میں نہیں دی گئی ہے۔ لیکن قانوناً جو اس کا تکنیکی لیگل حصہ ہے وہ کو آپ منسوخ نہیں کر سکتے۔ یہ ایک لمبی بحث ہے لیکن دونوں کے نقطۂ نظر کا خلاصہ یہ ہے۔ پاکستان میں عدالتیں اکثر امام ابو حنیفہ کے نقطۂ نظر کے مطابق فیصلہ کرتی ہیں۔ اس طرح کی عدالتوں

کے بعض فیصلوں کے بارے میں مجھے بھی تامل ہے۔ اس میں فیصلہ اس طرح نہیں ہوا جس طرح ہونا چاہئے تھا۔ میرا کہنا یہ ہے کہ اس موضوع پر ایک مفصل مرتب قانون ہونا چاہئے۔

جب میں اسلامی نظریاتی کونسل کا رکن تھا تو وہاں میں نے یہ مسئلہ اٹھایا تھا اور اس ضرورت کا اظہار کیا تھا کہ ایک مکمل اور جامع مسلم فیملی لاء پاکستان میں تیار ہونا چاہئے جس میں اس طرح کے سارے مسائل کو مکمل طریقے سے بیان کر دیا جائے۔ اور جو کمزور پہلو (Loop holes) ہیں یا چھوڑ دئے گئے راستے ہیں ان کو بند کر دیا جائے۔

سوال۔ ضعیف احادیث کو پہچاننے کا طریقہ کیسے کریں؟

آپ وہ مجموعے پڑھیں جن میں صحیح احادیث کا ذکر ہے۔ صحیح بخاری، صحیح مسلم کا ترجمہ پڑھیں۔ اردو میں ایک کتاب ہے جس کا انگریزی ترجمہ بھی ملتا ہے۔ اگرچہ بہت معیاری نہیں ہے۔ وہ "اللؤلؤ والمرجان فی ما اتفق علیہ الشیخان" ہے۔ جس میں صحیح بخاری اور مسلم دونوں کے متفق علیہ احادیث کو بیان کیا گیا ہے۔ وہ موجود ہے اس کو پڑھئے ان میں ضعیف ہونے کا ان شاء اللہ امکان نہیں ہے۔

آپ سے درخواست ہے کہ آپ ہمیں اصول فقہ پڑھائیں۔

اگر زندگی رہی تو میں ضرور پڑھاؤں گا لیکن میں اسلامی یونیورسٹی میں پڑھاتا ہوں آپ وہاں داخلہ لے لیں تو میں آپ کو پڑھاؤں گا۔

علوم حدیث کے اس تعارف کے بعد یہ بتائیں کہ ایک مومن مسلمان کو کیا کرنا چاہئے۔ ہمارے ہاں جو اختلافات ہیں ان کو ختم کرنا چاہئے...

اختلافات کو ختم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اختلاف کوئی بری چیز نہیں ہے۔ اس سے خیالات کا تنوع اور وسعت سامنے آتی ہے۔ جتنی وسعت ہوگی اتنے خیالات و افکار پھیلیں گے اور تعلیمی سطح بلند ہوگی۔ لیکن ان خیالات کو آپس میں دوسرے سے جھگڑنے کا ذریعہ نہیں بنانا چاہئے۔ امام بخاری اور امام مسلم میں کئی معاملات پر اختلاف ہے۔ لیکن امام مسلم امام بخاری کا اتنا احترام کرتے ہیں کہ انہوں نے امام بخاری سے کہا کہ آپ اجازت دیں کہ میں آپ کے پاؤں چوم لوں۔ لیکن امام مسلم نے خود اپنی صحیح مسلم کے مقدمہ میں امام بخاری پر اتنے احترام کے باوجود تنقید کی ہے۔ تو احترام اپنی جگہ اور اختلاف اپنی جگہ۔ دونوں ہو سکتے ہیں۔

کیا عورت و مرد کی نماز میں فرق ہے؟

یہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ نماز میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ایک ہی طرح کی ہے سارے احکام ایک جیسے ہیں۔ لیکن بعض فقہا کا کہنا یہ ہے کہ جب خاتون سجدہ یا رکوع کی حالت میں جائے تو سجدہ ایسے کرے کہ اس کے جسم کے لئے زیادہ سے زیادہ ساتر ہو اور جسم کے جو خدوخال ہیں وہ نمایاں نہ ہوں۔ یہ بھی ایک حدیث سے استدلال کی بنیاد پر ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کوئی ضرورت نہیں اسی طرح کرنی چاہئے۔ جیسے آپ کا جی چاہے ویسے کریں۔

حضورؐ سے محبت میں کیسے اضافہ کیا جا سکتا ہے؟

آپ سیرت اور حدیث کا مطالعہ کریں حضورؐ سے محبت میں اضافہ ہو جائے گا۔

آپ نے ایک شعر پڑھ کر سنانے کا وعدہ کیا تھا

میں بھول گیا تھا ابھی پڑھتا ہوں۔

اگر ہر ایک کو اپنی پسند کے امام کے مسائل پر عمل کی چھوٹ دے دی جائے تو کیا اس سے فرقہ بندی کی گنجائش پیدا نہیں ہوتی؟

اس سے اور بھی بہت سی خرابیاں پیدا ہوں گی اس لئے ہر شخص کو جو عمل نہ رکھتا ہو اپنی پسند کے مطابق فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ امام شافعی کہتے ہیں کہ یہ تحکم بالشریعہ نہیں ہوگا بلکہ تحکم بالتشہی ہوگی۔ اپنی خواہشات کے مطابق آدمی پیروی کرے گا۔ جو چیز کام یا بزنس میں مفید ہوگی تو تاجر کہے گا کہ یہ رائے اختیار کریں، جس کو کسی اور چیز میں فائدہ ہوگا تو وہ کہے گا اس چیز کو اختیار کریں۔ تو اس سے بڑی قباحت پیدا ہوگی۔

حواشی کا مطلب ہے حدیث کی کسی کتاب کے حاشیے پر۔

یہ ۱۴ لکھا ہوتا ہے اس کا کیا مطلب ہے؟

جو ۱۴ لکھا ہوتا ہے یہ عدد کے ابجدی عدد ہیں۔ عدد کے معنی ہیں انتہی۔ عدد کے ان ابجدی الفاظ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہاں حاشیہ ختم ہو گیا۔ یعنی unqoute جسے کہتے ہیں۔ انگریزی میں کہتے ہیں quot اور unquot تو پہلے لکھتے ہیں سہ اور اس کے بعد لکھتے ہیں انتہی۔ تو انتہی کی تخفیف کر کے انتہی کی بجائے اعداد دیتے ہیں۔

کیا ہم اس بات کا یقین کر لیں کہ مستشرقین نے احادیث کو درست کر کے بغیر رد و بدل کی لکھی

اس شہر میں کئی عمارتیں ہیں جس سے آپ کسب فیض کے لئے جا سکتی ہیں۔ میں تو دو علماء کو جانتا ہوں۔ ایک ڈاکٹر محمد طفیل حسن صاحب کو جانتا ہوں۔ ان کے والد مولانا عبدالغفار حسن بھی حیات ہیں۔ اللہ ان کی صحت اجازت دے تو ان سے بھی جا کر سند لیں۔ ان کی سند بڑی عالی ہے۔ وہ ایک واسطے سے مولانا شیخ الکل میاں نذیر حسین کے شاگرد ہیں۔ غالباً جہاں تک میرے علم میں ہے۔ اور مولانا نذیر حسین مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب کے شاگرد ہیں تو ان کی سند بڑی عالی اور مختصر ہے۔ ان سے سند لے لیں۔

حدیث کی تعریف میں حدثنا اور اخبرنا آئے ہیں تو ان دونوں میں کیا فرق ہے؟

حدثنا یہ ہے کہ استاد نے حدیث پڑھی اور طالب علم نے سنی تو جب طالب علم اس کو آگے بیان کرے گا تو حدثنا سے بیان کرے گا۔ اخبرنا یہ ہے کہ طالب علم نے حدیث پڑھی اور استاد نے سنی اور سن کر اجازت دے دی، یہ اخبرنا ہے۔

یہ اصطلاح سب سے پہلے امام مسلم نے شروع کی تھی۔ امام بخاری کے ہاں یہ اصطلاح نہیں ہے۔

حدیث کے علم سے پتہ چلتا ہے کہ ... تھا۔ یا پھر اسلام محدثین کی کوششوں سے پھیلا؟

ٹھیک ہے۔ محدثین کی کوششیں بھی شامل ہیں، صوفیا کی کوششیں بھی شامل ہیں۔ اس زمانے میں صوفیا اور محدثین الگ الگ نہیں ہوتے تھے۔ یہ نہیں تھا کہ یہ صوفیا ہیں اور یہ محدثین ہیں۔ محدثین صوفیا بھی ہوتے تھے اور صوفیا محدثین ہوتے تھے۔ سب ملے جلے ہوتے تھے All three in one ہوا کرتا تھا۔ اس لئے کسی نے ان کو صوفی کے نکتہ نظر سے دیکھا تو صوفیا میں بیان کر دیا۔ کسی نے عالم کے نقطہ نظر سے دیکھا تو علماء میں بیان کر دیا۔ کسی نے محدث کے نقطہ نظر سے دیکھا تو محدث بیان کر دیا۔ اب شاہ ولی اللہ صاحب تصوف کے بھی بڑے امام تھے۔ سب صوفیا ان کو مانتے ہیں۔ ان کے مریدین بھی تھے اور وہ محدث بھی تھے۔ شیخ احمد سرہندی صوفی بھی تھے تصوف کے بڑے سلسلے ان سے چلے ہیں لیکن انہوں نے سیالکوٹ جا کر شیخ فضل سیالکوٹی سے علم حدیث حاصل کیا۔

I would be gratful if you could reffer to some books or wbe sites

relating to psycology and Islam, objections made by psycologists on

محاضرات حدیث
ڈاکٹر محمود احمد غازی

محاضرات حدیث

ڈاکٹر محمود احمد غازی

الفیصل
ناشران و تاجران کتب
اردو بازار غزنی سٹریٹ لاہور

دوسرا خطبہ

علم حدیث کی ضرورت اور اہمیت

سنت کی اقسام ۴۹
سنت فعلی ۴۹
سنت تقریری ۴۹
قرآن میں سنت کی سند ۵۱
حدیث کے مقابلہ میں دیگر مذاہب کے صحائف کی حیثیت ۵۳
کتاب الہٰی اور ارشادات انبیاء میں امتیازی فرق ۵۶
سنت: وحی الٰہی کا عملی نمونہ ۵۷
قرآن و سنت کا باہمی تعلق ۷۵
محدثین کی اقسام ۸۳
سوال و جواب ۸۶

تیسرا خطبہ:

حدیث اور سنت بطور ماخذ شریعت

وحی کی اقسام ۱۰۲
کتب حدیث کی خصوصیات ۱۱۳
احادیث نبویؐ کی تعداد ۱۱۹
حجیت سنت ۱۲۰
سوال وجواب ۱۲۷

چوتھا خطبہ

روایت حدیث اور اقسام حدیث

روایت اور درایت ۱۳۵
متن حدیث ۱۳۶
علم روایت ۱۳۷

سماع ۱۳۷

قرأت ۱۳۸

اجازت ۱۳۸

مناولہ ۱۳۸

مکاتبہ ۱۳۹

اعلام ۱۳۹

وصیت ۱۴۰

وجادہ ۱۴۰

تحمل اور اداء ۱۴۱

راوی کی شرائط ۱۴۳

مقبول یا صحیح حدیث ۱۵۰

حدیث حسن ۱۵۰

ضعیف اور موضوع احادیث ۱۵۱

صحیح لعینہ اور صحیح لغیرہ ۱۵۲

حسن لعینہ اور حسن لغیرہ ۱۵۳

تواتر کے درجات ۱۵۴

حدیث مشہور ۱۵۹

خبر واحد ۱۵۹

مرسل حدیث ۱۶۳

منقطع حدیث ۱۶۴

معضل حدیث ۱۶۵

مدلس حدیث ۱۶۵

معلل حدیث ۱۶۶

شاذ حدیث ۱۶۶

منکر حدیث	۱۶۵
متروک حدیث	۱۶۶
موضوع احادیث	۱۶۷
موضوع حدیث کی تخلیق کے اسباب	۱۷۰
سوال و جواب	۱۷۳

پانچواں خطبہ

علم اسماء الرجال

صحابہ کرام اور سند کا اہتمام	۱۸۳
سند کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟	۱۸۶
احادیث کی روایت باللفظ کا اہتمام	۱۸۹
کیا روایت بالمعنی جائز ہے؟	۱۹۲
علم طبقات اور علم رجال	۱۹۵
طبقات پر اہم تصانیف	۱۹۹

چھٹا خطبہ

جرح و تعدیل

جرح و تعدیل کی قرآنی اساس	۲۱۱
صحابہ کرام اور جرح کی روایت	۲۱۳
اسناد کی پابندی کی عملی روایت	۲۱۸
راویوں کے طبقات	۲۲۰
کبار تابعین کا زمانہ	۲۲۲
طبقات رواۃ کی افادیت	۲۲۳
علم رجال کی شاخیں	۲۲۶
جرح و تعدیل اور ائمہ فن	۲۲۷
احادیث کی تحقیق کا مسئلہ	۲۳۰

سوال وجواب ۳۱۹

نواں خطبہ:

علوم حدیث

علم حدیث کا آغاز اور ارتقاء ۳۲۷

علم حدیث کے موضوعات ۳۲۸

معرفت صحابہ ۳۲۸

صحابی کی تعریف ۳۲۹

فضیلت کے لحاظ سے صحابہ کے درجات ۳۳۰

طبقات صحابہ رضی اللہ عنہم ۳۳۳

کبار صحابہ ۳۳۵

اوساط صحابہ ۳۳۵

صغار صحابہ ۳۳۶

صحابہ کرام کی کل تعداد ۳۳۷

تابعی کی تعریف ۳۴۰

طبقات تابعین ۳۴۲

تابعین کے درجات ۳۴۳

تابعی اور تبع تابعی کا تعین ۳۴۹

ضعیف حدیث پر عمل ۳۵۰

علل حدیث ۳۵۱

علم حدیث کے آداب ۳۵۷

درس حدیث کی اقسام ۳۵۷

احادیث میں تعارض ۳۵۹

علم ناسخ ومنسوخ ۳۶۳

اسباب ورود حدیث ۳۶۵

فرنگی محلی علماء ۴۳۳

نواب صدیق حسن خان ۴۳۴

دائرۃ المعارف العثمانیہ ۴۳۵

سوال وجواب ۴۳۷

بارھواں خطبہ:

علوم حدیث — دور جدید میں

مستشرقین کی خدمات ۴۴۴

تاریخ حدیث پڑھنے والا کام ۴۴۵

مخطوطات ۴۴۷

علم حدیث پر نئے علوم کی روشنی میں کام ۴۴۹

احادیث میں سابقہ کتب کا ذکر ۴۵۵

نئے انداز سے کام کرنے کی راہیں ۴۵۶

تدوین حدیث غیر مسلموں کے لئے ۴۵۸

علم حدیث کی کمپیوٹرائزیشن ۴۵۹

انکار حدیث کا مقابلہ ۴۶۱

☆☆☆

پیش لفظ

قبل ازیں محاضرات قرآنی کے عنوان سے علوم قرآن، تاریخ قرآن مجید اور تفسیر سے متعلق موضوعات پر بارہ خطبات پر مبنی ایک جلد طالبان علوم قرآنی کی خدمت میں پیش کی جا چکی ہے۔ زیر نظر جلد اسی سلسلے کی دوسری کڑی ہے۔ اس میں حدیث، علوم حدیث، تاریخ تدوین حدیث اور مناہج محدثین سے متعلق موضوعات پر بارہ خطبات پیش خدمت ہیں۔

یہ خطبات ادارہ ''الہدیٰ'' کے تعاون سے ادارہ الہدیٰ ہی کے اسلام آباد مرکز کے وسیع ہال میں دیے گئے۔ سرگودھا، راولپنڈی اور اسلام آباد سے تعلق رکھنے والی معلمات قرآن کے علاوہ الہدیٰ سے وابستہ خواتین اہل علم کی بڑی تعداد نے ان میں شرکت کی۔ خطبات کا آغاز ۶ اکتوبر ۲۰۰۳ء بروز پیر ہوا اور درمیان میں اتوار کا دن نکال کر ۱۹ اکتوبر ۲۰۰۳ء تک مسلسل بارہ روز یہ سلسلہ جاری رہا۔ خواتین اساتذہ کی ایک بڑی تعداد نے شرکت فرما کر مقرر کی عزت افزائی کی۔ علوم حدیث، رجال، جرح و تعدیل، حدیث کی اقسام اور ان کے احکام جیسے دقیق اور فنی مباحث کو جس ترتیب سے خواتین نے بڑی دلچسپی اور توجہ کے ساتھ سنا اس کی دلچسپی سے معلوم ہوا کہ خواتین کے اندر تعلیم یافتہ طبقے میں دینی تخصصات کی کس قدر ضرورت اور کتنی شدید طلب موجود ہے۔

محاضرات قرآنی کی طرح ان محاضرات کی اصل مخاطب بھی وہ خواتین اہل علم ہیں جو قرآن مجید کے درس و تدریس میں مصروف ہیں۔ فہم قرآن اور تفسیر قرآن کے لیے حدیث و سنت کی ضرورت و اہمیت سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں ہے۔ معلمات قرآن کو علوم حدیث کی اہمیت سے باخبر کرنا اور علم حدیث کی طلب اور شوق پیدا کرنا ہی ان خطبات کا اصل مقصد تھا۔

پہلا خطبہ

علم حدیث: ایک تعارف

پیر، ۶ اکتوبر 2003ء

علم حدیث: ایک تعارف

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم و علی آلہ و اصحابہ اجمعین

سب سے پہلے میں دل کی گہرائیوں سے ادارہ الہدیٰ کا شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے یہ عزت بخشی اور یہ موقع عنایت فرمایا کہ حدیث نبوی اور سنت رسول ﷺ کے بارے میں یہ گزارشات آپ کی خدمت میں پیش کر سکوں۔

یہ خطبات، جن کی تعداد ان شاء اللہ بارہ ہوگی، علم حدیث کے مختلف پہلوؤں سے بحث کریں گے۔ اس میں علم حدیث کے فنی مباحث پر بھی گفتگو ہوگی، علم حدیث کی تاریخ پر بھی گفتگو ہوگی، اور محدثین کرام نے احادیث رسول کو جمع کرنے، مرتب کرنے اور ان کا مطالعہ اور تشریح و تفسیر کرنے میں جو خدمات انجام دی ہیں، ان خدمات کا بھی اختصار کے ساتھ جائزہ لینے کی کوشش کی جائے گی۔

علم حدیث کا تعارف

آج کی گفتگو کا عنوان ہے علم حدیث: ایک تعارف۔ علم حدیث کے تعارف کی ضرورت اس لئے پیش آتی ہے کہ عموماً ہر مسلمان حدیث رسول سے تو واقف ہوتا ہے، اس کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کیا ہے؟ اور اسلام میں حدیث کی اہمیت کیا ہے؟ لیکن بہت سے حضرات کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ فنی اعتبار سے علم حدیث کا کیا مطلب ہے؟ حدیث اور اس سے ملحق جو اصطلاحات ہیں ان کا مفہوم کیا ہے؟ ان اصطلاحات کا استعمال اہل علم کے یہاں کن کن معانی میں ہوا ہے؟ یہ اور اسی قسم کی بہت سی فنی تفصیلات ایسی ہیں جن سے بہت سے لوگ واقف نہیں

ہیں۔ اس عدم واقفیت کے باعث بہت سے مسائل اور غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ قرآن مجید کی تشریح وتفسیر کا سوال ہو، فقہی احکام اور شریعت کے مسائل کا معاملہ ہو یا شریعت کے احکام میں ترتیب اور باہمی ربط کا سوال ہو، ان سب چیزوں کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے علم حدیث سے فنی واقفیت بقدر ضرورت لازمی ہے۔

ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآن مجید ایک متعین کتاب ہے۔ پورا قرآن مجید اس کتاب کے اندر لکھا ہوا ہے۔ اس سے باہر قرآن کا کوئی وجود نہیں ہے اور سارے کا سارا قرآن اس کتاب کے اندر آ گیا ہے۔ لیکن حدیث یا سنت کے بارے میں ایسی کوئی ایک کتاب موجود نہیں ہے جس کے بارے میں کہا جا سکے کہ حدیث یا سنت پوری کی پوری اس کتاب میں موجود ہے۔

احادیث کی تاریخ، تدوین اور روایت و درایت کے بارے میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ خود احادیث کے بہت سے مجموعے ابتدائی صدیوں سے متداول چلے آ رہے ہیں۔ بعد کی صدیوں میں مرتب ہونے والے بھی بہت سے مجموعے ملتے ہیں جن میں بہت سی احادیث مختلف موضوعات پر مختلف مقاصد کے لیے جمع کی گئی ہیں۔ ان سب کتابوں سے سنت کا پتہ چلتا ہے۔ اس لیے جب تک اسلامیات کے طلبہ کو بالعموم اور قرآن مجید کے طلبہ کو بالخصوص اچھی طرح سے یہ معلوم نہ ہو کہ حدیث اور سنت کس کو کہتے ہیں، حدیث کی جو کتابیں ہمارے سامنے ہیں ان سے استفادہ کرنے کا طریقہ کیا ہے، حدیث کی کسی کتاب میں اگر کوئی حدیث لکھی ہوئی ہے تو اس کی روشنی میں قرآن پاک کو کیسے سمجھا جائے؟ جب تک ان سب امور سے گہری واقفیت نہ ہو اس وقت تک قرآن پاک کو کما حقہ سمجھنا بہت مشکل ہے۔ ان تمام امور کو جاننے اور سمجھنے کے تفصیلی قواعد اور ضوابط مقرر ہیں جن پر گزشتہ تیرہ سو سال سے لوگ عمل کرتے چلے آ رہے ہیں اور قرآن مجید اور ارشادات رسول کو ان قواعد وضوابط کی روشنی میں سمجھ رہے ہیں۔

یہ سمجھنا کہ قرآن مجید اور سنت کسی خلا میں دیے جاتے ہیں اور بغیر کسی تسلسل کے آج جس کا جو جی چاہے وہی معنی قرآن مجید کی آیات اور الفاظ کو پہنا دے، یہ تصور درست نہیں ہے۔ قرآن مجید ایک تسلسل کے ساتھ ہم تک پہنچا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو اس کے معانی ومطالب سمجھائے۔ صحابہ کرام نے وہی معانی ومطالب تابعین کو سمجھائے اور اس طرح نسلاً بعد نسل ایک طبقہ کے بعد دوسرا طبقہ اور دوسرے کے بعد تیسرا طبقہ اس کو سیکھتا گیا اور اس طرح یہ

رہنمائی ہم تک پہنچی ہے۔ اس لئے حدیث اور سنت میں خدانخواستہ اگر کوئی خلا پیدا ہو گیا یا ہماری فہم
میں کوئی ایسا خلل آ گیا کہ جس میں ماضی سے ہمارا رشتہ کٹ جائے تو پھر قرآن مجید کے فہم میں بڑی
غلطیاں پیدا ہو جانے کا امکان ہے۔ ماضی قریب میں خود ہمارے ملک میں بہت سی گمراہیاں
اس لئے پیدا ہوئیں کہ بعض لوگوں نے سنت رسولؐ کے اس تسلسل کو، احادیث کے اس پورے علم
اور فن کو اور قرآن مجید کی تفسیر و تشریح کے ان سارے اصولوں کو نظر انداز کر کے صرف اپنی عربی
زبان دانی اور محض اپنی فہم کی مدد سے قرآن کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اس کے نتیجے میں بہت سی خرابیاں
اور کمزوریاں پیدا ہوئیں۔ اس لئے قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے علم حدیث سے واقفیت ناگزیر ہے۔
علم حدیث کی ضرورت اور اہمیت پر تفصیلی گفتگو بعد میں ہوگی۔ لیکن اس ابتدائی تمہیدی گفتگو سے
یہ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ علوم اسلامیہ میں بالعموم اور قرآن مجید کو سمجھنے میں بالخصوص علم حدیث کی اہمیت
کتنی ہے۔

حدیث کے لغوی معنی

لفظ 'حدیث' جس کو اس خاص فن کی اصطلاح کے طور پر استعمال کیا گیا ہے، عربی
زبان میں بہت سے معانی اور مطالب کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ عربی زبان میں حدیث کے معنی
گفتگو کے بھی ہیں۔ حدیث کے معنی نئی بات کے بھی ہیں۔ اور حدیث کے معنی کسی اہم اور تاریخی ذکر
و تذکرہ کے بھی ہیں۔ نئی چیز، نئی بات، اہم اور تاریخی ذکر، واقعہ، کوئی گفتگو یا کوئی کلام، ان کو عربی زبان
میں حدیث کہتے ہیں۔ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور ارشاد سنا ہوگا جس میں آپؐ
نے فرمایا: 'خیر الحدیث کتاب اللہ'۔ ایک جگہ ہے 'ان احسن الحدیث کتاب اللہ'، یعنی سب
سے اچھی گفتگو، سب سے اچھا کلام اللہ کا کلام ہے۔ گویا حدیث اور کلام دونوں ہم معنی، قصہ تذکرہ اور
کے طور پر بھی استعمال ہوتے ہیں۔

جاہلیت کے زمانے میں عربوں میں آپس میں جنگیں ہوتی رہتی تھیں اور آپس میں
اختلافات بھی ہوتے رہتے تھے۔ جب ایک قبیلے کی دوسرے قبیلے سے جنگ ہوتی تھی تو جیتنے
والا قبیلہ اپنی فتح کو ایک تاریخی جشن کے طور پر یاد رکھتا تھا۔ اس کی تفصیلات قبیلے کے خطیبوں،
شاعروں اور عام لوگوں میں افتخار کے ساتھ محفوظ رکھی جاتی تھیں۔ ان واقعات کو ایام العرب کے

حدیث نبوی

تاہم جب یہ لفظ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حدیث ایک فنی اصطلاح کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ تو اس سے مراد وہ تمام چیزیں یا وہ تمام امور ہوتے ہیں جن کا مقصد رسول اللہ ﷺ کے ارشادات گرامی، آپؐ کے افعال اور آپ کے احوال کی تحقیق کرنا ہے۔ علامہ بدرالدین عینی ایک مشہور محدث ہیں، صحیح بخاری کے شارح بھی ہیں اور مشہور فقیہ بھی ہیں۔ انہوں نے علم حدیث کی تعریف کی ہے کہ هُوَ عِلمٌ يُعرَفُ بِهِ اقوالُ رسولِ اللهِ ﷺ و افعالُهُ و احوالُهُ۔ یعنی علم حدیث وہ علم ہے جس کے ذریعے رسول اللہ ﷺ کے اقوال، آپؐ کے افعال اور آپؐ کے احوال معلوم کئے جائیں۔

علم حدیث کی تاریخ میں محدثین کے درمیان شروع سے حدیث کی اصطلاحی تعریف کے بارہ میں ایک اختلاف چلا آرہا ہے۔ اور وہ اختلاف یہ ہے کہ کیا صرف رسول اللہ ﷺ کے اقوال، افعال اور احوال کا نام حدیث ہے یا صحابہ کرامؓ اور تابعین کے اقوال، افعال اور احوال کا نام بھی حدیث ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ صحابہ کرام کے اقوال اور افعال و احوال تو حدیث میں شامل ہیں لیکن تابعین کے اقوال، افعال اور احوال حدیث کے مفہوم میں شامل نہیں ہیں۔ کچھ اور حضرات کا کہنا ہے کہ تابعین کے اقوال، افعال اور احوال بھی حدیث میں شامل ہیں۔ اس اعتبار سے علم حدیث کی تعریف میں تھوڑا سا فرق واقع ہو جائے گا۔ جو حضرات صرف رسول اللہ ﷺ کے اقوال، افعال اور احوال کو حدیث قرار دیتے ہیں، وہ اس کی وہ تعریف کریں گے جو ابھی میں نے عرض کی۔ جو لوگ صحابہ اور تابعین کے اقوال، افعال اور احوال کو بھی حدیث کے مفہوم میں شامل قرار دیں گے وہ اس کی تعریف میں صحابہ اور تابعین کے الفاظ بھی شامل کر دیں گے۔

اس اختلاف سے یہ نہ سمجھئے گا کہ اس سے علم حدیث کے ذخیرہ پر کوئی فرق پڑتا ہے۔ علم حدیث کا ذخیرہ وہی ہے، چاہے آپ یہ تعریف اختیار کریں یا وہ تعریف اختیار کریں یا کوئی تیسری تعریف اپنائیں۔ اس لئے کہ جو حضرات صحابہ کرامؓ کے ارشادات اور اقوال کو بھی حدیث قرار دیتے ہیں وہ ان کو اس لئے حدیث قرار دیتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ کے ارشادات سے رسول اللہ ﷺ کے اقوال اور احوال کا پتہ چلتا ہے۔ صحابہ کرام کے اجتماعی طرز عمل سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ

نکل جائیں گویا بجلی روشنی کا مطلب یہ ہے کہ فلاں ختم ہو گئی۔ کسی کو یہ اصطلاح اختیار کرنے پر اعتراض کرنے کی اجازت نہیں کہ آپ نے یہ اصطلاح کیوں رکھی؟ یا اس کا عکس کیوں نہیں رکھا؟ آپ کو یہ اختیار ہے کہ آپ اپنی سہولت کی خاطر جو اصطلاح چاہیں وہ اختیار کر لیں۔ آپ بطور اصطلاح کوئی لفظ مقرر کر لیں کہ جو باہر سے نیا آئے گا اس کو علم نہیں ہے، تو بتانا ہو گا اس کو مدد کرنی ہے۔ اس میں کوئی اختلاف کی بات نہیں ہے۔

اس لئے اگر محدثین نے اپنی اپنی اصطلاحات اختیار کی ہیں تو اس میں کسی کو اعتراض کا یا شک و شبہ کا حق نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہر عالم یا غیر عالم کو اپنی اصطلاحات وضع کرنے کا حق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مفسرین میں اور محدثین میں کچھ اصطلاحات کے بارے میں تو اتفاق رائے ہے۔ لیکن کچھ اصطلاحات کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض حضرات نے ان کا ایک مفہوم قرار دے کر اس کو استعمال کیا ہے اور بعض دوسرے حضرات نے کوئی اور مفہوم قرار دے کر استعمال کیا ہے۔ جس کی تفصیل آگے چل کر آپ کے سامنے آتی رہے گی۔

حدیث اور سنت کا فرق

سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ حدیث اور سنت میں محدثین نے کیا فرق رکھا ہے۔ حدیث اور سنت دو مشہور اصطلاحات ہیں۔ قرآن مجید میں سنت کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے اور حدیث کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ خود حدیث پاک میں حدیث کا لفظ بھی آیا ہے اور سنت کا لفظ بھی آیا ہے۔ حدیث اور سنت کے بارے میں علماء کے ایک گروہ کی تو رائے یہ ہے کہ یہ دونوں بالکل ایک مفہوم رکھتی ہیں۔ جو حدیث ہے وہ سنت ہے اور جو سنت ہے وہ حدیث ہے۔ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ایک بڑی تعداد کی رائے یہ ہے۔

کچھ دوسرے حضرات کا کہنا ہے کہ حدیث ایک عام چیز ہے اور سنت خاص ہے اور اس کا ایک حصہ ہے۔ حدیث تو ہر وہ چیز ہے جو رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارک سے منسوب ہو گئی جس میں ضعیف احادیث بھی شامل ہیں اور موضوع احادیث بھی شامل ہیں، منکر اور شاذ احادیث بھی شامل ہیں جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ اور سنت سے مراد وہ طریقہ ہے جو احادیث صحیحہ کی بنیاد پر ثابت ہوتا ہے، جو رسول اللہ ﷺ کا طے کیا ہوا طریقہ ہے جو آپ نے اپنی امت کو سکھایا، جو قرآن

وتابعین ان سب کے اقوال وافعال واعمال کو حدیث بھی کہتے ہیں اور اثر بھی کہتے ہیں۔

علم حدیث کی اصطلاح میں ایک اصطلاح ہے 'مرفوع'۔ مرفوع کے لفظی معنی ہیں وہ چیز جس کو بلند کیا گیا ہو جس کو اٹھایا گیا ہو، بلند شدہ۔ انگریزی میں Exalted۔ اصطلاح میں اس سے مراد وہ حدیث ہے جو رسول اللہ ﷺ تک پہنچتی ہے، جس میں راوی رسول اللہ ﷺ کا اسم مبارک لے کر صراحتاً اس حدیث کو آپ کی ذات مبارک سے منسوب کرتا ہے، اس کو مرفوع کہتے ہیں۔

اس کے مقابلہ میں دوسری اصطلاح ہے موقوف۔ یعنی جو رُکا ہوا ہو۔ جو رُک گیا ہو۔ انگریزی میں آپ اس کو Halted کہہ سکتے ہیں۔ یہ وہ روایت یا حدیث ہے جس کی نسبت صحابہ تک پہنچتی ہے۔ ان کے بعد آگے نسبت کوئی پیش قدمی نہیں کرتی۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ فلاں شخص نے مجھ سے بیان کیا، فلاں شخص سے فلاں نے بیان کیا، انہوں نے فلاں صحابیؓ کو یہ ارشاد فرماتے سنا اور پھر آگے وہ بات بیان ہوتی ہے۔ اس کے بعد آگے نہیں۔ اس بات کو موقوف کہتے ہیں جو صحابہ کرام پر جا کر رک جائے۔ جو لوگ حدیث اور اثر میں فرق کرتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ روایت اگر مرفوع ہو، رسول اللہ ﷺ کی ذات تک پہنچتی ہو تو اس کو حدیث کہا جائے گا اور اگر روایت صحابہ کرام یا تابعین پر موقوف ہو جائے تو اس کو اثر کہا جائے گا۔

یہی فرق ہے خبر اور حدیث کے درمیان۔ خبر کا لفظ بھی کتب حدیث میں کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ لغوی اعتبار سے خبر کا مطلب ہے اطلاع یا رپورٹ۔ یہ اطلاع یا رپورٹ جو رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد یا فعل یا کیفیت کے بارے میں اگر کسی نے دی، وہ اصطلاحاً خبر بھی کہلاتی ہے اور حدیث بھی کہلاتی ہے۔ یہ دونوں اصطلاحات Inter-changeable ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے کے بدلے میں بھی استعمال ہوتی ہیں اور الگ الگ بھی استعمال ہوتی ہیں۔ یہ چار اصطلاحی الفاظ ہیں جن کو سمجھ لینا چاہئے یعنی حدیث، سنت، اثر اور خبر۔

اصطلاحات میں کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہئے۔ ہر محدث کا حق ہے کہ جو اصطلاح چاہے وضع کرے۔ لیکن جب ہم کسی اصطلاح کو استعمال کرنا چاہتے ہیں تو ہم پہلے یہ ضرور دیکھ لیں کہ ہم اس اصطلاح کو کس سیاق و سباق میں استعمال کر رہے ہیں اور اس مفہوم میں استعمال کر رہے ہیں۔ مثلاً ایک اصطلاح امام بخاری کی ہے تو ہم امام بخاری کے سیاق و سباق میں امام بخاری کی اصطلاح کو استعمال کریں گے اور اپنی اصطلاح استعمال نہیں کریں گے۔ جو

بات درست نہیں ہوگی کہ میں اپنی کوئی اصطلاح وضع کروں یا آپ اپنی کوئی اصطلاح وضع کریں اور اس کو امام بخاری کے سیاق و سباق میں استعمال کریں۔ وہ امام بخاری کے نقطۂ نظر کی صحیح ترجمانی نہیں ہوگی۔ اس لئے ان چاروں اصطلاحات کا مفہوم پہلے سے ہی ذہن میں واضح ہونا چاہئے۔

علم حدیث: ایک بے مثال فن

علم حدیث جس کے بارے میں علم بھی دن بدن کم ہوتا جارہا ہے اور لوگوں کی دلچسپی بھی روز بروز گھٹ رہی ہے۔ اس میں مہارتیں دن بدن محدود ہوتی چلی جارہی ہیں۔ اس علم سے دلچسپی خود اسلامیات کے طلبہ کی محدود ہوتی چلی جارہی ہے۔ یہ انسانی تاریخ کا ایک انتہائی منفرد اور بے مثال علمی کارنامہ ہے۔ یہ ایک ایسا بے نظیر علم ہے جس کی مثال پیش کرنے سے انسانی تاریخ قاصر ہے۔ اس پر تھوڑی سی گفتگو آگے چل کر ہوگی۔ لیکن سردست اختصار کے ساتھ یہ ذہن میں رکھئے کہ انسانی تاریخ میں کوئی ایسا علم موجود نہیں ہے جس کا مقصد کسی ایک شخصیت کے اقوال و افعال کو محفوظ رکھنا اور ان کو ہر قسم کے شک وشبہ سے پاک کر کے اس طرح پیش کر دینا ہو کہ پڑھنے والوں کو ایسا یقین آجائے جیسے کہ آج سورج نکلنے کا یقین ہے۔ جتنی یہ بات یقینی ہے کہ اس وقت سورج نکلا ہوا ہے اتنی ہی اس بات کو یقینی بنا دینا کہ یہ بات رسول اللہ ﷺ کے دہن مبارک سے نکلی کہ نہیں نکلی۔ یہ پوری انسانی تاریخ میں اپنی نوعیت کی منفرد کاوش ہے۔ دنیا میں بڑی بڑی بڑی دینی شخصیتیں گزری ہیں۔ آج بھی ایسی دینی شخصیتیں موجود ہیں اور تاریخ میں بھی موجود رہی ہیں جن کے پیروکاروں کی تعداد رسول اللہ ﷺ کے ماننے والوں سے زیادہ ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام کو جو لوگ مانتے ہیں۔ ان کی تعداد ان سے بہت زیادہ ہے جو رسول اللہ ﷺ کو مانتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ماننے والوں میں یہودی بھی شامل ہیں عیسائی بھی شامل ہیں اور مسلمان بھی شامل ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ماننے والوں میں یہودی، عیسائی اور مسلمان تینوں شامل ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی بھی جلیل القدر پیغمبر کے اقوال و افعال اور ارشادات کو محفوظ رکھنے کا ان کے ماننے والوں نے ایک لاکھواں اہتمام بھی نہیں کیا، ایک کروڑواں اہتمام بھی نہیں کیا جتنا اہتمام مسلمانوں نے رسول اکرمؐ کے ارشادات گرامی کو محفوظ کرنے کے لئے کیا۔ اس پر آگے چل کر مزید تفصیل سے گفتگو ہوگی۔ مگر اس سے پہلے ایسے کسی فن کی کوئی مثال

آئے گا کہ آپ کا سوال کیا ہے، اور اگر سمجھ میں آ جائے تو پچیس تیس آدمیوں سے یا شاید پچاس پچاس آدمیوں سے زیادہ کے نام آپ کو نہ بتا سکیں۔ مسلمانوں میں چھ لاکھ رواۃ کے نام اس وقت محفوظ اور موجود ہیں۔

ابھی میں ساتھ والے کمرے میں بیٹھا تھا تو یہاں جو کتابیں رکھی ہوئی ہیں وہ اس بات کے ثبوت کے لئے کافی ہیں۔ رجال کی ان کتابوں میں کئی لاکھ انسانوں کے حالات محفوظ ہیں۔ صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارک کو دیکھا۔ ان کی آنکھیں اس شرف سے مشرف ہوئیں اور ان کے کان اس اعزاز سے معزز ہوئے۔ اس لئے سب سے پہلے ان کے حالات جمع کرنے پر توجہ دی گئی۔ آج صحابہ کرام کے تذکرے پر جو کتابیں ہیں جن کی تعداد ایک دو نہیں بلکہ درجنوں میں ہے۔ ان میں کم و بیش بارہ سے پندرہ ہزار صحابہ کرام کے حالات محفوظ ہیں۔ اس کی کوئی مثال آج تک کی تاریخ میں نہیں مل سکی۔ اور اس وقت بھی نہیں مل سکتی تھی۔ کہ کسی بڑے سے بڑے انسان کے ساتھیوں کا اور اس کے اصحاب کا تذکرہ جمع کیا گیا ہو اور بارہ پندرہ ہزار افراد کا تذکرہ اس لئے جمع کیا گیا ہو کہ یہ فلاں شخص کے اصحاب اور اس کے ساتھی ہیں اور ان سے ان کے بارے میں کوئی معلومات یا کوئی رہنمائی مل سکتی ہے۔ اس نقطہ نظر سے آپ جتنا غور کریں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہ انسانی تاریخ کا ایک بے مثال منفرد علم ہے۔ جس کی کوئی مثال دنیا کی تاریخ میں نہ مذہبی علوم میں ملتی ہے اور نہ غیر مذہبی علوم کی تاریخ میں ملتی ہے۔

مذہبی علوم کی تاریخ میں ایسی مثالیں تو موجود ہیں کہ کسی مذہبی شخصیت کے ارشادات کے مجموعے مرتب ہوئے ہوں۔ آج بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعض ارشادات بائبل میں موجود ہیں۔ یہ چار انجیلیں جن کو عیسائی مستند انجیلیں مانتے ہیں، یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سوانح عمریاں اور ارشادات کے مجموعے ہیں۔ اس سے قطع نظر کر ان کی تاریخی حیثیت کیا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ ان کی کوئی Authenticity ہے کہ نہیں، یہ بات بہر حال سب مانتے ہیں کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اقوال اور ارشادات کے کچھ مجموعے ہیں۔ لیکن ان مجموعوں کی مدد سے اگر آپ حضرت عیسیٰ کے اقوال و ارشادات کی کوئی فہرست مرتب کریں تو دو ڈھائی سو سے زیادہ ارشادات کا مجموعہ نہیں ملے گا۔ سارے ارشادات ملا کر ان کی تعداد دو ڈھائی سو سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اس کے مقابلے میں رسول اللہ ﷺ کے ارشادات گرامی جو صحابہ کرام نے جمع کئے ہیں ان

کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی غلطی کو درست کردے۔ لیکن یہ بات یا تو پرلے درجے کی غلط فہمی اور کم علمی ہے یا انتہائی بدترین تحریک کی پیداوار ہے جس میں علم حدیث کے بارے میں شک وشبہ کا اظہار کیا جائے۔

کسی بھی چیز کو محفوظ رکھنے کے جتنے طریقے ہو سکتے ہیں اور انسانی ذہن یا دماغ میں آسکتے ہیں وہ سب سنت کے سارے ذخیرے کو اور ارشادات رسول ﷺ کو محفوظ رکھنے کے لئے محدثین نے اور امت مسلمہ نے اختیار کئے اور ان سب طریقوں سے محفوظ ہو کر علم حدیث مرتب و منقح ہو کر ہم تک پہنچا ہے۔ دنیا کے کسی علم پر اتنے بڑے بڑے انسانی دماغوں نے اور اتنے غیر معمولی یادداشت رکھنے والے انسانوں نے مسلسل غور و خوض نہیں کیا جتنا علم حدیث پر غور و خوض ہوا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف پر سینکڑوں پہلوؤں سے لاکھوں انسانوں نے غور کیا ہے اور یہ غور چودہ سو برس سے مسلسل ہوتا چلا آرہا ہے۔ ابھی یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ اس وقت بھی دنیا بھر میں جاری و ساری ہے اور نئے نئے اہل علم تسلسل کے ساتھ نئے نئے راستے اور نئے نئے رجحانات علم حدیث پر غور کرنے کے لئے سامنے لارہے ہیں۔ جن پر میں سب سے آخری خطبہ میں ان شاء اللہ گفتگو کروں گا۔

اس لئے سب سے پہلے تو یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ علم حدیث اسی طرح کا مستند علم ہے جیسے کوئی بھی انسانی علم مستند ہو سکتا ہے۔ اس علم کے ذریعے رسول اللہ ﷺ کی سنت اور آپ کی احادیث مبارکہ کو جس طرح محفوظ کیا گیا وہ اسی طرح قطعی اور یقینی ہے جس طرح قرآن حکیم قطعی اور یقینی ہے۔ حدیث و سنت قرآن حکیم کی طرح صرف ایک فرق کے ساتھ قطعی اور یقینی ہے کہ قرآن مجید کے الفاظ اللہ کی طرف سے ہیں اور احادیث کے الفاظ اللہ کی طرف سے نہیں ہیں۔ قرآن مجید ایک خاص ترتیب سے رسول اللہ ﷺ نے محفوظ کرایا اور احادیث کو حضورؐ نے اس ترتیب سے محفوظ نہیں کرایا۔ صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ کے زمانہ مبارک میں قرآن مجید کو زبانی یاد کیا اور احادیث کو بہت سے صحابہ نے اس طرح سے زبانی یاد نہیں کیا۔ اس لئے کہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اسی ایک فرق کے ساتھ احادیث اور سنت اسی طرح مستند اور محفوظ ہیں جس طرح کہ قرآن مجید مستند اور محفوظ ہے۔

بیان کی جس کے سامنے بیان کیا اس نے آپ کی نسبت زیادہ بہتر طور پر اس کی حفاظت کی۔ یعنی آپ نے بیان کی اور کم عمری کی وجہ سے آپ کو یاد نہیں رہا، جس سے بیان کی تھی اس نے یاد رکھا اور آگے سینکڑوں ہزاروں تک پہنچایا، یا جہاں تک آپ شاید نہیں پہنچا سکتے تھے۔ تو اس کا امکان ہے کہ آپ سے زیادہ بہتر انداز میں وہ دوسروں تک پہنچا سکے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض ایسے لوگ جن کو پہنچایا گیا ہو وہ پہنچانے والے سے زیادہ حفاظت کرنے والے ہوں۔ ایک جگہ ارشاد ہوا کہ "رب حامل فقه الی من هو افقه منه" بعض اوقات ایسا ہو سکتا ہے کہ فقہ اور دانائی کی یہ بات، دین میں گہری سمجھ اور شعور کی یہ بات آپ نے کسی ایسے کو پہنچائی جو آپ سے زیادہ سمجھ رکھتا ہو اور وہ اس سے وہ معانی اور مطالب نکال لے جو آپ کے ذہن میں نہیں آئے۔ میں نے اپنی زندگی میں بارہا اس کی مثالیں دیکھی ہیں۔ کہ علم حدیث کا ایک خاص پہلو کسی جگہ بیان کیا گیا اور جس کے روبرو اور جس سے بیان کیا گیا اس نے اس سے وہ معنی نکالے جو بیان کرنے والے کے ذہن میں بالکل نہیں تھے۔

میرے ساتھ بھی ایک بار ایسا ہی ہوا۔ اے کے بروہی مرحوم ہمارے ملک کے مشہور دانشور اور قانون دان تھے۔ ایک مرتبہ ہم دونوں کسی معاملہ پر تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ میں نے ان کو اپنے نقطہ نظر کی تائید میں ایک حدیث سنائی جو انہوں نے پہلے نہیں سنی تھی۔ انہوں نے اس کو بڑا خوش ہو کر سنا اور اپنے پاس نوٹ بھی کر لیا۔ اگلے دن کسی موضوع پر ان کا لیکچر تھا۔ اس لیکچر میں انہوں نے اس حدیث کے معانی اور پیغام کو اتنی خوبصورتی اور جامعیت سے بیان کیا کہ میرے ذہن میں بے اختیار حضورؐ کے الفاظ گونجنے لگے کہ "رب حامل فقه الی من هو افقه منه" بعض اوقات سنانے والا اصل بات کی گہرائی تک اتنا نہیں پہنچ پاتا جتنا کہ سننے والا پہنچ جاتا ہے۔ حدیث رسول کی یہ بصیرت میں نے خود دیکھی ہے۔

ایک جگہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اور یہ ہم سب کے لئے ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ "اللھم ارحم خلفائی" اے اللہ میرے جانشینوں پر رحمت فرما۔ صحابہ کرامؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ آپ کے خلفاء سے مراد کون لوگ ہیں؟ آپؐ نے فرمایا "الذین یاتون من بعدی" میرے خلفاء سے مراد وہ لوگ ہیں جو میرے بعد آئیں گے "یروون احادیثی" میری حدیثیں روایت کریں گے "و یعلمونھا الناس" اور لوگوں کو سکھائیں گے۔ یعنی وہ لوگ جو میری احادیث کا

موجود ہیں اور دستیاب ہیں۔ لہٰذا یہ سمجھنا کہ حدیث تو زبانی روایت کی بنیاد پر چلی اور زبانی روایت کی بنیاد پر تین سو سال تک چلتی رہی اور بعد میں لوگوں نے جمع کر دیا، یہ بات درست نہیں ہے۔ اس پر تفصیل سے آگے چل کر بات کریں گے۔

لیکن ایک بات یاد رکھیں کہ کسی چیز کو محفوظ رکھنے کے جو طریقے ہو سکتے ہیں وہ سارے کے سارے علم حدیث اور سنت کو محفوظ رکھنے کے لئے اختیار کئے گئے۔ صحابہ کرامؓ میں سے پچاس کے قریب ایسے ہیں کہ جنہوں نے حضور ﷺ کی حیات مبارکہ ہی میں آپؐ کے ارشادات کو لکھا۔ ان لکھنے والوں میں حضرت ابو ہریرہؓ بھی شامل ہیں۔ ان میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ، حضرت سعد بن عبادہؓ اور کئی ایک حضرات شامل ہیں جن کے بارے میں آئندہ گفتگو کی جائے گی۔ یہ حضرات رسول اللہ ﷺ کے ارشادات گرامی کو تحریر کیا کرتے تھے، زبانی یاد کیا کرتے تھے اور اس زبانی یادداشت کا وقتاً فوقتاً اپنے تحریری ذخائر سے موازنہ کرتے رہتے تھے۔ ان ذاتی ذخائر سے موازنہ کرنے کے ساتھ ساتھ ہزاروں افراد ایسے موجود تھے جو تھوڑی سی بھی بھول چوک یا کمزوری اگر پیدا ہوتی تو اس کی نشاندہی کرنے پر ہر وقت کمربستہ رہا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ عرض کرتا ہوں جس سے اندازہ ہوگا کہ لوگ اس معاملہ میں کتنے حساس اور مستعد تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی ذات کے ساتھ کوئی ایسی چیز منسوب نہ ہونے پائے جس کے بارے میں پورے یقین کے ساتھ یہ ثابت نہ ہو کہ حضورؐ کی زبان مبارک سے ایسا ہی نکلا تھا۔

حضرت ابو ہریرہؓ راویان حدیث میں سب سے مشہور ہیں اور آپ ایک طویل عرصہ تک حدیث بیان فرماتے رہے۔ منکرین حدیث کا سب سے بڑا نشانہ آپ ہی کی ذات گرامی رہتی ہے۔ اس پر بھی آگے گفتگو کریں گے۔ آپؓ مدینہ منورہ میں حدیث بیان فرمایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں مشہور تابعی، جن کو بعض لوگوں نے صحابہ میں شامل کیا ہے، مروان بن حکم، مدینہ کے گورنر تھے۔ یہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے پہلے تھے۔ اپنی گورنری کے زمانے میں وہ کبھی کبھی حضرت ابو ہریرہؓ کے درس حدیث میں جا کر بیٹھا کرتے تھے۔ بعض احادیث انہوں نے سنیں اور یاد کر لیں۔ اس کے بعد گورنری سے معزول ہو کر کہیں اور چلے گئے۔ ایک طویل عرصہ کے بعد وہ خلیفہ بنے اور کچھ عرصہ بعد حج کے لئے آنا ہوا اور مدینہ منورہ میں حاضری ہوئی تو دوبارہ حضرت ابو ہریرہؓ کے درس میں جا کر بیٹھ گئے۔ ان کو خیال ہوا کہ شاید حضرت ابو ہریرہؓ سے حدیث بیان

کرتے تھے کوئی بھول چوک ہو رہی ہے؟ جو پہلے بیان کیا تھا آج اس سے مختلف بیان کر رہے ہیں۔ انہوں نے حضرت ابوہریرہؓ سے اس بارے میں کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ صرف یہ کہا کہ میں حدیث سننا چاہتا ہوں آپ ایک خاص مجلس میرے لئے بھی رکھیں۔ حضرت ابوہریرہؓ نے حامی بھر لی۔ اس پر خلیفہ نے ایک کاتب کی ذمہ داری لگائی کہ تم میری محفل میں جب حضرت ابوہریرہؓ حدیث بیان کریں تم ان کو پیچھے بیٹھ کر نوٹ کرتے رہو اور کسی کو اس کا پتہ نہ چلے۔ جب یہ خاص مجلس شروع ہوئی تو حضرت ابوہریرہؓ حدیث بیان کرتے اور کاتب لکھتے گئے۔ مروان بن حکم بعد میں اس تحریر کو اپنے ساتھ لے گئے۔

ایک سال کے بعد ان کو دوبارہ یہ ضرورت آن پڑی۔ اس موقع پر وہ اپنے ساتھ اس تحریر کو بھی ساتھ لائے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے کہا کہ وہ احادیث آپ دوبارہ بیان فرما دیجئے۔ انہوں نے وہ احادیث دوبارہ بیان کیں۔ کاتب ایک ایک کر کے چیک کرتے رہے اور معلوم ہوا کہ حضرت ابوہریرہؓ نے نہ تو ایک حرف زیادہ کیا تھا اور نہ ہی ایک حرف کم کیا تھا۔ اس پر مروان نے کہا کہ مجھے شبہ ہوا تھا کہ شاید آپ حدیث سنانے میں کچھ بھول رہے ہیں تو میں آپ کی آزمائش کرنا چاہتا تھا کہ آپ کی یادداشت میں کوئی فرق تو نہیں آیا۔ اس لئے میں نے آپ کے دونوں کا ریکارڈ چیک کیا تو درست نکلا۔ حضرت ابوہریرہؓ نے یہ سن کر فرمایا کہ ان میں ایک نقطہ کا بھی فرق نکلتا تو میں آج سے احادیث بیان کرنا چھوڑ دیتا۔ پھر غصہ کرتے اپنے مکان پر گئے۔ وہاں سے دفتر ان کو دکھائے اور کہا کہ یہ وہ ورقات ہیں جو میں نے رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے سن کر لکھے تھے۔ میں ان کو روزانہ چیک کرتا ہوں، دہراتا ہوں، یاد کرتا ہوں اور جب بھی کوئی حدیث بیان کرنے لگتا ہوں تو پہلے اس تحریر سے اپنی یادداشت کو تازہ کرتا ہوں۔

پھر آپؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کی محفل میں میری حاضری کا معاملہ یہ تھا کہ دوسرے صحابہ کرامؓ اپنے کاروبار وغیرہ کے لئے چلے جاتے، کسی کے خاندان تھے، بیویاں تھیں اور زمینیں تھیں۔ میرا آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ میں مسجد نبوی میں رہتا تھا اور اصحاب صفہ میں سے تھا۔ میرا کوئی روزگار بھی نہ تھا، ملازمت تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے آنے کے لئے کہہ دیا تو میں نے کہا۔ جب بھی آپ مسجد میں تشریف لاتے میں قریب جا کر بیٹھ جاتا تھا۔ ہر بات سنتا رہتا تھا۔ ایک دن میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ آپ جب ارشاد فرماتے ہیں تو بعض اوقات مجھے یاد نہیں

خشیت الٰہی پیدا ہو، دلوں کی نرمی پیدا ہو۔ صحیح بخاری اور حدیث کی تقریباً ہر کتاب میں آپ کو اس سے متعلق ابواب ملیں گے۔

۵) تفسیر: حدیث کی تقریباً ہر کتاب میں آپ کو تفسیر کے ابواب ملیں گے۔

۶) تاریخ اور سیر یعنی انبیاء و سابقہ اقوام کا تذکرہ اور واقعات

۷) شمائل یعنی رسول اللہ ﷺ کی اپنی عادات و خصائل۔ اس کو لوگوں نے الگ کتابوں کی شکل میں بھی محفوظ کر لیا ہے۔ شمائل ترمذی مشہور ہے۔ حدیث کی تقریباً ہر کتاب میں شمائل پر ایک باب ہوتا ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کے بارے میں، آپ کے جسمانی وجود اور شخصی محاسن و کمالات کے بارے میں، آپ کے عادات و خصائل، آپ کے لباس اور آپ کی ذات سے متعلق مختلف چیزوں کے بارے میں شمائل کے ابواب میں تفصیلات درج ہیں۔

۸) فتن یعنی آئندہ جو فتنے آنے والے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کو فتنوں سے آگاہ کیا تھا اور متنبہ کیا تھا کہ یہ راستے خطرے کے راستے ہیں ان سے بچا جائے۔ ان راستوں پر چلنے سے جن خرابیوں کے پیدا ہونے کا امکان تھا ان کی آپ نے نشاندہی فرمائی۔

۹) مناقب اور مثالب یعنی صحابہ کرامؓ کے مناقب اور فضائل، حضورؐ کے جو دشمن تھے ان کے مثالب اور ان کی کمزوریوں کی آپ نے نشاندہی فرمائی۔ اسی طرح سے آپؐ نے بعض قبائل کے مناقب بیان فرمائے۔ انصار اور قریش کے فضائل بیان فرمائے۔ مختلف اقوام کی کمزوریوں کی آپ نے نشاندہی فرمائی۔ بعض اقوام میں کوئی کمزوری ہے تو اس کی نشاندہی فرمائی تاکہ لوگ ان کی خوبیوں سے فائدہ اٹھائیں اور خرابیوں سے بچیں۔

۱۰) اشراط الساعۃ یعنی قیامت کی علامات۔ شرط علامت کو بھی کہتے ہیں۔ اگر اس کو شرط یعنی Condition کے معنوں میں لیا جائے تو یہ بھی ٹھیک ہے۔ عربی زبان میں شرط علامت کو بھی کہتے ہیں۔

بعض لوگوں نے اس کو ابواب ثمانیہ یعنی آٹھ ابواب میں تقسیم کیا ہے وہ یہ ابواب بیان کرتے ہیں۔

۱) عقائد

لوگوں کی غلط فہمی کو کس طرح دور کیا جائے کہ آئی احادیث کی حفاظت نہیں کی گئی۔

ان شاء اللہ آگے دیے ہوئے دو دن کی گفتگو سے آپ کو اس سوال کے جواب میں تمام مواد مل جائے گا اور پھر آپ کے لئے لوگوں کو سمجھانا آسان ہو جائے گا کہ یہ غلط فہمی کیوں پیدا ہوئی اور اس کا جواز کیا ہے۔

جو لوگ حدیث اور سنت میں فرق کرتے ہیں وہ دونوں کی کیا تعریف بیان کرتے ہیں؟

جو لوگ حدیث اور سنت میں فرق کرتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ حدیث سے مراد تو وہ روایت ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کے کسی قول، فعل یا حالت کی نشاندہی ہو۔ مثال کے طور پر صحیح بخاری کی پہلی حدیث ہے انما الاعمال بالنیات۔ یہ رسول اللہ ﷺ کا ایک ارشاد گرامی ہے۔ لیکن سنت سے مراد وہ طریقہ ہے جس کی آپ نے لوگوں کو تعلیم دی ہو اور جس کو آپ نے لوگوں کو سمجھایا ہو۔ مثال کے طور پر رسول اللہ ﷺ نے یہ سکھایا کہ جب رمضان کا مہینہ آتا ہے تو کیا طرز عمل اختیار کیا جاتا ہے۔ جب مسلمان پانچ وقت کی نماز ادا کرتے ہیں تو کیا کرتے ہیں۔ یہ جو مجموعی طور پر نماز کی ادائیگی کا عمل ہے یہ سنت ہے اور اس عمل کی تشریح اور توضیح کے لئے اگر کوئی انفرادی روایت آئی ہے تو وہ حدیث ہے۔ گویا حدیث تو وہ انفرادی روایت ہے اور اس کے نتیجے میں جو طرز عمل سامنے آیا ہے وہ سنت ہے۔ یہ ان لوگوں کی رائے ہے جو حدیث اور سنت کو الگ الگ قرار دیتے ہیں۔

میرے ذاتی خیال میں وہ رائے زیادہ درست ہے لیکن یہ میری شخصی رائے ہے، مجھے اپنی رائے پر زیادہ اصرار بھی نہیں۔ میرے خیال میں وہ رائے زیادہ درست ہے جس کے مطابق حدیث ایک عام لفظ ہے۔ اس میں سنت سمیت وہ ساری چیزیں شامل ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی ذات سے منسوب ہوں۔ ان میں وہ چیز بھی شامل ہے جو ثابت شدہ ہے، جس کے بارے میں تمام امت کا اتفاق ہے کہ حضورؐ سے اس کا انتساب درست ہے، جس کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں اور جس سے امت کے طرز عمل کی تشکیل ہوئی ہے وہ سنت ہے۔ جبکہ حدیث میں کچھ چیزیں ایسی بھی شامل ہو جاتی ہیں جو سنت میں شامل نہیں ہیں مثلاً ضعیف احادیث۔ محدثین نے کہا کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ حضورؐ سے اس کی نسبت کمزور ہے۔ حدیث تو یہ بھی ہے۔ چونکہ اسے حدیث کہا گیا ہے، اگرچہ ضعیف ہونے کی وجہ سے وہ سنت میں شامل نہیں

دوسرا خطبہ

علم حدیث کی ضرورت اور اہمیت

منگل [illegible] 2003ء

علم حدیث کی ضرورت اور اہمیت

علم حدیث کی ضرورت اور اہمیت پر گفتگو دو عنوانات کے تحت ہو سکتی ہے۔ ایک عنوان جس پر آج گفتگو کرنا مقصود ہے وہ علم حدیث کی عمومی ضرورت اور اسلامی علوم وفنون میں بالخصوص اور انسانی فکر کے دائرے میں بالعموم اس کی اہمیت کا مسئلہ ہے۔ دوسرا پہلو بطور ایک ماخذ قانون اور مصدر شریعت کے حدیث اور سنت کی اہمیت اور مقام ومرتبہ کا ہے۔ ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآن مجید اور سنت رسول مسلمانوں کے لئے شریعت اور قانون سازی کا اولین اور ابتدائی ماخذ ہے۔ سنت قرآن مجید کے ساتھ شریعت کا ماخذ کس طرح ہے؟ کن معاملات میں یہ ماخذ اور مصدر ہے؟ اس سے احکام کا استنباط کس طرح ہوتا ہے؟ اس پر قدرے تفصیل کے ساتھ کل گفتگو ہوگی۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے محدثین کرام کی غالب اکثریت کے نزدیک حدیث کی اصطلاح عام ہے اور سنت کی اصطلاح خاص ہے۔ سنت سے مراد وہ طریقہ یا وہ انداز اور ڈھنگ ہے جس پر کوئی انسان زندگی گزارتا ہے یا جس کے مطابق کوئی کام کرتا ہے۔ اچھے ڈھنگ کو بھی سنت کہا جاتا ہے اور برے ڈھنگ کو بھی سنت کہا جاتا ہے۔ عربی زبان میں سنت کا لفظ دونوں قسم کے انداز اور ڈھنگ کے لئے استعمال ہوا ہے۔

خود حدیث پاک میں بھی یہ لفظ انہی لغوی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک مشہور حدیث آپ نے پڑھی ہوگی: من سن فی الاسلام سنة حسنة، جس نے اسلام میں کوئی اچھی سنت پیدا کی، یعنی اچھا ڈھنگ اختیار کیا، کوئی اچھی روایت ڈالی یا اچھا طور طریقہ نکالا تو اس کو اس کا اجر ملے اور جو لوگ آئندہ اس پر عمل کریں گے ان کا اجر بھی اس کو ملتا رہے گا۔ لیکن ان کا اجر کم نہیں ہوگا۔ یہاں سنت کا لفظ اچھے طریقے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اسی حدیث کا دوسرا جملہ

سنت کی اقسام

سنت کی تین قسمیں ہیں۔ یعنی سنت ہم تک تین طریقوں سے پہنچی ہے۔ ایک طریقہ ہے رسول اللہ ﷺ کے زبانی ارشادات گرامی کا جو صحابہ کرام نے اپنی زبان سے بیان کئے اور ہم تک پہنچے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے [illegible] وانما نحن امر [illegible] الله و رسوله [illegible] یہ ایک مثال ہے سنت قولی کی۔ آپ کی زبان مبارک سے یہ قول نکلا، صحابہ نے اسی طرح یاد کر کے دوسروں تک پہنچایا۔ دوسروں نے اس کو یاد کر کے آگے منتقل کیا اور یوں یہ ارشاد گرامی ہم تک پہنچ گیا۔ یہ سنت قولی یا حدیث قولی ہے۔

سنت فعلی

سنت کی ایک قسم ہے سنت فعلی۔ یعنی صحابہ کرام نے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ یہ کرتے تھے یا فلاں موقع پر آپ نے یہ کیا۔ سنت قولی وہ ہے جو رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلنے والے الفاظ پر مشتمل ہو اور صحابہ کرام نے اسے بعینہ نقل کیا ہو۔ سنت فعلی یہ ہے کہ ایک صحابی نے حضور کو عمل کرتے دیکھا اور اپنی زبان میں اپنے الفاظ میں بعد والوں کے لئے بیان کیا۔ یہ سنت فعلی ہے۔

سنت تقریری

سنت کی تیسری قسم سنت تقریری ہے جس میں نہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی بیان ہوا ہے، نہ رسول اللہ ﷺ کا اپنا کوئی فعل یا عمل نقل ہوا ہے، بلکہ کسی دوسرے کا کوئی فعل یا عمل حضور کے سامنے ہوا اور آپ نے اس کی ممانعت نہیں فرمائی، اور اس کو جائز قرار دیا۔ یہ سنت تقریری ہے۔ اس طرح کی سنت سے بہت سے معاملات حدیث میں ثابت ہوتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ جب تشریف لائے تو عربوں میں بہت سے طور طریقے رائج تھے۔ بہت سے معاملات تھے جو عرب لوگ کیا کرتے تھے۔ ان معاملات اور طور طریقوں میں جس چیز کو رسول اللہ ﷺ نے شریعت کے خلاف

افضل ہے۔ جس نے بعد میں وضو کر کے نماز دہرائی۔ آپ نے پہلے صاحب کو جواب دیا اصبت السنة، تم نے سنت کے مطابق عمل اختیار کیا، دوبارہ نماز نہیں دہرائی۔ دوسرے صاحب سے فرمایا کہ لک الاجر مرتین، تمہیں دوہرا اجر ملے گا۔ گویا آپ نے دونوں حضرات کے اس نقطۂ نظر کو پسند فرمایا اور جائز قرار دیا۔ اس لئے اب یہ سنت ہو گئی۔ سنت سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ جس شخص کو پانی دستیاب نہ ہو اور وہ وضو کے بجائے تیمم کر کے نماز پڑھ لے تو یہ کافی ہے۔ دوبارہ پانی ملنے کے بعد دوبارہ نماز ضروری نہیں۔ لیکن اگر کوئی پڑھ لے تو اس کو دوہرا اجر ملے گا۔ اس طرح کے اور بھی بہت سے واقعات احادیث میں ملتے ہیں۔ حدیث میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ سنت تقریری سے کوئی چیز کیسے ثابت ہوتی ہے؟ ان مثالوں سے اس کا اندازہ ہو جائے گا۔

قرآن میں سنت کی سند

اس دور میں بعض حضرات کو یہ خیال ہے جو کہ بہت بڑی گمراہی ہے اور اسلام کے بنیادی تصور کے خلاف ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں اور دوسروں کو بھی یہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ جو چیز سنت کی صورت میں مسلمانوں کے پاس اس وقت موجود ہے اس کی کوئی سند یا کوئی اعتبار قرآن پاک میں موجود نہیں ہے۔ یہ نہ صرف ایک بہت بڑی گمراہی ہے بلکہ ایک بہت بڑی غفلت سے عبارت بات بھی ہے۔ اگر صرف قرآن مجید یا کوئی تحریری ہدایت نامہ ہدایت کے لئے کافی ہوتا تو اللہ تعالیٰ کو انبیاء بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔ آسمانی کتابیں اتار دی جاتیں اور اسی پر اکتفا کیا جاتا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوا۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء بھیجے گئے جن میں سے کچھ پر کتابیں بھی نازل کی گئیں۔ کتابوں کی تعداد چند درجن ہے۔ ایک روایت میں ایک سو چار (۱۰۴) کتابوں کی تعداد بیان ہوئی ہے۔ ایک دوسری روایت سے تین سو چودہ (۳۱۴) کتابوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن انبیاء کرام کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار کے قریب ہے۔ گویا اصل چیز نبی اور پیغمبر ہے۔ کتاب کا اترنا یا نہ اترنا یہ اللہ کی مشیت پر ہے۔ جب مناسب سمجھا اس نے کتاب نازل فرمائی اور جب مناسب نہیں سمجھا کتاب نازل نہیں فرمائی۔ اس لئے نبی اور پیغمبر کو اور ان کی رہنمائی کو کتاب سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ خود کتاب اللہ یعنی اللہ کی کتاب قرآن مجید میں درجنوں مقامات پر وہ آیات موجود ہیں جن میں حکمت کا تذکرہ

آگے بیان کیا جا رہا ہے، جن میں پیغمبر کی سنت اور اس کی تفسیر و تشریح کو قرآن مجید کے سمجھنے اور اس پر
عمل درآمد کے لئے لازمی قرار دیا گیا ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "الا انی اوتیت
القرآن ومثله معه" یاد رکھو مجھے قرآن مجید بھی دیا گیا اور اس کے ساتھ اتنا ہی اور بھی بہت کچھ دیا
گیا ہے۔ قرآن سے ملتی جلتی اور بھی بہت سی ہدایات اور رہنمائی عطا فرمائی گئی ہے۔ لہٰذا یہ دونوں
قسم کی رہنمائی، جس کی مزید تفصیل ہم آگے چل کر دیکھیں گے، اللہ کی طرف سے رسول علیہ الصلوٰۃ
والسلام کو عطا ہوئی۔

ایک روایت میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر نزول وحی کم و بیش چوبیس ہزار مرتبہ ہوا۔
بظاہر یہ چوبیس ہزار مرتبہ اگر وحی نازل ہوئی ہو اور قرآن پاک کی ایک ایک آیت ایک مرتبہ بھی نازل
ہو، اگرچہ بعض مرتبہ لمبی لمبی سورتیں ایک ہی مرتبہ کی وحی میں نازل ہوئیں، سورۃ انعام پوری ایک
ہی وقت میں نازل ہوئی۔ سورۃ یوسف پوری ایک وقت میں نازل ہوئی۔ بہت سی سورتیں اکثر چھوٹی
چھوٹی ایک ایک وقت میں نازل ہوئیں تو اس سے زیادہ سے زیادہ چار پانچ ہزار مرتبہ کر کے پورا
قرآن مجید نازل ہو سکتا تھا۔ یہ چوبیس ہزار مرتبہ وحی نازل ہونے کا کیا مفہوم ہے؟

امام ابوداؤد نے اپنی کتاب سنن میں روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر جبرئیل امین
قرآن لے کر بھی اترتے تھے اور سنت لے کر بھی نازل ہوتے تھے۔ "کان ینزل جبریل علیه الصلوٰة
والسلام ینزل علی رسول الله ﷺ بالسنة کما ینزل علیه بالقرآن" جبرئیل امین سنت لے
کر بھی اسی طرح اترتے تھے جس طرح کہ قرآن مجید لے کر اترتے تھے۔ "ویعلمه ایاہ کما
یعلمه القرآن" اور جیسے آپ کو قرآن سکھایا کرتے تھے اسی طرح سنت بھی سکھایا کرتے تھے۔ اس
سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ چوبیس ہزار مرتبہ جو نزول وحی ہوا اس میں قرآن پاک کے ساتھ
ساتھ سنت کا نزول بھی شامل ہے۔ اور جبرئیل امین نے سنت کے بہت سے امور بھی رسول اللہ ﷺ
کو سکھائے۔

اس لئے علم حدیث جو سنت کا سب سے اہم، بلکہ سب سے بڑا مصدر ہے اس کی
اہمیت اسی لئے بہت بڑھ جاتی ہے اور اس کی ضرورت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ علم سنت کو بیان
کرتا ہے۔ سنت کی تفصیلات علم حدیث کے ذریعے ہم تک پہنچتی ہیں۔ سنت کا تحفظ اور سنت کی بقا
کی ہر کاوش مسلمانوں کے لئے اسی طرح لازمی ہے اور بہت اونچی فضیلت رکھتی ہے جس طرح

قرآن مجید کا تحفظ اور اس کی بقا کی کاوش ہے۔ قرآن مجید کی حفاظت کا تو اللہ نے وعدہ لیا ہے انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون۔ لیکن اس وعدے کی جزوی تطبیق سنت پر بھی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ یہاں ذکر کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ذکر میں قرآن مجید شامل ہے۔ لیکن ذکر یعنی یاد دہانی اسی وقت یاد دہانی ہو سکتی ہے جب اس کا مفہوم سامنے ہو۔ اگر کوئی یاد دہانی ہو لیکن اس کا مفہوم کسی کی سمجھ میں نہ آئے۔ مثلاً کوئی شخص آپ کو کسی پرانی زبان میں یاد دہانی کا خط بھیج دے، پرانی سریانی یا رومن یا لیٹن زبان میں آپ کو خط لکھے اور آپ کو وہ زبان نہ آتی ہو تو یاد دہانی بے معنی ہے۔ یاد دہانی اسی وقت بامعنی ہوگی جب آپ کی سمجھ میں آئے۔ اس لئے اگر قرآن مجید کی تشریح اور توضیح موجود نہیں ہے تو یاد دہانی اور اس کے اثرات محدود ہو جاتے ہیں۔ اس لئے یاد دہانی کو برقرار رکھنے کے لئے جہاں اس کے متن کا تحفظ ضروری ہے وہاں اس کی تشریح و تعبیر کا تحفظ بھی ضروری ہے۔ اور وہ تشریح و تعبیر کا تحفظ سنت کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے امت مسلمہ کو تلقین فرمائی کہ سنت کے تحفظ اور بقا کے لئے بھی اسی طرح کوشش کریں جیسے قرآن پاک کے تحفظ اور بقا کے لئے کرتے ہیں۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا: المتمسک بسنتی عند فساد امتی لہ اجر شہید، کہ وہ شخص جو میری سنت کا دامن پکڑے ہوئے ہے، اس وقت جب میری امت فساد کا شکار ہو تو اس کے لئے شہید کا اجر ہے۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ لہ اجر مائۃ شہید، یعنی اس کو سو شہیدوں کا اجر ملے گا۔ سو شہیدوں کا اجر اس لئے ملے گا کہ ایک شہید جس مقصد کے لئے جان قربان کرتا ہے وہ کیا ہے؟ وہ اسلام کی بقا اور اسلام کا تحفظ ہے، امت مسلمہ کا تحفظ ہے۔ اگر خدانخواستہ سنتیں مٹ رہی ہوں، حدیث ختم ہو رہی ہو تو پھر امت مسلمہ کا وجود دینی بنیادوں پر باقی نہیں رہ سکے گا۔ تو جن مقاصد کی خاطر شہید اپنی جان قربان کرتا ہے سنت کا تحفظ کرنے والا انہی مقاصد کو دوسرے انداز سے حاصل کرتا ہے۔ اس لئے اس کو ایک شہید یا سو شہید کا اجر ملے گا۔ مختلف اسباب اور نیتوں کے لحاظ سے دونوں اپنے اپنے اجر کے مستحق ہوں گے۔

امام شافعی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ علماء حدیث اور علماء سنت کی اپنے اپنے علاقے اور زمانے میں وہی حیثیت ہے جو صحابہ کرام اور تابعین کی اپنے دور میں تھی۔ صحابہ کرام اور تابعین کو ان کے دور میں عزت و احترام کا مقام کیوں حاصل تھا؟ اس لئے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی دی

ہوئی رہنمائی لوگوں تک پہنچا رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات ان کے ذریعے لوگوں تک پہنچ رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی سنت کا علم ان کے ذریعے پھیل رہا تھا۔ لہٰذا آج اگر ایک صاحب علم جو حدیث اور سنت کا علم رکھتا ہو اور اس کے ذریعے یہ علم لوگوں تک پہنچا رہا ہو تو گویا وہ وہی کردار ادا کر رہا ہے جو صحابہ کرامؓ اور تابعین اپنے زمانے میں ادا کیا کرتے تھے۔ اسی لئے امام شافعیؒ نے ایک جگہ فرمایا ہے کہ اہل الحدیث فی کل زمان کالصحابة فی زمانهم کہ علمائے حدیث کی ہر زمانے میں وہی حیثیت ہوگی جو صحابہ کرامؓ کی اپنے زمانے میں تھی۔ ایک جگہ انہوں نے فرمایا کہ اذا رأیت صاحب حدیث فکانی رأیت احدا من اصحاب الرسول ﷺ اگر میں حدیث کے کسی عالم کو حدیث بیان کرتے ہوئے دیکھوں، اور خود امام شافعیؒ ان میں شامل تھے، تو گویا میں نے رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابی کو دیکھا جو علم حدیث بیان کر رہے تھے۔

یہ حدیث اور سنت کی دینی اور اساسی اہمیت اور ضرورت ہے۔ اس پر ایک دوسرے نقطہ نظر سے بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ وحی الٰہی جو قرآن پاک کی شکل میں ہمارے پاس ہے، اس میں بنیادی ہدایات اور کلیات بیان ہوئی ہیں جن میں سے بعض کا ذکر ہم ابھی کریں گے۔ لیکن ان ہدایات کا جو کتاب الٰہی میں بیان ہوئی ہیں جب تک مکمل تشکل نہ ہو اس وقت تک ان ہدایات پر عمل درآمد بڑا دشوار ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ حدیث اور سنت کی رہنمائی کے بغیر ان ہدایات پر عمل درآمد ممکن نہیں ہے تو شاید غلط نہیں ہوگا۔

حدیث کے مقابلہ میں دیگر مذاہب کے صحائف کی حیثیت

سابقہ آسمانی کتابوں کو دیکھیں۔ آج حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ناپید ہے۔ ان پر اتارے جانے والے صحیفے ناپید ہو گئے۔ ان کے ارشادات ہمارے علم میں نہیں ہیں۔ ان کی سنت کے بہت معمولی اور منتشر آثار ہیں جو اس لئے محفوظ ہو گئے کہ رسول اللہ ﷺ کی شریعت میں وہ شامل ہو گئے۔ عرب میں ان کا رواج تھا اور رسول اللہ ﷺ نے اللہ کے حکم سے ان کو شریعت کا حصہ بنا دیا۔ اس لئے وہ آج محفوظ ہیں ورنہ وہ آثار بھی محفوظ نہ رہتے۔

حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ماننے والے آج کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ ان کی ایک ریاست بھی موجود ہے جس کے پاس بڑے بڑے وسائل ہیں۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ

اس نے ترجمہ کر کے چھوڑ دیا۔ وہ ترجمہ ڈھائی سو سال بعد کہیں سے دریافت ہوا اور اس غیر مستند ترجمے کے یہ سارے ترجمے ہیں جو آج عہد نامہ جدید کی شکل میں کتابوں کی صورت میں موجود ہیں۔ یہ اناجیل اربعہ کی تاریخی حیثیت ہے۔

اس کے مقابلہ میں آپ دیکھیں سنت رسول اللہ ﷺ کو، جس کی تفصیل میں آگے چل کر مزید بیان کروں گا، اگر آج میں آپ سے یہ بیان کروں کہ یہ حدیث مبارک جو ابھی میں نے پڑھی إنما الاعمال بالنیات و إنما لکل امرئ ما نوی میں آپ سے بیان کر سکتا ہوں کہ مجھ سے یہ حدیث کس نے بیان کیا۔ اس سے کس نے بیان کی اور میں رسول اللہ ﷺ تک پوری سند آپ کو سنا سکتا ہوں۔ اور ان شاء اللہ آخری دن میں تبرک کے طور پر بیان بھی کروں گا، پوری سند میں آپ کے سامنے بیان کر دوں گا کہ صحاح ستہ کی احادیث میں کس روایت سے بیان کرتا ہوں۔ مسلمانوں کے علاوہ دنیا میں کسی اور کے پاس ایسی کوئی چیز موجود نہیں۔ دنیا کے لئے یہ بات ناقابل تصور ہے کہ ایسی کوئی چیز بھی ہو سکتی ہے؟ حضرت عیسیٰ تو بہت پہلے تھے، آج سے سو دو سو سال پہلے کے کسی آدمی کا بیان ایسی سند کے ساتھ موجود نہیں کہ سند میں شامل ہر آدمی ایک تاریخی وجود رکھتا ہو اور آپ کو اختیار ہو کہ ہر ایک کے بارے میں پوچھیں کہ یہ آدمی کون تھا؟ اور میری ذمہ داری ہو کہ میں تاریخ سے ثابت کروں کہ یہ فلاں صاحب تھے، فلاں جگہ پیدا ہوئے تھے یہ ان کا نام تھا اور یہ ان کا کارنامہ ہے۔ یہ چیز دنیا میں کسی کے پاس نہیں ہے۔ یہ صرف مسلمانوں کے پاس ہے۔

کتاب الٰہی اور ارشادات انبیاء میں بنیادی فرق

اب وحی الٰہی کی طرف آتے ہیں۔ وحی الٰہی کا ایک خاص اسلوب ہے۔ قرآن مجید میں بھی یہ اسلوب ہے، توراۃ میں بھی یہ اسلوب ملتا ہے، جو حصے توراۃ کے مستند باقی رہ گئے۔ اور جس حد تک انجیل میں استناد پایا جاتا ہے۔ انجیل میں بھی یہ بات موجود ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی باتوں کو عمومی انداز میں بیان فرماتے تھے۔ کتاب الٰہی کے عمومی اصول ہوتے تھے۔ کتاب الٰہی میں عملی تفصیلات اور روزمرہ کے احکام نہیں ہوتے۔ اگر ایسا ہوتے تو کتاب الٰہی کی کم از کم سو جلدیں ہوں۔ قرآن مجید کی سو جلدیں ہوتیں اگر یہ سب یعنی قرآن مجید میں لکھا جاتا کہ نماز میں رفع

یہاں ہاتھ رکھو، رفع یدین کرو یا مت کرو، نماز میں کیا پڑھو، کیسے پڑھو۔ صرف نماز کے احکام
اگر قرآن پاک میں لکھے جاتے تو موجودہ قرآن پاک سے شاید دس گنا زیادہ اس کی جلدیں بن
جاتیں۔ پھر لوگ اس کو دیکھتے رکھتے اور سمجھتے نہیں۔ اسی لئے قرآن مجید کا اسلوب یہ ہے کہ اس
میں عمومی ہدایات اور کلی اصول بیان کئے گئے ہیں۔ ایسے ہی کلی اصول تورات میں بھی تھے، یہی
کلی اصول انجیل میں ہیں۔ یہی سب کتابوں میں ہیں۔

اب اللہ کی سنت یہ رہی ہے کہ ان اصولوں کے دینے کے ساتھ ساتھ انبیاء علیہم السلام کو
دنیا میں بھیجا کہ ان کی سنت کو دیکھتے جاؤ اور عمل کرتے جاؤ۔ اگر کتاب الٰہی میں لکھا ہوا ہے کہ عدل
و انصاف سے کام لو تو جو ان کا طرز عمل ہے وہ عدل و انصاف ہے، اسی کے مطابق کام شروع
کر دو۔ اگر اس میں لکھا ہوا ہے کہ اللہ کی عبادت کرو تو جیسے یہ عبادت کرتے ہیں ویسے عبادت
شروع کر دو۔ اس طرح سے کتاب الٰہی کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملہ انبیاء علیہم السلام کے
سالہا سال کی سنتوں کے نتیجے میں سامنے آتا ہے۔ وہ ایک زندہ پائندہ نمونہ ہے۔ لوگ اس کو دیکھتے
جائیں اور کتاب الٰہی پر عمل درآمد کرتے جائیں۔

سنت: وحی الٰہی کا عملی نمونہ

سابقہ انبیاء علیہم السلام کی قوموں نے ان کی سنتوں کو بھلا دیا۔ نتیجتاً ان کی تعلیمات کا جو
کچھ باقی رہ گیا تھا اس کو بھی بھلا دیا اور یا ختم کر دیا۔ اب صورت یہ ہے کہ ان کے پاس صرف چند
علامات ہیں۔ عمل درآمد نہیں ہے۔ میں ایک مثال آپ کو دیتا ہوں۔ عیسائیوں کے بارے میں
آپ نے سنا ہوگا وہ کہتے ہیں کہ ہمیں دو اصولوں کی تعلیم دی گئی ہے اور ہم دو ہی اصولوں کے
علمبردار ہیں۔ عدل و انصاف اور انسانیت سے محبت۔ عیسائیوں کی کتابوں میں آپ نے پڑھا
بھی ہوگا اور دیکھا بھی ہوگا۔ لیکن یہ بات کہ انسانیت سے محبت سے کیا مراد ہے؟ اس پر عمل درآمد کیسے کیا
جائے گا؟ عدل و انصاف کی تعریف کیا ہے؟ اس کے کیا تقاضے کیا ہیں؟ جب تک کوئی تفصیل کر کے
لوگوں کی رہنمائی نہ کی جائے کہ عدل کس کو کہتے ہیں؟ اس وقت تک عدل کا نعرہ بے معنی ہے۔ میں
پوری زندگی تقریر یہ کرتا رہوں کہ عدل ہونا چاہئے۔ میری زندگی میں عدل ہو نہ آپ کی زندگی
میں عدل ہو تو یہ تقریر بے معنی ہے۔ یہ بات کہنے میں تو بہت اچھی لگتی ہے کہ کوئی تمہارے دائیں
گال پر تھپڑ مارے تو تم بائیں گال بھی سامنے کر دو۔ کہنے کو تو بڑی اچھی بات ہے لیکن اس کا عمل

ایک مثال میں عرض کرتا ہوں۔ قرآن پاک میں ہے اقیموا الصلوٰۃ اور درجنوں نہیں سینکڑوں جگہ آیا ہے کہ نماز قائم کرو۔ لیکن کہیں بھی نماز کی تفصیل بیان نہیں کی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے نماز کے احکام اور طریقہ کار کو بیان فرمایا اور آپ اس تفصیل میں نہیں گئے کہ یہ فرض ہے، اور یہ واجب ہے۔ آپ نے صرف اتنا کہنے پر اکتفا فرمایا کہ صلوا کما رأیتمونی اصلی جس طرح مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو اسی طرح نماز پڑھنی شروع کردو۔ صحابہ نے اسی طرح نماز پڑھنی شروع کردی۔ صحابہ نے آنے والے تابعین کو سکھایا، تابعین نے تبع تابعین کو سکھایا اور ہر دور میں فقہائے اسلام اور محدثین اور مفسرین قرآن نماز کے احکام کی تفصیلات بیان کرتے رہے۔ آج مسلمان اربوں کی تعداد میں نماز ادا کررہے ہیں۔ کروڑوں کی تعداد میں مسلمان باقاعدہ نماز پڑھتے ہیں۔ اگر آپ کو یہ جاننے کا شوق ہو کہ کس دور میں مسلمان نماز کس طرح پڑھتے تھے تو اس دور کی کوئی کتاب، فقہ کی، حدیث کی یا تفسیر کی دیکھ لیں، معلوم ہوجائے گا کہ مسلمان بارہویں صدی ہجری میں ایسے کرتے تھے۔ ساتویں صدی ہجری میں ایسے کرتے تھے۔ نویں صدی ہجری میں ایسے کرتے تھے۔ اگرچہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ آج جس طرح کررہے ہیں یہ تواتر سے ثابت ہے۔ لیکن مزید چیک کرنا چاہیں تو یہ سارا ذخیرہ موجود ہے اس کو چیک کیا جاسکتا ہے۔ یہ چوتھا تعامل ہے جو قرآن مجید کے تسلسل کے لئے ضروری ہے۔

۵ پھر جس ماحول اور جس سیاق وسباق میں قرآن مجید نازل کیا گیا اس ماحول اور سیاق وسباق کی پوری تفصیل موجود ہے اور یہ حدیث کی صورت میں ہمارے سامنے آئی ہے۔ سیرت اور حدیث کے ذخائر میں وہ پورا ماحول، اس کی منظر کشی اور نقشہ کشی کرکے ہمارے سامنے رکھ دی گئی جس میں قرآن مجید نازل ہوا۔ جب حدیث کا ایک طالب علم حدیث کی کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے، سیرت کا طالب علم سیرت کی تفصیلات پڑھتا ہے تو اس کے سامنے چشم تصور میں وہ سارا منظر منتقل ہوکر آجاتا ہے جس منظر میں قرآن پاک نازل ہوا، جس پس منظر اور پیش منظر میں قرآن پاک کے احکام وہدایات پر عملدرآمد شروع ہوا اور جن چیزوں کا بظاہر قرآن پاک یا حدیث پاک کے سمجھنے سے کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا وہ تفصیلات بھی صحابہ کرام نے بیان کردیں اور ان کو محفوظ رکھا گیا۔

حدیث کی اقسام پر آگے چل کر بات ہوگی، لیکن ابھی ضمناً ایک بات عرض

انسان کی شخصیت کی تفصیلات کو محفوظ رکھنے کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔

ے: انسان کے حاشیۂ خیال میں وہ امکانات اور تفصیلات نہیں آسکتیں جو سیرت کے واقعات کو محفوظ رکھنے کے لئے کی گئیں۔ زیادہ تفصیلات بیان کرنے کا موقع نہیں لیکن ایک چھوٹی سی مثال عرض کرتا ہوں۔

عربوں کے دل میں اللہ تعالیٰ نے یہ ذوق ، جو بظاہر ہمارے خیال میں اسی لئے ڈالا کہ سیرت کے واقعات محفوظ رکھے جائیں ، کہ اپنے قبائل اور برادریوں کے نسب کو محفوظ رکھیں۔ علم الانساب ان کے ہاں ایک باقاعدہ فن تھا۔ اس پر درجنوں کتابیں آج بھی موجود ہیں۔ علم الانساب کے نام سے ان موضوعات پر کتابیں لکھی گئیں کہ عرب قبائل کا نسب کیا تھا؟ کون کس کا بیٹا تھا، کس کا پوتا تھا، کس کا داماد تھا، کس کی شادی کہاں ہوئی، کس کی کتنی اولادیں تھیں، کس قبیلے کی آپس میں کیا رشتہ داریاں تھیں۔ ان موضوعات پر درجنوں کتابیں آج بھی دستیاب ہیں جو لوگوں نے وقتاً فوقتاً لکھیں۔

اب کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ عربوں کو ان موضوعات سے دلچسپی تھی، اس لئے ان کو ان چیزوں پر معلومات جمع کرنے کا شوق تھا، اس لئے انہوں نے انساب پر کتابیں لکھ دیں۔ بہت سے لوگ اپنے شوق کے لئے کتابیں لکھ دیتے ہیں، اس لئے ان لوگوں نے بھی لکھ دیں۔ لیکن محض یہ کہنا کافی نہیں ہے۔ جب ہم انساب کی ان کتابوں کا جائزہ لیتے ہیں اور ان کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایک عجیب وغریب بات سامنے آتی ہے، بہت عجیب وغریب۔ اتنی عجیب وغریب کہ اس کو محض اتفاق نہیں کہا جا سکتا۔ وہ عجیب وغریب بات یہ سامنے آتی ہے کہ جتنی معلومات محفوظ ہوئیں وہ مرکوز ہیں رسول اللہ ﷺ کی شخصیت پر، حالانکہ جس وقت سے محفوظ ہونا شروع ہوئیں اس وقت تو حضور پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ چالیس سال تک کسی کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں تھا کہ یہ نبی ہوں گے اور نبوت کا سلسلہ اس طرح چلے گا اور پھر ایک امت قائم ہوگی اور اس امت میں علوم وفنون کے بہت سے سلسلوں میں سے ایک سلسلہ یہ چلے گا کہ انساب کے بارے میں یہ معلومات جمع کی جائیں گی، یہ تو کبھی کسی کے تصور میں بھی نہیں آیا تھا۔ لیکن عربوں نے اپنے طور پر جو معلومات جمع کیں اور جو بعد میں کتابی شکل میں مدوّن ہوئیں اور آج جس طرح ہم تک پہنچیں، وہ سب رسول اللہ ﷺ کی شخصیت مبارکہ پر مرکوز ہیں۔ جس طرح ایک سرچ لائٹ ہوتی ہے، آپ پانچ ہزار واٹ کے ایک بلب سے روشنی کسی ایک نقطہ پر ڈالیں تو جس طرح سے وہ نقطہ چمکے گا اور

ذیک ایک گوشہ اس کا روشن ہو جائے گا۔ اسی طرح سے رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارک کا ایک ایک گوشہ محفوظ ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے لے کر آپ کے بیسیوں بیسیوں جد امجد عدنان تک اہم اور بنیادی امور سے متعلق ہر ایک چیز محفوظ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی دادیاں کون تھیں، نانیاں کون تھیں، پھوپھیاں کون تھیں۔ یہ سب معلومات علم انساب کی کتابوں میں ملیں گی۔ مثال کے طور پر میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ کی دادی کا نام کیا تھا تو شاید آپ بتا دیں۔ آپ میں سے اکثر بتا دیں گے۔ اگر میں یہ پوچھوں کہ دادی کی دادی کا کیا نام تھا تو شاید آپ میں سے دس فیصد بتا سکیں اور اگر میں پوچھوں کہ دادی کی دادی کی دادی کا کیا نام تھا تو شاید ہم میں سے کوئی بھی نہ بتا سکے۔ کم از کم میں تو نہیں بتا سکتا۔ اسی طرح میری یا آپ کی نانی کا کیا نام تھا، سب بتا دیں گے۔ نانی کی نانی کا نام شاید دو چار بتا سکیں۔ نانی کی نانی کی نانی کا کیا نام تھا شاید کوئی بھی نہیں بتا سکتا۔

رسول اللہ ﷺ کے بارے میں یہ عجیب و غریب بات ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اجداد، آپ کی دادیاں، آپ کی نانیاں، آپؐ کے نانا اور آگے آپؐ کی پھوپھیاں اور آگے آپؐ کے چچا اور آگے ہر ایک کی تفصیلات بیسیوں بیسیوں اور تیس تیس نسلوں تک محفوظ ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی محفوظ نہیں ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ کی محفوظ نہیں ہیں۔ ابوجہل، ابولہب کی محفوظ نہیں ہیں، خالد بن ولیدؓ کی محفوظ نہیں ہیں۔ یہ اسلام سے پہلے عرب کے بڑے بڑے لوگ تھے، انہی کا چرچا تھا۔ ان میں سے کسی کے بارے میں اس طرح کی معلومات محفوظ نہیں رہیں۔ جو محفوظ رہ گئیں وہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں محفوظ رہ گئیں۔

اس لئے میں یہ سمجھتا ہوں۔ اور میرا خیال ہے کہ میں حق بجانب ہوں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص مشیت سے عربوں کے دل میں یہ ڈالا کہ وہ نسب محفوظ رکھیں اور جس نسب کو عربوں نے زیادہ اہتمام کے ساتھ محفوظ رکھا یہ وہ تھا جس کا رشتہ رسول اللہ ﷺ سے بالواسطہ یا بلاواسطہ ملتا تھا۔

سیرت کے واقعات کے محفوظ رکھے جانے کی ایسی ایسی مثالیں ہیں کہ جن کی تفصیلات میں اگر میں جاؤں تو گفتگو موضوع سے آگے نکل جائے گی۔ رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے۔ مسجد نبوی میں ایک ستون سے ٹیک لگا کر خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ آج بھی وہ جگہ محفوظ ہے۔ اس کو اسطوانہ حنانہ کہتے ہیں۔ اس کے بعد جب صحابہ کی تعداد بڑھنے لگی تو کسی نے تجویز پیش کی کہ

کوئی بلند جگہ ہو جس پر قیام فرما کر آپ وہاں سے خطبہ ارشاد فرمایا کریں۔ اس غرض کے لئے ایک صحابی نے منبر ڈیزائن کیا جس پر آپ بیٹھ بھی سکیں اور اگر کھڑے ہونا چاہیں تو کھڑے بھی ہو سکیں۔ چنانچہ وہ منبر بنا کر لے آئے۔ اب یہاں اتنا کافی ہے۔ مختصر معلومات اور روایات کے لئے اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ تفصیلات کہ یہ منبر کس لکڑی کا تھا، وہ منبر کس نے بنایا تھا، اس کا سائز کیا تھا، اس کا ڈیزائن کیا تھا، وہ لکڑی کس جگہ کی تھی، کس جنگل سے کاٹ کر لائی گئی تھی، کیسے بیٹھ کر منبر بنا لیا، ان پر لوگوں نے معلومات جمع کیں اور کتابیں لکھیں۔ ادب سیرت پر جو قدیم ذخیرہ ہے اس میں تقریباً جتنی کتابوں کا تذکرہ ملتا ہے جو منبر کے ڈیزائن اور اس کے بارے میں تیار ہوئیں۔ رسول اللہ ﷺ جو نعلین استعمال فرماتے تھے نعلین مبارک، ان کی شکل کیسی تھی، وہ چمڑے کا تھا، کس چیز کا تسمہ لگا تھا، کون بناتا تھا، کس سے خریدتے تھے، نعلین مبارک ٹوٹ جاتا تو کس سے مرمت کراتے تھے، اس پر کتابیں موجود ہیں اور ایک چھوٹا رسالہ اردو میں بھی دستیاب ہے۔ یہ اس شخصیت سے محبت کا تقاضا ہے جو شخصیت حامل قرآن اور مبلغ قرآن ہے، جس کے ذریعے قرآن ہم تک پہنچا۔

۸۔ وہ علوم جو رسول اللہ ﷺ کی شخصیت سے متعلق ہیں مثلاً علم سیرت۔ ارشادات اور سنت اور عمل سے متعلق تو سنت اور حدیث ہوگئی لیکن آپ کی ذات سے متعلق، آپ کی شخصی اور جسمانی حالات اور واقعات سے متعلق ان کی وضاحت اگر بیان کیا جائے تو اس کے لئے سیرت اور آپ کی عمر کا کافی ذخیرہ ہے۔ لوگ شخصیت سے جس طرح سے تحقیق کرتے آ رہے ہیں، اس کے نتیجہ میں جو نئے نئے معاملات اور مسائل سامنے آتے ہیں ان کو صرف ایک ہی سبب معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے تحفظ کے لئے سنت کا تحفظ فرمایا، سنت کے تحفظ کے لئے صاحب سنت کا تحفظ فرمایا، صاحب سنت کی سیرت کے تحفظ کے لئے ہر وہ چیز جو بالواسطہ یا بلاواسطہ اس سے متعلق تھی وہ محفوظ کر لی گئی۔

۹۔ پھر رسول اللہ ﷺ کے براہ راست مخاطبین تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے مخاطبین اور ہمراہیوں یعنی صحابہ کرامؓ کے حالات محفوظ رکھے گئے۔ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ بائیس ہزار صحابہ کرامؓ کے حالات محفوظ اور موجود ہیں۔ اور جو صحابی جتنے قریب تھے ان کے حالات اسی قدر تفصیل اور وضاحت کے ساتھ محفوظ ہیں۔ انسان اپنے دوستوں کے ذریعے پہچانا جاتا ہے۔ یہ

حاصل نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس پورے سلسلۂ گفتگو میں ایک بحث اور پیدا ہوئی جس میں ایمان کی
نوعیت پر ذرا فلسفیانہ انداز سے غور شروع ہوا۔ زیادہ گہرائی میں جا کر غور ہوا۔ اس سے علم کلام
پیدا ہوا۔

یہ بات بڑی بنیادی اہمیت رکھتی ہے کہ جن اہل علم نے سب سے پہلے کلامی اور
فلسفیانہ نوعیت کے یہ سوالات اٹھائے وہ اصلاً محدثین تھے۔ مثال کے طور پر امام بخاری، امام احمد
بن حنبلؒ اور دوسرے محدثین نے ان سوالات سے بحث کی کہ کلام الٰہی قدیم ہے کہ حادث ہے۔ یہ
خالص عقلی اور فلسفیانہ مسئلہ ہے۔ لیکن امام احمد بن حنبلؒ نے یہ مسئلہ اٹھایا اور بہت کچھ کہا۔ ان
مثالوں سے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ علم حدیث نے مزید وسعت سے ایک نیا رجحان
مسلمانوں کے علوم وفنون میں پیدا کیا۔ اور اسلامی عقائد کی تعبیر، اسلامی عقائد پر اعتراضات کا
عقلی انداز سے دفاع کرنے کی کوشش ایک نئے علم کی تشکیل پر منتج ہوئی جس کو علم کلام کہتے ہیں۔
جس میں مسلمانوں نے بڑے غیر معمولی کارنامے انجام دیے۔

اس وقت علم کلام کی تاریخ میں جانا مقصود نہیں۔ لیکن متکلمین اسلام نے مسلمانوں کو اس
گمراہی سے محفوظ رکھا جس گمراہی کا بڑے بڑے لوگ شکار ہوئے اور بڑے بڑے مذاہب اس
گمراہی میں مبتلا ہو گئے۔ ہر مذہب میں ایک خلیج پیدا ہو گئی کہ معاملات میں اصل چیز انسانی
عقل ہے یا وحی الٰہی ہے؟ مذہب اصل ہے یا عقل؟ بالفاظ دیگر انسان کے لیے ضابطۂ زندگی کی
تشکیل میں وحی الٰہی فیصلہ کن ہے یا عقل کو فیصلہ کرنے کا حق اختیار حاصل ہے؟ کچھ لوگوں نے یہ
کہا کہ عقل ہی معاملات میں فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔ ایسا کہنے سے مذہب کا دامن ہاتھ سے چھوٹ
گیا۔ جیسے مغرب میں ہوا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ اصل فیصلہ کن عامل مذہب ہے۔ اس سے مذہب
کو تو کچھ زندگی مل گئی لیکن عقلیات کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا اور بالآخر مذہب بھی ختم ہو گیا۔
جیسے ہندو مت ختم ہو گیا اور دیگر پرانے مذاہب ختم ہو گئے۔ متکلمین نے دونوں کو ایک ساتھ جوڑا۔
متکلمین نے نقل کے رشتے کو دینی معاملات سے برقرار رکھا، دونوں کے تقاضے نبھائے۔
اور دینی معاملات کی عقلی تعبیر پیش کی۔ ان دونوں میں وہ توازن پیدا کیا کہ مسلمانوں میں بیک
وقت عقلی مسئلے بھی جاری رہے اور نقلی مسئلے بھی۔ جن نقلی مسائل پر جو علم تھے وہ بھی جاری
رہے۔ اور ان دونوں میں کوئی تعارض پیدا نہیں ہوا۔ یہ علم کلام بھی علم حدیث کی دین ہے۔

نقلی اور عقلی علوم جتنے ہیں یہ سارے کا سارا علم حدیث کی دین ہے۔ علم حدیث اور سنت میں جو احکام بیان ہوئے ہیں ان سے اصول فقہ کا علم نکلا ہے۔ اس سے پہلے کسی نے اس طرح کی تق کر مسلمانوں کی طرح ہے اور Disciplines کے دو عظیم الشان نمونے ہیں۔ ایک علم حدیث اور دوسرا علم اصول فقہ۔

علم حدیث ایک ایسا ادبی اور تجربیت کا نمونہ ہے کہ جس میں معلومات اور اطلاعات کی صحت پر زور دیا گیا ہے اور اصول فقہ ایک منطق اور عقلیت کا نمونہ ہے جس میں تمام مسائل پر غور کے لئے نئے تصورات و نظریات سامنے آئے جو معاملات کی بنیاد ہیں۔ علم اصول فقہ نے علم کلام سے کہیں زیادہ عقل و نقل کے درمیان تطبیق پیدا کی ہے اور عقل اور نقل کے درمیان توازن پیدا کیا ہے۔ اس توازن و اعتدال اور جامعیت کی مثال دنیا کی کسی قوم کے مذہب یا علمی روایت میں نہیں ملتی۔ اور یہ بات آپ بلاخوف تردید فخر سے کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کی کسی قوم کے پاس نہ ایسا علم ہے، نہ ماضی میں تھا اور نہ ماضی قریب میں کوئی ایسا علم تھا جس کو اصول فقہ کے مقابلہ میں رکھا جاسکے۔ جو ایک وقت خالص دینی علم بھی ہو، اس اعتبار سے اس کی اساس قرآن پاک اور سنت رسول پر ہو اور ایک وقت اس کی بنیاد خالص عقلی اور تجرباتی معاملات پر بھی ہو جس کو عقل کے بڑے سے بڑا معیار بھی عقلی بنیادوں پر غلط قرار نہ دے سکے۔ یہ مستحکم بنیادیں اصول فقہ کو علم حدیث سے حاصل ہوئیں۔ اس کی تفصیل میں جانے کا وقت نہیں ہے۔ اس لئے میں صرف اشارہ پر اکتفا کر رہا ہوں۔

دنیا میں اسلام سے پہلے بھی تاریخ کا تصور موجود تھا۔ اسلام سے پہلے تاریخ کی کتب بھی دنیا میں موجود تھیں۔ یونان کی کتابیں تھیں جن میں قوموں کی تاریخ بیان ہوئی ہے۔ یہ کتابیں چین میں بھی موجود تھیں، ہندوستانیوں میں بھی موجود تھیں اور ایرانیوں میں بھی موجود تھیں۔ ہیروڈوٹس اسلام سے پہلے کا مورخ ہے۔ اس کی بیان کردہ معلومات آج بھی دستیاب ہیں۔ اس کی Authenticity کتنی ہے، وہ قابل اعتماد ہے یا نہیں، یہ ایک دوسری بات ہے۔ لیکن اسلام سے پہلے کی تاریخ اور تاریخی معلومات کا ایک ذخیرہ ہمارے ہاں موجود ہے۔ ہندوؤں میں بھی اسلام سے پہلے کی کتابیں موجود ہیں جن میں بعض تاریخی نوعیت کی معلومات بھی شامل ہیں۔ لیکن وہ چیز جس کو اسلام سے پہلے تاریخ کہا جاتا تھا، وہ کیا تھی؟ آج دنیا کا کوئی مورخ اسلام کے اس احسان و

مانتا ہے یا نہیں مانتا۔ مانتا ہے تو بلاشبہ عدل وانصاف کی بات کرتا ہے اور نہیں مانتا تو بہوا احسان فراموش یا کم از کم ناواقف ضرور ہے۔ لیکن تاریخ کا صحیح تصور اور تاریخ کا وہ صحیح شعور جس طریقے سے مسلمانوں کو اور ان سے دنیا کو حاصل ہوا اس کا اولین مصدر وماخذ علم حدیث ہے۔

اسلام سے پہلے تاریخ کا جو تصور تھا وہ یہ تھا کہ کسی قوم میں جو قصے کہانیاں مشہور ہیں ان کو مدون کر لیا جائے۔ جو رطب و یابس دستیاب ہے اس کو حقیقت مان لیا جائے۔ گویا جب تاریخ لکھنے بیٹھو تو عوام میں رائج قصے جمع کر لو اور سارے کے سارے بیان کر دو اور نقل کر کے جمع کر دو۔ کوئی یہ پوچھنے والا نہیں تھا کہ بھئی! مؤرخ صاحب! آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ماخذ کیا ہے؟ یہ چیز آپ نے صحیح لکھی ہے یا غلط لکھی ہے؟ کس سے پوچھ کر کس سے سن کر یا کن ماخذ کی مدد سے لکھی گئی؟ آپ سے کس نے بیان کیا؟ آپ وہاں موقع پر موجود تھے کہ نہیں تھے؟ آپ اس کے چشم دید گواہ تھے کہ نہیں تھے؟ اس وقت نہ یہ سوالات تھے اور نہ دنیا کوئی تصور تاریخ کے بارے میں موجود تھا۔

علم حدیث نے سب سے پہلے لوگوں کو یہ تصور دیا کہ جب کوئی واقعہ بیان کرو تو پہلے خود یہ اطمینان کرو اور پھر دوسروں کو یہ اطمینان دلاؤ کہ تم اس واقعہ کے عینی شاہد ہو۔ اگر عینی شاہد نہیں ہو تو جو عینی شاہد تھا اس کا حوالہ دو کہ مجھ سے فلاں شخص نے بیان کیا جو عینی شاہد تھا۔ پھر اس بات کا یقین دلاؤ کہ تم جس واقعہ کو بیان کر رہے ہو اس کو بیان کرنے میں تمہارا کوئی ذاتی مفاد نہیں ہے؟ اگر اس واقعہ کو بیان کرنے میں تمہارا کوئی ذاتی مفاد ہے تو ہم تمہارے بیان کو قبول کرنے میں تامل کریں گے۔ اس لئے کہ ذاتی مفاد کی بنیاد پر آدمی بہت سی باتوں کو غلط طور پر نمایاں کر سکتا ہے اور صحیح باتوں کو اپنے ذاتی مفاد کی خاطر دبا سکتا ہے۔

یہ تصورات سب سے پہلے مسلمانوں نے دیئے۔ سب سے پہلے اسلامی علوم وفنون میں یہ اصول پیدا ہوئے اور مسلمان مؤرخین نے ان کو مسلمانوں کی تاریخ پر منطبق کر کے دکھایا۔ انہوں نے مسلمانوں کی تاریخ ان اصولوں کی بنیاد پر مرتب کر دی اور تاریخ نویسی کے اصول مقرر کر دیئے۔ یہ دنیا کو علم حدیث کی ایک ایسی بڑی دین ہے جس کے احسان سے دنیا کبھی بری الذمہ نہیں ہو سکتی۔ گزشتہ تین چار سو سالوں کے دوران مغرب میں بڑے بڑے فلسفی پیدا ہوئے، جو فلسفہ تاریخ کے مؤرخین مانے جاتے ہیں، جن کی کتابیں دنیا بھر میں پڑھی جاتی اور احترام کی نظر

سے ناواقف ہیں۔ لیکن آج ان مورخین کو جو اعتبار حاصل ہوا ہے اس کی بنیاد کیا ہے؟ یہ اصول تاریخ ان حضرات کے ہاں کہاں سے آئے؟

مسلمانوں میں سب سے پہلے مورخین ابن خلدون اور علامہ سخاوی ہیں جنہوں نے اصول تاریخ نویسی اور فلسفہ تاریخ کو نئے انداز سے مرتب کیا۔ علامہ سخاوی اصلاً علم حدیث کے امام تھے۔ ان کی ایک تصنیف ہے جو فلسفہ تاریخ اسلامی کی ایک بڑی نمایاں کتاب ہے: الاعلان بالتوبیخ لمن ذم اہل التاریخ۔ اس میں انہوں نے مسلمانوں کی تاریخ نویسی اور Historiography کے اصول بیان کئے ہیں جو سارے کے سارے علم حدیث سے ماخوذ تھے۔

اگر آپ انگریزی میں پڑھنا چاہیں تو ایک چھوٹی سی کتاب میں ان مباحث کی تلخیص ہے Philosophical Interpretation of History۔ لاہور میں ایک بزرگ تھے پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم، یہ کتاب انہوں نے لکھی ہے۔ مختصر کتاب ہے۔ اس سے ذرا زیادہ تفصیل دیکھنا چاہیں تو ایک کتاب اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے شائع کی تھی Quranic Concept of History اس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن پاک کی تعلیم کے نتیجہ میں اور احادیث مبارکہ کی وضاحت کے نتیجہ میں جو تصور تاریخ پیدا ہوا وہ کیا ہے؟ اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ علم حدیث کے علم تاریخ پر کتنے احسانات ہیں۔ مزید اختصار درکار ہو تو مولانا شبلی نعمانی کی سیرت النبی کی جلد اول کے مقدمے میں شبلی نے اس پر بحث کی ہے۔ وہ آپ پڑھ لیں تو چند صفحات کی بحث ہے۔ اس میں اس بات کا خلاصہ آپ کو مل جائے گا۔ وہ ضرور پڑھ لیجئے گا۔ سیرت النبی، شبلی نعمانی، جلد اول، مقدمہ۔

اصول دعوت اور اسلوب دعوت ایک اہم موضوع ہے۔ مسلمان اہل علم نے اس پر بیسویں صدی میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ لیکن یہ مباحث کہ دعوت کا اصول کیا ہے؟ جب دوسروں کو دعوت دی جائے تو کیسے دی جائے؟ دور دراز تک اسلام کا پیغام پہنچانا ہو تو کیسے پہنچایا جائے؟ جہاں پر پوری امت مسلمہ کا ایک فرد، ادارہ اور ایک طرز عمل بن گیا کہ وہ ہر جگہ اسلام کو لے کر گئے، انہیں کو دعوت کے اصول اور آداب بھی تمام تر انہی احادیث سے ملے۔

کہ کیا اسلوب ہو؟ انسان واحد سے کیسے بات کیا جائے؟ انسانی اخلاقی قواعد

سے کیسے سدھارا جائے؟ یہ مسلمانوں میں ایک بہت بڑا فن ہے۔ اس پر بہت سی کتابیں لکھی گئی۔ بعض کتابیں اچھی ہیں بعض اچھی نہیں ہیں۔ بعض کتابوں میں ایسا مواد بھی ہے جو اسلامی نقطہ نظر سے نظر ثانی کا محتاج ہے۔ لیکن بہت سی کتابیں ایسی ہیں جن میں بڑی گہری باتیں کہی گئی ہیں اور احادیث اور سنت کی تعبیر اس انداز سے کی گئی ہے کہ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انسانی مزاج اور اندر کی اصلاح کیسے ہوتی ہے۔ اخلاق و کردار سازی کیسے ہوتی ہے؟ اس کو علم تزکیہ اور احسان کہتے ہیں۔ یہ سارے کا سارا علم حدیث سے عبارت ہے۔ اور اس کی بنیاد ان احادیث پر ہے جن کو رقاق کہتے ہیں، جس کا میں نے کل تذکرہ کیا تھا۔ یعنی اندر سے دل کو کیسے نرم کیا جائے۔ ان احادیث میں جو روحانی ہدایات ہیں ان کو علمی انداز سے کیسے مرتب کیا جائے۔ اس سے ایک نیا فن پیدا ہوا۔

علم سیر یعنی اسلام کا بین الاقوامی قانون، یہ سارا کا سارا علم حدیث کی دین ہے۔ شروع میں علم حدیث کے وہ علماء اور محدثین جن کو بین الاقوامی تعلقات اور قانون صلح و جنگ سے زیادہ دلچسپی تھی وہ احادیث کے ان حصوں کو زیادہ محفوظ رکھتے تھے اور ان احادیث کو زیادہ پڑھتے اور پڑھاتے تھے جن سے بین الاقوامی قانون پر روشنی پڑتی ہے۔ اس طرح مغازی اور غزوات رسول پر الگ سے کتابیں وجود میں آنی شروع ہوگئیں تو علم مغازی وجود میں آیا۔ علم مغازی وجود میں آیا تو علم غزوات میں جو احکام ہیں وہ وجود میں آئے تو قانون جنگ وجود میں آنا شروع ہوگیا اور دوسری صدی ہجری شروع ہونے سے پہلے پہلے بین الاقوامی قانون کے موضوع پر سیر کے نام سے ایک نیا فن وجود میں آگیا جس کو علم سیر کہتے ہیں جس کی بنیاد اصلاً احادیث رسول پر ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنے بارے میں فرمایا تھا اور بجا فرمایا تھا کہ انا افصح العرب میں عرب میں سب سے فصیح انسان ہوں۔ اللہ نے دنیا کی سب سے فصیح و بلیغ قوم کو قرآن کے تحمل کے لئے منتخب فرمایا۔ اور جو رسول بھیجا اسے ایسے شہر میں بھیجا جو فصاحت و بلاغت میں اپنی جگہ معیار سمجھا جاتا تھا۔ جہاں کی زبان ٹکسالی سمجھی جاتی تھی، یعنی مکہ مکرمہ میں۔ اس قبیلہ میں بھیجا جس قبیلے کی زبان بڑی ٹکسالی سمجھی جاتی تھی یعنی قریش۔ اور قریش میں فصیح ترین انسان اللہ نے رسول اللہ ﷺ کو بنایا۔ لہذا رسول اللہ ﷺ کے ارشادات، خود ہی فصاحت و بلاغت کے اصولوں کا حسن تھے۔ مفسرین اور محدثین نے قرآن پاک کے ساتھ ساتھ سنت اور حدیث کے اعجاز کا فصاحت و بلاغت اور ادبیت کے نقطہ نظر سے جائزہ لیا۔ ان کی کاوشوں کے نتیجہ میں علم بلاغت کے قواعد

مرتب ہونے شروع ہوئے، اور یوں بلاغت کے نام سے ایک نیا فن وجود میں آنا شروع ہوا۔ یہاں تک کہ ایک بڑا فن معرض وجود میں آ گیا۔

یہ دس علوم و فنون ہیں جو براہ راست علم حدیث کی تاثیر کے نتیجہ میں مسلمانوں کے ہاں وجود میں آئے۔ لیکن علم حدیث کی اہمیت ان سے بھی بڑھ کر ہے۔ یہ علوم و فنون وجود میں آئے اور آج بھی ان میں وسعت آتی جا رہی ہے۔ ہر آنے والا دن علم حدیث میں ایک نیا میدان ہمارے سامنے لے کر آتا ہے جس پر آخری خطبہ میں گفتگو ہوگی۔ ہر نیا آنے والا استاذ علم حدیث کا نئے انداز سے مطالعہ کرتا ہے اور ہر آنے والا ہر طالب علم نئے انداز سے مطالعہ کرتا ہے۔ علم حدیث کے نئے نئے گوشے روز بروز ہمارے سامنے آتے چلے جا رہے ہیں۔ لیکن علم حدیث کی جو دیرپا اہمیت ہے جو دائمی، ازلی اور ابدی اہمیت ہے وہ ہے بطور ماخذ شریعت اور ماخذ قانون کے، جس پر تفصیل سے گفتگو آگے چل کر ہوگی۔

قرآن و سنت کا باہمی تعلق

ماخذ قانون اور ماخذ شریعت ہونے کی حیثیت سے قرآن اور سنت دونوں کا اتنا گہرا باہمی تعلق ہے کہ دونوں آپس میں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ قرآن مجید بنیاد ہے سنت رسول اس بنیاد پر تعمیر کی جانے والی عمارت ہے۔ قرآن مجید تنا ہے اور سنت رسول اس تنے سے نکلنے والی شاخیں ہیں۔ قرآن مجید ایک ایسا مرکز نور ہے جس سے شعاعیں نکل رہی ہیں اور وہ شعاعیں سنت رسول ہیں۔ قرآن مجید میں بنیادی اصول اور کلیات بیان کئے گئے ہیں۔ فقہی احکام کے اصول و کلیات جہاں جہاں بیان ہوئے ہیں جزئیات کے بارے میں بھی بیان ہوئے ہیں۔ ان کلیات کی عملی تطبیق احادیث کے ذریعے ہوئی۔ اس عملی تطبیق کے نتیجہ میں مزید احکام نکلے۔ فقہائے اسلام نے ان پر غور کیا۔ غور کرنے سے مزید احکام نکلتے چلے گئے۔ جب دو قسم کے احکام کو سامنے رکھا گیا تو تیسری قسم کے احکام سامنے آگئے۔ تیسرے اور دوسرے کو سامنے رکھا تو چوتھا حکم سامنے آیا۔ چوتھے اور تیسرے کو سامنے رکھا تو پانچواں حکم سامنے آگیا۔ یہ سلسلہ آج تک چلتا چلا جا رہا ہے۔ اور ہر مرحلہ پر اس عمل سے ہر حکم کی بنیاد اور سنت و احادیث رسول اور سنت رسول سے ہے۔ کوئی حکم اور کوئی فقہی مسلک اس وقت تک قابل قبول نہیں ہے جب تک اس کی بنیاد

درست حدیث رسول کی سند حاصل نہ ہو، گویا احادیث رسول سے تعلق رکھا ہو تو انسانی عقل کی توسیع
کے عمل کو اس طرح سے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے جس طرح گھوڑے کی لگام سوار کے ہاتھ میں
ہوتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ انسانی تصورات کو پھیلنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ انسان کا ذہن ہر
وقت کام کرتا رہتا ہے۔ انسان کا ذہن کسی افق کا پابند نہیں ہوتا۔ آپ رات کو آنکھیں بند کر کے
لیٹیں اور سوچیں تو لگے گا کہ پوری کائنات کا افق آپ کے سامنے کھلا ہوا ہے۔ اس افق میں نہ
زمین ہے نہ آسمان ہے۔ اس کی نہ حدود مقرر ہیں نہ کوئی انتہا، نہ ابتدا، بکھرا ہوا ہے۔ یہ ایک
لامتناہی وسعت ہے جو آپ کے سامنے ہے۔ یہی وسعت انسانی عقل میں ہوتی ہے۔ اگر اس
لامتناہی وسعت کو کسی حد اور ضابطہ کا پابند نہ کیا جائے تو انسان کبھی مشرق کی طرف جائے گا کبھی
مغرب کی طرف جائے گا اور اس کے سامنے کوئی راستہ متعین نہیں ہوگا۔ بار بار ایک انتہا کو چلا
جائے گا۔ اس لئے اس کی لگام کو کس کے رکھنا ضروری ہے۔ اس کو حدود کا پابند کرتے رکھنا
ضروری ہے۔ یہ حدود کی پابندی اور یہ لگام کسنے کا عمل حدیث رسول ﷺ نے کیا ہے۔

قرآن مجید کے عمومی کلیات یا ہدایات وہ ہیں کہ اگر حدیث و سنت کا حوالہ ختم کر دیا
جائے تو ان کی اچھی تعبیر بھی ہو سکتی ہے اور بری تعبیر بھی ہو سکتی ہے۔ قرآن مجید میں خود ایک جگہ لکھا
ہوا ہے: یضل به کثیرا و یهدی به کثیرا کہ اللہ تعالیٰ اس قرآن کے ذریعے بہت سوں کو گمراہ
کرتا ہے اور بہت سوں کو ہدایت دیتا ہے۔ جو لوگ سنت اور حدیث سے ہٹ کر قرآن سے رہنمائی
لینا چاہتے ہیں وہ گمراہ ہو جاتے ہیں اس لئے کہ قرآن مجید کی تعلیم ایک کلی چیز ہے۔ مثلاً قرآن
مجید میں عدل کی تعلیم ہے۔ لیکن عدل سے کیا مراد ہے؟ عدل کیا چیز ہے؟ جب تک اس کو سنت کی
شکل میں Concretise نہیں کیا جائے گا اس وقت تک آپ کا جی چاہے عدل کو کوئی پہنا دیں۔

آج سے تقریباً سو سال پہلے برصغیر میں ایک صاحب پیدا ہوئے جنہوں نے
کہا کہ قرآن مجید کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لئے حدیث اور سنت کی ضرورت نہیں ہے چونکہ
حدیث و سنت میں بڑا اختلاف ہے اس لئے اس سے مسلمانوں میں فرقے پیدا ہو گئے ہیں۔ ایک
بزرگ ان صاحب سے ملے اور ان سے کہا کہ یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ آپ مسلمانوں میں اتحاد
پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اگر سنت اور حدیث کی وجہ سے اختلاف پیدا ہوا ہے تو قرآن کی بنیاد پر اتحاد
ہو جائے گا۔ یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ لیکن آپ ذرا یہ بتائیے کہ قرآن پاک میں نماز کا حکم ہے

قرآن پاک کے حوالے سے بات کریں گے تو تم قرآن پاک کے حوالے سے بات مت کرنا۔ اس لئے کہ قرآن پاک کے حکم میں تو متعدد تعبیریں ہو سکتی ہیں۔ لیکن جو صحیح تعبیر ہے وہ صرف حدیث اور سنت ہی سے ملے گی۔ اس لئے سنت کے حوالے سے ان سے بات کرنا، قرآن پاک کے حوالے سے بات مت کرنا۔ یہ ایک جلیل القدر صحابیؓ دوسرے جلیل القدر صحابیؓ کو مشورہ دے رہا ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے جا کر خوارج سے سنت ہی کے حوالے سے بات کی اور بہت سے خوارج کو ان کی گمراہیوں سے روکا اور نکالا۔ اس لئے علم حدیث کی اہمیت مسلمانوں کے لئے نہ صرف سوسو فنون کی خاطر بلکہ قرآن مجید کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے بھی ناگزیر ہے۔

اب میں اختصار کے ساتھ ایک چیز اور عرض کر دیتا ہوں۔ کل علم حدیث کے موضوعات کا تذکرہ ہوا تھا۔ علم حدیث کے آٹھ موضوعات مشہور ہیں، جن کی تفصیل بیان کرتے ہوئے میں نے عرض کیا تھا کہ وہ کتابیں جو علم حدیث کے ان سارے موضوعات پر حاوی ہوں وہ کتابیں جامع کہلاتی ہیں جیسے امام ترمذیؒ کی کتاب جامع ترمذی کہلاتی ہے، یا صحیح بخاری الجامع الصحیح کہلاتی ہے۔

لیکن کچھ کتابیں ایسی ہیں کہ جن میں فقہی احادیث کو فقہی مسائل کی ترتیب سے بیان کیا گیا ہے۔ وہ کتب احادیث جن میں مسائل کی ترتیب فقہی ہو۔ مثلاً پہلے وضو کے احکام ہوں پھر نماز کے احکام ہوں، پھر زکوٰۃ کے احکام ہوں، پھر روزے کے احکام ہوں۔ اور صرف فقہی معاملات سے متعلق احادیث کو لیا گیا ہو، وہ کتابیں سنن کہلاتی ہیں۔ جیسے سنن ابوداؤد۔ سنن ابوداؤد کتب حدیث میں فقہی احکام کا ایک بہت بڑا مصدر و ماخذ ہے۔

شروع میں جب احادیث مرتب ہو رہی تھیں اور صحابہ کرامؓ احادیث کا سب سے بڑا ذخیرہ اور مصدر و ماخذ تھے تو ہر تابعی کی کوشش ہوتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ صحابہ کرام کے پاس حاضر ہو کر ان کی احادیث اپنے پاس نوٹ کر لے۔ اس سے تابعین کے پاس احادیث کے جو مجموعے ہوتے تھے وہ صحابہ سے سنے ہوئے ہوتے تھے۔ مثلاً ایک صحابیؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے سنی ہوئی احادیث اپنے پاس نقل کر لیں۔ پھر حضرت عمرؓ سے سنی ہوئی احادیث نقل کر لیں۔ اس طرح شروع شروع میں جو مجموعے مرتب ہوئے وہ صحابہ کرام کی مرویات کے مجموعے تھے۔ لہٰذا جن کتابوں میں احادیث صحابہ کرام کی ترتیب سے جمع کی گئی ہوں ان کو مسند کہا جاتا ہے۔ مسندوں میں سب سے بڑی کتاب مسند امام احمد ہے جس میں بہت بڑی تعداد میں

احادیث شامل ہیں۔ مسند امام احمدؒ کے ساتھ کچھ اور مسندیں بھی ہیں۔ مسند امام احمد تو ہے ہی، مسند ابوعوانہ ہے، مسند ابوداؤد طیالسی ہے۔ یہ سب وہ ہیں جن میں صحابہ کی ترتیب سے الگ الگ احادیث جمع کی گئی ہیں۔ صحابہ کی ترتیب میں کیا اصول رکھا جائے اس باب میں بھی محدثین کے اپنے اپنے ذوق تھے۔ مثلاً امام احمد نے یہ ترتیب اس حساب سے رکھی ہے کہ اسلام میں ان صحابی کا درجہ کیا ہے؟ چنانچہ سب سے پہلے عشرہ مبشرہ کی احادیث درج کی ہیں۔ عشرہ مبشرہ میں سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ کی احادیث ہیں۔ پھر بقیہ عشرہ مبشرہ، اس کے بعد ترتیب کے مطابق دیگر صحابہ جو ان کے خیال میں اسلام میں اونچا مقام رکھتے تھے۔ کچھ مسندوں کے مصنفین نے فیصلہ کیا کہ حروف تہجی کے اعتبار سے (Alphabetical) ترتیب رکھیں گے۔ کچھ مصنفین نے طے کیا کہ رشتہ داری کے حساب سے ترتیب رکھیں گے کہ جس صحابیؓ کی قرابت رسول اللہ ﷺ سے زیادہ ہوگی وہ اس کی احادیث پہلے ہوں گی۔ اس لحاظ سے بنی ہاشم کی احادیث پہلے ہوں گی۔ یہ ترتیب انہوں نے اپنی اپنی سہولت کی خاطر رکھی۔ لہٰذا مسند اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں احادیث کو صحابہ کی ترتیب سے بیان کیا گیا ہو۔

حدیث کی ایک کتاب ہوتی ہے 'معجم'۔ آپ نے سنا ہوگا معجم طبرانی کبیر، معجم طبرانی صغیر، معجم طبرانی اوسط، اور بھی کئی معجمیں ہیں۔ معجم سے مراد وہ احادیث ہیں جن میں مرتب کرنے والے محدث نے اپنے اساتذہ کی ترتیب سے احادیث کو جمع کیا ہو۔ مثلاً آپ حدیث کے طالب علم ہیں، آپ نے دس اساتذہ سے احادیث پڑھیں اور ان کی حدیثیں آپ کے پاس ہیں۔ اب جب آپ ان کو کتابی شکل میں مرتب کریں گے تو آپ سب اساتذہ کی احادیث الگ الگ کر دیں گے، باب اول استاد 'الف' کی احادیث ہیں، باب دوم استاد 'ب' کی احادیث ہیں۔ باب سوم استاد 'ج' کی احادیث ہیں۔ اس طرح کی ترتیب پر مشتمل احادیث کی کتاب کو معجم کہتے ہیں۔ اس میں بھی حروف تہجی کی ترتیب ہو سکتی ہے یا کوئی بھی ترتیب ہو سکتی ہے۔ معجم کے نام سے احادیث کی جو کتابیں ہیں ان میں طبرانی کی تین معجمیں زیادہ مشہور ہیں۔ پہلے امام طبرانی نے معجم کبیر لکھی۔ پھر امام صاحب کو خیال ہوا کہ یہ تو بہت بڑی ہے اس لئے اس کی تلخیص کی اور معجم صغیر لکھی۔ پھر خیال ہوا کہ یہ تو بہت چھوٹی رہ گئی تو ایک معجم اوسط لکھی جو درمیانے درجے کی ہے۔ یہ تینوں معجمیں چھپی ہوئی موجود ہیں اور دستیاب ہیں۔

کرتے ہیں جو ایک زمانے میں موجود تھے اور ان کے معاصر تھے اور اس بات کا امکان موجود ہے کہ ان کی آپس میں ملاقات ہوئی ہو لیکن ان کی یہ ملاقات ہمارے علم میں نہیں آئی تو میں ان کی حدیث کو تسلیم کرلوں گا کہ وہ صحیح حدیث ہے۔ اس لئے کہ وہ خود اخلاق و کردار کے اتنے اونچے معیار پر تھے کہ ان کی روایت کو قبول نہ کرنا نامناسب ہے۔

مثلاً امام مالک روایت کرتے ہیں امام زہری سے۔ امام مالک اتنے اونچے درجے کے انسان ہیں کہ مجھے یہ تحقیق کرنے کی ضرورت نہیں کہ امام مالک کی امام زہری سے ملاقات ہوئی تھی کہ نہیں ہوئی تھی۔ جب وہ روایت کرتے ہیں تو دونوں ایک زمانے میں تھے۔ امام زہری مدینہ بار بار تشریف لائے، حج کے لئے تشریف لائے، مدینہ منورہ میں ایک عرصے رہے اس لئے اس کی تحقیق کئے بغیر کہ ان کی ملاقات واقعی ہوئی بھی تھی کہ نہیں ہوئی تھی میں ان کی روایت قبول کرلوں گا۔ اس لئے امام مسلم نے کہا کہ امکان تو کافی ہے ثبوت لقاء ضروری نہیں ہے۔ یہ تھوڑا سا فرق ہے امام مسلم اور امام بخاری کی شرائط اور معیارات میں۔ ان معیارات کی بنیاد پر دونوں نے یہ اپنے مجموعے مرتب کئے۔ ان دونوں حضرات کے قریباً سو یا سوا سو سال بعد امام حاکم تشریف لائے۔ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ مختلف کتابوں میں بہت سی ایسی احادیث موجود ہیں جو ان دونوں محدثین کی شرائط پر پوری اترتی ہیں لیکن ان دونوں نے اپنی کتب میں ان کا ذکر نہیں کیا۔ تو انہوں نے ایک نیا مجموعہ ان احادیث کا مرتب کیا جو مستدرک کہلاتا ہے۔ المستدرک علی الصحیحین للحاکم مستدرک سے مراد وہ مجموعہ ہے جو کسی سابقہ محدث کی شرائط پر پوری اترنے والی احادیث کا بعد میں آنے والے محدث نے مرتب کیا ہو۔ جس کی شرائط پر وہ ہوں اس کی مستدرک کہلاتی ہے۔ صحیحین کی مستدرک، ابوداؤد کی مستدرک، ترمذی کی مستدرک، اسی طرح مستدرک کے نام سے خاصی کتابیں موجود ہیں۔

ایک کتاب کہلاتی ہے مستخرج۔ اس کے لفظی معنی تو ہیں نکالا ہوا لیکن 'مستخرج' سے مراد وہ مجموعہ ہے جس میں بعد میں آنے والے کسی محدث نے کسی سابقہ مجموعہ کی احادیث کو نئی سند سے بیان کیا ہو۔ مثلاً موطا امام مالک ہے۔ اس میں امام مالک ایک حدیث بیان کرتے ہیں کہ حدثنی نافع عن ابن عمر عن النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام۔ مالک نے امام نافع سے سنا۔ انہوں نے ابن عمر سے سنا اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا اور پھر حضور نے یہ

بیان فرمایا۔ اب بعد میں آنے والا کوئی محدث یہی روایت کسی اور سند سے بیان کرے، روایت یہی ہو لیکن سند اور ہو تو گویا یہ حدیث زیادہ باوثوق ہو جائے گی۔ بات زیادہ قابل اعتماد ہو جائے گی کہ ایک سے زیادہ سندوں اور مختلف واسطوں سے ایک ہی بات آئی ہے تو بات زیادہ صحیح ہے۔ تو گویا پہلی کسی حدیث کو Reinforce کرنے کے لئے مستخرج کے نام سے کتابیں مرتب کی گئیں جو 'مستخرج' کہلاتی ہیں۔

حدیث کی کتابوں کی بڑی بڑی اور مشہور قسمیں یہی ہیں۔ اور بھی کئی قسمیں ہیں جن کی کوئی زیادہ اہمیت نہیں۔ جن میں سے ایک قسم جز کہلاتی ہے۔ الجزء کے معنی ہیں محدثین کی اصطلاح میں کسی ایک صحابی کی احادیث، یا کسی ایک استاذ کی احادیث، یا کسی ایک موضوع پر پائی جانے والی احادیث کے مجموعوں کو جزء کہا جاتا ہے۔ امام بخاری کی کئی کتابیں 'جزء' کے نام سے موجود ہیں۔ بعض اور محدثین نے بھی کتابیں جزء کے نام سے لکھی ہیں مثلاً جزء حجۃ الوداع جس میں حجۃ الوداع سے متعلق ساری احادیث یکجا کردی گئی ہیں۔ اسی طرح کسی موضوع پر ساری احادیث ایک ہی جگہ پر جمع کی جائیں تو یہ مجموعہ بھی جزء کہلاتا ہے۔

ایک مجموعہ اربعین کا ہے۔ چالیس احادیث کا مجموعہ بہت سے محدثین نے ایسے مجموعے مرتب کئے ہیں۔ اس لئے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو میری چالیس باتیں سن کر آگے دہرائے اس کے لئے بڑی بشارت ہے۔ اس بشارت کا مصداق بننے کے لئے محدثین نے چالیس احادیث کے مجموعے جمع کئے۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گا۔ یہ کام آپ بھی کرسکتی ہیں۔ اگر آپ یہ طے کریں کہ کسی ایک موضوع پر کتابوں کا جائزہ لے کر چالیس احادیث کا مجموعہ مرتب کرلیں تو آپ بھی اس حدیث کی مصداق ہوسکتی ہیں۔ مثلاً آپ یہ کرسکتی ہیں کہ ماں باپ کے حقوق پر چالیس احادیث، پڑوسیوں کے حقوق پر چالیس احادیث، طلب علم کے بارے میں چالیس احادیث، یا صفائی کی اہمیت پر چالیس احادیث جمع کرلیں، یا کوئی بھی دوسرا عنوان لے لیں اور اس پر چالیس احادیث جمع کریں، ترجمہ کریں، مختصر تشریح کریں اور چھپوا لیں یا کسی کو پڑھا دیں تو آپ اس حدیث کا مصداق بن سکتی ہیں۔ مختلف موضوعات پر اربعین کے نام سے چالیس احادیث کے سینکڑوں مجموعے ملتے ہیں۔ بہرحال یہ کتب احادیث کی بڑی بڑی قسمیں ہیں۔

محدثین کی اقسام

علم حدیث کے بارے میں آخری بات کہہ کے آج کی گفتگو ختم کرتا ہوں۔ علم حدیث سے جو لوگ وابستہ ہیں ان میں بڑی تعداد تو ہمارے اور آپ جیسے طالبان علم کی ہوتی ہے۔ جو طالب علم ہیں وہ تو کسی شمار قطار میں نہیں آتے، لیکن جن کا درجہ طالب علم سے ذرا آگے بڑھ کر ہے ان میں سب سے پہلا درجہ "مُسنِد" کا ہوتا ہے۔ مسند کا مطلب ہے سند بیان کرنے والا۔ اسند کا مطلب ہے سند بیان کی، اور یسند سند بیان کرتا ہے۔ لہٰذا مسند یہاں اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ مسند کے معنی ہے سند بیان کرنے والا یعنی حدیث کا وہ مبتدی طالب علم جو سند کے ساتھ حدیث کا مطالعہ کرے اور سند اور رجال اور متن ان سب چیزوں کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد آگے بیان کرے وہ مسند کہلاتا ہے۔ یہ سب سے پہلا درجہ ہے۔

اس کے بعد درجہ آتا ہے محدث کا، یعنی وہ شخص جس نے علم حدیث میں اتنی مہارت حاصل کر لی ہو کہ علوم حدیث کا بیشتر حصہ اس کے علم اور حافظہ اور نظر میں محفوظ ہو وہ محدث کہلاتا ہے۔

اس کے بعد حافظ کہلاتا ہے۔ ہمارے ہاں بعض علاقوں میں حافظ القرآن کو اور نابینا کو بھی کہتے ہیں اس حافظ سے وہ نابینا حافظ مراد نہیں ہے، یا قرآن کے حافظ کو بھی ہم لوگ حافظ کہتے ہیں۔ یہاں حافظ سے وہ بھی مراد نہیں ہے۔ بلکہ حافظ علم حدیث کی ایک اصطلاح ہے جو بڑے بڑے علماء بلکہ ائمہ حدیث کے لئے استعمال ہوتی تھی۔ آپ کے اندازے کے لئے میں عرض کروں کہ ایک زمانہ میں حافظ ابن حجر عسقلانی گزرے ہیں جن سے بڑا محدث ان کے بعد سے کوئی پیدا نہیں ہوا۔ ان کو آج تک حافظ ابن حجر کہا جاتا ہے۔ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ ایک زمانے تک حافظ ابن تیمیہ کہلاتے تھے۔ علامہ ابن قیم آج بھی حافظ ابن قیم کہلاتے ہیں۔ اس درجہ کے لوگ جیسے ابن تیمیہ، ابن قیم اور ابن حجر تھے وہ لوگ حافظ کہلاتے ہیں۔ وہ لوگ جو علم حدیث کے ذخائر کو اپنی یادداشت میں محفوظ کئے ہوئے ہوں اور علم حدیث کے علوم و فنون ان کی یادداشت میں محفوظ ہوں اور علم حدیث کا کوئی گوشہ ان کے مطالعہ سے خارج نہ ہو وہ اصطلاحاً حافظ کہلاتے ہیں۔

اس کے بعد درجہ آتا ہے "الحجۃ" کا۔ الحجۃ سے مختلف لوگوں نے مختلف معنی مراد لئے

تھے جن کو علم حدیث کی تاریخ میں امیر المومنین فی الحدیث کا لقب دیا گیا ہو۔ حافظ ابن حجر عسقلانی کس درجے کے انسان تھے اس کا صرف اس بات سے اندازہ کیجئے کہ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم ان دونوں میں زیادہ بہتر کتاب کونسی ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے بارے میں یہ بھی بات کرتے تھے لیکن اس نے یہ ثابت کیا کہ مسلمانوں کی رائے بعد میں اکثریت کی بخاری قرآن مجید کے بعد صحیح ترین کتاب سمجھی ہے۔ اور مسلمانوں کی اکثریت یہی سمجھتی ہے۔ اقلیت کا بھی یہ نقطہ نظر ہے۔ لیکن ابن خلدون نے یہ لکھا ہے کہ ابھی تک مسلمانوں نے صحیح بخاری کی شرح کا حق ادا نہیں کیا۔ جس شان کی یہ کتاب ہے اس شان کی کوئی شرح اس کتاب کی نہیں لکھی گئی اور یہ مسلمانوں کے ذمہ ابھی تک قرض ہے۔ یہ قرض ادا نہیں ہوا۔ جب حافظ ابن حجر نے بخاری کی شرح میں فتح الباری لکھی تو بالاتفاق امت نے کہا کہ حافظ ابن حجر نے وہ قرض ادا کر دیا جو امت کے ذمہ تھا۔

ایک حدیث ہے: لا هجرة بعد الفتح فتح کے بعد یعنی فتح مکہ کے بعد ہجرت کی ضرورت نہیں رہی مشہور یہ تھا۔ جب فتح الباری لکھی تو لوگوں نے کہا کہ لا هجرة بعد الفتح یعنی اب شرح حدیث کے لئے سفر کرنا چھوڑو۔ کوئی ضرورت نہیں اب فتح الباری لکھی جا چکی ہے۔

یہاں میں یہ بات ختم کرتا ہوں اگر کوئی سوال ہے تو اس کا جواب دینے کی کوشش کروں گا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

آپ نے چالیس احادیث کو جمع کرنے کی ضرورت دی ہے تو عربی متن درست طور پر بھی سمجھ نہ آئے تو اس کا کیا حل ہوگا جبکہ کسی نے یہ کرنے کی نیت کرلی ہے۔

کوئی بات نہیں آپ اردو زبان میں حدیث کی کوئی بھی کتاب لے لیں اور انگریزی میں کتاب لکھی ہو تو انگریزی ترجمے کے ساتھ کتابیں موجود ہیں۔ اردو میں کتاب لکھی ہو تو اردو ترجمے کے ساتھ کتابیں موجود ہیں۔ وہاں سے فوٹو کاپی کریں۔ وہ اس طرح چالیس احادیث کو جمع کریں اور نیچے جو تفسیر یا شرح لکھی ہو وہ آپ لکھ دیں۔

کراچی کے ایک ڈاکٹر ہیں مجھ سے ملے تھے انہوں نے درخواست کی کہ وہ چالیس احادیث لیتے ہیں جن کا تعلق اخلاقیات سے اور قرآن سے واضح موافقت رکھتی ہوں اور متعلقات کو جمع کر رہی ہوں۔

اس لئے کہ حضورؐ نے ایسے کسی روزے کی تعلیم نہیں دی۔

معاشرہ میں منکرین حدیث کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ عام لوگ ان سے متاثر ہوتے ہیں، ایک سیدھا سادہ انسان ان کے پروپیگنڈے سے کس طرح بچ سکتا ہے؟

اس طرح بچ سکتا ہے کہ لوگوں کو علم حدیث کی تعلیم دی جائے جیسے کہ آپ یہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ لوگوں تک علم حدیث کے ذخائر اور رہنمائی پہنچائی جائے۔

کیا آپ اردو رسالہ کا نام بتا سکتی ہیں جس میں رسول اللہ ﷺ کے روزے کا ذکر ہے؟

اس کا اردو نام مجھے یاد نہیں رہا۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ایک چھوٹے سے رسالہ میں اس کا ذکر ہے، جس کا عربی نام ہے۔ وہ اپنی کتابوں کا عربی نام رکھا کرتے تھے، لیکن رسالہ چھوٹا سا ہے، اردو میں ہے، غالباً تیس چالیس صفحات کا ہے۔ آج سے تیس چالیس سال قبل چھپا تھا اور کوئی پینتیس چالیس سال پہلے میں نے پڑھا تھا۔

چالیس احادیث مختلف موضوعات پر بھی جمع کی جا سکتی ہیں اور ایک موضوع پر بھی۔ آپ کو اختیار ہے۔ حدیث ہر جگہ رہنمائی کرتی ہے وہ مجموعہ ہو یا الگ الگ ہو۔

جن لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ ہم سنت کو صحیح مانتے ہیں لیکن ہم احادیث کو نعوذ باللہ غلط سمجھتے ہیں، اللہ کہتا ہے کہ میں نے کھول کھول کر بیان کر دیا ہے اور وہ لوگ صرف قرآن پر عمل کرتے ہیں۔

ایک جملہ حضرت علیؓ نے ارشاد فرمایا تھا۔ جملہ بڑا زبردست ہے اور بہت سے معاملات پر صادق آتا ہے۔ جب خوارج نے آپ کے خلاف بغاوت کا فیصلہ کیا تو یہ عنوان اختیار کیا کہ قرآن پاک میں آیا ہے کہ إن الحكم إلا لله فیصلہ کرنے کا حق صرف اللہ کو ہے اور آپ نے دو ثالث مقرر کر دیے ہیں تو آپ نے قرآن پاک کی آیت کی خلاف ورزی کی۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ كلمة حق أريد بها الباطل، یہ جملہ تو حق ہے لیکن مراد اس سے باطل ہے، نیت اور عزائم برے ہیں۔ جملہ درست ہے۔ تو یہ جملہ تو درست ہے کہ قرآن پاک میں ہر چیز کو کھول کھول کر بیان کر دیا گیا ہے۔ لیکن نیت اس سے باطل ہے۔ قرآن پاک کوئی نظری یا مجرد یا Abstract کتاب نہیں ہے کہ کسی خلا میں نازل ہوئی ہو۔ بلکہ قرآن مجید ایک کتاب ہدایت اور ایک دستور العمل ہے جس کے ساتھ اس کا پڑھانے والا بھی بھیجا گیا تھا۔ خود قرآن مجید میں یہ لکھا ہوا ہے۔ کل اس پر بات کریں گے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہ اعتراض بے بنیاد ہے۔

حدیث کے متعلق جاننے کا بہت اچھا موقع ملا ہے۔ اللہ پاک آپ کو جزائے خیر دے، آمین۔ اس لیکچر کو لکھنے میں مشکل ہو رہی ہے۔ اگر آپ کی نظر میں کوئی خاص کتاب ہو جس کو ہم پڑھ سکیں یا کوئی اور طریقہ بتائیں جس سے ہم اصطلاحات کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔

اصل میں یہی طے ہوا تھا کہ یہ لیکچر ریکارڈ ہوں گے اور بعد میں ان کو ٹرانسکرائب کر کے میں ایڈٹ کروں گا تو شائع بھی کریں گے ان شاء اللہ۔ اردو میں کوئی کتاب آپ پڑھنا چاہیں تو میں کل چیک کر کے بتا دوں گا۔ میں اکثر اردو کتابیں نہیں پڑھتا ہوں۔ زیادہ تر عربی کتابیں دیکھتا ہوں۔ وہی بتا سکتا ہوں۔ لیکن اردو میں اس پر ایک تو ڈاکٹر خالد علوی صاحب کی بڑی اچھی کتاب ہے 'حفاظت حدیث'۔ اور ایک کتاب علوم حدیث پر ہے، ایک جلد چھپی ہے دوسری جلد چھپنے والی ہے۔ 'اصول حدیث' پر بھی دو تین کتابیں موجود ہیں۔ ایک کتاب ہے نخبۃ الفکر، حافظ ابن حجر کی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ اور بھی کئی ہیں میں کل چیک کر کے آپ کو مزید کتابوں کے نام بتا دوں گا۔

فقہی ترتیب سے کیا مراد ہے؟

فقہی ترتیب سے مراد ہے کہ فقہ کی کتابوں میں مضامین کو بیان کرنے کا ایک خاص انداز ہوتا ہے۔ سب سے پہلے اس میں طہارت کے احکام ہوتے ہیں۔ پھر نماز کے احکام ہوتے ہیں۔ پھر زکوٰۃ اور روزہ کے احکام ہوتے ہیں۔ پھر حج کے احکام ہوتے ہیں۔ پھر نکاح وطلاق کے احکام ہوتے ہیں۔ پھر وراثت، وصیت، پھر معاملات اور خرید وفروخت لین دین، یہ ترتیب فقہ کی سب کتابوں میں رائج ہے اور امام مالکؒ کے زمانے سے رائج ہے۔ احادیث کی وہ کتابیں جو اس ترتیب سے ہوں جن میں سب سے پہلے طہارت، نماز روزے کے احکام ہوں وہ سنن کہلاتی ہیں، جن میں یہ ترتیب نہ ہو وہ سنن نہیں کہلاتیں۔ مثلاً صحیح بخاری میں یہ ترتیب نہیں ہے۔ صحیح بخاری میں جو پہلا باب ہے وہ ہے باب کیف کان بدء الوحی علی رسول اللہ ﷺ۔ کہ رسول اللہ ﷺ پر وحی کا آغاز کیسے ہوا۔ سب سے پہلے یہ باب ہے پھر ایمان کا باب ہے پھر علم کا باب ہے۔ سنن ابن ماجہ میں پہلے علم کا باب ہے پھر بقیہ ابواب ہیں۔ ہر مصنف کی ترتیب الگ الگ ہے۔

اگر عورتوں کا محرم نہ ہو تو وہ گروپ کی شکل میں حج پر جا سکتی ہیں؟

یہ تو آپ کسی مفتی سے پوچھیں۔ لیکن فقہائے احناف کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اگر کوئی

خاتون مصر میں ہیں اور اس کی عدالتوں نے یہ بات مقرر کی ہے وہ بغیر محرم کے اس قرعہ کے ساتھ حج پر جاسکتی ہیں کہ ان کے ساتھ خواتین کی ایک بڑی تعداد ہو اور ان خواتین کے ساتھ ان کے محرم موجود ہوں۔ یہ تو فقہی مذہب ہے۔ لیکن سعودی قانون کی رو سے بغیر محرم کے کوئی خاتون حج کے لئے نہیں جاسکتی اور ہمیں اس قانون کی پابندی کرنی چاہئے۔ میں تین سال حج کے انتظامات سے وابستہ رہا ہوں۔ میں نے حج کے انتظامات کو براہ راست دیکھا ہے۔ اس تجربہ کی روشنی میں میرا مشورہ یہ ہے کہ بغیر محرم کے کوئی خاتون کبھی حج پر نہ جائے۔ چاہے ان کی عمر کتنی ہی ہو اور شرعاً فقہا کی نے اجازت دی ہو یا نہ دی ہو۔ بہتر یہی ہے کہ وہ محرم کے ساتھ جائے۔ میں نے ایسے ایسے واقعات اور مثالیں دیکھی ہیں کہ محرم نہ ہونے کی وجہ سے خواتین کو کتنی مشکلات پیش آگئیں۔ یہ شریعت کا حکم ہے اور بہت رحمت و شفقت پر مبنی ہے۔ فقہائے اسلام میں سب نے لکھا ہے کہ اگر کسی خاتون کے ساتھ محرم نہ ہو یا اس کے پاس اتنے پیسے نہ ہوں کہ وہ محرم کو بھی ساتھ لے جاسکے تو اس پر حج فرض ہی نہیں ہے۔ اپنے پاس پیسے موجود ہوں لیکن محرم موجود نہ ہو تو بھی خواتین پر حج فرض نہیں ہے۔ حج فرض تب ہی ہوتا ہے جب محرم بھی ہو اور اس کے لئے بھی پیسے ہوں۔ اپنے پاس پیسے ہوں وہ محرم جانے کے لئے تیار ہو، خاتون کے پاس پیسے ہوں کہ محرم کو لے جاسکے تبھی حج فرض ہوتا ہے۔ اس لئے کسی اجازت سے فائدہ نہ اٹھائیے اور اگر محرم ہو تو پھر جائیے اس کے بغیر بڑی مشکل پیش آتی ہے۔

سند کے ساتھ حدیث کو یاد کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ کوشش کی لیکن یاد نہیں رہتیں۔

بڑی مشکل سے یاد ہوتی ہیں۔ میں نے بھی بہت کوشش کی لیکن مجھے بھی یاد نہیں ہوئیں۔ میں نے کسی زمانے میں کوشش کی تھی کہ کچھ حدیثیں مجھے سند کے ساتھ یاد ہو جائیں لیکن یاد نہیں ہوئیں۔ اللہ سے دعا کریں اپنے لئے بھی اور میرے لئے بھی۔ خدا کرے کہ ہم دونوں کو یاد ہو جائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

☆☆☆☆☆☆☆

تیسرا خطبہ

حدیث اور سنت بطور ماخذ شریعت

بدھ، 8 اکتوبر 2003

حدیث اور سنت

بطور ماخذ شریعت

اس سے پہلے دو نشستوں میں حدیث اور اس کی تعریف، سنت اور اس کی تعریف، حدیث اور اس کی اہمیت اور سنت اور اس کی ضرورت پر گفتگو کی گئی تھی۔ آج حدیث اور سنت پر اس اعتبار سے گفتگو کرنی ہے کہ یہ شریعت کا ماخذ ہے، قرآن مجید کی شارح ہے، وحی الٰہی کی تعبیر ہے۔ آج کی گفتگو کا مقصد یہ دیکھنا ہے کہ کلام ربانی کو سمجھنے میں اور شریعت کے احکام کی تفصیل بیان کرنے میں سنت اور حدیث کی اہمیت کیا ہے۔

گفتگو آگے بڑھانے سے پہلے ایک بنیادی بات ذہن میں رکھنی چاہئے۔ وہ یہ ہے کہ قرآن و سنت میں جو کچھ آیا ہے اس کو اصطلاح میں نصوص کہا جاتا ہے۔ نص کے لغوی معنی تو عبارت یا Text کے آتے ہیں۔ لیکن اصطلاح میں نصوص سے مراد قرآن پاک اور سنت رسول کے Text یا عبارتیں ہیں جو دراصل شریعت کا ماخذ اور مصدر ہیں۔

نصوص کی دو قسمیں ہیں۔ کچھ نصوص وہ ہیں جن کو قطعی الثبوت کہا جاتا ہے۔ یعنی ان کا ثبوت قطعی اور یقینی دلائل کے ساتھ ہمارے سامنے ہو چکا ہے۔ قرآن مجید سارے کا سارا قطعی الثبوت ہے۔ احادیث اور سنت میں بھی خاصا بڑا حصہ قطعی الثبوت ہے۔ مثلاً سب کی سب متواتر احادیث اور سنن ثابتہ قطعی الثبوت ہیں۔ متواتر احادیث کی تفصیل آج کی گفتگو میں آئے گی۔ لیکن کچھ احادیث ہیں جو تواتر کے کسی درجہ تک نہیں پہنچیں وہ قطعی الثبوت نہیں ہیں اور ان کا درجہ قرآن کریم اور سنت متواترہ سے کم ہے۔ اس پر بھی آگے چل کر بات ہوگی۔ گویا کچھ نصوص ہیں جو قطعی

الثبوت ہیں اور کچھ نصوص ہیں جو ظنی الثبوت ہیں۔ جن کے بارے میں ظن غالب یہ ہے کہ یہ شریعت کا نص ہے۔

اسی طرح سے معانی اور مطالب کے اعتبار سے بھی ان نصوص کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ ہے جو قطعی الدلالت ہے۔ جس کے معنی اور مفہوم بالکل قطعی اور یقینی ہیں اور جن میں کسی اختلاف رائے کی یا کسی دوسری تعبیر کی گنجائش نہیں ہے۔ مثلاً قرآن پاک میں ہے اقیموا الصلوٰۃ، نماز قائم کرو۔ اب ہر شخص جو تھوڑی بہت بھی عربی جانتا ہے اور اسلام کی تعلیم سے تھوڑا سا بھی واقف ہے وہ یہ جانتا اور سمجھتا ہے کہ اقیموا الصلوٰۃ سے کیا مراد ہے۔ اس میں کسی دو تعبیروں کی گنجائش نہیں ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ کچھ نصوص ایسے ہیں جن میں ایک سے زیادہ تعبیروں کی گنجائش ہے۔ اور یہ گنجائش اللہ اور رسول نے ایک مصلحت سے رکھی ہے۔ جہاں اللہ اور رسول کی حکمت اور منشاء یہ تھا کہ شریعت کے احکام کو ایک سے زیادہ انداز سے سمجھا جا سکے وہاں انہوں نے ایسا اسلوب اور ایسا طرز بیان اختیار کیا جس میں ایک سے زائد تعبیرات کی گنجائش موجود ہے۔ قرآن مجید میں بہت سے الفاظ ہیں جو مشترک معنی کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ قرآن پاک فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ ترین معیار پر ہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی ایسا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے عربی زبان میں ایک سے زائد معنی ہیں اور وہاں سیاق و سباق میں کوئی ایسا قرینہ بھی نہیں رکھا گیا جس سے ایک معنی متعین ہوسکیں تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ قرآن مجید کی کچھ نصوص کو ایک سے زائد انداز میں سمجھا جا سکے جن میں ایک دو کی مثالیں میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔

اسی طرح سے حدیث پاک میں بھی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ ترین معیار پر ہیں۔ اس لئے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام افصح العرب تھے۔ کسی کا یہ تصور کرنا انتہائی بے بنیاد اور مہمل بات ہوگی کہ نعوذ باللہ رسول اللہ ﷺ بات تو واضح کہنا چاہتے تھے لیکن کہہ نہیں سکے۔ واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ جس موقع پر جو بات ارشاد فرمانا چاہتے تھے آپ نے اس موقع پر وہی ارشاد فرمائی اور اس سے جو مفہوم نکلتا ہے وہی مفہوم حضورؐ کا مقصود تھا۔ یہ کہنا بالکل غلط اور بے بنیاد ہے کہ رسول اللہ ﷺ تو کسی خاص قسم سے اپنے ذہن میں ایک خاص مقصد رکھتے تھے۔ لیکن چونکہ لغت کے اعتبار سے اس لفظ کے ایک سے زیادہ مفہوم نکل سکتے تھے

اس لئے لوگوں نے اس کو اس طرح سمجھ لیا جو حضور ﷺ کی منشا کے خلاف تھا۔ لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے۔ جس چیز کو رسول اللہ ﷺ نے دوٹوک اور قطعی انداز میں ارشاد فرمانا چاہا اسے دوٹوک اور قطعی انداز میں ارشاد فرمایا اور جس چیز کے بارے میں حضورؐ کا ارادہ یہ تھا کہ اس کو لوگ اپنے اپنے انداز سے سمجھیں وہ بات حضورؐ نے اس طرح ارشاد فرمائی کہ لوگ اس کو اپنے اپنے انداز سے سمجھے۔

ان دونوں کی ایک ایک مثال میں آپ کو دے دیتا ہوں۔ ایک قرآن پاک سے اور ایک حدیث سے۔ قرآن پاک میں ایک جگہ آیا ہے کہ اگر کسی شوہر اور بیوی میں اختلاف ہو جائے اور شوہر بیوی کو طلاق دے دے تو جب تک وہ مطلقہ خاتون عدت میں ہے اس وقت تک اس مطلقہ خاتون کے اخراجات اس کے شوہر کے ذمہ ہوں گے۔ یہ مشہور معاملہ ہے جس کو متعہ الطلاق کہتے ہیں۔ اس موقع پر ارشاد ہوا ہے کہ على الموسع قدره وعلى المقتر قدره کہ خوشحال اپنی استطاعت کے مطابق اور نادار اپنی استطاعت کے مطابق۔ متاعا بالمعروف اس علاقے اور اس زمانے کے معروف طریقے کے مطابق ضروری ساز و سامان دے۔ یہ الفاظ قرآن پاک میں آئے ہیں جن کے قطعی الثبوت ہونے میں کوئی شک نہیں۔ لیکن موسع سے کیا مراد ہے مقتر سے کیا مراد ہے؟ یہ ہر زمانے کے لحاظ سے الگ الگ طے ہو سکتا ہے۔ ایک غریب ماحول میں، ایک فقیر ملک میں دولت مند اور موسع کا مفہوم اور ہوگا اور نادار اور مقتر کا مفہوم الگ ہوگا۔ ایک انتہائی دولت مند ملک میں، مثلاً کویت میں اگر کہا جائے کہ دولت مند اپنی استطاعت کے مطابق دے اور نادار اپنی استطاعت کے مطابق دے۔ تو کویت کے ماحول میں نادار کے معنی اور ہوں گے پاکستان کے ماحول میں نادار کے معنی اور ہوں گے۔ پاکستان سے بھی زیادہ کوئی غریب فقیر ملک ہوگا تو وہاں نادار کے معنی اور ہوں گے۔

ایسا اس لئے رکھا گیا کہ اللہ کی مشیت اور منشا یہ تھا کہ چونکہ ناداری اور دولت مندی اضافی چیزیں ہیں اس لئے ان کو اپنے اپنے زمانے کے لحاظ سے سمجھا جائے اور اپنے اپنے زمانے کے لحاظ سے اس کے معنی متعین کئے جائیں۔ اس کے لئے معروف کی قید بھی لگا دی جس سے یہ بات مزید واضح ہو گئی کہ اس کی بہت سی تعبیریں ممکن ہیں۔ مثال کے طور پر پاکستان کے کسی دیہات میں اگر کسی خاتون کو یہ آزمائش پیش آ جائے اور وہ متاع کا مطالبہ کرے تو غالباً یہ کافی ہوگا کہ اس کو رہنے کے لئے مکان دے دیا جائے۔ اس مکان میں ضروری ساز و سامان ہو۔ وہ وقت

کھانے کا انتظام ہو، ماشیہ کا انتظام ہو، کچھ سواریاں اور ضروری سازوسامان ہو۔ شاید اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ ہمارے ہاں یہی معروف ہے۔ جو دولت مند ہوگا وہ چھوٹا مکان دے دے گا، غریب کچا مکان اسے دے دے گا۔ دولت مند آدمی شاید گھر میں گھوڑا بھی رکھوا دے تاکہ گاڑی رکھوا دے۔ غریب آدمی یہ چیزیں نہیں رکھ سکے گا۔

لیکن اگر یہی واقعہ کسی کے ساتھ یورپ میں پیش آ جائے تو وہاں اس کے معنی اور مفہوم کے معنی اور ہوں گے۔ وہاں مطلقہ خاتون یہ مطالبہ کرسکتی ہے کہ مجھے جو گھر رہنے کے لئے دیا گیا ہے اس میں ریفریجریٹر بھی رکھا ہو، اس میں سینٹرل ہیٹنگ کا انتظام بھی ہو، اس میں ٹیلیفون کی لائن بھی لگی ہوئی ہو۔ اس لئے کہ یہ چیزیں وہاں ناگزیر ہیں اور ہر آدمی کے پاس ہوتی ہیں۔ وہاں نادار سے نادار آدمی بھی ان چیزوں کے بغیر گزارہ نہیں کرسکتا۔ لیکن پاکستان میں کوئی نادار خاندان یہ مطالبہ کرے تو شاید وہ حق بجانب نہ ہو۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ شریعت کے احکام میں بعض جگہ اللہ کی حکمت ہی اس بات کی متقاضی رہتی ہے کہ اس کے معنی اور مطلب کو زیادہ سے زیادہ عمومی انداز میں سمجھا جائے۔ اور ہر علاقے کے لوگ اپنے حالات کے لحاظ سے، ہر زمانے کے لوگ اپنے ماحول کے لحاظ سے اس کو سمجھ سکیں۔ یہ گویا جیسا کہ حق اللہ اولت کے یعنی جس کے معانی اور دلالت کے دائرے وسیع ہیں۔ آپ اپنے ذوق، فہم و بصیرت اور خیال سے شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے اس کے معنی اور مطالب متعین کرسکیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے کسی نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ ہم بدوی لوگ ہیں، ریگستان میں سفر کرتے ہیں۔ ریگستان میں سب سے کمیاب چیز پانی ہوتی ہے۔ بعض اوقات ہم گزرتے ہیں، راستے میں کوئی تالاب یا گڑھا نظر آتا ہے، اس میں پانی جمع ہے۔ بارش کی وجہ سے یا کسی پہاڑ کے دامن میں پانی جمع ہے۔ اب ہمیں نہیں معلوم کہ یہ پانی پاک ہے کہ ناپاک ہے۔ اس میں کسی درندے نے منہ تو نہیں ڈالا۔ کسی ناپاک جانور نے اس کو ناپاک تو نہیں کیا تو ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ تو آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا، مختلف احادیث میں مختلف الفاظ آئے ہیں۔ ایک حدیث کے الفاظ ہیں الماء اذا بلغ قلتین لا یحمل خبثا کہ جب وہ پانی دو مٹکوں کے برابر ہو تو ناپاک نہیں ہوتا۔ ایک اور جگہ فرمایا کہ الماء الکثیر طهور لا ینجسه شيء کہ زیادہ پانی پاک ہے کوئی چیز اس کو ناپاک نہیں کرسکتی۔ اب ذرا غور فرمایئے کہ یہ الفاظ کہ زیادہ پانی ناپاک نہیں ہوتا، رسول اللہ ﷺ جو انتہائی

العرب میں آپ کی زبان مبارک سے ارادۃً اور سوچ سمجھ کر نکلے ہیں۔ یہاں آپ نے اسلامی حکمت تشریع کے پیش نظر ایسے مبہم الفاظ استعمال فرمائے جن کی متعدد تعبیریں ممکن ہیں۔ آپ چاہتے تو مثلاً یہ فرما دیتے کہ پانی اس یا تیس رطل (ایک پیمانہ) ہو تو ناپاک نہیں ہوتا۔ لیکن آپ نے ماء الکثیر کے الفاظ استعمال فرمائے۔ ماء کثیر سے کیا مراد ہے؟ کتنا پانی؟ جتنا کسی بڑے تالاب میں ہوتا ہے؟ اتنا پانی جتنا راول ڈیم میں ہے اتنا پانی؟ یا اتنا پانی جتنا ایک ٹب میں بھرا ہوا ہے یا اتنا پانی جو ایک کولر میں بھرا ہوا ہے؟ ماء الکثیر کے مفہوم میں لغوی اعتبار سے یہ سب شامل تھا۔

ہمارے شہر کی حد تک شاید ہم ماء کثیر کا یہ مفہوم مقرر کر دیں کہ راول ڈیم کا پانی ماء کثیر ہے اس لئے اس میں بہت زیادہ پانی ہے۔ لیکن جو چولستان کے بعض علاقوں میں جہاں دس دس میل پانی نہیں ملتا وہاں کے لوگوں کے نزدیک ایک مشک بھر پانی بھی بہت اور ماء کثیر ہے۔ بعض اور علاقے ایسے ہوں گے جہاں ایک مٹکا پانی بھی بہت زیادہ ہوگا۔ ماء کثیر قرار دیا جائے گا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے جان بوجھ کر، سوچ کر اور حکمت کی وجہ سے یہ بات ارشاد فرمائی کہ ہر علاقے کے لوگ اپنے حالات کے لحاظ سے اس اصطلاح کے معنی متعین کریں۔ چنانچہ امام ابوحنیفہؒ کے سامنے جب یہ حدیث اور ماء کثیر کا مسئلہ آیا تو وہ کوفہ میں بیٹھے ہوئے تھے جہاں ایک طرف دریائے دجلہ بہتا تھا دوسری طرف فرات بہتا تھا۔ تو ان کے ذہن میں ماء کثیر کا جو تصور آیا وہ یہ تھا کہ اتنا بڑا تالاب کہ اگر کوئی ایک طرف سے ہلائے کہ پانی ہل جائے تو اس کی لہر دوسرے کنارے تک نہ پہنچے۔ انہوں نے ماء کثیر کا یہ مفہوم سمجھا۔ اس کے برعکس امام مالکؒ جو مدینہ منورہ میں تشریف فرما تھے جہاں صرف دو کنویں تھے اور ان میں بھی ایک یہودی کا تھا۔ آپ نے سنا ہوگا اس سے متعلق ایک واقعہ۔ حضرت عثمانؓ نے پھر اس سے خرید کر وقف کر دیا۔ جہاں دو کنویں تھے ایک یہودی کا تھا اور پانی کی قلت تھی۔ امام مالکؒ نے ایک اور روایت کے الفاظ سے استدلال کرتے ہوئے کہا کہ دو بڑے بڑے مٹکے جو عرب گھروں میں پانی کے لئے رکھتے ہیں وہ اگر پانی سے بھرے ہوئے ہوں تو یہ ماء کثیر ہے۔ انہوں نے اسی مقدار کو ماء کثیر سمجھا۔ اب آپ دیکھیں دونوں میں بڑا فرق ہے۔ اتنا بڑا تالاب جس میں کم و بیش دس ہزار مٹکے آجائیں وہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک ماء کثیر ہے۔ اس کے برعکس امام مالکؒ کے نزدیک ماء کثیر وہ ہے جو دو مٹکوں میں آجائے۔ یہ دونوں مسالک اپنی جگہ

مجید کی موجودگی میں کسی اور رہنمائی یا کسی اور ہدایت کی ضرورت نہیں۔ اس کے جواب میں آپ کے سامنے میں نے ایک حدیث بیان کی تھی کہ 'الا انی اوتیت القرآن و مثلہ معہ' یاد رکھو مجھے قرآن پاک بھی دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اس جیسی رہنمائی اور بھی دی گئی ہے۔ قرآن پاک کی متعدد آیات سے، جن کی تعداد سینکڑوں میں ہے، ان سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر نزول قرآن کے علاوہ بھی وحی ہوتی تھی جو سنت اور حدیث کی رہنمائی کی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔

کل میں نے اس آیت کا بھی حوالہ دیا تھا جس میں رسول اللہ ﷺ کے چار فرائض کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یتلوا علیہم آیاتہ ویزکیہم و یعلمہم الکتاب والحکمۃ۔ یہ جو چار فرائض ہیں یہ تلاوت کتاب سے ہٹ کر ہیں۔ تلاوت آیات سے مختلف چیزیں ہیں۔ تلاوت آیات تو قرآن پاک کا بیان کر دیا گیا۔ پھر یعلمہم الکتاب والحکمۃ ویزکیہم یہ تین کام ہیں، ان کا طریقہ کار کیا تھا۔ اس کے لئے رسول اللہ ﷺ جو ہدایات یا رہنمائی فرمایا کرتے تھے وہ رہنمائی کیا تھی؟ وہ رہنمائی سنت کی شکل میں آج ہمارے سامنے ہے۔

خود قرآن مجید میں تین چار مقامات پر قرآن کی تبیین کا فریضہ رسول اللہ ﷺ کے سپرد کیا گیا ہے۔ لتبین للناس ما نزل الیہم، تا کہ آپ وہ تمام چیزیں ان کے لئے بیان کر دیں جو ان کے لئے نازل کی گئی ہیں۔ یعنی قرآن پاک کی آیات اور مطالب کا بیان کریں۔ بیان سے مراد محض تلاوت آیات نہیں ہے، بلکہ بیان کرنے سے مراد یہ ہے کہ اس کے معانی و مطالب کو بیان کر دیا جائے۔ اس کے مقاصد کی تشریح کی جائے۔ اس میں جو بات پنہاں ہے اس کو روز روشن کی طرح واضح کر دیا جائے۔ اس میں جہاں جہاں انسانی ذہن کی نارسائی کی وجہ سے الجھاؤ کا امکان پیدا ہو سکتا ہے اس ممکنہ الجھاؤ کو دور کیا جائے۔ جہاں جہاں غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے اس غلط فہمی کے راستوں کو بند کر دیا جائے۔ یہ ساری چیزیں بیان و تبیین میں شامل ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے جو بیان جاری ہوتا تھا، علمائے اسلام نے اس کی قسمیں بیان کی ہیں۔ ان میں سے بعض اقسام کا ذکر میں آج کی گفتگو میں کرتا ہوں۔ ایک مشہور صحابی ہیں حضرت عمران بن حصینؓ۔ وہ ایک مرتبہ اپنے حلقۂ درس میں کچھ مسائل بیان فرما رہے تھے۔ اس زمانے میں خوارج میں سے بعض جاہل اور انتہا پسند لوگ اس طرح کی باتیں کیا کرتے

تھے جیسے آج کل کے منکرین حدیث کرتے ہیں۔ ان میں سے کوئی خارجی باہر سے آیا ہوا تھا۔ اس
نے آ کے کہا کہ 'لا تحدثونا الا بالقرآن' آپ ہمیں احادیث نہ سنائیں صرف قرآن
پاک کی باتیں بتائیں۔ حضرت عمران بن حصینؓ نے قدرے ناگواری سے فرمایا کہ میں قرآن ہی
کی باتیں بیان کر رہا ہوں۔ قرآن میں اگر نماز کا حکم ہے تو تمہیں کہاں سے پتہ چلے گا کہ ظہر کی
رکعتیں چار ہیں، عصر کی چار ہیں اور مغرب کی تین ہیں۔ یہ اگر میں سنت سے نکال کر بیان کروں گا تو
تمہیں یہاں سے معلوم ہوگا۔ سنت سے بیان کروں گا تو یہ قرآن ہی کا بیان ہے۔ یہ قرآن ہی
کا حصہ ہے، قرآن سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ 'خذوا عنا' آج یہ ساری
معلومات ہم سے لے لو، اگر تم نہیں لو گے تو پھر تمہارے اندر بڑا اختلاف پیدا ہوگا اور تم ایسے
معاملات اور مسائل میں الجھ جاؤ گے جن سے نکلنے کا تمہارے سامنے کوئی راستہ نہیں ہوگا۔

وحی کی اقسام

آگے چلنے سے پہلے ایک اور چیز ذہن میں رکھیں، وہ سنت کی ایک خاص قسم ہے۔
حدیث کی جملہ اقسام پر تو تفصیل سے کل بات ہوگی لیکن ایک قسم ایسی ہے جس پر آج بات کرنا
ضروری ہے۔ ہم نے یہ دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ پر وحی دو طریقوں سے آتی تھی۔ ایک وہ وحی ہوتی
تھی جو وحی جلی کہلاتی ہے۔ یعنی جس کے الفاظ، جس کی عبارتیں، جس کے کلمات اللہ تعالیٰ کی
طرف سے ہوتے تھے اور جس میں رسول اللہ ﷺ کا کوئی دخل نہیں تھا۔ یہ وہ وحی تھی جس کے الفاظ
اور کلمات معجز ہیں، جن کا اسلوب، جن کا معیار، جن کی فصاحت و بلاغت معجزہ کی سطح تک پہنچی ہوئی
ہے۔ یہ وحی قرآن مجید کہلاتی ہے۔

اس کے علاوہ جو وحی آتی تھی وہ متعین الفاظ میں نہیں ہوتی تھی وہ سنت ہے۔ جس کے
صرف معنی اور مفاہیم حضور تک منتقل ہوئے۔ یہ وحی بعض اوقات جبریل امین کے ذریعے سے نازل
ہوتی۔ بعض اوقات کسی اور ذریعے سے بھی نازل ہوتی۔ حضورؐ نے خواب میں کوئی چیز دیکھی، یا اللہ
نے دل میں کوئی چیز ڈال دی۔ سنت حضور تک پہنچنے کے لئے وحی کی رہنمائی کے کئی طریقے تھے،
جس میں وہ طریقے بھی شامل تھے جس طریقے پر قرآن مجید نازل ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی کئی طریقے
شامل تھے۔ بہرحال وحی خفی کہلاتی ہے جس کو آپ انگریزی میں Tacit Revelation کہہ

سکتے ہیں۔ دوسری Express Revelation یا وحی جلی ہے۔ جو اپنے الفاظ کے ساتھ نازل ہوتی تھی۔ وحی خفی صرف معانی اور پیغام پر مشتمل ہوتی تھی جس میں الفاظ اللہ کی طرف سے نہیں ہوتے تھے بلکہ معانی حضورؐ پر نازل فرمائے گئے اور حضورؐ نے اپنے الفاظ میں ان کو بیان فرمایا۔

اس دوسری وحی یعنی وحی خفی میں ایک خاص قسم وہ ہے جو باقی تمام اقسام سے منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ تعداد میں بھی تھوڑی ہے۔ لیکن اس کا ایک خصوصی مقام ہے جس کے لئے اس کو حدیث قدسی کہا گیا ہے۔ وہ دراصل اللہ تعالیٰ ہی کا کلام ہے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے ادا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ یا تو صیغہ واحد متکلم یا جمع متکلم میں ارشاد فرماتے ہیں لیکن بیان کرنے والے رسول اللہ ﷺ ہیں۔ اس کے الفاظ چونکہ رسول اللہ ﷺ کے ہیں اس لئے یہ وحی قرآن مجید میں شامل نہیں ہے۔ اس کی تلاوت نہیں ہوتی، وہ قرآن مجید میں نہیں لکھی جاتی۔ لیکن وہ اللہ کا کلام ہے۔ مثال کے طور پر صحیح بخاری میں ہے جیسا کہ کل عرض کیا تھا، میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرے سے قربت حاصل کر سکتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ جب وہ میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے تو میں ایک باع (اس فاصلے کو جو دونوں بازوؤں کو دائیں بائیں پوری طرح پھیلانے کے وقت ہاتھوں کی انگلیوں کے آخری سروں کے درمیان ہوتا ہے، اس کو عربی زبان میں باع کہتے ہیں، آپ کہہ سکتے ہیں کہ دو گز کا فاصلہ) اس کی طرف بڑھتا ہوں۔ جب وہ میری طرف آہستہ چلتا ہے تو میں لپک کے اس کی طرف چلتا ہوں۔ جو لپک کر میری طرف آتا ہے تو میں دوڑ کر اس کی طرف آتا ہوں۔ یہ ارشاد باری تعالیٰ کی طرف سے حضورؐ نے صیغہ واحد متکلم میں ارشاد فرمایا۔ یہ حدیث حدیث قدسی کہلاتی ہے۔

احادیث قدسیہ کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ کل احادیث کی تعداد اگر پچاس ہزار ہو، جیسا کہ بعض لوگوں کا اندازہ ہے یا ساٹھ ہزار ہو جیسا کہ کچھ اور لوگوں کا اندازہ ہے۔ تو ان میں سے چند سو احادیث ہیں جو احادیث قدسیہ کہلاتی ہیں۔ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ ان کی تعداد تین سو کے لگ بھگ ہے۔ احادیث قدسیہ کے مجموعے الگ سے بھی شائع ہوئے ہیں۔ تقریباً ایک درجن مجموعے ہیں جن میں احادیث قدسیہ الگ شائع کر دی گئی ہیں۔ ایک مجموعہ میں ایک سو کے قریب احادیث ہیں، ایک دوسرے مجموعہ میں دو سو بیس احادیث ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تعداد تین سو کے لگ بھگ ہے۔ یہ تین سو احادیث ایک طرف سے قرآن مجید سے ملتی جلتی

حرف ہے بلکہ الگ حرف ہے، میم الگ حرف ہے۔ یہ خصوصیت صرف قرآن پاک کی ہے جو حدیث قدسی کو حاصل نہیں ہے۔ حدیث قدسی آپ پڑھیں تو اس میں اتنا اجر نہیں ہے جو قرآن پاک کی تلاوت میں ہے۔

ساتواں بڑا فرق یہ ہے کہ قرآن پاک وحی جلی ہے اور حدیث قدسی وحی خفی ہے۔ آٹھواں فرق یہ ہے کہ قرآن پاک روح الامین جبریلؑ لے کر نازل ہوتے تھے، جبکہ حدیث قدسی کسی بھی طریقے سے آسکتی تھی۔ نواں فرق یہ ہے کہ قرآن وحی متلو ہے، اس کی تلاوت ہوتی ہے۔ حدیث قدسی وحی متلو نہیں ہے۔ اس کی تلاوت نہیں ہوتی۔ دسواں فرق یہ ہے کہ قرآن مجید کے الفاظ متواتر ہیں۔ ضروری نہیں کہ حدیث قدسی بھی متواتر ہو۔ اگرچہ ایک دو قدسی حدیثیں ایسی ہیں جو کہ متواتر بھی ہیں، لیکن اکثر احادیث قدسیہ متواتر نہیں ہیں۔ گیارھواں فرق یہ ہے کہ قرآن پاک مصاحف میں لکھا ہوا ہے اور یکجا موجود ہے۔ احادیث قدسیہ مصاحف میں نہیں ہیں اور کسی ایک سرکاری یا باضابطہ مجموعہ میں یکجا موجود نہیں ہیں۔

احادیث اور سنت کا جو ذخیرہ ہمارے پاس موجود ہے یہ درجنوں نہیں بلکہ سینکڑوں کتابوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتابیں جو آج کتب حدیث کی ہمارے پاس موجود ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔ ان کی ترتیب اور تدوین کیسے ہوئی اس پر بعد میں بات ہوگی۔ لیکن اس وقت جو ذخیرہ جیسا کہ موجود ہے اس پر بات کریں گے۔ اگر ہم کسی بھی لائبریری میں جائیں تو وہاں جو کتابیں حدیث کی موجود ہیں وہ دو طرح کی ہیں۔ کچھ کتابیں تو وہ ہیں جو حدیث کی اصلی اور بنیادی کتابیں کہلاتی ہیں۔ اصلی اور بنیادی کتابیں وہ ہیں جن کو ان کتابوں کے مؤلفین اور جلیل القدر مرتبین نے براہ راست روایت کر کے مرتب کیا ہے۔ دوسری کتابیں وہ ہیں جن کی تعداد زیادہ ہے جو محدثین نے براہ راست روایت کر کے مرتب نہیں کیں بلکہ دوسرے مجموعے سامنے رکھ کر ان مجموعوں سے احادیث کا انتخاب کر کے ان کے مجموعوں کو مرتب کیا ہے۔

آخری کتاب جو براہ راست روایت کر کے مرتب ہوئی ہے وہ امام بیہقی کی سنن الکبریٰ ہے۔ امام بیہقی وفات کے اعتبار سے سب سے بڑے اور نمایاں محدث ہیں کہ ان کی کتاب آخری کتاب ہے جو براہ راست روایت کر کے مرتب کی گئی ہے۔ ان کے بعد براہ راست حدیث روایت کر کے مرتب کرنے والے دنیا سے ختم ہو گئے

درجے ہونا اصل حقیقت کے اعتبار سے ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے تین درجے قرار دیے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ درجہ اول میں وہ کتابیں شامل ہیں جن میں تمام احادیث صحیح ہیں اور مستند ہیں۔ کوئی ایک حدیث بھی ان میں ایسی نہیں ہے جو صحت کے اعلیٰ ترین معیار سے کم ہوئی ہو۔ اس درجہ کی کتابوں میں صرف مستند اور صحیح احادیث شامل ہیں۔ وہ تقریباً تمام محدثین کے نزدیک اتفاق رائے سے تین کتابیں ہیں۔ 'تقریباً' کا لفظ میں نے اس لئے استعمال کیا کہ شاید ایک آدھ کا کوئی جزوی اختلاف ہوگا۔

احادیث کی یہ تین کتابیں صحت کے اعلیٰ ترین درجہ پر فائز ہیں۔ موطا امام مالک، جس کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے۔ کتاب اللہ کے بعد صحیح ترین کتاب بعض لوگوں کے خیال میں موطا امام مالک ہے۔ امام شافعی کی بھی یہی رائے ہے۔ امام شافعی جو بہت بڑے محدث بھی ہیں اور بہت بڑے فقیہ بھی ہیں، وہ موطا امام مالک کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ قرار دیتے ہیں۔ موطا امام مالک کے بعد صحیح بخاری کا درجہ ہے۔ جو مسلمانوں کی غالب ترین اکثریت کی نظر میں اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے۔ اللہ کی کتاب کے بعد صحیح ترین کتاب دراصل ان کے نزدیک صحیح بخاری ہے۔ تیسرا درجہ صحیح مسلم کا ہے جو بعض اہل مغرب کے نزدیک اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے۔ اہل مغرب سے مراد یورپ یا امریکہ والے نہیں ہیں، بلکہ اسلامی اصطلاح میں اہل مغرب سے مراد سپین، اندلس، مراکش، الجزائر اور تیونس کے علاقے ہیں۔ یہ مغارب یا اہل مغرب کہلاتے تھے۔ یہ پورا علاقہ دنیائے اسلام کے انتہائی مغرب میں تھا۔ اس لئے وہاں کے لوگوں کی رائے بیان کرنا ہو تو مغارب یا اہل مغرب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ تو بعض اہل مغرب کی رائے ہے کہ صحیح مسلم اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے۔

یہ بحث ہمیشہ مسلمانوں میں چلتی رہی کہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ ان تینوں میں سے کون سی کتاب ہے۔ جو حضرات موطا امام مالکؒ کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ قرار دیتے ہیں ان کا کہنا یہ ہے کہ موطا امام مالکؒ میں جتنی احادیث آئی ہیں وہ بخاری کی بھی مستند ترین اور صحیح ترین احادیث ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ امام مالکؒ ان تمام محدثین میں، جن کی کتابیں آج ہمارے سامنے ہیں اور مشہور و معروف ہیں اور قدیم ترین مجموعہ حدیث کے مرتب ہیں، امام مالکؒ سے زیادہ قریب رسول ﷺ کے زمانہ مبارک سے معروف صاحب تصنیف محدثین میں سے کسی اور

محدث کو حاصل نہیں تھی۔ علم حدیث میں ایک خاص اہتمام یہ کیا جاتا تھا کہ سند حتی الامکان چھوٹی سے چھوٹی ہو یعنی راویوں کا بیان رسول اللہ ﷺ تک جتنا کم ہو اتنا اچھا ہے۔ ان میں اعلیٰ ترین سند وہ سمجھی جاتی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ تک کم سے کم واسطے ہوں۔ اور جتنے زیادہ واسطے ہوں اتنا ہی سند نازل مانی جاتی تھی۔ سند عالی یعنی اونچی سند وہ سمجھی جاتی تھی جس میں کم واسطے ہوں۔ اس کے مقابلہ میں سند نازل وہ ہوتی تھی جس میں زیادہ واسطے ہوں۔ امام مالکؒ کی جتنی سندیں ہیں وہ باقی سب محدثین کے مقابلہ میں عالی سندیں ہیں۔ ثلاثیات کتب حدیث میں امتیازی اعزاز کی بات سمجھی جاتی ہے۔ کتب حدیث میں ثلاثیات سے مراد وہ احادیث ہیں کہ جن کے مرتب کرنے والے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان صرف تین واسطے ہوں۔ تین سے زیادہ نہ ہوں۔ امام مالکؒ کی بیشتر سندیں ثلاثی ہیں اور کچھ سندیں ثنائی بھی ہیں جن میں صرف دو واسطے ہیں۔ ایک امام مالکؒ کے استاد اور ایک صحابی۔ چنانچہ امام مالکؒ کی موطا میں بہت سی احادیث ملیں گی مالک عن نافع عن ابن عمر۔ امام مالکؒ اپنے استاد نافع سے روایت کرتے ہیں، امام نافع اپنے استاد عبداللہ بن عمرؓ سے اور وہ رسول اللہ ﷺ سے۔ لہٰذا اس علوِ اسناد کی رو سے امام مالکؒ کی کتاب رسول اللہ ﷺ سے دور میں سب سے اقرب ترین کتاب ہے اور وہ اس لئے اصح یعنی صحیح ترین قرار دیئے جانے کی مستحق ہے۔

جمہور امت کی غالب ترین اکثریت کی رائے یہ ہے کہ صحیح بخاری اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے۔ صحیح بخاری اصح الکتب بعد کتاب اللہ جن اسباب کی وجہ سے ہے ان اسباب پر ابھی گفتگو کرتے ہیں۔ لیکن ایک بات ذہن میں رہے کہ موطا امام مالکؒ کی جتنی صحیح احادیث ہیں وہ ساری کی ساری نہیں تو ان کا بیشتر حصہ صحیح بخاری میں شامل ہو گیا ہے۔ اس لئے جب صحیح بخاری کو اصح الکتب کہا جائے گا تو موطا امام مالکؒ کی صحیح روایات خود بخود اصح الکتب بن گئیں۔ ایک دوسری وجہ موطا امام مالکؒ کو اصح الکتب قرار نہ دینے کی یہ بھی ہے کہ امام مالکؒ جب اپنی کتاب موطا تحریر فرما رہے تھے تو ان کا مقصد صرف اور صرف احادیث کا مجموعہ مرتب کرنا نہیں تھا بلکہ حدیث اور فقہ اور صحابہ اور تابعین کی سنت کو یکجا کرنا مقصود تھا۔ لہٰذا امام مالکؒ کی کتاب میں جہاں احادیث ہیں وہاں صحابہ کے اقوال بھی ہیں اور تابعین کے ارشادات اور آثار بھی ہیں اور اس موضوع پر امام مالکؒ کا اپنا مشاہدہ بھی شامل ہے کہ مدینہ منورہ کا عام طریقہ کیا تھا۔ تو گویا یہ ایک ایسی کتاب ہے

جس کا میدان یا دائرہ کار کتب حدیث سے ذرا مختلف اور بڑھ کر ہے۔ یہ خالص حدیث کی کتاب ان معنوں میں نہیں ہے جن معنوں میں حدیث کی اور کتابیں ہیں۔ اس میں احادیث کے علاوہ بھی بہت سے مباحث ہیں۔ امام مالکؒ کے اپنے فتاوی بھی اس میں ہیں۔ بعض جگہوں پر امام مالکؒ کے اپنے ارشادات بھی اس میں بیان ہوئے ہیں۔ تو گویا یہ فقہ اور حدیث دونوں کتابوں کا مجموعہ ہے۔ خالص حدیث کی کتابوں میں صحیح ترین کتاب صحیح بخاری ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک صحیح ترین کتاب صحیح مسلم ہے۔ بہر حال یہ تین کتابیں طبقہ اول کی کتابیں ہیں۔

طبقہ دوم کی کتابیں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی نظر میں چار ہیں۔ جامع ترمذی، سنن ابو داؤد، سنن نسائی اور مسند امام احمد۔ طبقہ دوم کی کتابیں وہ ہیں کہ جن کی بیشتر احادیث صحیح احادیث ہیں۔ اکثر و بیشتر احادیث سند کے اس معیار پر پورا اترتی ہیں۔ کچھ احادیث ہیں جو صحت کے معیار سے ذرا کم ہیں۔ ان معیارات کا ابھی تذکرہ کرتے ہیں۔ اور بہت تھوڑی احادیث ہیں جو ضعیف ہیں یا جن کا ضعف بہت نچلے درجے کا ہے۔ ضعیف ہیں تو معمولی درجہ کا ضعف ہے اور زیادہ سنجیدہ انداز کا ضعف نہیں ہے۔ یہ درجہ دوم کی احادیث ہیں۔

درجہ دوم کی احادیث میں جو بنیادی خصائص ہیں وہ یہ ہیں کہ اگرچہ یہ صحیحین یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے درجے تک تو نہیں پہنچتیں لیکن ان میں شامل بیشتر احادیث صحیح احادیث ہیں۔ ان کتابوں کے مصنفین اور مرتبین نے احادیث میں اپنے لئے جو شرائط مقرر کی ہیں اور جو معیار انتخاب انہوں نے حدیث کا رکھا اس میں انہوں نے کسی تساہل سے کام نہیں لیا۔ بلکہ اکثر و بیشتر کڑا معیار اپنے سامنے رکھا۔ پھر یہ احادیث جو ان چار کتابوں میں آئی ہیں یعنی ترمذی، ابو داؤد، امام احمد اور نسائی۔ ان احادیث کو امت میں قبول عام حاصل ہوا۔ ایک عام مقبولیت ان احادیث کو حاصل ہوگئی اور محدثین اور فقہا کا ایک اصول یہ ہے (محدثین اس سے اتفاق کم کرتے ہیں فقہا زیادہ کرتے ہیں۔) فقہا یہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی حدیث روایت کے اعتبار سے ذرا کمزور بھی ہو لیکن اس کو تلقی بالقبول حاصل ہو تو وہ حدیث قابل قبول ہے۔ تلقی بالقبول ایک اصطلاح ہے جس کا مطلب امت کے عام اہل علم نے اس کو قبول کیا ہو اور اس پر عمل درآمد کرتے ہوں، وہ حدیث صحیح کی نشانی ہے۔ ورنہ اگر اس میں کوئی کمزوری ہوتی تو امت عام طور پر اس کو قبول نہ کرتی۔ تلقی بالقبول خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ حدیث اونچے درجہ کی حدیث ہے۔ تو یہ چاروں کتابیں وہ

ہیں جن میں درج احادیث کو تلقی بالقبول حاصل ہوئی۔

ان میں ماخذ شریعت کے تمام بنیادی اصول پائے جاتے ہیں۔ شریعت کے جتنے احکام احادیث میں آئے ہیں۔ وہ ساری احادیث بڑی تعداد میں، شاید پچانوے فیصد کے قریب ان کتابوں میں موجود ہیں۔ چنانچہ لوگوں نے لکھا ہے کہ سنن ابوداود میں احادیث احکام کا اتنا بڑا مجموعہ ہے کہ اگر کسی کے پاس یہ کتاب ہو تو گویا اس کے گھر میں ایک نبی موجود ہے۔ کسی سابقہ مصنف نے لکھا کہ سنن ابوداود کی گھر میں موجودگی گویا گھر میں ایک بولتے نبی کی موجودگی ہے کہ نبی کے ارشادات ہر وقت آپ کے سامنے رہیں گے۔ اور احکام آپ کو معلوم ہوتے رہیں گے۔

ان کتابوں کے علاوہ احادیث کی جو بقیہ کتابیں ہیں وہ حضرت شاہ ولی اللہ کے نزدیک تیسرے اور آخری درجہ میں آتی ہیں۔ یہ وہ کتابیں ہیں جن میں ضعیف احادیث بڑی تعداد میں پائی جاتی ہیں۔ یہ وہ کتابیں ہیں جن کی سندوں میں بعض ایسے راوی آئے ہیں جو مجہول الحال ہیں، جن کی کیفیت معلوم نہیں کہ وہ مستند تھے کہ غیر مستند تھے۔ اس لئے ان احادیث پر صرف وہ لوگ اعتماد کر سکتے ہیں جو علم حدیث کے متخصص ہوں اور فن روایت اور علم رجال میں تعمق رکھتے ہوں۔ علم حدیث پر اچھی نظر نہ رکھنے والے کے لئے ان احادیث میں کمزور یا غیر کمزور کو متعین کرنا بڑا دشوار ہے۔ عام آدمی کے لئے ان کتابوں سے استفادہ کرنا بڑا دشوار ہے۔ اس لئے ان احادیث سے غیر متخصص کو براہ راست استفادہ نہیں کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ بہت سی غلط چیزیں ہوں گی، متعارض چیزیں ہوں گی تو عام آدمی الجھ کر رہ جائے گا اور پریشان ہوگا۔ لہٰذا صرف اہل علم کو ان کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

شاہ ولی اللہ کے علاوہ بعض لوگ اس تیسری کیٹیگری کی دو قسمیں کرتے ہیں۔ ایک کیٹیگری وہ ہے کہ جس میں نسبتاً قابل اعتماد چیزیں موجود ہیں۔ مثلاً سنن دارقطنی، مصنف ابن ابی شیبہ، مصنف عبدالرزاق، سنن دارمی۔ یہ وہ ہیں کہ جن میں بہت سی اچھی اور مستند چیزیں مل جاتی ہیں۔

ان کے بعد چوتھا درجہ ان کتابوں کا ہے جن میں بالکل قصے کہانیاں اور ادھر ادھر کی باتیں ہیں۔ جن کا کوئی قابل اعتبار ریکارڈ نہیں ہے۔ جن کے پیچھے کوئی مضبوط سند نہیں ہے۔ وہ قصے کہانیوں کے انداز میں بیان ہوتی ہیں۔ مثلاً دیلمی ایک مشہور محدث ہیں، ان کا آپ نے نام سنا ہوگا۔ ان کی کتاب مسند دیلمی ہے۔ اسی طرح ابن مردویہ کی کتاب ہے۔ اس طرح کے قصے کہانیوں کی سب کتابیں ہیں۔ جن کا کوئی علمی مقام نہیں ہے اس لئے ان کو بالکل نظر انداز کر دینا

سے آگے عرب، حجاز، بغداد وغیرہ میں تشریف لے گئے اور وہاں انہوں نے اپنی یہ عظیم کتاب مرتب فرمائی۔ لہٰذا ہم اہل پاکستان صحاح ستہ کے مصنفین میں سے ایک مصنف یعنی امام ابوداؤد کے ہم وطن ہیں۔

امام نسائی کی کتاب کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے حدیث کے متن اور رسول اللہ ﷺ کے الفاظ مبارک کی صحت کا بڑا اہتمام کیا ہے۔ احادیث کے متن کو نقل کرنے میں کہیں کہیں اختلافی روایات ہیں۔ ایک صحابی نے ایک طرح سے نقل کیا ہے، دوسرے صحابی نے دوسری طرح نقل کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وہ بات دو مرتبہ ارشاد فرمائی ہو۔ اور دو مرتبہ مختلف الفاظ میں ارشاد فرمائی ہو۔ ہو سکتا ہے ایک ہی مرتبہ ارشاد فرمائی ہو لیکن ان دونوں سننے والے صحابہ کا لہجہ الگ الگ ہو اور سننے والے نے اپنے لہجے میں بیان کر دیا ہو۔ دونوں چیزوں کا امکان ہے۔ اب ان حالات میں یہ تعین کرنا کہ رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے کون سا لہجہ نکلا تھا، یہ خاصی محنت اور تحقیق کا کام ہے۔ امام نسائی نے یہ کاوش کی ہے کہ صحت متن کا اہتمام کریں اور اس بات کو یقینی بنائیں کہ متن زیادہ سے زیادہ رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلنے والے الفاظ کے مطابق ہو۔ اسی لئے سنن پر جتنی کتابیں ہیں ان میں ضعیف احادیث کی سب سے کم تعداد سنن نسائی میں ہے۔ یہ نسائی نسا شہر کے ساتھ ہے نسائی۔ اس کا نساء یعنی عورتوں سے کوئی تعلق نہیں۔ نسا وسط ایشیا میں کوئی شہر تھا جو آج کل غالباً ترکمانستان میں ہے۔ وہاں سے ان کا تعلق تھا۔ نسا سے نسبت ہے نسائی۔

ابن ماجہ جو اکثر لوگوں کے خیال میں صحاح ستہ کی آخری کتاب ہے۔ اس کی ترتیب بڑی اچھی ہے۔ پہلے کون سی احادیث ہوں، پھر کون سی ہوں، پھر کون سا باب ہو، پھر بڑے ابواب میں ذیلی ابواب کی تقسیم ہے، پھر چھوٹے ابواب میں انفرادی موضوعات کی تقسیم ہے۔ اس سلسلہ میں محدثین نے سب سے زیادہ مفید اور حسین ترتیب اختیار فرمائی، وہ امام ابن ماجہ نے اختیار فرمائی۔ ابن ماجہ کی کتاب حسن ترتیب اور حسن تبویب کے اعتبار سے بڑی عمدہ اور اچھے انداز کی مانی جاتی ہے۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم، یہ دونوں صحیحین کہلاتی ہیں یعنی دو صحیح کتابیں۔ جب صحیحین کا لفظ استعمال کیا جائے گا تو بخاری اور مسلم مراد ہوں گے۔ شیخین کا لفظ بولا جائے گا تو بھی بخاری و

چونکہ محدثین کی معاشرہ میں بہت عزت ہوئی، لوگوں نے ان کو ہاتھوں ہاتھ رکھا اور ان کا احترام بادشاہوں سے بھی زیادہ ہونے لگا تو بہت سے ایسے لوگ بھی میدان میں آ گئے کہ جن کا مقصد دنیاوی عزت تھا یا کم از کم جزوی طور پر وہ دنیاوی عزت میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ جوں جوں ایسے لوگوں میں اضافہ ہوتا گیا محدثین اپنا معیار کڑا کرتے گئے یعنی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کو مزید سخت کرتے گئے۔

اب تک حدیث بیان کرنے کے دو طریقے ہوتے تھے۔ ایک طریقہ یہ ہوتا تھا کہ طلبہ سامنے بیٹھ گئے۔ محدث، مثلاً امام بخاری نے اپنی یادداشت یا اپنے تحریری ذخیرے سے حدیث بیان کرنی شروع کر دی اور لوگوں نے لکھنا شروع کر دیا۔ لوگوں کی تعداد خاصی بڑی ہوتی تھی اور درمیان میں مستملی بھی ہوتے تھے۔ یعنی ہر دو چار سو آدمیوں کے درمیان ایک آدمی بیٹھا ہوتا تھا جو بلند آواز سے ان الفاظ کو دہراتا تھا۔ جیسے نماز میں امام کے الفاظ دہرائے جاتے ہیں یا نماز میں اللہ اکبر دہرایا جاتا ہے۔ اس طرح مستملی ہوا کرتے تھے۔ بعض اوقات کئی کئی سو مستملی ہوا کرتے تھے جو ان الفاظ کو دہرایا کرتے تھے۔ محدث نے ایک لفظ کہا کہ انما الاعمال بالنیات۔ اب پہلے مستملی نے دہرایا، پھر دوسرے مستملی نے، پھر تیسرے نے، پھر چوتھے نے، اور کوئی چند منٹ میں سب لوگوں نے لکھا۔ پھر انہوں نے اگلا جملہ بولا، پھر اس سے اگلا۔ ایک طریقہ تو یہ تھا۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ طلبہ کے پاس تحریری ذخیرے موجود ہیں۔ امام بخاری نے جو لکھا، طلبہ نے اس کے تحریری نسخے پہلے ہی حاصل کر لئے۔ لیکن اب طالب علم، امام بخاری کو سنا رہا ہے اور سننے کے دوران جہاں غلطی ہے وہ ٹھیک کر دیتے ہیں اور غلطی نہیں ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ ٹھیک ہے، میں نے اجازت دے دی ہے، اب تم میری طرف سے روایت کر سکتے ہو۔ بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ سب نے پڑھ کر سنا دی۔ اگر چار پانچ ہزار طلبہ ہوں تو سب سے پڑھوا کر نہیں سنا جا سکتا۔ اس میں تو ایک ایک حدیث کے لئے پورا سال چاہئے۔ اس کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ ایک طالب علم پڑھتا تھا اور بقیہ سنتے تھے اور پھر امام بخاری یا جو بھی محدث ہوتے تھے وہ اجازت دیتے تھے کہ اس طرح سے آپ سب لوگوں کو پڑھنے کی اجازت ہے۔ درمیان میں بطور احتیاط کسی سے سن بھی لیا، کبھی ایک سے، کبھی دوسرے سے، اور سب کے بارے میں اندازہ ہو گیا کہ سب نے پڑھا ہے۔

بعد میں محدثین نے ان تینوں طریقوں کے تین درجات مقرر کئے۔ یہ تین گویا الگ الگ درجات ہو گئے۔ ایک تو وہ کہ جس میں محدث نے خود پڑھا اور لوگوں نے سنا۔ دوسرے میں طالب علم نے خود پڑھا اور محدث نے سنا۔ تیسرے میں ایک طالب علم نے پڑھا اور محدث نے سنا لیکن دوسرے بہت سے طلبہ نے بھی سنا۔ امام مسلم کے ہاں ان تینوں میں الگ الگ فرق کیا گیا ہے۔ امام بخاری کے ہاں یہ فرق نہیں ہے۔ امام مسلم کی اصطلاح یہ ہے کہ اگر امام مسلم نے کہا کہ حدثنا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ امام مسلم کے استاد نے حدیث پڑھی، امام مسلم نے سنی اور ان کے ساتھ بھی۔ اگر امام مسلم نے کہا کہ اخبرنا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ امام مسلم نے حدیث پڑھی، ان کے استاد نے سنی اور ان کو اجازت دے دی۔ اور اگر کہیں ایسا ہوا کہ امام مسلم اپنے استاد کے درس میں موجود تھے، کسی اور نے حدیث پڑھی اور امام مسلم نے سنی تو امام مسلم کہتے ہیں کہ حدثنا فلان قرئۃ علیہ وانا اسمع، ان کے سامنے پڑھا جا رہا تھا اور میں سن رہا تھا۔ آپ دیکھیں کہ accuracy کی اس سے بہتر مثال دنیا میں کہیں مل نہیں سکتی۔ اگر آپ یہودیوں اور عیسائیوں کے سامنے یہ بیان کریں تو وہ دنگ رہ جائیں گے کہ کسی کام میں اتنی accuracy بھی ہو سکتی ہے۔ کہ محدث نے خود نہیں پڑھا فقرۃ علیہ وانا اسمع، میرے استاد کے سامنے پڑھا جا رہا تھا اور دوسرے طالب علم کے ساتھ ساتھ میں بھی سن رہا تھا۔ استاد نے اسی طرح سن کر اس کی اجازت دی تھی۔ یہ ذرا سا فرق امام مسلم کے ہاں ہے اور امام بخاری کے ہاں نہیں ہے۔

احادیث نبوی کی تعداد

تعداد کے اعتبار سے صحیح مسلم کی احادیث زیادہ ہیں، صحیح بخاری کی احادیث کم ہیں۔ آپ کو پتہ ہے کہ حدیث کی ہر کتاب میں ایک ایک حدیث بار بار آتی ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں اگر خطبہ حجۃ الوداع کا ذکر آئے گا تو اس میں درجنوں موضوعات پر بات ہوئی ہے۔ تو جہاں عورتوں کے حقوق کا ذکر ہے وہاں خطبہ حجۃ الوداع کا بھی ذکر آئے گا، جہاں لوگوں کی برابری اور مساوات کا ذکر ہے وہاں بھی اس خطبہ کا حوالہ آئے گا۔ جہاں حج کے مناسک کا ذکر ہے وہاں بھی خطبہ کا کوئی نہ کوئی حصہ زیر بحث آئے گا۔ جہاں منیٰ کا ذکر ہے وہاں بھی آئے گا۔ جہاں عرفات کا ذکر ہے وہاں بھی آئے گا۔ اس طرح ایک حدیث کئی ابواب میں آ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث کی

کتابوں میں تکرار اور مکررات بہت ہوتے ہیں۔ مکررات کو نکالے بغیر اگر صحیح بخاری کی احادیث کو گنا جائے تو صحیح بخاری کی احادیث کی تعداد ۹ ہزار بیاسی ہے (9082)۔ یہ تعداد حافظ ابن حجر نے بیان کی ہے جن سے بڑا بخاری کا شارح پیدا نہیں ہوا۔ یہ بات میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ اس میں مکررات بھی شامل ہیں، تعلیقات بھی شامل ہیں، متابعات بھی شامل ہیں اور شواہد بھی شامل ہیں۔ مکررات کو اگر نکال دیا جائے اور صرف وہ احادیث جو براہ راست پوری سند کے ساتھ رسول اکرم ﷺ سے روایت ہوئی ہیں وہ نکالی جائیں تو ۲ ہزار ۶ سو ۲ (2,602) ہیں۔ اس کے برعکس صحیح مسلم میں کل چار ہزار احادیث ہیں۔ گویا چار ہزار احادیث صحیح مسلم میں ہیں اور دو ہزار احادیث صحیح بخاری میں ہیں۔

احادیث کی کل تعداد کیا ہے؟ اس کے بارے میں کچھ کہنا بڑا دشوار ہے۔ لیکن ایک عام اندازہ یہ ہے کہ مکررات کو نکال لینے کے بعد کل متون تیس سے پچاس ہزار کے درمیان ہیں۔ آج کل کمپیوٹر کا زمانہ ہے۔ بہت سے لوگوں نے حدیث کی کتابیں کمپیوٹرائز کرنا شروع کی ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد جب ساری کتابیں کمپیوٹرائزڈ ہو جائیں گی تو تمام احادیث کی اصل تعداد سامنے آجائے گی۔ اس میں بھی قطعیت کے ساتھ تعداد کا تعین کرنا دشوار ہوگا۔ اس لئے کہ کمپیوٹر مکررات کی شناخت نہ کر سکے گا۔ ایک حدیث کے الفاظ اگر مختلف ہیں لیکن مفہوم ایک ہے تو کمپیوٹر اس کو دو احادیث قرار دے گا۔ لیکن حدیث کا طالب علم اس کو ایک ہی حدیث سمجھے گا۔ اس لئے تحقیق کے ساتھ کمپیوٹر کے لئے بھی دشوار ہوگا کہ بالکل درست تعداد دے سکے۔ تاہم یہ تعداد تیس اور پچاس ہزار کے درمیان ہے۔

حجیت سنت

حجیت الحدیث یعنی کہ سنت کتاب اللہ کے ساتھ حجت ہے اور قرآن مجید کے احکام کی شارح ہے۔ اس پر فقہائے اسلام نے بڑی تفصیل کے ساتھ غور کیا ہے۔ اور سنت کے کردار پر بات کی ہے۔ قرآن مجید میں بنیادی اصول یعنی اصول عامہ ہیں۔ سنت میں ان اصولوں کی تطبیق بیان کی گئی ہے۔ قرآن پاک میں اجمال ہے، سنت میں تفصیل بیان کی گئی ہے۔ مثلاً قرآن پاک میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا فریضہ یہ ہے کہ لتبین للناس ما نزل الیہم کہ جو کچھ اللہ کی

ہے۔ لیکن بالواسطہ قرآن میں یہ بھی شامل ہے کہ اگر دونوں فریق راضی ہوں تو یہ ہو سکتا ہے۔ لہذا قرآن پاک میں اس طرح کی بالواسطہ بنیادیں تو ہیں لیکن براہ راست بنیاد کا تعین کرنا مشکل ہے۔

شفعہ کے بارے میں حدیث میں ہے کہ اگر آپ کے پڑوس میں کوئی جائیداد بک رہی ہو یا آپ کسی جائیداد میں شریک ہوں، اس میں آپ کا حصہ ہو اور ایک حصہ دار اپنا حصہ بیچ رہا ہو تو پہلا حق آپ کا ہے۔ یہ بات کہ غیر آدمی کو آپ نے اپنی زمین کے ساتھ کا ٹکڑا بیچا ہے اور یہ دوسری جگہ پہنچا ہوا ہے۔ بچے ہیں۔ اب انہوں نے اپنا حصہ بیچنا چاہا تو پتا چلا کہ اس نے کسی غیر آدمی کو دے دیا اور آپ کا اس سے نقصان ہو، یا پڑوس کے مسائل پیدا ہوں یا اور کوئی مسئلہ ہو تو آپ کو شریعت نے یہ حق دیا ہے کہ آپ جس پارٹنر یا کسی بھی شریک جائیداد سے کہیں کہ یہ حصہ کسی اور کو بیچنے کے بجائے مجھے دے دو۔ اب بیچنے والے کی ذمہ داری ہے کہ پہلے آپ کو ترجیح دے اور آپ کے ہاتھ فروخت کرے۔ یہ شفعہ کے بارے میں شریعت کا حکم ہے جو آج دنیا کے بہت سے قوانین میں مستعمل ہوتا ہے اور اب دنیا اس سے مانوس ہو گئی ہے۔ لیکن انگریزی زمانے سے یہ مشکل کیوں چلا آ رہا ہے کہ شہری جائیداد پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔ کیوں نہیں ہوتا؟ ہونا چاہیے۔ شریعت کا جو منشا ہے وہ ہر جائیداد پر حق شفعہ کے لاگو ہونے سے ہی پورا ہو سکتا ہے۔ یہاں شہری جائیداد کا استثنا کر دیا گیا ہے اور غیر شہری جائیداد پر ہی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

یہ اس موضوع پر گفتگو کا مختصر خلاصہ ہے کہ حدیث ماخذ شریعت ہے۔ کس طرح ماخذ شریعت ہے؛ اس سے احکام نکالنے میں احادیث کے درجات کا لحاظ رکھا جائے گا۔ صحت کے لحاظ سے، ثبوت کے اعتبار سے، معنی کے اعتبار سے احادیث کے جو مختلف درجات ہیں، ان سب کو پیش نظر رکھ کر طے کیا جائے گا کہ کس حدیث سے کون سے احکام نکلتے ہیں۔ ان کے حساب سے احکام کا درجہ متعین ہوگا۔ جو حدیث متواتر کے درجہ کی ہے، جس پر کامل بات ہو چکی، اس کا درجہ سب سے اونچا ہے۔ پھر آگے مختلف درجات ہیں جن پر ہم آئندہ بات کریں گے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين۔

☆☆☆☆☆☆☆

چوتھا خطبہ

روایت حدیث اور اقسام حدیث

جمعرات، 9 مئی 2003ء

روایت حدیث اور اقسام حدیث

علم حدیث بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم ہے۔ ایک حصہ وہ ہے جس کو علم روایت کہتے ہیں اور دوسرا حصہ وہ ہے جس کو علم درایت کہتے ہیں۔ علم روایت میں اس ذریعہ یا وسیلہ سے بحث ہوتی ہے جس کے ذریعے کوئی حدیث رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارک سے لے کر ہم تک پہنچا ہے۔

روایت اور درایت

روایت، سند، راوی، راوی کا سچا یا غیر سچا ہونا، راوی کا کردار، اس کا حافظہ یہ ساری چیزیں علم روایت میں زیر بحث آتی ہیں۔ علم درایت کی زیادہ توجہ حدیث کے متن اور اس حصہ پر ہوتی ہے جو رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی سے عبارت ہے۔

میں آپ کے سامنے آج ایک کتاب لے کر آیا ہوں۔ اس میں سے بعض چیزیں مثال کے طور پر آپ کے سامنے رکھوں گا۔ یہ ایک ضخیم کتاب ہے اور ساری صحاح ستہ اس میں شامل ہیں۔ صحاح ستہ کا مکمل نسخہ ایک جلد میں ہمارے ایک دوست نے شائع کیا ہے۔ جس میں ساری کی ساری چھ کتابیں شامل ہیں۔

میں ایک حدیث پڑھتا ہوں اور پھر یہ بتاؤں گا کہ اس میں علم روایت سے کس جگہ بحث ہوتی ہے اور علم درایت سے کس جگہ بحث ہوتی ہے۔ یہ صحیح بخاری کی کتاب الایمان ہے۔ کتاب الایمان کا باب نمبر پانچ ہے جس کا عنوان ہے 'باب ای الاسلام افضل'۔ یعنی سب سے اچھا اور افضل اسلام کونسا ہے یا کس کا ہے۔

پوچھا کہ یا رسول اللہ کون سا اسلام افضل ہے؟ آپ نے فرمایا وہ اسلام جس میں مسلمان ایک دوسرے کی زبان اور ہاتھ سے محفوظ رہیں۔ اس ارشاد نبوی کا مطالعہ کریں تو یہ چیز ثابت ہوتی ہے اور جو چیز ثابت ہوتی ہے وہ شریعت کے کون اصول اور تصورات کے مطابق ہے کہ نہیں۔ یہ ساری چیزیں جس فن کے ذریعے مطالعہ کی جائیں گی، اس فن کا نام ہے علم درایت۔ ہم پہلے علم روایت کی بات کرتے ہیں۔

علم روایت

علم روایت میں سب سے پہلے یہ چیز دیکھی جاتی ہے کہ راوی نے حدیث کا تحمل کیسے کیا۔ علم حدیث کے بارے میں راوی کے دو کردار ہیں۔ ایک کردار تو اس وقت آتا ہے جب اس نے وہ حدیث حاصل کی جو وہ بیان کر رہا ہے۔ دوسرا کردار اس وقت آتا ہے جب اس نے وہ حدیث آگے بیان کی۔ ایک کو تحمل کہتے ہیں اور دوسرے کو ادا کہتے ہیں۔ تحمل کا ترجمہ انگریزی میں آپ reception کر سکتے ہیں۔ تحمل کی اصطلاح یہاں بڑی معنی خیز ہے۔ تحمل کے لفظی معنی تو ہیں برداشت کرنا یا کسی بھاری چیز کو اٹھانا۔ یہاں تحمل حدیث کے معنی ہوں گے حدیث نبوی کی بھاری ذمہ داری یا امانت کو اٹھانا۔ ادا کا ترجمہ آپ delivery کر سکتے ہیں۔ جب اس نے حدیث کو اپنے شیخ سے receive کیا تو کہا جائے گا کہ راوی نے حدیث کا تحمل کیا۔ پھر جب راوی اس حدیث کو دوسرے لوگوں سے بیان کرے گا گویا دوسروں کو deliver کرے گا تو کہا جائے گا کہ اس نے حدیث کی یہ امانت ادا کر دی۔ ادا کے لفظ میں بھی امانت اور ذمہ داری کا مفہوم موجود ہے۔ یہ دو الگ الگ مراحل ہیں اور دونوں کے الگ الگ احکام اور الگ الگ شرائط ہیں۔

سماع

سب سے پہلے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ تحمل حدیث سے کیا مراد ہے۔ تحمل حدیث یعنی جب راوی حدیث کا مواد حاصل کر رہا ہے تو اس کے طریقے کیا کیا ہیں۔ سب سے پہلا طریقہ تو سماع کہلاتا ہے کہ انہوں نے براہ راست اپنے استاد یا شیخ کی زبان سے سنا ہو۔ شیخ نے حدیث پڑھ کر ان کو سنائی ہو اور سنانے کے بعد اجازت دی ہو۔ یہ طریقہ سماع کہلاتا ہے اور سب سے افضل طریقہ ہے۔

قراءت

اس کے بعد دوسرا طریقہ آتا ہے قراءت کا، جس میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ شاگرد نے استاد کے سامنے قراءت کی ہو اور قراءت سننے کے بعد استاد نے اجازت دی ہو کہ تمہاری قراءت درست ہے اب تم آگے میرے حوالے سے اس حدیث کو بیان کر سکتے ہو۔

اجازت

تیسرا درجہ اجازت کا ہے۔ اجازت سے مراد یہ ہے کہ استاد نے کسی صاحب علم کو، جس کے علم، ثقاہت اور تقویٰ پر استاد کو اعتماد ہو، یہ اندازہ کرنے کے بعد کہ یہ شخص حدیث کا علم رکھتا ہے، کسی خاص مجموعۂ حدیث کے روایت کرنے کی اجازت اس کو دے دی ہو۔ اجازت کا یہ طریقہ آج بھی زندہ ہے، ماضی میں بھی رائج تھا۔ ایک دوسرے کو اجازت دینے کا یہ طریقہ تابعین اور تبع تابعین کے زمانہ سے چلا آرہا ہے۔

یہ تین درجے تو وہ ہیں جو بڑے معیاری سمجھے جاتے ہیں اور صحاح ستہ کی احادیث انہی تین طریقوں سے آئی ہیں۔ زیادہ تر سماع کے طریقے سے، اور کچھ حصہ قراءت کے ذریعے اور تھوڑا حصہ اجازت کے ذریعے، جو بہت تھوڑا ایک برائے نام سا ہے۔ ان تین طریقوں کے علاوہ صحاح ستہ میں کسی اور طریقہ تحمل سے آئی ہوئی کوئی حدیث شامل نہیں ہے۔

مناولہ

اس کے علاوہ ایک اور طریقہ مناولہ کا طریقہ ہے۔ مناولہ کے معنی ہوتے ہیں کسی کو کوئی چیز دینا۔ مناولہ سے مراد یہ ہے کہ شیخ کے پاس احادیث کا ایک مجموعہ لکھا ہوا موجود ہے۔ جس میں ایک حدیث ہے، یا سو ہیں یا پانچ سو ہیں، وہ احادیث کا مجموعہ تحریری طور پر کسی کے حوالہ کرتے ہوئے کہہ دیا جائے کہ میری یہ کتاب آپ کے حوالے کر رہا ہوں، اس میں جو روایات ہیں آپ ان کو میری طرف سے بیان کر سکتے ہیں۔ مناولہ کا طریقہ تابعین اور تبع تابعین کے زمانے میں رائج نہیں تھا۔ بعد میں جب علم حدیث پوری طرح سے مدون ہو گیا اور کتابیں مرتب ہو گئیں، مجموعے مستند طور پر تیار ہو گئے تو پھر مناولہ کا طریقہ بھی رائج ہو گیا کہ ایک شیخ اپنا لکھا ہوا مجموعہ کسی شاگرد کو دے دیا

کرتے تھے اور کہتے کہ یہ لو اور اس کی بنیاد پر تم روایت کر سکتے ہو۔ یہ طریقہ جیسا کہ آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا، اتنا معیاری طریقہ نہیں تھا۔ صحاح ستہ میں کوئی حدیث اس بنیاد پر نہیں ہے اور حدیث کی بڑی بڑی کتابیں جو طبقہ دوم کی کتابیں ہیں۔ ان میں بھی اکثر و بیشتر احادیث اس طریقے کے مطابق نہیں ہیں۔ اِکّا دُکّا کوئی حدیث اس طریقے کے مطابق ہوئی تو ہوگی۔

مکاتبہ

اس کے بعد پانچواں طریقہ تھا مکاتبہ کا۔ کہ کسی استاد نے شاگرد کو کوئی حدیث لکھ کے بھیج دی اور اس کے بعد اس کی اجازت بھی دے دی یا شاگرد نے استاد کو خط لکھ کر دریافت کیا کہ فلاں حدیث یا اس مضمون کی کوئی حدیث اگر آپ کے علم میں ہے تو براہ کرم مجھے مطلع فرمائیں۔ استاد نے تحریری طور پر خط کے ذریعے مطلع کر دیا۔ یہ طریقہ مکاتبہ کہلاتا تھا۔ بظاہر آپ میں سے بعض کو خیال ہوگا کہ اس کا درجہ تو پہلے ہونا چاہئے۔ لیکن محدثین کے نزدیک اس کا درجہ بعد میں تھا۔ اس لئے کہ اس زمانے میں ذرائع آمد و رفت کے اسباب سے جب خط جاتے تھے تو اس میں چھ چھ مہینے اور سال سال لگ جایا کرتے تھے۔ یہ تعیین بڑا دشوار تھا کہ ایک شخص کے پاس جو تحریر پہنچی ہے، وہ فرض کیجئے کہ نیشاپور یا سمرقند یا بخارا سے لکھ کر گئی۔ ترکی اور تاجکستان ہوتی ہوئی کسی کے پاس آٹھ ماہ کے بعد پہنچی۔ اب قاہرہ میں بیٹھے ہوئے شخص کے لئے یہ تعیین بڑا دشوار تھا کہ یہ تحریر اسی استاد یا شیخ کی تحریر ہے جس کی طرف منسوب کی جا رہی ہے یا کسی اور نے لکھ کر اس کی طرف منسوب کر دی ہے۔ کیونکہ اس کا امکان موجود تھا۔ آج تو یہ امکان موجود نہیں ہے۔ آپ کا کوئی خط سعودی عرب سے آتا ہے تو آپ ٹیلیفون پر معلوم کر سکتے ہیں کہ واقعی یہ خط انہی بزرگ کا بھیجا ہوا ہے۔ اگلی مرتبہ جائیں تو تصدیق کر لیں۔ آج اس طرح کی تصدیق کرنا بہت آسان ہے۔ آج اگر تحریر کے ذریعے حدیث کی روایت ہوا کرتی تو اس کا درجہ بہت اونچا ہوتا۔ لیکن اس زمانے میں چونکہ جب یہ تصدیق اور تعیین بہت دشوار تھا اس لئے محدثین نے اس درجے کو بعد میں رکھا اور یہ پانچواں درجہ ہے۔

اعلام

چھٹا درجہ اعلام کہلاتا تھا۔ اعلام کے معنی ہیں مطلع کرنا اور بتا دینا۔ اصطلاح میں اعلام سے مراد شیخ کی طرف سے حدیث کے طالب علم کو یہ بتا دینا کہ فلاں جگہ فلاں تحریر یا فلاں شخص کے

ہوں۔ اس لئے آج وجادہ کا طریقہ بھی اتنا ہی تحقیقی ہے جتنا کوئی بھی طریقہ تحقیقی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ آج میرے اور آپ کے لئے جائز ہے کہ ہم صحیح بخاری کا نسخہ سامنے رکھ کر اس میں سے حدیث بیان کریں اور یقین کے ساتھ یہ بات کہیں کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔

یہ آٹھ طریقے تحمل حدیث کے تھے اور یہی طریقے ادا کے طریقے بھی تھے۔

تحمل اور اداء

جب ایک شخص نے ان طریقوں سے حدیث حاصل کی تو یہ طریقے جس کے لئے تحمل کے طریقے تھے لیکن جس شیخ سے ان طریقوں کے ذریعہ روایت لی گئی اس کے لئے یہ طریقے ادا کے طریقے تھے۔ جب یہ شیخ آگے چل کر دوسرے تک یہ حدیث پہنچائے گا اور کسی کو یہ معلومات deliver کرے گا تو اس کے لئے ادا ہوگا اور اس کے لئے تحمل ہوگا۔ تحمل اور ادا دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ روایت احادیث کے طریقوں کی حد تک یہ ایک ہی چیز کے دو رخ ہیں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اجازت حدیث یا اجازہ کا طریقہ آج بھی رائج ہے۔ اس کی عملی صورت یہی ہوتی ہے کہ علم حدیث کے کسی بڑے مشہور شیخ یا استاد سے آپ کی ملاقات ہوئی، آپ نے ان کو بتایا کہ آپ نے علم حدیث حاصل کیا ہوا ہے۔ انہوں نے آپ کا امتحان لے لیا۔ امتحان لینے کے بعد یہ یقین ہو گیا کہ اب آپ کی صلاحیت اور استطاعت آپ کو روایت حدیث کا اہل ثابت کرتی ہے۔ انہوں نے آپ سے مختلف جگہوں سے پڑھوا کر بھی سن لیا۔ اب چونکہ اس طریقہ سے روایت کرنے میں حدیث کے متن میں کسی کمی بیشی یا اختلاف کا امکان نہیں ہے۔ اس لئے کہ کتابیں چھپی ہوئی ہر جگہ بڑی کثرت سے موجود ہیں۔ اب صرف یہ تحقیق اور تعین باقی ہے کہ آپ کی یہ صلاحیت ہے کہ آپ حدیث پڑھ کر اس کا متن آگے بیان کر سکیں۔ یہ تحقیق کرنے کے بعد وہ لکھ کر آپ کو سند دیتے ہیں اور اجازت دیتے ہیں۔ اس طرح سندیں لوگ حاصل کرتے چلے آئے ہیں۔ میرے پاس بھی اس طرح کی بہت سی سندیں ہیں اور ایسے اہل علم سے ملاقات ہوتی رہتی ہے کہ جن سے سند لینا ایک شرف اور اعزاز کی بات ہوتی ہے۔

یہ چیز اجازہ یا اجازت کہلاتی ہے۔ اجازت متعین کتاب کی بھی ہو سکتی ہے کہ مثلاً انہوں نے صحیح بخاری کی کچھ احادیث آپ سے سنیں اور یقین کرنے کے بعد کہ آپ صحیح بخاری پڑھ

ورنہ محض کتاب کا ہدیہ یا اجازت کے معنا بغیر روایت کے معاملہ میں مناولہ معتبر نہیں ہوگا۔

جہاں تک مکاتبت کا تعلق ہے تو مکاتبت کے ساتھ ساتھ اگر تحریر کے ساتھ روایت کی اجازت بھی شامل ہے اور یہ بھی یقین ہو جائے کہ یہ تحریر انہی بزرگ کی ہے تو روایت کی اجازت دے دی جاتی تھی۔ ماضی میں اس کا طریقہ ایسے ہوتا تھا کہ مثلاً ایک محدث نے اپنے کسی بزرگ استاذ کو خط لکھ کر کہ میں نے سنا ہے کہ آپ کے پاس فلاں فلاں حدیث کے فلاں فلاں انداز یا روایات موجود ہیں، آپ براہ کرم اس کا متن مجھے لکھ کر بھیج دیں۔ انہوں نے اپنے شاگرد کو متن لکھ کے بھیجا اور اس کے ساتھ دو آدمی بھی بطور گواہ بھیج دیئے۔ ان گواہوں نے جو مستند اور معتبر تھے ان کے شاگرد کے سامنے گواہی دی کہ ہمارے سامنے شیخ نے اپنے قلم سے یہ تحریر لکھی تھی اور وہی یہ مہر لگائی تھی اور ہم اس بات کے گواہ ہیں کہ یہ تحریر انہی محدث کی لکھی ہوئی ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر اس کی بنیاد پر روایت کی جا سکتی ہے۔

امام بخاری نے ایک دو مقامات پر مکاتبہ مع الاجازۃ مع الاشہادۃ کی اجازت دی ہے۔ گویا اجازت، دو شرطوں کے ساتھ ہے، گواہی بھی ہو اور اجازت بھی ہو۔ یہ دو چیزیں جب شامل ہوں گی تو پھر عام مکاتبت سے اس کا درجہ اونچا ہو جائے گا۔ اس لئے امام بخاری نے اُن کی اجازت دی ہے۔ امام بخاری یا امام مسلم کے ہاں ایک دو احادیث جو مکاتبت کی بنیاد پر روایت ہوئی ہیں، اس کے الفاظ یہ ہیں: اخبرنی فلان کتابۃ یعنی فلاں بزرگ نے مجھے تحریری طور پر اطلاع دی یعنی اپنی Hand Writing میں یہ لکھ کر اجازت دی۔ بعض جگہ اس کا بھی التزام ہے کہ فلاں فلاں گواہوں کی موجودگی میں جنہوں نے میرے سامنے حلفیہ بیان کیا کہ یہ انہی بزرگ کی تحریر ہے اور انہوں نے اس کے مطابق آپ کو اجازت دی ہے۔

یہ تحمل کے طریقے تو علم روایت سے متعلق ہیں اور ان کا براہ راست تعلق علم روایت سے ہے۔ دوسرا شعبہ علم درایت کا ہے جس کا میں نے ابھی ذکر کیا۔ اس میں ایک محدث داخلی ذرائع سے یہ تعین کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ جو ارشادات رسول اللہ ﷺ سے منسوب کئے گئے ہیں وہ واقعی رسول اللہ ﷺ کے ارشادات ہیں۔ علم روایت کو خارجی نقد حدیث بھی کہتے ہیں اور علم درایت کو داخلی نقد حدیث بھی کہتے ہیں۔ خارجی نقد حدیث کا زیادہ دارومدار نقل پر ہوتا ہے کہ راوی کے بارے میں جو کچھ معلومات آپ کے پاس ہیں، راوی نے جو کچھ آپ سے بیان کیا، اس راوی

اونچے درجہ کا انسان ہو، کم از کم یہ بات اس نے سنی ہے اس کو سمجھ کر اس کو یاد رکھا ہو اور پوری توجہ کے ساتھ اس کو دہرایا ہو کہ کس سیاق وسباق کے ساتھ یہ بات ارشاد فرمائی گئی تھی اور اس کا مفہوم کیا تھا۔ بے عقل آدمی کی بات اور روایت قابل قبول نہیں ہے۔

یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوا کہ ایک چھوٹا بچہ جو تحمل کے وقت کم عمر تھا لیکن ادائیگی کے وقت اس کی عمر پختگی کو پہنچ گئی اور اس میں پختہ عقل وشعور پیدا ہو گیا، مثلاً پانچ چھ سال کا بچہ تھا جب اس نے تحمل کیا۔ تو کیا اب دس بارہ سال کے بعد وہ اس کو ادا کر سکتا ہے؟ محدثین کی غالب ترین اکثریت کا خیال یہاں بھی وہی ہے جو اسلام کے بارے میں ہے کہ صحابہ کے بارے میں یہ تسامح ہو سکتا ہے غیر صحابیؓ کے بارے میں نہیں ہو سکتا۔ اگر ایک بچہ پانچ سال کی عمر میں کسی تابعی سے یا تبع تابعی سے کوئی حدیث سنتا ہے اور بعد میں بالغ ہونے کے بعد بیان کرتا ہے تو اس میں ایک شک ضرور باقی رہتا ہے کہ بچے کو حدیث کا متن اور مفہوم صحیح طور پر یاد رہا کہ نہیں رہا۔ لیکن اگر کوئی صحابیؓ اپنا کوئی ایسا واقعہ بیان کرتے ہیں جو ان کے اپنے بچپن کا ہے لیکن رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد گرامی، یا تقریر یا عمل سے متعلق ہے اور وہ بلوغ کے بعد بیان کرتے ہیں تو وہ قابل قبول ہے۔ اس لئے کہ صحابہ کرام میں حضرت علیؓ بن ابی طالب، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت ابو سعید خدریؓ اور اس طرح کے بہت سے صحابہ کرام تھے جنہوں نے اپنے بچپن میں بارہا حضورؐ کی زیارت کی، بہت سے معاملات کو دیکھا اور بعد میں ان کو بیان کیا اور عام طور پر علمائے اسلام نے ان کو قبول کیا۔ رسول اللہ ﷺ کے بہت سے واقعات اسلام کے فوراً بعد کے زیادہ تر حضرت علیؓ سے مروی ہیں۔ مکہ مکرمہ کے کئی واقعات حضرت علیؓ سے مروی ہیں جب ان کی عمر دس بارہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ حضرت ابن عباسؓ کی عمر حضورؐ کے انتقال کے وقت تیرہ سال تھی۔ انہوں نے بہت سے واقعات نقل کئے ہیں جو ان کے بچپن کے ہیں۔ یہ سب واقعات قابل قبول ہیں، اس لئے کہ ان کے راوی صحابیؓ ہیں اور ان سے اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ وہ کوئی غلط چیز یا غلط یادداشت پر مبنی کوئی چیز بیان کر دیں گے۔ دوسرے تمام راویوں کے لئے یہ شرط ہے کہ انہوں نے تحمل بھی عقل کی حالت میں کیا ہو۔ البتہ تحمل کے لئے بلوغ شرط نہیں ہے۔ اگر دس سال کا بچہ ہو، یادداشت اچھی ہو، عربی جانتا ہو، اور ایسے لوگ ہر زمانے میں پائے جاتے ہیں، تو وہ حدیث قابل قبول ہے۔ تیرہ چودہ سال کی عمر کی حد تک قابل قبول ہے۔ لیکن اگر وہ تحمل کے وقت

اتنا کمسن بچہ ہو کہ اس میں عقل و شعور ہی نہ ہو تو اس کی روایت قابل قبول نہیں ہے۔

سب سے اہم شرط جو چوتھے نمبر پر ہے وہ ضبط ہے۔ ضبط سے مراد یہ ہے کہ راوی نے جو کچھ سنا اس کو پوری طرح سے یاد رکھا، پھر وہ چیز ہمیشہ اس کی یادداشت میں محفوظ رہی۔ کبھی اس کو بھلایا نہیں، کبھی اس میں التباس نہیں ہوا، کبھی اس میں کوئی شک نہیں ہوا اور روایت بیان کرنے تک تحمل سے لے کر ادا تک ضبط باقی رہا ہو۔ کسی مرحلے پر ضبط میں کوئی کمزوری یا خلل واقع نہ ہوا ہو۔ اس بات کی تحقیق اور تعین سب سے مشکل کام ہے جس کا محدثین نے اہتمام کیا اور ایک ایک راوی کے بارے میں تحقیق کی کہ اس کا ضبط کس عمر سے تھا اور کس عمر تک رہا۔ بڑھاپے میں یادداشت کام نہیں کرتی۔ محدثین نے اس بارے میں بھی معلومات جمع کیں کہ کس راوی کی کتنی عمر ہوئی اور عمر کے کس حصے تک اس کی یادداشت محفوظ تھی اور اگر آخیر عمر میں جا کر اس کی یادداشت جواب دے گئی اور خراب ہوگئی تو کس عمر میں خراب ہوگئی۔ پھر علمائے رجال اور محدثین اس بات کا بھی اہتمام کرتے ہیں کہ راویوں کی یادداشت اور حافظے کی تاریخ بھی معلوم کریں اور اس بات کی تحقیق بھی کریں کہ فلاں راوی کی یادداشت فلاں سن تک ٹھیک تھی۔ لہٰذا اس سن تک کی روایات قابل قبول ہیں۔ اس سن کے بعد ان کی یادداشت میں کمزوری آنی شروع ہوگئی۔ لہٰذا اس سن سے لے کر اس سن تک کی روایات کی اگر دیگر مآخذ سے تصدیق ہو جائے تو وہ قابل قبول ہیں اور فلاں سن میں اس کی یادداشت بالکل جواب دے گئی تھی۔ اس کے بعد کی روایت قابل قبول نہیں ہیں۔ چنانچہ آپ کو اتنی بے شمار مثالیں ملیں گی کہ ایک راوی کی ایک روایت قابل قبول ہے اور دوسری روایت قابل قبول نہیں ہے۔ اس لئے کہ پہلی روایات عالم ضبط میں تھیں اور دوسری روایات عالم ضبط کے زائل ہونے کے بعد تھیں۔ راوی کے یہ چار بنیادی شرائط ہیں جو ہر راوی میں پائی جانی چاہئیں۔ راوی کی ان چار شرائط کے بعد سند اور متن کے بارے میں تین شرائط اور ہیں جو اگر موجود ہوں تو وہ حدیث مکمل طور پر صحیح اور معیاری ہوگی۔

پہلی شرط یہ ہے کہ محدث سے لے کر مثلاً امام بخاری سے لے کر رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی تک متصل سند ہو اور درمیان میں کوئی سلسلہ ٹوٹا ہوا نہ ہو۔ اگر ایک سلسلہ بھی ٹوٹا ہوا ہے تو وہ حدیث پھر صحت کے اس معیار کی نہیں ہوگی۔ دوسری شرط یہ ہے کہ روایت شاذ نہ ہو۔ راوی مستند ہے، اس میں عقل بھی ہے، ضبط بھی ہے، مسلمان بھی ہے، اس میں عدالت بھی ہے اور سند بھی

متصل ہے۔ لیکن وہ کوئی ایسی روایت ذکر کرے جو عام، مشہور، مستند اور معروف روایت سے متعارض ہو، اس کی روایت کو شاذ کہتے ہیں۔ اگر کوئی ثقہ اور مستند راوی ایسی چیز بیان کرے جو عام راویوں کی روایت کردہ روایات کے خلاف ہو، اس کو شاذ کہتے ہیں۔ اور تیسری شرط اس باب میں یہ ہے کہ اس کے اندر کوئی ایسی چھپی ہوئی داخلی علت نہ ہو جو اس کے معیار کو متاثر کرتی ہو۔ علت سے مراد کوئی ایسی کمزوری ہوتی ہے جو بظاہر نہ روایت میں نظر آتی ہے نہ متن میں۔ اور عام جیسے عامی لوگوں کو اس کا پتہ نہیں چل سکتا، لیکن ایک ماہرِ فن جو علم حدیث کا امام ہو اور علم حدیث کی باریکیوں کی جزوی اور کلی تفصیلات سے واقف ہو، وہ پتہ لگا سکتا ہے کہ اس میں یہ کمزوری پائی جاتی ہے۔ ان پوشیدہ کمزوریوں یا خامیوں کو علت کہتے ہیں اور یہ علم حدیث کا سب سے مشکل فن ہے۔

علل الحدیث پر بھی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ معرفت علل الحدیث کے موضوع پر ائمہ حدیث نے بہت کام کیا ہے اور اس بات کے اصول طے کئے ہیں کہ حدیث کی اگر کوئی علت ہے تو اس کو کیسے دریافت کیا جائے۔ علت کے معنی آپ کمزوری کر سکتے ہیں کہ کوئی ایسی داخلی، اندرونی اور چھپی ہوئی کمزوری جس کا عام آدمی کو پتہ نہیں چلتا۔ یہ تینوں چیزیں اس میں موجود نہ ہوں اور راوی چاروں شرائط پر پورا اترتا ہو تو پھر وہ حدیث صحیح حدیث کہلائے گی۔

آپ میں سے کل کسی نے پوچھا تھا کہ صحیح حدیث کس کو کہتے ہیں؟ تو حدیث صحیح اس کو کہتے ہیں۔ یعنی حدیث صحیح وہ ہے جس کی سند متصل ہو، اس میں کوئی خامی نہ ہو، اس میں کوئی روایت شاذ نہ ہو، کوئی اندرونی علت نہ پائی جاتی ہو اور راوی میں چاروں شرائط موجود ہوں۔ گویا راوی کی چار شرائط ہیں اور حدیث صحیح کی بھی چار شرائط ہیں۔ راوی کی چار شرائط: اسلام، عدالت، عقل اور ضبط۔ یہ سات شرائط جس حدیث میں پائی جائیں گی وہ حدیث، حدیث صحیح ہو گی۔

ضبط سے مراد جیسا کہ میں نے عرض کیا قوت یادداشت ہے۔ اور محدثین کہتے ہیں دقت ملاحظہ۔ جب راوی یہ واقعہ دیکھ رہے تھے، سن رہے تھے، حدیث کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے تو ان کا مشاہدہ اتنا گہرا ہونا چاہئے۔ دقت ملاحظہ کے معنی ہیں keen observation یا minute observation کرے، ایک ایک لفظ اور ایک ایک جز کو پوری طرح سمجھ لیں اور اس کے بعد بیان کریں۔

ان سات شرائط میں سے اگر کوئی ایک شرط ناپید ہو جائے یا وہ شرائط جو مطلوب ہیں تو

میں ساری احادیث صحیح ہیں اور حدیث حسن کوئی نہیں ہے۔ ابوداؤد، ترمذی اور نسائی میں صحیح احادیث بھی ہیں اور حدیث حسن بھی بہت ہیں۔

ضعیف اور موضوع احادیث

دوسری طرف جو احادیث ناقابل قبول ہیں ان کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک ضعیف اور دوسری موضوع۔ موضوع کو مجازاً حدیث کہتے ہیں کیونکہ یہ وہ روایات ہیں جن کی نسبت رسول اللہ ﷺ سے درست نہیں ہے اور وہ حضورؐ کے ارشادات گرامی نہیں ہیں۔ موضوعات کے انگنت مجموعے پائے جاتے ہیں۔ کئی لوگوں نے یہ مجموعے مرتب کئے ہیں جن کی تعداد درجنوں میں ہے۔ کم از کم پچیس تیس کتابیں ہیں جن میں موضوع احادیث جمع کردی گئی ہیں، تاکہ لوگوں کو پتہ چل جائے کہ یہ حضورؐ کے ارشادات نہیں ہیں۔

ضعیف حدیث وہ ہے کہ جس میں حدیث حسن کی شرائط میں سے بعض شرائط نہ پائی جاتی ہوں۔ مثلاً سند پوری کی پوری متصل ہے لیکن راوی یادداشت میں کمزور ہے یا عدالت میں کمزور ہے، راوی کمزور باتیں روایت کرتا ہو۔ گویا وہ کھلم کھلا جھوٹا تو مشہور نہیں ہے لیکن اس کی روایات میں کمزور باتیں شامل ہوتی ہیں۔ اگر اس کی شہرت جھوٹے کی ہے تو پھر تو وہ حدیث موضوع ہو جائے گی۔ لیکن اس کے کردار کے بارے میں لوگوں کو کچھ شکایات ہیں، وہ حدیث ضعیف حدیث کہلائے گی۔

یہ حدیث کی چار بڑی بڑی قسمیں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی ذیلی تقسیمات بے شمار ہیں۔ محدثین نے کم و بیش سو اقسام بیان کی ہیں۔ ان سو قسموں میں ہر ایک کے الگ الگ احکام ہیں۔ یہ وہ فن ہے جس کی تدوین میں کم و بیش چار پانچ سو سال لگے ہیں اور ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں بہترین دماغوں نے اور اجتماعی مخلص ترین اور متقی ترین انسانوں نے اس کی تدوین اور اس کی خدمت میں وقت صرف کیا ہے۔ اس لئے جیسے جیسے غور و خوض ہوتا گیا اور تحقیق ہوتی گئی نئی نئی تقسیمیں سامنے آتی گئیں۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، نئے نئے مواقع اور نئے نئے امکانات سامنے آتے رہے۔ کم و بیش سو قسمیں محدثین نے بیان کی ہیں۔ مقدمہ ابن الصلاح، جو علوم حدیث کی مشہور کتاب ہے، اور اپنے زمانے کی ایک منفرد کتاب سمجھی جاتی تھی، اس میں علامہ ابن

تواتر کی تیسری قسم ہوتی ہے تواتر قدر مشترک۔ جہاں سب روایت کے الفاظ بھی الگ الگ ہوتے ہیں اور ان کا مفہوم بھی قدرے الگ ہوتا ہے، لیکن ان سب احادیث میں ایک حصہ قدر مشترک ہے جس سے ایک خاص بات ظاہر ہوتی ہے وہ تواتر قدر مشترک ہے۔ گویا یہ قدر مشترک حصہ اس طرح ثابت ہے کہ جس میں نہ کوئی احتمال ہے نہ کسی شک وشبہ کی گنجائش ہے۔ وہ تواتر قدر مشترک کہلاتا ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ مثال کے طور پر نمازوں کے اوقات کا معاملہ۔ اس بارے میں بہت سی احادیث ہیں۔ مختلف صحابہ نے اپنے اپنے انداز میں تفصیلات کو بیان کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے وقتاً فوقتاً مختلف الفاظ میں اس کو بیان کیا۔ صحابہ کرام نے مختلف سیاق وسباق میں اس کو بیان کیا۔ لیکن ان سب میں ایک بات کا قدر مشترک کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ظہر کی نماز اس وقت ہوگی جب سورج ڈھل جائے۔ فجر کا وقت اس وقت ہوگا جب صبح صادق طلوع ہو جائے۔ یہ الفاظ تو متعین طور پر متواتر احادیث میں نہیں آئے لیکن یہ قدر مشترک سینکڑوں احادیث میں موجود ہے۔ اس لئے یہ تواتر قدر مشترک کہلاتا ہے۔

اس کے بعد ایک درجہ ہے تواتر طبقہ کا۔ کہ ایک طبقہ نے، ایک پوری نسل نے ایک کام اس طرح کیا۔ اس کو دیکھ کر دوسری نسل نے، پھر تیسری نسل نے، پھر چوتھی نسل نے۔ یا کسی خاص طبقے نے، لوگوں کے کسی خاص گروہ نے ایک عمل اس طرح کیا۔ مثال کے طور پر ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتا ہوں۔ احادیث میں مختلف ناپوں (Measures) کا ذکر ہے۔ مثلاً صدقہ فطر کے بارے میں ذکر ہے، یا زکوٰۃ کے بارے میں ذکر ہے۔ اب حدیث میں کچھ پیمانوں کا ذکر آیا ہے کہ صاع، نصف صاع وغیرہ، یعنی صدقہ فطر کے طور پر گندم کا نصف صاع دیا جائے۔ تو صاع سے کیا مراد ہے۔ اس زمانے میں ایسے پیمانے تو نہیں ہوتے تھے جو سرکاری طور پر سٹینڈرڈائزڈ ہوں۔ ہر علاقے میں ایک ہی نام کے مختلف اوزان رائج ہوتے تھے۔ مثلاً جس پیمانے کو ہم آج تک سیر کہتے تھے اور اب کلو کہنے لگے ہیں۔ یہ سیر مختلف علاقوں میں مختلف مقدار کے ہوتے تھے مثلاً سیر عالمگیری، سیر شاہجہانی، پکا سیر، کچا سیر، فلاں سیر اور فلاں سیر وغیرہ۔ ہر سیر کا الگ الگ وزن متعین ہوتا تھا۔ کوئی اسی تولہ کا سیر ہے، کوئی چالیس تولے کا ہے، کوئی ۱۲۰ تولہ کا۔ اسی طرح سے عرب میں صاع مختلف انداز کے ہوا کرتے تھے۔ اب یہ بات کہ حدیث میں جس صاع کا ذکر ہوا ہے وہ کتنا ہے کہ اس کے مطابق آپ صدقہ فطر ادا کریں، ایک تحقیق طلب بات تھی۔

اکبر اللہ اکبر۔ اس طرح سے پوری اذان کے الفاظ وہ ہر مرتبہ پہلے آہستہ کہتے اور جب حضورؐ اس
کے درست ہونے کی تصدیق فرما دیتے تو اس کے بعد وہ زور سے کہتے گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے
دو تین مرتبہ یہ کیا کہ تو تشریف فرما ہوئے، ابو محذورہؓ نے آہستہ سے اذان کے الفاظ کہے، حضورؐ
نے درست ہونے کا اشارہ کیا اور پھر انہوں نے زور سے اذان پڑھی۔

ابو محذورہ زندگی بھر اسی طرح سے اذان دیتے رہے۔ اور جو کوئی اذان کی روایت
پوچھتا تھا وہ کہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے سکھایا کہ پہلے اس کو آہستہ سے کہو پھر زور سے کہو۔
اس کو ترجیع کہتے ہیں۔ یعنی لوٹانا، رجوع سے ہے۔ امام ابو یوسف حج کے لئے تشریف لے
گئے۔ مکہ مکرمہ میں مختلف محدثین سے اذان کے احکام پوچھے۔ تو وہاں کے کئی لوگوں نے ان کو
ترجیع کا طریقہ سکھایا کہ اذان کا سنت طریقہ یہ ہے کہ پہلے آہستہ کہو اس کے بعد بلند آواز سے کہو۔
امام ابو یوسف نے اسی کی بنیاد پر فتویٰ دینا شروع کر دیا کہ اذان میں ترجیع سنت ہے۔ کچھ عرصہ
کے بعد ان کا مدینہ منورہ تشریف لانا ہوا جہاں امام مالکؒ سے ملاقات ہوئی۔ یہ نہیں معلوم کہ اسی
ملاقات میں یا کسی اور ملاقات میں۔ جب اذان پر بات ہوئی تو امام ابو یوسف نے فرمایا کہ اذان
میں ترجیع سنت ہے۔ امام مالکؒ نے کہا کہ ترجیع نہ سنت ہے اور نہ شرط ہے۔ امام ابو یوسف نے
فرمایا کہ مجھ سے فلاں محدث نے روایت کی ہے، انہوں نے فلاں سے روایت کی ہے انہوں نے
فلاں سے روایت کی انہوں نے فلاں سے روایت کی تو انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے
جب ابو محذورہ کو اذان سکھائی تو ترجیع کے ساتھ سکھائی تھی۔ امام مالکؒ نے فرمایا کہ یہ روایت
میرے لئے قابل قبول نہیں ہے۔ اب امام ابو یوسفؒ کو حیرت ہوئی کہ میں حدیث صحیح کو پوری
متصل سند سے بیان کر رہا ہوں، ساری کی ساری شرائط پوری ہیں اور امام مالکؒ کہتے ہیں کہ یہ
میرے لئے قابل قبول نہیں ہے۔ امام ابو یوسفؒ نے پوچھا کہ آپ کے پاس کوئی ایسی حدیث
متصل موجود ہے جس کی بنیاد پر آپ میری روایت کو ناقابل قبول قرار دے رہے ہیں۔ امام مالک
نے کہا نہیں۔ امام ابو یوسف کو اور بھی حیرت ہوئی۔ امام مالکؒ نے کہا اچھا اس کا میں کل جواب
دوں گا۔ اگلے دن جب امام ابو یوسف ملاقات کے لئے تشریف لائے تو امام مالکؒ کے ہاں
بہت سے حضرات بیٹھے ہوئے تھے۔ امام مالکؒ نے ایک سے پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ انہوں نے
کہا کہ میں مدینہ منورہ کی فلاں مسجد کا مؤذن ہوں۔ انہوں نے کہا کہ اذان دیجئے۔ انہوں نے

ان کا حکم شریعت میں کیا ہے۔ دور فقہا سے علماء اور محدثین کے دور سے لے کر آج تک اس پر عمل درآمد ہوتا چلا آرہا ہے۔ بعض محدثین کا خیال یہ ہے کہ اگر خبر واحد صحیح ہے تو ہر حال میں واجب التعمیل ہے اور اس پر عمل درآمد کیا جائے گا۔ بعض فقہا کا، جن میں حضرت امام ابوحنیفہؒ بھی شامل ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اگر خبر واحد مسلمہ شدہ سنت اور قیاس سے متعارض ہو تو قیاس اور طے شدہ سنت کو ترجیح دی جائے گی۔ اور خبر واحد کا کوئی اور مفہوم قرار دیا جائے گا۔ اس پر ظاہری معنوں میں عمل نہیں کیا جائے گا۔ اس میں صرف یہی دو رائے نہیں بلکہ اور بھی آراء موجود ہیں اور ان کی بنیاد پر فقہی مسالک وجود میں آئے۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ میں صدر اسلام میں فقہی مسالک جتنے بھی بنے وہ اکثر و بیشتر 75 یا 80 فیصد خبر واحد کے بارے میں اختلاف ہی کی بنیاد پر وجود میں آئے ہیں۔ حدیث کی باقی قسموں کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں۔

امام ابوحنیفہ اپنے اس نقطہ نظر کی تائید میں ایک واقعہ سے استدلال کرتے ہیں۔ ایک خاتون تھیں فاطمہ بنت قیسؓ۔ وہ صحابیہ تھیں اور بڑی عالمہ اور فاضلہ خاتون تھیں۔ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں طلاق کا ایک مقدمہ آیا۔ کسی شخص نے اپنی اہلیہ کو طلاق دے دی۔ اور طلاق دینے کے بعد کہا کہ میرے گھر سے نکل جاؤ۔ مطلقہ خاتون شکایت لے کر حضرت عمر فاروقؓ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور کہا کہ میرے شوہر نے مجھے طلاق دے دی اور گھر سے نکلنے کے لئے کہتے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ قرآن پاک میں سنت طلاق کا حکم ہے جس کی رو سے شوہر نفقہ دینے کے بھی پابند ہیں اور رہائش دینے کے بھی پابند ہیں۔ جب تک تم عدت میں ہو یہ دونوں چیزیں ان کے ذمہ ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ اور تمام خلفائے راشدین کا طریقہ تھا کہ کوئی فیصلہ کرنے کے بعد تصدیق (Confirmation) کے لئے بقیہ صحابہ کرام سے پوچھتے تھے کہ کیا میں نے صحیح فیصلہ کیا ہے؟ اپنے سارے علم و فضل کے باوجود حضرت ابوبکر صدیقؓ کا بھی یہی طریقہ تھا، حضرت عمر فاروقؓ کا بھی، حضرت عثمانؓ کا بھی اور حضرت علیؓ کا بھی۔ کہ بقیہ صحابہ کرام سے جو وہاں موجود ہوتے تھے اس کو Verify کراتے تھے۔

چنانچہ یہ فیصلہ کرنے کے بعد حضرت عمرؓ نے صحابہ کرام سے، جو وہاں موجود تھے، پوچھا کہ کیا میں نے درست فیصلہ کیا ہے؟ سب صحابہ نے کہا کہ درست ہے۔ اس پر یہ خاتون جن کا میں نے ذکر کیا یعنی فاطمہ بنت قیس کھڑی ہوئیں اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں میرے

ہوں۔

۷۔ پھر وہ جو امام بخاری کی شرائط پر پوری ہیں لیکن بخاری میں نہیں ہیں۔

۸۔ پھر وہ جو مسلم کی شرائط پر پوری ہیں لیکن مسلم میں نہیں ہیں۔

۹۔ پھر وہ جن کو بقیہ چار اصحاب سنن نے روایت کیا ہو یعنی ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور نسائی نے۔

۱۰۔ پھر وہ جن کو صرف نسائی نے روایت کیا ہو۔

۱۱۔ پھر وہ جن کو بقیہ ائمہ نے روایت کیا ہو۔

یہ احادیث صحیح میں خبر واحد کے گیارہ درجات ہیں۔ جو متواتر احادیث ہیں وہ ان درجات سے ماوراء ہیں۔ ان کا درجہ سب سے اونچا ہے۔

جس کو حدیث حسن کہتے ہیں وہ صحیح کی وہ شکل ہے جس میں صحیح کی شرائط میں سے کوئی ایک آدھ شرط کم ہو۔ اس لئے اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ حدیث ضعیف کی بے شمار قسمیں ہیں۔ جیسا کہ ابھی میں نے عرض کیا کہ امام ابن الصلاح نے بیالیس قسمیں بیان کی ہیں۔ بعض حضرات نے اس سے بھی زیادہ قسمیں بیان کی ہیں۔ اور ان قسموں میں سے ہر ایک کا الگ الگ حکم ہے۔

چند قسمیں مثال کے طور پر میں بیان کرتا ہوں۔ آٹھ قسمیں بیان کر دیتا ہوں۔

حدیث ضعیف کی اقسام

مرسل حدیث

حدیث ضعیف میں سب سے اونچی قسم حدیث مرسل ہے۔ مرسل کے معنی چھوڑی ہوئی یا Opened۔ لیکن اصطلاح حدیث میں مرسل سے مراد وہ حدیث ہے جس میں کسی تابعی نے براہ راست رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک یا آپ کا عمل مبارک نقل کیا ہو اور درمیان میں صحابی کا ذکر نہ کیا ہو۔ مرسل احادیث اکثر و بیشتر محدثین کی نظر میں قابل قبول نہیں ہیں۔ محدثین کی بڑی تعداد مرسل احادیث کو قابل قبول نہیں سمجھتی۔ البتہ فقہا کی کچھ تعداد مرسل احادیث کو قابل قبول سمجھتی ہے بشرطیکہ وہ کسی ایسے تابعی سے منقول ہوں جو ثقہ اور شریعت میں گہرائی کی وجہ سے مشہور ہوں۔

اس کا درجہ اس کے حساب سے ہوگا۔ لیکن منقطع میں جو نام گرا ہوا ہے یہ معلوم ہے تو کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ کون آدمی ہے۔

معضل حدیث

اس کے بعد معضل حدیث کا درجہ آتا ہے۔ معضل وہ حدیث ہے جس میں دو راوی گر گئے ہوں۔ دو راوی گرے ہوں، دونوں معتبر ہیں یا غیر معتبر ہیں۔ یہ سارے احتمالات موجود ہیں۔ ان کا ضبط کس درجہ کا تھا، حفظ کس درجہ کا تھا، تحمل کے وقت وہ مسلمان ہوئے تھے کہ نہیں ہوئے تھے، یہ سارے مسائل جو حدیث صحیح میں تھے وہ پیدا ہوں گے۔

مدلّس حدیث

اس کے بعد ایک قسم مدلس کی ہے۔ مدلس اس حدیث کو کہتے ہیں کہ جس میں روایت بیان کرنے والے نے جان بوجھ کر misrepresentation کی ہو۔ روایت حدیث میں تدلیس کا رواج دوسری صدی میں شروع ہوا۔ دراصل جب کسی چیز سے لوگوں کو عزت ملنا شروع ہو جاتی ہے تو اس کے حصول کے لئے ایک مقابلہ اور مسابقت شروع ہو جاتی ہے اور مسابقت میں ہر ایک کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنے کو نمایاں کرے۔ اب فرض کریں درس قرآن کی میں مثال دے رہا ہوں کہ آپ ڈاکٹر فرحت ہاشمی سے پڑھتی ہیں، ان کا بڑا اونچا درجہ اللہ نے رکھا، بڑی شہرت عطا فرمائی، درس کو قبولیت حاصل ہوئی۔ اب فرض کریں کہ کسی اور نے بھی اس شہر میں درس کا حلقہ شروع کیا۔ اتفاق سے ان خاتون کو کسی وجہ سے وہ شہرت نہیں ملی، کیونکہ شہرت اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ اب اگر ان کے تلامذہ کہیں اور جا کر جا بسیں اور ایک خاتون آپ کے ہاں سے جا کے پڑھانا شروع کر دیں اور دونوں جا کر فرض کریں لندن میں درس کا حلقہ قائم کریں۔ آپ کے ہاں سے جانے والی خاتون ہر جگہ جا کر فخریہ بیان کریں گی کہ انہوں نے ڈاکٹر فرحت کے ہاں سے پڑھا ہے۔ اس کے برعکس وہ دوسری خاتون جب اپنے استاد کا نام لیتی ہیں تو ان کو کوئی نہیں جانتا۔ ان کی طرف لوگ کم جاتے ہیں، آپ کی طرف زیادہ آتے ہیں۔ اب اگر وہ خاتون یہ کہیں کہ میں نے اسلام آباد کی ایک بڑی مستند خاتون سے علم قرآن حاصل کیا ہے تو سننے والا سمجھے گا کہ شاید ڈاکٹر فرحت سے علم حاصل کیا ہے۔ اس طرح کی غلط بیانی جھوٹ تو نہیں ہے لیکن ایک طرح

کی misrepresentation ضرور ہے، یا اس سے کم از کم misrepresentation کا امکان ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔ تو مدلس اس حدیث کو کہتے ہیں کہ جس میں راوی جان بوجھ کر ایسے الفاظ استعمال کرے کہ جس سے سننے والے کو یہ تاثر ملے کہ اس نے کسی مستند آدمی سے یا فلاں خاص آدمی سے روایت حاصل کی ہے۔ یا انہوں نے براہ راست حاصل نہ کی ہو۔ کسی سنائی ان کو مل گئی۔ اب وہ روایت کرتے ہیں کہ فلاں صاحب بیان کرتے ہیں۔ بعض بیان ضرور کرتے ہیں، ہو کوئی سے بیان کیا ہوگا، لیکن آپ سے بھی بیان کیا ہے کہ نہیں اور آپ کو بیان کرنے کی اجازت دی ہے کہ نہیں۔ اس کو وہ درمیان میں حذف کر دیا کرتے تھے۔ یہ نہیں کہتے تھے کہ اخبرنی یا حدثنی یعنی مجھ سے یہ سنا۔ یا مجھ سے انہوں نے یہ بیان کیا۔ وہ آکے بیٹھے اور کہا کہ فلاں صاحب یہ حدیث بیان کرتے ہیں۔ یا فلاں صاحب سے روایت ہے، کس کی روایت ہے، کیا کہ انہوں نے تھوڑا سا چھپایا۔ اس طرح کی احادیث کو مدلس کہتے ہیں۔ اور کچھ لوگوں نے یہ کام کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ لیکن محدثین نے ان کو پکڑ لیا کہ یہ حدیث مدلس ہے۔ مدلس بھی حدیث ضعیف کی ایک قسم ہے۔

معلل حدیث

علت کا میں ذکر کر چکا ہوں کہ جس میں کوئی علت پائی جاتی ہو وہ حدیث معلل کہلاتی ہے۔ معلل حدیث کا پتہ چلانا خاصا مشکل ہوتا ہے۔ اور بڑی مشکل سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ کوئی حدیث معلل ہے کہ نہیں۔ محدثین نے اس پر کتابیں لکھی ہیں۔ علل الحدیث کے نام سے ایک الگ فن ہے۔ اور علم حدیث کے فنون میں سب سے مشکل فن ہے۔

شاذ حدیث

اس کے بعد شاذ حدیث کا درجہ ہے۔ یہ وہ حدیث ہے جس میں باقی سب چیزیں تو بالکل ٹھیک ہیں لیکن بات جو بیان کی گئی ہے وہ ایسی ہے کہ قرآن پاک کے عام احکام کے خلاف ہے۔ ایک نئی چیز ہے جو حدیث کے احکام سے متعارض ہے۔ وہ شاذ کہلاتی ہے۔ اس کی تعریف یہ ہے کہ ما رواہ الثقۃ مخالفا للثقات۔ یعنی ایک ثقہ راوی باقی ثقہ راویوں کے مخالف کوئی چیز بیان کرے۔

منکر حدیث

اس کے بعد منکر حدیث کا درجہ ہے۔ کہ ایک ضعیف راوی دوسرے ثقہ راویوں کے خلاف کوئی چیز بیان کرے۔ شاذ اور منکر ایک ہی چیز ہے۔ شاذ وہ ہے کہ جو ثقہ راوی سے آئے، منکر وہ ہے جو غیر ثقہ راوی سے آئے۔

متروک حدیث

اور آخری درجہ متروک حدیث کا ہے یعنی وہ حدیث جس کو ترک کر دیا گیا ہو، جس کے بارے میں آپ یقین سے اور قطعیت کے ساتھ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ یہ موضوع ہے اور حضورؐ سے جھوٹ منسوب ہے۔ لیکن آپ کو یہ یقین ہے کہ یہ بات عمل کرنے کے قابل نہیں ہے۔ یا تو وہ راوی ایسا ہے کہ فسق و فجور میں مبتلا ہے، یا ایسا راوی ہے کہ اس کے بارے میں عام شہرت ہے کہ اس کی یادداشت درست نہیں ہے۔ ایک مخبوط الحواس قسم کا آدمی ہے، وہ راوی بلاشبہ نیک آدمی ہوں گے، بزرگ بھی ہوں گے، لیکن ذہنی طور پر اس درجہ کے نہیں ہیں کہ ان کی بات بھروسہ کے قابل ہو۔ ایسی روایت متروک کہلاتی ہے۔ یہ نا قابل قبول احادیث کی مختلف قسمیں تھیں۔

موضوع احادیث

آخری درجہ جس کو صرف مجازاً حدیث کہتے ہیں وہ حدیث موضوع ہے۔ موضوع سے مراد وہ بات یا وہ قول جو غلط طور پر رسول اللہ ﷺ سے منسوب ہو گیا ہو لیکن حضورؐ کا ارشاد یا حضورؐ کا عمل نہ ہو۔ آپ کے ذہن میں سوال پیدا ہوگا کہ اس کا پتہ کیسے چلے گا۔ محدثین نے اسی لئے یہ ساری کاوشیں کیں اور ان چیزوں کا پتہ چلایا کہ رسول اللہ ﷺ سے غلط طور پر جو چیزیں منسوب ہیں وہ کیا ہیں۔ اور ایک جملہ میں آپ سے عرض کرتا ہوں اس کو ہمیشہ یاد رکھئے گا کہ دنیا میں آج جتنی بھی مذہبی کتابیں موجود ہیں، انجیل، بائبل، نیا عہد نامہ، پرانا عہد نامہ اور دیگر ساری مذہبی کتابیں وہ تاریخی اور علمی حیثیت سے ہماری موضوع احادیث سے بھی کم درجہ کی ہیں۔ موضوع احادیث بھی تاریخی طور پر ثابت شدہ ہیں۔ کم از کم یہ تو پتہ ہے کہ یہ احادیث کس نے وضع کیں۔ کس زبان میں وضع کیں۔ جس نے وضع کیں وہ کس زمانے کا تھا، کس علاقے میں وضع کیں، اس کے

الفاظ کیا تھے، وہ الفاظ بعینہٖ ہم تک پہنچے ہیں۔ بائبل کے بارے میں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ کس زمانے میں لکھی گئی۔ حتمی طور پر یہ بھی ابھی تک طے نہیں کہ موجودہ انجیل اول اول کس زبان میں لکھی گئی، کس نے لکھی، کہاں لکھی۔ خلاصہ یہ کہ علمی اور تاریخی طور پر ہماری موضوع احادیث بھی ان کتابوں کی نسبت کہیں زیادہ مستند اور تاریخی طور پر ثابت شدہ ہیں جن کو آج لوگ مذہبی کتابیں مانتے ہیں۔ اس سے آپ ہمارے اوران کے معیار کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

موضوع ہونے کا پتہ اس طرح بھی چلتا تھا کہ بعض اوقات لوگ خود اعتراف کر لیتے تھے۔ ایک شخص تھا، غالباً اس کا نام عبدالکریم بن ابی العوجا تھا۔ یہ شخص خلیفہ ہارون الرشید کے زمانے میں گرفتار ہوا۔ اس کے بارے میں شکایت تھی کہ یہ شخص جھوٹی حدیثیں گھڑ گھڑ کر لوگوں سے بیان کرتا ہے۔ تحقیق سے ثابت ہوا کہ واقعی ایسا ہی کرتا ہے۔ عدالت میں اس کے لئے سزائے موت کا حکم ہوا۔ اس زمانے میں طریقہ یہ تھا کہ سزائے موت خلیفہ کے ہاں سے کنفرم ہوا کرتی تھی، آج بھی سزائے موت کو سربراہ مملکت کنفرم کرتا ہے۔ خلیفہ ہارون رشید نے اس کو بلایا اور خود بھی مزید تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ واقعی اس نے چار ہزار حدیثیں گھڑی ہیں۔ اس نے اعتراف بھی کرلیا۔ جب سزائے موت کے لئے لے جانے لگے تو اس نے خلیفہ سے کہا کہ آپ مجھے مروا تو رہے ہیں لیکن ان چار ہزار حدیثوں کا کیا کریں گے جو میں نے گھڑ کر پھیلا دی ہیں۔ ان جعلی حدیثوں میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دے دیا گیا ہے۔ ہارون نے کہا کہ تم ان چار ہزار کی فکر نہ کرو، اگر چالیس ہزار بھی پھیلا دیتے تو ہمارے ہاں شعبہ بن الحجاج جیسے لوگ موجود ہیں الذی یبسطہ نخلۂ، جو چھلنی میں سے چھان کر نکال دیتے ہیں کہ کیا چیز صحیح ہے کیا غلط ہے۔ گویا ایسے ماہرین فن محدثین موجود تھے جن کا ہارون الرشید نے ذکر کیا مثلاً شعبہ بن الحجاج جیسے لوگ موجود ہیں جو چھان کر نکال دیں گے اور کھوٹے اور کھرے کو الگ الگ کر دیں گے، تم اس کی فکر نہ کرو۔ چنانچہ انہوں نے کھوٹے اور کھرے کو الگ الگ کر دیا، اور آج سب کے سامنے ہے کہ کیا چیز حضورؐ کا ارشاد ہے اور کیا آپؐ کا ارشاد نہیں ہے۔

یہ تو مثال اس کی ہے کہ جہاں وضع کرنے والے اور گھڑنے والے نے خود اعتراف کیا ہو کہ میں نے گھڑا ہے۔ لیکن اکثر وہ اعتراف نہیں کرتا تھا، یا پتہ نہیں چلتا تھا کہ کس نے سب سے پہلے گھڑی، یا گھڑنے کے بعد پھیلا دی اور مر گیا، یا کسی فرضی نام سے پھیلا دی۔ اس کی پہچ

نشانیاں اور کچھ پہچان علماء حدیث نے مقرر کی ہیں جو اکثر و بیشتر موضوعات کی کتابوں میں بھی موجود ہیں۔ موضوعات پر جن لوگوں نے کتابیں تیار کی ہیں اور موضوع احادیث کو الگ جمع کیا ہے ان کے شروع میں وہ اصول بیان کئے ہیں جن کے نتیجہ میں کسی حدیث کے موضوع ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

اس میں سب سے بڑی پہچان تو الفاظ کا جھول ہے یا غیر معیاری عبارت یا غیر معیاری الفاظ ہوں، رکاکۃ العبارۃ یا رکاکۃ اللفظ۔ رسول اللہ ﷺ فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ ترین معیار پر فائز تھے۔ حضورؐ افصح العرب ہیں اور دنیا نے تسلیم کیا ہے کہ حضورؐ افصح العرب ہیں۔ اس لئے کوئی ایسا جملہ جو گھٹیا قسم کا ہو، یا گھٹیا عبارت پر مبنی ہو یا عبارت جھول رکھتی ہو، اور فصاحت و بلاغت کے معیار سے گری ہوئی ہو وہ قطعاً رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نہیں ہو سکتی۔ جن حضرات نے پوری زندگی علم حدیث میں گزاری اور سالہا سال انہوں نے شب و روز حدیث کا مطالعہ رکھا ان کو ایک بصیرت اور ایک ملکہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ یہ اندازہ کر لیتے ہیں کہ یہ حدیث حضورؐ کا ارشاد نہیں ہو سکتی۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کوئی شخص اپنی ذاتی Subjective Opinion سے رائے دے دیتا تھا، ایسا نہیں تھا۔ بلکہ ماہرین حدیث کو محسوس ہو جاتا تھا کہ یہاں کوئی گڑبڑ ہے، پھر تحقیق سے بھی ثابت ہو جاتا تھا کہ یہاں واقعی گڑبڑ تھی۔

ایک محدث نے صحیح حدیث کے بارے میں لکھا ہے کہ لہ ضوء کضوء النہار، حدیث صحیح میں سے ایسی روشنی نکلتی معلوم ہوتی ہے جیسے سورج سے روشنی نکلتی ہے۔ اور حدیث موضوع کے بارے میں لکھا ہے لہ ظلمۃ کظلمۃ اللیل، حدیث موضوع میں ایسی تاریکی ہوتی ہے جیسے رات کی تاریکی ہوتی ہے۔ جب تحقیق کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ واقعی اس میں یہ جھول ہے۔

بعض چیزیں ایسی حضورؐ سے منسوب کر دی گئیں جو عام عقل اور مشاہدہ کے خلاف ہیں۔ اور بعض بڑی مضحکہ خیز قسم کی چیزیں مشہور کر دی گئی ہیں مثلاً ایک کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ کہ مرغا جب بولتا ہے تو فرشتے کو دیکھ کر بولتا ہے۔ بھئی مرغے کو فرشتے سے کیا تعلق ہے۔ بالبداہت غلط بات ہے۔ اس طرح کی اور بہت کی چیزیں جو بہت فضول قسم کی ہیں لیکن مشہور کر دی گئی ہیں۔

بعض چیزیں جو غیر اخلاقی اور بے حیائی کی چیزوں پر مشتمل ہوں وہ بھی موضوع ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے نعوذ باللہ کوئی ایسا لفظ نہیں نکل سکتا جو بے حیائی اور غیر اخلاقیات

پہنچی ہوں۔ ایسی بہت سی بے ہودہ اور بے تکی قسم کی چیزیں حضورؐ سے منسوب کر دی گئی ہیں۔ کس لئے یہ بے ہودہ چیزیں حضورؐ سے منسوب کر دیں؟ بعض لوگ خود بدکردار تھے بعض نے محض کھیل میں کر دیں، شرارتاً کر دیں، کچھ نے ویسے ہی کر دیں، مختلف اسباب ہو سکتے ہیں جن کا ابھی ذکر آئے گا۔

ایک اور چیز ہے۔ اور محدثین کے ہاں یہ اصول ہے کہ کسی چھوٹے عمل پر اتنے بڑے ثواب کا وعدہ ہو کہ جو غیر معمولی طور پر بڑا معلوم ہو تو اسے قبول نہیں کیا جائے گا۔ اگر آپ موضوعات پر نظر ڈالیں تو آپ کو اس کی مثالیں مل جائیں گی۔ مثلاً ایک جگہ لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص صبح اٹھنے کے بعد ایک مرتبہ کلمہ کہے تو اس کے ہر حرف سے ستر ہزار فرشتے پیدا ہوں گے۔ وہ ستر ہزار فرشتے اس کے لئے روزانہ دعا کریں گے اور ہر دعا سے ستر ہزار فرشتے نکلیں گے وہ دعا کریں گے اور قیامت تک اس کے لئے دعا کریں گے۔ یہ فضول سی بات ہے۔ مطلب یہ کہ آدمی کلمہ شہادت پڑھے، لا الہ الا اللہ پڑھے تو اس کا اجر و ثواب اپنی جگہ، لیکن یہ بات کہ اس سے اتنے فرشتے پیدا ہوں گے وغیرہ وغیرہ، اس طرح کا کلام رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے نہیں نکل سکتا۔ صحیح بخاری پوری پڑھ لیں آپ کو اس طرح کی کوئی فضول چیز نظر نہیں آئے گی، صحیح مسلم میں نظر نہیں آئے گی، موطاء امام مالکؒ میں نہیں ملے گی۔ اس طرح کی فضول باتیں اور قصے کہانیوں میں، واعظوں کے بیانوں میں اور گاؤں اور دیہاتوں میں بڑی جلدی مقبول ہو جاتی ہیں۔ کم علم لوگ اس طرح کی چیزیں بیان کرتے ہیں، اس لئے وہاں اس طرح کی چیز ملے گی، حدیث کی صحیح کتابوں میں نہیں ملے گی۔ ایسی ہی کمزور باتوں میں جنت کی کیفیات اور جہنم کی کیفیت اور ان کی اتنی تفصیلات کہ جیسے کسی نے فلم دیکھی ہو اس طرح کی تفصیلات حدیث میں نہیں آسکیں۔ یہ بھی موضوع حدیث کی ایک علامت ہے۔

موضوع احادیث کی تخلیق کے اسباب

موضوع حدیث کیوں ہمارے سامنے آئی اور کیسے جمع ہوئی؟ اس کے مختلف اسباب ہیں۔ یہ بات نہیں ہے کہ جنہوں نے موضوع حدیث بیان کی وہ سارے کے سارے بدنیت لوگ تھے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ ایک صحابیؓ کا قول ہے، صحابیؓ نے بیان کیا اور سننے والے

نے یہ سمجھا کہ شاید رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہوگا۔ انہوں نے غلط فہمی میں اس کو رسول اللہ ﷺ کی حدیث کے طور پر بیان کر دیا۔ حالانکہ وہ ارشاد کسی صحابی کا تھا۔ اس لئے محدثین اپنی اصطلاح میں اس کو موضوع حدیث قرار دیں گے۔ اس لئے کہ وہ حضورؐ کا ارشاد نہیں ہے لیکن اصل میں وہ کسی صحابی کا ارشاد ہوگا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ کسی بہت نیک اور اتقیٰ والے انسان نے جو بڑے جذبے والے اور مخلص آدمی تھے لیکن عقل میں ذرا کم تھے، انہوں نے کسی کو کوئی اچھی بات بیان کرتے ہوئے سنا اور سمجھے کہ یہ واقعی اچھی بات شاید حضورؐ نے فرمائی ہو اور اس کو حدیث کے طور پر بیان کرنا شروع کر دیا۔ بعض اوقات یہ بھی ہوا کہ کچھ لوگوں نے کسی سیاسی مصلحت سے اپنے اپنے سیاسی موقف کے حق میں احادیث بیان کرنی شروع کر دیں۔ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد اور پہلی صدی ہجری میں بہت سے ایسے واقعات پیش آئے۔ کچھ لوگوں نے بدنیتی کی بنیاد پر حضورؐ سے ارشادات منسوب کر دیئے تاکہ اس کے ذریعے اپنے سیاسی موقف کے لئے حمایت حاصل کر سکیں۔ اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ حدیث حضورؐ کا ارشاد ہو سکتی ہے کہ نہیں۔

اسی طرح سے بعد میں جب فقہی یا کلامی اختلافات ہوئے تو بعض حضرات نے اپنی اپنی پسندیدہ شخصیات کے بارے میں احادیث گھڑ کر حضورؐ کی ذات سے منسوب کر دیں۔ مثلاً ایک شخص نے امام ابو حنیفہؒ کے بارے میں حدیث گھڑ دی کہ میرے بعد ایک شخص ہوگا جس کا نام ابو حنیفہ ہوگا۔ هو سراج امتی، سراج امتی، سراج امتی۔ یعنی وہ میری امت کا چراغ ہوگا، میری امت کا چراغ ہوگا، میری امت کا چراغ ہوگا۔ حضورؐ کا ایسا کوئی ارشاد نہیں ہے۔ یہ بالکل جھوٹ اور فضول بات ہے۔

اسی طرح شاید کسی حنفی نے جو بڑا متعصب تھا اس نے امام شافعیؒ کے خلاف حدیث گھڑ دی کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میری امت میں ایک شخص آئے گا کہ يقال له محمد بن ادريس هو اشد على امتي من ابليس۔ کہ خود یہ وہ میری امت کے لئے ابلیس سے زیادہ نقصان دہ ہوگا۔ امام شافعیؒ جیسے انتہائی متقی بلکہ بزرگ اور مجتہد کے بارے میں یہ فضول بات پھیلا دی۔ اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ حدیث موضوع ہے۔

موضوع حدیث کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے بعد آنے والے کسی انسان کا نام لے کر کوئی پیشین گوئی نہیں کی۔ جس حدیث میں نام کے ساتھ کوئی پیشین گوئی

بیان ہوئی ہے وہ ساری کی ساری احادیث موضوع ہیں۔ اس طرح رسول اللہ ﷺ نے کسی خاص قوم یا پیشے کے لوگوں کی برائی بیان نہیں کی۔ کہ مثلاً بصرہ کے لوگ برے ہیں، اور کوفہ کے اچھے ہیں، یا خراسان کے برے ہیں اور مصر کے اچھے ہیں۔ جہاں کسی علاقہ کی برائی حضورؐ سے منسوب ہوئی ہے وہ حضورؐ کی زبان مبارک کے الفاظ نہیں ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ طریقہ نہیں تھا۔ قرآن پاک میں ہے "لا یسخر قوم من قوم" کوئی قوم کسی دوسری قوم کے ساتھ تمسخر نہ کرے۔ حضورؐ ایسا کیسے کر سکتے تھے۔ کسی قبیلہ کا نام لے کر برائی کہ فلاں قبیلہ کے لوگوں میں یہ برائی ہے یا فلاں علاقہ کے لوگوں میں یہ برائی ہے حضورؐ نہیں فرماتے تھے۔ اس طرح کی جتنی احادیث ہیں وہ سب کی سب موضوع ہیں۔ یہ کچھ علامات اور پہچانیں ہیں جو علم حدیث کے ماہرین نے مقرر کی ہیں اور جن سے موضوع احادیث کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

محدث جب حدیث بیان کیا کرتے تھے تو اس کے بہت سے انداز ہوتے تھے۔ ان سب کے درجات الگ الگ ہیں۔ سماع یعنی استاد کی زبان سے براہ راست سننا اور اس کی تصریح کرنا کہ میں نے براہ راست سنا، یہ سب سے اونچا درجہ ہے۔ محدث سے براہ راست سننا۔ پھر سننے کے بعد جب شاگرد آگے بیان کرتا ہے تو بیان کرنے کے جو الفاظ ہیں اس کے مختلف درجات ہیں۔ سب سے اونچا درجہ ہے سمعتہ یقول، کہ میں نے ان کو خود یہ بیان فرماتے سنا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے براہ راست سنا اور وہ اپنی زبان سے بیان فرما رہے تھے۔ اس کی ایک مثال صحیح بخاری کی پہلی روایت ہے۔ کتاب شروع ہوتی ہے کتاب بدء الوحی اور پہلا باب ہے کیف کان بدء الوحی علی رسول اللہ ﷺ۔ پھر آگے بیان کرتے ہیں حدثنا الحمیدی قال حدثنا سفیان عن یحیی بن سعید الانصاری قال اخبرنی محمد بن ابراہیم التیمی انہ سمع علقمۃ بن الوقاص اللیثی یقول، کہ انہوں نے علقمہ بن وقاص اللیثی کو یہ بیان کرتے ہوئے سنا، سمعت عمر بن الخطاب علی المنبر یقول، کہ میں نے حضرت عمر فاروقؓ کو یہ ارشاد فرماتے سنا۔ قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول، وہ یہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا کہ انما الاعمال بالنیات۔ یہ سب سے اونچا درجہ ہے جس میں محدث یہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے شیخ اور استاد کو سنا اور وہ یہ بیان فرما رہے تھے۔

دوسرا درجہ ہے حدثنی، کہ انہوں نے مجھ سے بیان کیا۔ اس کے بعد ہے حدثنا کہ

دار ہیں، اس کا نیکی و بدی والا یا کوئی اور وضع نہیں لے سکتا۔ اس لئے کہ پہلے سے تو معلوم نہیں ہوتا کہ کوئی شخص کونسی حدیث بیان کرے گا۔ اس لئے اس بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔

حضرت امیر معاویہؓ کے بیٹے حضرت یزید کے بارے میں جو حدیث ہے کہ میری امت کی وہ جماعت جو قسطنطنیہ یعنی موجودہ استنبول کو فتح کرے گی، وہ جماعت جنت میں جائے گی اور اس جماعت کے سپہ سالار یزید تھے تو کیا یہ حدیث صحیح ہے؟ کیونکہ آپ نے ایک خاص جماعت کو اس میں تعظیم دی ہے۔

اس موضوع پر مسند امام احمد میں دو حدیثیں آئی ہیں۔ پہلی حدیث میں استنبول کی فتح کا عمومی ذکر ہے۔ اس میں یزید میرے خیال میں شامل نہیں ہیں۔ میں حدیث کے الفاظ بیان کر دیتا ہوں: لتفتحن مدينة قيصر، کہ تم ضرور بالضرور قیصر کے شہر کو فتح کرو گے، جو قسطنطنیہ کے نام سے مشہور تھا، فلنعم الامير اميرها و نعم الجيش ذالك الجيش۔ وہ امیر کتنا ہی اچھا امیر ہوگا اور وہ لشکر کتنا ہی اچھا لشکر ہوگا۔ قسطنطنیہ کی فتح 1492ء میں ہوئی تھی۔ بہت سے لوگ قسطنطنیہ پر حملہ کرنے جاتے رہے ہیں کہ شاید ان کے ہاتھوں فتح ہو جائے اور وہ اس بشارت کے مصداق بن جائیں۔ یزید نے بھی کوشش کی لیکن یہ فتح یزید کے مقدر میں نہیں تھی۔ بلکہ محمد الفاتح کے ہاتھوں مقدر تھی جو عثمانی حکومت کا ایک بادشاہ تھا اور اسی لئے اس کو فاتح کہا جاتا ہے کیونکہ اس نے استنبول فتح کیا تھا۔ فتح کے بارے میں ایک روایت تو یہ ہے۔

مسند امام احمد کی ایک دوسری روایت ہے جس میں ہے کہ اول جيش يغزو مدينة قيصر مغفور لهم۔ یا اس طرح کے کچھ الفاظ ہیں۔ کہ وہ پہلا لشکر جو قیصر کے شہر پر حملہ کرے گا وہ مغفور لہم ہوگا۔ اب اس میں يغزو کا لفظ ہے۔ کیا اس سے مراد محض حملہ کرنا ہے یا فتح کر لینا مراد ہے۔ بعض روایات میں فتح کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے حملہ کرنا مراد ہے تو پہلا حملہ جس لشکر نے کیا اس کی سربراہی یزید کے ہاتھ میں تھی اور اس میں بڑے بڑے صحابہ کرامؓ بھی شامل تھے۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ اسی سال کی عمر میں اسی لئے تشریف لے گئے تھے کہ اس بشارت کے مصداق بن سکیں۔ چنانچہ وہاں محاصرہ ہی میں ان کا انتقال ہوا اور وہیں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ استنبول میں ان کا مزار آج بھی ہے۔ اور آپ میں سے جو وہاں گئے ہیں انہوں نے دیکھا ہوگا، میں نے بھی کئی بار ان کی زیارت کی ہے۔ اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہاں یغزو سے مراد کیا ہے۔ محض حملہ یا مکمل فتح۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے کہ کس کو اس کا مصداق

قرار دیتا ہے اور کسی کو نہیں۔

آپ نے کہا ہے کہ حضور ؐ نے اپنے بعد آنے والے کسی شخص کا نام لے کر کوئی بات نہیں فرمائی لیکن قیامت کی نشانیوں میں امام مہدی کا نام ملتا ہے؟

امام مہدی کے بارے میں جو احادیث ہیں ان کے بارے میں بڑی تفصیل سے بحث ہوئی ہے۔ اس میں دو ہی تواتر والی بات یاد رکھیں۔ یہ احادیث صحابہ کرام کی بڑی تعداد سے مروی ہیں اور صحابہ کے بعد بھی بڑی تعداد میں لوگوں سے مروی ہے۔ اگرچہ انفرادی طور پر یہ ساری احادیث اخبار آحاد ہیں لیکن ان میں کچھ باتیں قدرِ مشترک ہیں جن کو ہم تواتر قدرِ مشترک قرار دے سکتے ہیں۔ ان میں قدرِ مشترک کسی کا نام نہیں ہے۔ قدرِ مشترک یہ ہے کہ میرے بعد آخری زمانے سے پہلے ایک ایسا قائد، ایک ایسا متدین اور ہدایت یافتہ امام مسلمانوں کو ملے گا جو میرے طریقے کو دوبارہ زندہ کر دے گا۔ تواتر قدرِ مشترک کے اصول پر اتنی بات مشترک ہے۔ باقی کوئی چیز قدرِ مشترک نہیں ہے۔ ان روایات میں بہت سی ضعیف بھی ہیں، بلکہ کچھ روایات ان میں سے موضوع بھی ہیں۔ اس لئے جہاں نام کے تعین کے ساتھ ذکر آیا ہے وہ بعض محدثین کے نزدیک موضوع ہے اور جو لوگ اس کو موضوع نہیں سمجھتے ان کے نزدیک وہ احادیث سب کی سب ضعیف یا زیادہ سے زیادہ حسن لغیرہ ہیں۔ اس لئے یہ اصول کہ نام کے ساتھ جو روایات آئی ہیں وہ قابلِ قبول نہیں ہیں، یہ اصول باقی رہتا ہے اور مہدی کی روایت سے ٹوٹتا نہیں ہے۔ مہدی کی احادیث تواتر قدرِ مشترک سے ثابت ہیں۔ ان میں نام والی احادیث کا درجہ کم ہے۔

شبِ برات کے موقع پر اسلام آباد میں شبِ برات کی رات کو عبادت کی فضیلت کے بارے میں احادیث بھی کہی گئیں۔

نصف شعبان کے بارے میں ایک حدیث آئی ہے جو کہ میرے خیال میں بہت ضعیف ہے اور ضعیف کے بھی بہت نچلے درجے پر ہے۔ پندرھویں شعبان کی کوئی فضیلت حدیث کی مستند کتابوں میں نہیں آئی۔ اور قرآن پاک کی جس آیت کا لوگ حوالہ دیتے ہیں اس سے مراد کوئی اور رات نہیں ہے، بلکہ لیلۃ القدر ہے اور لیلۃ القدر ہی کا نام لیلۃ البراۃ ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ اپنا جسم نماز میں کتے کی طرح مت بچھاؤ اس میں جسم خود بخود ہو جاتا ہے، اس کی وضاحت فرمائیں۔

پانچواں خطبہ

علم اسناد و رجال

جمعۃ المبارک، 10 اکتوبر 2003ء

علم اسناد و رجال

آج کی گفتگو کا عنوان ہے علم اسناد اور علم رجال۔ ان دونوں کا آپس میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ اسناد سے مراد ہے کسی حدیث کی سند بیان کرنا۔ جبکہ رجال سے مراد ہے راویوں کا وہ سلسلہ جو حدیث کے ابتدائی راوی یا بیان کرنے والے سے رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی تک پہنچتا ہے۔ راوی کون لوگ ہوں، ان کا علمی درجہ کیا ہو، ان کی ذاتی اور اخلاقی صلاحیت کیا ہو، اس کی تو شرائط میں ان پر کسی قدر تفصیل سے اظہار خیال ہوا ہے۔ لیکن ابھی یہ گفتگو باقی ہے کہ راویوں کے حالات جمع کرنے کا کام کب سے شروع ہوا، کس طرح یہ حالات جمع کیے گئے اور کسی راوی کے قابل قبول یا ناقابل قبول، ضابط یا غیر ضابط ہونے کا فیصلہ کس بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ یہ وہ علم ہے جس کو علم اسماء الرجال یا علم رجال کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

علم اسناد اس وقت تک صحیح طور پر سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک علم رجال یا اسماء الرجال کی تفصیلات سامنے نہ ہوں۔ علم حدیث میں یہ مشکل ترین علوم وفنون میں شامل ہے۔ علم درایت میں علل کا موضوع سب سے مشکل ہے اور علم روایت میں رجال کا موضوع سب سے مشکل ہے۔ راویوں سے متعلق دو پہلو زیر بحث آتے ہیں۔ ایک پہلو تو رجال کے بارے میں معلومات، راویوں کی شخصیت اور کردار کے بارے میں تفصیلات سے متعلق ہے جس پر آج گفتگو ہوگی۔ رجال کا دوسرا پہلو کسی راوی حدیث کے قابل قبول یا ناقابل قبول ہونے کا فیصلہ، ان کے اصول اور قواعد اور ان اصول و قواعد کی روشنی میں بالآخر کسی راوی کے قابل قبول یا ناقابل قبول ہونے کا حتمی فیصلہ جس فن کی روشنی میں کیا جاتا ہے اس فن کو علم جرح و تعدیل کہتے ہیں۔ اس پر گفتگو کل ہوگی۔

ابتدا میں جب صحابہ کرام کا زمانہ تھا تو نہ روایت کی اتنی کثرت تھی نہ سند و حوالہ کی ضرورت تھی نہ اسناد کی ضرورت تھی۔ صحابہ کرام نے جس اہتمام اور جس محبت سے رسول اللہ ﷺ کے ارشادات، قول و افعال اور آپ کے حالات کو جمع کیا، یاد رکھا اور محفوظ کیا، وہ ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔ تو صحابہ کرام ایک دوسرے سے کسب فیض کیا کرتے تھے اور معلومات جمع کیا کرتے تھے۔

صحابہ کرام اور سند کا اہتمام

حضرت عبداللہ بن عباسؓ جو صحابہ میں علم و فضل میں بڑا اونچا مقام رکھتے ہیں، انہوں نے اپنی زندگی کے آخری تین سالوں میں رسول اللہ ﷺ سے براہ راست کسب فیض کیا۔ جب حضور ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی عمر تیرہ برس تھی۔ انہوں نے اپنی عمر کے بقیہ کافی سال دیگر صحابہ سے کسب فیض میں گزارے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے کسب فیض کے انداز سے یہ پتہ چلتا ہے کہ صحابہ کرام کا اسلوب اور رنگ ڈھنگ کیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو جب پتہ چلتا کہ کسی صحابیؓ کے پاس کوئی حدیث یا رسول اللہ ﷺ کا کوئی ارشاد گرامی ہے تو وہ ان صحابی رسول کے دولت خانے پر حاضر ہوتے۔ ایک مرتبہ ایک انصاری صحابیؓ کے مکان پر پہنچے۔ دوپہر کا وقت تھا اور وہ اندر سو رہے تھے۔ دستک دینا یا بلانا انہوں نے مناسب نہیں سمجھا اور یہ سوچ کر کہ وہ اس وقت آرام کر رہے ہیں، حضرت عبداللہ بن عباس ان کی دہلیز پر بیٹھ گئے۔ گرمی کا موسم تھا۔ ظاہر ہے ہوا کے جھکڑ چل رہے ہوں گے، ان لوؤں میں تیز آندھی اور دھوپ گرمی میں بیٹھے رہے۔ چہرے اور لباس پر گرد جم گئی۔ جب وہ صحابی عصر کی نماز کے لیے نکلے تو حضرت عبداللہ بن عباس کو بیٹھے دیکھا۔ انہوں نے کہا کہ اے ابن عم رسول اللہ ﷺ کے بھائی! آپ یہاں تشریف لائے اور مجھے اطلاع نہیں کی۔ آپ حکم دیتے تو میں آپ کے پاس حاضر ہوتا۔ آپ نے فرمایا کہ العلم یوتی ولا یاتی، علم کے پاس آیا جاتا ہے، علم کسی کے پاس نہیں جاتا۔ یہ صحابہ کا انداز تھا جو صحابہ کرام کے تذکروں اور سوانح سے پتہ چلتا ہے۔

مشہور صحابی حضرت عبادہ بن صامتؓ جن کے آخری ایام دمشق میں گزرے تھے۔ ان

کو پتہ چلا کہ ایک اور صحابی حضرت عقبہ بن عامر جہنی، جو رسول اللہ ﷺ کے خاص خدام میں شامل رہے، ان کے پاس کوئی خاص حدیث ہے، جو پہلے سے حضرت عبادہ بن صامت کے پاس پہنچی تھی، لیکن وہ اس کو کنفرم کرنا چاہتے تھے۔ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر ایک قافلہ کے ساتھ کئی ماہ کی مسافت طے کر کے حضرت عقبہ جہنی کے پاس پہنچے۔ ان کے مکان پر پہنچے تو شور مچ گیا کہ صحابی رسول حضرت عبادہ بن صامت تشریف لائے ہیں، لوگ جمع ہو گئے۔ وہ سیدھے حضرت عقبہ کے مکان پر پہنچے، دروازہ کھٹکھٹایا، وہ باہر نکلے، وہیں کھڑے کھڑے سلام دعا کی اور پوچھا کہ اس حدیث کے اصل الفاظ کیا ہیں؟ انہوں نے حدیث کے الفاظ سنائے، جو ان کی یادداشت کے مطابق تھے تو انہوں نے کہا کہ الحمد للہ مجھ تک جس ذریعے سے یہ حدیث پہنچی تھی وہ بالکل درست ہے، اب میں جا رہا ہوں اور یہ کہہ کر اجازت لی اور رخصت ہو گئے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خود صحابہ کرام نے کس محنت سے اور کس محبت اور احترام سے احادیث رسول کے بارے میں معلومات جمع کرنی شروع کی تھیں۔

جس کو خارجی نقد حدیث کہا جاتا ہے، جس پر کل ذرا تفصیل سے گفتگو ہوئی تھی۔ اس کی اساس علم روایت پر اور علم روایت کی اساس سند پر اور سند کی اساس رجال پر ہے۔ گویا رجال وہ بنیادی مضمون ہے جس کی بنیاد پر اسناد کا تعین ہوتا ہے اور اسناد کی بنیاد پر کسی حدیث کی خارجی نقد پر بات ہوتی ہے۔ اور خارجی نقد پر بات کرنے کے بعد گویا تحقیق کا ایک پہلو مکمل ہو جاتا ہے اور یہ طے ہو جاتا ہے کہ تاریخی وسائل اور نقد کے اعتبار سے اس حدیث کا کیا درجہ ہے۔ یہ ضرورت صحابہ کرام کے دور کے بعد پیش آئی جب صحابہ کرام دنیا سے اٹھ گئے اور بہت تھوڑی تعداد میں رہ گئے۔ کبار تابعین کا زمانہ بھی تقریباً ختم ہو گیا اور صغار تابعین کا زمانہ آ گیا۔ کبار تابعین کے زمانے تک بھی یہ امکان نہیں تھا کہ کوئی شخص رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی سے کوئی غلط بات منسوب کرے۔ غلط بات منسوب کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اس کا امکان بہر حال موجود رہتا تھا کہ یادداشت میں کوئی کمزوری آ جائے، کوئی دو احادیث کا مضمون ایک دوسرے میں مل جائے یا ایک حدیث کا مضمون دو الگ الگ متن کے طور پر بیان ہو جائے۔ اس طرح کا امکان موجود تھا۔ صحابہ کرام کی حد تک تو اس امکان کی بھی گنجائش نہیں تھی اس لئے کہ ان کے پاس حدیث رسول کو حاصل کرنے اور محفوظ رکھنے کا جو اہتمام تھا اس کا اندازہ آپ کو ان دو واقعات سے

ہو گیا ہو گا۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے جب کوئی پوچھتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے کیا فرمایا تو وہ براہ راست جواب نہیں دیا کرتے تھے، بلکہ اپنی فہم اور دانست کو بیان کر دیا کرتے تھے، اور جو بات ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ حدیث میں آیا ہے کہ من کذب علی متعمدا فلیتبوأ مقعدہ من النار، جو شخص جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں کر لے۔ اس لئے وہ حتی الامکان حدیث بیان کرنے سے احتراز کیا کرتے تھے کہ اس میں اگر ایک ذرا سی بھی غلطی کا امکان ہو تو اس وعید کے مستحق نہ بن جائیں۔ ایک مرتبہ ضرورت پڑ گئی اور وہ حدیث کے الفاظ بیان کرنے لگے تو پریشانی اور گھبراہٹ کے عالم میں کھڑے ہو گئے اور حدیث بیان کرنے کے بعد کہا کہ او قریبا من ذلک او شبیھا من ذلک یعنی تقریباً ایسی بات فرمائی تھی یا اس سے ملتی جلتی بات فرمائی تھی یا اس سے مشابہ بات فرمائی تھی، اور بڑی حیرت اور پریشانی کا اظہار کیا۔ ہو سکتا ہے کہ میری یادداشت میں کوئی کمزوری رہ گئی ہو۔ غرض انتہائی غیر معمولی اہتمام کے ساتھ انہوں نے یہ چیز بیان فرمائی۔

کبار تابعین کا بھی یہی رویہ تھا۔ لیکن جب صغار تابعین کا دور آیا، اور یہ زمانہ پہلی صدی ہجری کا نصف دوم ہے، اس وقت اس کا اندیشہ ہونے لگا کہ بعض لوگ احادیث بیان کرنے میں احتیاط اور تقویٰ کا وہ معیار برقرار نہیں رکھ پا رہے ہیں جو معیار صحابہ کرام نے رکھا تھا۔ اس وقت اس بات کی ضرورت پیش آئی کہ تابعین سے یہ پوچھا جائے کہ آپ نے کس صحابی سے یہ روایت سنی۔ تابعین میں بھی جو کبار تابعین تھے جن کا علم اور تقویٰ غیر معمولی طور پر ضرب المثل تھا ان سے یہ پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ لیکن صغار تابعین سے، جو صحابہ کرام اور حضور ﷺ کے زمانے سے دور ہونے کی وجہ سے جن کے بارے میں یہ امکان موجود تھا کہ شاید ان کے ہاں حفظ و احتیاط برقرار نہ رہے۔ ان سے یہ پوچھا جاتا تھا کہ آپ نے یہ حدیث کس صحابی سے یا کس تابعی سے لی ہے۔

سند کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟

حضرت سفیان ثوری جن کا شمار صغار تابعین میں ہوتا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ پہلے حدیث کی سند پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی لیکن لما استعمل الرواۃ الکذب استعملنا

لیوم التاریخ"۔ جب حدیث کے راویوں نے غلط بیانیوں سے کام لینا شروع کیا تو ہم نے ان کے لئے تاریخ کا وسیلہ اور تاریخ کا ہتھیار استعمال کرنا شروع کر دیا۔ تاریخ کے ہتھیار سے مراد یہ ہے کہ جب کوئی صاحب کوئی حدیث بیان کرتے تھے۔ وہ زمانہ تابعین یا تبع تابعین کا تھا۔ تو ان سے پوچھا جاتا تھا کہ انہوں نے یہ حدیث کس صحابیؓ سے سنی۔ صحابیؓ کا نام لینے کے بعد وہ یہ تحقیق کرتے تھے کہ ان صحابیؓ کی وفات کس سن میں ہوئی اور وہ صحابیؓ کس علاقہ میں قیام پذیر رہے تھے۔ اور اس طرح سے یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ بیان کرنے والے نے حدیث صحیح بیان کی ہے یا اس میں کوئی بھول رہ گیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک صاحب نے، جن کا تعلق تبع تابعینؒ سے تھا، انہوں نے کوئی حدیث بیان کی۔ سننے والوں نے پوچھا کہ آپ نے یہ حدیث کس سے سنی ہے؟ انہوں نے بیان کیا کہ فلاں تابعی سے سنی ہے۔ پوچھا گیا کہ کس سن میں سنی ہے تو انہوں نے کہا کہ سن ۱۰۸ھ میں سنی ہے۔ پوچھا گیا کہ سن ۱۰۸ھ میں کہاں سنی تھی تو انہوں نے کہا کہ آرمینیا میں سنی تھی۔ سوال ہوا کہ آرمینیا میں وہ کیا کرنے گئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ جہاد کرنے گئے تھے۔ پوچھنے والے بزرگ نے کہا کہ تم غلط بیان کر رہے ہو، جھوٹ بول رہے ہو۔ ان تابعی کا انتقال ۱۰۲ھ میں ہو گیا تھا اور ۱۰۸ھ میں وہ زندہ نہیں تھے۔ اور وہ جہاد کرنے کے لئے آرمینیا نہیں بلکہ روم تشریف لے گئے تھے۔ اب یہ معلومات کہ ان تابعی کا انتقال ۱۰۲ھ میں ہوا تھا اور انہوں نے جس جہاد میں حصہ لیا تھا وہ روم کی جہادی مہم تھی، آرمینیا کی نہیں تھی اور ان دونوں کے درمیان تقریباً دو ہزار میل کا فرق ہے۔ اس سوال و جواب بلکہ جرح سے یہ پتہ چلا کہ ان صاحب کو بیان کرنے میں یا تو یادداشت میں التباس ہو رہا ہے یا کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے، یا ممکن ہے انہوں نے دانستہ غلط بیانی کی ہو۔ اس بارے میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن اس بھول کی وجہ سے ان کی یہ روایت تبع تابعینؒ نے قبول نہیں کی۔

اس طرح سے جب یہ واقعات کثرت سے پیش آنے شروع ہوئے اور اس کا امکان وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا جا رہا تھا تو پھر یہ معلومات جمع کرنے کا عمل شروع ہوا کہ صحابہ کرام کہاں کہاں تشریف لے گئے تھے، کس کس علاقہ میں مقیم رہے، انہوں نے وہاں جا کر کیا کیا اور کس علاقہ میں کس طرح کی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ مثلاً جہاد کا معاملہ تھا۔ اب یہ بات کہ کسی خاص تابعی نے آرمینیا کے جہاد میں حصہ لیا یا روم کے جہاد میں حصہ لیا، اس کا براہ راست علم

حدیث سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن چونکہ روایت میں اس کا حوالہ دیا گیا کہ آرمینیا کے جہاد کے دوران ان سے یہ بات کہی، جب کہ انہوں نے آرمینیا میں جہاد نہیں کیا تو اس سے یہ مغالطہ واضح ہوگیا کہ غلط ہے کہ اس تابعی کی حد تک یہ تحقیق ہوگیا کہ ان کے ذریعے سے یہ روایت نہیں آئی، کسی اور کے ذریعے سے آئی ہوگی۔

اس طرح سے علم حدیث میں ایک نئے شعبہ کا آغاز ہوا جس کو علم اسناد بھی کہتے ہیں اور علم اسناد کی بنیاد چونکہ سند پر ہے اور سند میں راویوں کا تذکرہ ہوتا ہے، راویوں کے حالات جمع کرنے کو علم رجال کہا گیا۔ علم رجال سے یہ نہ سمجھئے گا کہ اس سے صرف مرد مراد ہیں۔ یہ صرف ایک اصطلاح ہے اور میں پہلے ہی عرض کرچکا ہوں کہ لا مشاحة فی الاصطلاح۔ اصطلاح میں کوئی اختلاف نہیں۔ علم رجال میں خواتین کا بھی تذکرہ ہوتا ہے۔ علم رجال کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جس میں خواتین راویوں کے تذکرے نہ ہوں۔ اس لئے رجال کے لفظ سے کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے۔ اس میں ان تمام راویوں اور راویات کا تذکرہ ہوتا ہے جنہوں نے علم حدیث کی روایت کی ہے۔ جیسے جیسے علم حدیث، روایات اور رجال کا دائرہ بڑھتا گیا، علم حدیث میں اختصاص (specialization) بھی پیدا ہوتا گیا۔ کچھ لوگ وہ تھے جو رجال کے فن میں زیادہ ماہر تھے۔ پھر رجال سے متعلق موضوعات جن میں جرح و تعدیل بھی ہے جس پر آگے چل کر بات ہوگی، کچھ لوگ اس کے متخصص ہوئے۔ کچھ لوگ علم روایت کے متخصص ہوئے کہ حدیث کی داخلی شہادت سے اندازہ لگائیں کہ حدیث کی داخلی شہادت سے اس کے قرین ہونے یا نہ ہونے کا پتہ چلتا ہے یا نہیں چلتا۔ کچھ حضرات تھے جو خارجی نقد روایت اور رجال میں زیادہ مشہور تھے، کچھ حضرات تھے جو داخلی نقد روایت میں زیادہ مشہور تھے۔ یعنی حدیث کی داخلی شہادت اور داخلی معیار نقد میں۔ کچھ حضرات تھے جو دونوں میں زیادہ مشہور تھے۔ جو دونوں میں زیادہ مشہور تھے ان میں حضرت امام مالکؒ کا نام نامی بھی شامل ہے۔ جو حضرات داخلی نقد روایت میں زیادہ مشہور تھے ان میں امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کا نام زیادہ مشہور ہے۔ جو نقد روایت میں مشہور ہیں ان میں محدثین کی بڑی تعداد شامل ہے۔ لیکن محدثین میں ایسے حضرات بھی شامل تھے مثلاً امام بخاری، امام ترمذی، جو دونوں میدانوں کے شہسوار تھے۔ جو روایت اور رجال کے بھی ماہر تھے اور نقد روایت کے بھی ماہر تھے۔ حدیث کی داخلی شہادت سے بھی ان کو بہت اچھا اندازہ ہوجایا کرتا تھا۔

رجال اور سند کی ضرورت پیش آنے کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ جہاں تک رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کا تعلق ہے صحابہ کرام ان کی روایت باللفظ کیا کرتے تھے۔ جو بات رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمائی اس کو اسی طرح یاد فرماتے تھے، اسی طرح لکھتے تھے اور آپس میں اپنے تحریری ذخائر کا ایک دوسرے سے تبادلہ اور تقابل کرتے رہتے تھے اور اپنی یادداشتوں کو ایک دوسرے سے چیک بھی کروایا کرتے تھے۔ صحابہ کرام کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ جہاں تک ممکن ہو رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کی روایت باللفظ ہو۔ لیکن جو معاملات رسول اللہ ﷺ کے عمل یا سنت تقریری سے تعلق رکھتے تھے، کہ حضور کے سامنے کوئی کام ہوا اور آپ نے اس کی اجازت دے دی یا منع نہیں فرمایا اس کی روایت ہر صحابی اپنے الفاظ میں کیا کرتے تھے۔ گویا ایک واقعہ کی تعبیر میں مختلف صحابہ کرام نے مختلف انداز سے کیں۔ جس نے جس طرح سے دیکھا اور سمجھا اور جس پہلو کو زیادہ اہم سمجھا اس پہلو کو بیان فرما دیا۔

جب یہ چیز تابعین تک پہنچی تو انہوں نے اس بات کا اہتمام کیا کہ جس صحابی نے جو چیز جن الفاظ میں بیان کی وہ ان کو انہی الفاظ میں آگے تک پہنچایا جائے اور اس کے الفاظ میں رد و بدل نہ کی جائے۔ روایت باللفظ کا یہ سلسلہ اہتمام کے ساتھ جاری رہا۔ اس میں اس حدیث نبوی سے بھی صحابہ کرام کو مدد ملی جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ 'نضر الله امرأ' اللہ تعالیٰ اس شخص کو سرسبز و شاداب رکھے 'سمع مقالتي' جس نے میری کوئی بات سنی 'فوعاها كما سمعها' اور جیسا اس کو سنا تھا ویسے ہی اس کو روایت کر دیا۔ اس سے روایت باللفظ کی اہمیت واضح ہوتی ہے کہ اگر جیسا سنا تھا ویسا ہی بیان کرو گے تو تروتازگی کی یہ بشارت ملے گی اور اگر اس کے الفاظ یا مفہوم میں کوئی تبدیلی ہو گئی تو بظاہر مفہوم یہ نکلتا ہے کہ یہ بشارت اس طرح سے حاصل نہیں ہوگی۔

احادیث کی روایت باللفظ کا اہتمام

رسول اللہ ﷺ جب صحابہ کرام کو بذات خود کوئی چیز بتاتے یا پڑھاتے یا یاد کرواتے تھے تو اس بات کا اہتمام کرتے تھے کہ جو الفاظ آپ نے یاد کروائے ہوں صحابہ کرام انہی الفاظ میں اس کو یاد کریں۔ چنانچہ حضرت براء بن عازب کا مشہور واقعہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک

مرتبہ ان سے پوچھا کہ اے براء! جب رات کو سونے کے لئے لیٹتے ہو تو کوئی دعا کرتے ہو؟ انہوں نے فرمایا کہ یا رسول اللہ آپ بتائیں جو آپ فرمائیں گے میں وہ دعا پڑھا کروں گا۔ اس پر حضورؐ نے ان کو یہ دعا سکھائی جو مشہور ہے کہ "اللھم اسلمت وجھی الیک وفوضت امری الیک والجات ظھری الیک رغبۃ و رھبۃ الیک، لاملجا ولا منجا منک الا الیک آمنت بکتابک الذی انزلت ونبیک الذی ارسلت"۔ جب حضرت براء بن عازبؓ نے دوبارہ پڑھ کر رسول اللہ ﷺ کو سنائی تو آپ نے نبیک کی بجائے ورسولک الذی ارسلت کہا تو رسول اللہ ﷺ نے ان کا ہاتھ سے ٹھوکا لگا کر اشارہ کیا اور فرمایا کہ نہیں ایسے، ونبیک الذی ارسلت کہا تھا۔ تو حضرت براء بن عازبؓ نے یہ ہمیشہ یاد رکھا، اور وہ انتہائی محبت سے بیان کیا کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہاں ٹھوکے سے اشارہ کرکے بتایا کہ ونبیک الذی ارسلت۔ اس سے اس بات کی بھی تائید ہوتی ہے کہ جو بات حضورؐ نے ارشاد فرمائی ہو اس کو انہی الفاظ میں بیان کرنا چاہئے اس کا ہم معنی کوئی لفظ استعمال نہیں کرنا چاہئے۔ نبی اور رسول قریب قریب ایک ہی معنی کے حامل ہیں لیکن رسول اللہ ﷺ نے یہاں نبی کا لفظ استعمال فرمایا تھا اس لئے آپ نے تاکید فرمائی کہ اسی لفظ کو استعمال کیا جائے۔ چنانچہ صحابہ کرام کے زمانے سے اس کا التزام رہا اور رسول اللہ ﷺ کے قولی ارشادات تو تقریباً ۹۹ فیصد روایت باللفظ کے ساتھ منقول ہیں۔ البتہ حضورؐ کے اعمال، تقریرات یا افعال کا معاملہ ذرا مختلف ہے جن کو ہر صحابیؓ نے اپنے انداز میں بیان کیا۔ جس صحابی نے جس طرح دیکھا اور جس طرح سے مناسب سمجھا بیان کیا۔ پھر تابعین نے صحابہ کرام کی اس روایت کو انہی کے الفاظ میں بیان کیا اور ہر صحابیؓ کی روایت ان کے اپنے منفرد الفاظ کے ساتھ کتب حدیث میں موجود ہے۔

اس بات کی تائید اس مثال سے بھی ہوتی ہے کہ ایک حدیث میں کوئی صحابیؓ ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے دو قبیلوں کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ سلسلہ بیان میں قبیلہ اسلم اور قبیلہ غفار نے یہ کیا، ان کے ساتھ یہ معاملہ ہوا۔ کسی بھی سیاق وسباق میں ان کا ذکر ہے۔ اب جن تابعی نے ان سے سنا ان کو یہ التباس ہو گیا کہ صحابی رسول نے غفار کا لفظ پہلے بولا تھا یا اسلم کا پہلے بولا تھا۔ حالانکہ اس بات کی ذرا بھی اہمیت نہیں ہے۔ اس سے معنی میں، مفہوم میں، پیغام میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن وہ تابعی جب بیان کرتے تھے تو یہ وضاحت ضرور کرتے تھے کہ انہوں نے غفار اور اسلم یا اسلم اور غفار

وهو ابن عيينة ۔ یعنی ترمذی کہتا ہے کہ وہ ابن عیینہ ہیں یا ثوری ہیں تاکہ واضح ہو جائے کہ یہ وضاحت میرے استاد حضرت کی زبان مبارک سے نہیں ہے بلکہ میری زبان سے ہے۔ یہ گویا ایک مثال ہے کہ روایت باللفظ میں کس قدر باریکی اور نزاکت کا اہتمام رکھا گیا۔

کیا روایت بالمعنی جائز ہے؟

کچھ وقت گزرنے کے بعد محدثین کے درمیان یہ سوال پیدا ہوا کہ روایت باللفظ سے ہٹ کر اگر روایت بالمعنی کی جائے تو جائز ہے یا نہیں؟ لیکن روایت بالمعنی کا سوال تدوین کے سلسلے میں نہیں پیدا ہوا تھا۔ تدوین کی حد تک بخاری، مسلم، ترمذی اور باقی سب کتابوں میں جب روایتیں جمع کی گئیں تو جس طرح سے آئی تھیں اسی طرح سے لکھی گئیں۔ روایت باللفظ ہی کے انداز میں جمع ہوئیں۔

سوال وہاں پیدا ہوا جہاں کسی مجلس درس یا مجلس وعظ میں یا تبلیغ دعوت کے کسی عمل میں کوئی حدیث بیان کرنے کی ضرورت پیش آئے تو کیا وہاں بھی روایت باللفظ کی پابندی ضروری ہے یا روایت بالمعنی بھی ہو سکتی ہے۔ یہ سوال وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اہمیت اختیار کرنے لگا اور ہم ان تمام محدثین اور علماء کرام کے شکر گزار ہیں جنہوں نے یہ سوال اٹھایا اور اس معاملہ میں یہ گنجائش پیدا کی۔ اگر وہ حضرات روایت بالمعنی کی یہ گنجائش پیدا نہ کرتے تو آج دنیائے اسلام کے لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کے لئے حدیث رسول کا حوالہ دینا ناممکن ہو جاتا۔ اس لئے کہ ہم میں سے کتنے ہیں جو حدیث کے حافظ ہیں اور ایک ایک لفظ زیر زبر کی پابندی کے ساتھ اور ایک ایک شوشے کی پابندی کے ساتھ اسی طرح بیان کر سکتے ہیں جس طرح کی میں نے مثالیں دیں کہ وہ استاد کے نام کا اضافہ بھی ان سے منسوب نہیں کرتے۔ ایسا ہوتا تو پھر لوگ حدیث کا حوالہ دینا چھوڑ دیتے اور عوام کے لئے اس سے استفادہ کرنا عملاً مشکل ہو جاتا بلکہ ناممکن ہو جاتا۔ اس لئے محدثین نے یہ سوال اٹھایا کہ کیا روایت بالمعنی جائز ہے؟ کچھ لوگوں کا پھر بھی یہی خیال رہا کہ روایت بالمعنی کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے۔ بلکہ جو لوگ بیان کرنا چاہیں وہ پہلے یاد کریں پھر اس کے بعد بیان کریں۔ لیکن علماء کرام کی اکثریت نے بعد کے سالوں میں تیسری، چوتھی اور پانچویں صدی ہجری کے سالوں میں کچھ شرائط کے ساتھ روایت بالمعنی کی اجازت دے دی۔

تیسری شرط تو یہ ہے کہ جو راوی اس کو روایت کرے وہ صرف ونحو اور علوم لغت کا عالم ہو۔ یعنی جب وہ روایت بالمعنی کرے تو اس کو پتہ ہو کہ جس لفظ کو وہ جس معنوں میں بیان کر رہا ہے وہ لفظ ان معنی میں استعمال ہوتا ہے کہ نہیں۔ اگر وہ اس معنی میں نہ ہوا اور بیان کرنے والا صرف و لغت کا عالم نہ ہو تو وہ کچھ کا کچھ بیان کر دے گا۔

ایک صاحب کے بارے میں مشہور ہے کہ انہوں نے ایک حدیث کا ترجمہ پڑھا جس میں من قوماً فلیخفف، کہ جو شخص کسی کی امامت کرے وہ ہلکی نماز پڑھائے۔ تو یہ ترجمہ لکھا ہوا دیکھ کر وہ سمجھے کہ شاید ہلکے پھلکے ہو جائیں اور نماز میں حرکت کرتے رہیں۔ چنانچہ جب وہ امامت کرتے تو ہلتے رہتے تھے۔ کسی نے پوچھا کہ آپ نماز پڑھاتے ہوئے ہلتے کیوں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ حدیث میں آیا ہے۔ پوچھا کہ حدیث میں کہاں لکھا ہوا ہے کہ نماز میں ہلا کرو۔ ان امام صاحب نے ترجمہ دکھایا تو لکھا ہوا تھا کہ نماز ہلکی پڑھائے۔ انہوں نے ہلکے کو ہلکے پڑھا۔ یعنی اگر آدمی صرف ونحو اور لغت کا عالم نہ ہو تو اس طرح کی غلطیاں ہو سکتی ہیں۔

دوسری شرط یہ ہے کہ وہ الفاظ جو احادیث میں استعمال ہوئے ہیں اور ان کا جو معنی اور مفہوم رسول اللہ ﷺ کا مقصود تھا اس سے واقف ہو۔ اور دونوں الفاظ کے درمیان جو تفاوت ہے یعنی جو الفاظ وہ استعمال کر رہا ہے اور جو اصل میں استعمال ہوئے ہیں ان دونوں کے درمیان فرق سے واقف ہو۔ اور حدیث رسول کو غلطی کے بغیر بیان کرنے کی استطاعت رکھتا ہو۔ یہ شرط تو ہر اس شخص کے لئے ہیں جو حدیث کا مفہوم بیان کرے گا۔

امام مالکؒ کی ایک بات مجھے بہت پسند آئی ہے۔ امام مالکؒ کا ارشاد یہ ہے کہ احادیث مرفوعہ میں تو روایت بالمعنی جائز نہیں ہے۔ یعنی کوئی چیز جو رسول اللہ ﷺ سے منسوب ہے اس میں تو روایت بالمعنی جائز نہیں ہے اور وہ روایت باللفظ ہی ہونی چاہئے۔ لیکن جو بقیہ احادیث ہیں جن میں صحابہ کرامؓ میں سے کسی کی رائے یا کسی کا مشاہدہ یا کسی کا فتویٰ یا کسی کی روایت بیان ہوئی ہے وہ روایت بالمعنی ہو سکتی ہے کیونکہ اس کے بارے میں یہ وعید نہیں آئی ہے کہ من کذب علی متعمدا فلیتبوا مقعدہ من النار۔ یہ وعید صرف حضورؐ کے ارشادات کے بارے میں آئی ہے۔ یہ امام مالکؒ کی رائے ہے جو بہت وزنی معلوم ہوتی ہے۔

اس سے ملتی جلتی ایک دوسری رائے یہ ہے کہ روایت بالمعنی صحابہؓ کے لئے تو جائز تھی

لیکن غیر صحابی کے لئے جائز نہیں ہے۔ اب اگر صحابہ کے لئے جائز تھی اور غیر صحابہ کے لئے جائز
نہیں تو پھر ہمارے لئے تو پھر یہ اجازت بیکار ہے اور ہمارے لئے اس اجازت کا ہونا یا نہ ہونا
بے معنی ہے۔ یہ تو ایک نظری یا تعلیمی شکل بات ہوئی۔ لیکن جو عام محدثین ہیں ان کا یہی کہنا ہے کہ
روایت بالمعنی ان شرائط کے ساتھ جائز ہے اور بعد میں لوگوں نے روایت بالمعنی ہی کے طریقے کو
اختیار کیا۔ آج کل آپ نے سنا ہوگا لوگ دینی گفتگو میں، تقریروں اور مضامین میں کثرت سے
احادیث کا حوالہ مفہوم کے ساتھ دیتے ہیں۔ لیکن کوشش کرنی چاہئے کہ مفہوم کا حوالہ صحیح ہو اور کسی
حدیث کا حوالہ بغیر تحقیق کے نہ دیا جائے۔ بعض اوقات گفتگو کے دوران دوران بیان میں ایک چیز
زبان پر آجاتی ہے اور آدمی اس کو حدیث کہہ کر بیان کر دیتا ہے اور بعد میں پتہ چلتا ہے یا تحقیق
سے پتہ چلتا ہے کہ حدیث نہیں تھی بلکہ کسی اور کا قول تھا۔ ایسا کرنا احتیاط کے خلاف ہے۔ یہ چیز
بڑی ذمہ داری کا تقاضا کرتی ہے اور اس معاملہ میں احتیاط کرنی چاہئے۔

عام روایت میں، جس میں روایت باللفظ اصل ہے اور روایت بالمعنی کی بعد
میں اجازت دی گئی ہے، یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود متعدد مواقع پر اپنے
ارشادات کو دوسروں تک پہنچانے کا حکم دیا۔ ایک جگہ آپ نے فرمایا کہ بلغوا عنی ولو آیۃ، کہ اگر
میری طرف سے ایک آیت بھی تم تک پہنچی ہے تو اس کو دوسروں تک پہنچاؤ۔ اب جس شخص کے علم
میں بھی رسول اللہ ﷺ کے ارشادات یا سنت کا علم آیا ہے وہ مکلف ہے کہ جہاں تک اس کے بس
میں ہو اور جہاں تک اس کے لئے آسان ہو اسے دوسروں تک پہنچائے۔ اسی طرح خطبہ حجۃ
الوداع دینے کے بعد آپ نے فرمایا کہ الا ھل بلغت کیا میں نے پہنچا دیا؟ لوگوں نے جواب دیا
کہ ہاں آپ نے پہنچا دیا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ فلیبلغ الشاھد الغائب کہ جو موجود ہے وہ
یہ بات ان تک پہنچا دے جو موجود نہیں ہیں۔ اس لئے بہت بڑی تعداد میں ان صحابہ کرام نے خطبہ
حجۃ الوداع کی روایت کی اور انہیں ان صحابہ تک پہنچایا جو وہاں موجود نہیں تھے اور ان تابعین تک جو
بعد میں آئے کیونکہ فلیبلغ الشاھد الغائب کا اطلاق علماء امت کے نزدیک ہر اس شخص پر
ہوتا ہے جس تک یہ حدیث پہنچے۔ جس شخص کی مجلس میں یہ حدیث بیان کی جائے گی تو جو شخص
وہاں موجود ہوگا وہ شاہد ہوگا اور جو وہاں موجود نہیں ہوگا وہ غائب ہوگا۔ تو موجود ہے وہ موجود
نہ رہنے والے تک پہنچائے۔ اور جب کوئی شخص پہنچائے گا تو وہ ایک طرح سے راوی حدیث ہوگا۔

ان کا کردار اور ان کی شخصیت زیر بحث آئیں گے۔ جب زیر بحث آئیں گے تو علم رجال وجود میں آئے گا۔ اس لئے ان احادیث کا لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ راویوں پر رواۃ کے بارے میں بحث ہو۔ چونکہ رواۃ اور راویانِ حدیث اس ارشادِ نبوی پر عمل درآمد کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اگر راویانِ حدیث نہ ہوتے تو آج ہم ان ارشادات گرامی سے محروم ہوتے اور ان پر عمل نہ کرسکتے۔ راویانِ حدیث ہی کے وسیلے سے اور انہی کے واسطے سے یہ ہدایت اور رہنمائی ہم تک پہنچی ہے۔ اس لئے وہ اس عمل کا ایک لازمی حصہ ہیں۔ اور اس عمل کا حصہ ہونے کی وجہ سے ان کی شخصیت کا مطالعہ بھی علم حدیث ہی کا مطالعہ ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ وہ تمام مسلمان خواتین و حضرات جو روایت حدیث، نقل حدیث، کتابت حدیث، شرح حدیث اور درس حدیث میں مصروف ہیں وہ سب کے سب اس عمل کا حصہ ہیں۔ کہ فلیبلغ الشاهد الغائب پر وہ سب عمل کر رہے ہیں اور فلیبلغ الشاهد الغائب کے حکم پر عمل کرنے کے ساتھ ساتھ وہ راویان حدیث اور علم حدیث کا بھی حصہ بنتے جا رہے ہیں۔

چنانچہ اس طرح سے ایک ایک کر کے یہ نام سامنے آتے رہے اور یہ تحقیق شروع ہوتی گئی۔ سب سے پہلے تحقیق اور راویان حدیث کی چھان بین کا یہ عمل حضرت حسن بصریؒ نے شروع کیا۔ حضرت حسن بصریؒ اور محمد بن سیرین تابعین میں بڑا نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ تین تابعین کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ سید التابعین ہیں۔ ایک سعید ابن المسیب، جو حضرت ابوہریرہؓ کے شاگرد خاص اور داماد تھے اور طویل عرصہ ان کے ساتھ رہے۔ دوسرے حضرت حسن بصریؒ جن کے بارے میں کہا گیا کہ وہ سید التابعین ہیں۔ اور تیسرے حضرت محمد بن سیرین جو تابعین میں بڑا نمایاں مقام رکھتے تھے۔

علم طبقات اور علم رجال

ان مؤخر الذکر دو حضرات نے، یعنی حسن بصری اور محمد بن سیرین نے رجال کے کام کا آغاز کیا۔ اور ایک طرح سے یہ دونوں حضرات علم رجال کے بانی اور موسس ہیں۔ انہوں نے سب سے پہلے یہ معلومات جمع کیں کہ صحابہ کرام کہاں کہاں تشریف لے گئے۔ اس ضمن میں پہلا کام یہ تھا کہ صحابہ کرام کے بارے میں مکمل معلومات جمع کی جائیں۔ صحابہ کرام کے بارے میں تو

سب کو معلوم ہے۔ ان کے بارہ میں زیادہ تحقیق کی ضرورت نہیں پڑی۔ لیکن خطبہ حجۃ الوداع میں
ایک لاکھ چوبیس یا چالیس ہزار صحابہ کرام موجود تھے، ان کے علاوہ بھی بہت سے صحابہ تھے جو اس
موقع پر حج کے لئے تشریف نہیں لائے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کو جو نہیں جانا جاتا تھا۔ پہلا کام
تو یہ تھا کہ صحابہ کرام کے حالات کو جمع کیا جائے اور ان کے تذکروں پر کتابیں تیار کی جائیں
تاکہ پتہ چل جائے کہ کون لوگ صحابی تھے اور کون نہیں تھے۔

لہٰذا سب سے پہلے صحابہ کرام کے تذکروں کی جمع و تدوین کا کام شروع ہوا جس میں بعض
کی مثالیں میں ابھی دیتا ہوں۔ آگے چل کر جب صحابہ کرام مدینہ منورہ سے نکل کر کوفہ، بصرہ،
دمشق، مصر اور دیگر مختلف جگہوں میں آباد ہوئے تو اس بات کی بھی ضرورت پیش آئی کہ جو صحابی
جہاں جا کر بسے ہیں وہاں جا کر ان کا تذکرہ لکھا جائے۔ چنانچہ ان صحابہ پر الگ الگ کتابیں لکھی
گئیں جو کوفہ میں جا کر بسے، جو بصرہ میں جا کر بسے، جو دمشق اور قاہرہ میں جا کر بسے اور ان صحابہ
کے بارے میں ایک کتاب ہماری اردو زبان میں بھی ہے (اور عربی میں بھی) جو سندھ میں آ کر
بسے۔ ہندوستان کے ایک بزرگ تھے قاضی اطہر مبارکپوری، انہوں نے ایک کتاب لکھی جس میں
انہوں نے ان صحابہ کے حالات لکھے جو سندھ میں تشریف لائے، اور سندھ میں آباد ہوئے اور
یہیں ان کا انتقال ہوا۔ اس طرح سے ہر شہر اور علاقہ کے صحابہ پر الگ الگ کتابیں لکھی گئیں جس کے
بعد یہ ممکن نہیں رہا کہ کوئی شخص غلط طور پر یہ دعویٰ کرے کہ فلاں صحابی نے مجھ سے یہ بیان کیا۔ اسی
طرح یہ امکان بھی نہیں رہا کہ ایک صاحب صحابی نہ ہوں اور بعد میں یہ دعویٰ کریں کہ میں صحابی
ہوں۔ مثال کے طور پر کوئی شخص سمرقند جائے اور یہ دعویٰ کرے کہ میں صحابی رسول ہوں۔ حضورؐ
نے یہ فرمایا ہے۔ اگرچہ ایسا نہیں ہوا۔ لیکن چونکہ امکان موجود تھا اس لئے اس امکان کا سدباب
کرنے کے لئے ان تابعین حضرات نے صحابہ کرام کے تذکرے الگ بھی جمع کئے، شہروں کے بھی
جمع کئے، قبیلہ وار بھی جمع کئے اور مختلف جنگوں کے حساب سے بھی جمع کئے کہ کس جنگ میں کون کون
سے صحابی شریک ہوئے۔ تاکہ یہ پتہ چلے کہ کون سے صحابی سمرقند تشریف لے گئے تھے اور کون
سے صحابی آرمینیا تشریف لے گئے تھے۔ تاکہ وہاں اگر کوئی روایت ان کے نام سے آئے تو تحقیق
کی جاسکے کہ وہ وہاں تشریف لے بھی گئے تھے یا نہیں۔

ہندوستان میں ایک شخص تھا بابا جنوبی ہندوستان میں، دکن یا حیدرآباد دکن کا رہنے

والا تھا۔ اس کا نام بابا رتن تھا۔ ساتویں صدی ہجری میں تھا اور اس نے طویل عمر پائی تھی۔ ہمیں نہیں
معلوم کہ وہ کتنا عمر کا تھا لیکن غالباً ۶۰۰ یا ۷۰۰ سو سال اس کی عمر تھی۔ اس نے دعویٰ کیا کہ میں تقریباً
سو سال سے زیادہ عمر کا ہوں، رسول ﷺ کے زمانہ میں موجود تھا۔ چنانچہ معجزہ شق القمر کے بعد جب میں نے
دیکھا کہ چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے تو میں عرب پہنچا۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ
آ چکے تھے۔ میں مدینہ پہنچا اور وہاں جا کر مسلمان ہوا اور آپ ﷺ کے پاس تین چار مہینے رہا، پھر آپ
نے مجھ سے کہا کہ اپنے علاقہ میں جا کر تبلیغ کرو تو میں واپس ہندوستان آ گیا۔ بہت سے لوگوں نے
اس کی باتیں مان لیں اور اس کا بہت چرچا ہوا۔ لوگ دور دور سے اس کے پاس آ کر شریک ہوتے۔
اس کی خوب ہر طرف چلی اور بڑی شہرت ہوئی۔ اس پر محدثین کے سامنے سوال پیدا ہوا
کہ اس شخص کے دعویٰ کی کیا حیثیت ہے۔ محدثین نے لکھا کہ یہ بالکل جھوٹ ہے۔ ایسا کوئی آدمی
صحابی رسول قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن اس کے نام سے روایات مشہور ہونی شروع ہو گئیں۔
ہمارے برصغیر کے لوگ ایسے بھی بڑے خوش عقیدہ ہوتے ہیں اور مذہب کے نام پر بہت جلد
لوگوں کی باتوں میں آ جاتے ہیں۔ علامہ اقبال نے کہیں کہا ہے کہ

تاویل کا پھندا کوئی صیاد لگا دے
یہ شاخِ نشیمن سے اترتا ہے بہت جلد

کہ ہندوستان کے مسلمان تاویل کے پھندے میں بہت جلدی پھنس جاتے ہیں۔ یہ
ہندوستان کے مسلمانوں کا ایک کمزور پہلو ہے۔ لیکن بابا رتن کے علاوہ ایک دوسرے شخص نے بھی
ایسا ہی دعویٰ کیا لیکن محدثین نے بڑی صراحت اور قطعیت کے ساتھ کہا کہ دونوں جھوٹے ہیں
اور ان دونوں کو دجال اور کذاب قرار دیا۔ ان کی کوئی بات نہیں چلی۔ چنانچہ بہت جلد وہ فتنہ ختم
ہو گیا۔

صحابہ کرامؓ کے بعد جیسے جیسے زمانہ بڑھتا گیا علماء حدیث علم رجال پر معلومات جمع
کرتے رہے اور بالآخر پانچویں صدی ہجری تک یہ معلومات مکمل طور پر جمع ہو گئیں۔ اس لئے
پانچویں صدی ہجری کے بارے میں میں نے عرض کیا تھا کہ امام بیہقی آخری محدث ہیں جن کی
وفات ۴۵۸ھ میں ہوئی ہے اور جنہوں نے تمام روایات احادیث کی روایت کر کے اپنا مجموعہ مرتب
کیا۔ ان کے بعد کے جو مجموعے ہیں وہ براہ راست روایت شدہ مجموعے نہیں ہیں۔ بلکہ سابقہ

جن لوگوں نے لکھا وہ کتابیں ہمارے سامنے ہیں اور ان کی بنیاد پر ہم بتا سکتے ہیں کہ اس کا آغاز کب ہوا۔

طبقات پر اہم کتابیں

سب سے پہلے طبقات ابن سعد کے نام سے بارہ تیرہ جلدوں میں ایک کتاب تیار ہوئی، کوئی ایڈیشن بارہ جلدوں میں ہے، کوئی تیرہ میں اور کوئی چودہ جلدوں میں ہے۔ یہ ایک بڑے مشہور محدث اور مورخ تھے۔ انہوں نے طبقات ابن سعد کے نام سے ایک کتاب لکھی اور اپنے زمانے تک صحابہ سمیت جتنے بھی راویان حدیث تھے ان سب کے حالات جمع کئے۔ شروع کی پہلی دو جلدیں سیرت پر ہیں۔ انہوں نے سوچا کہ جس شخصیت کے راویوں کے حالات بیان کرنے ہیں پہلے اس شخصیت کا تذکرہ ہونا چاہئے۔ اس لئے پہلی دو جلدوں میں انہوں نے سیرت بیان کی اور بقیہ دس یا بارہ یا چودہ جتنی بھی جلدیں ہیں ان میں انہوں نے صحابہ کرام سے لے کر اپنے زمانہ تک کے تمام راویوں کے حالات بیان کئے۔

میں آپ سے یہ بھی عرض کردوں کہ محدثین کی نظر میں ابن سعد کا درجہ اتنا زیادہ اونچا نہیں ہے۔ اس لئے نہیں کہ ابن سعد پر کوئی اعتراض تھا، لیکن یہ بات میں اس لئے عرض کرنا چاہ رہا ہوں کہ محدثین کے مشکل اور سخت معیار کا اندازہ ہو جائے جو انہوں نے راویوں کے لئے رکھا۔ وہ ابن سعد کو کم معیار کا اس لئے قرار دیتے ہیں کہ ابن سعد واقدی کے شاگرد تھے اور واقدی محدثین کی نظر میں قابل قبول نہیں تھے۔ کوئی محدث واقدی کی روایت قبول نہیں کرتا۔ کسی محدث نے، نہ بخاری نے، نہ مسلم نے، نہ ترمذی نے، نہ ابوداؤد نے، کسی نے ان کی روایت قبول نہیں کی۔

مجھے حیرت ہوئی تھی کہ جب ہم واقدی کی کتابیں پڑھتے ہیں تو وہ بڑے صاحب علم، فقیہ اور متدین انسان معلوم ہوتے ہیں تو آخر یہ محدثین ان کی روایت کیوں قبول نہیں کرتے؟ ان کا کردار کس درجہ کا تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی جتنی آمدنی تھی وہ ساری آمدنی اور اپنے وقت کا سارا حصہ مطالعہ اور علم کے حصول میں لگایا کرتے تھے۔ علم حدیث کے بارے میں معلومات اور سیرت کے واقعات جمع کرنا ان کے مشاغل تھے۔ سیرت کے بڑے

نامور تھے۔ مغازی یعنی حضورؐ کے غزوات کے واقعات جمع کرتے تھے۔ ہر اس قبیلہ میں جاتے تھے جس نے کسی جنگ میں حصہ لیا ہو یا جس قبیلہ کے کسی آدمی نے حضورؐ کے ساتھ کسی جنگ میں شرکت کی ہو اور وہاں سے واقعات جمع کرتے تھے کہ کیا ہوا اور کیسے ہوا اور آپ کے بزرگوں میں کیا چیز مشہور ہے اور پھر اس کو لکھا کرتے تھے۔ ایک ایسا آدمی جس نے پوری زندگی اس کام میں گزاری ہو تو آخر محدثین نے اس کو ناقابل قبول کیوں سمجھا۔

واقدی کی روایات کا بیشتر حصہ علم حدیث اور علم سیرت سے ہے۔ یہ طبعاً بڑے فیاض تھے اور روپے خرچ کرنے میں فراخ دل تھے۔ اس لئے وہ اکثر تنگ دستی کے شکار رہا کرتے تھے۔ ان کے پاس پیسے نہیں ہوا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ عید کے موقع پر ان کی اہلیہ نے ان سے شکایت کی کہ گھر میں پیسے نہیں ہیں، نہ کسی کے پاس کپڑے ہیں اور نہ گھر میں عید کا اہتمام کرنے کے لئے کچھ ہے۔ آپ کہیں سے بچوں کا کوئی بندوبست کریں۔ آپ کو معلوم ہے کہ خواتین اس معاملہ میں زیادہ حساس ہوتی ہیں۔ پہلے تو واقدی نے کوئی توجہ نہیں دی۔ اس پر بیگم نے رونا دھونا شروع کر کے ایک ہنگامہ مچا دیا۔ یہ بیچارے کسی سے پیسے مانگنے کے لئے گئے۔ ان کے ایک دوست تھے ان سے جا کر پیسے مانگے۔ انہوں نے دو ہزار درہم کی تھیلی لا کر دے دی۔ اب تھیلی لے کر بڑے خوش خوش گھر آئے کہ اب تو عید کا پورا خرچ اور قرضے وغیرہ ادا کریں گے۔ ان کے ایک ہاشمی دوست تھے جو سادات میں سے تھے۔ وہ آئے اور انہوں نے گھر پہنچ کر بیان کیا کہ میرے ایک ہاشمی دوست ہیں سادات میں سے ہیں وہ کچھ پیسے قرض لینا چاہتے ہیں۔ بیگم سے پوچھا کیا ارادہ ہے؟ واقدی نے کہا کہ آدھے ان کو دے دوں اور آدھے میں رکھ لوں گا۔ ایک ہزار میں ہمارا کام چل جائے گا اور ایک ہزار ان کو دے دیں گے۔ بیگم نے کہا کہ خدا کا خوف کرو۔ تمہاری ساری عمر سیرت کے مطالعہ کرنے میں گزر گئی ہے، قرآن و حدیث کا طالب علم کہتے ہو، حضورؐ کے خاندان کا ایک آدمی آیا ہے اور تم آدھی رقم خود رکھو گے؟ پوری رقم اس کو کیوں نہیں دے دیتے؟ چنانچہ وہ پوری تھیلی اس کو دے دی۔ انہوں نے پوری تھیلی ہاشمی صاحب کو دے دی۔ اب ہاشمی اس تھیلی کو دیکھ کر حیران ہوئے کہ یہ کہاں سے آئی ہے۔ دراصل وہ پیسے انہی ہاشمی بزرگ کے تھے۔ ان سے ان کے کسی اور دوست نے مانگے تھے جو واقدی کے بھی دوست تھے۔ انہوں نے ہاشمی بزرگ سے شکایت کی کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں، عید کے لئے کچھ دے دیں۔ انہوں نے وہ تھیلی واقدی کے دوست کو دے

دی۔ واقدی نے جب اپنے دوست سے پیسے مانگے تو انہوں نے وہی تھیلی اٹھا کے جوں کی توں واقدی کو دے دی۔ واقدی سے ہاشمی نے مانگی انہوں نے جوں کی توں اٹھا کے ان کو دے دی۔ یہ بنی عباس کے زمانے کا ذکر ہے۔ جب یہ واقعہ وہاں کے وزیر یحیی بن خالد برمکی کو معلوم ہوا تو وہ بڑا خوش ہوا۔ اس نے کہا کہ یہ تو بڑی زبردست بات ہے۔ اس نے دو ہزار درہم واقدی کو دیئے، دو ہزار درہم ہاشمی دوست کو دیئے اور دو ہزار درہم غیر ہاشمی دوست کو دیئے۔ اور کہا کہ یہ پیسے چونکہ واقدی کی بیوی کی وجہ سے ہاشمی کو واپس ہوئے اس لئے بیوی چار ہزار درہم کی مستحق ہے۔ دس ہزار درہم اس نے دیئے اور اس طرح یہ قصہ ختم ہوا۔

واقدی اس درجہ کے انسان تھے لیکن محدثین ان کو قابل اعتماد نہیں سمجھتے۔ ان کی کتاب 'کتاب المغازی' تین جلدوں میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے غزوات کے بارے میں بڑی مستند اور معلومات افزا کتاب ہے۔ محدثین کا طریقہ یہ تھا کہ جس نے جو روایت بیان کی انہوں نے اسی طرح باللفظ بیان کر دی۔ مجھ سے بیان کیا فلاں نے، ان سے فلاں نے، ان سے فلاں نے کہ غزوہ بدر میں مسلمانوں کی تعداد تین سو تیرہ تھی۔ پھر مجھ سے فلاں نے بیان کیا، فلاں سے فلاں نے کہ اونٹوں کی تعداد ۷۰ تھی۔ پھر مجھ سے بیان کیا فلاں نے، کہ گھوڑے دو تھے، تلواریں اتنی تھیں۔ مجھ سے بیان کیا فلاں نے، ان سے فلاں نے کہ ہمارے پاس نیزے اتنے تھے۔ اس طرح کی معلومات وہ جمع کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہی طریقہ درست ہے۔

اس کے برعکس واقدی نے یہ کیا کہ ان ساری معلومات کو جمع کیا اور عنوان رکھا غزوہ بدر کے حالات۔ پھر یہ لکھا کہ غزوہ بدر کی یہ معلومات میں نے ان ان حضرات سے جمع کی ہیں۔ ان سب کے نام دیئے ہیں اور نام دینے کے بعد اس پورے واقعہ کو ایک مربوط انداز میں بیان کیا۔ الگ الگ یہ نہیں بتایا کہ ان سب مجموعی معلومات میں سے کس سے کتنا حصہ معلوم ہوا ہے۔ محدثین کے ہاں تو یہ بڑا جرم تھا کہ یہ پتہ نہ چلے کہ کس نے کیا بات روایت کی ہے۔ اس لئے محدثین نے واقدی کے اس اسلوب سے شدید اختلاف کیا اور ان کو ساری عمر کے لئے ناقابل قبول قرار دے دیا۔ اس سے صرف یہ اندازہ کرنا مقصود ہے کہ محدثین کا معیار کتنا کڑا تھا کہ انہوں نے ایک ایسے زبردست اور جید عالم کو اور ایسے طالب علم کو جس نے پوری زندگی عرب کے ریگستانوں میں گھوم پھر کر گزاری تھی اور سیرت کی ساری معلومات جمع کی تھیں محض اس لئے ناقابل قبول قرار دے دیا

کیونکہ ان کے ہاں احتیاط کا وہ اونچا اور غیر معمولی معیار موجود نہیں جس کی پابندی محدثین کرتے تھے۔ حالانکہ واقدی کی کتاب غزوات رسول کے سب سے بڑے ماخذوں میں شمار ہوتی ہے لیکن محدثین نے کہا کہ آپ نے یہ احتیاط نہیں کی ہے اس لئے ہم آپ کی بات کو قابل قبول نہیں سمجھتے۔ بہرحال محدثین کے ہاں واقدی کا ذکر ہمیشہ منفی انداز میں آتا ہے۔

ابن سعد بھی واقدی کے شاگرد تھے۔ ابن سعد پر ویسا کوئی اعتراض نہیں تھا۔ لیکن چونکہ واقدی کے ساتھ رہے تھے اس لئے محدثین نے کہا کہ جب تک کسی دوسرے ذریعے سے تصدیق نہ ہو ابن سعد کی بات بھی زیادہ قابل اعتماد نہیں۔ میری ذاتی رائے میں تو بطور مورخ دونوں قابل اعتماد ہیں اور تاریخی واقعات کی حد تک دونوں کی بات قابل قبول ہے۔ لیکن حدیث کی روایت کے بارے میں ان دونوں حضرات کی بات محدثین نے قبول نہیں فرمائی۔

طبقات ابن سعد کے بعد جن حضرات نے کتابیں لکھیں ان میں سب سے پہلی کتاب جو آج ہمارے پاس موجود ہے وہ امام بخاری کے استاد یحییٰ بن معین کی ہے۔ یحییٰ بن معین بڑے محدث تھے۔ اپنے زمانے میں امیر المومنین فی الحدیث کہلاتے تھے۔ امام بخاریؒ کے اساتذہ میں سے تھے اور امام احمد بن حنبل کے دوستوں میں سے تھے۔ انہوں نے فن رجال پر کتاب لکھی ہے۔ ان کے بعد امام بخاری کے ایک اور استاد علی بن المدینی نے ایک کتاب لکھی۔

لیکن جس شخصیت نے علم رجال پر سب سے زیادہ کام کیا وہ خود امام بخاری تھے۔ امام بخاری کی کئی کتابیں ہیں ان میں سے کتاب التاریخ الکبیر اور کتاب التاریخ الصغیر دونوں مطبوعہ ہیں۔ یہ اس طرح سے ہسٹری کی کتابیں نہیں ہیں جس طرح آج ہسٹری کی کتابیں ہوتی ہیں۔ بلکہ یہ کتابیں اسماء الرجال پر ہیں۔ یعنی ان رجال کے حالات پر ہیں جن کا علم حدیث میں ذکر آتا ہے اور یہ کہ کب ان کی پیدائش ہوئی اور کب وفات ہوئی۔ وفات کا تذکرہ اس لئے ضروری ہے کہ یہ تعین کیا جائے کہ ان کی ملاقات اپنے شاگرد سے جو ان سے منسوب کر کے بیان کرتا ہے ہو سکتی تھی کہ نہیں ہو سکتی تھی۔ جب تک تاریخ وفات کا پتہ نہ ہو اس وقت تک یہ تعین بڑا دشوار ہے۔ پھر امام بخاری کی شرط تو اس سے بھی بہت آگے ہے کہ نہ صرف معاصرت یعنی ہم عصری ہو بلکہ یہ بھی ثابت ہو کہ ان کی ملاقات ہوئی ہے تو اس لئے امام بخاری یہ بھی تحقیق کرتے تھے کہ ان کے کن کن شاگردوں کی ان سے ملاقات ثابت ہے اور ان کی اپنے کن کن اساتذہ سے

ملاقات ثابت ہے۔ یہ معلومات امام بخاری نے جمع کی ہیں۔

امام بخاری نے ایک اور کتاب بھی لکھی ہے۔ یہ علم رجال کا ایک شعبہ ہے جس پر کم از کم ایک درجن کے قریب کتب آج دستیاب ہیں۔ وہ یہ کہ جب رجال پر معلومات کی تیاری شروع ہوا تو یہ بھی پتہ چلا کہ اب ایسے لوگ بھی سامنے آرہے ہیں جو کمزور ہیں یا اس معیار کے نہیں ہیں جس معیار کے لوگوں کی روایت قبول کی جاتی ہے۔ ان راویوں کو ضعفاء یا مجروحین کہا جاتا ہے۔ جب ضعفاء اور مجروحین کی تعداد زیادہ ہوگئی تو محدثین اور علماء رجال نے ان پر الگ کتابیں تیار کیں۔ امام بخاری نے سب سے پہلے ایک کتاب لکھی: کتاب الضعفاء الصغیر، یعنی چھوٹی کتاب جو ضعیف راویوں پر مشتمل ہے۔ اس میں انہوں نے ضعیف راویوں کی معلومات اور فہرست الگ سے دی ہے تاکہ لوگ کتاب کی مدد سے یہ تحقیق کر لیں کہ اگر ان میں سے کوئی راوی آرہا ہے تو وہ راوی ضعیف ہے اور اس کی روایت میں تامل کرنا چاہئے۔ جن لوگوں نے اس موضوع پر لکھا ہے ان میں امام مسلم بھی شامل ہیں۔ لیکن بعد کے محدثین میں جن کا کام اس میدان میں سب سے نمایاں ہے وہ امام دار قطنی ہیں۔ امام دار قطنی کی کتاب السنن مشہور ہے۔ ان کی کئی کتابیں علم رجال اور جرح وتعدیل پر ہیں۔ جرح وتعدیل پر کتابوں کا آئندہ ذکر کریں گے۔

امام دار قطنی کے ایک معاصر اور امام مسلم کے ایک جونیئر معاصر ابوبکر بزار تھے جن کی مسند بزار مشہور ہے۔ انہوں نے بھی علم رجال پر ایک کتاب لکھی اور اس کتاب میں ان معلومات کو جمع کیا۔ امام نسائی جو صحاح ستہ میں سے ایک کتاب کے مصنف ہیں۔ ان کی کتاب ہے کتاب الضعفاء والمتروکین۔ یہ کتاب بھی مطبوعہ شکل میں موجود ہے اور چھپ چکی ہے۔ اس میں ان راویوں کے حالات ہیں جو ضعیف ہیں یا جن کی روایت کو ترک کر دیا جاتا ہے اور قبول نہیں کیا جاتا۔

مزید برآں اس فن کے دو اور بڑے نام علامہ ابن ابی حاتم اور حافظ ابن عبدالبر ہیں۔ ابن عبدالبر اندلس کے رہنے والے تھے۔ ان کا تعلق چوتھی پانچویں صدی ہجری سے ہے اور یہ حافظ اہل المغرب کہلاتے ہیں۔ یعنی سپین، مراکش، اندلس، قیروان اور تیونس کے سب سے بڑے حافظ حدیث۔ ان سے بڑا محدث ان کے زمانے میں اور کوئی نہیں تھا۔ ان سے بڑے بڑے محدثین ان کے بعد پیدا ہوئے۔ لیکن ان کے اپنے زمانے میں ان سے بڑا کوئی محدث نہیں تھا۔ حافظ ابن عبدالبر نے بہت سی کتابیں لکھیں۔ ان میں مؤطا کے رجال پر ان کی کتاب بہت

کے نام سے ملتا ہے۔ انہوں نے جب حافظ مزی کی کتاب کو دیکھا تو ان کو پتہ چلا کہ اس میں تو بہت کچھ کمی ہے۔ انہوں نے اس کو مکمل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس کا تکملہ لکھا۔ یعنی اس کتاب کا ایک ضمیمہ تیار کیا۔ اصل کتاب بارہ جلدوں میں ہے جبکہ یہ تیرہ جلدوں میں تیار ہوا۔ اس طرح سے یہ کتاب 'اکمال الکمال لتھذیب الکمال فی اسماء الرجال' کے نام سے حافظ مغلطائی نے لکھی۔ اب یہ کتاب اتنی طویل اور ضخیم ہو گئی کہ اس سے استفادہ مشکل ہو گیا۔ اس پر علامہ ذہبی نے جو حافظ مغلطائی کے ہم عصر تھے، اس کی تہذیب تیار کی اور تذہیب تہذیب الکمال فی اسماء الرجال یعنی تہذیب الکمال کی تہذیب۔ انہوں نے ایک نیا نسخہ تیار کیا، وہ جو شائع ہوا اور ہر جگہ ملتا ہے۔ اس کے بعد اس کتاب کو بے شمار لوگوں نے کم و بیش ایک درجن حضرات نے اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔ اس پر مزید تحقیق کی، اس کی شرحیں لکھیں، اس کے حواشی لکھے اور اس کو مزید بہتر بنایا۔ تا آنکہ ان کے تقریباً سو سال کے بعد حافظ ابن حجر ہیں جن کا نام ہر حدیث کے حوالہ میں آتا ہے۔ وہ ایسے کم لوگ ہیں جن کا ذکر حدیث کی ہر گفتگو میں آئے اور حافظ ابن حجر ان میں سے ایک ہیں۔ انہوں نے تہذیب التہذیب کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ یہ بھی ہر جگہ ملتی ہے۔ پھر تہذیب التہذیب کا انہوں نے دو جلدوں میں خلاصہ لکھا 'تقریب التہذیب' یعنی لوگوں کے لئے تہذیب کو قریب بنانا۔

یہ علم حدیث میں علم رجال پر کام تھا جو وقتاً فوقتاً ہوا۔ اس پر مزید گفتگو بھی کرنی ہے لیکن چونکہ آج وقت ختم ہو گیا اس لئے رجال پر بقیہ گفتگو جرح و تعدیل کے سیاق و سباق میں ہوگی۔

صحابہ کرام پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ صحابہ کرام کے تذکرہ پر ہی آج کی گفتگو ختم کرتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ صحابہ کرام پر اس تحقیق کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ غیر صحابی کو کسی غلط فہمی یا کسی بدنیتی کی وجہ سے صحابی نہ سمجھ لیا جائے۔ تو پہلے صحابہ کرام پر مختلف تذکرے تیار ہوئے۔ ان میں سب سے قدیم تذکرہ جو آج بھی دستیاب ہے وہ علامہ ابن عبدالبر کا ہے جن کو حافظ اہل المغرب کہا جاتا ہے۔ علامہ ابن عبدالبر کی وفات ۴۶۳ھ میں ہوئی تھی۔ پانچویں صدی ہجری کے آدمی ہیں۔ انہوں نے کتاب لکھی تھی 'الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب' یعنی صحابہ کی پہچان کی ایک جامع کوشش۔ الاستیعاب کے معنی ہیں comprehensive survey اس کتاب میں انہوں نے کم و بیش ساڑھے سات ہزار صحابہ کا تذکرہ کیا ہے۔

اس کے بعد علامہ ابن حجر عسقلانی نے ایک کتاب لکھی 'الاصابہ فی تمییز الصحابہ' جس میں تقریباً بارہ ہزار صحابہ کا تذکرہ ہے۔ ان سے پہلے ایک کتاب علامہ ابن اثیر جزری نے لکھی تھی 'اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ'۔ صحابہ کے تذکرے پر یہ تین بڑی بڑی کتابیں ہیں جو آج ہر جگہ دستیاب ہیں۔ خود صحابہ کے بارے میں براہ راست معلومات کا مستند ترین، جامع ترین اور بہترین ذخیرہ تین کتابیں ہیں۔ چوتھی کتاب طبقات ابن سعد جس کا میں نے ذکر کیا۔ ان چار کتابوں سے صحابہ کرام کی زندگی کا پورا نقشہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ اب کسی کے لئے یہ ممکن نہیں رہا کہ کسی غیر صحابی کو صحابی کہہ کر کوئی غلط بات اس کے حوالہ سے حضورؐ کی ذات گرامی سے منسوب کردے۔ وہ کتابیں ان کے علاوہ ہیں جو مختلف شہروں یا مختلف علاقوں کے لحاظ سے لکھی گئیں، دمشق کے صحابہ کرام، فارس، مصر کے صحابہ کرام وغیرہ۔

ایک آخری کتاب کا ذکر کرکے بات ختم کرتا ہوں۔ ایک بزرگ تھے علامہ ابن عساکر جو بڑے محدث تھے۔ ابن عساکر کی کتاب تاریخ دمشق فن تاریخ کی چند عجائب روزگار کتابوں میں سے ایک ہے۔ میں مبالغہ نہیں کررہا بلکہ کوئی کتب خانہ ہو تو میں آپ کو دکھا بھی سکتا ہوں۔ انہوں نے پوری زندگی اس کام میں لگائی کہ دمشق شہر میں کون کون سے محدثین آئے۔ دمشق میں کس کس حدیث کی روایت ہوئی۔ یہاں کون کون سے صحابہ کرام آئے، یہاں حدیث پر کتنا کام ہوا۔ علم حدیث سے متعلق دمشق میں کتنا کام ہوا۔ علم حدیث کی زبان پر کیا کام ہوا، لغات پر کیا کام ہوا۔ انہوں نے یہ لکھی تھی تاریخ دمشق کے نام سے۔ دمشق میں ایک بڑی فاضل اور معمر خاتون ہیں میری ان سے ملاقات ہوئی ہے۔ وہاں ایک مجمع اللغۃ العربیۃ ہے جو ۱۹۲۱ء سے قائم ہے۔ عرب دنیا کا قدیم ترین علمی ادارہ ہے۔ میں بھی الحمدللہ اس کا رکن ہوں۔ عربی زبان کے مشہور ماہر مولانا عبدالعزیز میمن بھی اس کے رکن تھے۔ میرے استاد مولانا محمد یوسف بنوری جو بڑے مشہور محدث تھے وہ بھی اس کے رکن تھے۔ وہاں وہ کتاب شائع ہورہی ہے۔ اس کی اسی (80) جلدیں اب تک چھپ چکی ہیں اور ہر جلد خاصی ضخیم ہے۔ ابھی وہ کتاب مکمل نہیں ہوئی ہے۔ ان خاتون کا کہنا تھا کہ اگر یہی رفتار رہی تو شاید ۱۲۰ جلدوں میں یہ کتاب مرتب ہوجائے گی۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ محدثین نے کتنی معلومات جمع کی ہیں۔ یہ ایک کتاب صرف دمشق شہر کے بارے میں ہے۔

خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد لکھی تھی جو متعدد جلدوں میں کئی بار چھپی ہے اور اب ایک اور جدید تحقیق کے ساتھ چھپ رہی ہے۔ اس کی بھی درجنوں جلدیں ہوں گی۔ وہ اس میں بھی معلومات بغداد کے بارے میں ہیں۔ بغداد میں جتنے تابعین گزرے ہیں۔ صحابہ تو وہاں کم ہی گئے صحابہ کے بعد بغداد بنا، لیکن تابعین، اور زیادہ تر تبع تابعین تھے، تبع تابعین کے دور سے یہاں علم حدیث کا تذکرہ شروع ہوا۔ تابعین کے دور سے معمولی، جو تابعین یا تبع تابعین وہاں گئے۔ ان سے لے کر پانچویں صدی ہجری میں خطیب بغدادی کے زمانہ تک بغداد میں آنے والے ہر محدث ہر خادم حدیث اور ہر عالم کا تذکرہ اس میں موجود ہے۔

سوالات کل کریں گے اس لئے کہ آج جمعہ کا دن ہے اور وقت تنگ ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

چوتھا خطبہ

جرح و تعدیل

ہفتہ، 11 اکتوبر 2003

جرح وتعدیل

جرح وتعدیل کی قرآنی اساس

اس سے پہلے علم اسناد اور اس سے متعلق چند ضروری مسائل پر گفتگو ہوئی تھی اور اس میں یہ عرض کیا گیا تھا کہ خود قرآن مجید اور سنت رسول کی رو سے یہ بات ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے جو چیز منسوب کی جائے وہ ہر لحاظ سے قطعی اور یقینی ہو۔ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ ہو اور ہر مسلمان جو تاقیام قیامت دنیا میں آئے اس کو پورے اطمینان اور شرح صدر کے ساتھ یہ بات معلوم ہو جائے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کے لئے کیا بات ارشاد فرمائی ہے۔ کیا چیز جائز قرار دی ہے، کیا ناجائز ٹھہرائی ہے، کن چیزوں پر ایمان لانا اس کے لئے ناگزیر قرار دیا گیا ہے اور کن چیزوں کے بارے میں اس کو آزادی دی گئی ہے۔ اس اصول کی بنیاد قرآن مجید کی وہ آیات ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب بھی کوئی اطلاع یا خبر تم تک پہنچے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو۔ ان جاء کم فاسق بنبا فتبینوا 'جب کوئی فاسق شخص تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کر لو' اس لئے کہ اگر بغیر تحقیق کے اس خبر کو قبول کر لو گے تو ہو سکتا ہے کہ کسی ایسی قوم کے خلاف تم کوئی کارروائی کر گزرو جس کے خلاف کارروائی کرنے میں تم حق بجانب نہ ہو۔

اگرچہ اس آیت مبارکہ کا براہ راست تعلق روایت حدیث سے نہیں ہے، لیکن اس سے یہ اصول ضرور نکلتا ہے کہ ہر خبر کی تحقیق ضرور کر لینی چاہئے۔ جب دنیاوی معاملات میں تحقیق کی یہ اہمیت ہے تو وہ خبر جو رسول اللہ ﷺ کے قول، فعل یا تقریر کے بارے میں دی گئی ہو اس کی اہمیت

چونکہ بہت زیادہ ہے اس لئے اس کی تحقیق کرنا اور پہلے سے اس بات کو یقینی بنانا کہ یہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے، انتہائی ضروری ہو جاتا ہے۔

ایک اور جگہ قرآن مجید کی سورۃ ممتحنہ میں آیا ہے۔ ممتحنہ کا نام ہی اس لئے رکھا گیا ہے کہ اس میں امتحان لینے یا آزمانے کا ذکر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: یا ایھا الذین آمنوا اذا جاءکم المؤمنات مھاجرات فامتحنوھن۔ جب تمہارے پاس مومن عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو ان کو آزما کر دیکھو۔ یہ آیت صلح حدیبیہ کے بعد نازل ہوئی تھی جب بڑی تعداد میں مکہ مکرمہ سے خواتین نے ہجرت کر کے مدینہ منورہ آنا شروع کیا اور ہر آنے والی خاتون نے یہ کہا کہ چونکہ میں نے اسلام قبول کر لیا ہے لہٰذا اس کو مدینہ منورہ میں شہریت دے دی جائے اور یہاں رہنے کی اجازت عطا فرما دی جائے۔ اس وقت یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا ہر آنے والی خاتون کے اس دعویٰ کو قبول کر لیا جائے یا اس کی تحقیق اور تصدیق کی جائے۔ ایک اعتبار سے یہ معاملہ بڑا اہم تھا اس لئے کہ آنے والی خاتون یہ بیان کر رہی تھی کہ اس نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اور حالت اسلام میں جب رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی تو وہ صحابیہ ہو گئی۔ گویا ایک صحابیہ کی طرف سے یہ کہا جا رہا ہے کہ اس نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اس کے باوجود فامتحنوھن کا حکم دیا جا رہا ہے کہ ان کا امتحان لو اور آزمائش کر کے دیکھو کہ کیا انہوں نے واقعی اسلام قبول کیا ہے یا نہیں۔ اس سے بجا طور پر یہ سبق نکلتا ہے کہ اگر کسی شخص کا یہ دعویٰ ہو کہ وہ صحابی ہے تو اس دعویٰ کی تحقیق کرنی چاہئے اگر کسی شک وشبہ کا امکان ہو۔

کل میں نے آپ میں سے کسی کے سوال کے جواب میں بابا رتن ہندی کی مثال دی تھی جس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ اس کی عمر چھ سو سال ہے اور اس نے رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی تھی۔ اہل علم نے اس کی تحقیق کی اور ثابت کیا کہ دعویٰ جھوٹا ہے۔ اور بابا رتن کے بارے میں تمام اوہام وخرافات اور روایات کی تردید کر دی۔ قرآن مجید کی ان دونوں آیات سے اسناد اور روایت کی تحقیق کا اصول ملتا ہے۔

مزید برآں جیسا کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا، جس کا کئی بار حوالہ دیا جا چکا ہے، کفیٰ بالمرء کذبا ان یحدث بکل ما سمع۔ کسی شخص کے جھوٹا ہونے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ جو بات سنے اس کو آگے بیان کر دے۔ اس میں بھی اس بات کی تلقین ملتی ہے کہ جب کوئی بات

سنو تو پہلے اس کی تحقیق کر لو اور اگر یہ ثابت ہو جائے تو پھر آگے بیان کرو، اور دوسری بات یہ کہ بغیر تحقیق کے آگے بیان نہ کرو۔ جب عام باتوں کے بارے میں یہ حکم ہے تو پھر روایت حدیث تو دینی اہمیت رکھنے والا معاملہ ہے۔ اس میں تحقیق کرنے کا حکم کیوں نہیں دیا جائے گا۔ لازماً دیا جائے گا اور یقینی طور پر تحقیق کرنا لازمی ہوگا۔

صحابہ کرام اور جرح کی روایت

جب تک معاملہ صحابہ کرام کے ہاتھ میں رہا تو اس کی تحقیق کی زیادہ ضرورت نہیں تھی کہ ایک صحابی جو روایت بیان کرتے ہیں اس کو صحیح طور پر سمجھا جاتا تھا۔ لیکن بعض اوقات صحابہ کرام تحقیق وتصدیق کے اس عمل کو ضرورتاً بھی کر لیا کرتے تھے۔ نظر انداز وہاں کر دیا کرتے تھے جہاں سو فیصد یقین ہوتا تھا کہ صحابی رسول جو بات بیان کر رہے ہیں وہ اپنے ذاتی یقین اور مشاہدہ کی بنیاد پر بیان کر رہے ہیں۔ اس میں کسی بھول چوک کا امکان نہیں۔ نعوذ باللہ صحابہ کرام کے بارے میں غلط بیانی کا امکان تو تھا نہیں۔ لیکن بھول چوک یا کسی ایک چیز کو کسی دوسرے سیاق وسباق میں سمجھ لینے کا امکان بہرحال تقاضائے بشری موجود تھا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کے بارے میں تمام اہل علم نے تصدیق کی ہے کہ وہ سب سے بڑی شخصیت ہیں جنہوں نے سندوں اور راویوں کے بارے میں تحقیق کرنے کی روش اختیار کی۔ ظاہر ہے جناب صدیق اکبر کا زمانہ تو ابتدائی زمانہ تھا۔ حضور رسول ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے کوئی دو سوا دو سال بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس لئے جو لوگ ان سے احادیث بیان کرتے تھے وہ تقریباً سب کے سب صحابہ ہی تھے۔ لیکن اس کے باوجود جناب صدیق اکبرؓ نے ان سے بھی تصدیق وتحقیق کی روش اپنائی اور یہ چاہا کہ اس بات کو لوگوں کے ذہن نشین کریں کہ کوئی چیز رسول ﷺ کی ذات سے غلط منسوب نہ ہو۔ سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زندگی میں ایسے کئی واقعات ملتے ہیں کہ ان کے سامنے کسی صحابیؓ نے کوئی حدیث بیان کی لیکن جناب صدیق نے اس حدیث کو فوراً قبول نہیں کیا۔ صحابیؓ سے کہا کہ اس کے لئے مزید شہادت پیش کریں اور اس مزید شہادت وثبوت کے بعد اس حدیث کو قبول کیا۔

کسی سے ملنے کے لئے جائے تو دوسرا آدمی ہر وقت اس سے ملنے کے لئے تیار ہو۔ اس کی مصروفیات بھی ہو سکتی ہیں، اس کے آرام کا وقت بھی ہو سکتا ہے، وہ کسی ایسے کام میں مصروف ہو سکتا ہے جو زیادہ اہم ہو۔ اس پر حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے کہا جو بات آپ نے حضور علیہ السلام کے حوالے سے بیان کی ہے اس پر کوئی گواہ ہے؟ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ بڑے مجتہد صحابہ میں شمار ہوتے تھے۔ مکہ مکرمہ کے بالکل ابتدائی دور میں مسلمان ہوئے تھے۔ انہوں نے اس کو محسوس کیا کہ انہوں نے ایک حدیث بیان کی اور حضرت عمر فاروقؓ اس کو قبول کرنے میں تامل کر رہے ہیں۔ لیکن ان کے حکم پر انہوں نے ایک دوسرے صحابی، جو اتفاق سے اس وقت موجود تھے، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ چلیں حضرت عمرؓ کے دربار میں گواہی دیں کہ اس ارشاد کے موقع پر آپ بھی موجود تھے۔ چنانچہ حضرت ابوسعید خدریؓ نے گواہی دی اور فرمایا کہ جب رسول اللہ ﷺ نے یہ بات ارشاد فرمائی تھی تو میں بھی موجود تھا اور میں اس کا گواہ ہوں۔

اب حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے شکایت کی تو کہا کہ انی لامین علی حدیث رسول اللہ ﷺ۔ خدا کی قسم میں رسول اللہ ﷺ کی احادیث کے معاملے میں بڑا امانت دار ہوں اور میں پوری ذمہ داری سے یہ بات بیان کرتا ہوں، اس کے باوجود آپ نے گویا میری بات قبول نہیں کی اور ایک گواہ طلب کر لیا۔ اس پر حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا کہ اجل۔ یقیناً ایسا ہی ہے۔ میں آپ کو بہت دیانت دار سمجھتا ہوں، ولکنی احببت ان اتثبت۔ لیکن میں یہ چاہتا تھا کہ میں مزید تحقیق اور مزید تصدیق کر لوں۔

ایسے ہی ایک موقع پر جب حضرت عمر فاروقؓ نے دوسری گواہی طلب کی تو آپ نے فرمایا کہ اما انی لم اتھمک۔ دیکھئے میں نے آپ پر کوئی الزام نہیں لگایا، میں آپ پر تہمت نہیں لگا رہا کہ خدانخواستہ آپ غلط بیانی کر رہے ہیں، ولکنی خشیت ان یتقول الناس علی رسول اللہ ﷺ۔ لیکن مجھے یہ ڈر ہوا کہ آپ لوگوں کو بار بار احادیث بیان کرتے دیکھ کر اور آسانی سے قبول کرتے دیکھ کر لوگوں میں یہ جرأت پیدا ہو جائے کہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں جو چاہیں ہر وقت بیان کر دیں۔ لوگوں کو اس طرح کی تربیت دینے کے لئے کہ جو بات بیان کریں بہت اہتمام اور تحقیق کے ساتھ بیان کریں، میں نے آپ سے گواہی کا مطالبہ کیا۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں روایت آتا ہے کہ ان کے سامنے

اسناد کا عمل نہ ہوتا 'لقال من شاء ما شاء' یہ جملہ حضرت عبداللہ بن مبارک کا ہے جو امیر المومنین فی الحدیث کہلاتے ہیں کہ سند دین کا حصہ ہے، اگر اسناد کا عمل نہ ہوتا تو دین کے بارے میں جس کا جو جی چاہتا وہ کہہ دیا کرتا اور کوئی پوچھنے والا نہ ہوتا۔ اس لئے اس بات کو یقینی بنانے کے لئے کہ رسول اللہ ﷺ سے کوئی غلط بات منسوب نہ ہو جائے اسناد کے عمل کو لازمی قرار دیا گیا۔ اور یہ بات مسلمانوں کے علمی مزاج کا حصہ بن گئی کہ جو علمی بات کسی کے سامنے کی جائے وہ پوری سند کے ساتھ کی جائے۔ یہ روایت مسلمانوں کے علاوہ کسی قوم میں موجود نہیں۔ بلا استثنا اور بلا خوف تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ سند کا یہ تصور صرف اور صرف مسلمانوں کی روایت میں پایا جاتا ہے کسی اور قوم کی مذہبی یا غیر مذہبی روایت میں سند کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔

اسناد کی پابندی کی اسلامی روایت

مسلمانوں کے ہاں نہ صرف علم حدیث میں، بلکہ تمام علوم و فنون میں اسناد کی پابندی لازمی تھی۔ آپ تفسیر کی پرانی کتابیں اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ آج ہی جا کر تفسیر طبری دیکھیں۔ اس میں ہر بات اور تفسیر سے متعلق ہر جملہ پوری سند کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ ابن جریر طبری نے یہ جملہ یا قول کس سے سنا، انہوں نے کس سے سنا، انہوں نے کس سے سنا؟ یہاں تک کہ یہ بات یا صحابہ کرام تک یا رسول اللہ ﷺ تک یا جہاں تک وہ بیان کرنے والا بیان کرنا چاہتا ہے وہاں تک پہنچتی ہے۔ طبری کی تفسیر میں بغیر حوالہ اور بغیر سند کے ایک جملہ بھی نقل نہیں کیا گیا، الا یہ کہ وہ بات ابن جریر طبری کی اپنی رائے ہو۔ ایک سے زائد احادیث پر جہاں وہ تبصرہ کرتے ہیں وہاں لکھتے ہیں: قال ابن جریر، 'اور ابن جریر کا کہنا یہ ہے' یا 'قلت' 'میں نے کہا' یا 'اقول' 'میں یہ کہتا ہوں'۔ گویا جہاں ان کی اپنی رائے ہے وہاں اپنا حوالہ ہے اور جہاں ان کی اپنی رائے نہیں ہے وہ مکمل حوالہ اور سند کے ساتھ روایات کرتے ہیں۔

سیرت کی پرانی کتابیں اٹھا کر دیکھیں۔ سیرت کی ساری پرانی کتابیں، ابن اسحاق کی سیرت ہو، جو اب چھپ گئی ہے، یا عروہ بن زبیر کی کتاب المغازی ہو، حتیٰ کہ واقدی ہوں جو اتنے مستند نہیں سمجھے جاتے، یا ابن سعد ہوں، ان میں سے ہر کتاب میں ہر واقعہ کی پوری سند موجود ہے۔ ایک ایک جملہ کی مکمل سند بیان کی گئی ہے۔ حتیٰ کہ ادب، شعر، فصاحت، بلاغت،

صرف، نحو اور لغت ان سب کی سندیں موجود ہیں۔

حتیٰ کہ یہ بات کہ امرؤ القیس نے کوئی شعر کس طرح کہا تھا اور کیا کہا تھا اس کی بھی پوری سند بیان ہوئی ہے۔ ایک شاعر اور ادیب تھے مفضل ضبی۔ انہوں نے عربی شاعری کے بہت سے قصائد جمع کئے اور وہ زندگی کے سالہا سال اس میں لگانے کہ عرب قبائل میں پھر پھر کے لوگوں سے پرانے اشعار سنے، اور جمع کئے اور پھر پوری سند کے ساتھ بیان کئے کہ انہوں نے کس سے سنا، جس سے سنا اس نے کس سے سنا؟ حالانکہ شعر وادب میں اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ اگر آپ سے کوئی کہے کہ موجودہ دیوان غالب کی سند کیا ہے تو پوچھنے والا بھی اس سوال کو مضحکہ خیز سمجھے گا اور جس سے یہ پوچھا جائے گا وہ بھی اس کو فضول بات سمجھے گا۔ حالانکہ مرزا غالب اتنے پرانے نہیں ہیں۔ ڈیڑھ سو سال پہلے کے ہیں۔ لیکن ان کے دیوان کی کوئی سند ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔ ہمیں کوئی پتہ نہیں کہ مرزا غالب کے نام سے جو دیوان مشہور ہے یہ واقعی پورے کا پورا انہی کا دیوان ہے کہ نہیں۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

واقعی انہوں نے یہی کہا تھا یا کسی اور نے کہا تھا۔ اس کا بہرحال عقلی طور پر بڑا امکان موجود ہے کہ کسی نے غلط چھاپ دیا ہو اور یہ شعر مرزا صاحب سے غلط طور پر منسوب کر دیا ہو۔ اب کوئی ایک ایسا آدمی موجود نہیں ہے جو حتمی طور پر یہ گواہی دے کہ مرزا غالب نے میرے سامنے یہ غزل کہی تھی اور پھر انہوں نے آگے بیان کی ہو، پھر کسی اور نے بیان کی ہو۔ یہ چیز مسلمانوں کے علاوہ کسی اور قوم کے پاس موجود نہیں ہے۔

یہ صرف علم حدیث کی دین ہے کہ علم حدیث نے مسلمانوں میں ایک ایسا ذوق پیدا کر دیا کہ انہوں نے نہ صرف دینی علوم بلکہ شعر و ادب، بلاغت اور صرف و نحو کی ایک ایک چیز کی، ایک ایک قاعدہ کلیہ کی، ایک ایک شعر کی، ایک ایک ضرب المثل کی سند کے ساتھ حفاظت کی اور وہ سندیں آج ہمارے پاس موجود ہیں۔ پڑھنے والوں کو بعض اوقات الجھن بھی ہوتی ہے کہ ادب کی کتاب میں تو روانی تب آتی ہے جب مسلسل عبارت ہو۔ ادب کی کتب میں درمیان میں سندیں آ رہی ہوں تو پڑھنے والوں کو الجھن ہوتی ہے۔ لیکن اس مواد کی علمی حیثیت اور اس کے

اسناد اور authenticity کو محفوظ رکھنے کے لئے جو التزام وہاں بھی کیا گیا۔

جیسا کہ آپ میں سے ہر ایک کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ وقت گزرنے کے ساتھ سند لمبی بھی ہوتی گئی۔ رسول اللہ ﷺ سے زمانہ جتنا دور ہوگا سند اتنی ہی لمبی ہوتی۔ سب سے مختصر سند یا موطا امام مالکؒ میں ہیں جو اکثر و بیشتر دو ناموں پر مشتمل ہیں۔ امام مالکؒ اور ان کے استاد اور ایک صحابی۔ مثلاً مالک عن نافع عن ابن عمرؓ۔ حضرت نافع اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ دو آدمی ہیں۔ کہیں کہیں موطا امام مالکؒ میں تین راوی بھی آتے ہیں لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ اسی طرح سے جیسے جیسے زمانہ بڑھتا گیا راویوں کی تعداد بھی بڑھتی گئی۔ سب سے لمبی سند امام بیہقی کی ہے جو آخری محدث ہیں۔ ۴۵۸ھ میں ان کی وفات ہوئی ہے۔ اس لئے ان کی سند لمبی ہوتی ہے۔ کبھی سات نام ہوتے ہیں، کبھی آٹھ ہوتے ہیں اور کبھی کبھی نو ہوتے ہیں۔

راویوں کے طبقات

جب یہ سلسلہ آگے بڑھا تو جو علماء رجال تھے اور جنہوں نے راویوں کے حالات پر کتابیں لکھیں تھیں، انہوں نے راویوں کے طبقات مقرر کئے اور بتایا کہ راویوں کے طبقات کونسے ہیں۔ تاکہ ہر طبقے کے حالات الگ الگ بیان کئے جاسکیں اور یہ پتہ چل سکے کہ کونسا طبقہ کس طبقہ کے اساتذہ میں شمار ہوتا ہے۔ اب مثلاً اگر کسی غیر محدث سے، جو حدیث کا طالب علم نہ ہو، یہ کہا جائے کہ امام بیہقیؒ نے امام مالکؒ سے روایت کی ہے اور وہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ یہ بھی فرضی بات کر رہا ہوں، مثلاً اگر کوئی ایسی سند سے کوئی بات بیان کرے تو غیر محدث یا ایسا آدمی جو حدیث کا طالب علم نہ ہو اس کو پتہ نہیں چلے گا کہ امام بیہقیؒ اور امام مالکؒ کے درمیان جو طویل زمانہ گزرا ہے، ان دونوں کے درمیان کم و بیش پانچ چھ واسطے ہوں گے۔ امام بیہقیؒ امام مالکؒ سے براہ راست روایت کر ہی نہیں سکتے۔ امام مالکؒ تو تبع تابعین میں شامل ہیں اس لئے وہ براہ راست رسول اللہ ﷺ سے روایت ہی نہیں کر سکتے۔ صحابہ سے بھی روایت نہیں کر سکتے۔

اب جو شخص علم حدیث جانتا ہے وہ سمجھ لے گا کہ یہ روایت گڑبڑ ہے۔ جو علم حدیث کو نہیں جانتا اس کو پتہ ہی نہیں چلے گا کہ یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس کو نہ امام بیہقیؒ کے سن وفات کا پتہ ہے، نہ امام مالکؒ کے سن وفات کا پتہ ہے، نہ صحابہ کرامؓ کے دور کا پتہ ہے۔ اس لئے

سہولت کی خاطر طبقات مقرر کر دیے گئے کہ صحابہ کرامؓ کا ایک طبقہ ہے جس سے اس بات کا واضح
طور پر اندازہ ہو جائے گا کہ صحابہ کرامؓ کس دور سے کس دور تک رہے۔ آخری صحابی بھی حضرت
محمود بن لبید تو میرے علم نا سے تھے، ان کی وفات ۱۰۱ھ میں ہوئی ہے۔ وہ آخری صحابی ہیں۔ وہ
حضور ﷺ کے انتقال سے چند ماہ پہلے خدمت اقدس میں لائے گئے۔ ان کی عمر چار پانچ سال تھی۔
وہ صرف ایک واقعہ بیان کرتے ہیں اس کے علاوہ کوئی روایت ان سے نہیں ہے۔ وہ بیان کرتے
ہیں کہ میں بچہ تھا، میرے والد یا دادا مجھے حضورؐ کی خدمت میں لائے۔ رسول اللہ ﷺ نے مجھے گود
میں بٹھایا اور پانی لے کر تھوڑا پیا اور پھر مجھے پلایا اور پھر تھوڑی سی کلی کر کے پھر مجھے کھلائی اور میرے سر
پر ہاتھ پھیر کر مجھے دعا دی۔ بس اس کے علاوہ اور کوئی روایت ان سے منقول نہیں ہے۔ یہ آخری
صحابی ہیں جن کے بعد صحابہ کرامؓ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ پھر کوئی ایسا آدمی روئے زمین
پر باقی نہیں رہا جس نے رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی ہو۔

اب یہ بات کہ صحابہ کرامؓ کا دور کب تک ہے اور بڑے صحابہ کا زمانہ کب تک ہے، درمیانی عمر کے صحابہ کا زمانہ کب تک ہے، صغار صحابہ کا زمانہ کب تک ہے۔ یہ تمام باتیں جاننا ضروری ہے۔ صغار صحابہ سے مراد وہ صحابہ ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد بچے تھے اور ان کا شمار بچوں میں ہوتا تھا۔ پھر یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ جب انہوں نے پہلی بار حضورؐ کی زیارت کی تو وہ کس عمر میں تھے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو آخری بار کس عمر میں دیکھا۔ یہ جاننا اس لیے ضروری ہے کہ اگر کوئی شخص مثال کے طور پر محمود بن لبیدؓ سے کوئی حدیث بیان کرے، اور یہ دعویٰ کرے کہ ان کا نام صحابہ میں شامل ہے اور الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب میں لکھا ہوا ہے کہ یہ صحابی تھے۔ اب اس بنیاد پر ان سے کوئی لمبی چوڑی حدیث روایت کرے تو جو آدمی طبقات صحابہ کے علم کو نہیں جانتا وہ دھوکے میں پڑ سکتا ہے کہ واقعی محمود بن لبید صحابی تھے اور ان سے یہ بات منسوب ہے۔ لیکن جو جانتا ہے وہ کہے گا کہ جتنی بھی روایات ان سے منسوب ہیں وہ غلط منسوب ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو پانچ چھ سال کی عمر میں دیکھا تھا یا شاید اس سے بھی کم عمر میں۔ اور اس واقعہ کے علاوہ کوئی روایت ان سے مروی نہیں ہے۔ اس بات کو جاننے کے لئے صحابہ کے طبقات کو جاننا ضروری ہے۔ اس لئے پہلا طبقہ صحابہ کرامؓ کا ہے جس پر الگ بہت سی چھوٹی بڑی سی کتابیں موجود ہیں۔

ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ کا شمار بھی، با اختلاف روایات، صغار تابعین کی اس دوسری کیٹگری میں ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کی تحقیق کے مطابق امام ابوحنیفہ کا شمار صغار تابعین کی اس کیٹگری میں ہے۔ جنہوں نے کچھ صحابہ سے روایت بھی کی ہے۔ انہوں نے بعض اصحاب رسول کو دیکھا ضرور ہے۔ وہ اپنے لڑکپن میں اپنے والد کے ساتھ حج کے لئے گئے۔ خود بیان کرتے ہیں کہ میری عمر بارہ تیرہ سال تھی۔ مکہ مکرمہ میں ایک جگہ دیکھا کہ بڑا ہجوم لگا ہوا ہے اور لوگ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش میں ہیں۔ میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ انہوں نے کہا کہ صحابی جلیل حضرت انس بن مالک حج کے لئے تشریف لائے ہیں، لوگ ان کو دیکھنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ میں اپنے والد سے انگلی چھڑا کر ہجوم میں گھسا اور دیکھا کہ حضرت انس کھڑے تھے اور لوگ ان سے سوالات کر رہے تھے۔ بعض روایت میں آتا ہے کہ انہوں نے بھی کوئی سوال پوچھا، بعض روایات میں آتا ہے کہ انہوں نے کچھ نہیں پوچھا، بعض روایات میں آتا ہے کہ انہوں نے کوئی بات سنی اور آگے نقل کی، بعض روایات میں آتا ہے کہ سنی تو تھی لیکن یاد نہیں رہی۔ لیکن دیکھنا ثابت ہے۔ بہرحال یہ وہ صغار تابعین ہیں جو تابعین کے سب سے چھوٹے طبقہ میں آتے ہیں۔

اس کے بعد اتباع تابعین میں یعنی تبع تابعین میں سب سے بڑا طبقہ ہے ان اتباع تابعین کا جنہوں نے بڑے تابعین کو دیکھا۔ پھر اسی طرح سے تبع تابعین کا طبقہ وسطی یعنی درمیانی طبقہ۔ پھر تبع تابعین کا سب سے چھوٹا طبقہ جنہوں نے چھوٹے تابعین کو دیکھا مثلاً امام شافعی۔ اس کے بعد وہ طبقہ جس نے تبع تابعین کو دیکھا اور ان سے روایت لی۔ پھر وہ طبقہ جس نے متوسطین تبع تابعین کو دیکھا اور آخر میں جس نے آخری عمر میں، جب تبع تابعین تھوڑے رہ گئے، ان کو دیکھا۔ یہ رواۃ کے بارہ طبقات ہیں۔

طبقات رواۃ کی افادیت

بظاہر کسی حدیث کے سلسلہ میں ان طبقات کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ لیکن اس سے اس بات میں مدد ملی جاتی ہے کہ کسی راوی کے طبقہ کا تعین کیا جا سکے کہ اس کا تعلق کس طبقہ سے ہے۔ جب طبقہ کا تعین ہو جائے گا تو زمانے کا تعین آسان ہو جائے گا۔ جب زمانہ کا تعین آسان

ہوگا تو پھر یہ بات طے کرنا آسان ہو جائے گا کہ ان میں یا ان راوی نے کس طبقے کے راوی سے روایت کی ہے وہ روایت ممکن بھی ہے یا نہیں ہے۔ مثال کے طور پر تبع تابعین کے چھوٹے طبقہ کا کوئی راوی تابعین کے بڑے طبقے سے روایت کرے تو یہ ممکن نہیں ہے۔ اس لئے فوری طور پر یہ اندازہ ہو جائے گا کہ اس روایت میں کہیں کوئی جھول ہے۔ مثال کے طور پر امام بخاری امام زہری سے روایت کریں تو یہ روایت درست نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ امام بخاری نے امام زہری کا زمانہ نہیں پایا۔ امام زہری کی وفات غالباً ۱۲۴ھ میں ہوئی جبکہ امام بخاری کی ولادت ۱۹۴ھ میں ہوئی ہے۔ اب ۱۹۴ھ کی ولادت اور ۱۲۴ھ کی وفات میں تو ستر اسی سال کا فرق ہے۔ اس لئے ان چیزوں سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ روایت میں کوئی جھول ہے اور فوراً اس کا تعین ہو جاتا ہے۔

یہ طبقے تو تھے راویوں کے، جس سے گویا زمانی اعتبار سے تعین کیا جا سکتا ہے کہ کس خاص طبقے کے راوی نے کس زمانے میں وقت گزارا ہوگا اور کس زمانے میں وہ زندہ ہوں گے۔ اس کے بعد بارہ طبقات یعنی درجات راویوں کے آتے ہیں۔ ان میں ایک تو طبقات یعنی Classes ہیں، یا جیسا میں نے اردو میں کہا تھا، ایک چیز تھی، پھر دوسری چیز تھی زمانے کے اعتبار سے۔ ایک درجہ ہے درجہ ثقہ یا غیر ثقہ ہونے کے اعتبار سے۔ کچھ راوی ہیں جو بڑے اونچے درجے کے ہیں جن کا نام سنتے ہی ہر شخص گردن جھکا دے گا کہ یہ انتہائی اونچے درجے کے راوی ہیں۔ عبداللہ بن مبارک کا میں کئی بار نام لے چکا ہوں، ان کا جب نام آئے گا تو کسی تحقیق کی ضرورت نہیں کہ کس درجے کے راوی ہیں۔ امام بخاری، امام ترمذی، امام احمد بن حنبل کا نام آئے گا تو ہر شخص بلا تامل ان کی روایت کو قبول کرے گا۔ لیکن اس درجے کے راویوں کا تعین کیسے ہوگا؟ اس کام کے لئے علم جرح و تعدیل کے قواعد مقرر کئے گئے۔

اس ضمن میں سب سے پہلا اصول تو یہ ہے کہ صحابہ کرام سب کے سب عدول ہیں۔ الصحابۃ کلہم عدول، وہ سب ایک درجہ کے ہیں۔ یہ تحقیق تو ہو سکتی ہے کہ فلاں صاحب صحابی ہیں کہ نہیں ہیں۔ لیکن یہ تحقیق ہونے کے بعد کہ وہ صحابی تھے، پھر مزید تحقیق نہیں ہوگی کہ وہ عادل تھے کہ نہیں، اس لئے کہ صحابہ کے بارے میں یہ بات متفق علیہ ہے کہ وہ سب کے سب عادل تھے۔ صحابہ کرام میں بھی یقیناً درجات ہیں اور اس سے کوئی مسلمان انکار نہیں کرتا۔ مثلاً جو درجہ حضرت ابوبکر صدیق کا ہے وہ اور صحابہ کا نہیں ہے، جو درجہ حضرت عمر فاروق کا تھا وہ بقیہ صحابہ

کا نہیں ہے۔ جو درجہ عشرہ مبشرہ کا تھا وہ دوسرے صحابہ کا نہیں ہے۔ لیکن علم حدیث کی روایت کی حد تک سب کا درجہ برابر مانا جاتا ہے۔

صحابہ کرامؓ کے بعد بقیہ راویوں کا جو سب سے اونچا درجہ ہے، وہ ان لوگوں کا درجہ ہے جن کے لئے اصطلاح استعمال کی جاتی ہے یا تو اثبت یا اوثق یا ثقۃ علیٰ جلالۃ قدرہ وشانہ۔ رجال کی اکثر کتابوں میں آتا ہے۔ مثلاً یحییٰ بن معین اور ان کے درجہ کے لوگوں کے بارہ میں ملے گا ثقۃ علیٰ جلالۃ قدرہ وشانہ۔ کہ تمام محدثین ان کے مرتبہ کی بلندی پر اور ان کی اعلیٰ شان پر متفق ہیں۔ گویا یہ سب سے اونچے درجہ کے راوی ہیں۔ اگر میں الفاظ کی مثالیں دینے پر آؤں گا تو بات بہت لمبی ہو جائے گی اس لئے میں تفصیل یہ چھوڑ دیتا ہوں۔ ہر درجہ کے لئے الگ الفاظ ہیں جو راوی کا درجہ بیان کرنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں اور جن سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ راوی کا کیا درجہ ہے۔ میں صرف دو تین درجات کے نمونے دے کر باقی میں چھوڑ دیتا ہوں۔

اس کے بعد تیسرا درجہ ان راویوں کا ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ثقہ متقن۔ یعنی یہ ثقہ اور قابل اعتماد راوی ہیں۔ اس کے بعد چوتھا درجہ ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ لا باس بہ۔ کوئی حرج نہیں ہے۔ یعنی جیسے انگریزی میں not bad کہتے ہیں۔ گویا اب کمزوری شروع ہو گئی۔ کمزور تو نہیں ہیں لیکن کمزوری سے اوپر جو درجات ہیں ان میں سے یہ آخری درجہ ہے۔ اس کے بعد جو درجہ آتا ہے وہ ہے صدوق، وہ اس کی بات کہا کرتے تھے، بات سچ کہا کرتے تھے۔ یعنی گویا ان کی سچائی کے بارے میں تو گواہی ہے لیکن یادداشت اور حافظہ کے بارے میں کچھ نہیں کہا گیا۔ اس کے بعد اگلا درجہ ہے کہ صدوق سیئ الحفظ، یعنی سچائی کے اعتبار سے تو وہ سچے تھے لیکن حافظہ برا تھا۔ اس طرح سے ایک ایک کر کے بارہ درجات ہیں جن میں سے آخری چار درجے کمزور اور ضعیف راویوں کے ہیں۔ آخری درجہ اس جھوٹے راوی کا ہے جو جھوٹی احادیث وضع کرتا تھا، جس کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے کہ یہ جھوٹا راوی تھا۔ ان لوگوں کے الگ سے تذکرے موجود ہیں۔

یہ جو بارہ درجات یا بارہ طبقات ہیں یہ تقریباً تمام علماء رجال کے متفق علیہ ہیں۔ یہ تفصیل جو میں نے بیان کی ہے یہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے اپنی کتاب تقریب التہذیب میں دی ہے۔ تقریب التہذیب بہت اہم لیکن نہایت مختصر کتاب ہے جو ایک جلد میں بھی چھپی ہے اور

جلدوں میں بھی چھپی ہے۔ اور تین جلدوں میں بھی چھپی ہے۔ میرے پاس لاہور کا چھپا ہوا ایک جلد کا نسخہ ہے۔ اس میں ایک جلد میں انہوں نے تمام کتب رجال کا گویا نچوڑ دے دیا ہے۔ جس سے آپ کو ایک سرسری اندازہ ہو جاتا ہے کہ کسی راوی کی حیثیت کیا ہے۔ کتب رجال پر مسلمانوں کا اتنا بڑا ذخیرہ موجود ہے کہ اگر اس کو جمع کیا جائے تو پوری لائبریری اس سے تیار ہو سکتی ہے۔ درجنوں جلدوں میں، بیسیوں اور بیسیوں جلدوں میں، جو یہ کتابیں لکھی گئیں۔ یہ کتابیں دوسری صدی ہجری سے لکھی جانی شروع ہوگئیں اور تقریباً آٹھویں نویں صدی ہجری تک لکھی گئیں اور اس کے بعد بھی لوگوں نے ان کو مرتب کیا۔ یہ کتابیں مختلف انداز اور مختلف سطحوں کی ہیں۔ ان میں سے بعض مصنفین وہ ہیں کہ جو بڑے سخت ناقد تھے اور جن کا معیار بہت اونچا تھا جیسے امام بخاری اور امام مسلم کا معیار بہت کڑا تھا۔ انہوں نے جب رجال پر کتاب لکھی تو بہت اونچے معیار کے ساتھ لوگوں کو جانچا۔ ماہرین علم رجال میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے کہ جنہوں نے بڑی نرمی سے کام لیا اور ان کا تساہل مشہور ہے۔ انہوں نے بعض کمزور راویوں کو بھی ثقہ قرار دے دیا۔ اور ان میں کچھ لوگ تھے جو معتدل تھے اور بیچ میں تھے۔ ہم ان سب کا تذکرہ کریں گے۔

علم رجال کی شاخیں

رجال پر شروع میں جو کتابیں لکھی گئیں وہ مختلف علاقوں پر الگ الگ کتابیں تھیں مثلاً مدینہ کے راویوں پر، دمشق کے راویوں پر، کوفہ کے راویوں پر یا کسی خاص قبیلہ کے راویوں پر۔ جیسے جیسے یہ موضوع بڑھتا گیا، زیادہ جامع اور زیادہ مفصل کتابیں سامنے آتی گئیں۔ جن لوگوں نے زیادہ مفصل کام کیا ان میں دو نام بڑے نمایاں ہیں۔ ایک حافظ ابن حجر عسقلانی کا ہے، اور دوسرا نام امام ذہبی کا ہے۔ امام ذہبی کی چار کتابیں ہیں: تذکرۃ الحفاظ، طبقات الحفاظ، میزان الاعتدال فی نقد الرجال اور المغنی فی الضعفاء الرجال۔ یہ چاروں کتابیں جامع ہیں اور ان میں سے ہر کتاب کا الگ الگ مقصد ہے اور ہر کتاب کے قاری اور مستفیدین الگ الگ ہیں۔ مختلف لوگوں کی ضرورت کے لحاظ سے انہوں نے یہ چار کتابیں تیار کیں۔

امام نووی اپنے زمانے کے مشہور محدثین میں سے تھے۔ صحیح مسلم کے شارح ہیں۔ ان کی کتاب ریاض الصالحین کا نام آپ نے سنا ہوگا، بڑی مقبول ہوئی۔ ان کی اربعین نووی بھی

ذکر ہوگا۔ علم حدیث کی کوئی کتاب امام مالکؒ کے تذکرے سے خالی نہیں ہوسکتی۔ امام اوزاعی کا ذکر فقہ کی ہر کتاب میں ہوگا۔ لیکن علم حدیث میں بھی ان کا ذکر ہوگا۔ اس لئے طبقات اور علم رجال کی کتابوں میں بہت سی چیزیں مشترک ہیں۔

علم رجال کی کتابوں کی ایک اور صنف ہے جس کو مشیخہ کہتے ہیں۔ اس سے مراد وہ کتابیں ہیں جن میں کسی ایک محدث نے اپنے شیوخ کا تذکرہ لکھا ہو۔ اس زمانے میں لوگ ایک یا دو یا تین یا دس آدمیوں سے علم حدیث حاصل نہیں کرتے تھے بلکہ ایک ایک آدمی سینکڑوں محدثین کے پاس علم حدیث حاصل کرنے کے لئے جاتا تھا۔ کیوں؟ اس کا ذکر میں آگے کروں گا۔ اب ایک شخص نے اگر سو آدمیوں سے حدیث سیکھی ہے تو ان سو کا تذکرہ اس نے مرتب کرلیا۔ اس تذکرہ کو مشیخہ کہتے تھے۔ اس طرح کے مشیخے بڑی تعداد میں ہیں۔ امام سخاوی جن کا تعلق دسویں صدی ہجری سے تھا اور اپنے زمانے کے بڑے محدث تھے انہوں نے لکھا ہے کہ مشیخہ پر جو کتابیں دیکھی ہیں وہ ایک ہزار سے زیادہ ہیں جو مختلف محدثین نے اپنے اپنے شیوخ کے بارے میں لکھیں۔ یہ ساری کی ساری کتابیں فن رجال کا جز ہیں۔ پھر جیسے جیسے فن رجال پھیلتا گیا اس کی شاخیں بنتی گئیں۔

اس کے علاوہ فن رجال کی کئی شاخیں تھیں۔ مثلاً آپ کو معلوم ہے کہ عربی زبان میں لوگوں کا نام الگ ہوتا ہے، لقب الگ ہوتا ہے اور کنیت الگ ہوتی ہے۔ مثلاً امام بخاری کو بخاری کے لقب سے تو ہم سب جانتے ہیں۔ لیکن بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ ان کا نام محمد بن اسماعیل تھا۔ اگر آپ کسی کتاب میں یہ لکھا ہوا دیکھیں کہ قال محمد بن اسماعیل تو شاید بہت کم لوگوں کو یہ پتہ چلے کہ اس سے مراد امام بخاری ہیں۔ اسی طرح سے کچھ لوگ اپنی کنیت سے مشہور ہوتے تھے۔ مثلاً اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ حضرت عبداللہ بن عثمان نے یہ فرمایا تو شاید آپ میں سے بہت سے لوگوں کو یہ پتہ نہ چلے کہ میری مراد کیا ہے۔ عبداللہ بن عثمان حضرت ابوبکر صدیقؓ کا نام تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا نام عبداللہ اور ان کے والد ابو قحافہ کا نام عثمان تھا۔ لیکن دونوں اپنی اپنی کنیت سے اتنے مشہور ہوئے کہ اصل نام بہت کم لوگوں کو معلوم ہوسکا۔ اس لئے راویوں میں یہ مسئلہ بہت پیدا ہوتا ہے کہ ایک راوی نے ایک جگہ جب حدیث بیان کی تو ایک شاگرد نے اس کو کنیت سے لکھ دیا۔ مثلاً حدثنی الانصاری، دوسرے نے لکھ دیا کہ حدثنی محمد، تیسرے نے لکھ دیا حدثنی

محمد بن اسماعیل، چوتھے نے لکھ دیا کہ حدثنی ابو عبداللہ۔ اب یہ سب ایک شخصیت کے حوالے ہیں۔ لیکن جو شخص نہیں جانتا کہ امام بخاری کی کنیت ابو عبداللہ تھی، لیکن وہ مشہور تھے بخاری کے لقب سے، نام ان کا محمد تھا، والد کا نام اسماعیل تھا اس لئے محمد بن اسماعیل بھی کہلاتے تھے، وہ زبردست التباس اور الجھن کا شکار ہوگا۔ لہٰذا کوئی ایسی کتاب ہونی چاہئے جس کی مدد سے یہ پتہ چل جائے کہ کس کی کنیت کیا ہے۔ یہ فن 'موضح' کہلایا۔ موضح الرجال یعنی رجال کی وضاحت کرنے والا، جس میں ان لوگوں کا تذکرہ جمع کیا گیا جن کا نام کچھ اور ہو لیکن وہ اپنی کنیت سے مشہور ہوں۔ یا نام سے مشہور ہوں کنیت کچھ اور ہو۔ تو کہیں کنیت اور نام میں فرق کی وجہ سے التباس نہ ہو۔ اس پر بہت سی کتابیں ہیں۔

اسی طرح سے ایک خاص صنف یا میدان ہے جس کو 'المؤتلف والمختلف' کہتے ہیں۔ المؤتلف والمختلف پر کم از کم ایک درجن کتابیں موجود ہیں۔ یعنی ملتے جلتے ناموں کی تحقیق۔ بعض نام ملتے جلتے ہوتے ہیں جس کی وجہ سے التباس پیدا ہو سکتا ہے۔ یہاں اتنی خواتین بیٹھی ہوئی ہیں۔ اگر پتہ کریں تو آپ میں سے کم و بیش ایک درجن نام مشترک نکلیں گے۔ ثریا ایک کا نام بھی ہے، دوسری کا بھی نام ہے، تیسری کا بھی نام ہے۔ محدثین اور راویوں میں بھی اشتراک اسم ہو سکتا تھا اور ہوتا تھا۔ اب یہ بات کہ اگر ایک دور میں ایک سے زیادہ محمد بن اسماعیل ہیں تو کون سے محمد بن اسماعیل مراد ہیں۔ خود صحابہ کرام میں عبداللہ نام کے کم و بیش ایک درجن صحابہ ہیں۔ ان میں سے جو چار مشہور عبداللہ ہیں وہ 'عبادلہ اربعہ' کہلاتے ہیں۔ ان عبادلہ اربعہ میں راوی بیان کرتا ہے حدثنی عبداللہ، مجھ سے عبداللہ نے بیان کیا۔ اب کن سے عبداللہ نے بیان کیا؟ یہ اس وقت تک پتہ نہیں چل سکتا جب تک ان میں سے ہر عبداللہ کے شاگردوں کی فہرست آپ کے پاس موجود نہ ہو۔ عبداللہ بن مسعودؓ سے کسب فیض کرنے والے کون کون ہیں۔ ان کے نمایاں ترین شاگرد مثلاً علقمہ ہیں۔ علقمہ کے شاگردوں میں نخعی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ جو ایک اور مشہور عبداللہ تھے ان سے ان کے پوتے شعیب بن عبداللہ روایت کرتے ہیں۔ شعیب بن عبداللہ سے ان کے بیٹے عمرو بن شعیب روایت کرتے ہیں۔ اب اگر آپ سے کوئی حدیث بیان کرے کہ مجھ سے ابراہیم نخعی نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں کہ میرے استاد نے عبداللہ سے پوچھ کر فلاں معاملہ کس طرح ہوا۔ اب آپ کو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ یہاں عبداللہ سے عبداللہ بن مسعود

مراد ہیں، عبداللہ بن عمرو بن العاص مراد نہیں ہوں گے۔ آپ کو آسانی سے ایک ابتدائی presumption قائم ہو جائے گی۔ دوسرے اگر یہ کہا جائے کہ عمرو بن شعیب نے بیان کیا، وہ روایت کرتے ہیں عبداللہ سے، تو یہاں آپ کو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ یہاں عبداللہ سے مراد عبداللہ بن عمرو بن العاص ہیں۔ اس طرح حضرت عبداللہ بن عباسؓ ایک اور عبداللہ ہیں۔ مثلاً کوئی کہے کہ مجاہد نے بیان کیا، مجاہد عبداللہ سے نقل کرتے ہیں، تو جاننے والوں کو اندازہ ہو جائے گا کہ چونکہ مجاہد عبداللہ بن عباسؓ کے شاگرد ہیں اس لئے یہاں عبداللہ سے مراد عبداللہ بن عباس ہوں گے۔ اس لئے مؤتلف والمختلف کے نام سے جو فن ہے یہ اس کی ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ صحابہ میں یہ التباس زیادہ نہیں ہوتا، لیکن باقی لوگوں میں بہت ہوتا ہے۔ تابعین میں کم، تبع تابعینؒ میں اس سے بھی زیادہ اور اس کے بعد اس سے بھی زیادہ۔ جیسے جیسے راویوں کی تعداد بڑھتی جائے گی اس التباس کے امکانات بڑھتے جائیں گے۔ اس التباس کو دور کرنے کے لئے کچھ حضرات نے پوری زندگی اس کام میں لگائی کہ ایسے راویوں کے حالات جمع کریں جن کے نام اور کنیتیں ملتی جلتی ہیں۔ بعض جگہ ایسا ہے کہ صرف اپنا نام بلکہ والد کا نام اور دادا تک کے نام ایک جیسے ہیں۔ اب تین ناموں سے بھی پتہ نہیں چلتا کہ کون مراد ہے۔ پھر یہاں کنیت سے پتہ چلے گا۔ کہیں وطن کی نسبت سے پتہ چلے گا جیسے نیشاپوری، مالکی، بصری یا استاد سے پتہ چلے گا۔ اس پر قدیم ترین کتاب امام دارقطنی کی ہے جو مشہور محدث ہیں۔ حضرت خطیب بغدادی جن کا میں نے ذکر کیا ہے، بغداد کے ہیں۔ ان کی بھی اس موضوع پر کتابیں ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ کچھ کتابیں ایسی ہیں جو الگ الگ کتابوں کے راویوں پر مشتمل ہیں۔ مثلاً صحیح بخاری میں جتنے راوی ہیں ان پر الگ کتابیں ہیں، اسماء رجال صحیح البخاری۔ صحیح بخاری کے جتنے رجال ہیں وہ کون کون ہیں۔ صحیح مسلم کے رجال پر کتابیں ہیں۔ موطا امام مالکؒ کے رجال پر کتابیں ہیں، مسند امام احمد کے رجال پر کتابیں ہیں، امام ابوداؤد کی سنن پر کتابیں ہیں۔ حدیث کی تقریباً تمام کتابوں کے راویوں پر الگ الگ کتابیں موجود ہیں جن میں وہ سارا مواد یکجا مل جاتا ہے۔ اس میں تلاش کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ اب اگر رجال کی ساری کتابیں ایک جگہ ہوتیں اور الگ الگ کتابوں کے رجال پر مواد نہ ہوتا تو تلاش کرنا مشکل ہو جاتا۔ اگر ابوداؤد کا راوی آپ کو معلوم ہے تو رجال ابوداؤد میں تلاش کر لیں آسانی سے مل جائے گا۔

شاگردوں میں بڑا نمایاں مقام رکھتے ہیں اور امام ابوحنیفہ کے تو بیشتر اجتہادات انہوں نے ہی
مدون کئے ہیں۔ آج فقہ حنفی امام محمد کی کتابوں کی بنیاد پر قائم ہے۔ امام محمد نے ابتدائی کسب فیض
اپنے ہم سبق امام ابویوسف سے کیا تھا۔ امام ابویوسف کی عمر زیادہ تھی امام محمد کی عمر کم تھی۔ جب امام
ابوحنیفہ کا انتقال ہوا تو امام محمد کی عمر کوئی اٹھارہ انیس سال تھی۔ بقیہ تکمیل انہوں نے امام ابویوسف
سے کی اور چند سال انہوں نے مدینہ منورہ میں امام مالکؒ سے بھی کسب فیض کیا اور مکہ مکرمہ میں
حدیث کی تکمیل کرنے کے بعد وہ کوفہ آگئے۔ جب وہ کوفہ آئے تو امام ابویوسف اس وقت چیف
جسٹس بن چکے تھے۔ امام محمد اور ان کے درمیان تھوڑی سی غلط فہمی ہوگئی جو عام طور پر انسانوں میں
ہو جاتی ہے۔ جس دور میں ان دونوں کے درمیان غلط فہمی ہوئی اس دوران امام محمد جب کسی روایت
میں امام ابویوسف کا حوالہ دیتے ہیں تو اس میں اس غلط فہمی یا ناراضگی کے باوجود امام ابویوسف کا پورا
احترام ملحوظ رکھتے ہیں اگرچہ اس بشری ناراضگی کی وجہ سے وہ امام ابویوسف کا نام نہیں لیتے لیکن جو
بات بیان کرتے ہیں اس سے ان کے اعلیٰ ترین اخلاقی معیار اور اعلیٰ ترین ذمہ داری کا احساس
ہوتا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ حدثنی من اثق فی دینہ وامانتہ مجھ سے اس شخص نے بیان کیا
جس کے دین اور امانت پر مجھے پورا اعتماد ہے۔ ناراضگی کی وجہ سے نام نہیں لیتے لیکن ناراضگی کے
باوجود یہ بیان کرتے ہیں کہ مجھے ان کے دین اور امانت پر پورا اعتماد ہے۔ حدثنی من اثق فی
دینہ وامانتہ، حدثنی الثقۃ، حدثنی الثبت، حدثنی الحجۃ الثقۃ۔ مجھ سے ایک ایسے راوی
نے بیان کیا جو حجت ہے، ثبت ہے اور ثقہ ہے۔ اور سب کو معلوم ہوتا تھا کہ اس سے امام ابویوسف
مراد ہیں کیونکہ یہ حدیث مبہم یا مدلس نہیں ہے۔ لیکن اس سے یہ اندازہ کر لیں کہ کتنا اور ذمہ
داری کتنی غیر معمولی تھی۔ اس طرح کی ایک اور مثال بھی میں عرض کرنے والا ہوں جس سے آپ
غیر معمولی اور عظیم ذمہ داری کا احساس ہوگا جو راویان حدیث نے ملحوظ رکھی اور کس ذمہ داری کا
ثبوت دیا جو آج ناقابل تصور ہے۔

ایک کتاب اعلام المحدثین بھی ہے اس میں سب ابواب اور فنون ہیں جو روایت حدیث سے
متعلق رہی ہیں اور ان کا سارا تذکرہ پانچ جلدوں پر مشتمل ایک کتاب میں دستیاب ہے۔ بقیہ
تذکروں میں بھی ہے۔ رجال کی ہر کتاب میں راویوں کے ساتھ خواتین راویوں کا تذکرہ بھی
موجود ہے۔

جیسے جیسے یہ مواد سامنے آتا گیا، وہ مرتب ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ چوتھی یا پانچویں صدی ہجری تک سارا کام مکمل ہو گیا۔ یہ تحقیق مکمل کرنا تھی کہ کس راوی پر کیا اعتراض ہے یا کس راوی پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اس پر الگ کتابیں تصنیف ہونی شروع ہوئیں۔ یہ وہ علم ہے جس کو علم جرح تعدیل کہتے ہیں۔ جرح کے معنی زخمی کر دینا اور مجروح کے معنی بھی زخمی کر دینا ہیں۔ لیکن عربی زبان میں زخمی کرنے دو مفاہیم میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک مفہوم تو کسی چھری یا ہتھیار سے جسم پر زخم لگا دینا ہے اس کے لئے عربی زبان میں جرح کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ایک زخم لگانا دل پر ہے کہ کوئی ایسی بات کہہ دی جو دل کو زخمی کر دی۔ اس کے لئے جرح کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

جراحات السنان لها التیام

ولا یلتام ما جرح اللسان

کہ تلوار کا زخم تو اچھا ہو جاتا ہے لیکن زبان اور الفاظ کا جو زخم ہوتا ہے وہ مندمل نہیں ہوتا، وہ ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ لہٰذا جرح کے یہ معنی کیے گئے۔ بعد میں ایسی بات کہنا کہ وہ سنے تو اس کو بری لگے۔ لیکن اصطلاحی اعتبار سے اس سے مراد یہ ہے کہ محدث نے کسی راوی کا کوئی ایسا عیب بیان کرنا جس کی وجہ سے وہ عدالت کے مرتبے سے ساقط ہو جائے اور اس کی بیان کردہ روایات ضعیف حدیث شمار ہو جائیں یا کسی راوی کی کسی ایسی کمزوری کو بیان کرنا جس کی وجہ سے اس راوی کی عدالت ختم ہو جائے یا صداقت کا معیار کم ہو جائے اور اس کی بیان کردہ روایات ضعیف حدیث شمار ہو جائیں۔ یہ ہے جرح کی تعریف۔ علامہ ابن اثیر جو ایک بڑے مورخ اور محدث ہیں اور لغت حدیث پر ان کی کتاب النہایہ فی غریب الحدیث بڑی مشہور ہے، اس میں جو مواد ہے اس میں سے وہ کہتے ہیں کہ جرح سے مراد وہ وصف ہے کہ جس کی کسی راوی سے جب نسبت کر دی جائے تو اس کا اعتبار رخصت ہو جائے اور اس کی بات پر عمل کرنا [illegible] کی ضد ہے۔ اس عمل کو جرح کہتے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ دوسرا عمل ہے تعدیل کا کہ کسی راوی کے بارے میں یہ تحقیق کر کے بتا دینا کہ یہ راوی عادل ہے۔ یہ راوی ان چیزوں کا حامل ہے جو ایک راوی کی جن ذیلی قسموں میں، یعنی صفات عدالت کو پورا کرتا ہو کہ یہ راوی مسلمان تھا، متقی تھا، یعنی ان تمام اخلاقی اور روحانی خوبیوں اور اچھائیوں کا حامل تھا جو ایک راوی حدیث کے لئے ضروری ہیں۔ اس

کا حافظہ اچھا تھا، اس کا ضبط اچھا تھا، اس کی بیان کردہ روایت میں کوئی علت نہیں ہے، اس کی سند
سے واسطے میں کوئی کٹاؤ نہیں، بیچ میں کوئی خلا نہیں ہے اور یہ رپورٹ کرنے والا انسان ثقہ ہے۔ جب ان
ساری چیزوں کی تحقیق ہو جائے تو تحقیق کے اس عمل کو تعدیل کہتے ہیں۔ جرح کے معنی کمزوری
بیان کرنا اور تعدیل کے معنی عدالت بیان کرنا۔ گویا جرح اور تعدیل کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔
ایک راوی کے بارے لوگوں کے معروضات میں مادہ ہے اور آپ نے پتہ چلایا کہ یہ راوی جھوٹا ہے تو اس کی
عدالت ساقط ہو گئی۔ یا آپ نے کہا کہ جھوٹا تو نہیں لیکن بعض لوگوں نے اس پر جھوٹا ہونے کا الزام
لگایا ہے تو وہ مشکوک ہو گیا۔ یا آپ نے اس کے بارے میں تحقیق کر کے پتہ چلایا کہ فاسق ہے
اور بعض ایسے اعمال میں مبتلا ہے جن کو کرنے والا فاسق ہو جاتا ہے۔ نعوذ باللہ شراب پیتا ہے، یا
جھوٹ بولنے کا عادی ہے، یا کسی اور بڑی بدعت میں مبتلا ہے جس کے بدعت ہونے پر اتفاق ہے۔
ایک تو وہ بدعت ہے جس کے بدعت ہونے میں اختلاف ہے۔ بعض لوگ اس کو بدعت سمجھتے ہیں
بعض نہیں سمجھتے۔ بعض ایک عمل کو سنت سمجھتے ہیں بعض بدعت سمجھتے ہیں۔ ایسا نہیں بلکہ بدعت کے کسی
ایسے عمل میں شریک ہے جس کے بدعت ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔ یا یہ مجہول ہے، غیر معلوم
ہے، پتہ نہیں کون ہے، کس زمانے کا ہے، کس قسم کا ہے، اس کا احوال کیا ہے۔ علمائے حدیث کسی سے
اصطلاح میں یعنی مجہول الشخصیت اور مجہول الحال ہے۔ یا ذات تو معلوم ہے کہ فلاں آدمی ہے، فلاں کا
بیٹا ہے، فلاں شہر کا ہے، لیکن اس کی صفات کا پتہ نہیں کہ کس قسم کا آدمی ہے، اچھا ہے یا برا ہے۔
ان میں سے اگر کوئی چیز اس میں ہو تو اس کی عدالت ختم ہو جاتی ہے۔ اور عدالت ختم ہو جانے کی
وجہ سے وہ راوی مستند نہیں رہے گا۔ اس طرح اگر تعدیل ختم ہو گئی تو جرح ہو گئی۔ اس عمل کو جرح کہتے ہیں۔

اسی طرح ضبط کا معاملہ ہے کہ آپ کی تحقیق میں اس کا حافظہ اچھا تھا، تحمل اور ادا دونوں
کے وقت اور عمر بھر اچھا رہا، تحمل سے لے کر ادا تک سب باتیں ٹھیک ٹھیک یاد رہیں، لیکن بعد
میں تحقیق سے پتہ چلا کہ اس کا حافظہ ختم ہو چکا تھا۔ شروع سے ختم ہو گیا تھا یا بعد میں ختم ہو گیا، شروع
سے خراب تھا یا بعد میں خراب ہو گیا تھا، یہ تحقیق سے ثابت ہو گا۔ یا مثلاً کسی راوی کے بارے میں
تحقیق سے پتہ چلا کہ ان کا حافظہ تو ٹھیک تھا، لیکن بعض اوقات وہ ایک آدمی اور دوسرے آدمی
میں اشتباہ کر دیا کرتے تھے یا ایک بات اور دوسری بات میں اشتباہ کر دیتے تھے۔ یا یہ ثابت ہو
کہ حافظہ تو ٹھیک ہے لیکن جو روایتیں بیان کرتے ہیں وہ عام ثقہ اور مستند راویوں سے مختلف کوئی

چیز بیان کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر کوئی ایسی بات بیان کرے جو سب راویوں کے بیان سے مختلف ہو۔

مثلاً اکثر راوی یہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز پڑھا کرتے تھے تو یہاں (ناف پر) ہاتھ باندھا کرتے تھے، کچھ لوگوں نے بیان کیا کہ یہاں (ناف کے اوپر) باندھا کرتے تھے، کچھ نے یہ بیان کیا کہ یہاں (سینے کے اوپر) باندھا کرتے تھے، کچھ نے یہ بیان کیا کہ ہاتھ چھوڑ کر پڑھا کرتے تھے۔ اب یہ چار روایتیں مستند راویوں کے ذریعے آئی ہیں۔ ان چاروں کے بارے میں یہ اختلاف تو ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کس پر عمل کرنا ہے۔ کچھ کے خیال میں یہاں افضل ہے، کچھ کے خیال میں یہاں افضل ہے، کچھ کے خیال میں چھوڑنا افضل ہے۔ جو مستند اور ثقہ راوی ہیں وہ ان چار میں محدود ہیں۔ اب اس کے علاوہ کوئی شخص پانچواں بیان کرے مثلاً یہ کہ رسول اللہ ﷺ (نعوذ باللہ) یہاں (گردن پر) ہاتھ باندھا کرتے تھے، بالفرض اگر ایسی روایت ہو تو یہ ثقات کے خلاف ہے۔ راوی کا درجہ جو بھی ہو یہ روایت قابل قبول نہیں ہوگی۔ ایسا غیر ثقہ بیان بھی راوی کی عدالت کو ساقط کر دیتا ہے اور ایسا راوی مجروح ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ اگر سچا ہوتا تو ایسی بات کیوں بیان کرتا جو معلوم ہو کسی نے بیان نہیں کی۔ یا کسی راوی کے بارے میں یہ ثابت ہو کہ انہیں کثرت سے ایسی کیفیت پیش آتی تھی جس میں وہ بات کو بھول جایا کرتے تھے۔ بڑھاپے میں کثرت سے ایسا ہوتا ہے کہ بعض اوقات انسان بھول جاتا ہے اور بعض اوقات کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ آپ نے اسی نوے سال کی عمر کے بزرگوں میں دیکھا ہوگا کہ پورے پورے بچے ایسے ہو جاتے ہیں۔ یادداشت ٹھیک رہتی ہے اور بعض اوقات اس قدر ان کی کیفیت ہو جاتی ہے کہ کچھ یاد نہیں رہتا۔ اپنے گھر والوں کو بھی نہیں پہچانتا۔ تو یہ تحقیق ہوتی ہے کہ کسی راوی کی یہ کیفیت تھی کہ نہیں تھی۔ بعض اوقات ایک راوی وقتی طور پر غلطی کرتا ہے اور وہ اس کی غلطیاں ہوتی ہیں جن سے معروف طریقہ کے خلاف ہوتا ہے۔ اگر اس طرح کی چند غلطیاں ثابت ہو جائیں تو اس کو بھی عدم تصحیح یا جرح قرار دیں گے اور وہ راوی غیر مستند اور مجروح ہو جائے گا۔

یہ ساری کی ساری اہمیت علم اسناد اور علم جرح و تعدیل کی ہے۔ ذخیرہ حدیث کا بیشتر دارومدار ان حضرات کی تحقیق اور علم رجال کی تفصیلات پر ہے۔ علم حدیث کے وہ ذیلی علوم جن میں سب سے بڑا اور مرکزی ستون اور مرکزی عنصر کے درمیانی ستون سے مثال دیں تو وہ علم

چاہتے ہیں کہ ان تین راویوں کا درجہ جرح و تعدیل کی میزان میں کیا ہے۔ اب وہ یہ کریں گے کہ ایک ایک آدمی کے پاس جا کر ملاقات کریں گے۔ کوئی مدینہ میں ہے تو کوئی مکہ میں ہے، کوئی کوفہ میں ہے تو کوئی بصرہ میں ہے۔ چھ چھ مہینے سفر کر کے ان کے پاس پہنچیں گے۔ اور جا کر ان شاگردوں کے شاگردوں کے پاس بیٹھیں گے۔ ان سے ان احادیث کی روایت کریں گے۔ تینوں آدمیوں سے روایت کا یہ عمل ظاہر ہے کہ ایک دو سال میں مکمل نہیں ہوا ہوگا۔ اس میں بہت وقت لگا ہوگا۔ دس دس سال میں جا کر مکمل ہوا ہوگا، بیس سال میں ہوا ہوگا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ کتنا وقت لگا ہوگا۔ جب یہ عمل مکمل ہو جائے گا تو پھر وہ ان روایات کا باہم مقابلہ کر کے دیکھیں گے۔ اگر وہ یہ دیکھیں کہ انیس راویوں کی روایت ایک جیسی ہے اور بیسواں راوی مختلف بات کہتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ بیسویں راوی سے یا تو بھول چوک ہوئی یا اس کا حافظہ اس میں کام نہیں کرتا تھا، یا اس نے نعوذ باللہ جان بوجھ کر کوئی چیز ملاوٹ کی ہے۔ اب اگر وہ اختلاف یا تبدیلی سنجیدہ قسم کی ہے یعنی ایسی ہے جس سے معنی و مفہوم میں فرق پڑتا ہے تو یہ اس راوی کے خلاف جائے گا اور اس کی عدالت کمزور ہو جائے گی۔ اور اگر اس اضافہ یا تبدیلی سے معنی اور مفہوم میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا، صرف لغت یا الفاظ کا فرق ہے، تو اس سے اس راوی کے حافظے کے بارہ میں رائے پر اثر پڑے گا۔ اور کہا جائے گا کہ گویا اس کا حافظہ اتنا اچھا نہیں تھا۔ ورنہ جب انیس راوی ایک طرح سے بیان کر رہے ہیں تو پھر بیسواں دوسری طرح کیوں بیان کر رہا ہے۔ اب یا تو اس کے حافظے میں کمی ہے یا پھر اس کی نیت میں فتور ہے۔ اگر معنی میں فرق پڑتا ہے تو نیت میں اور اگر صرف الفاظ میں فرق ہے تو حافظہ میں فتور ہے۔ اب گویا یہ مفروضہ ہے کہ اس راوی کے حافظہ یا نیت میں سے کسی ایک چیز میں فتور ہے۔ اب وہ محقق اس راوی کی بقیہ روایات کی تحقیق کریں گے۔ ان راویوں کے ساتھ بیٹھ کر وہ پانچ دس سال کسب فیض کریں گے۔ پانچ سال میں ان کی ساری احادیث جمع کرنے کے بعد ان کے جو اساتذہ ہیں ان کے پاس جائیں گے۔ ان سے ان کی تصدیق کریں گے تو اس میں بھی پچیس تیس سال لگیں گے۔ ان پچیس تیس سالوں میں جا کر یہ ثابت ہوگا کہ واقعی ان صاحب کے حافظہ میں کمزوری تھی یا نیت میں فتور تھا۔ پھر ان کی جرح کی باری آئے گی اور یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ یہ راوی مجروح ہے۔ یہ کام آسان نہیں تھا۔ اس پر لوگوں کی نسلوں کی نسلوں نے کام کیا اور اس طرح سے مختلف روایات کی variations جمع کیں۔ ان

سے حاصل کی۔ ایک دوسرے سے کولیٹ (Collate) کیا۔ پھر ان میں سے جو بہترین سند تھی اس کو انہوں نے اپنی کتاب میں نقل کیا۔ ساری روایتیں اور ساری سندیں نقل کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اگر وہ ایک ایک حدیث کی ساری سندیں نقل کرتے تو شاید پوری صحیح بخاری اس ایک حدیث، انما الاعمال بالنیات کی سندوں سے بھر جاتی۔ انہوں نے تمام اساتذہ سے تصدیق کرنے کے بعد سب سے بہترین سند کا انتخاب کر کے نقل کر دی اور باقی کو نقل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ لہذا جب امام بخاری یہ کہتے ہیں کہ میں نے چار لاکھ احادیث میں سے صحیح بخاری منتخب کی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک ایک حدیث کو میں نے سینکڑوں مرتبہ دریافت کیا اور جتنوں شیوخ اور صحابہ کی روایات کو جمع کیا اور پھر ان میں سے جو سند مجھے سب سے زیادہ بہترین لگی میں نے اس کو اختیار کر لیا اور باقی سندوں کو نظر انداز کر دیا۔ لہذا جب تعداد بیان کی جاتی ہے تو اس سے یہ مراد ہوتی ہے۔

امام یحییٰ بن معین جو صحابہ کے بعد محدثین کے سب سے اونچے درجے میں شمار ہوتے ہیں۔ اور اپنے زمانے میں امیر المومنین فی الحدیث کہلاتے تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب تک مجھے کوئی حدیث تیس طرق سے نہ مل جائے، میں اپنے کو یتیم سمجھتا ہوں۔ میں اس حدیث کے بارے میں یتیم ہوں جس کے تیس طرق یا تیس سندیں میرے پاس موجود نہ ہوں، زیادہ ہوں تو اچھا ہے اور جتنی زیادہ ہوں اتنا اچھا ہے۔

ایک بزرگ تھے حضرت ابراہیم بن سعید، جو امام مسلم کے اساتذہ میں سے تھے۔ امام مسلم نے ان سے روایات لی ہیں۔ ان سے ایک محدث ملنے کے لئے گئے اور ان سے کہا کہ میں آپ سے حضرت ابوبکر صدیق کی فلاں روایت سننا چاہتا ہوں۔ آپ کی سند سے وہ کیسے پہنچی۔ گویا یہ ویلیڈیشن اور ری ویری فیکیشن کی ایک قسم تھی۔ انہوں نے اپنے ملازم سے کہا کہ حضرت ابوبکر صدیق کی جو روایات ہیں ان کی 23 ویں جلد لے آؤ۔ اب ان صاحب نے حیرت کے ساتھ سوچا کہ حضرت ابوبکر کی ساری روایت ملا کر بھی شاید چالیس اور پچاس سے زیادہ نہیں بنتیں۔ جو زیادہ سے زیادہ دس پندرہ صفحات کے ایک کتابچہ میں آسکتی ہیں۔ تو یہ تیسویں جلد کہاں سے آ گئی؟ انہوں نے پوچھا کہ حضرت ابوبکر صدیق کی تو ساری روایات مل کر چالیس پچاس کے لگ بھگ بنتی ہیں، ان کی مرویات کی تیسویں جلد کہاں سے آ گئی؟ انہوں نے کہا کہ جب تک میرے

نے مجھ سے یہ حدیث بیان کی ہے اور پوری سند کے بعد حدیث بیان کی۔ امام ابن ابی حاتم نے خاموشی سے پوری حدیث سنی اور پھر کہا کہ اس میں یہ کمزوری ہے، یہ کمزوری ہے اور یہ کمزوری ہے۔ فلاں کی روایت فلاں سے ثابت نہیں ہے، فلاں کی روایت فلاں واسطے سے ہے اور فلاں کی فلاں واسطے کے بغیر ہے۔ کوئی آٹھ دس کمزوریاں بتائیں۔ ان صاحب نے کہا کہ آپ نے تو چیک کئے بغیر یہ سب کمزوریاں بیان کر دیں۔ آخر آپ نے یہ سب کچھ کس بنیاد پر بتایا؟ ان صاحب کو شبہ ہوا کہ شاید ایسے ہی کہہ دیا ہو۔ اس پر امام ابن ابی حاتم نے کہا کہ اگر آپ کو میری بات میں کوئی شک یا شبہ ہے تو امام ابو زرعہ رازی، جو ایک اور امام تھے، جو اسی دور کے امام ہیں، انہوں نے بھی جرح و تعدیل پر ایک کتاب لکھی ہے، ان کے پاس چلے جائیں اور جا کر پوچھ لیں۔ وہ امام ابو زرعہ کے پاس چلے گئے۔ ان سے وہی حدیث بیان کی۔ انہوں نے بھی فوراً کوئی حوالہ یا کتاب چیک کئے بغیر باقی ساری کی ساری وہ باتیں بتائیں جو اس سے قبل امام ابن ابی حاتم نے بتائی تھیں۔ اب ان صاحب کو بڑی حیرت ہوئی کہ انہوں نے بھی وہی باتیں بتائیں جو ابن ابی حاتم نے بتائی تھیں۔ انہوں نے حیرت سے پوچھا کہ آخر آپ یہ سب باتیں کس بنیاد پر بتا رہے ہیں۔ آپ کی دلیل کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ جب آپ کسی سنار کے پاس کوئی کھوٹا زیور لے کر جاتے ہیں اور وہ اس کو چیک کر کے کہتا ہے کہ یہ کھوٹا ہے تو کیا آپ اس سے دلیل پوچھتے ہیں؟ جیسے سنار کو کھوٹے کھرے کا اندازہ ہو جاتا ہے کیا اسے نہیں ہوتا؟ سنار کو تو ایک بار ہاتھ میں لے کر فوراً پتا چل جاتا ہے اور اس کو فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ سونا کھوٹا ہے کہ کھرا۔ اسی طرح محدث کو، جس کی عمر اسی میں گزری ہو، اس کو بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ کیا کھرا ہے اور کیا کھوٹا۔

جرح و تعدیل کے مشہور ائمہ

وہ حضرات جنہوں نے جرح و تعدیل میں اپنا مقام پیدا کیا ان کے نام اگر ایک ایک بیان کئے جائیں تو بات بڑی لمبی ہو جائے گی۔ اور اگر جرح و تعدیل میں ان کا اسلوب بھی بیان کیا جائے تو بات بہت زیادہ لمبی ہو جائے گی۔ لیکن میں مختصراً صرف برکت کے لئے اس نیت سے کہ اللہ تعالیٰ روز قیامت جب ان کا حشر کرے تو ہمیں بھی ان کے ساتھ شامل کرے، صرف اس وجہ سے میں ان کے نام دہرا دیتا ہوں۔

چلا کہ گھر میں تو کچھ بھی نہیں ہے سب ختم ہو گیا ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ وہ پیسہ کہاں خرچ ہو گیا تو انہیں بتایا گیا کہ ایسے کاروبار میں لگا دیا گیا ہے جو بڑا مفید کاروبار تھا۔ انہوں نے کہا کہ وہ مفید کاروبار کہاں ہے، اس کے اثرات تو کہیں نظر نہیں آرہے ہیں۔ گھر میں تو فقر و فاقہ کا منظر نظر آرہا ہے تو جواب دیا کہ وہ آپ ہی کا بیٹا ہے جو مسجد میں درس دے رہا ہے۔ وہ آپ ہی کا صاحبزادہ ہے اور میں نے سارا پیسہ اس کی تعلیم پر خرچ کر دیا ہے۔

اس طرح سے لوگ اپنی عمر بھر کی کمائی علم پر خرچ کر دیا کرتے تھے۔ لیکن ایسے حضرات بھی تھے جو ایک سال تجارت کرتے تھے اور ایک سال علم حدیث کے لئے سفر کیا کرتے تھے۔ کچھ لوگ یہ کرتے تھے کہ ایک بھائی نے کاروبار کیا اور دوسرے بھائی کو حدیث کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ ابتدائی دس بارہ سال علم حدیث میں لگائے پھر چند سال کاروبار میں لگائے۔ پھر علم حدیث میں چند سال لگائے۔ اس لئے کہ علم حدیث کے لئے طویل طویل سفر کرنے پڑتے تھے، اور یہ کام پیسے کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔ پیسہ حاصل کرنے کے لئے محنت کرنی پڑتی تھی۔

اگر ہم علم حدیث حاصل کرنا چاہیں تو ایسے ادارے کہاں کہاں موجود ہیں جو ہم علم حدیث کے لئے داخل کر دیں۔

علم حدیث کے الگ اداروں کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ البتہ دینی مدارس میں ہر جگہ حدیث پڑھائی جاتی ہے۔ بعض جگہ اچھی، بعض جگہ کمزور۔ لیکن اس کے لئے آپ کو پہلے آٹھ سال ابتدائی علوم پڑھنے پڑیں گے۔ پھر علم حدیث کا نمبر آئے گا۔ اس لئے آپ عربی سیکھ کر پہلے یہاں خود پڑھنا شروع کر دیں۔ یہ تو عمر بھر کا کام ہے۔

حضرات کو آپ نے بتایا ایک شخص کتاب لائے تھے اس کا نام کیا ہے۔

وہ صحاح ستہ یعنی بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ اور نسائی کا مجموعہ تھا۔

بخاری کی احادیث کے عنوانات میں کوئی تناسب ہو تو نظر نہیں آتا۔

یہ بات بظاہر صحیح معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث ہے اوصانی خلیلی بثلاث۔ اس کو بخاری میں اوّل عنوانات کے تحت بیان کیا گیا ہے باقی کہیں بیان نہیں کیا گیا۔ یہ بڑی غور و خوض کی بات ہے۔ اس موضوع پر لوگوں نے الگ سے کتابیں لکھی ہیں۔ امام بخاری جب

کوئی عنوان بیان کرتے ہیں تو وہ عنوان بڑی گہری بصیرت پر دلالت کرتا ہے۔ بعض اوقات حدیث کے الفاظ میں وہ چیز نہیں ہوتی لیکن حدیث کے معنی پر غور کریں تو وہ چیز سامنے آجاتی ہے۔ مثلاً میں نے صحیح بخاری کی آخری حدیث پڑھی تھی جس کا عنوان امام بخاری نے دیا ہے: باب قول الله عز و جل و نضع الموازين القسط ليوم القيامة و ان اعمال بني آدم توزن یعنی باب کا عنوان ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے باب میں کہ ہم روز قیامت برابر کا ایک ترازو رکھیں گے اور اس اعلان میں کہ بنی آدم کے اعمال تولے جائیں گے۔ یہ عنوان ہے اور حدیث ہے كلمتان خفيفتان على اللسان حبيبتان الى الرحمن ثقيلتان في الميزان سبحان الله وبحمده سبحان الله العظيم گویا وہ زبان سے نکلنے والا عمل میزان میں بھاری کیسے ہوگا؟ یہ ذرا سا جملہ جو زبان سے نکلا تو اس کو کیسے تولا جائے گا۔ کیا اس کے تولے جانے کی کوئی شکل ہے؟ جب اس کے تولے جانے کی کوئی شکل ہے تو اعمال کے تولے ہونے کی بھی یقیناً کوئی نہ کوئی شکل ممکن ہے۔ جب اعمال کے تولے جانے کا ذکر ہے تو موازین قسط کے معنی معلوم ہو گئے۔ اس طرح سے امام بخاری بالواسطہ طور پر بتاتے ہیں کہ ان کی مراد کیا ہے۔ صحیح بخاری کے عنوانات پر لوگوں نے الگ سے کتابیں لکھی ہیں اور درجنوں جلدوں میں بعض اوقات تین تین جلدوں میں کتابیں لکھی گئی ہیں اور بخاری کے تراجم ابواب کی تفسیر کی گئی ہے۔ مولانا محمد ادریس کاندھلوی لاہور کے ایک مشہور محدث تھے، انہوں نے "تحفۃ القاری فی حل تراجم البخاری" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو ابھی تک چھپی نہیں ہے، لیکن ان کے صاحبزادگان میں کسی کے پاس وہ کتاب ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر وہ چھپی تو بیس جلدوں میں آئے گی۔ اس میں صرف بخاری کے عنوانات کی تشریح ہے۔ اصل کتاب کی تشریح نہیں بلکہ صرف عنوانات کی تشریح ہے۔

شب برات کے حوالے سے لوگوں کے جو عقائد ہیں ان کو کیسے درست کیا جائے؟

لوگوں سے ان کے عقائد کے بارے میں لڑنا جھگڑنا نہیں چاہیے۔ لوگ عقائد کے معاملے میں خاصے متشدد ہوتے ہیں، ایک مرتبہ اختلاف میں شدت پیدا ہو جائے تو پھر کوئی آپ کی بات نہیں سنتا۔ آپ آہستہ آہستہ نرمی سے بیان کریں۔ جو لوگ شب برات پر کچھ عبادات وغیرہ کرتے ہیں وہ بھی یہ سمجھ کر کرتے ہیں کہ حدیث میں شب برات کی عبادت کا ذکر آیا ہے۔ حالانکہ کسی صحیح حدیث میں تو نہیں آیا ہے۔ اس لئے آہستہ آہستہ ان کو قائل کریں۔ اگر پہلے ہی دن تنقید

تدوین حدیث

تدوین حدیث کے موضوع پر گفتگو کا مقصد اس پورے عمل کا ایک خاکہ بیان کرنا ہے

جس کے نتیجے میں احادیث نبوی کو جمع کیا گیا، مرتب کیا گیا اور کتابی صورت میں مدون کر کے ہم

تک پہنچایا گیا۔ ممکن ہے آپ میں سے بعض حضرات کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا ہو کہ تدوین حدیث کا

موضوع تو گفتگو کے آغاز میں زیر بحث آنا چاہئے تھا اور سب سے پہلے یہ بتانا چاہئے تھا کہ احادیث کیسے

مدون ہوئیں اور ان کی تدوین کی تاریخ کیا تھی۔

لیکن یہ موضوع میں نے قصداً آخر میں اس لئے رکھا ہے کہ گذشتہ چند دنوں کی گفتگو سے

یہ بات کافی حد تک اور بڑی حد تک واضح ہو جاتی ہے کہ علم حدیث کی تدوین کن مضبوط بنیادوں

پر ہوئی ہے۔ جو لوگ علم حدیث کی تدوین کے نقطۂ نظر سے شبہات کا اظہار کرتے ہیں ان کے

شبہات کتنے بے بنیاد اور سطحی ہوتے ہیں۔ اس کا کچھ اندازہ گزشتہ بعض گفتگوؤں سے ہو گیا ہوگا۔

واقعہ یہ ہے کہ علم حدیث کے بارے میں محدثین کرام نے جس بے مثال دقت نظر سے کام لیا

ہے، جتنی محنت، محبت، عقیدت اور کاوش سے علم حدیث کو آئندہ نسلوں تک پہنچایا گیا اور رسول

ﷺ کے ارشادات کو محفوظ کیا گیا، وہ پوری انسانی تاریخ کا ایک منفرد، عجیب و غریب اور بے

مثل کارنامہ ہے۔ اس کارنامے سے جو لوگ واقف ہیں ان کو اس کارنامے کی عظمت کا اور اس

کے magnitude کا تصور اس کا اندازہ ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ علم حدیث کی تدوین کے

بارے میں جو شکوک و شبہات ظاہر کئے جاتے ہیں وہ کتنے بے بنیاد، بے حقیقت، کمزور اور بودے

flimsy قسم کے ہیں۔ مگر یہ شبہات نا واقفیت پر مبنی ہیں اور ان سے کسی حد تک صرف نظر کیا

ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر یہ شبہات کسی وجہ سے پھیلتے ہیں اور اسلام کے بارے میں کسی کی بدگمانی
کو پیدا کرنے کی کوشش کا ایک حصہ ہیں تو پھر یہ ایک بہت بڑا الزام ہے۔ اخلاقی جرم بھی ہے، علمی
جرم بھی ہے اور دینی اور مذہبی جرم بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو اس جرم کے ارتکاب سے محفوظ
رکھے جو اس غلط فہمی کا شکار ہیں یا جو شکار ہو گئے ہیں۔

کہنے والے یہ کہتے ہیں کہ حدیث کے نام سے آج جو ذخیرہ علم و ہدایت مسلمانوں کے
پاس موجود ہے وہ تاریخی اعتبار سے استناد کا وہ درجہ نہیں رکھتا جو کسی قانونی روایت کے لئے ضروری
ہے۔ یہ بات سب سے پہلے مسلمانوں میں سے کسی نے نہیں کہی بلکہ اس کا آغاز مغربی مستشرقین
نے کیا۔ مغربی مستشرقین نے یورپ اور دنیائے مغرب کے ان اہل قلم نے جنہوں نے اسلامیات
اور اسلامی علوم و فنون کو موضوع بنایا، سب سے پہلے ذات رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نشانہ
بنایا۔ شروع میں اور اٹھارویں صدی عیسوی میں اور کسی حد تک انیسویں صدی کے آغاز میں جو
کتابیں لکھی گئیں ان میں بیشتر کا موضوع رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہوتی تھی۔ ایک مسلمان ان
بے بنیاد اور غلط باتوں کو نقل نہیں کر سکتا جو مغربی مصنفین ذات رسالت مآب ﷺ کے بارے میں
اپنی کتابوں میں لکھا کرتے تھے۔ لیکن بہت جلد ان کو اندازہ ہو گیا کہ یہ الزامات اتنے بودے،
اتنے کمزور، اتنے غیر علمی اور اتنے غیر عقلی ہیں کہ کوئی سنجیدہ اور منصف مزاج شخص ان الزامات سے
متاثر نہیں ہو سکتا۔

پھر یہ محسوس ہوا یا پھر خود ان کو احساس ہو گیا ہو گا کہ جو باتیں وہ کہہ رہے ہیں وہ غلط ہیں
اس لئے انہوں نے اس بے فائدہ مہم کو چھوڑ دیا اور حملہ کا رخ قرآن پاک کی طرف کر دیا۔ یعنی اب
توپوں کا رخ قرآن مجید کی طرف موڑ دیا۔ قرآن مجید کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں اور غلط
فہمیاں پیدا کی گئیں۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے شروع میں قرآن پر
انگریزی، فرانسیسی، جرمنی اور بہت سی دوسری زبانوں میں بہت کچھ لکھا گیا۔ ان تحریروں میں
قرآن پاک کے بارے میں ہر طرح کی غلط فہمیاں پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ چالیس پچاس
سال کے بعد ان کو اندازہ ہو گیا کہ یہ چیز بھی بہت کمزور ہے اور قرآن پاک اتنی مضبوط بنیادوں پر
قائم ہے کہ ان بنیادوں کو کسی طرح کے کمزور الزامات کی بنیاد پر ہلانا ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ انہوں
نے قرآن مجید کو بھی چھوڑ دیا اور اپنی توپوں کا رخ حدیث نبوی کی طرف کر دیا۔ اب بڑے زور و شور

کے لئے کوئی تیار نہیں ہوگا۔ یونانیوں کا سارا ذخیرہ آج آپ تک کیسے پہنچا؟ جو لوگ یونانیوں کے علوم وفنون پر اظہار تعجب کرتے ہیں ان سب کو اس ذخیرہ سے ہاتھ دھو لینے چاہئیں اور اس سارے ذخیرہ کو دریابرد کردینا چاہئے۔ کیا آج افلاطون کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مقالات کا کوئی نسخہ موجود ہے؟ کیا آج منطق پر ارسطو کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی کوئی کتاب دستیاب ہے؟ کیا اس کی تحریریں بطلیموس کی موجود ہیں؟ کیا حکیم افلاطون اور جالینوس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخے آج موجود ہیں؟ اگر یہ سب چیزیں آج موجود نہیں ہیں تو جس بنیاد پر علم حدیث پر شک وشبہ کا اظہار کیا جارہا ہے اسی بنیاد پر ان تمام علوم وفنون کا انکار کردینا چاہئے؟ اور کہنا چاہئے کہ یہ نسخے افلاطون اور جالینوس نے نہیں بلکہ بعد کے کسی آدمی نے مرتب کئے تھے اور پچھلے لوگوں سے غلط منسوب کردیئے گئے؟ یہ بات تو بڑی عجیب ہے کہ جو بات اہل مغرب سے منسوب کی جائے وہ چاہے کتنی ہی کمزور ہو ہر صورت میں قابل قبول ہے۔ اور جو چیز مسلمانوں سے نسبت رکھتی ہو اور رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی سے منسوب ہو، وہ کتنی ہی روز روشن کی طرح ثابت ہو، کتنی ہی اچھی سند سے مسلسل ہو اس کا انکار کردیا جائے یہ بات قابل قبول نہیں ہے۔

پھر مزید براں جو چیز تاریخی طور پر ثابت ہے اور نہ صرف ثابت ہے بلکہ بارہ تیرہ سو سال سے بھی زیادہ مدت تک لوگ اس سے اتفاق کرتے رہے ہیں، وہ عربوں کے حافظہ کا معاملہ ہے۔ عربوں کا حافظہ ضرب المثل تھا۔ عربوں نے اپنے حافظہ کی بنیاد پر جو خزانے محفوظ رکھے، اسلام سے پہلے کے وہ خزانے جن کی بنیاد پر مغربی محققین اسلام پر بہت سے اعتراضات کرتے چلے آئے ہیں، جن کی بنیاد پر ان کو یہ پتہ چلا کہ مشرکین مکہ اسلام پر کس قسم کے اعتراضات کیا کرتے تھے، وہ خزانے آج ہم تک کس ذریعے سے پہنچے ہیں؟ اب یہ بات کہ اگر کفار مکہ نے اسلام پر کوئی اعتراض کیا ہے تو وہ اعتراض تو تحریری شکل میں ہے اور صحیح دلیل ہے کہ کفار مکہ نے اعتراض کیا تھا اس لئے کہ وہ انہی محدثین کی مرتب کردہ تاریخ میں موجود ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کونسی تاریخ میں موجود ہے؟ انہی تاریخوں میں تو موجود ہے جو بقول مغربی محققین محض زبانی روایات کی بنیاد پر ہم نے آپ تک پہنچی ہیں، مسلمانوں نے لکھ کر سامنے رکھی ہیں۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ وہ روایت تو قابل قبول ہے جس میں کہا گیا ہو کہ ابوجہل نے یہ کہا اور ابولہب نے وہ کہا اور عبداللہ بن ابی نے یہ کہا، لیکن وہ روایت مشکوک ہے جس میں کہا گیا ہو کہ سیدنا ابوبکر صدیقؓ نے اس طرح

سے قرآنیت کا مظاہرہ کیا اور سیدنا عمر فاروقؓ نے جس طرح سے اسلام کی خدمت کی۔ اگر یہ قابل قبول ہیں تو سب قابل قبول ہونی چاہئیں۔ اور اگر ناقابل قبول ہیں تو سب ناقابل قبول ہیں۔ ان دونوں میں فرق اور امتیاز کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

پھر اسلام سے پہلے کے دور جاہلیت کے جو نمونے عربوں نے محفوظ کئے ہیں، عرب شاعری اور خطابت کے نمونے جو جاہلیت کے ادب کے نمونے ہیں اور جن کو گزشتہ ڈیڑھ ہزار سال سے اہل علم و تحقیق پڑھتے چلے آرہے ہیں ان سے عربوں کے اس مزاج کا اندازہ ہوتا ہے جو وہ چیزوں کے محفوظ رکھنے کے بارے میں رکھتے تھے۔ جن لوگوں نے جاہلی ادب کے نمونے جمع کر کے محفوظ کرنے میں اپنی عمریں کھپائی ہیں، جن لوگوں کو ہزاروں اشعار پر مشتمل قصائد زبانی یاد ہوا کرتے تھے ان کے حافظہ کی مثالیں ضرب المثل ہیں۔ وہ اشعار تواتر کے ساتھ اور اتنی کثرت کے ساتھ منقول ہیں کہ کوئی ان کا انکار نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی شخص آج اس بات کا انکار کرے کہ امرؤ القیس نامی کوئی شاعر تھا جس نے فلاں مشہور قصیدہ لکھا تھا تو وہ اس بات کا بھی انکار کر سکتا ہے کہ ہٹلر نامی کوئی فرمانروا کبھی تھا جو جرمنی میں گزرا ہے۔ یا وہ تاریخ کی ہر چیز کا انکار کر سکتا ہے۔

جن لوگوں نے یہ شعر اور قصائد محفوظ رکھے جو تسلسل اور تواتر کے ساتھ اسلام سے پہلے سے مشہور چلے آرہے ہیں، جو قوم ایسی چیزوں کو صرف ادبی ذوق اور دلچسپی کی وجہ سے محفوظ رکھتی ہے، وہ اس غیر معمولی دینی جذبہ اور محبت کی وجہ سے، جو صحابہ کرام میں موجزن تھا، اس غیر معمولی محبت اور عقیدت کی وجہ سے جو رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کے لئے ان کے دلوں میں موجود تھی، کیا وہ ان روایات کو محفوظ نہیں رکھ سکتے تھے جن پر اسوۂ حسنہ نبوی مشتمل تھیں۔

عربوں کے حافظہ کی مثالیں دیکھنی ہوں تو جاہلی ادب اور شاعری کا مطالعہ کریں کہ رسول ﷺ کی ولادت مبارک سے کئی کئی سو سال پہلے کے قصائد لوگوں نے نقل کئے ہیں اور آج تک اسی طرح محفوظ ہیں۔ آج زمانہ جاہلیت کے درجنوں نہیں سینکڑوں قصائد موجود ہیں۔ معلقات، اصمعیات، مفضلیات اور اس طرح کے دوسرے مجموعوں میں موجود یہ قصائد اسلام سے کئی کئی سو سال پہلے کے ہیں۔ ابھی چند سال قبل ایک معاصر عرب محقق نے تیسری صدی عیسوی کے عربی اشعار کا پتا چلایا ہے جو رسول اللہ ﷺ کی ولادت سے تین سو سال پہلے کہے گئے تھے۔ جو قوم ان اشعار کو محفوظ رکھ سکتی ہے، جن کو چودہ سو سال میں آج تک آپ کو پڑھ کر

حافظے میں ہوں، وہ قوم احادیث بجز قرآن پاک کے کیوں محفوظ نہیں رکھ سکی؟

پھر یہ مفروضہ بھی اپنی جگہ غلط ہے کہ کسی چیز کو محفوظ رکھنے کے لئے جب تک تحریری شہادتیں نہ ہوں وہ محفوظ نہیں رہ سکتی۔ حالانکہ اگر کسی تاریخی حقیقت یا واقعہ کی بنیاد صرف تحریری شہادت ہو تو وہ بھی مشکوک ہے۔ خود تحریری شہادت کے بارے میں یہ کیسے پتہ چلے گا کہ یہ وہی تحریر ہے جو فلاں سن میں لکھی گئی تھی۔ فرض کیجئے کہ آج رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کا کوئی مجموعہ جو سیدنا ابو ہریرہؓ نے لکھا موجود ہوتا تو جن لوگوں کے مقدر میں ہدایت نہیں ہے وہ اس مجموعہ کے بارہ میں بھی اسی طرح شکوک وشبہات کا اظہار کرتے جیسے آج کر رہے ہیں۔ مستشرقین کہتے کہ نہیں یہ وہ مجموعہ نہیں ہے جو حضرت ابو ہریرہؓ سے منسوب کیا جاتا ہے، بلکہ یہ تو بعد میں کسی نے لکھ کر آپؓ سے منسوب کر دیا ہے۔ پھر کیا ہوتا؟ انکار کرنے والا اس کا بھی انکار کرتا۔ ماننے والے اس کے بغیر بھی مانتے ہیں۔ انکار کرنے والے اس کے باوجود ہر چیز کا انکار کر سکتے ہیں۔ انکار کرنے والے تو قرآن کا بھی انکار کرتے ہیں جو ہر طرح سے تواتر کے ساتھ پہنچا ہے۔ اس لئے کسی موافق یا مخالف کے انکار سے بات نہیں بنتی، بات اور دلیل اس بنیاد پر قائم ہوتی ہے کہ جو چیز پہنچائی گئی وہ کتنے استناد کے ساتھ پہنچائی گئی۔ کتنی قوت اور اہتمام کے ساتھ اس کو محفوظ رکھا گیا۔ اس کے متن کی جو اصالت یعنی purity اور pristine character ہے۔ اس کو آگے کس طرح سے منتقل کیا گیا۔

جس طرح سے اللہ نے عربوں کو حافظے سے نوازا اسی طرح سے یہ اللہ تعالیٰ کی عجیب وغریب سنت ہے اور میں اس کی بات اپنا مشاہدہ آپ سے بیان کر سکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی یہ عجیب وغریب سنت رہی ہے کہ جو شخص علم حدیث میں دلچسپی لیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے حافظہ میں برکت عطا کر دیتا ہے۔ اس دور میں بھی جن لوگوں کا آپ نے بہترین حافظہ دیکھا ہوگا یا آئندہ دیکھنے کا موقع ملے گا وہ علم حدیث سے وابستہ ہوں گے اور جن کا علم حدیث کے ساتھ اختصاص کا تعلق ہوگا وہ حافظہ اور یادداشت میں دوسروں سے نمایاں طور پر ممتاز نظر آئے گا۔ محدث جلیل مولانا انور شاہ کشمیری کے حافظہ کے واقعات ہم سب نے کثرت سے سنے ہیں۔ ماضی قریب میں شیخ عبدالعزیز بن باز اور شیخ ناصر الدین البانی کے حیرت انگیز حافظہ کا مشاہدہ کرنے والے کثرت سے موجود ہیں۔

تھی ممانعت فرمائی؟ اس پر کوئی منکر حدیث اظہار خیال نہیں کرتا۔ اسی طرح وہ احادیث بھی موجود
ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ نے احادیث لکھنے کی اجازت دی، احادیث کو لکھوایا، اپنے قلم سے
اپنے بعض ارشادات کو ضبط تحریر میں منتقل کروایا اور صحابہ کرام کو تحریری صورت میں منتقل کیے۔ کوئی منکر
حدیث کبھی ان کا ذکر نہیں کرتا۔ اس لئے کہ یہ ان کے نقطہ نظر کے خلاف ہے۔ یہ انصاف اور
Objectivity کا تقاضا یہ ہے کہ تصویر کے دونوں رخ اٹھائے جائیں اور پھر دیکھا جائے کہ ثابت
کیا جائے کہ اصل بات کیا ہے۔

مثال کے طور پر ایک حدیث میں آتا ہے کہ لا تکتبوا عنی (میری طرف سے مت لکھو)
ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ، جو شخص مجھ سے قرآن کے علاوہ کچھ لکھے وہ اسے
مٹا دے۔ وحدثوا عنی، ہاں میری طرف سے روایت کرو، کوئی حرج کی بات نہیں۔ و
من کذب علی متعمدا فلیتبوا مقعدہ من النار۔ یہ بہت اہم حدیث ہے جس کے بارے میں
منکرین حدیث کا کہنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے احادیث کو لکھنے سے منع فرمایا تھا۔ اس سے ان
لوگوں کے دعوے کے مطابق آپ کے زمانے میں احادیث نہیں لکھی گئیں۔ صحابہ کرام نے نہیں
لکھیں اور جب صحابہ کرام نے نہیں لکھیں تو بعد میں لکھے جانے کا کوئی اعتبار نہیں۔ لیکن اس طرح
یا حدیث سے مراد کیا ہے، یہ رسول اللہ ﷺ نے کس کو منع کیا تھا اور کیوں منع کیا تھا؟ یہ ایسی
چیز ہے جس پر منکرین حدیث غور نہیں کرتے۔ لیکن خود اس روایت میں دو الفاظ ہیں جو قابل
غور ہیں۔ ایک آپ نے یہ فرمایا کہ حدثوا عنی، مجھ سے روایت بیان کرو۔ اس میں علم حدیث
اور آپ کے ارشادات بیان کرنے اور روایت کرنے کا حکم واضح طور پر موجود ہے۔ گویا اس حدیث سے کم
سے کم اتنا تو ثابت ہوا کہ آپ نے زبانی روایت کرنے کا حکم دیا اور احادیث کو زبانی منتقل کرنے کا
حکم دیا۔ لکھنے کی ممانعت کی، لیکن زبانی بیان کرنے کا حکم دیا۔ دوسرا اہم لفظ ہے کہ جو کوئی قرآن
کے علاوہ کچھ لکھے اس کو مٹا دے۔ آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ اس کو ضائع کر دے۔ جلا دے یا پھینک
دے۔ یا اس کو چھپا دے یا زمین میں دفن کر دے۔ مٹا دینے کا لفظ ذرا غور سے یاد رکھئے تو اس
پر آگے بات آئے گی۔

تدوین حدیث حضورؐ کی حیات مبارکہ میں

اس کے ساتھ ساتھ ایسے بہت سے واقعات ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بعض صحابہ

کرام کو لکھنے کی اجازت دی جائے، آپ کی موجودگی میں اور آپ کی مجالس میں صحابہ کرامؓ آپ کے ارشادات کو لکھا کرتے تھے اور ان کے مجموعے مرتب کیا کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی روایت سنن دارمی میں منقول ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں بیٹھا ہوتا تھا اور جو کچھ آپ ارشاد فرمایا کرتے تھے وہ لکھا کرتا تھا۔ مجھ سے قریش کے بعض ذمہ دار حضرات نے یہ کہا کہ تم رسول اللہ ﷺ کی ہر بات لکھتے ہو، ممکن ہے بعض اوقات آپؐ غصہ میں ہوں، بعض اوقات مزاج کا موڈ ہو سکتا ہے اور وہ کوئی بات مزاح کے طور پر ارشاد فرما سکتے ہیں۔ تو تم ہر بات کیوں لکھتے ہو؟ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ لوگ ایسا کہتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ تم ضرور لکھو فوالذی نفسی بیدہ ما خرج منہ الا حق۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے میری زبان سے حق کے علاوہ کوئی اور بات نہیں نکلتی۔ اب دیکھئے کہ آپ نے قسم کھا کر فرمایا کہ جو میں کہتا ہوں وہ حق کہتا ہوں لہٰذا لکھو۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ جو باتیں سنتے تھے وہ لکھ لیتے تھے۔ ایک روایت کے مطابق انہوں نے ایک ہزار احادیث اس مجموعے میں لکھیں۔ یہ مجموعہ صحیفہ صادقہ کہلاتا ہے۔ اس مجموعہ کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ اس مجموعہ کی تاریخ پر اگر بات شروع کی جائے تو گفتگو بہت لمبی ہو جائے گی۔ یہ مجموعہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کے انتقال کے بعد ان کے عزیزوں کے حصہ میں آیا۔ انہوں نے اپنے والد سے پڑھنے کے بعد اس کو روایت کرنے کی اجازت حاصل کی۔ وہ آگے اس کو بیان کیا کرتے تھے۔ ان کے بعد یہ مجموعہ ان کے پوتے کے حصہ میں آیا جن کا نام شعیب تھا۔ ان کے انتقال کے بعد پوتے عمرو کے حصہ میں آیا۔ اور وہ اس کی روایت کیا کرتے تھے۔ کتب حدیث میں آپ نے یہ روایت بارہا پڑھی ہوگی۔ مسند امام احمد اور ترمذی کے ساتھ ساتھ اور بھی کئی کتابوں میں ہے۔ عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ یعنی عمرو بن شعیب اپنے والد سے وہ اپنے دادا سے یعنی والد اپنے دادا سے، جد کی نسبت عمرو کی طرف نہیں ہے شعیب کی طرف ہے کہ شعیب اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں یعنی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے یہ بات اس طرح فرمائی۔ یہ ایک ذخیرہ تھا جو صحابہ کے زمانے میں پہلے ایک صحابیؓ نے حضورؐ کی مجلس میں مرتب کیا۔

رہتے تھے۔ جیسا کہ مروان بن حکم خلیفہ نے ایک مرتبہ چیک کیا تھا اور چیک کرنے کے بعد بعینہ وہی نکلا تھا جو پہلے سے لکھا ہوا تھا۔ لہٰذا حضرت ابوہریرہؓ جو حضورؐ کے انتقال کے بعد پچاس سال تک زندہ رہے، اور اپنی زندگی کے اگلے پچاس سال تک جو بھی روایات بیان فرماتے رہے ان میں کسی ایک روایت اور ان کے تحریری ذخیرہ میں اختلاف نہیں ہوا۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ قیدوا العلم بالکتاب، کہ جو علم تم مجھ سے حاصل کرتے ہو اس کو تحریر میں قید کرو۔ صحیفہ تحریر میں لاؤ۔ یہ تیسری مثال ہے کہ حضورؐ نے لکھنے کی نہ صرف اجازت دی بلکہ حکم ارشاد فرمایا۔ حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے جو امام سیوطی نے تدریب الراوی میں نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ ہم آپ سے بہت سی چیزیں سنتے ہیں تو کیا ان کو لکھ لیا کریں؟ آپؐ نے فرمایا اکتبوا ولا حرج 'لکھ لیا کرو اس میں کوئی حرج نہیں'۔ اس کے بعد رافع بن خدیج بھی لکھنے لگے۔ یہ ایک اور صحابیؓ کی مثال آپ کے سامنے آئی۔ کہ صحابہ حضورؐ کے ارشادات حضورؐ کے زمانے ہی میں حضورؐ کی اجازت سے لکھا کرتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ جب فتح مکہ کے موقع پر مکہ میں داخل ہوئے تو آپ کو معلوم ہے کہ تمام کفار مکہ آپؐ کے سامنے موجود تھے۔ آپؐ نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔ جب آپؐ یہ خطبہ ارشاد فرما چکے تو یمن سے آنے والے ایک صحابیؓ تھے جن کا نام ابوشاہ تھا۔ انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ نے خطبہ میں بہت اچھی باتیں ارشاد فرمائیں یہ خطبہ اگر کوئی مجھ کو لکھ کر دے دے تو بڑا ہی اچھا ہوگا۔ صحیح بخاری کی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا اکتبوا لابی شاہ' ابوشاہ کو لکھ کے دے دو۔ لوگوں نے ابوشاہ کو خطبہ کا مکمل متن لکھ کر دے دیا جو ان کے پاس لکھا ہوا موجود تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے حکم سے آپؐ کا پورا خطبہ لکھ کر ایک صحابیؓ کو دے دیا گیا۔

یہ کہنا کہ حضورؐ نے تمام احادیث کو لکھنے کی ممانعت کر دی تھی یہ ایک بالکل بے بنیاد اور غلط بات ہے۔ جامع ترمذی کی روایت ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، جو ایک بڑے صحابیؓ ہیں، ہجرت سے پہلے مدینے کے سرداروں میں شمار ہوتے تھے قبیلہ خزرج کے بڑے سرداروں میں سے تھے اور اتنے بڑے سردار تھے، اتنے بڑے سردار تھے کہ رسول اللہ ﷺ کا جب انتقال ہوا تو انصار کو یہ خیال ہوا کہ ان کو رسول اللہ ﷺ کا جانشین ہونا چاہئے۔ اور رسول اللہ ﷺ

کا جانشین انصار میں سے ہوتا تو یقیناً سعد بن عبادہ ہی ہوتے۔ ان کے پاس ایک تحریری ذخیرہ
احادیث موجود تھا۔ ترمذی میں روایت ہے کہ ان کی ملکیت میں ایک صحیفہ تھی یا کتاب تھی: صحیفة
فیہا طائفة من احادیث رسول اللہ علیہ الصلوۃ والسلام و سننہ۔ جس میں انہوں نے
احادیث رسول اور سنتوں کی ایک بڑی تعداد محفوظ کر رکھی تھی۔ یعنی ان کے پاس احادیث رسول اور
سنن پر مشتمل ایک لکھا ہوا مجموعہ موجود تھا۔ ان کے بعد وہ مجموعہ ان کے صاحبزادے کے پاس
گیا۔ ان کے صاحبزادے لوگوں کو اس کی روایت کر کے اور پڑھ کر سنایا کرتے تھے اور لوگ اس کی
نقلیں ان سے حاصل کیا کرتے تھے۔ یہ ذخیرہ حضرت سعد بن عبادہ کے صاحبزادے کے بعد ان
کے شاگردوں کے پاس آ گیا۔ پہلے تو ایک ہی نسخہ تھا، اب اس کے سینکڑوں نسخے تیار ہو گئے۔ ہر
شاگرد نے اپنا نسخہ تیار کر لیا۔ جس کا طریقہ تھا کہ استاد اپنا نسخہ سامنے رکھ کر بولتے تھے اور شاگرد
لکھتے جاتے تھے۔ ہر شاگرد کے پاس ایک نسخہ تیار ہو جاتا تھا۔ یہ ایک اہم مثال ہے کہ رسول اللہ
ﷺ کے زمانے میں صحابہ کرام نے احادیث کے نسخے تیار کئے اور ان کو محفوظ رکھا۔

اس کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ نے کچھ تحریریں، بعض روایات میں آتا ہے 104،
بعض میں آتا ہے 105 جیسے خطوط مختلف حکمرانوں کے نام لکھے۔ اگر حضور کا ارشاد حدیث ہے
تو ہر تحریر مبارک بھی ایک حدیث ہے۔ میں آپ کو ایک نامہ مبارک سنانا چاہوں گا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

من محمد عبد اللہ و رسولہ الی هرقل عظیم الروم سلام علی من اتبع
الهدیٰ

اما بعد فانی ادعوک بدعایة الاسلام اسلم تسلم یوتک اللہ اجرک مرتین۔
فان تولیت فانما علیک اثم الاریسیین و السلام علی من اتبع الهدیٰ

محمد رسول اللہ

یہ نامہ مبارک باقاعدہ حدیث کی تحریر ہے جسے لکھوایا۔ 106 اس طرح کی احادیث
آپ نے لکھوائیں، مختلف لوگوں کو آپ نے بھیجیں۔ ان میں سے چھ آٹھ تحریریں اپنی اصلی صورت
میں موجود ہیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے فرانسیسی زبان میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ چھ
اصل نامہ ہائے مبارک ہیں جو مختلف مقامات پر موجود ہیں۔ انہوں نے ان کی پوری تفصیل اور

تاریخ اس کتاب میں بیان کی ہے۔ ایک بڑی اہم چیز یہ ہے کہ یہ متن جو میں نے آپ کے سامنے
پڑھا ہے آپ نے بعض کیلنڈروں میں بھی اس کو چھپا ہوا دیکھا ہوگا۔ بعض تقویموں میں بھی چھپا ہوا
دیکھا ہوگا۔ یہ متن بار بار چھپا ہے۔ لوگ اس کو نقل کرتے ہیں۔ یہ متن اور صحیح بخاری میں پایا جانے والا متن
بالکل ایک ہے۔ دونوں میں سو فیصد یکسانیت ہے۔ یہ مکتوب 1864ء میں ایک عیسائی کے
پاس دریافت ہوا تھا۔ اس کی تاریخ بیان کرنے کا موقع نہیں ہے۔ لیکن جب یہ دریافت ہوا اور اس
کی یہ عبارت پڑھی گئی تو پتہ چلا کہ اس کا متن بعینہ وہی ہے جو صحیح بخاری میں لکھا ہوا ہے۔ گویا صحیح
بخاری کے ایک ماخذ کی تصدیق ہوگئی۔ گویا آج اس چیز کا اصل نسخہ دریافت ہوا ہے جو صحیح بخاری
میں تیسری صدی ہجری میں اسی طرح لکھی گئی تھی۔ اب اس بات کی دوبارہ تصدیق ہوگئی کہ صحیح
بخاری مرتب کرتے وقت امام بخاری کے پاس جو ماخذ تھے وہ بالکل صحیح ترین ماخذ تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے صرف ان نامہ ہائے مبارک پر اکتفا نہیں فرمایا تھا۔ آپ نے پڑھا
ہوگا کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ نے مدینہ کے قبائل اور یہودیوں کے
درمیان ایک معاہدہ فرمایا جو میثاق مدینہ کہلاتا ہے۔ یہ 52 دفعات پر مشتمل دنیا کا پہلا تحریری
دستور ہے۔ اس سے پہلے کوئی دستور تحریری طور پر مرتب نہیں ہوا۔ دنیا کی کسی قوم میں اس طرح کی
کسی تحریری اور مدون دستوری قانون کی اس سے پہلے کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہ دستاویز کسی مدون
دستور کی پہلی مثال ہے۔ یہ حضور نے لکھوا کر اپنے پاس محفوظ رکھا۔ آج اس کے متن کتب
حدیث میں موجود ہے۔ صحیح بخاری میں اس کا بالواسطہ حوالہ ہے۔ سنن ابوداؤد میں اس کے بعض
حوالے اور سیرت ابن ہشام میں اس دستور کا پورا متن نقل ہوا ہے۔ یہ اس بات کی ایک اور
مثال ہے کہ عہد نبوی میں حدیثیں لکھی گئیں اور رسول اللہ ﷺ کے حکم سے لکھی گئیں۔

ان کے علاوہ حضور نے مختلف قبائل سے معاہدے فرمائے۔ ہر معاہدہ ایک حدیث
ہے۔ اس لئے کہ اس معاہدے کی تنفیذ کے ساتھ آپ نے کیا شرائط طے فرمائیں۔ کس قبیلہ کو
کونسی مراعات عطا فرمائیں، غیر مسلموں کو کیا حقوق دیئے؟ یہ سب ان معاہدوں سے ثابت
ہوتا ہے۔ تو یہ سب معاہدے احادیث ہیں۔ اس طرح کے جو معاہدے رسول اللہ ﷺ نے فرمائے
ان کی تعداد کم وبیش چار ساڑھے چار سو کے قریب ہے۔ ان میں سے بیشتر معاہدے آج بھی
موجود ہیں اور مکاتیب نبوی اور وثائق نبوی کا اہم حصہ ہیں۔ اس موضوع پر دستاویزوں کی تعداد کم

الگ سے کتابیں موجود ہیں جو صدر اسلام سے آج تک لکھی جا رہی ہیں۔ لوگ ان پر کام کر رہے ہیں۔ اس لئے ان مثالوں کے بعد یہ کہنا کہ رسول اللہ ﷺ نے حدیث لکھنے کی ممانعت کی تھی یہ بات فضول اور بے بنیاد ہے۔

ایک سوال پھر بھی پیدا ہوتا ہے کہ جو ممانعت والی احادیث آئی ہیں ان کا کیا مفہوم ہے۔ ان کے تین مختلف مفاہیم ہیں۔ سب سے پہلے تو رسول اللہ ﷺ نے اسلام کے بالکل آغاز کے دور میں ممانعت فرمائی۔ جب حضورؐ ایسے ماحول میں تھے جہاں لکھنے والے بہت تھوڑے تھے۔ آغاز اسلام میں مکہ کرمہ میں تمام لکھنے والوں کی تعداد سترہ تھی جیسا کہ بلاذری نے لکھا ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے تو بارہ تیرہ آدمیوں کے سوا کوئی لکھنا نہیں جانتا تھا۔ ان لکھنے والوں میں سے جن لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا وہ تعداد میں اور بھی تھوڑے تھے۔ سب نے تو اسلام قبول نہیں کیا۔ مثلاً ابوجہل لکھنا پڑھنا جانتا تھا لیکن اس نے تو اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ ابولہب لکھنا جانتا تھا۔ عبداللہ بن ابی بھی لکھنا جانتا تھا لیکن انہوں نے تو اسلام قبول نہیں کیا۔

اس لئے اسلام قبول کرنے والوں میں جو لکھنا جانتے تھے ان کی تعداد اور بھی کم تھی اور رسول اللہ ﷺ انہی سے قرآن پاک لکھوانے کا کام لیا کرتے تھے۔ اس لئے اگر شروع میں قرآن پاک اور احادیث دونوں چیزیں یہی حضرات لکھا کرتے تو اس بات کا بڑا امکان تھا کہ قرآن اور احادیث کے مضامین آپس میں مخلوط ہو جائیں اور کسی کو آگے چل کر یہ شبہ ہو جائے کہ یہ قرآن پاک کی آیت ہے یا حدیث ہے۔ مثلاً حضرت عمر فاروقؓ لکھنا جانتے تھے۔ لیکن اگر رسول اللہ ﷺ شروع میں حضرت عمر فاروقؓ کو اس کی اجازت دیتے کہ ایک کاغذ کے ایک سرے پر قرآن پاک لکھیں، جو تھوڑا تھوڑا نازل ہو رہا تھا۔ اور دوسرے سرے پر حدیث لکھیں اور یہ ذخیرہ حضرت عمر فاروقؓ کے خاندان میں چلا آتا تو سو ڈیڑھ سو سال کے بعد اس بات کا امکان تھا کہ وہ دونوں کاغذ کسی ایسے آدمی کو ملیں جو قرآن کا حافظ نہیں ہے اور وہ حدیث کو بھی قرآن کا حصہ سمجھ لے۔ اس کا امکان تو بہر حال موجود رہتا۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ نے شروع میں قرآن پاک کے علاوہ کوئی اور چیز لکھنے کی ممانعت فرمائی۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ صحابہ کی یہ تربیت فرما رہے تھے کہ جو حضور ﷺ کرتا دیکھیں اس پر خود بخود عمل درآمد شروع کر دیں بجائے صحیفہ پر لکھنے کے اس کو سینوں میں اتار لیں

تاکہ وہ عمل کے ذریعے محفوظ ہو جائے۔ قرآن پاک الفاظ کے ذریعے محفوظ ہو جائے، سنت آپ کے عمل کے ذریعے محفوظ ہو جائے، اور لوگوں کے رگ و پے میں سما جائے۔ لوگوں کے طرز عمل اور شب و روز کی نشست و برخاست کا حصہ بن جائے۔ اس لئے شروع میں رسول اللہ ﷺ نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں فرمائی کہ حدیث و سنت لکھی جائے۔

اس کے بعد دوسری ممانعت آپ نے کاتبان وحی کے لئے فرمائی۔ جو لوگ کاتبین وحی تھے ان کے لئے فرمایا کہ وہ قرآن پاک کے علاوہ کوئی اور چیز نہ لکھیں۔ اس لئے کہ اگر کاتبان وحی کوئی اور چیز لکھیں گے تو ان کے بارے میں التباس کا زیادہ امکان ہے۔ اگر دوسرے حضرات لکھیں مثلاً حضرت ابو شاہؓ کے پاس لکھی ہوئی چیز موجود تھی اور ابو شاہ کاتبان وحی میں سے نہیں تھے۔ اس لئے ابو شاہ کے ذخیرے میں کوئی چیز ملے تو اس میں یہ غلط فہمی نہیں ہو سکتی تھی کہ یہ قرآن پاک کی آیت ہے جو لکھی ہوئی ہے۔ ایک فی لاکھ بھی اس کا امکان نہیں تھا۔ لیکن مثلاً حضرت زید بن ثابتؓ کے پاس اگر کوئی ایسی چیز ہوتی تو مغالطہ کا امکان تھا اس لئے حضورؐ نے کاتبان وحی کو منع فرمایا۔

تیسری چیز جو بڑی اہم ہے وہ یہ کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ جس نے قرآن کے علاوہ کوئی چیز لکھی ہے وہ اس کو مٹا دے۔ بعض صحابہ یہ کرتے تھے، اور ایک مرتبہ حضورؐ نے دیکھا کہ وہ ایسا کر رہے تھے کہ قرآن پاک کے اپنے نسخہ میں تفسیری حواشی لکھ لیتے تھے یا اسی کاغذ پر جو جگہ بچتی اس پر آپؐ کے ارشادات گرامی لکھ لیا کرتے تھے۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ قرآن کے علاوہ کوئی چیز لکھی ہے تو مٹا دو۔ اس لئے کہ اگر ایک ہی کاغذ پر ایک ہی چیز ہوگی تو اس سے آگے چل کر بڑی الجھن پیدا ہو سکتی ہے۔ اس لئے آپ نے مٹانے کا حکم دیا، منع کرنے کا حکم نہیں دیا۔

یہ وہ چیز ہے جس کے بارے میں لوگ جان بوجھ کر یا غلط فہمی کی بنیاد پر شبہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ حضورؐ نے لکھنے کی ممانعت فرمائی تھی۔ لکھنے کی ممانعت بہت آغاز کے سالوں میں تھی، کاتبین وحی کے لئے تھی اور قرآن پاک کے ساتھ چیزیں ملا کر لکھنا منع تھا۔ ان پر حدیث لکھنے سے منع کرنے کی پابندی تھی۔ اس ایک پہلو کے علاوہ حضورؐ نے خود احادیث لکھنے کی اجازت دی۔ آپؐ کی محفل میں احادیث لکھی گئیں۔ آپ کی اجازت سے لکھی گئیں۔ آپؐ نے خود لکھوا کر لوگوں کو دیں۔ بہت سی دستاویزات اور وثائق آپؐ نے تیار کروائے جو آج کتب حدیث میں موجود ہیں اور ان

ہوا ہے کہ کسی مسلمان کو کافر کے بدلے میں قتل نہ کیا جائے۔ یہ بعض خاص حالات میں حضورؐ نے ہدایت فرمائی تھی۔ یہ تین قسم کے مسائل اس صحیفہ میں لکھے ہوئے جو حضورؐ کے زمانہ میں لکھے ہوئے مجھے دیئے گئے تھے۔ اس کے علاوہ کوئی اور چیز خاص طور پر مجھے نہیں دی گئی جو باقی صحابہ کو نہ دی گئی ہو۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ ایک صحیفہ حضورؐ کے زمانے کا لکھا ہوا حضرت علیؓ کے پاس بھی موجود تھا جس میں دیت، قیدیوں کی رہائی کے احکام اور یہ بات کہ مسلمان اور کافر کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں قتل کیا جا سکتا ہے کہ نہیں، اس کے بارے میں بعض ہدایات دی گئی تھیں۔

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰؓ ایک صحابیؓ تھے جو سب سے آخر میں انتقال کرنے والے صحابہ میں سے تھے۔ مجھے ٹھیک سن یاد نہیں لیکن سن اٹھاسی نوای ہجری کے لگ بھگ ان کا انتقال ہوا۔ چند آخری صحابہ میں سے ہیں۔ ان کے پاس ایک صحیفہ، یعنی احادیث کا لکھا ہوا مجموعہ، موجود تھا جس میں سے وہ روایت کیا کرتے تھے۔ حضرت سمرہ بن جندب مشہور صحابی ہیں۔ آپ نے ان کا نام سنا ہوگا۔ ان کے بارے میں حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ "جمع فیہا احادیث کثیرۃ" اس رسالہ یا کتاب میں انہوں نے بہت سی احادیث جمع کی تھیں۔ حافظ ابن حجر نے تعداد نہیں بتائی۔ لیکن احادیث کثیرۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑی تعداد میں احادیث جمع کی تھیں۔ حضرت ابو رافعؓ رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے اور آپؐ کے ساتھ بہت طویل عرصہ تک رہے۔ ان کے پاس ایک تحریری ذخیرہ موجود تھا جس میں نماز کے بعض احکام لکھے ہوئے تھے۔ یہ بھی ایک صحابی کا لکھا ہوا ذخیرہ ہے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کا مرتب کیا ہوا ایک مجموعہ آج بھی دستیاب ہے اور استنبول کے کتب خانہ سعید علی پاشا میں اس کا مخطوطہ موجود ہے۔ مشہور صحابیؓ حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ کے دست مبارک کا لکھا ہوا ایک اور مجموعہ اسی کتب خانہ سعید علی پاشا میں موجود ہے جس میں حج کے احکام لکھے ہوئے ہیں۔ یہ وہ چند نمونے ہیں جو صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں لکھے گئے۔ ایک اور نمونہ حضرت ابو طبیہ انجعیؓ کا مرتب کیا ہوا مجموعہ بھی آج موجود ہے۔ استنبول میں ایک اور کتب خانہ ہے جو کتب خانہ فیض اللہ کہلاتا ہے وہاں موجود ہے۔ دمشق کا ایک کتب خانہ دار الکتب الظاہریہ ہے جو بہت بڑا اور نفیس کتب خانہ ہے اور اب اس کی ایک جدید ترین عمارت بنائی گئی ہے، اس میں یہ کتب خانہ موجود ہے۔ الملک الظاہر بیبرس ایک حکمران تھا جس نے یہ کتب خانہ بنایا تھا اور قدیم

بھی ایک مجموعہ مرتب کیا اور ان دونوں کو لے کر حضرت عمر بن عبدالعزیز کے پاس آئے [illegible] عمر بن عبدالعزیز نے وہ مجموعہ ایک ابتدائی جامع مجموعہ تھا امام زہری صف اول کے محدثین میں سے ہیں۔ بہت سے محدثین ان کے شاگرد ہیں۔ امام مالک جیسے محدث کا تعلق ان کے تلامذہ سے ہے۔ ان کا مجموعہ بہت جامع مجموعہ تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے [illegible] ہر علاقے میں اس کا ایک نسخہ یا نقل تیار کرا کے بھیجی تاکہ لوگوں کے پاس یہ مجموعے مرتب ہو جائیں۔ یہ مجموعے صحابہ کرام کے بعد تابعین کے دور میں مرتب ہوئے۔

تدوین حدیث تبع تابعین کے دور میں

تبع تابعین کے ابتدائی دور میں اور صغار تابعین کے دور میں جتنے مجموعے مرتب ہوئے ان کی تعداد بیان کرنا بڑا دشوار ہے۔ ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی نے صرف تابعین دور کے [illegible] مجموعوں کا پتہ چلایا ہے۔ وقتاً فوقتاً دوسرے محققین بھی ان کا پتہ چلاتے رہتے ہیں۔ دو تین مثالیں دینے پر میں اکتفا کرتا ہوں۔

محمد بن اسحاق جن کا تعلق تبع تابعین کی ابتدائی نسل سے ہے۔ اور بعض لوگوں نے ان کو صغار تابعین میں بھی شمار کیا ہے۔ ان کا مجموعہ آج مطبوعہ شکل میں موجود ہے۔ انہوں نے ان احادیث کو جمع کیا جن کا تعلق سیرت سے، رسول اللہ ﷺ کے غزوات اور آپ کی ذات گرامی سے ہے۔ وہ ساری احادیث محمد بن اسحاق کے مجموعے میں آج مطبوعہ شکل میں موجود ہیں اور اردو اور انگریزی زبانوں میں اس مجموعے کا ترجمہ بھی دستیاب ہے۔

ایک اور امام بھی حضرت معمر بن راشد تھے جو یمن کے ایک بڑے محدث تھے۔ انہوں نے ایک کتاب الجامع المسند کے نام سے لکھی تھی۔ الجامع اس لئے کہ اس میں حدیث کے تمام ابواب کا تذکرہ تھا اور المسند اس لئے کہ وہ صحابہ کی ترتیب پر تھی۔ انہوں نے اس کتاب کو کئی حصوں میں مرتب کیا تھا جس کی آخری یا پانچ جلدیں آج بھی قلمی شکل میں ترکی کے ایک کتب خانہ میں موجود ہیں۔ معمر بن راشد کا تعلق تابعین کے متوسط دور سے ہے۔ معمر بن راشد کے براہ راست شاگرد عبدالرزاق بن ہمام تھے۔ عبدالرزاق بن ہمام نے ان سے احادیث روایت کیں۔

معمر کے مجموعے کی جو آخری دو جلدیں آج دستیاب ہیں ان میں جو احادیث ہیں وہ ساری کی
ساری مصنف عبدالرزاق میں بھی موجود ہیں۔ مصنف عبدالرزاق آج مطبوعہ موجود ہے۔ گویا مصنف
عبدالرزاق کی سند سے ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ معمر بن راشد نے جو احادیث تحریری طور پر
مرتب کی تھیں ان کا تعلق صحابہ، تابعین کے طبقے سے تھا۔ وہ ساری احادیث تحریری اور زبانی طور پر
عبدالرزاق کو منتقل ہوئیں۔ عبدالرزاق بڑے محدثین کے استاد ہیں۔ امام بخاری کے بھی
استاد ہیں، امام مسلم کے بھی استاد ہیں۔ اور اس زمانے کے بہت سے محدثین خصوصاً امام احمد بن حنبل
ان کے تلامذہ میں شامل ہیں۔ ان کی جو احادیث تھیں ان کا بہت بڑا حصہ عبدالرزاق کے ذریعے آیا۔
ان میں وہ احادیث بھی شامل ہیں جو معمر بن راشد کے مجموعہ میں شامل تھیں۔

تدوین حدیث تیسری صدی ہجری میں

صحیح بخاری جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ تیسری صدی ہجری میں لکھی گئی، ایک
بزرگ نے صحیح بخاری کی ان روایات کو جمع کیا، وہ آج کل جرمنی میں رہتے ہیں، بہت فاضل انسان
ہیں۔ جرمنی میں اور اکیسویں صدی کے غالباً اس وقت فاضل ترین اہل علم میں سے ہیں۔ اگر مجھ سے
کہا جائے کہ اس دور کی فاضل ترین شخصیات کے نام بتاؤ تو میں سب سے پہلے ان کا نام
بتاؤں گا۔ ڈاکٹر فواد سزگین۔ انہوں نے چند جلدوں میں ایک کتاب لکھی ہے اور وہ جلد بہت
ضخیم، ہزارہا صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ تاریخ التراث العربی ہے۔ یہ جرمن زبان میں لکھی ہے جس میں
انہوں نے صدر اسلام سے لے کر چودہ صدیوں میں تمام اسلامی علوم وفنون کی تاریخ بیان کی ہے۔
قرآن، حدیث، تفسیر، فقہ، کلام، تصوف اور عربی ادب، غرض ہر فن کی تاریخ دی ہے۔ اس موضوع
پر اس سے زیادہ جامع کتاب کوئی نہیں ہے۔ اس کتاب کی چوتھی جلد پوری حدیث پر ہے۔ جو حدیث
کی تاریخ پر جتنا مواد اس کتاب میں ہے کسی اور کتاب میں نہیں ہے۔ بہت کم کتابوں میں ہے۔
ان کے پی ایچ ڈی کے تھیسس کا موضوع تھا کہ صحیح بخاری کے مآخذ کیا تھے۔ اس میں انہوں نے اور
بھی بہت سی مثالیں دیں اور عبدالرزاق کا بھی حوالہ دیا۔ انہوں نے لکھا کہ امام بخاری کی وہ روایات
جو انہوں نے عبدالرزاق سے لی ہیں وہ ساری کی ساری عبدالرزاق کی مصنف میں موجود ہیں۔ مصنف
عبدالرزاق کی وہ تمام احادیث جو معمر بن راشد سے لی ہیں وہ ساری کی ساری معمر کی جامع میں

موجود ہیں۔ انہوں نے ایک ایک کر کے بتایا کہ بغیر کسی حرف یا لفظ کے اختلاف کے، زیر زبر کا بھی اس میں فرق نہیں۔ لہٰذا یہ کہنا کہ یہ سارا ذخیرہ زبانی یادداشت کی بنیاد پر چل رہا تھا، یہ بالکل بے بنیاد ہے۔ انہوں نے اس پر پوری کتاب لکھی ہے۔ میں نے اصل کتاب نہیں پڑھی، وہ جرمن اور ترکی زبان میں ہے، لیکن ان کے خطوط دیکھے ہیں، اور خود ان سے ملاقات کا موقع ملا تو ان سے یہ باتیں معلوم ہوئیں۔

اس بات کی تردید کرنے کے لئے یہ چند مثالیں کافی ہیں کہ احادیث زبانی روایت ہو رہی تھیں، یعنی سنائی جاتی تھیں اور تیسری صدی ہجری کے محدثین نے ان کو جوں کا توں نقل کیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ جن کا تعلق تبع تابعین کے دوسرے طبقہ سے ہے، ان کے اپنے دست مبارک کی مرتب کی ہوئی دو مطبوعہ کتابیں آج موجود ہیں۔ ایک 'کتاب الزہد' ہے جس میں زہد سے متعلق احادیث ہیں اور دوسری 'کتاب الجہاد' ہے جس میں جہاد سے متعلق احادیث ہیں۔ امام مالکؒ جن کا تعلق بعض روایات کے مطابق صغار تابعین سے ہے اور اکثر روایات کے مطابق ان کا تعلق تبع تابعین کے دوسرے طبقہ سے ہے، ان کی کتاب موطا سے تو ہم سب واقف ہیں۔ جن حضرات نے تابعین میں سے کتابیں لکھیں اور وہ آج ہمارے پاس موجود ہیں ان میں حضرت ہشام بن عروہ بن زبیر بھی شامل ہیں جو حضرت عائشہؓ کے بھتیجے کے بیٹے تھے۔ حضرت عائشہؓ سے بہت سی روایات عروہ بن زبیر کرتے ہیں۔ ان کا مرتب کیا ہوا مجموعہ ترکی کے شہید علی کتب خانہ میں موجود ہے۔

حضرت ابو بردہ، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے پوتے تھے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کا مجموعہ ان کو ملا، وہ بہت سی کتابیں ان کو ملیں جن کی بنیاد پر وہ روایت کیا کرتے تھے۔ ان کا مرتب کیا ہوا مجموعہ دمشق کے کتب خانہ ظاہریہ میں موجود ہے۔ مسند حسن بن مالک، الجعدی فی الجعد، ابو یزید محمد بن مسلم الاسدی۔ یہ وہ چند صغار تابعین ہیں جن کے مجموعے آج کتب خانوں میں موجود ہیں۔

ان حضرات کے علاوہ تبع تابعین میں سے صغار تبع تابعین کا جو طبقہ یعنی مشہور محدثین سے پہلے کا طبقہ، ان کی جو کتابیں آج ہمارے پاس موجود ہیں، ان میں قدیم ترین کتب میں سے ایک ابو داؤد طیالسی کی مسند ہے جو مسند ابو داؤد طیالسی کے نام سے چھپ چکی ہے۔ ان کا انتقال 204

ایک ابھی آپ نے کہا تھا کہ قرآن تو سارا کا سارا قطعی الثبوت ہے لیکن دوسرے ہی ایک سوال کے جواب میں آپ نے کہا کہ قرآن کی بعض آیات ایسی ہیں جن کا ایک سے زیادہ مطلب نکل سکتا ہے۔

نہیں، آپ کو سمجھنے میں غلطی ہو رہی ہے۔ جہاں کسی ایک لفظ میں ایک سے زیادہ مفہوم نکل رہے ہوں، وہ ظنی الدلالت کہلاتے ہیں۔ میں نے دو چیزیں بتائی تھیں، ایک یہ کہ قرآن پاک سارا کا سارا قطعی الثبوت ہے اور اس کا قرآن ہونا ثابت ہے، اس باب میں تو پورا قرآن الحمد سے لے کر والناس تک ایک ایک حرف، ایک ایک شوشہ اور ایک ایک نقطہ قطعی الثبوت ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ احادیث کا بھی بہت بڑا حصہ قطعی الثبوت ہے اور اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہے۔ لیکن قرآن مجید کی بعض آیات ہیں جن کا ایک سے زیادہ مفہوم نکل سکتا ہے، وہ ظنی الدلالت ہیں، یعنی جن کے مفہوم میں ایک سے زائد معانی اور مذاہب کی گنجائش ہے اور علماء صحابہ یا علماء تفسیر نے ان کے ایک سے زائد مطالب قرار دیئے ہیں۔ وہ سارے مطالب ظنی الدلالت ہیں۔ ان میں سے ہر مطلب بیک وقت صحیح ہو سکتا ہے، اس لئے میں نے ظنی الدلالت لفظ بولا تھا، قطعی الثبوت کا نہیں بولا تھا۔ قرآن پاک پورے کا پورا قطعی الثبوت ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے احادیث کیوں روایت نہیں کی گئیں؟

میں یہ بات پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ احادیث کو بیان کرنے کا زیادہ موقع اس وقت ملا جب صحابہ کرام ایک ایک کر کے دنیا سے اٹھتے جا رہے تھے۔ صحابہ کرام کو آپس میں احادیث بیان کرنے کا بہت کم موقع ملتا تھا، اس لئے کہ انہیں اس کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ احادیث بیان کرنے کی زیادہ ضرورت اس وقت پیش آئی جب تابعین کی تعداد بڑھ گئی اور صحابہ کرام کی تعداد کم ہوتی گئی۔ حضرت فاطمۃ الزہرا کا انتقال رسول اللہ ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے چھ ماہ کے اندر اندر ہو گیا تھا اور ان چھ مہینوں میں انہوں نے جس پریشانی اور کرب میں اپنا وقت گزارا وہ سب کو معلوم ہے۔ وہ چھ ماہ کے اس زمانے میں جو اشعار وہ پڑھا کرتی تھیں ان میں سے ایک یہ تھا:

صبت علی مصائب لو انہا

صبت علی الایام صرن لیالیا

ان پر غیر معمولی مظالم ڈھائے اور ایسے ایسے مظالم کیے کہ ان کی تفصیل سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ نہ صرف اسلام پر قائم رہے، بلکہ علم دین حاصل کیا، علم حدیث میں تخصص پیدا کیا۔ سعودی عرب چلے گئے اور اب گزشتہ تقریباً پچیس تیس سال سے مدینہ منورہ میں قیام پذیر ہیں۔ سعودی عرب کی شہریت ان کو ملی ہوئی ہے۔ مدینہ منورہ کی جامعہ اسلامیہ میں حدیث کے استاذ ہیں اور حدیث پر انہوں نے بہت سی کتابیں لکھیں۔ انہوں نے علم حدیث پر جو کام کیا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ انہوں نے حضرت ابوہریرہؓ کی احادیث پر کام کیا۔

حضرت ابوہریرہؓ کی احادیث پر جو اعتراضات جوزف شخت اور گولڈزیہر نے اٹھائے تھے وہی اعتراضات مصر کے ایک منکر حدیث محمود ابو ریہ نے بھی اٹھائے ہیں۔ محمود ابو ریہ نے ایک کتاب لکھی 'ابو هريرة ومروياته'، ابوہریرہؓ اور ان کی روایات، اور اس میں وہی باتیں دہرائیں جو وہ لوگ کہتے تھے۔ ہمارے ہاں بھی کچھ لوگوں نے یہی باتیں بار بار دہرائی ہیں۔ ڈاکٹر ضیاء الرحمن اعظمی نے کمپیوٹر کی مدد سے حضرت ابوہریرہؓ کی ساری روایات کو جمع کیا۔ ان کے تمام طرق کو جمع کیا اور یہ ثابت کیا کہ جو متون ہیں وہ کل پندرہ سو کے قریب ہیں، باقی سارے طرق ہیں۔ پندرہ سو متون کا ایسے آدمی کے لیے یاد رکھنا جو لکھتا بھی ہو تین سال میں کوئی مشکل بات نہیں۔ روزانہ اوسطاً دو تین حدیثیں بھی نہیں بنتیں۔ تو ایک آدمی تین چار یا پانچ احادیث تو روزانہ لکھ سکتا ہے اور یاد بھی کر سکتا ہے اس میں ایسی کوئی بڑی بات نہیں۔ یہ ضیاء الرحمن اعظمی کی کتاب میں تمام تفصیل موجود ہے۔ اس کتاب کا نام بھی 'ابو هريرة ومروياته' ہے۔ مستشرقین اور منکرین حدیث کو چونکہ حضرت ابوہریرہؓ کے راستے سے حدیث پر اعتراض کا موقع ملتا ہے اس لیے حضرت ابوہریرہؓ کو زیادہ نشانہ بناتے ہیں۔

احادیث کے ضعف کے بھی درجے ہوتے ہیں؟

یقیناً ہوتے ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ضعیف احادیث کی بیالیس قسمیں ہیں جن میں سے چند میں پہلے بیان کر چکا ہوں، ان سب کے الگ الگ درجات ہیں۔ ضعیف احادیث کو بالکل مسترد نہیں کیا جاتا۔ بعض شرائط کے ساتھ قبول کیا جاتا ہے لیکن اس قبولیت کا دارومدار ضعف پر ہے۔ زیادہ ضعف ہو تو قبول نہیں کی جاتی، جو کم ضعف والی ہو اس کو پہلے دیکھا جاتا ہے کہ آیا دوسری ضعیف احادیث سے اس کی تائید ہوتی ہے؟ اگر دوسری ضعیف احادیث سے تائید ہوتی ہو تو

آٹھواں خطبہ

رحلۃ اور محدثین کی خدمات

منگل، 14 اپریل 2003ء

رحلہ اور محدثین کی خدمات

آج کی گفتگو کا عنوان ہے: رحلہ یعنی طلب الحدیث یعنی علم حدیث کے حصول اور تدوین کی غرض سے سفر۔ یوں تو حصول علم کے لئے دور دراز علاقوں کا سفر کرنا مسلمانوں کی روایت کا ہمیشہ ہی ایک اہم حصہ رہا، لیکن علم حدیث کے حصول کی خاطر سفر کا ایک منفرد مقام ہے۔ محدثین کرام نے علم حدیث کے حصول، احادیث کی تحقیق، راویوں کی جرح و تعدیل اور رجال کے بارے میں معلومات جمع کرنے کی خاطر جو طویل و مشقت انگیز سفر اختیار فرمائے ان سب کی داستان نہ صرف دلچسپ اور حیرت انگیز ہے بلکہ علم حدیث کی تاریخ کا ایک بڑا نمایاں اور منفرد باب ہے۔ محدثین میں جس شخصیت نے جتنے زیادہ سفر کئے ہوں، تذکرہ حدیث اور تذکرہ محدثین میں اتنی ہی احترام سے اس محدث کا ذکر کیا جاتا ہے۔ محدثین کے تذکرے میں رحّال اور جوّال، بہت زیادہ سفر کرنے والا اور جوّال، بہت زیادہ گھومنے والا۔ یہ صفات بہت کثرت سے نظر آتی ہیں۔ بعض محدثین کے بارے میں تذکرہ نگار لکھتے ہیں۔ طاف البلاد انہوں نے مختلف شہروں کا چکر لگایا تھا۔ جال فی البلاد انہوں نے چاروں طرف عالم میں سفر کئے تھے۔ انہوں نے مشرق و مغرب کے شہر اور علاقے علم حدیث کی تلاش میں چھان مارے۔ یہ عبارتیں اور الفاظ تذکرہ محدثین میں عام ہیں۔

القاب محدثین

علم حدیث میں محدثین کے لئے جو القاب استعمال ہوتے ہیں ان میں سے ایک لقب رحال بھی ہے۔ مثال کے طور پر حدیث کی کسی کتاب میں آپ کو ملے گا: حدثنا یحییٰ بن سعید القطان کے شروع

سے پکارا کرتے اور کہتے کہ اس کو لاؤ۔ جب چوتھی پرچی پر یہ مرحلہ آیا تو ابو نعیم مسکرائے اور کہا کہ تم امتحان لینا چاہتے ہو، پھر کہا کہ اے اس دوست نے تو یہ شرارت میرے ساتھ نہیں کی۔ تم کیوں ایسا کر رہے ہو۔ یعنی ان کو اپنی روایت اور حافظہ پر اتنا اعتماد تھا کہ ایک دو مرتبہ تک میں ان کو اندازہ ہو گیا کہ یہ تحقیق غلطی نہیں بلکہ آزمانا مقصود ہے۔ یہ سن کر وہاں پر لوگوں، امام احمد اور یحییٰ بن معین نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ان سے اجازت لے کر واپس آ گئے۔ امام احمد نے کہا کہ میں نے آپ سے نہیں کہا تھا کہ یہ بہت قابل اعتماد ہیں اور ان کو چیک کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس قدر تحقیق کے بعد یحییٰ بن معین نے اپنی کتاب میں درج کیا کہ ابو نعیم مستند راوی ہیں۔

رحلہ

رحلہ ایک اصطلاح ہے جس کے لفظی معنی تو سفر کے ہیں لیکن یہاں علم حدیث کی اصطلاح میں علم حدیث حاصل کرنے کے لئے سفر کرنا رحلہ کہلاتا ہے۔ رحال ان محدثین کو کہتے ہیں جو بہت زیادہ سفر کرتے ہیں اور رحلہ وہ محدث جس کے پاس سفر کر کے جایا جائے۔ بعض حضرات نے قرآن مجید میں سورۃ توبہ میں جو آیت آئی ہے السائحون یعنی سفر کرنے والے سے طلب علم کا سفر مراد لیا ہے۔ اس لفظ کے بارے میں بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہاں سفر کرنے والے سے مراد وہ سفر کرنے والے ہیں جو کسی نیک مقصد کی خاطر سفر کریں۔ مثلاً جہاد کے لئے، دعوت دین کے لئے یا پھر مثلاً طلب علم کے لئے۔ اور یہ آخری قول جن لوگوں کا ہے ان میں حضرت عکرمہ (حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے شاگرد) بھی شامل ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ السائحون سے مراد حدیث کے طلبہ ہیں۔ گویا حدیث کے طلباء اس سے مراد ہوں۔ جیسے کہ حضرت عکرمہ کی رائے ہے تو طلب حدیث کے لئے گھر سے نکلنا اور سفر اختیار کرنا قرآن مجید سے براہ راست بھی ثابت ہے۔

لیکن بالواسطہ طور پر قرآن مجید کی ایک آیت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شریعت میں طلب علم کے لئے گھر سے نکلنے اور سفر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ سورۃ توبہ کی آیت ہے: فلولا نفر من كل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا في الدين ولينذروا قومهم إذا رجعوا إليهم

اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان صرف دو واسطے ہیں۔ مالک عن نافع عن ابن عمرؓ۔ امام بخاری کی عالی اسناد کے بارے میں ایک دو روز قبل مجھ سے غلطی ہوگئی تھی۔ میں اس کی اصلاح کر دیتا ہوں۔ آپ بھی اپنی یادداشتوں میں اصلاح کر لیں۔ امام بخاری کے ہاں جو سندیں سب سے اعلیٰ ہیں وہ ثلاثیات کہلاتی ہیں جن میں امام بخاری اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان تین واسطے ہیں۔ میں نے غالباً یہ کہا تھا کہ ثلاثیات کا بیشتر حصہ علی بن مدینی سے منقول ہے۔ یہ غلطی ہوئی۔ علی بن مدینی سے نہیں، بلکہ امام بخاری کی بیشتر ثلاثیات مکی بن ابراہیم سے منقول ہیں۔ مکی بن ابراہیم اور علی بن مدینی دونوں امام بخاری کے اساتذہ ہیں۔ لیکن ثلاثیات کی بڑی تعداد مکی بن ابراہیم سے منقول ہے۔ علی بن مدینی سے منقول نہیں ہے۔

اس علو اسناد کے بارے میں امام احمد کا ارشاد ہے کہ "طلب علو الاسناد من الدین" کہ علو اسناد کو حاصل کرنا بھی دین کا ایک حصہ ہے۔ یہ چیز دین کا حصہ اس لئے ہے کہ سند میں اور واسطے جتنے کم ہوں گے بات اتنی یقینی ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات جتنے یقینی انداز میں کسی تک پہنچیں گے اتنا ہی زیادہ اس پر عمل درآمد کے لئے جذبہ پیدا ہوگا۔ جتنا عمل درآمد کا جذبہ پیدا ہوگا اتنی ہی دقت نظر کے ساتھ انسان عمل کرے گا۔ اس لئے علو اسناد کا حصول بھی دین کا ایک حصہ ہے۔ جب علو اسناد کے لئے انسان سفر اختیار کرے گا تو وہ بھی دین کا ایک حصہ ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے اس کا اجر ملے گا۔

آپ نے مشہور بزرگ اور صوفی ابراہیم بن ادہمؒ کا قصہ سنا ہوگا۔ ان کا زمانہ وہی ہے جب محدثین کرام طویل اور مسلسل سفر اختیار فرمایا کرتے تھے اور علم حدیث کے بارے میں معلومات جمع کیا کرتے تھے۔ ایک موقع پر حضرت ابراہیم بن ادہم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت سے جو بلائیں اور آزمائشیں اٹھائی ہیں اس کی ایک وجہ محدثین کرام کے طویل سفر بھی ہیں، یعنی محدثین جو طویل سفر اختیار فرماتے ہیں اور جو مشقت برداشت کرتے ہیں اس کی برکت سے اور اس کی پسندیدگی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس امت کی بہت سی بلائیں ہٹا دی ہیں اور ختم کر دی ہیں۔

علم حدیث کے لئے صحابہؓ کے سفر

علم حدیث کے لئے سفر کرنے کا طریقہ سب سے پہلے خود صحابہ کرامؓ نے شروع کیا۔ صحابہ کرامؓ نے کئی مواقع پر طویل سفر اختیار فرمائے جن کا مقصد یہ تھا کہ حدیث کے بارے میں جو معلومات کسی اور صحابیؓ کے پاس ہیں ان کو حاصل کیا جائے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جو عبادلہ اربعہ میں سب سے پہلے درجہ پر فائز ہیں۔ یعنی عبداللہ نام کے چار مشہور صحابیوں میں جن کا درجہ سب سے پہلا ہے، اور صحابہ کرامؓ میں فقہ اور افتاء میں سب سے نمایاں صحابہ میں سے تھے۔ ان کا ارشاد ہے کہ قرآن مجید کی کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس کے بارے میں مجھے یہ معلوم نہ ہو کہ یہ کب نازل ہوئی ہے اور کہاں نازل ہوئی ہے۔ میں ہر آیت کے بارے میں جانتا ہوں، اور اسی طرح ہر سورۃ کے بارے میں مجھے علم ہے۔ اگر کوئی آیت ایسی ہوتی جس کے بارے میں مجھ کو معلوم نہ ہو کہ کہاں نازل ہوئی اور کب نازل ہوئی، یا جس کے بارے میں مجھ سے زیادہ کوئی جاننے والا موجود ہوتا تو میں اس کے پاس سفر کرکے جاتا اور جہاں بھی سواریاں اور راستے پہنچا سکتی ہیں میں وہاں پہنچتا اور اس آیت کے بارے میں معلومات حاصل کرتا۔ یہ متفق علیہ حدیث ہے اور بخاری و مسلم دونوں نے اس کو نقل کیا ہے۔

حضرت جابر بن عبداللہؓ ایک مشہور صحابی ہیں۔ ان کو خبر ملی کہ رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابی شام میں مقیم ہیں جن کا نام عبداللہ بن انیسؓ ہے۔ ان کے پاس کوئی ایسی حدیث ہے جو جابر بن عبداللہ نے نہیں سنی ہے۔ جابر بن عبداللہ نے سفر کے سامان اور زاد راہ کا انتظام کیا، اونٹ خریدا اور ایک مہینے کا سفر کرکے شام پہنچے۔ دمشق کے عبداللہ بن انیس کے مکان کا پتہ کیا۔ دروازے پر کھٹکھٹایا، ملازم نکلا، انہوں نے اندر جا کر بتایا کہ کوئی بدو آیا ہے، پرانے کپڑے پہنے ہوئے ہے، گرد آلود ہے، معلوم ہوتا ہے کہ دور سے سفر کرکے آیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن انیس نے کہا کہ جاکر نام معلوم کرو۔ انہوں نے بتایا کہ جابر۔ عبداللہ بن انیسؓ نے ملازم سے مزید وضاحت کروائی کہ کون جابر؟ باہر سے جواب لایا گیا کہ جابر بن عبداللہؓ۔ یہ سنتے ہی عبداللہ بن انیسؓ خود بھاگے۔ اندر سے دوڑتے ہوئے نکلے، حضرت جابر کو گلے لگایا، چمٹالیا، بوسہ دیا اور پوچھا کہ کیسے تشریف لائے؟ انہوں نے کہا کہ مجھے معلوم ہوا تھا کہ فلاں حدیث کے بارے میں پتہ چلا

تھا کہ وہ آپ کے پاس ہے۔ اس کے الفاظ کیا ہیں اور آپ نے رسول اللہ ﷺ سے کن الفاظ میں اس حدیث کو سنا تھا؟ انہوں نے دہرایا کہ ان الفاظ میں سنا تھا۔ انہوں نے کہا کہ میں صرف اس غرض سے آیا تھا، اس کے علاوہ کوئی غرض نہیں ہے۔ اونٹ کی باگ موڑ دی اور واپس مدینہ منورہ کی طرف چل پڑے۔

حضرت جابر بن عبداللہؓ کو ایک مرتبہ ایک اور حدیث کے حصول کے لئے مصر جانے کا موقع ملا۔ مصر میں ایک صحابی کے بارے میں انہوں نے سنا کہ ان صحابی کے علم میں کوئی حدیث ہے اور ان کے علاوہ کوئی اور صحابیؓ اس وقت ایسے نہیں ہیں جو اس حدیث کا علم رکھتے ہوں۔ وہ اونٹ پر سوار ہوئے اور مدینہ منورہ سے سفر کر کے مصر پہنچے۔ وہ صحابیؓ مصر کے گورنر تھے۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ ملازم نکلا تو بولے کہ گورنر سے کہو کہ باہر آئے۔ ملازم کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ کون شخص ہے، اس لئے کہ اس طرح تو کوئی نہیں کہتا۔ لوگ تو درخواست لے کر آتے ہیں کہ میں گورنر سے ملنا چاہتا ہوں، کس وقت ملاقات کا موقع مل سکتا ہے وغیرہ۔ یہ کون شخص ہے جو گورنر سے باہر آنے کا کہہ رہا ہے۔ اس نے جا کر کہا کہ باہر ایک بدو آیا ہے اور کہتا ہے کہ گورنر سے کہو کہ باہر آئے۔ وہ بھی اپنے ساتھیوں کے مزاج شناس تھے، سمجھ گئے کہ کوئی صحابیؓ ہوں گے۔ کہا کہ جا کر نام پوچھ کر آؤ۔ انہوں نے کہا جابر۔ انہوں نے کہا کہ جا کر پوچھو کیا جابر بن عبداللہ ہیں؟ دوڑتے ہوئے باہر آئے، گلے ملے اور پوچھا کیسے آنا ہوا۔ انہوں نے کہا کہ آپ کے پاس ایک حدیث ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ من ستر عورۃ مسلم فکانما احیا موؤدۃ۔ یعنی جس نے کسی مسلمان کی کسی کمزوری کو چھپایا وہ ایسا ہی ہے جیسا کسی نے زندہ درگور کی جانے والی بچی کو زندگی بخشی۔ کسی مسلمان کی کسی کمزوری کو چھپانا ایسا ہی کار ثواب ہے جیسا کسی لڑکی کی جان کو بچا لینا جس کو اس کے رشتہ دار زندہ درگور کرنے کے لئے آمادہ ہوں۔ گورنر صاحب نے تصدیق کی اور دوبارہ حدیث کے الفاظ دہرا دیئے۔ انہوں نے یہ الفاظ سنے، نعرہ تکبیر بلند کیا، اللہ اکبر کہا اور واپس تشریف لے گئے۔

حضرت ابو ایوب انصاریؓ کو پتہ چلا کہ یہی حدیث دوسرے الفاظ میں ایک صحابیؓ کے پاس ہے۔ انہوں نے بھی مدینہ منورہ سے مصر کا سفر اختیار کیا۔ ان صحابیؓ کے مکان پر دستک دی اور یہ حدیث ان الفاظ میں سنی کہ من ستر مومنا فی الدنیا ستره الله یوم القیامة۔ جو شخص اس دنیا میں کسی مومن کی پردہ پوشی کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی کرے گا۔ انہوں

نے اللہ اکبر کہا، الحمد للہ کہا اور اپنی سواری کی باگ موڑ کر واپس تشریف لے گئے۔

ایک صحابی جن کا نام عبداللہ بن عدیؓ ہے۔ ان کا تعلق رسول اللہ ﷺ کے قبیلہ بنی عبد مناف سے تھا۔ ان کو پتہ چلا کہ حضرت علیؓ کے پاس کوئی حدیث ہے جو ان تک نہیں پہنچی۔ یہ مدینہ منورہ سے چلے، کوفہ پہنچے، حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان سے حدیث سنی، سیکھی، یاد کی، نوٹ کر لی اور واپس چلے گئے۔

حضرت جابر بن عبداللہؓ نے دو سفر کئے۔ ایک شام کا اور ایک مصر کا۔ دونوں سفروں میں صرف دو احادیث سن کر واپس آ گئے۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ نے بھی ایک سفر مصر کے لئے اختیار کیا۔ حضرت عقبہ بن عامر الجہنی جو مصر میں تھے، ان سے علم حدیث کے بارے میں کوئی روایت معلوم کی اور واپس آ گئے۔ صحابہ کرامؓ کے اور بھی واقعات ہیں جن میں انہوں نے کسی حدیث کی تحقیق کے لئے سفر اختیار کئے۔ ان چند واقعات سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ انہوں نے ایک ایک روایت کی تحقیق کی خاطر کتنے سفر اختیار کئے۔

علم حدیث کے لئے تابعین کے سفر

جب تابعین کا زمانہ آیا تو یہ روایت اور بھی زیادہ عام ہو گئی۔ اتنی عام ہو گئی کہ ایک ایک لفظ اور ایک ایک بات سیکھنے کے لئے تابعین طویل سفر اختیار فرمایا کرتے تھے۔ امام شعبی جن کی وفات 104 ھ میں ہوئی اور وہ امام ابوحنیفہ کے اساتذہ میں سے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص شام کے انتہائی شمالی علاقہ سے سفر کرے اور یمن کے انتہائی جنوبی علاقہ تک جائے اور کسی حدیث کا ایک لفظ یاد کر کے واپس آ جائے، سمعت کلمۃ کوئی ایک کلمہ سن کر آ جائے، تسمع ما یستقبلہ، جو مستقبل میں اس کے لئے مفید اور کارآمد ہو تو میرا یہ خیال ہے کہ اس کا یہ سفر ضائع نہیں ہوا۔ یہ سفر کامیاب اور کامران و مفید ہے۔

حضرت علقمہ اور اسود دو مشہور اور بڑے تابعین میں سے ہیں اور ان کا درجہ تفقہ میں اور شریعت کے فہم اور بصیرت میں بہت اونچا مانا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ امام ابوحنیفہ نے ایک بار ارشاد فرمایا کہ اگر شرف صحابیت اور احترام صحابیت مانع نہ ہوتا تو میں یہ کہتا کہ علقمہ عبداللہ بن عمرؓ سے بڑھ کر ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں کوفہ میں تھے۔ علقمہ اور اسود بھی دونوں حضرت

نیکیاں لکھ دیتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا کہ سننے والے سے غلطی ہوئی۔ صحیح الفاظ یہ نہیں ہیں۔ اب ان کو بڑی مایوسی ہوئی کہ میرے پاس ایک بہت حوصلہ افزا اور ایمان افروز حدیث تھی جس کی تصدیق حضرت ابو ہریرہؓ نے نہیں کی۔ فوراً ان کے دل میں مایوسی کی ایک کیفیت طاری ہوگئی۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا: اصل الفاظ یہ ہیں: ان اللہ لیعطی لعبدہ المومن بالحسنۃ الواحدۃ الفی الف حسنۃ ' اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندے کو ایک نیکی کے مقابلہ میں بیس لاکھ نیکیاں دیتے ہیں۔ اب انہوں نے حیرت سے دیکھا کہ ایک نیکی کے مقابلہ میں بیس لاکھ نیکیاں کیسے ہو سکتی ہیں۔ اس پر حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ قرآن مجید میں آیا ہے کہ جو لوگ اللہ کو قرض دیں گے، قرضا حسناً فیضعفہ لہ اضعافا کثیرۃ تو اللہ تعالیٰ ان کے لئے اس کو بہت گنا بڑھا دیں گے۔ تو انہوں نے کہا کہ ہمارے تمہارے لئے دس بیس لاکھ تھوڑی رقم ہے۔ اللہ کے لئے تو اضعافا کثیرۃ ہے۔ بہت گنا۔ تو اللہ تعالیٰ کے لئے دس لاکھ بیس لاکھ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ وہ اس اضافہ اور ترمیم کے ساتھ خوشی خوشی واپس آئے اور یہ حدیث انہوں نے ایک واسطہ کم کرکے براہ راست صحابیِ رسولؐ سے سن لی۔

ایک تابعی تھے ابن الدیلمی، فلسطین میں رہتے تھے۔ ان کو پتہ چلا کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ، جو صحیفہ صادقہ کے مصنف ہیں، مدینہ منورہ آئے ہوئے ہیں اور ان کے پاس ایک ایسی روایت ہے جس سے شراب خور کے بارے میں کوئی وعید ثابت ہوتی ہے۔ وہ فلسطین سے سفر کرکے مدینہ منورہ پہنچے۔ مدینہ میں لوگوں نے بتایا کہ وہ تو مکہ مکرمہ چلے گئے ہیں۔ وہ سفر کرکے مکہ مکرمہ چلے گئے۔ وہاں پہنچے تو کسی نے بتایا کہ حضرت عبداللہ طائف میں اپنے باغ کی دیکھ بھال کے لئے گئے ہیں اور وہیں پر مقیم ہیں۔ چنانچہ یہ طائف پہنچے۔ اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے پوچھا کہ کیا آپ نے رسول اللہ ﷺ سے کوئی حدیث شراب خور کی وعید کے بارے میں سنی ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ سمعت رسول اللہ ﷺ یقول۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: من شرب الخمر، جس نے شراب پی، لم تقبل لہ صلوٰۃ اربعین صباحاً، تو چالیس دن تک اس کی نماز قبول نہیں ہوگی۔

ایک صاحب امام اوزاعی کے پاس علم حدیث سیکھنے کے لئے تشریف لائے۔ چار پانچ دن امام اوزاعی کے پاس رہے۔ صبح سویرے امام کی خدمت میں حاضر ہو جاتے تھے اور رات تک

ان کی خدمت میں رہتے تھے۔ امام اوزاعی ایک دن میں ایک ہی حدیث سنانے پر اکتفا کرتے
تھے۔ چار پانچ دن کے بعد انہوں نے قدرے ناگواری سے عرض کیا کہ میں چار دن سے آپ کے
ساتھ ہوں اور آپ نے چار دنوں میں مجھے چار ہی حدیثیں سنائی ہیں۔ امام اوزاعی غالباً یہی بات
ان سے کہلوانا چاہتے تھے۔ انہوں نے حضرت جابرؓ کا وہ قصہ سنایا جس میں انہوں نے ایک اونٹ
خریدا اور پہلے دمشق جا کر ایک روایت کی تصدیق (confirmation) کی۔ پھر ایک دوسرے
موقع پر سفر کر کے مصر گئے اور وہاں ایک دوسری روایت جا کر verify کرائی۔ انہوں نے کہا کہ
صحابہ کرامؓ ایک ایک روایت کے حصول کے لئے نہیں، کیونکہ روایت تو ان کو پہلے سے حاصل ہوتی
تھی، بلکہ صحابیؓ سے براہ راست سننے کے لئے ایک ایک اور دو دو مہینے کا سفر اختیار کیا کرتے تھے۔
تم چار دن میں چار احادیث کے ملنے پر خوش ہو۔ غالباً اس کام کی اہمیت ان کو جتانا مقصود تھا۔
اس لئے انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا اور ان کو یہ درس دیا۔

ایک اور تابعی ہیں حضرت ابو علی بغدادی الاسعدی۔ ان کو یہ پتہ چلا کہ خراسان میں کوئی
تابعی ہیں۔ خراسان بہت بڑا صوبہ سمجھا جاتا تھا جس کی حدود موجودہ ایران میں مشہد سے لے
کر پورے افغانستان کے شمالی حصہ اور وسط ایشیا کے جنوبی حصہ سمیت موجودہ تاجکستان کی سرحد تک
پھیلی ہوئی تھیں۔ اس پورے علاقہ کو خراسان کہا جاتا تھا۔ آج وسط ایشیا میں جو علاقہ تاجکستان ہے یہ
خراسان کہلاتا تھا۔ امام ابو علی بغدادی کو یہ پتہ چلا کہ خراسان میں کسی صاحب کے پاس ایک
حدیث ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے حضرت معاویہؓ کو ایک خط لکھا تھا
اور اس میں یہ لکھا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ دعا تلقین کی ہے کہ لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ، لہ الملک
ولہ الحمد وھو علی کل شیء قدیر، اللھم لا مانع لما اعطیت ولا معطی لما منعت و
لا ینفع ذا الجد منک الجد۔ انہوں نے کہا کہ یہ دعا رسول اللہ ﷺ نے مجھے سکھائی تھی، تم بھی پڑھا
کرو۔ حضرت معاویہؓ سے پھر بقیہ تابعین نے اس دعا کو یاد کیا۔ یہ روایت ان تابعی سے براہ
راست سننے کی غرض سے انہوں نے بغداد سے خراسان کا طویل سفر اختیار کیا۔

ایسی روایات بھی ہیں جن میں دو صحابی ایک دوسرے سے روایت کرتے ہیں۔ عموماً
ایک صحابی رسول اللہ ﷺ سے روایت کر کے تابعین کو بتاتے ہیں، لیکن ایسی مثالیں بھی ہیں کہ
ایک صحابی نے دوسرے صحابی سے حدیث روایت کی ہے اور یہ حدیث اس کی ایک مثال ہے کہ

حضرت معاویہ حضرت مغیرہ بن شعبہ سے روایت کرتے ہیں۔ اس حدیث کو براہ راست ان تابعی کی زبان سے سننے کے لئے جنہوں نے حضرت معاویہؓ کی زبان مبارک سے سنا تھا انہوں نے بغداد سے خراسان کا سفر اختیار کیا اور خراسان جا کر اس حدیث کا ایک واسطہ کم ہو گیا اور یہ حدیث انہوں نے اختیار کی۔

آپ نے حضرت زر بن حبیش کا نام سنا ہوگا۔ زر بن حبیش ایک مشہور تابعی ہیں۔ قرات کے فن میں بہت بڑے امام ہیں۔ حضرت اُبی بن کعبؓ کے خصوصی تلامذہ میں سے ہیں۔ حضرت اُبی بن کعبؓ وہ صحابی ہیں جن کو حضورؐ نے یہ اعزاز عطا فرمایا کہ آپؐ کے بارے میں یہ گواہی دی کہ اقرءھم ابی۔ میرے صحابہ میں سب سے اچھے قاری اور سب سے اچھا قرآن پڑھنے والے ابی بن کعبؓ ہیں۔ حضرت ابی بن کعبؓ قرآن فہمی اور قرآن خوانی میں سب صحابہ کرامؓ میں ممتاز تھے۔ جتنے قرات اور تجوید کے سلسلے ہیں وہ سارے کے سارے یا اکثر و بیشتر حضرت ابی بن کعبؓ تک پہنچتے ہیں۔ جو بڑے بڑے قراء ہیں، جو قراء سبعہ کہلاتے ہیں ان میں سے بیشتر کی روایت حضرت ابی بن کعب تک پہنچتی ہے۔ ان کے شاگردوں میں بڑا نمایاں نام حضرت زر بن حبیش کا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں حضرت عثمان بن عفانؓ کی خلافت کے زمانے میں کوفہ سے مدینہ منورہ آیا اور اس پورے سفر کا مقصد صرف حضرت ابی بن کعبؓ سے ملاقات اور دوسرے صحابہ کرامؓ کی زیارت تھی۔ وما حملنی علی الوفادة اور مجھے اس لمبے سفر پر آمادہ کیا الا لقی ابی بن کعب ابی بن کعب کی ملاقات نے۔ اس کے علاوہ میرا کوئی اور مقصد نہیں تھا۔

حضرت ابوالعالیہ جن کا ابھی میں نے ذکر کیا، وہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ یعنی تابعی حضرات کسی شیخ حدیث سے ملاقات کے لئے کئی کئی روز کا سفر کرکے پہنچتے تھے، یا تو کسی حدیث کی تحقیق کی خاطر، یا سابقہ حدیث کی سند کو مزید بہتر بنانے کی خاطر، یا ایک نئے طریقے کا اضافہ کرنے کی خاطر، یا کسی راوی کے کردار اور حافظہ کی تحقیق کی خاطر۔ سفر کرنے کے بعد جب ہم منزل پر پہنچتے تھے تو سب سے پہلے ہم یہ دیکھتے تھے کہ ان کے ہاں نماز کا اہتمام کتنا ہے۔ اگر وہ نماز کا اہتمام مکمل طور پر کرتے تھے تو ہم وہاں ٹھہر کر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور حدیث کے بارے میں جو کچھ ہوتا تھا وہ سیکھ لیتے تھے۔ اور اگر یہ دیکھتے تھے کہ نماز میں کمزوری پائی جاتی ہے تو ہم الٹے پاؤں واپس آجاتے تھے اور ان سے نہیں ملتے تھے اور ہمارا یہ خیال تھا کہ جو نماز سے

بارے میں اہتمام نہیں کرتا اور نمازوں کو ضائع کرتا ہے وہ باقی چیزوں کو بھی ضائع کرتا ہوگا۔

ایک اور تابعی ہیں جن کا شمار نوجوان صغار تابعین میں ہے، زید بن الحباب، یا تبع تابعین میں سے ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ مجھے ایک روایت ملی جس کے بارے میں پتہ چلا کہ اس کو تین بزرگوں نے روایت کیا ہے۔ ایک روایت کے راوی کوفہ میں، دوسری روایت کے راوی مدینہ میں اور تیسری روایت کے راوی مصر میں ہیں۔ میں پہلے کوفہ گیا۔ وہاں شیخ سے مل کر اس کی تصدیق کی اور یہ روایت لی یعنی حاصل کیا۔ اس کے بعد دوسرا سفر میں نے مدینہ منورہ کا اختیار کیا۔ مدینہ منورہ میں جو شیخ تھے ان سے اس روایت کو لیا اور وہاں سے مصر پہنچا تو معلوم ہوا کہ جن سے ملنے آیا ہوں ان سے ملاقات کے اوقات مقرر ہیں اور ان مقررہ اوقات کے علاوہ وہ کسی سے نہیں ملتے۔ فجلست على بابه، میں ان کے دروازے پر بیٹھ گیا۔ جب وہ باہر نکلے تو انہوں نے دیکھا کہ ایک بدو دروازے پر بیٹھا ہوا ہے۔ پوچھا کس لئے آئے ہو۔ بتایا کہ اس غرض سے آیا ہوں۔ انہوں نے حدیث پڑھ کر بتائی اور حدیث کے الفاظ کو verify کیا کہ یہی الفاظ تھے: فرق ما بين صيامنا و صيام اهل الكتاب اكلة السحر، کہ ہمارے اور اہل کتاب کے روزوں میں ایک اہم فرق ہے وہ سحری کا ہے۔ اہل کتاب جب روزہ رکھتے ہیں تو سحری نہیں کھاتے اور ہم جب روزہ رکھتے ہیں تو سحری کھا کر رکھتے ہیں۔

اس روایت کے ان الفاظ کے تحقق اور تیقن کے لئے انہوں نے تین بڑے شہروں کا سفر اختیار کیا۔ اس میں کتنا وقت لگا ہوگا، کتنے پیسے لگے ہوں گے، کتنے وسائل خرچ ہوئے ہوں گے، اس کا ہم صرف اندازہ ہی کر سکتے ہیں۔ یقین سے تو نہیں کہہ سکتے۔ افسوس کہ کسی محدث نے اپنا حساب کتاب لکھ کے نہیں چھوڑا، ورنہ ہمیں شاید یہ بھی پتہ چلتا کہ راستے میں کتنا خرچ ہوا، کتنی منزلیں آئیں اور کہاں کہاں ٹھہرے۔ وہ اس کام کو صرف اللہ کے لئے کرنا چاہتے تھے، اس لئے انہوں نے شاید اپنا حساب نہیں لکھا۔ اگر حساب کسی نے لکھا ہوتا تو آج شاید اس بحث کے سوال کا جواب بھی مل جاتا جنہوں نے پوچھا تھا کہ ان کے اخراجات کیسے اور کہاں سے پورے ہوتے تھے۔

سفر اختیار کیا جائے۔ یہ حدیث رسول ﷺ کے ادب و احترام کے خلاف سمجھا گیا کہ قریب کے محدثین وغیرہ کو نظر انداز کر کے دوسرے کسی علاقے میں دستیاب ذخیرہ کو حاصل کرنے کے لئے سفر شروع کیا جائے۔

(۲) دوسرا ادب یہ تھا کہ جب اپنے علاقے میں حدیث کے ذخیرے اور حدیث کے مشائخ سے پورے کا پورا علم حاصل کر لیا جائے اور دوسرے کسی علاقے کا سفر اختیار کیا جائے تو جگہ کے تعین اور ترتیب میں احتیاط سے کام لیا جائے۔ یہ دیکھا جائے کہ زیادہ بڑا ذخیرہ کہاں دستیاب ہے۔ مشائخ کس علاقہ میں بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ حدیث کے کس فن کے ماہرین کس علاقے کے مشائخ کے پاس زیادہ ہیں۔ پہلے ان کا انتخاب کیا جائے۔ اس کے بعد جس شیخ کے علاقہ میں حدیث کی روایات جتنی زیادہ ہوں اس علاقہ کا سفر پہلے اختیار کیا جائے۔

(۳) تیسرا ادب بڑا دلچسپ اور اہم ہے کہ جب سفر اختیار کیا جائے اور کسی علاقہ میں جا کر وہاں کے مشائخ کی خدمت میں حاضری دی جائے تو تکثیر روایات پر زور دیا جائے۔ تکثیر مشائخ پر زور نہ دیا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس راوی کے اساتذہ کی تعداد زیادہ ہوتی تھی اس کو زیادہ پذیرائی ملتی تھی اور اس کی شہرت زیادہ ہوتی تھی کہ فلاں نے اتنے بڑے اساتذہ سے علم سیکھا ہے، فلاں محدث نے دو ہزار اساتذہ سے علم سیکھا ہے۔ تو یہ شہرت اپنے بارے میں ایک خوش گمانی اور نفس میں ایک جذبہ خود پسندی پیدا کرتی تھی۔ یہ اخلاص کے خلاف تھا اور تقویٰ کے خلاف تھا جو ایک ایسے صاحب علم میں ہونا چاہئے جو صرف اللہ کی رضا کی خاطر علم دین کو حاصل کرتا ہو اور اس کا مقصد دنیاوی شہرت حاصل کرنا نہ ہو۔ اس لئے روایات کی تعداد بڑھانے پر زور دیا گیا۔ بہ نسبت شیوخ کی تعداد بڑھانے کے۔ مثلاً اگر ایک حدیث کے بارے میں بیس روایات ایک شیخ کے پاس ہیں تو بہتر یہ ہے کہ بیس روایات اس شیخ سے حاصل کی جائیں بہ نسبت اس کے کہ بیس شیوخ سے ایک ایک روایت حاصل کی جائے۔

(۴) چوتھا ادب یہ تھا کہ روایات جب حاصل ہو جائیں تو ان کا مذاکرہ اس علاقے کے اہل علم کے ساتھ مسلسل کیا جائے۔ جو احادیث آپ نے لکھی ہیں اور جس راوی سے سنی ہیں تو اب دوسرے راوی کے ساتھ ان کا مذاکرہ کریں۔ وہ آپ کو پڑھ کر سنائیں، آپ ان کو پڑھ کر سنائیں۔ جو مطالب انہوں نے سمجھا وہ آپ سے بیان کریں اور جو آپ نے سمجھا ہے آپ ان سے

بیان کریں۔ راویوں کے بارے میں جو معلومات آپ کو ملی ہیں وہ آپ ان سے بیان کریں اور جو
ان کو ملی ہیں وہ آپ سے بیان کریں تاکہ ایک دوسرے کا علم پختہ ہو اور اس میں مزید علم اور نکتے
سامنے آئیں اور دونوں کا علم کمال تک پہنچ جائے۔

(۵) پانچواں ادب یہ تھا کہ جب سفر اختیار کیا جائے تو شریعت میں سفر کے جو آداب
بیان ہوئے ہیں ان کا لحاظ رکھا جائے۔ سفر کے بہت سے آداب ہیں۔ جن کا علم حدیث کے موضوع
سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن ان آداب کی پابندی جب ہر سفر میں ضروری ہے تو طلب
حدیث کے لئے کئے جانے والے سفر میں بطریق اولیٰ ان آداب کی پابندی ہونی چاہئے۔ چنانچہ
جب سفر اختیار کیا جائے تو اللہ کی رضا مقصود ہونی چاہئے۔ دنیاوی شہرت مقصود نہیں ہونی چاہئے۔
صرف رسول اللہ کی احادیث کا تحفظ اور بقا مقصود ہو، کوئی مادی منفعت مقصود نہ ہو۔ جس پیسے سے
سفر اختیار کیا جائے وہ جائز پیسہ ہو اور اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ ہو۔ جو ہمراہی اختیار کئے
جائیں وہ متقی اور پرہیزگار لوگ ہوں۔ اگر ایک سے زیادہ آدمی سفر کررہے ہیں تو ایک کو اپنا امیر
مقرر کرلیا جائے اور باقی ان کی امارت میں سفر کریں۔ جہاں ٹھہرنا ہو وہ جگہ صاف ستھری ہونی
چاہئے۔ حلال وحرام کا خیال رکھیں۔ یہ وہ آداب ہیں جو ہر سفر پر منطبق ہوتے ہیں۔ اس لئے بہتر
یہ ہے کہ شریعت میں سفر کے جتنے بھی آداب بیان ہوئے ہیں ان سب کا لحاظ رکھا جائے۔

یہ وہ آداب تھے جن کا تمام رجالِ حدیث اور محدثین کرام لحاظ رکھتے تھے۔ انہوں نے
دور دور کے سفر اختیار کئے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ ایک محدث طویل سفر اختیار کرکے ایک جگہ
پہنچے اور پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ جن کی خدمت میں حاضر ہونے آئے ہیں وہ تو انتقال فرماگئے ہیں۔

اس طرح کے حوصلہ شکن واقعات کی ایک بڑی مثال ایک صحابی عبدالرحمٰن الصنابحی کی
ہے۔ وہ صحابی تو نہیں ہیں تابعی ہیں۔ صحابہ کے تذکروں میں ان کا نام تبرکاً لکھا جاتا ہے۔ وہ بہت
دور سے یمن سے رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہونے۔ نیا نیا اسلام قبول کیا تھا۔ بڑے شوق
اور وارفتگی کے ساتھ تیز رفتاری سے یمن سے مدینہ کی طرف آرہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی
خدمت میں حاضری دیں گے۔ جب مدینہ منورہ تک ایک رات کی مسافت رہ گئی تو کہیں پڑاؤ کیا۔
صبح سویرے اٹھ کر دربارِ رسالت میں حاضری کی غرض سے نہانے دھونے کا اہتمام کررہے تھے۔
اپنے پاس موجود کپڑوں میں سے بہترین لباس پہن لیا۔ خوشبو لگائی اور دربارِ رسالت میں حاضری

کے خیال سے خوش ہو رہے تھے۔ ابھی سفر شروع کر ہی رہے تھے کہ مدینہ کی سمت سے کچھ لوگ آتے دکھائی دیئے۔ انہوں نے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو؟ بتایا کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں جا رہا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ہم تو آپ ﷺ کی تدفین سے فارغ ہو کر آ رہے ہیں۔ اب ان پر جو گزری ہوگی اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ اس کی ایک بڑی مثال ہے کہ علم حدیث کے حصول کے لئے کس طرح شیخ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور عین وقت پر جا کر پتہ چلا کہ جب لب بام ایک ہاتھ رہ گئی تو کمند ٹوٹ گئی۔

حصول علم حدیث کے لئے محدثین کی قربانیاں

امام اوزاعی جو امام اہل شام کہلاتے ہیں۔ اتنے بڑے امام ہیں کہ ان کا درجہ امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کے برابر قرار دیا جاتا ہے۔ علم حدیث میں امام مالک کے برابر کا درجہ رکھتے تھے۔ بیروت میں رہتے تھے جہاں آج بھی ان کا مزار موجود ہے اور جس علاقہ میں ان کا مزار ہے وہ محلہ امام اوزاعی کہلاتا ہے۔ یہ کوفہ اور بصرہ کے سفر کے لئے روانہ ہوئے۔ ارادہ یہ تھا کہ حضرت حسن بصری اور محمد بن سیرین سے علم حدیث کی روایت حاصل کریں گے۔ جب وہاں پہنچے تو پتہ چلا کہ حسن بصری کا تو انتقال ہو گیا ہے اور محمد بن سیرین بیمار ہیں۔ ان کے ہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ بستر پر لیٹے ہوئے ہیں۔ طبیبوں نے آرام کا مشورہ دیا ہے اور لوگوں سے ملنے کی ممانعت کر دی ہے۔ انہوں نے جا کر دیکھا، حضرت سے سلام کیا، عیادت کی، چند روز مقیم رہے۔ دو روز جا کر دیکھتے رہے، چند دن بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا اور یہ بغیر کچھ حاصل کئے بیروت واپس چلے گئے۔ یہ اس طرح کی بے شمار مثالوں میں سے صرف چند ایک ہیں۔ ایک تابعی کی مثال ہے جو صحابی بننے سے رہ گئے اور ایک بڑے مشہور تابعی کی جو بیک وقت محدث اور فقیہ دونوں تھے۔

ابن ابی حاتم رازی جو بہت مشہور ہیں اور جن کا میں پہلے بھی کئی بار تذکرہ کر چکا ہوں۔ ان کی کتاب علل الحدیث بڑی مشہور ہے۔ یہ رے کے رہنے والے تھے جو موجودہ تہران کے قرب و جوار میں تھا جو اب پھیلتے پھیلتے تہران کا حصہ بن گیا۔ وہاں سے یہ سفر کر کے بصرہ پہنچے اور وہاں کے شیوخ حدیث سے کسب فیض کے لئے وہاں کچھ دن مقیم رہے۔ ایک سال کی نیت سے بصرہ پہنچے تھے۔ آٹھ ماہ میں جمع پونجی ختم ہو گئی۔ اب کسی سے مانگنا انہوں نے اپنی شان

دو مسافروں کو اپنے قافلے میں لے جایا کرتے تھے۔ علامہ مقدسی سے پیسے لیے جو راستے میں ختم ہوگئے۔ جس منزل تک انہوں نے پیسے دیے تھے وہ منزل آگئی تو انہوں نے کہا کہ اب ہم آپ کو آگے نہیں لے جائیں گے اور انہیں راستے میں چھوڑ دیا۔ محمد بن طاہر نے سوچا کہ بغداد تو ہر صورت جانا ہے، پیدل ہی روانہ ہوگئے۔ اگر بیت المقدس اور بغداد کے درمیان کا راستہ آپ کے سامنے ہو تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ایک بہت بڑا صحرا راستے میں آتا ہے جو بڑا مشکل اور دشوار گزار ہے۔ گھوڑے، اونٹ کی پشت پر بھی بمشکل لوگ اس کو عبور کر پاتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں نے اپنی پشت پر کتابیں لادیں اور پیدل نکل پڑا۔ چلتے چلتے جوتے گھس کر پھٹ گئے تو ننگے پاؤں چل پڑا۔ گرمی کا زمانہ تھا، اوپر سے جلتی ہوئی دھوپ اور نیچے سے تپتا ہوا صحرا۔ پیسے نہیں تھے تو کھانے پینے کا انتظام بھی ختم ہوگیا۔ پشت پر کتابوں اور کاغذات کا بوجھ، طبیعت اتنی خراب ہوئی کہ خون کا پیشاب آنے لگا۔ ان تمام تکالیف کے باوجود بغداد پہنچ گئے۔ اپنا وقت گزارا۔ مزدوری کرکے کچھ پیسے کمائے اور مکہ مکرمہ آگئے۔ مکہ مکرمہ میں بھی یہی کیفیت ہوئی، وہاں بھی مزدوری کرکے کچھ پیسے کمائے اور پھر اپنے وطن واپس پہنچ گئے۔

امام ابو نصر عبیداللہ سجزی ایک اور محدث ہیں۔ ان کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ طلب فی الآفاق انہوں نے کائنات کے چکر لگائے۔ آفاق یعنی زمین کے کونوں کے چکر لگائے اور اسی چکر میں وہ مختلف جگہوں پر گئے تھے۔ پھرتے ہوئے کسی شہر میں جا نکلے۔ وہاں جا کر شہر میں شہرت ہوئی کہ یہ علم حدیث کے بڑے ماہر ہیں۔ لوگ ان سے علم حدیث حاصل کرتے تھے۔ یہ اوروں سے حاصل کرتے تھے۔ رات کو مزدوری کرتے تھے اور دن میں کسب علم کرتے تھے۔ کوئی خاتون تھی، جوان تھی، بہت خوب صورت تھی اور بڑے اچھے خاندان کی تھی۔ اس نے دیکھا کہ یہ عالم ہیں، محدث ہیں، بڑے پڑھے ہوئے ہیں، رات کو مزدوری کرتے ہیں، دن میں علم حاصل بھی کرتے ہیں اور پہنچاتے بھی ہیں۔ وہ ایک مرتبہ ان کے گھر آئی، ان کے شاگرد موجود تھے۔ خاتون نے دروازہ پر دستک دی۔ شاگرد نے دروازہ کھول کر دیکھا تو اطلاع دی کہ ایک خاتون آئی ہوئی ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ کیا کام ہے؟ اس نے ایک تھیلی دی کہ یہ آپ کے لیے لے کر آئی ہوں۔ اس میں ایک ہزار دینار ہیں۔ کہا کہ میں آپ سے شادی کرنا چاہتی ہوں اور صرف آپ کی خدمت کرنے کے لئے ایسا کرنا چاہتی ہوں۔ میرا اور کوئی مقصد یا کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کی محرم

ہیں کہ آپ کی خدمت کرنا چاہتی ہوں۔ اس پیسے سے آپ اپنا گزارہ کریں اور علم حدیث کے لئے اپنا وقت لگائیں۔ یہ پیسہ اور میری خدمات آپ کے لئے حاضر ہیں۔ انہوں نے کہا کہ بی بی تمہارا بہت بہت شکریہ، لیکن میں نے یہ طے کیا تھا کہ میں صرف اللہ کے لئے علم حاصل کروں گا۔ صرف اللہ ہی سے اس کا اجر مقصود ہے۔ میں دنیا میں کوئی اجر نہیں چاہتا، لہٰذا مجھے تمہاری خدمت اور پیسوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے، تمہاری اس پیشکش کا بہت شکریہ۔ جو مجھ پہ گزر رہی ہے یہ گزر جائے گی اور مجھے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے اجر ملے گا۔

علامہ ابو حاتم الرازی علم حدیث کے بہت بڑے امام تھے۔ ان کے صاحبزادے بھی علم حدیث اور فن جرح و تعدیل کے بہت بڑے امام ہیں جو ابن ابی حاتم الرازی کہلاتے ہیں اور نام ان کا عبدالرحمٰن ہے۔ ان کا یہ واقعہ میں خطیب بغدادی کی اس کتاب 'الرحلۃ فی طلب الحدیث' سے پڑھ کر سناتا ہوں۔ وہ کہتے ہیں میں نے اپنے والد کو یہ ارشاد فرماتے سنا کہ جب میں پہلی مرتبہ طلب حدیث کے لئے نکلا تو میں سات سال سفر میں رہا۔ میں جتنا پیدل چلتا تھا میں اس کو شمار کرتا جاتا تھا، جب ایک ہزار فرسخ سے زیادہ ہوگیا۔ (اور جن صاحب نے یہ کتاب ایڈٹ کی ہے وہ بھی بڑے عالم ہیں، انہوں نے حاشیہ میں لکھا ہے کہ ایک فرسخ موجودہ پانچ کلومیٹر سے تھوڑا زیادہ ہوتا تھا۔) جب میں نے ایک ہزار فرسخ کا سفر پیدل طے کرلیا یعنی ساڑھے پانچ ہزار کلومیٹر کے لگ بھگ چل لیا تو اس کے بعد میں نے گننا چھوڑ دیا۔ لیکن جو میں چلا وہ یہ تھا کہ کوفہ اور بغداد کے درمیان جو سفر میں نے کیا مجھے یاد نہیں کہ کتنی مرتبہ کیا۔ جب کوفہ میں سنا کہ کوئی محدث آیا ہے تو کوفہ چلا گیا، پھر سنا کہ کوئی محدث بغداد آگیا ہے تو میں بھی بغداد چلا گیا۔ اور مکہ اور مدینہ کے درمیان بہت مرتبہ اور بحرین (جو مشرقی سعودی عرب کے قریب ہے وہاں) سے جو صلا شہر کے قریب تھا مصر گیا۔ اس وقت ہوائی جہاز میں تین گھنٹے لگتے ہیں۔ اور مصر سے رملہ، موجودہ فلسطین کی جو اتھارٹی ہے اس کے دارالحکومت رملہ میں، جس کو اخبار والے رام اللہ کہتے ہیں۔ اور رملہ سے بیت المقدس پیدل گیا اور بیت المقدس سے عسقلان اور رملہ سے طبریہ جو وہاں کا ایک شہر ہے اور طبریہ سے دمشق اور دمشق سے حمص اور حمص سے انطاکیہ اور انطاکیہ سے طرسوس، یہ بھی شام کا ایک شہر ہے، پھر طرسوس سے حمص واپس آیا اور ابوالیمان جو ایک مشہور محدث تھے ان کی احادیث میں سے کچھ چیزیں رہ گئی تھیں وہ میں نے حمص سے حاصل کیں، پھر حمص سے بیسان پیدل آیا، جو

کہتے ہیں کہ شب برات کی فضیلت میں کیا سبھی ضعیف روایات ہیں؟

بھئی شب برات کو چھوڑ دیجئے، جو آپ کا جی چاہے وہ کیجئے۔ ایک اصولی بات میں عرض کرنا چاہتا ہوں اس کو آئندہ بھی یاد رکھیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ کچھ احادیث ہیں جو قطعی الثبوت ہیں۔ کچھ احادیث ظنی الثبوت ہیں۔ ظنی الثبوت وہ ہیں جن کے حدیث صحیح ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ وہ اکثر خبر واحد یا اخبار آحاد ہیں۔ ان میں شروع سے علماء اور محدثین کے درمیان اختلاف رہا ہے۔ ایک محدث ایک حدیث کو ثابت شدہ مانتے ہیں۔ ان کی نظر میں وہ صحیح ہے۔ دوسرے محدث اپنی تحقیق میں اس کو ضعیف مانتے ہیں۔ ان کی نظر میں وہ ضعیف ہے۔ جو ضعیف مانتے ہیں وہ اس پر عمل نہیں کرتے، کیونکہ ان کی تحقیق کے مطابق وہ ضعیف ہے۔ جو اپنی تحقیق میں اس کو صحیح سمجھتے ہیں وہ اس پر عمل کرتے ہیں۔ اس لئے اگر کوئی کسی ضعیف حدیث پر عمل کر رہا ہے تو یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ اور جو کوئی اس پر عمل نہیں کر رہا ہے تو یہ بھی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔

اعتراض یا نکیر صرف وہاں کرنا چاہئے جہاں شریعت کے کسی واضح، قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت حکم کی خلاف ورزی ہو رہی ہو۔ اس لئے اگر کوئی شب براءۃ کی احادیث پر عمل کرتا ہے تو آپ کا کیا جاتا ہے، کرنے دیجئے۔ اگر آپ کی تحقیق میں وہ احادیث کمزور ہیں یا ان لوگوں کی تحقیق میں کمزور ہیں جن کے علم پر آپ کو اعتماد ہے تو آپ ان پر عمل نہ کیجئے۔ لیکن اگر کچھ اور لوگ ایسے ہیں جن کی تحقیق پر آپ کو اعتماد نہیں ہے لیکن وہ ان احادیث کو ثابت شدہ سمجھ کر ان پر عمل کر رہے ہیں تو آپ ان پر اعتراض مت کیجئے۔ یہ ایک جزوی سی چیز ہے اس پر زیادہ بحث اور اختلاف کی ضرورت نہیں ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے کہا کہ مجھے نبی کریم ﷺ نے دو باتیں بتائی تھیں، اگر میں اس وقت ایک بھی لوگوں کے سامنے بیان کر دوں تو میرا قتل مسلمانوں پر واجب ہو جاتا اور وہ مجھے قتل کر دیتے۔

یہ نہیں کہا کہ میرا قتل مسلمانوں پر واجب ہو جاتا۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ بہت سی چیزیں میرے علم میں ایسی ہیں کہ اگر میں ان کو کھلم کھلا بیان کر دوں تو شاید لوگ مجھے قتل کر دیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جب علم حدیث یا علم دین بیان کیا جائے تو تدریج اور ترتیب کے ساتھ بیان

کیا جائے۔ اس طرح بیان نہ کیا جائے کہ سننے والے لوگ پہلے ہی مرحلے میں اس کا انکار کر دیں۔ آپ پہلے اسلام کے عقائد کو پھر اخلاق پھر تربیت اور تعلیم اور پھر احکام بتائیں۔ یہ وہی چیز ہے جو حضرت عائشہؓ نے فرمائی کہ رسول اللہ ﷺ اگر پہلے ہی دن یہ کہتے کہ شراب نوشی چھوڑ دو تو شاید عرب میں بہت کم لوگ آپؐ کی بات مانتے۔ آپ نے تدریج کے ساتھ پہلے ان کو مکارم اخلاق سکھائے، پھر نماز سکھائی پھر ایک ایک کر کے باقی چیزیں سکھائیں۔ آخر میں کہا کہ شراب نوشی اور فلاں فلاں قسم کے گناہ چھوڑ دو تو لوگوں نے چھوڑ دیے کیونکہ تربیت ہو چکی تھی۔ یہی بات حضرت ابو ہریرہؓ نے کہی کہ میں ایسا علم بھی رکھتا ہوں کہ اگر میں بیان کروں تو شاید لوگ مجھے قتل کر دیں اس لئے کہ ابھی ان کی وہ تربیت نہیں ہوئی اور شاید وہ ان کو سننے کے لئے تیار نہ ہوں۔ اس کے علاوہ اس کا کوئی اور مطلب نہیں ہے اور منکرین حدیث اس سے جو مطلب نکالنا چاہتے ہیں وہ درست نہیں ہے۔

کل آپ نے ڈاکٹر حمید اللہ کی کتاب خطبات بہاولپور کا ذکر کیا اس کا کچھ حصہ میں پڑھ چکی ہوں۔ اس میں انہوں نے بار بار لیکچرز کو بار دشمنوں سے تشبیہ دی ہے جن کا ذکر قرآن پاک میں ہے۔ میں بھی ان خطبات کو درست ڈاکٹر حمید اللہ سے تنقید کی خواہش رکھتی تھی۔ لیکن یہ ایک خاص جہت دل چاہ رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ان بار دشمنوں سے مستفید ہونے کا موقع دیا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ مجھے بھی ایسا ہی اخلاص عطا فرمادے جو ڈاکٹر حمید اللہ کو عطا فرمایا تھا۔ ان خطبات کا علمی درجہ وہ نہیں ہے جو ڈاکٹر حمید اللہ صاحبؒ کے خطبات کا تھا۔ ان خطبات کے دینے والے کا نہ وہ علمی مقام ہے نہ روحانی نہ اخلاقی جو ڈاکٹر صاحب کا تھا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ان خطبات اور ڈاکٹر صاحب کے خطبات بہاولپور میں ایک اور ایک ہزار کی نسبت بھی نہیں ہے۔ لیکن ایک ادنیٰ مشابہت ضرور ہے کہ وہ بھی بارہ تھے یہ بھی بارہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو قبول فرمائے۔ آمین

کیا آپ انگریزی میں کسی ایسی اچھی کتاب کا نام بتا سکتے ہیں جو علوم حدیث کے اہم موضوعات سے متعلق ہو اور اس بارے میں ہماری رہنمائی کر سکے۔

افسوس کہ اس وقت انگریزی میں کوئی ایسی کتاب میرے ذہن میں نہیں ہے۔ لیکن اگر آپ نے ان خطبات کے کچھ نوٹس انگریزی میں بنائے ہوں تو ان کو ایک ترتیب دے کر ایک آؤٹ

If the lessee undertakes to pay the encumberance and the risk of the leased property, then the lease is permissible.

تو ایسے مواد آپ لے کر کے کسی تائید سنت کی جانب رہنمائی کی جائے۔

منکرین حدیث میں دو طرح کے لوگ ہیں۔ کچھ وہ ہیں جن کو واقعی کوئی غلط فہمی ہے۔ ان لوگوں کو کتابیں دی جاسکتی ہیں۔ مثال کے طور پر شام کے ڈاکٹر مصطفی سباعی کی ایک عربی کتاب ہے 'السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی'۔ اس کے دو اردو تراجم ہیں۔ ایک پروفیسر غلام احمد حریری کا کیا ہوا اور دوسرا ڈاکٹر احمد حسن کا کیا ہوا ہے۔ یہ دونوں ترجمے آپ ان لوگوں کو دے سکتے ہیں۔ ایک ہمارے دوست اور بہت بزرگ اور فاضل دوست مولانا محمد تقی عثمانی کی انگریزی کتاب ہے **The Authority of Sunnah**۔ یہ آپ منکرین حدیث سے متاثر لوگوں کو دے سکتے ہیں۔ اسی طرح سے ایک چھوٹی سی کتاب ہے مولانا بدر عالم مہاجر مدنی کی۔ ان کی کتاب کا نام ہے 'حجیت حدیث'۔ وہ بھی اس معاملہ میں مفید ہے۔ لیکن بہترین کتاب **Studies in the Early Hadith Literture** ہے جو ڈاکٹر مصطفی اعظمی کی ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

نواں خطبہ

نظام حدیث

مورخہ 15 اگست 2003

علوم حدیث

علم حدیث کا آغاز اور ارتقا

آج کی گفتگو کا عنوان ہے علوم حدیث۔ آج تک جتنی بحث ہوئی ہے اس سب کا تعلق ایک اعتبار سے علوم حدیث ہی سے ہے۔ یہ سب موضوعات علوم حدیث ہی کے موضوعات تھے۔ لیکن علوم حدیث پر الگ سے گفتگو کرنے کی ضرورت اس بات پر زور دینے کے لئے پیش آئی کہ جن موضوعات کو علوم حدیث کہتے ہیں وہ ایک بہت بڑی، ایک منفرد اور نئی علمی روایت کے مظہر ہیں۔ یہ روایت مسلمانوں کے علاوہ کسی اور قوم میں نہیں پائی جاتی۔ علوم وفنون کے اس مجموعہ کو لاتعداد اہل علم نے اپنی زندگیاں قربان کرکے مرتب کیا۔ اور ان تمام موضوعات سے متعلق مواد جمع کیا جس کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے احوال، اقوال اور شخصیت مبارکہ سے تھا۔ انہوں نے اس مواد کی تحقیق کی اور اس کو مرتب انداز اور نت نئے اسالیب میں پیش کیا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ موضوعات پھیلتے گئے۔ ان میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان میں سے ہر جزوی موضوع پر الگ الگ کتابیں لکھی گئیں۔ پھر ان کتابوں کی شرحیں لکھی گئیں، شرحوں کے حواشی لکھے گئے، پھر ان کتابوں کی تلخیصیں تیار ہوئیں۔ مختلف اہل علم نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق ان کتابوں کے ایڈیشنز تیار کئے۔ اسی طرح وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ سب علوم نئے نئے عنوانات کے تحت مرتب ہوتے گئے۔ ان سب موضوعات کے مجموعہ کو علوم حدیث کہا جاتا ہے۔ گویا علوم حدیث سے مراد علم وفن کی وہ پوری روایت ہے جس کا محدثین کرام نے

اہتمام کیا، اور اہل علم کی ایک بہت بڑی تعداد، بلکہ اہل علم کی درجنوں نسلوں نے اس مواد کو فراہم کر کے مرتب و منظم کیا، کئی سو سال کے تسلسل کے ساتھ اس کی تہذیب و تنقیح کی۔

علم حدیث کے موضوعات

ان میں سے بعض موضوعات جو نسبتاً زیادہ اہم تھے ان پر گزارشات پیش کی گئیں۔ یہ موضوعات اس اعتبار سے اہمیت رکھتے ہیں کہ ان پر الگ سے ایک دو نہیں بلکہ درجنوں کتابیں لکھی گئیں۔ بعض محدثین نے ان میں اختصاص پیدا کیا اور یوں یہ موضوعات اس اختصاص کا موضوع قرار پائے۔ علم حدیث میں مختلف پہلوؤں سے اس اختصاص سے کام لیا گیا۔ بعض ایسے موضوعات کا ابتدائی مختصر اور سرسری تعارف آج مقصود ہے۔

معرفت صحابہ

ان میں سب سے اولین موضوع جس کا اختصار کے ساتھ پہلے بھی تذکرہ کیا جا چکا ہے، وہ معرفت الصحابہ ہے۔ سب سے پہلے صحابہ کرامؓ کی نشاندہی، پھر ان کی سیرت و سوانح کی تدوین ایک ایسا بڑا موضوع ہے جس سے واقفیت کسی بھی حدیث کا درجہ متعین کرنے کے لئے ضروری ہے۔ کسی حدیث کا کیا مقام و مرتبہ ہے، اس کا تعین کرنے میں علم معرفت صحابہ کا بنیادی کردار ہے۔ اگر کوئی روایت کسی صحابیؓ سے مروی ہے اور صحابیؓ تک سند مکمل اتصال اور تسلسل کے ساتھ پہنچ جاتی ہے تو پھر اس حدیث کا درجہ یقیناً زیادہ ہوگا۔ لیکن اگر اس حدیث کی سند اس صحابیؓ تک نہیں پہنچتی تو پھر ظاہر ہے کہ اس کا درجہ وہ نہیں ہوگا جو صحابیؓ کی روایت کا ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے جس سے حدیث کا ہر طالب علم فوری طور پر اتفاق کرے گا۔ مشکل وہاں پیش آتی ہے جہاں کسی شخصیت کے صحابیؓ ہونے یا نہ ہونے میں اختلاف ہو، یا اس کے صحابیؓ ہونے یا تابعی ہونے کے بارے میں دو مختلف رائے پائی جاتی ہوں۔ دوسری مشکل وہاں پیش آئے گی جب کسی صحابیؓ کے سن وفات میں اختلاف ہوگا۔

اس تعین کی ضرورت اس لئے پیش آتی ہے کہ اگر کوئی تابعی یہ بیان کریں کہ انہوں نے فلاں صحابیؓ سے یہ حدیث سنی اور صحابیؓ کا انتقال ایک خاص سن میں ہو جانا متعین ہو چکا ہو تو پھر یہ تعین کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ ان تابعی کی ملاقات ان صحابیؓ سے ہوئی تھی کہ نہیں۔ مثال کے طور پر

ایک صاحب نے سن 195ھ میں ایک حدیث بیان کی اور دعویٰ کیا کہ انہوں نے ایک صحابیؓ سے اس حدیث کو سنا ہے۔ وہاں ایک بڑے محدث بھی موجود تھے۔ انہوں نے پوچھا کہ حضرت آپ کی عمر کیا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ میری عمر 115 یا 120 سال ہے۔ ان محدث نے فوراً بتا دیا کہ آپ کے دعویٰ کے مطابق اگر آپ کی عمر 120 سال بھی مان لی جائے تو بھی آپ کی پیدائش سے پانچ سال پہلے ان صحابیؓ کا انتقال ہو چکا تھا جن سے آپ روایت بیان کر رہے ہیں۔

یہ جو تاریخی ریکارڈ اور فوری طور پر اس بات کا تعین حاصل کر لیا جاتا ہے کہ کسی تابعی کو کسی صحابیؓ سے تلمذ حاصل ہے کہ نہیں، یا کسی تابعی نے کسی صحابیؓ سے کسب فیض کیا ہے کہ نہیں، اس کا دارومدار بڑی حد تک اس بات پر ہے کہ صحابہ کرامؓ کے بارے میں معلومات مکمل، یقینی اور واضح طور پر ہمارے پاس موجود ہوں۔

صحابی کی تعریف

ائمہ حدیث کے نزدیک صحابیؓ کی بالاتفاق تعریف یہ ہے کہ صحابیؓ وہ خوش نصیب شخصیت ہیں جنہوں نے حالت ایمان میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زیارت کی ہو اور آپ کو دیکھا ہو۔ چاہے یہ سعادت کتنے ہی تھوڑے دورانیہ کے لئے حاصل ہوئی ہو، لیکن اگر یہ سعادت حالت ایمان میں حاصل ہوئی اور وہ صاحب حالت ایمان میں زندہ رہے اور اسی حالت ایمان میں وفات پا گئے تو وہ صحابیؓ شمار ہوں گے۔ اس میں چھوٹا سا مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ کچھ لوگ ایسے بدنصیب بھی تھے جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ مبارک میں اسلام لائے اور آپ کی زیارت سے مشرف ہوئے لیکن آپ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد کسی قبائلی عصبیت یا کسی غلط فہمی یا کسی دوسری گمراہی کی وجہ سے اسلام سے پھر گئے۔ کسی مدعی نبوت کے ساتھ ہو گئے اور خدانخواستہ اسی حالت میں مر گئے۔ ایسے لوگوں کے صحابی ہونے کا تو کوئی سوال نہیں۔ کیونکہ مسلمان کی حیثیت سے اور اسلام کی حالت میں وفات نہیں ہوئی۔ لیکن ان لوگوں میں بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جو بعد میں اللہ کی توفیق سے دوبارہ مسلمان ہو گئے، وہ بھی صحابیؓ نہیں کہلائیں گے۔ اگرچہ انہوں نے حالت ایمان میں حضورؐ کی زیارت کی اور حالت ایمان ہی میں وفات پائی، لیکن چونکہ حالت ایمان کا تسلسل قائم نہیں رہا، اس لئے وہ صحابیت کے شرف سے خارج ہو گئے۔

بعض اہل علم کا خیال ہے کہ ایسے لوگوں کو بھی صحابی کہا جائے گا۔ بعض کا خیال ہے کہ نہیں کہا جائے گا۔ محدثین کا عام رجحان یہ ہے کہ ایسا کوئی شخص صحابی نہیں کہا جا سکے گا جو حالت ایمان پر قائم نہ رہا ہو اور درمیان میں کسی گمراہی، کفر یا شرک کا وقفہ آگیا ہو۔

شرف صحابیت کے حصول میں نہ تو بالغ ہونا شرط ہے اور نہ روایت کرنا شرط ہے۔ کسی نے رسول اللہ ﷺ سے کوئی روایت نہیں کی، صرف آپ کو دیکھا تو ان کو بھی شرف صحابیت حاصل ہے اور اگر وہ اتنے بچے ہوں کہ ان کو معاملات، احادیث، احکام اور شریعت کی بہت زیادہ سمجھ بوجھ نہیں تھی لیکن اس کے باوجود انہوں نے بچپن میں حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی زیارت کی تھی تو وہ بھی شرف صحابیت سے مشرف مانے جائیں گے۔ ایسے بہت سے حضرات ہیں جو حضور ﷺ کی رحلت کے وقت بہت کم عمر تھے۔ حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت محمود بن لبیدؓ، حضرت ابو طفیل عامر بن واثلہؓ اور ان کے علاوہ بھی ایسے کئی حضرات ہیں جو بہت بچے تھے اور پانچ، چھ یا سات سال کی عمر میں انہوں نے حضور کو دیکھا اور بعد میں کچھ یادداشتیں جو ان کے ذہن میں تھیں وہ بھی ان کو بیان کرنے لگے۔ یہ شرف صحابیت کے لئے کافی ہے۔

صحابی کی تعریف اور تعیین کے بارے میں محدثین اور علمائے اصول میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔ علمائے اصول یعنی اصول فقہ کے علماء صحابی کی تعریف کچھ اور کرتے ہیں۔ میں اس کو چھوڑ رہا ہوں البتہ محدثین کے نزدیک صحابی کی تعریف وہ ہے جو میں نے ابھی بیان کردی۔

صحابہ کرامؓ کی اس تعریف میں یکسانیت کے باوجود صحابہ کے درجات میں فرق ہے۔ بعض صحابہ کو بعض صحابہ پر فضیلت حاصل ہے جس سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا۔ یہ بات کرتے وقت دو چیزیں الگ الگ شمار ہوں گی۔ ایک صحابہ کے طبقات ہوں گے اور دوسری صحابہ کی فضیلت کے معیارات ہوں گے۔ طبقات صحابہ سے مراد ہے صحابہ کرام کی زمانی اعتبار سے تقسیم کہ کن صحابہ کی کتنی عمر ہوئی۔ محدثین نے زمانوں کے لحاظ سے ان کو مختلف طبقات میں تقسیم کیا۔ یہ ایک الگ چیز ہے جو ابھی آئے گی۔

فضیلت کے لحاظ صحابہ کے درجات

جہاں تک صحابہ کے فضائل کا تعلق ہے تو اس اعتبار سے صحابہ کرامؓ کے مختلف درجات

ہیں۔ سب سے پہلا درجہ جس کی قرآن مجید سے تائید ہوتی ہے اور قرآن مجید میں کئی مرتبہ اس کا ذکر بھی آیا ہے وہ السابقون الاولون ہے۔ اس سے مراد وہ صحابہ ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی تبلیغ دین کے ابتدائی تین سالوں کے دوران اسلام میں داخل ہوئے۔ ابتدائی تین یا چار سال میں جب رسول اللہ ﷺ نے صرف مکہ مکرمہ تک اپنے کام کو محدود رکھا اور مکہ مکرمہ میں بھی اپنے قریبی رشتہ دار قرابتداروں تک اپنی دعوت کو پہنچایا، اور وہ لوگ اسلام میں داخل ہوئے جو حضور ﷺ سے بالواسطہ یا بلا واسطہ قریبی رشتہ کی وجہ سے یا خونی رشتہ داری کی وجہ سے وابستہ تھے۔ یہ حضرات السابقون الاولون کہلاتے ہیں۔ ان میں خلفاء اربعہ، سیدنا زید بن حارثہؓ، حضرت خدیجہ الکبریٰؓ اور وہ تمام صحابہ جو ابتدائے اسلام کے چند سالوں میں اسلام میں داخل ہوئے، شامل ہیں۔ یہ تقسیم امام حاکم نے کی ہے جن کی کتاب معرفۃ علوم الحدیث بڑی مشہور ہے۔ باقی محدثین بھی قریب قریب اس سے اتفاق کرتے ہیں۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اسلام کی دعوت شروع کی اس وقت سے لے کر جب تک آپ نے علم کو دار الندوہ میں، جو قریش کا ایک طرح سے اسمبلی ہال تھا، وہاں جا کر علی الاعلان دعوت نہیں دی، اس وقت تک جو لوگ اسلام میں داخل ہوئے وہ السابقون الاولون کہلاتے ہیں۔

جب سیدنا عمر فاروقؓ نے اسلام قبول کرلیا اور ان کے قبول اسلام کے ذریعے اللہ نے اسلام اور مسلمانوں کو قوت عطا فرمائی تو حضرت عمر فاروقؓ کی تجویز پر رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام کو لے کر نکلے اور دار الندوہ میں قریش کے مرکز میں جا کر علی الاعلان اسلام کا کلمہ بلند کیا۔ اس مرحلہ پر بہت سے لوگ جو مسلمان ہوئے وہ اور جو بعد میں مسلمان ہوئے، وہ صحابیت کے دوسرے درجہ پر فائز کہلاتے ہیں اور ان کے لئے امام حاکم نے اصحاب دار الندوہ کی اصطلاح رکھی ہے۔ یعنی وہ صحابہ کرام جو دار الندوہ کی دعوت کے نتیجہ میں یا اس کے بعد مسلمان ہوئے۔

صحابہ کرامؓ میں تیسرا درجہ ان حضرات کا ہے جنہوں نے حبشہ کی طرف ہجرت فرمائی یا اس ہجرت کے دوران اسلام میں داخل ہوئے۔ یہ زمانہ ہجرت حبشہ سے لے کر ہجرت مدینہ تک چلتا ہے جب رسول اللہ ﷺ نے خود مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔

اس کے بعد انصار مدینہ میں ان خوش نصیبوں کا درجہ ہے جو بیعت عقبہ اولیٰ میں شامل رہے۔ یہ گویا انصار کے سابقون الاولون ہیں۔ انصار میں سے یہی السابقین الاولین وہ حضرات ہیں جو پہلی

بیعت عقبہ میں شامل رہے۔ اس کے بعد وہ حضرات جو دوسری بیعت عقبہ میں شامل رہے۔ بیعت عقبہ کے بارے میں بعض سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ دو مرتبہ ہوئی اور بعض نے لکھا ہے کہ تین مرتبہ ہوئی۔ ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ یہ صرف اصطلاح کا فرق ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عقبہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ سے مدینہ منورہ کے تین مختلف وفود کی ملاقات تین مرتبہ ہوئی۔ پہلی مرتبہ چھ حضرات سے ملاقات ہوئی۔ اس میں کوئی باقاعدہ معاہدہ یا اتفاق رائے نہیں ہوا کہ رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے جائیں یا مدینہ منورہ میں اسلام کی دعوت کے کام کو باقاعدہ کیسے مرتب کیا جائے۔ بعض سیرت نگار حضرات نے اس کو بیعت کا نام نہیں دیا۔ لہٰذا اس کو بیعت عقبہ اولیٰ قرار نہیں دیتے۔ وہ دوسری بیعت عقبہ کو بیعت عقبہ اولیٰ اور تیسری کو بیعت عقبہ ثانیہ قرار دیتے ہیں۔ کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ اس موقع پر عقبہ کے مقام پر رسول اللہ ﷺ اور مدینے کے چھ لوگوں کے درمیان باقاعدہ ملاقات ہوئی تھی۔ چھ صحابہ کرامؓ مدینہ منورہ سے وہاں تشریف لائے تھے اور انہی سے مدینہ منورہ میں دعوت اسلامی کا آغاز ہوا۔ اس لئے یہ پہلی بیعت عقبہ ہے، اور جو بیعت دوسرے اہل علم کے نزدیک پہلی بیعت کہلاتی ہے وہ ان حضرات کے نزدیک دوسری ہے اور جو دوسری ہے وہ دراصل تیسری ہے۔ یہ محض گنتی اور شمار کا فرق ہے ورنہ واقعات کی اس ترتیب میں کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ تو گویا پہلی یا دوسری یا جو بھی تقسیم آپ پسند کریں، ان میں جو حضرات شریک ہوئے ان کا درجہ چوتھا ہے اور جو دوسری یا تیسری بیعت میں شریک ہوئے ان کا درجہ پانچواں ہے۔

اس کے بعد وہ حضرات ہیں جو مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے گئے یا مدینہ کے قرب و جوار کے رہنے والے یا مدینہ منورہ میں رہنے والے حضرات جو رسول اللہ ﷺ کے قیام قبا کے دوران اسلام میں داخل ہوئے۔ حضورؐ نے چند دن قبا میں قیام فرمایا جہاں بہت سے حضرات نے اسلام قبول کیا۔ بہت سے صحابہ نے ہجرت کر کے حضورؐ کے ساتھ مدینہ میں جا کر مل گئے۔ ان کا طبقہ ہے جو امام حاکم کے نزدیک درجہ اور فضیلت کے اعتبار سے صحابہ کرامؓ کا چھٹا طبقہ ہے۔ ابھی بطور ماخذ حدیث یا مصدر حدیث کے بات نہیں ہو رہی ہے بلکہ ابھی صرف صحابہ کے درجات اور فضیلت کی بات ہو رہی ہے۔

پھر ساتواں درجہ ان کا ہے جو اصحاب بدر ہیں۔ ممکن ہے آپ کے ذہن میں یہ سوال

پیدا ہو کہ ہم تو ابھی تک یہ پڑھتے آرہے ہیں کہ اصحاب بدر کا درجہ سب سے اونچا ہے۔ یہاں تو اس درجہ کیوں بتایا جارہا ہے۔ اس سوال پر میرا پہلا جواب تو یہ ہے کہ یہ میں نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ امام حاکم بتارہے ہیں۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ جو پہلے تمام درجات ہیں اصحاب بدر ان میں شامل ہیں۔ سابقون اولون میں سے کوئی نہیں جو غزوہ بدر میں شامل نہ ہو۔ اصحاب دارالندوہ میں کوئی نہیں جو بدر میں شامل نہ ہوا ہو۔ یہ سارے کے سارے اصحاب بدر میں شامل ہیں۔ اس لئے جب ہم اصحاب بدر کے درجہ کا ذکر کریں گے تو ایک آدھ کے استثنٰی کے ساتھ پورے کے سارے اس میں شامل ہوں گے۔

اصحاب بدر کے بعد صلح حدیبیہ سے پہلے اسلام میں داخل ہونے والے ان خوش نصیبوں کا درجہ ہے جو ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔ ان کا درجہ اس لئے اونچا ہے کہ صلح حدیبیہ سے پہلے پہلے مکہ مکرمہ کے لوگوں اور مسلمانوں کے درمیان شدید جنگ اور کشمکش کی کیفیت تھی اور تمام اہل مکہ اور ان کی وجہ سے بقیہ قبائل کے بہت سے لوگ مسلمانوں کے شدید دشمن تھے۔ لہٰذا جو شخص مکہ مکرمہ یا کسی اور قبیلے سے اپنا وطن چھوڑ کر اسلام قبول کرتا ہے اور مدینہ منورہ آکر گویا اپنی سابقہ شہریت کو منسوخ کر کے مسلمانوں کی برادری میں شامل ہو جاتا ہے وہ پوری برادری اور گھربار چھوڑ کر پورے عرب سے دشمنی مول لے کر مدینہ منورہ کی بستی میں آتا ہے تو اس کا درجہ بعد والوں سے بلاشبہ اونچا ہونا چاہئے۔

صلح حدیبیہ کے بعد صورت حال بدل گئی۔ کفار مکہ سے جنگ بندی کا معاہدہ ہوا۔ دوسرے قبائل سے بھی معاہدات ہوئے، کچھ قبائل سے دوستی کے عہد و پیمان ہوئے۔ مسلمانوں کے لئے حالات نسبتاً بہتر ہو گئے اور اب دشمنی کی وہ کیفیت نہیں رہی۔ ان حالات میں جو اصحاب تشریف لائے ان کی قربانی پہلے آنے والے حضرات کے مقابلہ میں نسبۃً کم درجے کی ہے۔ اس لئے آٹھواں درجہ ان کا ہے جو صلح حدیبیہ کے بعد اور بیعت رضوان سے پہلے پہلے تشریف لائے۔ پھر بیعت رضوان میں جو لوگ شریک ہوئے قرآن مجید میں ان کا ذکر موجود ہے لقد رضی اللہ عن المومنین اذ یبایعونک تحت الشجرۃ۔ اللہ تعالیٰ راضی ہو گیا ان لوگوں سے جو درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے۔ اب قرآن مجید کی اس گواہی کے بعد تو کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ ان کا درجہ کیا ہے۔

کا موقع ملا۔ ظاہر ہے کہ جن تابعین کو اکابر صحابہ سے کسب فیض کا موقع ملا، مثلاً اگر کسی تابعی نے سیدنا عمر فاروقؓ سے روایت نقل کی یا کسی تابعی نے صدیق اکبرؓ سے روایت نقل کی تو ان کے تابعی ہونے کا درجہ بھی بڑا ہوگا۔ اس اعتبار سے صحابہ کرامؓ کے تین طبقات علماء حدیث نے بیان کئے ہیں۔

کبار صحابہ

سب سے پہلا یا سب سے اونچا اور بڑا درجہ کبار صحابہ کا ہے۔ ان میں وہ صحابہ کرامؓ شامل ہیں جن کو ایک طویل عرصہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں گزارنے، آپ کی سنت کا مشاہدہ کرنے، آپ سے حدیث کو حاصل کرنے اور آپ کے زیر سایہ براہ راست اور عملی تربیت حاصل کرنے کا موقع ملا۔ یہ کبار صحابہ ہیں جن میں خلفائے اربعہ، عشرہ مبشرہ، امہات المومنین کے علاوہ مہاجرین کی بڑی تعداد شامل ہے۔ ان میں انصار اور مہاجرین دونوں گروہوں سے حضورؐ کے قریب ترین وہ اصحاب شامل ہیں جو شب وروز آپؐ کے ساتھ رہے۔ ظاہر ہے کہ ان کی تعداد تھوڑی ہے لیکن تیقن کے ساتھ گنتی کرکے بتانا دشوار ہے کہ ان سے صحابہ کبار صحابہ میں سے ہیں اور کون سے نہیں۔ آخر میں کبار صحابہ اور اوساط صحابہ کے درمیان جو Dividing Line آئے گی وہاں تھوڑا سا اختلاف ہوگا اور وہاں حتمی اور قطعی طور پر یہ تعین کرنا دشوار ہوگا کہ یہ وہ لکیر ہے جو کبار صحابہ کو باقی صحابہ سے الگ کرتی ہے تو یہ لکیر کھینچنا بہت مشکل ہے۔ البتہ اس تقسیم سے کبار صحابہ کے بارے میں ایک عمومی اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔

اوساط صحابہ

اس کے بعد اوساط صحابہ کا درجہ ہے۔ یہ وہ صحابہ ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں اپنے ہوش وحواس میں تھے، نوجوان تھے، جن کو حضور ﷺ کو دیکھنے کے خاصے مواقع ملے لیکن نوجوان اور کم سن ہونے کی وجہ سے اتنے قریبی اور خصوصی مواقع نہیں ملے جتنے مثلاً حضرت عمر فاروقؓ یا حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ یا امہات المومنین کو ملے۔ مثال کے طور پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا شمار مدینہ منورہ کے ابتدائی سالوں میں کم سن بچوں میں ہوتا تھا۔ جب حضورؐ دنیا سے تشریف لے گئے تو ان کی عمر بائیس، تئیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضورؐ

کے پاس دس سال کی عمر میں تشریف لائے، اس لئے ان جیسے نوعمر صحابہ کرام کا شمار کبار صحابہ میں تو نہیں ہو سکتا۔ لیکن دس سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے ان کو غیر معمولی فہم، سمجھ بوجھ اور عقل و دانش سے نوازا تھا۔ انہوں نے تین سالوں میں اتنا کچھ حاصل کر لیا تھا کہ بہت سے اور حضرات حاصل نہیں کر سکے۔ اس لئے ان کا شمار اوساط صحابہ میں ہے۔ جب حضورؐ کا انتقال ہوا تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی عمر تیرہ یا ساڑھے تیرہ سال کی تھی۔ ان کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہیں۔ جب غزوہ احد ہوا تو جو صحابہ کرامؓ غزوہ احد میں شرکت کے لئے ہتھیار اور سامان جنگ لے کر نکلے، حضورؐ نے مدینے سے باہر جا کر فوج کا معائنہ فرمایا۔ اس وقت ایک ہزار کے قریب لشکر تھا۔ بعض لوگوں کو آپؐ نے کم سن قرار دے کر واپس بھیج دیا۔ ان میں حضرات عبداللہ بن عمرؓ، ابوسعید خدریؓ اور چند اور حضرات شامل تھے۔ آپؐ نے ان سے کہا کہ تم ابھی کم سن ہو، جنگ میں شریک نہیں ہو سکتے اس لئے چلے جاؤ۔ وہ بہت بوجھل دل اور افسوس کے ساتھ واپس چلے گئے کہ حضورؐ کے ساتھ جہاد میں شرکت کی اس سعادت عظمیٰ کے حصول کا موقع نہیں ملا۔ اس وقت ان کی عمر کیا ہو گی؟ ظاہر ہے بارہ تیرہ یا چودہ سال کے لگ بھگ ہو گی۔ ایسی عمر کہ انسان کا شمار بچوں میں تھا نہ بڑوں میں۔ خود اپنی دانست میں یہ جنگ میں حصہ لینے کے قابل تھے لیکن رسول اللہ ﷺ نے از راہ شفقت اور از راہ مہربانی اور از راہ بزرگی ان کو اس کا اہل نہیں سمجھا کہ وہ جنگ میں شرکت جیسی اہم ذمہ داری انجام دے سکیں۔

یہ سارے حضرات جو غزوہ احد میں نوجوان تھے ان کو غزوہ خندق میں آپؐ نے شرکت کا موقع عطا فرمایا اور وہ اس میں شریک ہوئے۔ یہ اوساط صحابہ کہلاتے ہیں۔ ان میں سے متعدد حضرات نے لمبی عمر پائی اور جن کی عمر زیادہ طویل ہوئی زیادہ تر روایات انہی سے ہیں۔ تابعین نے زیادہ تر انہی حضرات سے استفادہ کیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت انس بن مالکؓ، حضرت زید بن ثابتؓ یا اور ان کے ہم عمر حضرات اوساط صحابہ میں شمار ہوتے ہیں۔

صغار صحابہ

تیسرا طبقہ صحابہ کرامؓ میں صغار صحابہ کا ہے جو حضور ﷺ کی حیات کے زمانے میں بہت بچے تھے اور ان کی جوانی کا زمانہ آپؐ کی حیات کے بعد شروع ہوا۔ مثلاً حضرات حسنینؓ سے کوئی

روایت منقول نہیں ہے۔ بہت عام قسم کی دو ایک باتیں ان سے منقول ہیں۔ مثلاً حضورؐ کے حلیہ مبارک کے بارے میں، آپ کے کسی عام طرزِ عمل کے بارے میں ان کا کوئی روایت ہوگی ورنہ عام طور پر ان حضرات سے کوئی روایت نہیں ہے۔ حضرت محمود بن لبیدؓ جن کا ذکر ہو چکا ہے، ابو الطفیل عامر بن واثلہ، یہ وہ حضرات ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا تو سہی لیکن روایت کرنے یا صحبت میں رہنے یا کوئی طویل استفادہ کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ ان کی اکثر روایتیں دوسرے صحابہ کرامؓ سے ہیں۔ یہ صحابی ہوتے ہوئے بھی صحابہ سے روایت کرنے والے لوگ ہیں۔

ان طبقات سے یا زمانے کے اس تعین سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ کس صحابی کا زمانہ کس زمانے تک آتا ہے۔ چونکہ صحابہ کے طبقات پر الگ الگ کتابیں لکھی گئی ہیں اور طبقات صحابہ میں مؤرخین اور محدثین نے زمانے کا تعین بھی کیا ہے اس سے اس بات کا پتہ چلنا بہت آسان ہے کہ اگر کسی تابعی نے کسی صحابی سے روایت کی ہو تو اس روایت کا درجہ کیا ہے اور وہ روایت متصل بھی ہے کہ نہیں۔

صحابہ کرامؓ کی کل تعداد

صحابہ کرامؓ کی تعداد ایک لاکھ سے اوپر ہے۔ بعض لوگوں نے یہ تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار بتائی ہے۔ بعض لوگوں نے کم و بیش بتائی ہے۔ ان تمام حضرات کی تعداد جن کو شرف صحابیت حاصل تھا وہ بہت زیادہ تھی۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار تو وہ تھے جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ 9 ذی الحجہ سن 10ھ کو میدان عرفات میں موجود تھے۔ بہت سے حضرات ایسے بھی ہوں گے جو اس موقع پر حج کے لئے حاضر نہیں ہو سکے ہوں گے، انہوں نے بھی اس سے پہلے یا بعد میں حضورؐ کو دیکھا ہوگا لہٰذا وہ بھی صحابی ہیں۔ اس لئے صحابہ کی تعداد کے بارے میں قطعی طور پر کچھ کہنا تو بہت مشکل ہے۔ البتہ وہ صحابہ کرامؓ جن کے اسمائے گرامی معلوم ہوئے اور کسی نہ کسی اعتبار سے محدثین کے علم میں آئے، ان کی تعداد امام ابو زرعہ رازی نے ایک لاکھ چودہ ہزار بتائی ہے۔ صحابہ کے جو تذکرے آج موجود ہیں مثلاً "الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب"، "الاصابہ فی تمییز الصحابہ"، "اسد الغابہ" اور "طبقات ابن سعد"، ان سب کتابوں میں جن صحابہ کرامؓ کا ذکر ہے ان کی مجموعی تعداد چودہ، پندرہ ہزار کے درمیان ہے۔ یہ وہ حضرات ہیں جن سے یا تو کوئی نہ کوئی

روایت منقول ہے۔ سیرت سے متعلق کسی واقعہ میں ان کا ذکر آتا ہے۔ باقی صحابہ سے کوئی روایت منقول نہیں ہے۔ انہوں نے حضور کو دیکھا ضرور لیکن ایسا کوئی موقع نہیں آیا کہ وہ کوئی روایت بیان کرسکیں۔

علم حدیث کا ایک طے شدہ اصول ہے کہ صحابہ کرامؓ سب کے سب عادل ہیں۔ لہٰذا کسی صحابیؓ کے عادل یا غیر عادل ہونے کے بارے میں بحث غیر ضروری ہے۔ یہ بحث تحصیل حاصل ہے۔ امام ابوزرعہ رازی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اذا رأیت الرجل ینتقص احداً من اصحاب رسول اللہ ﷺ جب تم کسی کو دیکھو کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ میں سے کسی کی تنقیص کررہا ہے فاعلم انہ زندیق تو جان لو کہ وہ زندیق ہے۔ یعنی بے دین اور دہریہ ہے۔ اس لئے کہ قرآن مجید صحابہ کرامؓ کے واسطے سے ہی ہم تک پہنچا۔ سنت کے ذخائر صحابہ کرامؓ ہی کے واسطے سے آئے۔ اگر صحابہ کرامؓ کا ایمان خود ہی مشکوک قرار دیا جائے اور صحابہ کرامؓ کے کردار اور عدالت پر چھینٹے اڑائے جائیں تو پھر قرآن مجید بھی مشکوک ہے، حدیث بھی مشکوک ہے اور پورا دین مشکوک ہے۔ اسی وجہ سے بالاتفاق محدثین، فقہائے اسلام اور مفسرین قرآن تمام صحابہ کرامؓ کو عادل قرار دیتے ہیں۔

صحابہ کرامؓ سے جو روایات آئی ہیں ان صحابہ اور ان روایت کے نقطہ نظر سے بھی صحابہ کرامؓ کے تین طبقات ہیں

۱۔ ایک طبقہ وہ ہے جو کبار صحابہ سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن ان سے کوئی روایت منقول نہیں ہے۔ مثلاً حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جن کا تعلق صحابہ کے طبقہ اول کے بھی طبقہ اولیٰ سے ہے۔ لیکن ان سے کوئی روایت منقول نہیں ہے۔ ان کا انتقال مکہ مکرمہ میں ہوا۔ ان کو کسی تابعی نے دیکھا ہی نہیں۔ ان کا سارا رابطہ صحابیات ہی رہا۔ ان صحابہ کرامؓ میں سے کسی کو ضرورت اتنی پیش نہیں آئی کہ ان سے کوئی روایت معلوم کرتا۔ صحابہ کرامؓ کا جو طبقہ زمانی اعتبار سے جتنا زیادہ متقدم تھا ان سے روایتیں اتنی ہی کم ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے روایتیں بہت ہی کم ہیں۔ مسند امام احمد کو آپ کھول کر دیکھیں۔ ان کی شاید پچیس صفحات سے زیادہ کی روایات نہیں ہوں گی

۲۔ زیادہ روایتیں ان صحابہ کرامؓ سے ہیں جن کا تعلق اصاغر صحابہ یعنی دوسرے طبقہ

خیالات کو ان کے شاگردوں نے باقاعدہ طور پر علمی شکل میں مرتب کر دیا اور جس کے نتیجہ میں
مذاہب فکر وجود میں آئے۔ ان میں سے اکثر و بیشتر کے علم کا ذریعہ دو ہی بنیادی واسطے ہیں جن سے علم
پہنچا ہے۔ حضرت علی بن ابی طالبؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ یا بالواسطہ یا براہ راست ان دونوں کے پڑھائے
واسطے سے ان مذاہب تک پہنچا۔ ان سے پہلے علم صحیح ہو اتنی طرح پہنچتا ہے۔

مثال کے طور پر امام مالک مدینہ منورہ میں تھے جو مجتہد تھے۔ ان کی پوری زندگی مدینہ منورہ
میں گزری۔ مدینہ منورہ میں فن کو کسب فیض کرنے کا سب سے زیادہ موقع ان تابعین سے ملا جن
تابعین نے مدینہ منورہ کے صحابہ کرام سے سب سے زیادہ فیض کیا تھا۔ مدینہ منورہ میں تابعین نے جن صحابہ
سے کسب فیض کیا ان میں دو نام بڑے نمایاں ہیں۔ ایک حضرت عمر فاروقؓ اور دوسرے حضرت علی
بن ابی طالبؓ۔ حضرت علیؓ کوفہ میں گزرے ہوئے زندگی کے آخری چار پانچ سالوں کے علاوہ
پوری زندگی مدینہ منورہ میں رہے۔ امام مالک کی روایات آپ دیکھیں تو اکثر روایات میں سب
مالک عن نافع عن ابن عمرؓ یا مالک عن ابن شہاب اور ابن شہاب کے معاصرین پھر
مدینہ منورہ کے صحابہ کرام سے ملتے ہیں۔ یا مالک عن ابی الزناد عن الاعرج عن ابی ہریرہؓ۔ امام مالک کے
استاد تھے ابوالزناد۔ امام مالک روایت کرتے ہیں۔ مالک عن ابی الزناد عن الاعرج۔ عبدالرحمن
بن اعرج ان کے ایک استاد تھے جو لنگڑاتے تھے یا ان کو کوئی تکلیف تھی تو عرف عام میں اعرج کہا جاتا
تھا۔ اس طرح سے مدینہ کا جتنا علم تھا وہ حضرت علیؓ، حضرت عمر فاروقؓ، عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت
ابوہریرہؓ کے ذریعے سے ہو کر امام مالک تک پہنچا اور امام مالک کا مکتب فکر وجود میں آگیا۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ایک طویل عرصہ تک کوفہ میں رہے۔ حضرت علیؓ بھی وہاں
تشریف لے گئے۔ ان کا اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا علم جو کوفہ میں تھا وہ ان تابعین تک پہنچا
جنہوں نے ان دو شخصیات سے کسب فیض کیا۔ ان تابعین میں بھی دو حضرات بہت نمایاں
ہیں۔ حضرت علقمہ اور حضرت اسود نخعی۔ ان دونوں کا علم بہت جلد ہو کر حضرت امام ابوحنیفہ تک آگیا۔
عبداللہ بن مسعودؓ کا علم علقمہ تک، علقمہ کا علم ابراہیم نخعی تک، ابراہیم نخعی کا علم حماد بن سلیمان
تک، حماد بن سلیمان کا علم امام ابوحنیفہ تک۔ پھر امام ابوحنیفہ کے شاگردوں میں امام محمد اور امام
ابو یوسف نے اس کو کتابی شکل میں مرتب کر دیا۔ یوں پوری کی پوری ایک نسل کو منتقل کر دیا اور یوں ایک
مکتب فکر بن گیا۔

پھر وہ حضرات ہیں جنہوں نے کوفہ اور مدینہ منورہ دونوں کے اہل علم سے استفادہ کیا اور ان دونوں روایتوں یعنی مدینہ اور کوفہ کی روایت کو جمع کیا۔ مدینہ اور کوفہ یعنی عراق کی روایت کو جس شخصیت نے ترقی دی وہ امام شافعی تھے۔ امام شافعی کے ہاں یہ دونوں روایتیں جمع ہو گئیں۔ امام شافعی نے طویل عرصہ تک مکہ مکرمہ میں رہ کر وہاں کے علما سے کسب فیض کیا۔ اس کے بعد وہ مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ مدینہ منورہ میں انہوں نے امام مالکؒ سے کسب فیض کیا۔ امام مالکؒ سے کسب فیض کرنے کے بعد وہ عراق گئے اور وہاں، بغداد اور عراق کے بقیہ علماء سے کسب فیض کیا جن کے پاس حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا علم تھا۔ اس طرح سے وہ دونوں روایتوں کے جامع بن گئے تو ایک تیسرا مکتب فکر وجود میں آ گیا۔

پھر امام شافعی سے جن حضرات نے کسب فیض کیا ان میں بعض لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کی طرف سے ان دونوں روایتوں کے جمع کرنے سے اہل علم کا ایک طبقہ سامنے آیا ہے جس کا زیادہ تر زور عقلیات اور رائے پر ہے۔ لہذا عقلیات اور رائے کے ساتھ ساتھ احادیث اور سنت پر زیادہ [illegible] کی ضرورت ہے۔ [illegible] زیادہ زور دینے کی اس ضرورت کا احساس جب پیدا ہوا تو امام احمد بن حنبل کا مکتب فکر وجود میں آیا۔ ان چاروں مسلکوں سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ چاروں مکاتب فکر وجود میں آئے ہیں یہ ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور نہ صرف یہ کہ الگ نہیں کیا جا سکتا بلکہ جن صحابہ کرامؓ کے علمی اثرات اور اجتہادی بصیرت اور غور و فکر کے نتیجے میں یہ مکاتب فکر وجود میں آئے وہ آپس میں اس طرح مربوط ہیں کہ ایک دوسرے سے کسب فیض کرتے ہیں اور سب کا علم چھن چھن کر ایک جگہ پہنچتا ہے۔

صحابہ کرامؓ پر یہ مباحث ایک پورے فن کا موضوع ہے۔ اس پر کتابیں ہیں۔ درجنوں کتابیں کئی کئی جلدوں میں لکھی گئی ہیں۔ ان کا انتہائی مختصر ترین خلاصہ بلکہ خلاصہ کا خلاصہ ہے جو میں نے آپ کے سامنے رکھا۔

تابعی کی تعریف

جس طرح صحابہ کرامؓ پر بحث ہوئی اسی طرح سے تابعین پر بھی بحث ہوئی۔ تابعین

ہوتا۔ کیونکہ کسی کی وجہ سے ان کو قبول اسلام کا موقع نہیں ملا۔ اس لئے تابعین میں شمار ہوئے۔ ان کا انتقال ظاہر ہے بعد میں ہوا ہوگا۔ یہ تابعین کی پہلی نسل تھی اور آخری نسل وہ تھی جنہوں نے کم سنی میں صغار صحابہ کو دیکھا۔ آخری صحابی جن کی وفات 110ھ میں ہوئی ان کو اگر کسی تابعی نے پانچ چھ سال کی عمر میں دیکھا ہو اور اس کی عمر سو سال یا ایک سو پانچ سال ہوئی ہو، جو کبھی کبھی ہو جاتی ہے ہر قوم اور معاشرے میں دو چار لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی عمر سو سال یا زیادہ ہو تو کرور ایسے کچھ لوگ ہوں تو وہ تابعی ہو جائیں گے۔ اس طرح تابعین کا زمانہ تقریباً 210ھ تک آجاتا ہے۔ یہ زمانہ صحابہ کرام کا ہے اور صحابہ کا زمانہ نسبتاً چھوٹا ہے۔ تابعین کا زمانہ تقریباً 110 سال ہوتا ہے۔ صحابہ کا زمانہ سو سال سے ایک بحث طویل ہوگا۔ اس لئے تابعین کے طبقات زیادہ ہیں اور صحابہ کے طبقات کم ہیں۔ تابعین کے یہ چند درجات ان کے درجات کے حساب سے ہیں

تابعین کے درجات

فن روایت کے نقطہ نظر سے صحابہ کی طرح تابعین کے بھی کئی درجات ہیں۔ سب سے بڑا درجہ کبار تابعین کا ہے۔ کبار تابعین سے مراد وہ لوگ ہیں [illegible] کبار صحابہ، عشرہ مبشرہ سے روایت کرتے ہیں وہ کبار تابعین کہلاتے ہیں۔ کبار تابعین میں ایک شخصیت ایسی بھی ہے جس کو ایسا شرف حاصل ہے جو کسی اور کو حاصل نہیں ہے۔ شاید کسی صحابی کو بھی حاصل نہ ہو۔ وہ ہیں حضرت قیس بن ابی حازم۔ یہ تمام عشرہ مبشرہ سے روایت کرتے ہیں۔ اگر کوئی ایک شخص ایسا ہے جس کے اساتذہ میں عشرہ مبشرہ کے تمام کے تمام صحابہ شامل ہوں تو وہ قیس بن ابی حازم ہیں۔ یہ واحد تابعی ہیں جو تمام عشرہ مبشرہ سے روایت کرتے ہیں۔ یہ بات امام حاکم نے اپنی کتاب میں لکھی ہے۔

اس کے بعد اوساط تابعین ہیں جو بقیہ صحابہ سے روایت کرتے ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ ان کی روایت کبار تابعین سے بھی ہے۔ جن کی روایت اکثر و بیشتر کبار تابعین سے ہے اور کبار صحابہ کے علاوہ جو بقیہ صحابہ کرام ہیں ان سے بھی روایت کرتے ہیں۔

صغار تابعین وہ ہیں جنہوں نے صغار صحابہ کو دیکھا ہے اور اوساط تابعین سے روایت کی ہے۔ ان میں سے بعض حضرات کی کبار صحابہ سے بھی روایت منقول ہے اور ثابت ہے۔ ان

قرآن پاک میں پیشین گوئی آئی ان کی تکمیل صحابہ کرامؓ کے ہاتھوں ہوئی۔ اس لئے قرنی جس کو
حضورؐ نے اپنا زمانہ کہا وہ دراصل صحابہ کرامؓ کا زمانہ ہے۔ ثم الذین یلونہم پھر ان کا زمانہ جو ان
کے بعد آئیں گے۔ یلونہم میں ضمیر جمع کی ہے جس سے اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ اگر حضورؐ کا
اپنا زمانہ مراد ہوتا تو آپؐ فرماتے کہ ثم الذین یلونی پھر وہ لوگ جو میرے بعد آئیں گے۔
لیکن آپؐ نے ایسا نہیں فرمایا بلکہ فرمایا ثم الذین یلونہم۔ گویا اس میں قرنی سے مراد صحابہ کا
زمانہ ہے۔ اسی لئے آپؐ نے جمع کی ضمیر کا استعمال فرمایا ہے۔ ثم الذین یلونہم پھر ان کا زمانہ جو
ان کے بعد آئیں گے یعنی تبع تابعین۔ تو پہلا یلونہم تابعین اور دوسرا یلونہم تبع تابعین کے
متعلق ہوا۔

ایک بزرگ نے ایک لطیف نکتہ کے طور پر لکھا کہ قرنی سے دورِ صحابہ مراد ہے۔ اس کے
شواہد میں سے ایک چیز یہ بھی ہے کہ چاروں خلفائے راشدین کے ناموں کا مخفف بھی
آ گیا ہے۔ ق سے صدیق، ر سے عمر، ن سے عثمان، ی سے علی۔ خلفائے راشدین کے ناموں کے
آخری حروف لیں تو قرنی بنتا ہے۔ یہ محض ایک نکتہ ہے۔ اگر آپ کا جی چاہے تو اتفاق کریں اور نہ
چاہے تو نہ کریں۔ لیکن خود حدیث کے الفاظ یلونہم سے بھی یہ اشارہ ملتا ہے کہ اس سے مراد صحابہ
کا دور ہے۔ اس لئے کہ وہ حضورؐ کے دور کی ایک توسیع اور تکملہ ہے۔

اس پر بڑی بحث ہوئی ہے کہ تابعین میں سب سے افضل شخصیت کون ہیں۔ اگر کسی
ایک شخصیت کو منتخب کرنا ہو تو سب سے افضل تابعی کس کو قرار دیا جائے گا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ اس
بارے میں ہم قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اللہ تعالیٰ ہی اس کا فیصلہ کرے گا۔ کچھ حضرات نے
کہا کہ افضل ترین تابعی حضرت قیس بن ابی حازمؒ ہیں جنہوں نے عشرہ مبشرہ سے روایت کی ہے۔
تاہم بہت بڑی تعداد میں علمائے حدیث کا کہنا ہے کہ افضل التابعین حضرت سعید بن المسیبؒ ہیں
جنہوں نے طویل عرصہ تک حضرت ابوہریرہؓ سے اور دیگر بہت سے صحابہ کرامؓ سے کسب فیض کیا۔
بعض کا خیال ہے کہ افضل التابعین یا سید التابعین حضرت اویس قرنیؒ ہیں جن کا ذکر صحیح مسلم میں
ہے اور رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے ان کا نام آیا ہے۔ کچھ کا خیال ہے کہ حضرت عطاء بن
ابی رباحؒ افضل التابعین ہیں جو مکہ مکرمہ میں سالہا سال قرآن اور حدیث کا درس دیتے رہے۔ جو اور
مکہ مکرمہ میں رہنے والے صحابہ کرامؓ کی بڑی تعداد سے انہوں نے کسب فیض کیا۔ کچھ کا خیال ہے

کہ افضل ترین تابعی حضرت قاسم بن محمدؒ ہیں جو سیدنا صدیق اکبرؓ کے پوتے اور ان کے بیٹے حضرت محمد بن ابوبکرؓ کے صاحبزادے ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ افضل ترین تابعی حضرت عروہ بن زبیرؒ ہیں جو حضرت عائشہؓ کے بھانجے ہیں جنہوں نے حضرت عائشہؓ سے بہت کسب فیض کیا اور جنہوں نے اسلامی تاریخ میں سب سے پہلے سیرت پر کتاب لکھی ہے۔ سیرت پر سب سے پہلا علمی کام انہوں نے کیا جس میں انہوں نے اپنی خالہ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایتوں کو جمع کیں اور ان کو ایک کتاب کی صورت میں مرتب کیا۔ وہ اپنی خالہ کے پاس جایا کرتے تھے۔ ان کے ہاں رہا کرتے تھے۔ خالہ نے ان کو بچپن سے رکھا اور ان کی تربیت کی اس لئے ان کے پاس جو علم تھا وہ بہت کم لوگوں کے پاس ہو سکتا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ حضرت حسن بصریؒ افضل التابعین ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ محمد بن سیرینؒ افضل التابعین ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ حضرت ابو ادریس الخولانیؒ ہیں۔ ابو ادریس الخولانی کا معاملہ بھی بالکل اسی طرح کا ہے جو حضرت عبدالرحمن الصنابحیؒ کا ہے۔ وہ حضورؐ کے زمانے میں اسلام لا چکے تھے لیکن مدینہ منورہ آنے کا موقع نہیں ملا۔ جب مدینہ منورہ آنے کا موقع ملا تو حضورؐ دنیا سے تشریف لے جا چکے تھے۔ اس لئے عمر کے اعتبار سے تو وہ صحابہ کرامؓ کے ہم عمر تھے البتہ منصب اور درجے کے اعتبار سے وہ تابعین کے اہم فرد تھے۔

تابعی اور تبع تابعی کا تعین

یہ سارے معاملات کہ تابعین اور تبع تابعین کا تعین کیسے ہو۔ ان کا دارومدار اکثر و بیشتر ایک خاص فن پر ہے، جس پر علمائے حدیث نے بہت کام کیا۔ وہ ہے تواریخ الرواۃ۔ یہ ویسے تو ایک ہلکا اور مختصر موضوع معلوم ہوتا ہے لیکن یہ موضوع جلد ہی اتنا پھیل گیا اور اس پر اتنا مواد جمع ہو گیا کہ محدثین نے اس پر الگ الگ کتابیں لکھیں۔ ایک کتاب کے بعد دوسری، پھر تیسری، پھر چوتھی۔ ایک بہت اہم کتاب اس موضوع پر امام بخاری کی کتاب التاریخ الکبیر ہے جو غالباً آٹھ جلدوں میں ہے۔ اس کے علاوہ اور لوگوں کی بھی اس پر کتابیں ہیں جن میں انہوں نے یہ پتہ چلانے کی کوشش کی کہ کس تابعی کا انتقال کس سن میں ہوا، کس تبع تابعی کا انتقال کس سن میں ہوا اور تبع تابعین کے شاگردوں میں کس کا انتقال کس سن میں ہوا۔ یہ بات جاننا اس لئے ضروری ہے کہ احادیث اور سندوں کی تحقیق میں بہت سے معاملات ایسے پیش آتے کہ اس تعین سے کسی

حدیث کے قابلِ قبول یا ناقابلِ قبول ہونے کا اندازہ ہو گیا۔

چنانچہ علامہ ابن الجوزی کے زمانے میں جو چھٹی صدی ہجری کا زمانہ ہے، شام کے کچھ یہودی کوئی دستاویز لے کر عباسی خلیفہ کے پاس آئے۔ وہ دستاویز کافی پرانی معلوم ہوتی تھی، قدیم خط میں لکھی ہوئی تھی۔ انہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ یہ وہ دستاویز ہے جو رسول اللہ ﷺ نے فتحِ خیبر کے موقع پر ہمیں دی تھی۔ اس میں یہ لکھا ہوا تھا کہ ہمیں فلاں فلاں معاملات سے مستثنیٰ کر دیا جائے گا۔ بہت سی مراعات کا اس میں ذکر تھا اور دعویٰ کیا گیا تھا کہ حضورؐ نے یہ مراعات ہمیں دی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ مراعات حضورؐ کے زمانے تک ہمیں ملتی رہیں۔ لیکن بعد میں جب ہمیں خیبر سے جلاوطن کر کے شام بھیجا گیا تو یہ مراعات بھی ہم سے لے لی گئیں۔ لہٰذا آپ یہ مراعات ہمیں دوبارہ دیں۔ خلیفۂ وقت نے وہ دستاویز اس زمانے کے سب سے بڑے محدث علامہ عبدالرحمن ابن الجوزی (جو مصنفِ اول کے محدثین میں سے تھے۔) کو بھیجی کہ بتائیں اس دستاویز کے بارے میں کیا فیصلہ کیا جائے؟ انہوں نے دستاویز سامنے رکھی اور اسے دیکھا تو پہلی ہی نظر میں معلوم ہو گیا کہ جعلی ہے۔ انہوں نے خلیفہ کو خط لکھا کہ یہ دستاویز جعلی ہے۔ لوگوں نے بڑی حیرت کا اظہار کیا کہ حضور ﷺ سے منسوب ایک دستاویز آئی ہے، خاصی پرانی ہے جس پر صحابۂ کرامؓ کی گواہیاں ہیں اور آپ نے ایک ہی نظر دیکھنے کے بعد کہہ دیا کہ جعلی ہے۔ خلیفہ نے علامہ ابن الجوزی کو بلایا کہ ذرا تشریف لائیے۔ وہ آئے تو پوچھا کہ آپ کس بنیاد پر یہ بات کہہ رہے ہیں کہ دستاویز جعلی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس دستاویز میں لکھا ہوا ہے کہ اس کے گواہان میں حضرت معاویہؓ اور حضرت سعد بن معاذؓ بھی شامل ہیں اور دعویٰ یہ کیا جا رہا ہے کہ یہ دستاویز رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں کو فتحِ خیبر کے موقع پر عطا کی۔ غزوۂ خیبر سن ۶ھ میں ہوا تھا۔ سن ۶ھ تک حضرت معاویہؓ اسلام قبول کر کے مدینہ منورہ نہیں آئے تھے۔ وہ فتحِ مکہ سے پہلے اور صلحِ حدیبیہ کے بعد اسلام لانے والے صحابہ میں سے ہیں۔ غزوۂ خیبر کے وقت حضرت معاویہؓ مسلمان ہی نہیں ہوئے تھے لہٰذا اس وقت ان کا خیبر جانا اور اس معاہدہ پر بطور گواہ دستخط کرنا، رسول مسلمانوں کی طرف سے دستخط کرنا خارج از امکان ہے۔ اسی طرح حضرت سعد بن معاذؓ کا انتقال غزوۂ احد کے وقت ہو گیا تھا۔ وہ غزوۂ احد میں شدید زخمی ہو گئے تھے اور اس کے فوراً بعد انہی زخموں کی وجہ سے کچھ ہی دن میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ بھی غزوۂ خیبر کے موقع پر اس وقت دنیا میں موجود نہیں تھے۔ لہٰذا ان

روایتی گواہیوں سے پتہ چلا کہ دستاویز جعلی ہے۔ یہ فن صحابہ کرامؓ، تابعین اور تبع تابعین اور
بقیہ راویوں کے سن پیدائش اور سن وفات کا تعین کرتا تھا۔

امام سفیان ثوری جو بڑے مشہور محدث ہیں وہ یہ کہتے ہیں (اور یہ قول کئی کتابوں میں
نقل ہوا ہے) کہ جب ایک زمانہ ایسا آیا کہ جب راویوں نے جھوٹ سے کام لینا شروع
کیا اس وقت انہی ... تو ہم نے ان کا مقابلہ کرنے کے لئے تاریخ کا استعمال شروع
کر دیا۔ یعنی ہمیں تاریخ کے استعمال سے پتہ چل جاتا ہے کہ کون کس زمانے میں زندہ تھا اور اس
نے کس کی روایت ممکن ہے اور کس کی روایت ممکن نہیں ہے۔

حضرت خالد بن معدان مشہور تابعی ہیں۔ ان کی وفات 104ھ میں ہوئی تھی۔ ان سے
ایک صاحب نے کوئی حدیث روایت کی اور دعویٰ کیا کہ سن 108ھ میں آرمینیا کی جنگ میں میں
نے ان سے یہ حدیث لی تھی۔ ایک مجلس میں وہ ایک صاحب احادیث بیان کر رہے تھے۔ دوران
روایت انہوں نے بیان کیا کہ مجھ سے ایک بڑے ثقہ راوی نے یہ روایت بیان کیا ہے۔ جب ان
سے پوچھا گیا کہ یہ ثقہ راوی کون ہیں۔ انہوں نے پھر کہا کہ ثقہ راوی نے بیان کیا ہے۔ بار بار
اصرار کیا گیا کہ اس ثقہ راوی کا نام بتائیں۔ تو انہوں نے کہا کہ خالد بن معدان نے بیان کیا تھا۔
پوچھنے والے نے پوچھا کہ آپ نے کس سن میں ان سے یہ روایت لی تھی؟ انہوں نے بتایا کہ 108
ھ میں۔ پوچھا گیا کہ کس جگہ؟ تو انہوں نے بتایا کہ وہ آرمینیا کی جنگ میں شریک تھے۔ جو محدث یہ
سوالات کر رہے تھے انہوں نے کہا کہ یہ روایت سراسر جعلی ہے۔ اس لئے کہ خالد بن معدان کا
انتقال 104ھ میں ہو گیا تھا اور وہ آرمینیا کی جنگ میں نہیں بلکہ روم کی جنگ میں شریک ہوئے تھے۔

ایک اور راوی تھے ابو خالد السقاء۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ انہوں نے حضرت انسؓ اور
حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کی ہے۔ یہ دعویٰ انہوں نے سن 209ھ میں کیا۔ امام ابو نعیم
اصفہانی جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے، وہ وہاں موجود تھے۔ انہوں نے پوچھا کہ آپ کی عمر کیا ہے۔
ابو خالد انہوں نے جواب دیا کہ 125 سال ہے۔ حضرت ابو نعیم نے کہا کہ پھر آپ کی پیدائش سے
پانچ سال پہلے حضرت عبداللہ بن عمرؓ وفات پا چکے تھے۔ یہ سن 209ھ بہت ہی متاخر تابعین کا
زمانہ ہے۔ یہ دراصل تابعین کا زمانہ نہیں ہے۔ تابعین کا زمانہ صحابہ کرامؓ کے زمانے سے لے کر کوئی اسی
نوے سال کے بعد تک کا ہے۔ صحابہ کا آخری دور 110ھ تک ہے۔ اس کے بعد اسی یا نوے سال

گئیں تو تقریباً 190 یا 200ھ کے لگ بھگ بیشتر تابعین کا زمانہ ختم ہو گیا۔

ان حضرات کا بیشتر ذخیرہ امام بخاری، حضرت علی بن المدینی، ابو حاتم رازی اور امام نسائی کی کتابوں میں ہے۔ ان میں سب سے بڑا ماخذ حضرت امام بخاری کی کتاب التاریخ الکبیر ہے جو آٹھ جلدوں میں ہے۔

ان راویوں کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کا تعین کرنے کے ساتھ ساتھ اور ان کے ضبط، حافظہ، عدالت اور کردار کا تعین کرنے کے ساتھ ساتھ ایک مسئلہ یہ بھی پیدا ہوا کہ ان کی رشتہ داریوں پر بھی بحث کی جائے اور یہ پتہ چلایا جائے کہ کون کس کا بھائی تھا اور کون کس کی بہن تھی وغیرہ وغیرہ۔ اس کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ اگر ایک راوی مثلاً ایک تابعی راوی کے دو بیٹے ہوں، ایک بیٹا بہت باکردار اور سچا راوی ہو اور دوسرا بیٹا اس درجہ کا نہ ہو اور روایت اس طرح کی جائے کہ ابن فلاں نے روایت کی تو یہ جاننا بہت ضروری ہوگا کہ یہاں ابن فلاں سے کون سا بیٹا مراد ہے، پہلا بیٹا مراد ہے کہ دوسرا بیٹا مراد ہے۔ اگر ایک ہی بیٹا ہے تو پھر تو ابن فلاں کی روایت قبول کرنے میں کوئی شک اور تامل نہیں ہے۔ لیکن اگر دو بیٹے ہیں تو پھر تحقیق کرنی پڑے گی کہ کون سے بیٹے کی روایت ہے اور کس بیٹے کا درجہ کیا تھا۔ اس تحقیق کی ضرورت وہاں ہوتی جہاں یہ ثابت ہو جائے کہ کسی راوی کے دو یا تین یا چار بیٹے تھے۔ یہی حال بہنوں کا ہے۔ مثلاً عمرہ بنت عبدالرحمن ایک انتہائی مستند راویہ ہیں۔ انہوں نے احادیث کا ایک مجموعہ بھی مرتب کیا تھا۔ عمرہ بنت عبدالرحمن سے روایت کرنے والی ان کی صاحبزادی اور مثال کے طور پر فرض کریں کہ ان کی دو بیٹیاں ہوں اور آپ کے پاس اگر کوئی کہے کہ بنت عمرہ نے یہ روایت کی ہے۔ اب بنت عمرہ سے مراد کون سی بیٹی ہے؟ وہ بیٹی جس کا حافظہ اور کردار اچھا تھا یا وہ بیٹی جس کا حافظہ اچھا نہیں تھا۔ اس تحقیق کی ضرورت تب پیش آئے گی جب یہ پتہ ہو کہ عمرہ کی دو صاحبزادیاں راویات تھیں۔ اس موضوع پر امام مسلم نے ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام الاخوۃ والاخوات ہے۔ امام ابو داؤد نے، امام نسائی نے اور امام بخاری کے استاد علی بن المدینی نے بھی اس موضوع پر الگ سے کتابیں لکھیں۔

ایک اور چیز جس کا مختصر تذکرہ پہلے بھی ہو چکا ہے۔ وہ حدیث ضعیف کی تفصیلی واقفیت اور معرفت ہے۔ علم حدیث میں جو مشکل ترین میدان ہے، وہ حدیث ضعیف کا تعین ہے۔

محدثین نے حدیث ضعیف کے بہت سے درجے بتائے ہیں۔ بعض حضرات بیالیس یا تریسٹھ درجات بتاتے ہیں۔ بعض نے چونسٹھ اور بعض نے اس سے بھی زیادہ بتائے ہیں۔ حتی کہ سو سے لے کر سو کے قریب قسمیں حدیث ضعیف کی بتائی گئی ہیں۔ جن میں سے ہر ایک کے الگ احکام ہیں اور ہر ایک کا الگ درجہ ہے۔ لیکن ایک بات پر سب متفق ہیں۔ اسباب ضعف متساویۃ الضعف نہیں۔ درجات متفاوت ہیں۔ یعنی ان احادیث میں ضعف کے اعتبار سے کمی بیشی ہوسکتی ہے۔ ایک ضعف کم درجہ کا ہوگا، دوسرا ضعف زیادہ درجہ کا ہوگا۔ زیادہ ضعف میں بھی پھر کئی درجات ہوسکتے ہیں۔ بعض اوقات کسی حدیث میں ضعف کا ایک سبب ہوگا، بعض اوقات ایک سے زیادہ اسباب ہوں گے۔ پھر اسباب مختلف ہوں گے اور مختلف قسم کے ہوں گے۔ ان سے اسباب ضعف اور مراتب پر بھی بحث ضروری ہے۔ ان میں سے بعض پہلوؤں کا اختصار کے ساتھ بیان میں کرچکا ہوں۔ اب دہرانے کی ضرورت نہیں۔

ضعیف حدیث پر عمل

کیا حدیث ضعیف پر عمل کیا جاسکتا ہے؟ یا نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بارے میں اہل علم میں تین نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں۔ یہاں جب میں اہل علم کا لفظ استعمال کررہا ہوں تو اس سے مراد محدثین بھی ہیں، فقہائے کرام بھی ہیں اور وہ حضرات بھی ہیں جو بیک وقت محدثین بھی ہیں اور فقیہ بھی ہیں۔ مثلاً امام شافعی اور امام مالک وغیرہ۔ وہ حضرات بھی مراد ہیں جو صرف محدث ہیں مثلاً امام نسائی یا امام علی بن المدینی یا امام ابوحاتم رازی۔ اسی طرح وہ حضرات بھی یہاں مراد ہیں جن کی شہرت صرف فقیہ کی ہے، مثلاً امام ابوحنیفہ۔ ان سب نقطہ ہائے نظر کو تین اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

۱۔ ایک نقطہ نظر وہ ہے جو اکثر و بیشتر ان حضرات کا ہے جو صرف محدث ہیں اور علم حدیث میں زیادہ نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ کسی صورت میں حدیث ضعیف پر مطلقاً عمل نہیں کرنا چاہئے، نہ احکام میں نہ فضائل میں نہ کسی اور چیز میں۔ اس لئے کہ جس بات یا قول کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے کہ اس کی نسبت رسول اللہ ﷺ سے کمزور ہے، ایسی بات کی نسبت حضور سے کرنا ایک اعتبار سے رسول اللہ ﷺ سے غلط چیز منسوب کرنے کے

مترادف ہے۔ جب اس کی نسبت ہی بگڑ گئی ہے تو حضورؐ سے آپ کیسے اس کو منسوب کر سکتے ہیں اور بطور حدیث رسول اس پر کس طرح عمل کر سکتے ہیں۔ یہ نقطہ نظر امام یحییٰ بن معین، امام بخاری، امام مسلم اور امام ابن حزم کا ہے۔ ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ اگر کسی حدیث کا ضعیف ہونا ثابت ہو گیا تو اس پر عمل درآمد نہیں ہوگا۔

۲۔ ایک دوسرا نقطہ نظر درمیانہ درجے کے کچھ لوگوں کا ہے یعنی ان حضرات کا جو حدیث اور فقہ دونوں میں دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ ضعیف حدیث پر عمل کیا جائے گا یعنی مطلقاً 'ہر حال میں' عمل کیا جائے گا۔ یہ رائے امام ابوداؤد اور امام احمد بن حنبل سے منسوب ہے۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ حدیث ضعیف بھی اگر مل جائے تو وہ ہماری تمہاری رائے سے زیادہ بہتر ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم اپنی یا کسی انسان کی رائے پر عمل کریں یہ اس سے بہتر ہے کہ حدیث ضعیف پر عمل کر لیں۔ وہ رسول اللہ ﷺ سے منسوب ایک چیز موجود ہے۔ اگرچہ اس کی نسبت مشکوک ہے لیکن پھر بھی اس پر عمل کیا جانا چاہئے۔ یہ ایک طرح سے عاشقانہ اور ایک والہانہ قسم کی بات ہے۔

۳۔ تیسرا نقطہ نظر جو اکثر ائمہ فقہا کا نقطہ نظر ہے اور محدثین میں سے بھی بعض حضرات کا یہی نقطہ نظر ہے۔ وہ یہ ہے کہ فضائل کے باب میں حدیث ضعیف پر کچھ شرائط کے ساتھ عمل کیا جا سکے گا۔ یہ شرائط اگر موجود ہوں تو فضائل، مناقب اور دعاؤں کے باب میں اس پر عمل کیا جائے گا۔ پہلی شرط یہ ہے کہ اس حدیث ضعیف سے نہ کوئی حلال حرام ثابت ہوتا ہو نہ کوئی حرام حلال ثابت ہوتا ہو اور نہ اس سے شریعت کا کوئی حکم ثابت ہوتا ہو۔ یعنی حکم شرعی اور حلال، حرام جیسے معاملات حدیث ضعیف کی بنیاد پر طے نہیں ہو سکتے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ حدیث ترغیب یا ترہیب کے موضوع پر ہو۔ یعنی اس میں کسی نیک کام کی ترغیب دلائی گئی ہو یا کسی برے کام کے انجام سے ڈرایا گیا ہو۔ اس میں ایک بات ضرور رکھئے کہ کسی فعل کا اچھا فعل ہونا اس سے ثابت نہیں ہوگا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی ضعیف حدیث میں یہ بتایا گیا ہو کہ فلاں فعل اچھا ہے اس کو اختیار کریں اور آپ اس ضعیف حدیث کی بنیاد پر اس فعل کو اچھا فعل قرار دے دیں۔ بلکہ وہ فعل جس کا اچھا ہونا پہلے سے ثابت ہو اس فعل کی ترغیب دلائی گئی ہو اور کسی ایسے عمل کے انجام سے ڈرایا گیا ہو جس کا برا ہونا پہلے سے ثابت ہو۔ اس کا انجام بتایا گیا ہو۔ تیسری شرط یہ ہے کہ اس کا

ہیں۔ اس لئے اگر کوئی شخص عمل کرتا ہو تو اس پر اعتراض نہ کریں۔

جو حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ حدیث ضعیف پر عمل نہیں کرنا چاہئے مثلاً علی بن المدینی اور اس طرح ان کے ہم مسلک دوسرے حضرات اس پر متفق ہیں کہ اس پر عمل نہ کریں۔ جو حضرات سمجھتے ہیں کہ حدیث ضعیف پر ہر صورت میں عمل کرنا چاہئے ان میں سے بہت سے عمل کر رہے ہیں۔ آپ کا نقطۂ نظر کوئی پوچھے تو آپ بیان کر دیجئے کہ ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے۔ اس کے دلائل پوچھے تو وہ بھی بیان کر دیجئے۔ لیکن ان معاملات میں جن میں صحابہ کرامؓ اور تابعین کے زمانہ سے امت میں ایک سے زائد آراء چلی آرہی ہیں امت میں تفریق پیدا نہیں کرنی چاہئے۔ امت کی وحدت اور اتفاق قرآن پاک کی نص قطعی سے ثابت ہے۔ قطعی الدلالت اور قطعی الثبوت ہے کہ ان هذه امتکم امة واحدة۔ سنت سے قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت نصوص سے ثابت ہے کہ امت کی وحدت کا تحفظ کرنا چاہئے۔ لہٰذا اس طرح کے اختلافی معاملہ میں جہاں تابعین کے زمانے سے متعدد آراء چلی آرہی ہوں، اور بڑے بڑے محدثین اور بڑے بڑے علما کے نقطہ ہائے نظر تین طرح کے پائے جاتے ہیں تو ایسے معاملات میں نکیر نہیں کرنی چاہئے۔ آج بھی اگر وہ تین آراء موجود ہوں تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ اس کی بنیاد پر اگر کوئی اختلاف ایسا پیدا نہیں ہونا چاہئے کہ جس سے امت میں کوئی تفریق ہو جائے۔

ضعیف حدیث سے متعلق ایک دو مسائل اور ہیں جو علم حدیث کے طلبہ کو خاص طور پر یاد رکھنے چاہئیں۔ مثال کے طور پر اگر آپ کوئی کتاب پڑھ رہی ہوں۔ فرض کریں کہ آپ جامع ترمذی پڑھ رہی ہوں یا ابو داؤد کی سنن کا مطالعہ کر رہی ہوں۔ اور پڑھتے پڑھتے آپ کو حاشیہ میں کسی کی تعلیق یا حاشیہ نظر آئے کہ 'ضعیف' کہ یہ حدیث ضعیف ہے تو اس کے بارے میں فوراً یہ فیصلہ نہ کیجئے کہ یہ حدیث ناقابل اعتبار ہے اور بالکل ضعیف ہے۔ اس لئے کہ جب محدثین یہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے تو ان کی مراد وہ طریقہ یا وہ روایت یا وہ سند ہوتی ہے جس سے وہ بیان ہوئی ہے۔ اس روایت میں طریقہ بھی شامل ہے اور متن بھی شامل ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اس روایت یا اس سند کو کمزور کہہ رہے ہوں اور متن کمزور نہ ہو۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث ایک سند سے قوی اور صحیح ہے اور دوسری سند سے ضعیف ہے۔ اب اگر محدث ایک سند کو ضعیف قرار دے رہا ہے تو ضروری نہیں کہ متن بھی ضعیف ہے۔ یہ تحقیق کرنی چاہئے کہ بقیہ طرق

سے بھی یہ متن جو پہنچا ہے تو سارے طرق ضعیف ہیں یا بعض طرق ضعیف ہیں اور بعض قوی ہیں۔ پھر اگر سند رے کے سارے طرق ضعیف ثابت ہوں تو پھر اس کو حتمی درجہ مقرر کیا جائے گا۔ اگر بہت سارے طرق ضعیف مل جائیں اور ان سب میں ضعف الگ الگ قسم کا ہو تو پھر اس حدیث کا درجہ عام ضعیف سے مختلف ہوگا۔

یہ ایک لمبی بحث ہے۔ مثالیں اگر مثالیں دوں گا تو بات اور بھی لمبی ہو جائے گی۔ ضعف الگ الگ قسم کا ہو اور مختلف درجات اور مراتب میں ضعف ہو تو وہ ایک دوسرے کو جبر کر دیتا ہے یعنی یہ دو قسم کا ضعف ایک دوسرے کو compensate کر دیتا ہے۔ پھر وہ حدیث حسن کے درجہ پر پہنچ جاتی ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ سب جگہ پر ایک ہی درجہ اور ایک ہی قسم کا ضعف ہے تو وہ حدیث ضعیف ہے۔ فرض کریں ایک حدیث روایت ہوئی جس میں راوی الف نے بیان کیا کہ انہوں نے راوی ب سے یہ حدیث سنی۔ راوی ب نے بیان کیا کہ انہوں نے راوی ج سے سنی۔ راوی ج بیان کرے کہ انہوں نے راوی د سے سنی۔ راوی د بیان کرتا ہے کہ انہوں نے فلاں صحابیؓ سے سنی اور فلاں صحابیؓ نے رسول اللہ ﷺ سے سنی۔ اب راوی د جو ہیں ان کی روایت یا سماع کسی صحابیؓ سے ثابت نہیں ہے اور وہ مثال کے طور پر تابعین میں سے نہیں ہیں۔ اب اگر بعد میں کوئی اور سند ایسی دستیاب ہو جائے جس میں ایک تابعی اسی حدیث کو کسی اور صحابیؓ سے روایت کرتے ہیں جن سے ان کی ملاقات ثابت ہے تو پھر یہ حدیث صحیح ہوگی اور جو کمزوری تھی وہ دور ہو گئی۔ گویا وہ خاص سند کمزور تھی، لیکن چونکہ متن دوسری صحیح سندوں سے بھی آیا ہے اس لئے متن اپنی جگہ درست قرار پا گیا۔ اس کے بارہ میں سمجھا جائے گا کہ اس کمزور روایت سے جو متن آیا ہے وہ حسن لغیرہ ہے۔ لیکن دوسری روایت سے جو آیا ہے وہ صحیح ہے۔

اگر تحقیق سے یہ پتہ چلے کہ جہاں جہاں تابعی سے صحابیؓ کا سلسلہ جڑ رہا بیان کیا جاتا ہے وہاں یہ خلا پایا جاتا ہے۔ یا تو یہی ایک راوی ہو جو مختلف صحابہ سے بیان کرتا ہے اور اس کی ملاقات کسی صحابیؓ سے ثابت نہیں تو اس کا درجہ بہت نیچے چلا جائے گا۔ اس کو متہم بالکذب کہا جائے گا، جو موضوع سے ایک درجہ اونچا ہے اور جو ضعف کی سب سے نچلی قسم ہے۔ اگر کچھ تابعین ایسے ہیں جن کی روایت صحابہ کرام سے ممکن ہے یا ثابت ہے تو پھر سمجھا جائے گا کہ ضعف ذرا نیچے درجے کا ہے۔ اس لئے کسی حدیث کو حتمی طور پر ضعیف قرار دینے میں بہت احتیاط سے کام لینا چاہئے۔

یہ بات بتانا میں نے اس لئے ضروری سمجھی کہ بعض محدثین نے علم حدیث کی الگ الگ کتابوں کا جائزہ لے کر ان کی روایات کو بالکل ایک ایک کر کے یہ تعین کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کا درجہ صحیح کا ہے، ضعیف کا ہے یا موضوع کا ہے۔ کسی حدیث کا موضوع ہونا تو واضح ہے، لیکن جب وہ کسی روایت کو صحیح یا حسن یا ضعیف قرار دیتے ہیں تو وہ صرف اس روایت کو ضعیف وغیرہ قرار دے رہے ہوتے ہیں جو اس طریق سے اس کتاب میں بیان ہوئی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ متن اگر مثلاً صحیح بخاری میں کسی اور طریق سے آیا ہو تو وہ بھی ضعیف ہو، وہ طریق ظاہر ہے ضعیف نہیں ہوگا۔ یہ وضاحت میں نے اس لئے کی کہ میں نے بہت سے لوگوں کو خود دیکھا ہے کہ ان کے سامنے ایک حدیث بیان ہوئی اور انہوں نے فوراً یہ سمجھتے ہی کہہ دیا کہ یہ حدیث ضعیف ہے، اس لئے کہ فلاں بزرگ نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔ وہ دراصل بھول جاتے ہیں کہ جو ضعیف ہے وہ اس روایت کے ساتھ اس کتاب میں ضعیف ہے۔ لیکن اگر وہی روایت کسی اور روایت اور سند سے کسی اور کتاب میں آئی ہے تو ضروری نہیں کہ وہ بھی ضعیف ہو، ہو سکتا ہے کہ صحیح ہو، ہو سکتا ہے کہ حسن ہو، حسن لغیرہ ہو یا حسن لغیرہ ہو، بہر حال حتمی رائے دینے سے پہلے یہ دیکھ لینا چاہئے۔

چنانچہ حدیث کی وہ قسم جو ضعیف سند سے لوگوں تک پہنچی ہو لیکن اس کا ضعف ذرا ہلکی قسم کا ہو۔ جب آپ اس حدیث کو کسی جگہ بیان کریں اور آپ کے علم میں ہو کہ یہ حدیث ضعیف ہے تو بہترین طریقہ یہ ہے اور ذمہ داری کا تقاضا بھی ہے کہ یہ بیان کر دیں کہ یہ ضعیف حدیث ہے۔ لیکن اس ضعیف حدیث میں فلاں بات ارشاد فرمائی گئی ہے جو بظاہر درست ہے اس لئے اس پر عمل کرنا چاہئے۔ بہت سے لوگ اس بات کا اہتمام نہیں کرتے، کیوں نہیں کرتے، اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ جو لوگ ایسا نہیں کرتے ان کو کم از کم اتنا ضرور کرنا چاہئے اور اس پر محدثین نے زور دیا ہے کہ وہ یہ نہ کہیں کہ قال رسول اللہ ﷺ، رسول اللہ ﷺ نے یہ بات ارشاد فرمائی۔ بلکہ اگر اس کو بیان کرنا ہی ہو تو صرف یہ کہنے پر اکتفا کریں کہ روایت میں آتا ہے کہ یہ بات ارشاد فرمائی گئی۔ یا بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ حضورؐ نے یہ بات ارشاد فرمائی، یا حضورؐ سے یہ منسوب ہے کہ آپؐ نے یہ بات ارشاد فرمائی، یا فلاں کتاب میں اس طرح آیا ہے، ترمذی شریف میں آیا ہے کہ فلاں کام اس طرح ہے۔ اس طرح آپ براہ راست رسول اللہ ﷺ سے نسبت کرنے سے بچ جاتے ہیں اور یوں ایک کمزور چیز کی نسبت حضورؐ سے نہیں ہو سکے گی۔

بعض محدثین اتنے اونچے درجے کے ہیں کہ ان سے او نچا درجہ علم حدیث میں اللہ نے بہت کم لوگوں کو عطا فرمایا۔ ان میں سے ایک نام یحیٰی بن معین ہیں۔ امام احمد بن حنبل ہیں، امام ابوزرعہ ہیں، امام بخاری ہیں۔ یہ لوگ بڑے اونچے درجہ کے محدث ہیں۔ جب اتنے اونچے درجہ کے محدث یہ کہیں کہ لا اعرف هذا الحدیث کہ میں اس حدیث سے واقف نہیں، یا مجھے نہیں پتہ کہ یہ حدیث کیا ہے تو پھر اس بات کے باور کرنے کے آثار ہیں کہ یہ حدیث صحیح یا حسن نہیں ہے، یا تو بالکل ہی ضعیف ہے یا موضوع ہے۔ لیکن کیا محض کسی ایک محدث کے کہنے سے ہم یہ کہہ دیں کہ حدیث موضوع ہے؟ یہ بھی احتیاط کے خلاف ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلاں بڑے محدث نے اس حدیث کے جاننے سے انکار کردیا ہے۔ البتہ یہ تردد روایت معلوم ہوتی ہے۔ اس میں احتیاط سے کام لینا چاہئے اور از سر نو تحقیق کرلینی چاہئے۔

علل حدیث

یہ علم حدیث کا ایک اور اہم میدان ہے جو بڑا مشکل ہے۔ میں اس کی تفصیلی مثالیں دینا چاہتا تھا۔ لیکن ایک مثال دینے کے لئے بھی بڑی تفصیلی گفتگو چاہئے۔ امام ابوحاتم رازی کی کتاب علل الحدیث دو جلدوں میں چھپی ہوئی موجود ہے میں آج وہ ساتھ لانا چاہتا تھا لیکن پھر اس لئے نہیں لایا کہ کتاب سامنے رکھ کر علل پر گفتگو شروع کی تو بات بہت لمبی ہوجائے گی اور باقی موضوعات رہ جائیں گے۔ علل الحدیث سے مراد کسی حدیث میں متن یا سند کے اعتبار سے وہ کمزوری ہے جس کا عام طالب حدیث یا عالم حدیث کو پتہ نہ چلے اور جس کا پتہ چلانے کے لئے بڑی گہری بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ہے خواص علل الحدیث کا۔ اور سب سے مشکل فن علم حدیث میں یہی ہے۔ یہاں ایک بات یاد رکھنی چاہئے۔ محدثین نے لکھا ہے کہ الحدیث الصحیح لا معلل ولا ضعیف، یعنی ایک حدیث جو پہلے تو حدیث صحیح ہے، روایت کے اعتبار سے بھی صحیح ہے، سند اور متن کے اعتبار سے بھی صحیح ہے، درایت کے اعتبار سے بھی صحیح ہے اور آپ نے ان سب پہلوؤں سے تحقیق کرنے کے بعد یہ حتمی نتیجہ نکال لیا کہ یہ صحیح حدیث ہے۔ اب اسی موضوع پر کوئی کمزور یا معلل حدیث آپ کے سامنے آئی تو اس حدیث کے معلل ہونے کی وجہ سے پہلے سے صحیح ثابت شدہ اس حدیث پر اثر نہیں پڑے گا۔ بلکہ اس کے صحیح ہونے کی وجہ سے اس

معلل یا ضعیف حدیث کی علت دور ہو جائے گی۔ کمزور قوی کو متاثر نہیں کر سکتا، البتہ قوی کمزور کو متاثر کر سکتا ہے۔ یہ بھی ایک عقلی بات ہے۔

علم حدیث کے آداب

علم حدیث پر جن حضرات نے کتابیں لکھی ہیں ان میں سے خطیب بغدادی کی دو کتابیں بھی شامل ہیں۔ آپ میں سے جو لوگ عربی جانتے ہیں وہ ضرور یہ دونوں کتابیں پڑھیں۔ ان میں یہ بتایا گیا ہے کہ حدیث پڑھنے والوں کو کن آداب کی پیروی کرنی چاہیے۔ کل میں نے سفر یعنی رحلہ کے آداب کا ذکر کیا تھا۔ لیکن خود علم حدیث کے پڑھنے میں کن آداب کی پیروی کرنی چاہیے، محدث کے آداب کیا ہیں، طالب حدیث کے آداب کیا ہیں، لکھنے والے کے آداب کیا ہیں، املا کے آداب کیا ہیں، املا لینے اور دوسروں کو املا دینے کے آداب کیا ہیں۔ ایک تو مستملی وہ ہے جو شیخ سے املا لے کر آگے لوگوں کو بتا رہا ہے، اور دوسرا مستملی وہ ہے جو خود اپنے لیے لکھ رہا ہے۔ دونوں کے الگ الگ آداب ہیں اور اس پر الگ الگ کتابیں ہیں۔ امام خطیب بغدادی کی دو کتابیں اہم ہیں 'الکفایہ فی علم الروایۃ' اور 'الجامع فی آداب الراوی و اخلاق السامع'۔ ان میں انہوں نے راوی اور سامع کے آداب بتائے ہیں۔ الجامع دو جلدوں میں ہے اور الکفایہ ایک ضخیم جلد میں ہے۔ ان دونوں کتابوں میں انہوں نے جو آداب بتائے ہیں ان کی تلخیص امام غزالی نے احیاء العلوم میں کی ہے جس کے اردو اور انگریزی دونوں تراجم ملتے ہیں۔ انگریزی ترجمہ جو ہمارے ملک میں چھپا ہے، بڑا ناقص ہے۔ اس کو بھی آپ دیکھنا چاہیں تو دیکھ لیں۔ اس میں آپ کو آداب مل جائیں گے۔ اس نسخے میں اس کا حوالہ دے کر اس بات کو یہیں چھوڑ دیتا ہوں۔ اسی طرح کی ایک کتاب علامہ سمعانی کی ہے جس میں انہوں نے 'ادب الاملاء والاستملاء' بیان کیے ہیں، کہ املا کے آداب کیا ہیں اور استملاء کے آداب کیا ہیں اور جو شخص املا لے کر آگے بیان کرے گا یعنی مستملی، اس کے آداب کیا ہیں۔ اس کے علاوہ طالب حدیث کے آداب کیا ہیں، ان کا خلاصہ بھی امام غزالی نے دیا ہے، وہاں سے دیکھ لیں۔

درس حدیث کی اقسام

ابتدا ہی سے حدیث پڑھانے کے تین انداز اور اسالیب مروج رہے ہیں۔ اور یہ بڑی

عجیب بات ہے۔ جب میں نے پہلی مرتبہ ان کے بارے میں پڑھا تو مجھے بہت حیرت ہوئی اور کسی حد تک وہ حیرت آج بھی موجود ہے۔ ان تینوں طریقوں کا بہت سے اہل علم نے ذکر کیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے استاد تھے شیخ ابو طاہر الکردی، جب آگے میں اپنی سند بیان کروں گا تو ان کا بھی نام آئے گا۔ اس لئے بالواسطہ طور پر وہ میرے بھی استاد ہیں۔ انہوں نے بھی ان تین طریقوں کی تفصیل بیان کی ہے۔

ان ایک طریقہ ہے السرد کا۔ سرد کے معنی ہیں بیان کرنا یعنی simple naration۔ یہ طریقہ اہل علم کے لئے ہے، یعنی وہ لوگ جو حدیث کا اچھا علم رکھتے ہیں۔ اس طریقہ کے تحت شیخ کا کام یہ ہے کہ وہ حدیث کو بیان کرتا جائے، خود پڑھ کر سنائے یا طالب علم سے پڑھوا کر سنے یا ایک طالب علم پڑھے اور بقیہ طلبہ سنیں، یا ایک ایک کر کے سب سنائیں، یہ طریقہ سرد کہلاتا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر شیخ کا اور کوئی کام نہیں ہوتا۔ اس نے ایک کتاب پڑھ کر سنائی اور آپ کو اجازت دے دی۔ یا آپ نے پڑھ کر سنائی۔ اس نے سن کر آپ کو اجازت دے دی۔ یا ایک ایک کر کے سب نے پڑھ کر سنائی اور سب کو اجازت دے دی۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ یہ طریقہ علماء اور خواص کے ساتھ مخصوص ہے اس لئے کہ وہ پہلے سے علم حدیث پڑھ چکے ہیں۔ علم حدیث کے معانی اور مطالب کو جانتے ہیں۔ علمی سطح پر اس درجہ کے لوگ ہیں کہ علم حدیث کے سارے مباحث ان کے سامنے ہیں۔

۲۔ دوسرا طریقہ کہلاتا ہے طریق الحل والبحث۔ یعنی حدیث کی مشکلات حل کرنے اور مسائل پر بحث کرنے کا طریقہ۔ کہتے ہیں کہ یہ طریقہ حدیث کے طلبہ کے لئے ہے اور جو حدیث کے طلبہ ہوں ان کے لئے یہی طریقہ ہونا چاہئے۔ یہاں علم حدیث کے لغوی، فنی اور فقہی مباحث کا ذکر ہوگا۔ فنی مباحث سے مراد علم روایت اور علوم حدیث سے متعلق مباحث ہیں اور فقہی مباحث سے مراد ہے ان احادیث کی خصوصی تحقیق جہاں فقہ سے متعلق مسائل کا ذکر ہو، کلامی مباحث یعنی عقیدہ سے متعلق اور لغوی مباحث یعنی جہاں کوئی مشکل لفظ آ گیا ہے اس پر بحث۔ یہ طریقہ طلبہ کے لئے ہے۔ ان اہل علم نے لکھا ہے کہ اس میں اعتدال اور توازن سے کام لینا چاہئے، زیادہ تفصیلی بحث نہیں کرنی چاہئے۔

۳۔ تیسرا طریقہ امعان کا ہے۔ امعان یعنی گہرائی سے دقیق کام کرنا۔ امعان کی

میں ایک سے زیادہ قوّت دلائل ہوں گی۔ اس میں اختلاف رائے بھی ہوگا۔ ایک محدث کی نظر میں ایک حدیث کو ترجیح حاصل ہوگی تو دوسرے کی نظر میں دوسری حدیث کو ترجیح حاصل ہوتی۔ اس لئے ان مسائل پر زندگی بھر کسی بھی لڑنے کا نہیں۔

مثال کے طور پر وجوہ ترجیح میں سے بعض کبار فقہاء کے نزدیک ایک اہم وجہ ترجیح یہ ہے کہ اگر دونوں روایتیں برابر درجے کی ہوں تو اس صحابیؓ کی روایت کو زیادہ ترجیح دی جائے گی جن کو رسول اللہ ﷺ کی قربت زیادہ حاصل رہی ہوگی، بہ نسبت ان صحابی کی روایت کے جو حضور ﷺ کے اتنے قریب نہیں رہے۔ یہ بڑی معقول بات معلوم ہوتی ہے اور اس سے اختلاف کرنا بہت مشکل ہے۔

ایک اور وجہ ترجیح جو ایک معقول رائے پر مبنی ہے کہ جو بعد کا طرز عمل ہے اس کو ترجیح دی جائے گی، بہ نسبت پہلے کے طرز عمل کے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک عمل پہلے اختیار فرمایا اور دوسرا بعد میں اختیار فرمایا۔ دونوں احادیث بظاہر متعارض معلوم ہوں تو ایسے میں بعد والی حدیث کو ترجیح دی جائے گی، پہلی والی کو چھوڑ دیا جائے گا۔ امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں جہاں دونوں احادیث کے زمانہ صدور کی تعیین ممکن نہ ہو وہاں ان صحابیؓ کی رائے کو ترجیح دی جائے گی جو حضور ﷺ کے زیادہ قریب رہے ہیں۔ جو صحابی حضور ﷺ سے زیادہ قریب نہیں رہے یا کم عرصہ قریب رہے ان کی روایت کو ترجیح نہیں دی جائے گی۔ چنانچہ رفع یدین کے مسئلہ پر لوگ بہت جھگڑتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ رفع یدین کی روایت نہیں کیا کرتے تھے اور بغیر ہاتھ اٹھائے رکوع میں جایا کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہاتھ مبارک اٹھا کر رکوع میں جایا کرتے تھے اور گویا رفع یدین کے ساتھ نماز پڑھا کرتے تھے۔ دونوں صحابی ہیں، دونوں کا درجہ بہت اونچا ہے، دونوں کی روایت کا درجہ بالکل برابر ہے۔ امام ابوحنیفہ کا ارشاد گرامی یہ ہے کہ یہاں ان صحابی کی روایت کو ترجیح دی جائے گی جو حضورؐ کے زیادہ قریب رہے۔ وہ صحابی جو مکہ مکرمہ کے چوتھے پانچویں سال اسلام میں داخل ہوگئے اور حضورؐ کے اتنے قریب تھے کہ باہر سے آنے والے ان کو اہل بیت میں سے سمجھتے تھے ان کی روایت کو ترجیح دی جائے گی، بہ نسبت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت کے جو غزوہ احد میں اس لئے واپس کر دیئے گئے کہ کم سن تھے اور ابھی بچے تھے۔

یہ بہر حال امام ابوحنیفہؒ کی ایک رائے ہے جس کی ایک مضبوط عقلی بنیاد بھی موجود ہے۔
اس معاملہ میں ہر محدث اور ہر فقیہ کو ایک دلیل کی بنیاد پر رائے قائم کرنے کا اختیار ہے۔ اس بارے میں یہ کہنا کہ فلاں فقیہ کا طرزِ عمل سنت کے خلاف ہے، یا یہ عمل سنت سے متعارض ہے اور بدعت ہے، ایسا کہنا درست نہیں۔ یہ بھی سنت ہے اور وہ بھی سنت ہے۔ محدثین اپنے غیر معمولی علم و بصیرت، اور اپنے غیر معمولی اخلاص و تقویٰ اور فقہاء اپنے غیر معمولی تفقہ کی وجہ سے ایک رائے کو زیادہ قوی، اور دوسری رائے کو نسبتاً کم قوی سمجھتے ہیں اور ان میں سے جس نے جس رائے کو قوی تر سمجھا اس کو اختیار کر لیا۔
اسی طرح سے کچھ وجوہِ ترجیح متن کے اعتبار سے ہیں کہ ایک حدیث کے متن میں کوئی عام اصول بیان ہوا ہے۔ اور ایک دوسری حدیث میں کسی خاص specific situation کے بارے میں کوئی بات بیان ہوئی ہے۔ یہاں یہ کہا جائے گا کہ ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ جہاں خاص صورت حال ہے وہاں یہ خاص حدیث قابلِ عمل ہوگی اور جہاں عمومی صورت حال ہوگی وہاں وہ عمومی حدیث قابلِ عمل ہوگی۔ دونوں مدلول کے اعتبار سے ایک دوسرے کو compensate کریں گی۔ مثال کے طور پر ایک حدیث وہ ہے جس میں احتیاط کا پہلو زیادہ سامنے آتا ہے اور ایک وہ ہے جس میں احتیاط کا پہلو نسبتاً کم ہے۔ مثلاً ایک حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ فلاں فعل جائز ہے اور ایک اور حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ یہ عمل جائز نہیں ہے۔ اب احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو ترک کیا جائے۔ مثال کے طور پر ایک جگہ آیا ہے کہ شیشہ کے گلاس میں پانی پینا مکروہ ہے، جبکہ ایک دوسری حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ مکروہ نہیں ہے۔ اب اس میں یہ تو نہیں کہا گیا ہے کہ شیشہ کے گلاس میں پانی ضرور پیا کرو۔ اس لئے احتیاط یہ ہے کہ نہ پیا جائے۔ جو مکروہ ہے، تو احتیاط کا تقاضا ہے کہ بلا ضرورت شیشہ کے قیمتی گلاس میں پانی نہ پیا جائے۔ یہ بعض لوگوں کی رائے ہے۔ یہ ہے کہ یہاں اس حدیث پر عمل کیا جائے گا جس میں احتیاط زیادہ ہے بہ نسبت اس کے جس میں احتیاط کم ہے۔ اس طرح مدلول یا مفہوم کے اعتبار سے بھی کچھ اصول ہیں۔
کچھ اصول ہیں جو خارجی ہیں۔ یعنی حدیث کے الفاظ میں نہیں لیکن خارجی شواہد کی بنیاد پر اس سے ان اسباب کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً دو حدیثیں ہیں۔ ان میں سے ایک حدیث میں

جو بات ارشاد فرمائی گئی ہے وہ ائمہ اربعہ یا خلفائے اربعہ کا نقطہ نظر بھی ہے تو خلفائے راشدین کا نقطہ نظر اس کے ساتھ شامل ہو گیا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی حدیث نسبتاً زیادہ قوی ہے۔ اس پر عمل کیا جائے گا۔ یا مثلاً ایک وہ روایت ہے جس پر عمل اہل مدینہ بھی موجود ہے اور دوسری روایت ایسی ہے جس کی تائید کسی ایسے اجتماعی عمل سے نہیں ہوتی۔ اب یہاں دو روایتیں ہیں۔ دونوں اصول روایت، سند وغیرہ کے اعتبار سے برابر ہیں تو عمل اہل مدینہ والی روایت کو ترجیح دی جائے گی۔ میں نے اذان میں ترجیع سے متعلق امام ابو یوسف کی مثال دی تھی۔ امام ابو یوسف نے اپنی روایت کو چھوڑ کر اس کو قبول کیا، حالانکہ دونوں روایتیں صحیح تھیں۔ لیکن انہوں نے عمل اہل مدینہ کی وجہ سے اپنی روایت کو ترک کر دیا۔ اب یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ امام مالک اور امام ابو یوسف نعوذ باللہ حدیث کے تارک ہو گئے۔ نہیں حدیث کے تارک نہیں ہوئے، بلکہ دو برابر کی حدیثوں میں ترجیح اس کو دی جس کے حق میں عمل اہل مدینہ کی تائید بھی حاصل ہو رہی تھی۔

علم ناسخ اور منسوخ

علم حدیث میں آخری چیز علم ناسخ اور منسوخ ہے۔ رسول اللہ ﷺ جب دنیا میں بطور نبی اور پیغمبر کے تشریف لائے تو آپ کی چار ذمہ داریاں تھیں، یتلوا علیہم آیاتہ ویزکیہم ویعلمہم الکتاب والحکمۃ۔ یہ جو تزکیہ کا عمل تھا کہ لوگوں کا تزکیہ فرماتے تھے تو یہ افراد کا تزکیہ بھی تھا، خاندانوں کا تزکیہ بھی تھا، منازل اور مساجد کا تزکیہ بھی تھا، لوگوں کے اوقات کا تزکیہ بھی تھا، نظام اور معاشرہ کا تزکیہ بھی تھا، ہر چیز کا تزکیہ تھا۔ کوئی چیز آپ نے تزکیہ کے بغیر نہیں چھوڑی، ہر چیز کو پاکیزہ اور ستھرا بنایا۔

اس ستھرا بنانے کے عمل میں ایک تدریج اور اعتدال حضورؐ نے پیش نظر رکھا۔ جو چیزیں بنیادی تھیں وہ پہلے بیان فرمائیں جن کا انداز عمارت کی بنیادوں کے اوپر اٹھنے والی دیواروں کا تھا وہ آپ نے بعد میں بیان فرمائیں۔ جو دیواروں سے آگے بڑھ کر چھت کی نوعیت کی تھیں وہ آپ نے اس کے بعد بیان فرمائیں۔ جو بات ستون کی حیثیت رکھتی تھی وہ اپنے مقام پر بیان فرمائی۔ جو اس انداز کی تھی کہ مکان بننے کے بعد اس کی تکمیل کیسے ہو وہ آخر میں بیان فرمائی۔ یہ ایک منطقی ترتیب حضورؐ نے پیش نظر رکھی۔ جیسے ایک طبیب جب کسی پیچیدہ مرض کا علاج کرتا ہے تو پہلے ایک

دوا دیتا ہے، پھر دوسری، پھر تیسری، پھر چوتھی اور بقیہ دواؤں کو ایک ایک کر کے چھڑا دیتا ہے۔ کچھ پرہیز بتا دیتا ہے اور بعد میں اس پرہیز کو ختم کر دیتا ہے کہ ٹھیک ہے اب کھاؤ۔

اسی طرح سے رسول اللہ ﷺ کے ارشادات میں یہ تدریج پائی جاتی ہے۔ اس تدریج میں جب کسی عمل کی ضرورت نہیں رہی تو وہ عمل ختم ہو گیا، وہ حدیث گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ منسوخ ہو گئی۔ مثال کے طور پر جب اسلام آیا تو عرب میں شراب نوشی بڑی کثرت سے رائج تھی۔ ہر جگہ شراب نوش اور مے خوار پائے جاتے تھے۔ شراب کی حرمت کا ذکر قرآن پاک میں تدریج کے ساتھ آیا اور جب مکمل حرمت آ گئی تو رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو شراب نوشی سے بالکل پاک اور صاف کرنے کے لئے بعض دوسری چیزوں کی بھی ممانعت کر دی۔ لیکن حضورؐ کی یہ ممانعت بھی وقتی طور پر کی تھی۔ صحیح مسلم میں ایک روایت ہے جو صحیح بخاری میں بھی ہے۔ ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ ہمارے قبیلے کا وفد جب حضورؐ کی خدمت میں آیا تو آپ نے ہمیں فلاں فلاں چیزوں کا حکم دیا اور ان چیزوں سے روکا۔ 'ونہانا عن النقیر والمزفت والدباء'۔ ہمیں چار چیزوں سے روکا، یہ چار قسم کے برتن ہوا کرتے تھے جن میں شراب رکھی جاتی تھی اور بنائی جاتی تھی۔ کسی برتن میں فی نفسہ کوئی اچھائی یا برائی نہیں ہے۔ لیکن ایک برتن ہوتا تھا جو کدو سے بنتا تھا۔ اس زمانے میں یہ پلاسٹک کی شیشیاں تو نہیں ہوتی تھیں۔ اس کے بجائے ایک بڑا کدو لے کر اس کو خشک کر دیا کرتے تھے۔ وہ کدو خشک ہونے کے بعد لکڑی کی طرح سخت ہو جاتا تھا۔ اندر سے اس کا ریشہ نکال کر اس کو کھوکھلا کرتے تھے۔ اس میں کھجور یا انگور کا رس بھر کے اس کو اوپر سے بند کر کے درخت سے لٹکا دیتے تھے۔ دو دن تک لٹکا رہتا تھا۔ ہوا کی ٹھنڈک اور دھوپ کی گرمی سے اس میں خمیر پیدا ہو جاتا تھا اور وہ شراب بن جاتی تھی۔ بعد میں اس برتن کو دوسرے مقاصد کے لئے بھی استعمال کرتے تھے۔ اس کو دباء کہتے تھے۔ اب بظاہر اس میں کوئی قباحت نہیں کہ آپ کدو لیں اور اس کو خشک کر کے برتن بنا لیں۔ لیکن چونکہ یہ برتن خاص شراب نوشی اور شراب سازی کے لئے استعمال ہوتا تھا اس لئے حضور ﷺ نے اس کی بھی ممانعت فرما دی۔ جب شراب کا بالکل خاتمہ ہو گیا اور لوگوں نے مکمل طور پر شراب چھوڑ دی پھر ان برتنوں کی ممانعت کی ضرورت نہیں رہی۔ آج اگر کوئی شخص کدو کا برتن بنانا چاہے تو بنا سکتا ہے۔

اسی طرح سے ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا: 'کنت نہیتکم عن زیارۃ

دسواں خطبہ

کتب حدیث - شروح حدیث

جمعرات، 16 اکتوبر 2003ء

قارئین کے لئے یا علم حدیث کے عام طلبہ کے لئے دو مجموعے زیادہ دلچسپی اور زیادہ اہمیت رکھتے ہیں جو عام طور پر کتب خانوں میں دستیاب ہیں، وہ اپنی ترتیب کی خوبی اور جامعیت کی وجہ سے دوسرے قدیم تر مجموعوں سے زیادہ مفید اور مقبول ہیں۔

موطا امام مالکؒ

ان میں معروف اور متداول ہونے کے اعتبار سے قدیم ترین مجموعہ امام مالک کی موطا ہے۔ موطا سے پہلے بھی مجموعے تیار ہوئے اور ان میں سے بعض آج بھی موجود ہیں لیکن وہ مقبول اور متداول مجموعے نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ذکر عام طور پر علم حدیث کے سیاق وسباق میں کم ہوتا ہے۔ متداول اور معروف ومقبول اور مشہور مجموعوں میں قدیم ترین مجموعہ امام مالک کی موطا ہے۔ موطا کے لفظی معنی تو ہیں: Beaten Track یعنی وہ راستہ جس کو لوگوں نے پے درپے چل کر اتنا ہموار کردیا ہو کہ بعد والوں کے لئے اس پر چلنا آسان ہوگیا ہو۔ امام مالک نے جب موطا مرتب کی تو انہوں نے کوشش کی کہ وہ تمام احادیث، صحابہ کرامؓ کے آثار، تابعین کے اجتہادات اور عمل اہل مدینہ پر معلومات وتحقیقات کے ذخائر اس میں جمع کردیے جائیں جن پر مسلسل عمل درآمد ہورہا ہے اور جو ایک لمحے کے لئے بھی عمل سے خالی نہیں رہے۔ پھر امام مالک نے اس کتاب کو مرتب کرنے کے بعد اپنے ہم عصر جید ترین اہل علم کی بڑی تعداد کو، جن کے بارے میں بعض حضرات کا خیال ہے کہ ان کی تعداد ستر تھی، ان کو دکھایا اور ان کی منظوری اور پسند کے بعد امام مالک نے اس مجموعے کو مشتہر کیا۔

یہ بات کہ امام مالک کو یہ مجموعہ مرتب کرنے کا خیال کیوں آیا۔ اس کے بارے میں بعض روایات کتب حدیث اور کتب تاریخ میں بیان ہوئی ہیں۔ ایک بات جو عام طور سے مشہور ہے جو بظاہر درست معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ امام مالک نے یہ مجموعہ عباسی خلیفہ منصور کے کہنے پر مرتب کیا تھا۔ منصور عباسی خاندان کا ایک نہایت نامور وذہین اور صاحب علم فرد تھا۔ اس نے خود ایک طویل عرصہ مدینہ منورہ میں گزارا تھا۔ امام مالک کا ہم درس تھا اور امام مالک کے ساتھ مل کر بہت سے اہل علم سے اور بہت سے محدثین اور فقہا سے اس نے کسب فیض کیا تھا۔ اس نے خلیفہ بننے کے بعد امام مالک سے یہ درخواست کی کہ اس وقت دنیائے اسلام میں، جو اس وقت

ایک ہی مملکت پر مشتمل تھی، ایسی کتاب کی ضرورت ہے جس کی تمام عبارتیں، جنھیں صاحبان اور فقہ اسلامی پر کام کرنے والے تمام لوگ پیروی کریں، اتنی مختصر ہو کہ ہر شخص اس سے استفادہ کرسکے۔ اتنی چھوٹی بھی نہ ہو کہ لوگ اس سے استفادہ نہ کرسکیں اور اتنی ضخیم بھی نہ ہو کہ اس کا پڑھنا وقت طلب ہو جائے۔ اس میں ان تمام سنتوں اور احادیث کو جمع کیا جائے جن پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے سے عمل ہوتا آیا ہے۔ صحابہ کرامؓ اور تابعین کے وہ اقوال بھی اس میں شامل ہوں جن سے قرآن پاک اور احادیث کے مفہوم کو سمجھنے میں مدد ملے۔ نہ اس میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے شواذ ہوں، نہ عبداللہ بن عباسؓ کی رخصتیں ہوں اور نہ عبد اللہ بن عمرؓ کی سختیاں ہوں بلکہ وہ ایک درمیانی راستہ کو بیان کرتی ہو۔

امام مالک نے اس تجویز کے مطابق موطا تصنیف شروع کی اور ایک طویل عرصہ تک اس کے لئے مواد جمع کرتے رہے۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ انہوں نے چالیس سال اس کام میں لگائے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ چالیس سال منصور کے کہنے کے بعد نہیں لگے ہوں گے۔ وہ پہلے سے علم حدیث پر جو کام کر رہے تھے اور جو یادداشتیں وہ مرتب کر رہے تھے، امام مالک نے انہی کو سامنے رکھ کر منصور کی تجویز کے مطابق مجوزہ کتاب پر کام شروع کر دیا۔

امام مالک اس کام کے لئے یقیناً اپنے زمانہ میں موزوں ترین شخصیت تھے۔ علم حدیث میں بھی ان کو بڑا نمایاں مقام حاصل تھا اور علم فقہ میں بھی وہ اتنا نمایاں مقام رکھتے ہیں کہ چار بڑے مسالک فقہ میں سے ایک کے بانی ہیں۔ امام مالک نے مدینہ منورہ میں جن اصحاب علم سے کسب فیض کیا وہ تمام تر صحابہ کرامؓ کے علوم وفنون کے جامع تھے۔ حضرات شیخینؓ، حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت علی بن ابی طالبؓ، حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہ صحابہ کرامؓ میں ان سے زیادہ حدیث اور سنت کی سختی سے پیروی کرنے والا مشکل سے ملے گا، حضرت عبداللہ بن عباسؓ جو ترجمان القرآن اور حبر الامۃ یعنی امت کے سب سے بڑے عالم کہلاتے تھے، حضرت ابو ہریرہؓ جو ایک طویل عرصہ مدینہ منورہ میں حدیث کی روایت کرتے رہے اور جو سب سے بڑی تعداد میں احادیث کے راوی ہیں۔ حضرت زید بن ثابتؓ جو کاتب وحی اور دربار رسالت کے سیکرٹری تھے ان سب کے علوم وفنون مدینہ منورہ میں موجود تابعین تک پہنچے۔ امام مالک نے ان سب تابعین سے کسب فیض کیا اور یہ سارے علوم ان تک منتقل ہوئے۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، مدینہ منورہ میں صحابہ کرام کے بعد جو نسل بہت نمایاں ہوئی ان میں فقہائے سبعہ کا مقام بہت بلند ہے۔ فقہائے سبعہ وہ حضرات ہیں جو مدینہ منورہ میں علم حدیث اور علم فقہ میں سب سے نمایاں تھے۔ دنیا بھر سے لوگ ان کے پاس استفادہ اور تحقیق کے لئے آیا کرتے تھے۔ یہ حضرات مدینہ منورہ کے صحابہ کرام کے علوم وفنون کے مجموعہ اور جامع تھے۔ امام مالک کو ان حضرات کا علم بھی پہنچا۔ انہوں نے ان حضرات کے تلامذہ سے اور ان کی تحریروں سے استفادہ کیا۔ ان کے اساتذہ میں امام نافع بھی شامل تھے جو تیس سال حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ شب و روز رہے۔ سفر میں بھی ساتھ رہے اور حضر میں بھی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے علاوہ انہوں نے دوسرے مدنی صحابہ سے بھی کسب فیض کیا۔ دنیائے اسلام کے دوسرے شہروں میں بھی گئے

امام مالک نے بہت بچپن میں، کم سنی میں امام نافع کی صحبت اختیار کر لی تھی اور ایک طویل عرصہ جس کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چودہ سال یا اس کے لگ بھگ ہے وہ امام نافع کے پاس رہے۔ امام نافع کے انتقال کے بعد ہی امام مالک نے اپنا حلقہ درس قائم کیا۔ اس کے علاوہ امام مالک نے اپنے زمانے کے بڑے بڑے اساتذہ اور مدینہ منورہ کے صف اول کے محدثین اور فقہا سے علم حاصل کیا۔ امام زہری، امام جعفر صادق، یحییٰ بن سعید انصاری، امام لیث بن سعد جو امام شافعی کے بھی استاد ہیں اور جن کا مزار مصر میں ہے، اور ربیعۃ الرائے جو امام مالک کے اساتذہ میں بڑا نمایاں مقام رکھتے ہیں، ان سب کے علوم وفنون سے استفادہ کرنے کے بعد امام مالک نے موطا امام مالک لکھی۔

امام مالک کے بارے میں ایک چیز بڑی نمایاں ہے اور وہ یہ کہ ان کے شیوخ کی تعداد بہت کم ہے۔ بقیہ محدثین کے تذکروں میں آپ نے سنا ہوگا کہ کسی نے ہزار ہا محدثین سے استفادہ کیا، کسی نے اتنے سو سے، کسی نے ہزار سے۔ امام مالک کے شیوخ کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ ان کے شیوخ کی تعداد پچانوے ہے۔ کسی نے کہا کہ زیادہ ہے۔ کسی نے اس سے کم و بیش بیان کی ہے۔ بعض ساٹھ اور نوے کے درمیان ان کے شیوخ کی تعداد بیان کی جاتی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ امام مالک نے پہلے دن سے یہ طے کیا تھا کہ میں صرف اس شیخ سے

کسب فیض کیا ان کا جو علم حدیث کے ساتھ ساتھ تفقہ میں بھی بڑا اونچا مقام رکھتے تھے اور حدیث کے فہم اور اس کی انطباق اور اس سے نکلنے والے مسائل پر بھی ان کی گرفت مضبوط ہو۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں کہ میں کسی غیر فقیہ کی محفل میں نہیں بیٹھا اور جن کی محفل میں بیٹھ کر استفادہ کیا وہ سب کے سب بڑے فقہا تھے۔ خود ایک جگہ فرمایا کہ میں نے محض کسی کے زہد و اتقا کی بنیاد پر اس کی شاگردی اختیار نہیں کی بلکہ صرف ان حضرات کی شاگردی اختیار کی جو زہد و اتقا کے ساتھ ساتھ علم حدیث اور روایت میں اونچا مقام رکھتے تھے، اور تفقہ اور بصیرت میں بہت آگے تھے۔ انہوں نے صرف ایسے ہی لوگوں سے کسب فیض کیا۔ ایک جگہ لکھا کہ میں نے مدینہ منورہ میں ایسے ایسے لوگ دیکھے کہ اگر ان کا نام لے کر دعا کی جاتی تو شاید اللہ تعالیٰ بارش برسا دیتا، گویا دین، تقویٰ اور روحانیات میں وہ اس درجہ کے لوگ تھے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ ان میں سے کچھ تفقہ میں اونچا مقام نہیں رکھتے تھے اس لئے میں ان کے حلقہ درس میں نہیں بیٹھا۔ یہی وجہ ہے کہ امام مالک کے اساتذہ کی تعداد نسبتاً تھوڑی ہے۔ لیکن وہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے کہ جب ایک مرتبہ یہ ثابت ہو جاتا تھا کہ فلاں شیخ امام مالک کے استاد ہیں تو پھر محدثین ان کے حفظ و ضبط اور عدالت وغیرہ کی مزید تحقیق نہیں کرتے تھے۔ امام یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ کوئی راوی امام مالک کے اساتذہ میں شامل ہیں تو میں اس راوی کی مزید تحقیق نہیں کرتا۔ امام احمد بن حنبل کا کہنا ہے کہ اگر کسی شیخ سے امام مالک نے روایت لی ہو تو پھر اس شیخ کی روایت قبول کرنے میں مجھے کوئی تامل نہیں۔

ایسے برگزیدہ شیوخ سے روایتیں لے کر امام مالک نے موطا مرتب فرمائی جو ایک لاکھ احادیث میں سے انتخاب ہے۔ آپ کو احادیث کے متون تھوڑے ہیں، روایات اور سندیں زیادہ ہیں۔ ایک لاکھ طریقوں سے جو روایات پہنچی تھیں ان میں سے امام مالک نے انتخاب کیا جن میں کم و بیش ایک ہزار سے کچھ کم احادیث ہیں اور دو ہزار کے قریب صحابہ اور تابعین کے اقوال، ارشادات اور آثار ہیں۔ یہ سارے کے سارے اندراجات وہ ہیں جو خالص عملی مسائل سے متعلق ہیں۔ روزمرہ کی زندگی میں انسان کو انفرادی اور اجتماعی معاملات میں جن چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے وہ سارے کے سارے معاملات امام مالک کی موطا میں موجود ہیں۔ اس میں جتنی بھی احادیث ہیں جو ایک ہزار کے لگ بھگ ہیں، وہ ساری کی ساری صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں موجود ہیں۔ محدثین نے تحقیق کرکے اس بات کی تصدیق کی ہے وہ سب کی سب صحیح اور مرفوع

روایات ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی صحت کے اعلیٰ درجہ سے نیچے نہیں ہے۔ اسی لئے صحیحین سے پہلے کے زمانے میں جب صحیح مسلم اور صحیح بخاری مرتب نہیں ہوئی تھیں عام طور پر لوگوں کا کہنا یہ تھا کہ موطا امام مالک اصح کتب بعد کتاب اللہ ہے۔ امام شافعی کا یہ ارشاد بہت سی کتابوں میں منقول ہے کہ کتاب اللہ کے بعد صحیح ترین کتاب موطا امام مالک ہے، اس لئے کہ اس وقت صحیح بخاری اور صحیح مسلم موجود نہیں تھیں۔ بعد میں چونکہ یہ سارا ذخیرہ بخاری اور مسلم میں شامل ہو گیا، اس میں مزید صحیح احادیث بھی شامل ہو گئیں اور صحابہ اور تابعین کے اقوال جو موطا امام مالک میں تعلیقات یا بلاغات کے طور پر آئے تھے ان کتابوں میں براہ راست سند کے ذریعے بیان ہو گئے اس لئے ان دونوں کتابوں میں سے کسی ایک کتاب کو (زیادہ تر حضرات نے صحیح بخاری کو) اصح الکتب بعد کتاب اللہ قرار دیا ہے۔

امام مالک ایک طویل عرصہ تک موطا پڑھاتے رہے۔ طلبہ دور دور سے ان کے پاس آیا کرتے تھے اور موطا امام مالک کا درس لیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے امام مالک کو جو مرتبہ عطا فرمایا اس کا اندازہ دو چیزوں سے ہوتا ہے۔ ایک حدیث ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا کہ عنقریب ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ لوگ اونٹ کی پشت کو کستے ہوئے دور دور کا سفر کریں گے اور علم دین کی تلاش میں نکلیں گے لیکن مدینے کے عالم سے بڑا کوئی عالم انہیں نہیں ملے گا۔ اکثر محدثین اور علمائے حدیث کی بڑی تعداد کے نزدیک اس حدیث کا مصداق امام مالک ہیں۔ اس لئے کہ ان کے زمانے میں ایسا کوئی عالم نہیں تھا جس کی خدمت میں لوگ دور دور سے آئے ہیں۔ تین براعظموں سے لوگ امام مالک کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ افریقہ، ایشیا اور یورپ۔ چنانچہ اسپین سے امام یحییٰ بن یحییٰ المصمودی جو ان کے شاگردوں میں سب سے نمایاں مقام رکھتے ہیں اور موطا امام مالک کے سب سے مقبول نسخہ کے راوی ہیں، ان کا تعلق یورپ سے تھا۔ ایشیا میں خراسان اور سمرقند جیسے دور دراز علاقوں سے لوگ ان کی خدمت میں آئے اور موطا امام مالک کا درس لے کر گئے۔

اللہ تعالیٰ نے امام مالک کو غیر معمولی عزت اور بڑے مال و دولت سے نوازا تھا۔ وہ جس مکان میں رہتے تھے وہ ایک زمانہ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا مکان رہ چکا تھا اور جس مکان میں درس حدیث کی محفل لگتی تھی وہ حضرت عمر فاروقؓ کا مکان تھا۔ درس حدیث کے لئے

وہاں بڑا پر تکلف اہتمام ہوتا تھا۔ صفائی ستھرائی اہتمام سے کرائی جاتی تھی۔ عود و عنبر وہاں کی خوشبو جلائی جاتی تھی۔ امام مالک غسل کر کے اور عمدہ لباس پہن کر آتے تھے اور تمام حاضرین مؤدب ہو کر بیٹھتے تھے۔ ایک مرتبہ امام ابو حنیفہ حاضر ہوئے اور بقیہ عام طلبہ کی طرح مؤدب ہو کر بیٹھ گئے۔ اسی طرح جو بھی آتا تھا، چھوٹا ہو یا بڑا، اسی طرح مؤدب ہو کر بیٹھ جاتا تھا۔ امام شافعی بھی طالب علم کی حیثیت سے اس درس میں شریک ہوتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ کتاب کا ورق بھی اتنا آہستہ پلٹتے تھے کہ ورق پلٹنے کی آواز نہ ہو۔ آواز ہوگی تو محفل کے سکون اور کیفیت میں خلل پڑے گا۔

ایک دیکھنے والے نے بیان کیا کہ یہاں دربار شاہی جیسا رعب داب ہوا کرتا تھا۔ جب پڑھنے والے پڑھ کر نکلتے تھے تو دروازے پر سواریوں کا ہجوم ایسا ہوتا تھا جیسے شاہی دربار برخاست ہو گیا ہو اور سواریاں نکل نکل کر جا رہی ہوں۔ کسی بھی آدمی کو وہاں کوئی خصوصی یا نمایاں مقام حاصل کرنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ خلفائے وقت مہدی، ہارون اور منصور تینوں کو اپنے اپنے زمانے میں امام مالک کے درس میں بیٹھنے کا موقع ملا۔ یہ لوگ اس درس میں آئے تو عام آدمی کی طرح طالب علم کی حیثیت سے بیٹھے اور اسی طرح مؤدب ہو کر بیٹھے رہنے کے بعد چلے گئے۔ خلیفہ مہدی نے ایک مرتبہ گزارش کی کہ میں مدینہ منورہ آیا ہوں۔ میری تین گزارشات ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ مجھے موطا امام مالک کی اجازت عطا فرمائیں۔ دوسری یہ کہ میرے دونوں بیٹوں کو درس میں حاضری کا موقع دیں۔ اور تیسری یہ کہ میرے بیٹوں کے لئے خصوصی محفل کا اہتمام فرمائیں۔ امام مالک نے کہا کہ پہلی دونوں درخواستیں قبول ہیں، تیسری قابل قبول نہیں ہے۔ صاحبزادے محفل میں آئیں، جہاں جگہ ملے بیٹھ جائیں اور درس لے کر چلے جائیں۔ چنانچہ مہدی کے دونوں بیٹے، اس فرمانروا کے بیٹے جس کی حکومت اسپین سے لے کر سمرقند اور بخارا تک اور آرمینیا اور آذربائیجان سے لے کر سوڈان تک پھیلی ہوئی تھی، اس کے بیٹے امام مالک کے درس میں عام لوگوں کی طرح بیٹھے اور درس لے کر چلے گئے۔ آپ نے فرمایا اور یہ جملہ مشہور ہے کہ العلم یؤتی ولا یأتی۔ علم کی خدمت میں حاضر ہوا جاتا ہے، علم کسی کی خدمت میں حاضر نہیں ہوتا۔

کچھ زمانے کے بعد خلیفہ ہارون ان کے دربار میں آیا اور گزارش کی کہ امام مالک کوئی حدیث پڑھ کر سنا دیں تاکہ میں براہ راست حدثنا کے اسلوب پر، مجھے حدیث پڑھنے کی اجازت دے دیں۔ امام مالک نے کہا کہ میرا اسلوب حدثنا کا نہیں بلکہ اخبرنا کا ہے۔ موطا کا نسخہ مجھ سے لے

مجھے پڑھ کر سنا دیجئے میں ان کو اجازت دے دوں گا۔ میرا طریقہ یہ ہے جس کو میں خلیفہ وقت کی کے لئے بھی بدل نہیں سکتا۔ چنانچہ ہارون الرشید نے بیٹھ کر موطا امام مالک پڑھی اور پڑھ کر اجازت لی جیسے کہ باقی شاگرد اجازت لیا کرتے تھے۔

امام شافعی جب امام مالک کی خدمت میں حاضر ہوئے تو امام مالک کا آخری زمانہ تھا۔ امام مالک ان دنوں صرف مخصوص طلبہ کو موطا کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ عام درس انہوں نے بند کر دیا تھا۔ امام مالک کی عمر پچاسی سال کے قریب ہوئی تھی۔ یہاں زمانے کا ذکر ہے جب ان کی عمر نوے یا اٹھانوے سال تھی۔ صحت اجازت نہیں دیتی تھی کہ زیادہ پڑھانے پر طلبہ کو درس دیں۔ امام مالک کی خدمت میں حاضری سے پہلے امام شافعی نے مکہ مکرمہ کے گورنر سے مدینہ منورہ کے گورنر کے نام سفارشی خط لیا کہ نوجوان محمد بن ادریس شافعی کو امام مالک کے دربار میں پہنچا دیا جائے اور اجازت دلائی جائے کہ یہ موطا کے درس میں شریک ہوں۔ امام شافعی گورنر مدینہ کے پاس گورنر مکہ کا وہ خط لے کر گئے اپنا تعارف کرایا، خط پیش کیا اور امام مالک کے درس میں شریک ہونے کے لئے سفارش چاہی۔ گورنر نے کہا کہ چلیں میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔

جب دونوں امام مالک کے دردولت پر پہنچے تو ملازم نے کہا کہ یہ ان کے آرام کا وقت ہے۔ آپ کو ملنا ہو تو فلاں وقت پر آسکتے ہیں۔ گورنر صاحب واپس چلے گئے۔ امام مالک کے اٹھنے کا وقت ہوا تو یہ دونوں دوبارہ پہنچے وہاں جا کر گورنر نے بہت ادب اور احترام سے درخواست کی اور اپنی شرمندگی دور کرنے کی غرض سے مکہ کے گورنر کا خط بھی پیش کر دیا کہ میں اس سفارش کے سلسلے میں حاضر ہوا ہوں۔ امام مالک نے خط دیکھ کر پھینک دیا اور کہا کہ اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث گورنروں کی سفارشوں پر پڑھائی جایا کرے گی اور ناخوشی کا اظہار کیا۔ گورنر نے معذرت کی۔ امام شافعی نے عرض کیا کہ میرا تعلق رسول اللہ ﷺ کے خاندان سے ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ امام شافعی مطلبی تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے پردادا جناب ہاشم کے بھائی مطلب کی اولاد میں سے تھے۔ مطلب جناب ہاشم کے بھائی تھے اور امام شافعی ان کی اولاد میں سے تھے۔ یہ نسبت سن کر امام مالک نے اجازت دے دی۔ مکہ اور مدینہ کے گورنروں کی سفارش کو تو انہوں نے درخور اعتنا نہیں سمجھا لیکن رسول اللہ ﷺ کے خاندان کی نسبت کا لحاظ کر کے اجازت دے دی۔

اس سے اندازہ ہو سکتا ہوگا کہ وہ کس شان کا درس ہوتا ہوگا اور کیسے لوگ موطا کا درس لیتے ہوں گے۔ موطا کا درس کتنے لوگوں نے لیا؟ اس کا تعین کرنا بہت دشوار ہے۔ بلاشبہ وہ ہزاروں لوگ ہوں گے۔ جن لوگوں کو تحریری طور پر باقاعدہ اجازت عطا ہوئی ان کی تعداد بھی سینکڑوں میں ہے، ایک ڈیڑھ ہزار کے قریب ہے۔ ہر علاقہ میں یہ حضرات موجود تھے۔ تمام بڑے بڑے محدثین بالواسطہ یا بلاواسطہ امام مالک کے شاگرد ہیں۔ امام احمد، امام بخاری، امام ابوداؤد، امام ترمذی اور امام نسائی یہ سب حضرات ایک ایک واسطے سے امام مالک کے شاگرد تھے۔ ائمہ فقہ میں سے امام شافعی اور امام محمد بن حسن شیبانی براہ راست امام مالک کے شاگرد تھے۔ اتنا غیر معمولی مقام و مرتبہ جس شخص کو حاصل ہو جائے پھر اللہ تعالیٰ ہی کی توفیق ہو اس کے کردار کو اور جواب دہی کے احساس کو برقرار رکھے۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔

ایک مرتبہ ایک بڑی محفل میں مکہ مکرمہ تشریف فرما تھے۔ غالباً حج کے لئے تشریف لے گئے تھے، مکہ مکرمہ میں جس طرح اور جس پیمانے پر شائقان علم کا رجوع ہوتا ہوگا اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ بڑی تعداد میں لوگ جمع ہوئے۔ اس محفل میں جہاں بڑے بڑے لوگ موجود تھے، امام مالک سے چالیس سوالات کئے گئے۔ اڑتیس سوالات کے جواب میں فرمایا لا ادری، مجھے نہیں پتہ، صرف دو سوالات کا جواب دیا کہ ہاں ان کا جواب میں جانتا ہوں۔

ایک مرتبہ ایک شخص چھ ماہ کی مسافت کا طویل سفر کر کے پہنچے۔ غالباً اندلس سے آئے تھے اور کوئی مسئلہ پوچھا۔ امام مالک نے بتایا کہ میں نہیں جانتا۔ یہ بات میرے علم میں نہیں ہے۔ اس نے تھوڑا سا ناخوشی کا اظہار کرنے کے لیے کہا کہ میں چھ مہینے کا سفر کر کے آیا ہوں، لوگوں نے آپ سے یہ مسئلہ پوچھنے کے لئے مجھے بھیجا ہے۔ میں جب واپس جاؤں گا تو ان لوگوں کو کیا جواب دوں گا۔ آپ نے کہا کہ ان سے کہنا کہ مالک نے کہا ہے کہ مجھے معلوم نہیں۔ جس چیز کے بارے میں مکمل اور سو فیصد تحقیق نہیں ہوا کرتی تھی اس کا جواب نہیں دیا کرتے تھے۔

موطا امام مالک کم وبیش 140ھ کے لگ بھگ مرتب ہوئی۔ جب موطا امام مالک مرتب ہوئی اور اس کو مقبولیت حاصل ہوئی تو اور بھی کئی لوگوں نے، جن میں کئی حضرات استعداد اور شہرت کے اعتبار سے زیادہ بلند مرتبے کے نہیں تھے، کتابیں لکھنی شروع کر دیں۔ لوگوں نے امام مالک سے کہا کہ فلاں بھی کتاب لکھ رہا ہے، فلاں بھی کچھ لکھ رہا ہے، فلاں بھی لکھ رہا ہے۔ آپ نے

ایک بات ایسی فرمائی کہ آج جس کی تصدیق سب کے سامنے ہے۔ آپ نے فرمایا کہ حسن نیت کو بقا ہے۔ جس نے اچھی نیت سے لکھی ہوگی اس کی کتاب کو بقا ہوگی۔ آج کسی کو نہیں معلوم کہ وہ کتابیں کہاں گئیں۔ تذکروں میں ذکر ملتا ہے کہ لوگوں نے امام مالک کے مقابلہ میں کتابیں لکھی تھیں۔ لیکن وہ سب کتابیں فنا کا شکار ہو گئیں۔ لیکن بقا موطا امام مالک کو حاصل ہوئی۔

امام مالک کی کتاب میں چالیس ثلاثیات ہیں۔ ثلاثیات سے مراد وہ احادیث ہیں جن میں حضورؐ اور امام مالک کے درمیان صرف دو واسطے ہوں۔ ایک امام مالک کے استاد اور دوسرے کوئی صحابی رسول ﷺ۔ ان میں سے ایک سند وہ بھی ہے جس کا میں کئی بار ذکر کر چکا ہوں یعنی مالک عن نافع عن ابن عمر۔ امام مالک امام نافع سے روایت کرتے ہیں، وہ عبداللہ بن عمر سے، صرف دو واسطے ہیں۔

امام مالک سے موطا کا املا لینے والوں میں ہزاروں حضرات شامل تھے۔ سننے والے اور عمومی استفادہ کرنے والے تو پتہ نہیں کتنے ہوں گے، شاید لاکھوں ہوں گے۔ لیکن جن لوگوں نے پوری موطا امام مالک پڑھ کر اس کی باقاعدہ اجازت لی اور سند حاصل کی ان کی تعداد چودہ سو کے قریب ہے۔ ان چودہ سو میں سے تیس حضرات جو اپنی جگہ بڑے نامور صاحب علم ہوئے، حدیث اور فقہ کے امام ہوئے، انہوں نے اپنے اپنے لئے موطا کے نسخے تیار کئے۔ ان تیس نسخوں میں سے سترہ نسخے مشہور رہے۔ ان سترہ نسخوں میں سے جو سب سے متداول اور معروف نسخہ ہے وہ امام مالک کے شاگرد خاص یحییٰ بن یحییٰ کا ہے۔

یحییٰ بن یحییٰ اندلس سے تشریف لائے تھے۔ طویل عرصہ امام مالک کی خدمت میں رہے۔ موطا امام مالک کے اصل نسخہ کے راوی وہی ہیں۔ انہی کے نسخہ کو موطا کہا جاتا ہے۔ جب کہا جاتا ہے کہ موطا امام مالک میں یہ ہے تو مراد ہوتی ہے یحییٰ بن یحییٰ کا نسخہ۔ باقی نسخے ان کے مرتبین کی طرف منسوب ہوتے ہیں، مثلاً موطا امام محمد۔ تو یہ موطا امام محمد کی کتاب نہیں ہے بلکہ یہ امام مالک کی موطا کا وہ نسخہ ہے جو امام محمد نے تیار کیا۔ اسی طرح موطا قعنبی بھی ہے۔ قعنبی نے خود کوئی موطا تیار نہیں کی تھی بلکہ یہ موطا امام مالک کا وہ نسخہ ہے جو قعنبی نے تیار کیا۔ اسی طرح باقی نسخے ان کے تیار کرنے والوں کے ناموں سے مشہور ہوئے۔ یحییٰ بن یحییٰ کا نسخہ امام مالک کے نام سے منسوب ہوا۔

اس کا دوسرا ایڈیشن بھی آ گیا ہے۔ یہ بارہ جلدیں مصنف کے نام سے مشہور ہیں۔ مصنف اس تنا۔ کو کہتے ہیں جس میں احادیث کے ساتھ ساتھ صحابہ اور تابعین کے اقوال اور فتاویٰ بھی موجود ہوں۔ اس لئے مصنف عبد الرزاق صحابہ اور تابعین کے فتاویٰ کا ایک بہت بڑا ماخذ ہے۔ اس میں تابعین کے فتاویٰ کے ساتھ ساتھ جو فقہاء تبع تابعین ہیں اور ان میں بھی جو بڑے فقہا ہیں جن میں خود امام عبد الرزاق بھی شامل ہیں، ان کے فتاویٰ کا ایک بڑا مجموعہ شامل ہے۔ امام عبد الرزاق بہت سے محدثین کے استاد ہیں۔ بہت سے محدثین نے ان سے کسب فیض کیا۔ علم حدیث اور علم فقہ دونوں میں ان کا بہت اونچا مقام ہے۔

امام عبد الرزاق کے بعد ایک اور مُصنَّف، (مُصنِّف سے مراد تو وہ آدمی ہے جس نے کوئی کتاب تصنیف کی ہو۔ لیکن مصنَّف نون کے زبر کے ساتھ کا مطلب ہے وہ کتاب جو تصنیف کی گئی ہو۔ علم حدیث کی اصطلاح میں مصنَّف سے مراد حدیث کی ایک خاص انداز والی کتاب ہے جس میں تمام ابواب پر حدیثیں مرتب کی گئی ہوں اور صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے اجتہادات اور اقوال سب موجود ہوں۔) ابو بکر بن ابی شیبہ کی مصنف بھی ہے جس کے کئی ایڈیشن نکلے ہیں کوئی بارہ جلدوں میں ہے کوئی دس میں ہے کوئی چودہ میں ہے کوئی سولہ میں ہے۔ ابو بکر بن ابی شیبہ کی وفات 235ھ میں ہوئی۔ اس لئے یہ دوسری صدی ہجری کے اواخر اور تیسری صدی ہجری کے اوائل کے محدث ہیں۔ ان کے اساتذہ میں امام سفیان بن عیینہ، عبد اللہ بن مبارک، وکیع بن الجراح، امام شافعی کے استاد اور یحییٰ بن سعید قطان جیسے جید ترین محدثین شامل ہیں۔ ان کے براہ راست تلامذہ میں امام احمد، امام بخاری، امام مسلم، ابن ماجہ، ابو زرعہ اور ابو حاتم رازی جیسے لوگ شامل ہیں۔ مصنف ابی بکر بن ابی شیبہ کی ترتیب فقہی ابواب پر ہے۔ یعنی وہ مسائل جو فقہی نوعیت کے ہیں۔ مثلاً پہلے طہارت کے ابواب ہیں، پھر وضو کے ابواب ہیں، پھر نماز کے، پھر روزے کے، پھر حج کے پھر نکاح و طلاق وغیرہ کے ابواب ترتیب سے موجود ہیں۔ کل مسائل کے متعلق ابواب کی ترتیب کے ساتھ یہ کتاب فقہیات حدیث کا بہت بڑا ماخذ ہے اور احادیث احکام کا سب سے بڑا اور جامع مجموعہ ہے اور اتنا ضخیم ہے کہ چودہ سولہ جلدوں میں آیا ہے۔ اس لئے احادیث احکام ساری کی ساری اس میں آ گئی ہیں۔

امام احمد کی یہ کتاب غیر معمولی علمی مقام رکھتی ہے۔ لیکن اس سے استفادہ بڑا مشکل تھا۔ آج بھی اس کتاب سے براہ راست استفادہ بڑا مشکل ہے۔ اس لئے کہ یہ مسند ہے اور مسند حدیث کی اس کتاب کو کہتے ہیں جس کی ترتیب صحابہ کرام کی بنیاد پر ہو۔ اس کتاب میں سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی مرویات ہیں، پھر حضرت عمر فاروقؓ کی اور بقیہ عشرہ مبشرہ کی، پھر بقیہ صحابہ کرام کی۔ اب کوئی آدمی جو علم حدیث سے زیادہ واقف نہیں ہے، وہ مسند امام احمد میں کوئی حدیث تلاش کرنا چاہے تو پہلے اس کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اس حدیث کے اصل راوی کون سے صحابی ہیں۔ جب تک یہ معلوم نہ ہو مسند امام احمد میں کسی حدیث کا تلاش کرنا بڑا دشوار کام ہے۔ لیکن الحمدللہ اب یہ کام بہت آسان ہو گیا۔ اس لئے کہ ایک تو ونسنک کی انڈیکس آ گئی ہے۔ ونسنک کی انڈیکس ضرور دیکھ لیجئے گا۔ ونسنک ایک ڈچ مستشرق تھا جس نے مستشرقین کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ مل کر صحاح ستہ سمیت بڑی حدیث کی نو بڑی کتابوں کا ایک انڈکس تیار کیا جس میں صحاح ستہ، مسند امام احمد اور موطا امام مالک اور سنن دارمی شامل ہیں۔ ان نو کتابوں کا اس نے ایک Word Index تیار کیا ہے۔ حدیث کا کوئی ایک لفظ بھی آپ کو یاد ہو تو حروف تہجی کی ترتیب سے وہ اس میں شامل ہے۔ آپ اس انڈکس کی مدد سے اسے تلاش کر سکتے ہیں۔

اس انڈکس میں ان نو کتابوں کے ایک ایک مخصوص ایڈیشن کا حوالہ دیا گیا ہے۔ وہ ایڈیشن جن کا حوالہ ونسنک نے دیا ہے وہ پچھلی صدی کے چھپے ہوئے ایڈیشن تھے، تیرھویں صدی کے اواخر یا چودھویں صدی کے بہت شروع کے چھپے ہوئے تھے۔ آج وہ ایڈیشن نہیں ملتے۔ حال ہی میں کسی ادارے نے، غالباً کسی عرب ملک میں اس پرانے ایڈیشن کا ایک نیا ایڈیشن فوٹو کاپی سے چھاپ دیا ہے اور وہ ساری کی ساری نو کتابیں تکس تیس جلدوں میں ایک ساتھ چھاپ دی ہیں تاکہ اگر اس انڈکس سے استفادہ کرنا ہو تو اس نئے ایڈیشن کی مدد سے آپ استفادہ کر سکیں۔ اس نئے ایڈیشن سے کام نسبتاً آسان ہو گیا ہے۔

لیکن ایک اور بڑا کام مسند امام احمد پر چودھویں صدی کے وسط میں ہوا۔ یہ کام مشہور مجاہد اسلام، داعی اسلام اور شہید اسلام شیخ حسن البنا کے والد احمد عبدالرحمٰن البنا نے کیا۔ حسن البنا شہید کے والد احمد عبدالرحمٰن البنا الساعاتی جو اپنی روزی کے لئے گھڑی سازی کا کام کرتے تھے۔ (ایک جج نے پوچھا تھا کہ محدثین کھاتے کہاں سے تھے تو حسن البنا کے والد نے پوری زندگی علم حدیث

کی خدمت کا کام کیا۔ لیکن گھڑیوں کی ایک دکان تھی جس سے ان کی آمدنی ہوتی تھی۔ چند گھنٹے وہاں بیٹھا کرتے تھے۔ اس کے بعد باقی وقت علم حدیث کی خدمت میں صرف کرتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کا لقب الساعاتی پڑ گیا۔ انہوں نے مسند امام احمد کو ایک نئی ترتیب سے مرتب کیا، جس کا نام ہے 'الفتح الربانی فی ترتیب مسند الامام احمد بن حنبل الشیبانی'۔ الفتح الربانی میں انہوں نے ان تمام احادیث کو ایک نئے موضوعاتی انداز میں مرتب کر دیا۔ اب آپ اس میں سبجیکٹ وائز احادیث تلاش کر سکتے ہیں۔ اسی طرح سے انہوں نے ان احادیث کی ایک شرح بھی لکھی جس کا نام انہوں نے رکھا 'بلوغ الامانی'۔ یہ بلوغ الامانی اور فتح الربانی دونوں ایک ساتھ بہت ساری جلدوں میں چھپی ہیں اور کتب خانوں میں عام طور پر مل جاتی ہیں۔

امام احمد ابن حنبل کی مسند کے ساتھ ساتھ ایک اور مسند کا حوالہ اور تذکرہ بھی ملتا ہے۔ لیکن افسوس کہ وہ مسند آج موجود نہیں ہے اور صرف تاریخ کی کتابوں میں اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ وہ مسند امام بقی بن مخلد نے مرتب کی تھی۔ بقی بن مخلد کا تعلق اسپین سے تھا۔ قرطبہ کے رہنے والے تھے۔ ان کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ انہوں نے چھ مرتبہ مشرق و مغرب کا سفر کیا۔ مشرق و مغرب سے مراد یہ ہے کہ اسپین سے نکلے اور سمرقند و بخارا تک گئے۔ اس طرح انہوں نے پوری دنیائے اسلام کا چھ مرتبہ سفر کیا اور احادیث کا سب سے بڑا مجموعہ مرتب کیا۔ وہ مجموعہ افسوس کہ ضائع ہو گیا اور ہم تک نہیں پہنچا۔ لیکن اس کے بارے میں جو تفصیلات احادیث کی کتابوں میں ملتی ہیں وہ بڑی عجیب و غریب ہیں۔ اس کتاب کی ضخامت کا اندازہ ہم اس بات سے کر سکتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل نے جن صحابہ کی احادیث اپنی مسند میں جمع کیں ان کی تعداد ۹۰۴ ہے۔ جبکہ امام بقی بن مخلد نے اپنی مسند میں سولہ سو صحابہ سے احادیث جمع کی تھیں۔ تقریباً دوگنی سے زیادہ۔ اس کی جلدیں بھی اتنی ہی ہوں گی اور احادیث کی تعداد بھی اسی حساب سے دوگنے سے زائد ہوگی۔

الجامع الصحیح للامام بخاری

امام احمد بن حنبلؒ کی مسند کے بعد جو اہم ترین، مقبول ترین اور اعلیٰ ترین مجموعہ ہے وہ امام بخاری کی الجامع الصحیح ہے۔ امام بخاری کی وفات 256 ھ میں ہوئی۔ ایک مصرعہ یاد رکھنے کا کسی نے لکھا ہے۔

پہنا چکی تھیں تھا وہ کھی۔ جب امام بخاری ایک طویل مدت کے بعد آخری مرتبہ اپنے وطن بخارا واپس تشریف لے گئے تو پورے شہر نے ان کا استقبال کیا۔ شہر کے لوگوں کو اس کا اندازہ تھا کہ انہیں کس قدر اعزاز حاصل ہوا ہے کہ امت کی طرف سے ان کے شہر کے ایک فرزند کو امیر المومنین فی الحدیث کا لقب دیا گیا اور ان کی مرتب کی ہوئی کتاب اصح الکتب بعد کتاب اللہ قرار پائی۔ اس لئے پورا شہر بشمول حاکم وقت کے ان کے استقبال کے لئے نکل آیا۔ لوگوں نے بڑی مسرت سے ان کے قافلے پر درہم اور دینار نچھاور کئے اور اس طرح امام بخاری اپنے وطن واپس تشریف لے آئے۔

ایک مجلس میں جہاں امام بخاری احادیث بیان فرما رہے تھے، امام مسلم بھی حاضر تھے۔ امام مسلم کا درجہ بھی کم نہیں ہے۔ امام مسلم درس کے دوران خوشی سے اتنے بے تاب ہو گئے کہ بے اختیار کہا اے امیر المومنین مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کے پاؤں چوم لوں۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ امام بخاری کس درجے کے انسان ہوں گے۔ دوسرا اعتراف امام احمد بن حنبل کا کہنا ہے۔ اور یہ گواہی کسی ایسے ویسے انسان کی نہیں بلکہ امام احمد بن حنبل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ابھی خراسان نے محمد بن اسماعیل سے بڑھ کر کوئی انسان پیدا نہیں کیا۔ یہ محمد بن اسماعیل امام بخاری تھے۔

آپ کو معلوم ہے کہ پرانے زمانے میں ہر بڑی تصنیف میں کتاب کے نام سے موضوع کا عنوان ہوتا تھا۔ کتاب الصلوٰۃ، کتاب الزکوٰۃ وغیرہ۔ اسی طرح صحیح بخاری میں جو کتابیں ہیں ان کی تعداد 160 ہے۔ کتاب بدء الوحی، کتاب العلم، کتاب الصلوٰۃ، کتاب الزکوٰۃ وغیرہ وغیرہ۔ یہ کتابیں 160 ہیں۔ ہر کتاب میں کئی کئی ابواب ہیں۔ مجموعی طور پر کل تین ہزار چار سو پچاس (3450) ابواب ہیں۔ احادیث کی کل تعداد مکررات کو نکال کر دو ہزار چھ سو دو ہے۔ جن میں سے بائیس ثلاثیات ہیں۔

کتاب کی ترتیب کے ضمن میں امام بخاری نے پہلے یہ کیا کہ اس کتاب کے ابواب کا ایک خاکہ مرتب کیا کہ اس کتاب کے یہ یہ ابواب ہوں گے۔ ان تمام ابواب کا خاکہ مرتب کرنے کے بعد مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ مسجد نبوی میں گئے اور روضہ رسول ﷺ پر حاضری دی۔ وہاں دو رکعت نماز پڑھ کر انہوں نے اس کتاب کو لکھنے کا آغاز کیا اور سولہ سال تک اس کتاب کو لکھتے رہے اور احادیث کی چھان پھٹک کرتے رہے۔ بعض ابواب ایسے ہیں کہ جس کے عنوانات ہی سے عبارت ہیں۔ ان میں کوئی حدیث نہیں ہے۔ آپ صحیح بخاری دیکھیں تو کئی بار آپ کو ایسی ملیں گی

جہاں امام بخاری نے صرف باب کا لفظ لکھا ہے یا صرف عنوان دیا ہے لیکن حدیث کوئی نہیں لکھی۔ وجہ یہ ہے کہ جس درجہ کی سند اور جس معیار کی روایت وہ دینا چاہتے تھے اس معیار کی کوئی روایت نہیں ملی اس لئے انہوں نے باب کا عنوان خالی چھوڑ دیا اور حدیث نہیں لکھی۔

امام بخاری نے جتنی احادیث نقل کی ہیں وہ سب کی سب صحیح لذاتہ ہیں۔ اس میں صحیح لغیرہ بھی کوئی نہیں ہے۔ اکثر احادیث مستفیض ہیں۔ مستفیض صحیح لغیرہ کی اس قسم کو کہتے ہیں جس کو ہر درجہ میں کم سے کم تین راویوں نے روایت کیا ہو۔ تین صحابیوں نے لفظاً یا معناً روایت کیا ہو، پھر تین تابعین نے پھر تین تبع تابعین نے۔ اس لئے اس کی بیشتر احادیث بڑی تعداد میں مستفیض ہیں۔ صحیح بخاری کی کچھ احادیث عزیز ہیں۔ عزیز ان احادیث کو کہا جاتا ہے جن کو ہر درجہ کے دو راویوں نے روایت کیا ہو اور بہت تھوڑی احادیث ہیں جو اخبار آحاد ہیں۔ خبر واحد یا اخبار آحاد ان احادیث کو کہتے ہیں جن کو کسی ایک یا دو درجوں میں صرف ایک راوی نے روایت کیا ہو۔

صحیح بخاری میں مکررات وغیرہ کو ملا کر کل احادیث نو ہزار بیاسی 9082 ہیں۔ ان مکررات وغیرہ کو نکال کر کل احادیث کی کل تعداد دو ہزار چھ سو دو 2602 ہے اور جو تعلیقات ہیں ان کی تعداد بھی کئی سو ہے۔ موقوفات یعنی اقوال صحابہ کا بعض لوگ شمار کرتے ہیں بعض نہیں کرتے۔

صحیح بخاری کو جو مقبولیت حاصل ہوئی اس کی کوئی مثال امت مسلمہ کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ دیگر اقوام کا میں نہیں کہہ سکتا، لیکن بظاہر اور واقعہ میں بھی ایسا ہی ہوگا۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسانی تاریخ میں کسی انسان کی علمی کاوش کو اتنی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی جتنی امام بخاری کی کتاب کو حاصل ہوئی۔ اس کی سینکڑوں شرحیں لکھی گئیں جن میں سے 53 شرحیں وہ ہیں جن کا ذکر حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں کیا ہے۔ حاجی خلیفہ آج سے دو سو سال پہلے ایک ترکی عالم گزرے ہیں۔ انہوں نے اسلامی علوم وفنون کی تاریخ اور ببلیوگرافی پر ایک کتاب کئی جلدوں پر مشتمل لکھی ہے جس کا نام کشف الظنون ہے۔ اس میں انہوں نے 53 شرحوں کا ذکر کیا ہے۔

امام بخاری کے ایک شارح ہیں مولانا عبدالسلام مبارکپوری جن کی ایک کتاب سیرت البخاری مشہور ہے۔ اس میں انہوں نے 143 شرحوں کا ذکر کیا ہے۔ میں نے اس کتاب کو کچھ دن پہلے دیکھا۔ بعض اردو کی شرحیں جو ان کے زمانے میں لکھی جا چکی تھیں اس کتاب میں ان کا ذکر نہیں ہے اور یہ کتاب سیرت البخاری بھی کم وبیش ستر سال پہلے لکھی گئی تھی۔ اس دوران بھی کئی شرحیں لکھی

گئیں جن کا ذکر بھی اس کتاب میں نہیں ہے۔ اس لئے ہم یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ آج امام بخاری کی اس کتاب کی کم وبیش دو سو شرحیں موجود ہوں گی۔ یہ ایک محتاط اور محفوظ اندازہ ہے جو کیا جا سکتا ہے۔ یہ شرحیں عربی، فارسی، اردو، انگریزی، فرانسیسی اور ترکی زبانوں میں لکھی گئی ہیں۔ ان چھ زبانوں میں تو بہت سی شرحیں میرے علم میں ہیں اور ان میں سے بیشتر کو میں نے خود دیکھا ہے اس لئے میں کہہ سکتا ہوں۔ لیکن ممکن ہے دوسری زبانوں میں بھی صحیح بخاری کی شرحیں موجود ہوں جن کا مجھے علم نہیں۔

صحیح بخاری کی عربی زبان میں چار شرحیں مشہور ہیں۔ جو چار مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہیں۔ سب سے مشہور شرح، جس کے بارے میں میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ The Commentary par excellence ہے، وہ حافظ ابن حجر کی فتح الباری ہے۔ ابن خلدون نے لکھا تھا۔ ابن خلدون کا زمانہ حافظ ابن حجر سے ذرا پہلے کا ہے۔ انہوں نے جہاں یہ بحث کی ہے کہ صحیح بخاری افضل ہے یا صحیح مسلم افضل ہے، اور یہ بتایا ہے کہ کونسی کن وجوہ سے افضل ہے، اس کے ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ یہ کتاب جس درجہ کی ہے اس درجہ کی شرح ابھی تک نہیں لکھی گئی اور یہ امت مسلمہ کے ذمہ ایک قرض کفایہ ہے کہ اس کتاب کی ایک شرح لکھے۔ جب ابن خلدون کے کم وبیش نصف صدی بعد فتح الباری لکھی گئی تو لوگوں نے بالاتفاق کہا کہ جس قرض کا ذکر ابن خلدون نے کیا تھا وہ حافظ ابن حجر نے امت کی طرف سے چکا دیا۔ حدیث کی کسی شرح میں جو معیارات ہونے چاہئیں، جس معیار اور پائے کی شرح ہونی چاہئے اس معیار اور پایہ کی شرح حافظ ابن حجر نے فتح الباری کی شکل میں لکھ دی۔ اور صحیح بخاری کی شرح کا حق ادا کر دیا۔ علم روایت، علم درایت، علم طرق اور علوم حدیث کی جتنی قسمیں میں نے آپ کے سامنے ان گزارشات کے دوران بیان کی ہیں اور جتنی بیان نہیں کیں وہ سب کی سب صحیح بخاری کی شرح فتح الباری میں منعکس ہوتی ہیں۔

آج سے چند سال پہلے بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں یہ تجویز آئی تھی کہ اس کا شرح اردو ترجمہ کیا جائے۔ چنانچہ ہم نے بہت غور وخوض کے بعد اس ترجمہ کا ایک فارمیٹ تیار کیا اور اس کے بعض اجزا کو ترجمہ کرایا جو آج کل ایڈٹ ہو رہا ہے اور ان شاء اللہ جلد شائع ہوگا۔ اس طرح اردو میں وہ مواد یا اس کا ایک نمونہ ہمارے سامنے آ جائے گا جو حافظ ابن حجر نے صحیح بخاری کی شرح میں امت کے سامنے رکھا ہے۔

فتح الباری کے درجنوں ایڈیشن دنیائے اسلام میں نکلے ہیں اور شاید دنیا میں اسلامیات کا کوئی ایسا کتب خانہ نہیں ہے جو فتح الباری سے خالی ہو۔ حافظ ابن حجر جامعہ ازہر میں پڑھاتے تھے اور یہ جامعہ ازہر کے لئے بڑی فضیلت کی بات ہے کہ حافظ ابن حجر وہاں استاد رہے ہیں۔ حافظ ابن حجر کے رفیق کار، ان کے معاصر اور آ تنے ہی درجے کے فقیہ اور محدث علامہ حافظ بدرالدین عینی تھے۔ انہوں نے بھی صحیح بخاری کی شرح لکھی عمدۃ القاری۔ وہ بھی جامعہ ازہر میں استاد تھے۔ ان کی شرح بھی بڑی غیر معمولی اور بہت مقبول ہے۔ لیکن اللہ نے جو درجہ حافظ ابن حجر کی فتح الباری کو عطا فرمایا وہ غالباً عمدۃ القاری کو حاصل نہیں ہوا۔

عمدۃ القاری میں فقہی مباحث پر زیادہ زور دیا گیا اور صحیح بخاری کے ابواب کے جو عنوانات ہیں جنہیں تراجم ابواب کہتے ہیں علامہ بدرالدین عینی نے ان پر غیر معمولی توجہ دی۔ بدرالدین عینی خود ایک بہت بڑے محدث تھے۔ انہوں نے صحیح بخاری کی اس شرح کے ساتھ ساتھ سنن ابی داؤد کی بھی شرح لکھی اور بھی بہت سا علمی کام کیا۔ لیکن ان کی کتاب عمدۃ القاری بہت مشہور ہے۔ ضخامت کے اعتبار سے عمدۃ القاری زیادہ بڑی کتاب ہے، لیکن معیار اور کیفیت کے لحاظ سے فتح الباری کا درجہ بہت اونچا ہے۔ ایک حدیث ہے 'لا ھجرۃ بعد الفتح' فتح مکہ کے بعد ہجرت کی ضرورت نہیں۔ اس پر بعض لوگوں نے کہا کہ 'لا ھجرۃ بعد الفتح' یعنی فتح الباری کے بعد علم حدیث کے لئے اب ہجرت کرنے کی ضرورت نہیں۔ فتح الباری کا یہ مقام و مرتبہ ہے۔

صحیح مسلم

صحیح بخاری کے بعد صحیح مسلم کا درجہ آتا ہے۔ امام مسلم کے اساتذہ میں خود امام بخاری، امام احمد بن حنبل اور امام شافعی کے ایک براہ راست شاگرد حرملہ بن یحیٰی بھی شامل ہیں۔ اس لئے امام مسلم کو دو بڑے محدثین سے براہ راست اور ایک بڑے فقیہ سے بالواسطہ کسب فیض کا موقع ملا۔ امام شافعی سے ان کے شاگرد کے ذریعے اور امام احمد سے براہ راست۔ امام صاحب نے امام اسحاق بن راہویہ سے بھی براہ راست کسب فیض کیا۔ لیکن ان کے خاص اساتذہ قتیبہ بن سعید اور ابوالولید القعنبی تھے۔ مسلم میں ان دونوں کی روایات کثرت سے ملیں گی۔ آپ دیکھیں گے حدثنی القعنبی، اخبرنی القعنبی، حدثنا قتیبۃ بن سعید۔ ان دونوں شیوخ کی بہت

احادیث آپ کو صحیح مسلم میں کثرت سے نظر آئیں گی۔ یہ امام مسلم کے خاص اساتذہ میں سے تھے۔ امام مسلم کی صحیح میں بلا تکرار دو ہزار احادیث ہیں۔ صحیح مسلم کے بعض خصائص کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے موازنے کے بارے میں بھی بات ہو گئی ہے۔

صحیح مسلم کی دو شرحیں مشہور ہیں۔ ایک کا ذکر کل کر چکے۔ دوسری مشہور شرح امام نووی کی ہے جو بہت مشہور اور مقبول ہے۔ چھپی ہوئی ہے اور ہر جگہ دستیاب ہے اور مسلم کی شرحوں میں ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ امام مسلم کی کتاب صحیح بخاری کے بعد بلند ترین درجہ رکھتی ہے۔ بعض علما کا کہنا ہے کہ وہ صحیح بخاری سے بھی افضل ہے، چنانچہ مغرب کے بعض علما کا یہی خیال تھا کہ وہ صحیح بخاری سے افضل ہے۔

صحیح مسلم کے بعد جو چار کتابیں ہیں ان میں مختلف حضرات نے مختلف کتابوں کا درجہ مختلف رکھا ہے۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ سب سے اونچا درجہ سنن ابوداؤد کا ہے، بعض کا کہنا ہے کہ جامع ترمذی کا ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ سنن نسائی کا درجہ اونچا ہے۔

پکی بات یہ ہے کہ مختلف خصوصیات کے باعث ان تینوں کتابوں کا درجہ اپنی اپنی جگہ اونچا ہے۔ سنن ابوداؤد اس اعتبار سے خاص مقام رکھتی ہے کہ وہ احادیث احکام کا ایک بڑا مجموعہ ہے جو ایک جگہ دستیاب ہے اور احادیث احکام میں صحیح ترین احادیث کا مجموعہ ہے۔ سنن ابوداؤد کا اس لحاظ سے درجہ بہت اونچا ہے۔ علم حدیث کے مختلف علوم و فنون کو ایک ساتھ سمونے کے اعتبار سے جامع ترمذی کا درجہ اونچا ہے اور صحت متن اور صحت نقل کے اعتبار سے سنن نسائی کا درجہ ہے۔ اس لئے جس ترتیب سے بھی بیان کریں ان تینوں میں سے کوئی نہ کوئی کتاب اس کی مستحق ہو گی کہ صحیحین کے بعد اس کا درجہ ہو۔ امام ابوداؤد صف اول کے محدثین میں سے ہیں۔ ہمارے بلوچستان کے علاقہ ضلع قلات یا خضدار سے ان کا تعلق ہے اس لئے پاکستانی ہیں۔ ان کے اساتذہ میں امام احمد، یحییٰ بن معین، قتیبہ بن سعید (جو امام مسلم کے بھی استاد ہیں)، ابوبکر بن ابی شیبہ اور اسحاق بن راہویہ شامل ہیں اور بڑے محدثین میں سے امام نسائی ان کے شاگرد ہیں۔ کچھ لوگ امام ابوداؤد کو پہلے لکھتے ہیں کہ ترمذی اور نسائی ان کے شاگردوں میں ہیں۔ اس لئے استاد کا ذکر پہلے اور شاگرد کا ذکر بعد میں کیا جاتا ہے۔

سنن ابو داؤد

امام ابو داؤد اس کتاب کے علاوہ بھی کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کا علمی مقام اس کتاب سے پہلے بھی بہت غیر معمولی اور مشہور و معروف تھا۔ جب وہ بصرہ تشریف لائے تو بصرہ کا گورنر ان سے ملنے کے لئے حاضر ہوا اور کہا کہ میری تین گزارشات اگر آپ قبول کر لیں تو میں بہت شکر گزار ہوں گا۔ ایک یہ کہ آپ بصرہ میں کچھ دن قیام فرمائیں تاکہ اہل بصرہ آپ سے استفادہ کر سکیں۔ دوسری یہ کہ آپ اہل بصرہ کے لئے خاص طور پر علم حدیث کی درس و تدریس کا کوئی حلقہ قائم کریں۔ اور تیسری گزارش یہ ہے کہ میرے دو بچوں کو الگ سے کوئی وقت دے دیں کہ جس میں آکر وہ آپ سے علم حدیث پڑھا کریں۔ آپ نے فرمایا کہ پہلی دو گزارشات قبول ہیں۔ تیسری گزارش مسترد۔ بچوں کو چاہئے کہ باقی لوگوں کے ساتھ آکر حدیث پڑھیں۔

سنن ابو داؤد میں پانچ لاکھ احادیث میں سے چار ہزار آٹھ سو 4800 کا انتخاب کیا۔ یہ احادیث صرف سنن اور احکام سے متعلق ہیں۔ صحاح ستہ میں فقہی احادیث کا سب سے بڑا ماخذ یہی کتاب ہے۔ صحاح ستہ کی کسی اور کتاب میں فقہی احادیث اتنی بڑی تعداد میں موجود نہیں ہیں۔ اس میں تکرار برائے نام ہے۔ کہیں کہیں کوئی حدیث دوبارہ نقل ہوئی ہے ورنہ ایک حدیث دوبارہ نقل نہیں کی گئی ہے۔ اس لئے چار ہزار آٹھ سو احادیث میں اکثر و بیشتر وہ ہیں جو ایک ہی بار بیان ہوئی ہیں۔

یہ کتاب جب سے لکھی گئی ہے بہت مقبول رہی ہے۔ علما اور طلبہ نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ایک محدث نے کہا کہ جس کے پاس سنن ابو داؤد ہے گویا اس کے پاس ایک ایسا پیغمبر ہے جو ہر وقت اس کی رہنمائی کر رہا ہے۔ یوں تو یہ بات حدیث کی ہر کتاب کے بارے میں کہی گئی ہے۔ لیکن جس نے بھی یہ سنن ابو داؤد کے بارے میں کہی اس نے سنن ابو داؤد کے خصوصی مقام کو سامنے رکھ کر کہی۔

سنن ابو داؤد کی بہت سی شرحیں لکھی گئیں جن میں سے ایک قدیم شرح امام خطابی کی ہے جو معالم السنن کے نام سے مشہور ہے۔ امام خطابی کا زمانہ امام ابو داؤد سے کم و بیش سو سال بعد کا ہے۔ امام ابو داؤد کا انتقال 275ھ میں ہوا۔ امام خطابی کا انتقال 388ھ میں ہوا۔ پھر ایک امام منذری تھے جنہوں نے اس کتاب کی تلخیص کی اور اس تلخیص کی شرح علامہ ابن قیم نے

لکھی۔ ایک شرح علامہ بدرالدین عینی کی ہے جو نامکمل ہے۔ یہ نامکمل شرح بھی چھ یا سات جلدوں میں ہے۔ ابھی حال ہی میں عرب دنیا اور پاکستان میں چھپی ہے اور ہر جگہ ملتی ہے۔

علامہ سیوطی نے بھی سنن ابوداؤد کی شرح میں ایک کتاب لکھی مرقاۃ الصعود الی شرح ابی داؤد۔ مرقاۃ الصعود سے مراد وہ سیڑھی ہے جس پر چڑھ کر آدمی بلندی کی طرف جاتا ہے۔ بارھویں صدی ہجری میں ایک عالم علامہ ابوالحسن سندھی تھے، ٹھٹھہ کے رہنے والے۔ انہوں نے ایک مختصر شرح لکھی تھی جو فتح الودود کے نام سے مشہور ہے اور کئی بار چھپ بھی ہے۔ ابوداؤد کی چار مشہور شرحیں برصغیر میں لکھی گئیں جن کے بارے میں کل تفصیل سے بات ہوگی۔ اس کا انگریزی ترجمہ بھی ہے جو ہمارے ایک سابق رفیق کار اور محترم دوست ڈاکٹر احمد حسن مرحوم نے کیا تھا، کئی بار چھپ چکا ہے اس پر انگریزی میں حواشی بھی ہیں اور مختصر شرح بھی ہے۔ امام مسلم کی صحیح کا بھی انگریزی ترجمہ ہو چکا ہے جس کی تفصیل کل آئے گی۔ یہ ترجمہ پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم نے کیا تھا۔

جامع ترمذی

سنن ابوداؤد کے بعد جامع ترمذی کا درجہ آتا ہے۔ امام ترمذی امام بخاری اور امام مسلم دونوں کے براہ راست شاگرد ہیں۔ امام ابوداؤد کے بھی شاگرد ہیں۔ قتیبہ بن سعید جو امام مسلم کے استاد ہیں وہ امام ترمذی کے بھی استاد ہیں۔ جامع ترمذی جامع ہے۔ یعنی حدیث کے آٹھوں ابواب اس میں شامل ہیں۔ اس میں عقائد، اخلاق، احکام، تفسیر، فضائل، فتن، اشراط قیامت، علامات قیامت یہ سب موضوعات شامل ہیں۔ اس لئے اس کا درجہ جامع کا ہے اور اس طرح سے وہ امام بخاری کی جامع کے برابر ہے۔ صحاح ستہ میں امام بخاری اور ترمذی دونوں کی کتابیں جامع ہیں۔

جامع ترمذی کے جو اہم خصائص یا مباحث ہیں ان میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ حدیث کے درجہ کا تعین بھی کرتے ہیں۔ وہ پہلے حدیث بیان کرتے ہیں اور پھر اس کا درجہ بیان کرتے ہیں جیسے ہذا حدیث حسن، ہذا حدیث صحیح، ہذا حدیث غریب۔ اس میں امام ترمذی اپنی اصطلاحات بھی استعمال کرتے ہیں اور کچھ اصطلاحات بقیہ محدثین کی لیتے ہیں۔ اس طرح سے ہر حدیث کے بعد پڑھنے والوں کو پتہ چل جاتا ہے کہ امام ترمذی نے اس

حدیث کو کس وجہ پر لکھا ہے۔ پھر امام ترمذی یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ اس حدیث سے جو احکام نکلتے ہیں ان احکام میں بقیہ محدثین اور فقہا کی رائے کیا ہے۔ مثلاً اس بارے میں امام شافعی کیا کہتے ہیں، امام سعد کیا کہتے ہیں، امام احمد بن حنبل کیا کہتے ہیں، امام مالک کیا کہتے ہیں اور امام ابو حنیفہ کیا کہتے ہیں گویا تمام فقہا کی آرا بھی قاری کے سامنے آجاتی ہیں۔ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو حدیث کی کسی اور کتاب میں نہیں پائی جاتی۔

ایک اور اہم بات یہ ہے کہ امام ترمذی ایک باب میں جو احادیث بیان کرتے ہیں وہ بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ "وفی الباب عن فلان و فلان و فلان" کہ اس موضوع پر فلاں فلاں صحابی کی احادیث بھی ہیں۔ ان احادیث کو انہوں نے اپنی کتاب میں شامل نہیں کیا۔ یا تو اس کی سند جو امام ترمذی تک پہنچی وہ اس درجہ کی نہیں تھی یا امام ترمذی نے محسوس کیا کہ جو مضمون تھا وہ بقیہ احادیث میں آگیا یا کسی اور وجہ سے انہوں نے ان احادیث کو شامل نہیں کیا لیکن حوالہ دے دیا کہ اس موضوع پر فلاں احادیث بھی موجود ہیں۔ تلاش کرنے والے تلاش کر سکتے ہیں۔ چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تکرار بہت کم ہے۔ جو حدیث ایک بار آگئی امام ترمذی اس کو دوبارہ نہیں دہراتے۔ پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ امام ترمذی نے راویوں کے نام اور کنیت پر بڑی بحث کی ہے۔ اس لئے کہ بعض راوی کنیت سے بہت مشہور ہیں اور بعض نام سے مشہور ہیں۔ اگر ایک جگہ کنیت آئی ہو اور دوسری جگہ نام آیا ہو تو یہ التباس ہو سکتا ہے کہ دو آدمی ہیں یا ایک ہی آدمی ہے۔ تو امام ترمذی وضاحت کر دیتے ہیں کہ یہ نام جن بزرگ کا ہے یہ وہی شخصیت ہیں جن کی کنیت یہ ہے۔ مثلاً ابو عمرو، ابو عمرو کا نام کچھ اور تھا۔ یا امام اوزاعی۔ کہیں اوزاعی آتا ہے کہیں عبدالرحمن آتا ہے۔ اب جہاں عبدالرحمن آیا ہے وہاں یہ پتہ چلانا کہ یہ امام اوزاعی ہیں ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ امام ترمذی اس کی نشاندہی کر دیتے ہیں۔

جامع ترمذی کے ضمن میں ایک بات خاص طور پر قابل غور ہے۔ وہ یہ کہ امام ترمذی ان محدثین میں سے ہیں کہ جن کا تساہل جرح و تعدیل میں مشہور ہے۔ امام ترمذی راوی کو عادل قرار دینے میں نرمی سے کام لیا کرتے تھے۔ محدثین نے امام ترمذی اور امام حاکم دونوں کی تعدیل کے بارے میں یہ کہا ہے کہ ان کی روایت قبول کرنے میں احتیاط سے کام لینا چاہئے اور جس راوی کو امام ترمذی اور امام حاکم عادل قرار دیں اس کی عدالت کی دوسری جگہ سے بھی تحقیق کر لینی چاہئے۔

اگر دوسرے محدثین بھی اس کو عادل قرار دیتے ہیں تو وہ عادل ہیں اور اگر دوسرے محدثین اسے مجروح قرار دے رہے ہیں تو پھر محض امام ترمذی کی تعدیل پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔ اگر یہ بات ہے تو امام ترمذی نے جن راویوں کو عادل قرار دے کر ان سے احادیث نقل کی ہیں ان احادیث میں بھی کلام ہو سکتا ہے۔ اس لئے امام ترمذی کی تصحیح، حسن قرار دی ہوئی احادیث میں سے بھی کئی احادیث کے بارے میں کلام ہوا ہے۔ تئیس (23) روایات وہ ہیں جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ شدید درجہ کی ضعیف ہیں۔ اس موضوع پر لوگوں نے کام کیا ہے۔ کئی لوگوں نے زمانہ حال میں جامع ترمذی کے کئی نسخے بھی شائع کئے ہیں جن میں ہر حدیث کی الگ سے نشاندہی کر دی گئی ہے۔

لیکن بہرحال یہ ایک اختلافی رائے رہے گی۔ اگر آج کا کوئی آدمی امام ترمذی جیسے عالم امام حدیث کی رائے اور ان کی تصحیح و تعدیل سے اختلاف کر سکتا ہے تو آج کے آدمی سے بھی اختلاف ہو سکتا ہے۔ امام ترمذی جیسا انسان اگر اپنے زمانے میں کسی حدیث کو ضعیف یا حسن قرار دیں اور آج کا کوئی آدمی یہ کہے کہ امام ترمذی کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے اور وہ حدیث حسن یا صحیح نہیں بلکہ ضعیف ہے۔ تو پھر آج کے آدمی سے بھی کل کے لوگ اختلاف کر سکتے ہیں۔

یہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میں نے بعض لوگوں کو دیکھا ہے کہ زمانہ حال کے ایک بزرگ جن کا چند سال قبل انتقال ہوا ہے ان کے شاگردوں میں بڑی شدت پائی جاتی ہے۔ جس حدیث کو ان کے استاد نے ضعیف قرار دیا ہے تو ان کے شاگرد اس کو ضعیف منوانے کے لئے لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک عرب ملک میں کسی جگہ میری گفتگو یا تقریر تھی۔ میں نے کوئی حدیث بیان کی تو وہاں ایک صاحب علم جو پچیس یا تیس سال کی عمر کے تھے، وہ ان بزرگ سے نسبت رکھتے تھے۔ انہوں نے محفل میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا کہ یہ حدیث تو ضعیف ہے اور ہمارے فلاں استاد نے فلاں تحقیق کی ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ کے استاد کی تحقیق کے بارے میں کوئی منفی بات نہیں کہتا۔ مگر تمھیں یہ ظاہر ہے ان کا علم و مرتبہ اور مقام اپنا ہے کہ جو بات وہ کہیں گے وہ قابل احترام ہے۔ لیکن اگر آپ کے استاد کو امام ترمذی سے اختلاف کرنے کا حق پہنچتا ہے تو باقی حضرات کو آپ کے استاد سے بھی اختلاف کرنے کا حق حاصل ہے۔ چنانچہ ان کی اس تحقیق پر بھی لوگوں نے کتابیں لکھی ہیں۔ ابھی حال ہی میں ایک کتاب دمشق

کے ایک عالم نے لکھی ہے جو غالباً چار یا پانچ جلدوں میں ہے جس میں انہوں نے ان بزرگ کی تصحیح یا تضعیف سے اختلاف کیا ہے۔

میں نام لے کر عرض کرتا ہوں۔ علامہ شیخ ناصر الدین البانی، بڑے مشہور اور صف اول کے محدثین میں سے تھے۔ چند سال پہلے ان کا انتقال ہوا ہے۔ اگر بیسویں صدی میں علم اسلام کے چند عظیم ترین علمائے حدیث کے نام چنے ہوں تو یقیناً ایک نام ان کا ہوگا۔ انہوں نے تمام کتب حدیث کا از سر نو جائزہ لیا اور اپنی تحقیق میں جہاں جہاں جس حدیث کو صحیح یا ضعیف یا حسن قرار دیا اس کی نشاندہی کر دی۔ اب اگر علامہ ناصر الدین البانی امام ترمذی سے اختلاف کر سکتے ہیں تو آج کے اہل علم کو علامہ البانی سے اختلاف کا حق ہونا چاہئے۔ ہمارے لئے تو دونوں سر آنکھوں پر، ہمارے لئے تو دونوں ایسے ہیں کہ وہ آئیں تو بقول امام مسلم کے ہم ان کے پاؤں چوم لیں۔ لیکن اگر علامہ ناصر الدین البانی امام ترمذی سے اختلاف کر سکتے ہیں تو کوئی اور آنے والا علامہ ناصر الدین البانی سے بھی اختلاف کر سکتا ہے۔ اس سے احترام میں کمی یا خدانخواستہ مقام و مرتبہ میں کمی کا سوال نہیں۔ مقام اپنی جگہ، اختلاف رائے اپنی جگہ۔

جامع ترمذی کی بہت سی شرحیں لکھی گئیں۔ برصغیر کی شرحوں کا کل ذکر کریں گے۔ برصغیر سے باہر کی شرحوں میں دو شرحیں مشہور ہیں۔ ایک علامہ ابو بکر بن العربی کی جو ایک مشہور مالکی فقیہ ہیں۔ ان کی کتاب ہے عارضۃ الاحوذی، یہ مختصر شرح ہے لیکن اچھی شرح ہے۔ دوسری شرح علامہ سراج الدین بلقینی کی ہے۔ یہ مصر کے رہنے والے تھے۔ مسلکاً شافعی تھے۔ ابو بکر بن العربی مالکی تھے۔ گویا ایک شرح مالکی عالم نے کی ہے اور دوسری شرح شافعی عالم نے کی ہے۔ حنفی عالم کی شرح کا ذکر کل کریں گے۔ یہ دونوں شرحیں بڑی مشہور ہیں۔ علامہ سراج الدین بلقینی کی شرح ہے العرف الشذی۔ علامہ بلقینی قاہرہ کے رہنے والے تھے۔ وہیں ان کا مزار ہے اور وہیں دفن ہوئے تھے۔ امام ترمذی کی اور بھی کئی کتابیں علم حدیث پر ہیں جن کا تذکرہ میں چھوڑ دیتا ہوں۔ ان کی ایک مشہور کتاب شمائل ترمذی ہے جس میں انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے شمائل کو بیان فرمایا ہے۔ یہ جامع ترمذی ہی کا ایک باب ہے جو الگ سے چھپا ہے۔ گویا ترمذی ہی کی کتاب کا ایک حصہ ہے۔ بعض حضرات نے اس کو الگ بھی چھاپا ہے، اس کی شرحیں بھی لکھی گئی ہیں اور بہت سی شرحوں کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے۔

سنن نسائی

ترمذی کے بعد درجہ ہے امام نسائیؒ کی کتاب کا۔ امام نسائی نے دراصل السنن الکبریٰ کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی تھی۔ امام نسائی کی وفات 303ھ میں ہوئی ہے۔ یہ صحاح ستہ کے مصنفین میں زمانے کے اعتبار سے سب سے آخری آدمی ہیں۔ یعنی ترتیب زمانی میں سب سے آخر میں آتے ہیں۔ لیکن کتاب کی اہمیت اور صحت کی ترتیب میں پانچویں نمبر پر یا تیسرے یا چوتھے نمبر پر آتے ہیں۔ اس بارے میں اختلاف ہوسکتا ہے۔ تیسرے، چوتھے اور پانچویں میں سے ایک پر آتے ہیں۔ ان کی کتاب السنن الکبریٰ دراصل بڑی کتاب تھی۔ جب وہ لکھی جاچکی اور شائع ہوئی تو رملہ جو فلسطین کا شہر ہے جس کو آج کل رام اللہ کہا جاتا ہے وہاں کا گورنر ایک بہت صاحب علم آدمی تھا۔ امام صاحب کے پاس کسب فیض کے لئے آیا کرتا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ آپ سے گزارش کی کہ لوگوں کے لئے اتنی بڑی کتاب کا پڑھنا اور اس کا نقل کرانا تو بہت دشوار ہوگا، پھر اس میں بعض احادیث ضعاف بھی آگئی ہیں اور بعض حسن لغیرہ ہیں۔ اس لئے آپ اس کا ایک مختصر نسخہ تیار کریں جس میں صرف صحیح احادیث ہوں اور جو تکرار ہے یا جو احادیث قوی نوعیت کی نہیں ہیں وہ آپ نکال دیں۔ آپ نے السنن المجتبیٰ کے نام سے اس کتاب کا خلاصہ تیار کیا۔ یہی وہ کتاب ہے جو آج کل مروج ہے اور سنن نسائی کہلاتی ہے۔

سنن نسائی اس اعتبار سے بڑی ممتاز ہے کہ صحیحین کے بعد سب سے کم ضعیف حدیثیں اس میں ہیں۔ صحیحین میں تو کوئی نہیں ہے۔ بقیہ دونوں کتابوں، ابوداؤد اور ترمذی میں ضعاف کی تعداد سنن نسائی کی نسبت زیادہ ہے۔ اس کے رجال یا راوی سنن کی بقیہ کتابوں کے مقابلے میں زیادہ ہیں۔ بقیہ چار کتابوں میں ابوداؤد، ابن ماجہ، ترمذی اور نسائی میں نسائی کے رجال سب سے قوی ہیں۔ اس کے راوی سب سے مستند ہیں اور اس کی شرائط بخاری اور مسلم کی شرائط کے بہت قریب ہیں۔

امام نسائی کو علل الحدیث میں بڑی مہارت تھی۔ انہوں نے علل الحدیث کی جابجا نشاندہی کی ہے۔ امام ترمذی نے بھی علل کی نشاندہی کی ہے لیکن امام نسائی اس میں زیادہ نمایاں ہیں۔ امام ترمذی کی طرح وہ اسماء اور کنی (کنیتوں) کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ اسی طرح سے

وہ امام ترمذی سے ملتے جلتے ہیں۔ انہوں نے غریب الاحادیث کی بھی شرح کی ہے۔ جہاں مشکل الفاظ آئے ہیں ان کی شرح کی ہے۔ گویا یہ وہ کتاب ہے جو ابوداؤد اور ترمذی دونوں کی خصوصیات اپنے اندر رکھتی ہے اور ایک اعتبار سے صحیحین کے بعد اسی کا درجہ آتا ہے۔ اس لئے کہ ضعیف حدیثیں اس میں سب سے کم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض حضرات نے اس کو صحیحین کے بعد کا درجہ دیا ہے۔

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس کتاب کی اس کے شایان شان کوئی شرح نہیں لکھی گئی۔ میں نے بہت تلاش کیا لیکن کسی قدیم شرح کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ آج سے نہیں بلکہ تیس پینتیس سال پہلے مجھے خیال ہوا کہ اس کتاب کی کوئی باقاعدہ اور مفصل شرح نہیں ہے۔ کسی نے ایک فقیر قسم کے آدمی سے پوچھا کہ آج کل کیا کر رہے ہو۔ اس نے کہا کہ بادشاہ کی لڑکی سے شادی کی فکر میں ہوں۔ پوچھنے والے نے کہا اچھا، کتنا کام ہو گیا۔ اس نے جواب دیا کہ آدھا کام ہو گیا ہے اور آدھا باقی ہے۔ اس نے کہا کہ آدھا کیا کام ہو گیا ہے؟ فقیر نے جواب دیا کہ میں تو راضی ہوں اور شہزادی کا راضی ہونا ابھی باقی ہے۔ میرا آج سے پینتیس سال پہلے سے یہ خیال ہے کہ مجھے اگر موقع ملا تو سنن نسائی کی شرح لکھوں گا۔ اس میں آدھا کام تو ہو گیا کہ میں تیار ہوں۔ بقیہ آدھا ہونا ابھی باقی ہے، یعنی شرح لکھی نہیں گئی ہے۔

اس کی جو شرحیں مشہور ہیں وہ صرف دو ہیں۔ ایک علامہ محمد بن عبدالہادی سندھی تھے، جن کی وفات 1138ھ میں ہوئی ہے۔ ان کا ایک حاشیہ ہے جو عام چھپی ہوئی کتابوں میں ملتا ہے۔ اس وقت پاکستان میں سنن نسائی کے جو نسخے ملتے ہیں وہ علامہ سندھی کی اس شرح کے ساتھ ملتے ہیں۔ یہ بڑی مختصر شرح ہے جو صرف حاشیہ پر آئی ہے۔ دوسری شرح 'زہر الربی' علامہ سیوطی نے لکھی ہے۔ وہ بھی بڑی مختصر ہے اور کہیں کہیں حاشیوں پر چھپی ہوئی بھی ہے۔ ان دو کتابوں کے علاوہ کوئی شرح ایسی قابل ذکر مجھے نہیں ملی جو مخطوطہ کی شکل میں ہو یا مطبوعہ شکل میں موجود ہو۔ اس لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ اس کی شرح لکھی جائے جو اسی انداز کی ہو جس انداز کی حدیث کی بقیہ کتابوں کی شرحیں ہیں۔ جن میں سے بعض کا تذکرہ کل ہوگا۔

سنن ابن ماجہ

صحاح ستہ کی آخری کتاب امام ابن ماجہ کی ہے۔ محمد بن یزید بن ماجہ کی وفات 273ھ میں ہوئی۔ اس لئے یہ امام ابوداؤد کے قریب قریب ہم عصر ہیں۔ امام ابوداؤد کی وفات 275ھ

میں ہوئی۔ ان کی وفات 273ھ میں ہوئی۔ زمانہ اگرچہ دونوں کا قریب قریب ایک ہے۔ لیکن امام ابن ماجہ کی کتاب کا درجہ سب سے آخر میں ہے۔ اس لئے کہ اس میں کمزوری کے اعتبار سے بعض ایسی چیزیں ہیں جو حدیث کی بقیہ کتابوں میں نہیں پائی جاتیں۔ اس میں جو ترتیب اختیار کی گئی ہے وہ احادیث احکام کی سنن کی ترتیب ہے۔ اس میں بتیس کتابیں، تین سو چودہ ابواب اور چار ہزار احادیث ہیں۔ حسن ترتیب کے اعتبار سے یہ تمام صحاح ستہ میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔ اس کی ترتیب بہت اچھی ہے۔ تکرار بہت کم ہے۔ اس میں سندیں کم اور متون زیادہ ہیں۔ انہوں نے سندیں صرف متون کے برابر رکھی ہیں اور بعض جگہ ایک سند سے ایک سے زائد متن بھی بیان کئے ہیں۔ ایک سند بیان کی ہے اور کہا ہے کہ اسی سند سے میں نے فلاں فلاں روایات فلاں استاد سے لی ہیں۔

اس کتاب کے آنے سے پہلے اور اس کے بعد بھی یہ بحث جاری رہی کہ صحاح ستہ کی چھٹی کتاب کون سی ہے۔ اگرچہ محدثین کی اکثریت سنن ابن ماجہ کو ہی صحاح ستہ کا حصہ سمجھتی ہے، لیکن بعض حضرات نے سنن ابن ماجہ کو صحاح ستہ میں شامل نہیں کیا۔ کچھ حضرات کو خیال ہے کہ سنن دارمی صحاح ستہ میں شامل ہے۔ کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ موطا امام مالک صحاح ستہ میں شامل ہے۔ لیکن علما کی غالب اکثریت سنن ابن ماجہ کو صحاح ستہ میں شامل سمجھتی ہے۔

سنن ابن ماجہ میں حدیث کی بقیہ کتابوں کے مقابلہ میں ضعیف احادیث زیادہ ہیں۔ ان کی ٹھیک ٹھیک تعداد کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا دشوار ہے۔ کچھ کا خیال ہے کہ ان کی تعداد چھتیس ہے، کچھ کا خیال ہے کہ ایک سو کے قریب ہے، کچھ کا خیال ہے کہ ایک سو تیس یا ایک سو چھتیس کے قریب ہے۔ پھر ضعیف کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا ویسے بھی بہت مشکل ہوتا ہے۔ ایک محدث کی رائے میں ایک حدیث ضعیف ہے، دوسرے کی رائے میں وہ ضعیف نہیں ہے یا اتنی ضعیف نہیں ہے۔ پھر ضعاف کے بھی مختلف درجات ہیں۔ بہر حال اس کتاب میں ضعاف کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے۔ بعض وہ ہیں جن کا ضعف بہت شدید ہے۔ وہ تقریباً تیس چھتیس کے قریب ہیں۔ بقیہ وہ ہیں جو ضعف کے ہلکے درجے پر ہیں۔

اس کتاب کی شرحیں بھی نسبتاً کم لکھی گئیں۔ برصغیر میں اس کی ایک دو شرحیں لکھی گئیں جن کا ذکر آگے کیا جائے گا۔ برصغیر سے باہر جو شرحیں لکھی گئیں ان میں ایک کتاب ہے علامہ سیوطی

کی مصباح الزجاجہ فی شرح سنن ابن ماجہ، اور ایک ہے ما تمس الیہ الحاجۃ لمن یطالع سنن ابن ماجہ'۔

یہ علم حدیث کی بنیادی کتابوں کا مختصر تعارف تھا جس میں صحاح ستہ بھی آگئیں اور ان کے علاوہ بقیہ کچھ کتابیں بھی آگئیں۔ آج کی گفتگو میں یہیں ختم کرتا ہوں۔ ہمارے پاس پندرہ منٹ ہیں سوال جواب کے لئے۔ کل کے سوالات بھی آپ پوچھنا چاہیں تو پوچھ سکتے ہیں۔ کل جمعہ کا دن ہے، جتنا وقت کم ہوگا لیکن علم حدیث پر برصغیر میں جو کام ہوا ہے اس کا تذکرہ ہوگا۔ ان شاء اللہ برصغیر میں اسلام کے آنے سے لے کر 2003 تک علم حدیث پر جو کام ہوا ہے اس کا تذکرہ اختصار کے ساتھ کروں گا۔ کوشش ہے۔ یہ بتانا مقصود ہے کہ علم حدیث کی خدمت میں برصغیر کے لوگ دنیائے اسلام کے دوسرے علاقوں سے پیچھے نہیں رہے۔ برصغیر میں علم حدیث اور اس کے متعلقات پر بڑا کام ہوا ہے بلکہ برصغیر کے لوگوں نے ایک زمانے میں دنیائے اسلام کے دوسرے علاقوں کے لوگوں کے مقابلہ میں علم حدیث پر زیادہ کام کیا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

طریقہ یہ بھی ہو سکتا تھا۔ لیکن قرآن مجید میں اس طرح سے کوئی معین مقدار یا quantity مقرر کرکے نہیں بتائی بلکہ ایک عمومی بات بتائی جس کو اپنے اپنے زمانے کے لحاظ سے لوگ سمجھیں اور اس کی تعبیر کر دیں۔ چونکہ تعبیروں کا اختلاف اسلام کی بنیادی خصوصیت میں شامل ہے اس لئے حضورؐ نے اس کی اجازت دی۔ قرآن پاک میں اس کی گنجائش رکھی گئی۔ مختلف فقہاء نے مختلف تعبیریں کیں اور جو شخص جس فقیہ کے علم اور تقویٰ پر اعتماد کرتا ہے اس کی بات مان لیتا ہے۔ اس زمانے میں جب یہ سارے محدثین اور فقہاء موجود تھے اس وقت جن حضرات کو امام شافعی کے علم اور تقویٰ پر اعتماد تھا وہ امام شافعی کے اجتہادات کو سر آنکھوں پر تسلیم کرتے تھے۔ امام شافعی اتنے اونچے درجہ کے انسان تھے کہ اگر آج وہ آئیں اور ہم میں سے کوئی ان کے پاؤں چھونے کی کوشش نہ کرے تو بڑا بدبخت ہوگا۔

امام احمد بن حنبلؒ سے ہر مسلمان کو محبت اور عقیدت ہے۔ لیکن امام احمد بن حنبل کے اجتہادات کو دنیائے اسلام میں بہت تھوڑے لوگ قبول کرتے ہیں۔ مسلمانوں میں مشکل سے ایک فیصد لوگ ہوں گے جو فقہی معاملات میں امام احمد کی رائے اور اجتہاد پر عمل کرتے ہیں۔ بقیہ ننانوے فیصد دوسرے فقہاء کی پیروی کرتے ہیں۔ لیکن امام احمد کے احترام میں وہ کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ تقلید سے مراد صرف یہ ہے کہ کسی شخص کے علم اور تقویٰ پر اعتماد کرکے اس کی بات کو مان کر اس پر عمل کر لیا جائے۔ اس کو تقلید کہتے ہیں۔ امام احمد کی تقلید تو تھوڑے لوگوں نے کی۔ لیکن احترام سب کرتے ہیں۔ تقلید کا تعلق احترام سے نہیں ہے۔ احترام تو ہر صاحب علم کا ہوتا ہے۔ صحیح بخاری دنیائے اسلام میں ہر جگہ پڑھائی جاتی ہے۔ اس وقت دنیائے اسلام میں امام ابوحنیفہ کی پیروی کرنے والے کم و بیش پینسٹھ فیصد مسلمان ہیں۔ پورا وسط ایشیا، پورا افغانستان، پورا ترکی، پورا مشرقی یورپ، پورا ہندوستان، پورا پاکستان، پورا بنگلہ دیش، پورا چین۔ یہ دنیائے اسلام کے تقریباً ساٹھ پینسٹھ فیصد بنتے ہیں اور امام ابوحنیفہ کی تقلید کرتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی امام بخاری کے احترام اور عقیدت میں کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ امام بخاری نے کم سے کم بیس مقامات پر امام ابوحنیفہ پر تنقید کی ہے جو بعض مقامات پر خاصی سخت ہے۔ سر آنکھوں پر۔ اگر باپ اور چچا میں اختلاف ہو تو بچوں کا یہ حق نہیں کہ وہ باپ کا ساتھ دے کر چچا کے خلاف کچھ آواز اٹھائیں۔ دادا اور دادا کے بھائی میں اختلاف ہو تو پوتوں اور نواسوں کا یہ کام نہیں کہ وہ ٹیک کر

حمایت میں الجھیں اور دوسرے کی مخالفت کریں۔ ہم امام بخاری کا بھی احترام کرتے ہیں اور امام ابوحنیفہ کا بھی احترام کرتے ہیں۔ ان کا آپس میں اختلاف ہے۔ جس کو امام بخاری کے دلائل زیادہ مضبوط معلوم ہوں وہ ان کی پیروی کرے اور جس کو امام ابوحنیفہ کے دلائل مضبوط معلوم ہوتے ہیں وہ ان کی پیروی کرے اور احترام دونوں کا کرے۔

کیا صحیح بخاری میں ایک ہی باب کے اندر آنے والی دو قولی احادیث کے الفاظ ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتے ہیں؟

ایسا ہو سکتا ہے۔ اس کا امکان موجود ہے کہ ایک باب میں ایک ہی صحابی سے آنے والی روایت کے الفاظ مختلف ہوں۔ اس کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں۔ ایک سبب تو یہ ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہی ایک بات کوئی بار بیان فرمایا ہو۔ دو صحابہ نے دو مختلف اوقات میں اس کو سنا اور دونوں الفاظ نوٹ کر کے یاد کر لئے اور آگے بیان کر دیا۔ لیکن زیادہ ایسا ہوا ہے کہ کسی عملی معاملہ کو یعنی حضور کے قولی ارشاد کو نہیں بلکہ کسی طرز عمل کو صحابہ نے دیکھا اور ایک صحابیؓ نے اپنے الفاظ میں بیان کر دیا اور دوسرے نے اپنے الفاظ میں۔ تو واقعہ تو ایک ہے لیکن دیکھنے والے صحابی اس کو ایک سے زیادہ قسم کے الفاظ میں بیان کر سکتے ہیں۔ صحابیؓ کے لئے ضروری نہیں ہے کہ جو واقعہ وہ دیکھے اس کے لئے بھی ایک ہی طرز بیان اختیار کرے۔ مثلاً عبد اللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ میں غزوہ بدر میں گیا تو رسول اللہ ﷺ نے مجھے اور میرے ساتھ کئی لوگوں کو کمسنی کی بنیاد پر واپس کر دیا۔ اب اس واقعہ کو حضرت عبد اللہ بن عمرؓ جب بھی بیان کریں گے ضروری نہیں کہ ایک ہی طرح کے الفاظ میں بیان کریں۔ لیکن ان سے جو تابعی سنیں گے وہ انہی الفاظ میں لکھیں گے جن الفاظ میں ان سے حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے بیان کیا ہے۔ ان الفاظ میں وہ تابعی اپنی طرف سے کوئی رد و بدل نہیں کریں گے۔ البتہ جس صحابیؓ نے اپنی آنکھوں سے ایک واقعہ دیکھا ہے اس کے الفاظ میں رد و بدل ہو سکتا ہے۔ اس طرح ایک ہی واقعہ کے الفاظ میں فرق ہو سکتا ہے۔

امام بخاری کی کتاب کا مکمل نام کیا ہے؟

امام بخاری کی کتاب کا مکمل نام ہے 'الجامع الصحیح المسند المختصر من امور رسول اللہ ﷺ و سننہ و ایامہ'

کیا موطا امام مالک بھی دوسری کتابوں کی طرح مختلف مجلدات میں ہے؟

اتنے بڑے انسان ہیں کہ اپنے زمانے میں وہ شیخ الکل کہلاتے تھے، یعنی سب کے استاد، پورے ہندوستان کے استاد۔ اور واقعی وہ علم حدیث میں شیخ الکل تھے۔

علوم الحدیث کی کسی جامع کتاب کا نام بیان کر دیں۔

اس موضوع پر سب سے جامع کتاب ڈاکٹر خالد علوی کی ہے جس کا نام علوم الحدیث ہے اور دو جلدوں میں چھپی ہے۔ ایک جلد اس کی چھپ چکی ہے۔

حدیث کے تعارض میں عام اور خاص دونوں کا ذکر ہو، اس میں مفہوم کے اعتبار سے جو شق ہے اس کی وضاحت کر دیں۔

اگر دو احادیث میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہو تو اس کو دور کرنے کے چار وجوہ یا چار طریقے ہیں۔ ان میں سے ایک سند ہے، دوسرا متن ہے، تیسرا مفہوم ہے اور چوتھا خارجی امور ہیں۔ مفہوم میں بھی چار پانچ چیزیں شامل ہیں۔ مفہوم کا ایک اصول یہ ہے جو سب سے پہلے محدثین نے وضع کیا بعد میں دنیا کے سب لوگ اس کو ماننے لگے۔ وہ یہ ہے کہ ایک حدیث میں کوئی چیز عمومی انداز میں بیان ہوئی ہے۔ جنرل مفہوم ہے جس کو اصطلاح میں 'حدیث عام' کہا جاتا ہے۔ اور ایک دوسری حدیث خاص ہے اور وہ کسی خاص حالت کو بیان کرتی ہو۔ تو بظاہر ان میں تعارض ہوگا لیکن درحقیقت ان میں تعارض نہیں ہے۔ جو عام کو بیان کرتی ہے وہ عام مسائل کو بیان کرتی ہے جو خاص ہے وہ اس خاص particular category کو regulate کرتی ہے۔ تو ہم یہ کہیں گے کہ یہ جو خاص حدیث ہے یہ اس عام کے اس پہلو کو مستثنیٰ کر رہی ہے جس کا ذکر اس حدیث میں کیا گیا ہے۔ یہ دو احادیث کے درمیان تعارض دور کرنے کا ایک طریقہ ہے۔

اس سلسلہ میں ایک مثال عرض کرتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ 'لا تبع ما لیس عندک' یہ سنن کی اکثر کتابوں میں موجود ہے۔ کہ وہ چیز مت بیچو جو تمہارے پاس موجود نہیں ہے۔ یہ ایک عام حدیث ہے۔ آپ گندم بیچیں اور آپ کے پاس موجود نہ ہو تو مت بیچیں۔ آپ کے پاس جوتا نہیں ہے تو جوتا مت بیچیں، میز نہیں ہے تو میز مت بیچیں، گلاس نہیں ہے تو گلاس مت بیچیں۔ یہ ایک عام چیز ہے۔ لیکن ایک خاص چیز ہے کہ کسی کے پاس فیکٹری لگی ہوئی ہے۔ وہ مثلاً فرنیچر بناتا ہے اور آپ چاہتے ہیں کہ یہ پیسے لیجئے اور مجھے دو چارپائیاں بنا کر دے دیں۔ پیسے آپ نے دے دیئے، خرید و فروخت مکمل ہو گئی اور چارپائیاں اس شخص کے پاس موجود نہیں ہیں۔ تو اس حدیث کی رو

سے وہ آپ کو تپائیاں نہیں بیچ سکتا۔ نہ آپ سے پیسے لے سکتا ہے۔ پہلے وہ تپائیاں بنائے، جب بن جائیں تو پھر آپ کو فروخت کرے۔ لیکن ایک طریقہ شروع سے یہ رائج رہا ہے کہ جو لوگ سپلائرز ہیں یا مینوفیکچررز ہیں، اسلام سے پہلے بھی یہ ہوتا تھا آج بھی ہوتا ہے۔ آپ مینوفیکچرر یا سپلائر سے کوئی معاملہ کرلیں اور پہلے اس کو پیسے دے دیں۔ وہ جس طریقے سے سپلائی کرتا ہے آپ کو سپلائی کردے گا۔ اس وقت تو وہ چیز موجود نہیں ہے لیکن بعد میں موجود ہو جائے گی۔ وہ آپ کو دے دے گا۔ یہ ایک خاص حکم ہے جو اس خاص صورت حال کے لئے ہے۔ یہ اس عام حکم سے مستثنیٰ ہے۔ اب آپ کہیں کہ بظاہر تو تعارض ہے۔ وہ چیز موجود نہیں ہے تو وہ کیسے بیچے گا۔ لیکن یہ ایک خاص حدیث ہے ایک خاص صورت حال کو بیان کرتی ہے۔ مینوفیکچرر یا Grower کو آپ کہیں کہ فلاں تاریخ کو آپ مجھے دس من گندم دے دیں۔ یا قصائی ہے جانور خرید کر لاتا ہے اور گوشت سپلائی کرتا ہے۔ آپ کے ہاں کوئی تقریب ہے اور آپ اس سے کہیں کہ فلاں تاریخ کو دس من گوشت سپلائی کردو تو وہ کردے گا اس لئے کہ وہ سپلائر ہے۔ تو سپلائر، مینوفیکچرر یا Grower کے لئے حضورؐ نے اجازت دی ہے اس لئے کہ یہ طریقہ چلا آرہا تھا۔ یہ مخصوص صورت حال ہے اور اس کو اسی پر محدود رکھا جائے گا اور بقیہ عام حدیث بقیہ معاملات پر منطبق ہوگی۔ ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں رہا۔ یہ ہے مفہوم کے لحاظ سے تعارض کو دور کرنا۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

گیارھواں خطبہ

برصغیر میں علم حدیث

جمعۃ المبارک، 17 اکتوبر 2003

علم حدیث میں برصغیر کا contribution تابعین اور تبع تابعین کے زمانے سے شروع ہو گیا تھا۔ ایک بزرگ تھے ابو معشر نجیح السندی، جن کے لقب کے ساتھ سندی یا سندھی لگا ہوا ہے۔ ان کی روایات اور ان کی بیان کردہ احادیث اور سیرت کا مواد کتب حدیث اور کتب سیرت میں کثرت سے ملتا ہے۔ اس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ برصغیر میں اس روایت نے اتنی تیزی سے جڑیں پکڑیں کہ یہاں کے ایک نامور صاحب علم کا تذکرہ عراق، حجاز اور مصر کے نامور اصحاب علم کے ساتھ ہونے لگا۔

علم حدیث کے ارتقاء اور برصغیر میں علم حدیث پر ہونے والے کام کی رفتار اور اسلوب و انداز کے اعتبار سے دیکھا جائے تو برصغیر کی علمی تاریخ کے سات دور بنتے ہیں۔

برصغیر میں علم حدیث کا پہلا دور

سب سے پہلا دور وہ ہے جو محمد بن قاسم کی فتح سندھ کے ساتھ شروع ہوا اور اس وقت تک جاری رہا جب دہلی میں مسلمانوں کی خود مختار اور مستقل بالذات سلطنت کا دارالحکومت قائم ہوا۔ یہ وہ دور ہے جس میں مسلمانوں کے علمی روابط زیادہ تر عرب کے ساتھ بالعموم اور عراق کے ساتھ بالخصوص قائم ہوئے۔ عراق کے لوگ بڑی تعداد میں یہاں آئے۔ اسی طرح دوسرے عرب ممالک سے بھی لوگ بڑی تعداد میں یہاں برصغیر میں آکر بسے۔ ان میں اہل علم بھی شامل تھے، محدثین بھی شامل تھے۔ ان محدثین کے جزوی تذکرے تاریخ کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ یہ محدثین بڑی تعداد میں آتے رہے اور یہاں علم حدیث کی نشر و اشاعت اپنی مقدور بھر کوششوں کے ذریعے تصنیفی اور تحقیقی کام کرتے رہے۔ لیکن ان میں سے بیشتر کا کوئی مفصل تذکرہ نہیں ملتا۔ اس دور کے اہل علم کے بارہ میں اگر کوئی مواد ملتا بھی ہے تو وہ انتہائی مختصر اور محدود ہے۔ اس قلت معلومات کی ایک بڑی اور اہم وجہ یہ بھی ہے کہ کوئی بڑا اور نمایاں تصنیفی اور تحقیقی کام اس دور میں ایسا نہیں ہوا کہ جو کسی قابل ذکر کتاب کی شکل میں یا تصنیف کی شکل میں ہوتا اور ہم تک پہنچتا۔

برصغیر میں علم حدیث کا دوسرا دور

اس کے بعد جب دہلی میں مسلمانوں کی سلطنت قائم ہوئی۔ اور وہ دور شروع ہوا جس کو دور سلطنت کہتے ہیں۔ اس وقت بڑی تعداد میں علمائے کرام برصغیر میں آئے جن میں علم

حدیث پر جو کام کیا وہ کئی سو سال تک پوری دنیائے اسلام میں بہت مشہور و معروف اور مقبول رہا۔ ان کا اسم گرامی تھا امام حسن بن محمد صغانی لاہوری۔ امام صغانی لاہوری کے نام سے مشہور ہیں۔ لاہور میں طویل عرصہ تک قیام کرنے کی وجہ سے وہ لاہوری کہلائے۔ اگرچہ ان کے بارے میں یہ بات مختلف فیہ ہے کہ وہ اصل میں کہاں کے رہنے والے تھے۔ بعض بزرگوں کا کہنا ہے کہ ان کا تعلق بدایوں سے تھا جو یوپی کا ایک شہر ہے۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ ان کا تعلق پنجاب ہی کے کسی علاقے سے تھا۔ تاہم اس پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ لاہور میں قیام پذیر رہے۔ لاہور ہی کو انہوں نے اپنا وطن بنایا۔ پھر ایک طویل عرصہ کے بعد وہ لاہور سے دنیائے عرب چلے گئے اور حجاز میں سکونت اختیار فرمائی اور وہیں کہیں ان کا انتقال ہوا۔ حدیث پر ان کی کتاب ہے مشارق الانوار النبویہ فی صحاح الاخبار المصطفویہ۔ جس کو مختصراً مشارق الانوار کہا جاتا ہے۔

مشارق الانوار برصغیر میں کئی سو سال تک حدیث کی ایک مستند کتاب کے طور پر مروج رہی ہے۔ مدرسوں میں پڑھائی جاتی رہی ہے۔ بہت سے حضرات نے اس کے ترجمے کئے اور اس کی شرحیں لکھیں۔ اس کا اردو ترجمہ بھی ایک قدیم ترین کتاب کے طور پر موجود ہے۔ جب برصغیر میں طباعت اور نشر و اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا اسی وقت یعنی بارھویں صدی ہجری کے اواخر میں یا تیرھویں صدی ہجری کے شروع میں مشارق الانوار کا اردو ترجمہ شائع ہوا تھا۔

مشارق الانوار ایک مختصر کتاب ہے جس میں صحیحین کی قولی احادیث کا انتخاب ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں جتنی احادیث ہیں ان میں فعلی اور تقریری احادیث کو انہوں نے نکال دیا ہے اور قولی احادیث یعنی رسول اللہ ﷺ کے قولی ارشادات گرامی کو منتخب کر کے اور سند حذف کر کے انہوں نے جمع کر دیا ہے۔ گویا وہ یہ چاہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات گرامی روایت اور سند کے فنی مباحث سے ہٹ کر عام قارئین تک پہنچ جائیں تاکہ عام لوگ ان کا مطالعہ کر سکیں۔

یہ مشکوٰۃ سے پہلے لکھی جانے والی ایک کتاب تھی۔ امام صغانی لاہوری کی وفات 650ھ میں ہوئی تھی۔ ظاہر ہے انہوں نے اس سے پہلے یہ کتاب لکھی ہوگی۔ ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں لکھی جانے والی یہ کتاب برصغیر میں طویل عرصہ تک مروج رہی۔ اس کی شرحیں بھی لکھی گئیں۔ بعد میں استنبول میں جو عملاً تقریباً سات سو برس تک دنیائے اسلام کا سیاسی مرکز اور

گئی ہیں۔ یہ کتاب ایک اعتبار سے ان کی شرح ہے۔ تو ان کتب کا سامنے رکھ کر گویا علم حدیث کی
ساری کتابوں کے بارے میں پڑھنے والے کو کچھ نہ کچھ واقفیت ہو جاتی ہے۔ بہت سے اہل علم نے
اس کی تعریف کی ہے اور اس کا ذکر مختلف تذکروں میں ملتا ہے۔ یہ ایک ایسا مجموعہ کام ہے جو اس
انداز میں برصغیر کے علاوہ کسی اور ملک میں نہیں ہوا۔

صوبہ گجرات کے دو بڑے محدثین اور مصنفین میں ایک محدث سے ہر عرب اور ہر
حدیث کا ہر طالب علم اور پوری دنیائے اسلام واقف ہے۔ وہ ہیں شیخ علی المتقی الہندی۔
اگر کہا جائے کہ شیخ علی متقی دنیائے اسلام میں اپنے زمانے کے سب سے بڑے محدث تھے تو شاید
غلط نہیں ہوگا۔ وہ گجرات سے ہجرت کر کے مکہ مکرمہ چلے گئے تھے اور وہیں ان کا مزار ہے۔ انہوں
نے ایک ایسا کام کیا جو اپنی نوعیت کا ایک بہت بڑا اور منفرد کام تھا۔ انہوں نے یہ چاہا کہ تمام
احادیث رسول کو، جو مجموعہ جات حدیث میں موجود ہیں، حروف تہجی کے اعتبار سے جمع کر دیا
جائے۔ چنانچہ انہوں نے 'کنز العمال' کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ کنز العمال میں تمام صحاح
ستہ، مسند امام احمد، معجم طبرانی، مسند ابو داؤد طیالسی اور حدیث کی جتنی کتابیں ان کو دستیاب
ہو سکیں، ان سب کی احادیث کو انہوں نے حروف تہجی کے حساب سے جمع کر دیا ہے۔

یہ کتاب کئی بار چھپی ہے۔ پہلی بار تو قدیم انداز سے چھپی تھی۔ کتاب کے قدیم
ایڈیشنوں میں احادیث کی تعداد کا کوئی بندوبست نہیں تھا کہ ان کو ترتیب وار نمبر شمار لگا کر شمار کر
لیا جائے۔ لوگوں نے انفرادی طور پر manually اس کی گنتی کی تو بعض لوگوں کے مطابق اس
میں 152,000 احادیث ہیں۔ کچھ اور لوگوں کے اندازہ کے مطابق اس سے کم اور کچھ کے اندازہ
کے مطابق اس سے زیادہ ہیں۔

چند سال پہلے یہ کتاب عرب دنیا میں بڑی تحقیق اور اہتمام کے ساتھ دوبارہ شائع ہوئی
اور کتاب کے مرتب و محقق نے ہر حدیث کا نمبر بھی ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ یہ بات میرے علم میں
نہیں کہ پوری کتاب مکمل ہوئی کہ نہیں ہوئی۔ اس کے بعض اجزا شائع ہوئے تھے اور میں
نے دیکھے تھے۔ اگر مکمل ہو گئی ہے تو صحیح تعداد کا اندازہ ہو گیا ہوگا جس کا مجھے پتہ نہیں ہے۔ لیکن یہ
ایک بڑی اہم کتاب ہے جو ایک طویل عرصہ تک طلبہ حدیث کے لیے اہم مرجع رہی ہے۔ کیونکہ
اس میں حدیث کو تلاش کرنا اور اس کا حوالہ دینا بڑا آسان ہے۔ اگر حدیث کے شروع کا حصہ

آپ کو یاد ہو تو حروف تہجی کی ترتیب سے کتاب شروع کر دیں۔ نہ یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ اس کے راوی کون ہیں نہ یہ پوچھنے کی ضرورت ہے کہ دراصل یہ حدیث کس کتاب میں ہے اور نہ یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ اصل اور ابتدائی راوی کون ہیں۔ اگر پہلا لفظ آپ کو یاد ہے تو مزید کچھ بھی جاننے کی ضرورت نہیں۔ اس حساب سے یہ کتاب طلبہ، محققین، واعظین، مقررین اور عام مسلمانوں کے لئے بڑی مفید ہے۔ سب نے اس سے استفادہ کیا اور بہت جلد یہ مقبول ہوئی۔

شیخ علی المتقی کے بعد علم حدیث میں نمایاں کام کرنے والے انہی کے شاگرد تھے شیخ عبدالوہاب المتقی، جو ایک بہت بڑے محدث تھے وہ بھی ہجرت کر کے ہندوستان سے مکہ مکرمہ چلے گئے تھے۔ انہوں نے مکہ مکرمہ میں علم حدیث کو بہت بڑے پیمانے پر عام کیا۔ گجرات اور برصغیر کا نام ان کی وجہ سے ہر جگہ روشن ہوا۔ دنیائے اسلام کے مختلف گوشوں سے آنے والوں نے ان سے کسب فیض کیا۔ ان سے استفادہ کرنے والوں میں برصغیر کے لوگ بھی شامل تھے اور باہر کے لوگ بھی۔ یہ تین شخصیات تو ان لوگوں میں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں جن کا تعلق برصغیر سے ہے اور جنہوں نے جس کام کو اس طرح سے انجام دیا۔ پوری دنیا میں اس کے اثرات محسوس کیے گئے۔

برصغیر میں علم حدیث کا تیسرا دور

دور مغلیہ، دور سلاطین کے بعد آیا۔ اس دور کو علم حدیث کے اعتبار سے ایک نئے دور کا آغاز کہہ سکتے ہیں۔ علم حدیث پر ایک نئے انداز سے اور نئے جوش و خروش سے دور مغلیہ میں کام کا آغاز ہوا۔ اگرچہ اس نئے جوش و خروش کا مغل حکمرانوں سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اس کا اعزاز ان کو نہیں جاتا لیکن چونکہ یہ کام مغل حکمرانوں کے زمانے میں ہوا اس لئے ان کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ یہ دور دو بڑی شخصیات سے عبارت ہے۔ دو بڑی شخصیات جن کے تذکرے کے بغیر برصغیر میں علم حدیث کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان میں ایک شخصیت تو ایسی ہے کہ دنیائے اسلام میں حدیث کی تاریخ ان کے تذکرہ کے بغیر مکمل نہیں ہے تو درست ہے۔ ان میں سے پہلی شخصیت تو شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی ہے اور دوسری شخصیت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے تذکرے کے بغیر علم حدیث کی کوئی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ برصغیر کے مسلمانوں کے امیر المومنین فی الحدیث ہیں تو غلط نہیں ہوگا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا تعلق دہلی سے تھا۔ علم حدیث سے ان کی دلچسپی اور علم حدیث میں ان کی خدمات اس درجہ کی ہیں کہ محدث دہلوی کا لفظ ان کے نام کا حصہ بن گیا ہے۔ آپ نے دہلی کے رہنے والے بہت سے لوگوں کے نام کے ساتھ محقق کا لفظ نہ ہوگا، وہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی اولاد میں سے ہیں۔ کہ لئے محقق کہلاتے ہیں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے خاصی طویل عمر پائی۔ یہ اکبر کے زمانے میں پیدا ہوئے اور شاہجہان کے زمانے میں ان کا انتقال ہوا۔ جہانگیر ان سے متاثر تھا۔ اس نے انہیں اپنے دربار میں آنے کی دعوت دی۔ وہ جہانگیر سے ملنے کے لئے اس کے دربار میں تشریف لے گئے اور جہانگیر سے ملے۔ جہانگیر ان کی شخصیت سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اپنے روزنامچے میں، جو تزک جہانگیری کے نام سے مطبوعہ موجود ہے، ان کا ذکر بڑے ہی تعریفی انداز میں لکھا ہے کہ ایسے لوگ بہت کم ہیں۔ میں ان کی شخصیت اور گفتار سے بڑا متاثر ہوا ہوں۔ یعنی ایک شخصیت کہ جن کا بادشاہوں نے نوٹس لیا اور بادشاہوں نے اپنی تحریروں میں جن کا ذکر کیا ان میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی شامل ہیں۔

شیخ عبدالحق نے حرمین کا سفر کیا اور تین سال وہاں بسر کئے۔ حرمین کے بہت سے مشائخ سے بھی کسب فیض کیا، سندیں اور اجازت حاصل کی اور اس کے بعد واپس ہندوستان آ گئے۔

یہاں آنے سے پہلے اور آنے کے بعد انہوں نے یہ محسوس کیا کہ برصغیر کی بہت سی خرابیوں اور گمراہیوں کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ یہاں براہ راست قرآن مجید، حدیث اور سیرت کا مطالعہ کم ہوتا جا رہا ہے۔ عقلیات اور معقولات پر زیادہ زور ہے جس کی وجہ سے لوگوں میں تدین، خشیت الٰہی اور تعلق مع اللہ کی وہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی جو براہ راست قرآن مجید، حدیث اور سیرت کے مطالعہ سے پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں اکبر کی گمراہی عام تھی۔ علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ

تخم الحادے کہ اکبر پرورید

باز اندر فطرت دارا دمید

افادہ کا دروازہ جو کبھی بند ہو گیا تھا وہ دوبارہ دار کی حفاظت میں ان کے سامنے آ گیا تھا۔ گویا وکبرہ کا اعادہ جو ضرب المثل ہے۔ اس کی وضاحت یا تشریح کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ بہت ہی بد دینی اور الحاد کا زمانہ تھا جس کے منفی اثرات مسلم معاشرہ پر مرتب ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اس دور میں اور ان حالات میں تین حضرات نے اس صورت حال کو بدلنے کے لئے قدم اٹھایا۔ ان میں سے ایک بڑا نمایاں نام حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا بھی ہے۔

حضرت شیخ محدث دہلوی نے تین بڑے کام کئے۔ ایک بڑا کام تو یہ کیا کہ دہلی میں علم حدیث کا ایک بہت بڑا حلقہ شروع کیا جہاں سے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں طلبہ اور اہل علم نے ان سے کسب فیض کیا اور علم حدیث کا ایک نیا رجحان دارالحکومت دہلی میں شروع ہوا جس کے اثرات باقی معاشرہ پر بھی ہوئے۔ ان کے تلامذہ ان سے پڑھ کر دوسرے شہروں میں گئے۔ دوسرے شہروں میں علم حدیث کے حلقے قائم ہوئے اور علم حدیث کی ایک نئی خوشبو، ایک تازہ ہوا اور ایک نئی نسیم جاں فزا ہندوستان میں پھیلنا شروع ہوئی جس کے محرک اول شیخ عبدالحق محدث دہلوی تھے۔

شیخ عبدالحق نے دوسرا کام یہ کیا کہ علوم نبوت پر چھوٹے چھوٹے رسالے اور کتابیں لکھنا شروع کیں جن کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں ذات رسالت مآب علیہ الصلوۃ والسلام سے تعلق استوار ہو۔ رسول اللہ ﷺ کی ذات سے محبت پیدا ہو۔ حضورؐ کی شخصیت پر، آپؐ کے شمائل پر، نبوت پر اور مدینہ منورہ کے فضائل جیسے موضوعات پر انہوں نے فارسی میں مختلف چھوٹے بڑے رسائل لکھے جو بہت مقبول بھی ہوئے اور ان کے بھی بہت اچھے اثرات مرتب ہوئے۔

اس کے ساتھ ساتھ ان کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے برصغیر میں حدیث کی تعلیم کی ایک باقاعدہ روایت پیدا کی، اس روایت کو مضبوط علمی بنیادوں پر قائم کیا اور اس طرح قائم کیا کہ ان کے انتقال کے کئی سو سال بعد تک بھی وہ جاری رہی۔ انہوں نے حدیث کی مشہور کتاب "مشکوۃ المصابیح" کی شرحیں تحریر کیں جو فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں تیار ہوئیں۔ مشکوۃ المصابیح آٹھویں صدی میں لکھی گئی تھی اور یہ حدیث کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس کی اپنی ایک حیثیت ہے۔ ایک طویل عرصہ مشکوۃ درسی کتاب کی حیثیت سے رائج رہی ہے اور آج بھی بہت سے اداروں کے نصاب میں شامل ہے۔ اس کتاب کو برصغیر میں متعارف کرانے والے اور بطور نصابی کتاب کے اختیار کرنے والے شیخ عبدالحق محدث دہلوی ہیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اس

کتاب و اپنے ادارے میں متعارف کرایا۔ ان کی وجہ سے یہ کتاب برِ صغیر ہندوستان میں متعارف ہوئی اور اس کو پڑھا کر بہت سے لوگ سنتِ رسول سے پہلی مرتبہ واقف ہوئے۔ انھوں نے اس کتاب کی دو شرحیں لکھیں۔ ایک فارسی میں اشعۃ اللمعات فی شرح المشکوۃ، فارسی زبان میں مختصر ہے اور عام تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے ہے۔ اس میں انھوں نے احادیث کا فارسی ترجمہ کیا ہے، مختصر تشریح بھی کی، مشکل الفاظ کے معنی بھی بیان کئے اور جہاں جہاں ضرورت ہوئی فقہی مباحث بھی بیان کئے جو برصغیر کے حالات کو پیش نظر رکھ کر مرتب کئے گئے تھے۔

دوسری کتاب شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے عربی زبان میں لمعات التنقیح کے نام سے لکھی جو کئی بار چھپی، یہ کئی جلدوں میں ہے۔ یہ علمائے حدیث اور متخصصین کے لئے ہے۔ اس میں لغوی، فقہی اور کلامی مباحث خاصی تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ علمائے کرام جو دینی علوم کے متخصص ہیں وہ علم حدیث کے متخصص بھی ہو جائیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا یہ کام اپنی جگہ ایک تاریخ ساز کام تھا۔ جس کے تاریخ ساز اور انتہائی دیرپا اثرات ہوئے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے انتقال کے بعد وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ روایت کمزور پڑ گئی۔ ان کا انتقال گیارہویں صدی ہجری کے وسط میں 1052ھ میں ہوا۔ ان کو طویل عمر ملی، تقریباً پچانوے یا چھیانوے سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا اور کم و بیش پچاس سال وہ مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ سے واپسی پر درس حدیث دیتے رہے۔ حجاز جانے سے پہلے بھی وہ درس حدیث دیتے رہے تھے، لیکن اب پچاس سال مسلسل درس دینے کی وجہ سے پورے ہندوستان پر ان کے گہرے اثرات مرتب ہوئے، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ روایت کمزور پڑ گئی۔

ہندوستان میں درسِ نظامی کے اثرات کی وجہ سے معقولات کو غیر معمولی فوقیت دی گئی تھی۔ اور منطق و فلسفہ کی گہری اور طویل تعلیم کے ساتھ ساتھ فقہ اور اصول فقہ کی کتابیں بھی فلسفے کے رنگ میں پڑھائی جاتی تھیں۔ اصول فقہ کی جو کتابیں برصغیر میں لکھی گئیں وہ ساری کی ساری منطق و فلسفہ کے انداز میں لکھی گئی ہیں۔ اگر آپ اصول فقہ کے طالب علم ہوں اور یہاں کی لکھی ہوئی کوئی بڑی کتاب اٹھا کر دیکھیں تو اس اسلوب کا اندازہ ہو جائے گا۔ برصغیر میں ایک بزرگ تھے، ملا محب اللہ بہاری، برصغیر کے ایک مشہور اصولی تھے۔ ان کی ایک کتاب ہے مسلم الثبوت۔ اسے اگر آپ دیکھیں تو بڑی مشکل کتاب ہے۔ اصول فقہ کی تاریخ میں اس سے مشکل کتاب شاید اور

تھے تو شاہ صاحب نے یہ شعر پڑھا۔

نسیت کل طریق کنت اعرفہ

الا طریقا یؤدینی الی ربعکم

میں ہر راستہ بھول چکا ہوں سوائے اس راستے کے جو آپ کے گھر تک آتا ہے۔

لیکن شیخ ابوطاہر کردی نے کہا کہ جلدی میں کوئی فیصلہ نہ کرو۔ بلکہ ابھی غور کر لو۔ انہوں نے خود بھی چند روز غور کرنے کے بعد شاہ ولی اللہ سے کہا کہ تم یہاں نہ رہو اور واپس ہندوستان چلے جاؤ۔ شیخ ابوطاہر نے با اصرار شاہ صاحب کو واپس بھیج دیا۔ اس وقت شاہ صاحب بڑے بوجھل دل کے ساتھ واپس تشریف لے آئے۔ لیکن واپس تشریف لانے کے بعد شاہ صاحب نے جو کارنامے انجام دیئے اور جن کا سلسلہ آج تک چلا آرہا ہے ان کو دیکھنے سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ ابوطاہر کردی نے کسی خاص نیت سے ان کو بھیجا تھا اور شاہ صاحب کو بھی اس کا اندازہ ہو گیا تھا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے برصغیر میں علم حدیث اور علوم حدیث کی اشاعت کی روایت کو پروان چڑھایا جو اتنی مضبوط تھی اور اخلاص کی ایسی مضبوط بنیادوں پر استوار تھی کہ آج بھی ان کی رکھی ہوئی بنیادیں موجود ہیں۔ ان کے لگائے ہوئے چمنستان حدیث کے گلہائے معطر ڈھائی سو سال سے برصغیر کو معطر کئے ہوئے ہیں۔ ان کے جاری کئے ہوئے کام کے اثرات آج بھی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہیں جن سے آج تمام لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔

شاہ صاحب نے علم حدیث کی تدریس کا ایک حلقہ قائم کیا اور اعلیٰ ترین سطح پر علم حدیث کی تعلیم دی۔ اپنی خاص نگرانی میں ماہرین حدیث کی ایک جماعت تیار کی۔ ان کو ہندوستان کے مختلف گوشوں میں متعین کیا اور جگہ جگہ حدیث کی تعلیم کے ادارے قائم کئے۔ خود انہوں نے علوم حدیث پر متعدد کتابیں تصنیف کیں جو فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے علوم حدیث میں ایک نئے فن کی بنیاد ڈالی۔ نئے کا لفظ شاید درست نہ ہو اس لئے کہ ان سے پہلے بھی کئی حضرات نے اس موضوع پر قلم اٹھایا تھا، لیکن جس انداز سے شاہ صاحب نے قلم اٹھایا تھا، اس کی مثال نہیں ملتی۔

شاہ صاحب نے علم حدیث کی تاریخ کا ایک قابل ذکر کام یہ کیا کہ حدیث نبوی کے پورے ذخیرے کو جمع کر کے اور اس کا مطالعہ کر کے اس میں جو امور دین اور شریعت کے بنیادی اصول

بیان ہوئے ہیں، ان کو اس طرح اجاگر کیا کہ پورے علوم حدیث اور علوم نبوت کی روح پڑھنے والے کے سامنے آجاتی ہے۔ یہ کارنامہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی جس کتاب میں ہے اس کا نام "حجۃ اللہ البالغہ" ہے جس کا اردو اور انگریزی ترجمہ دونوں دستیاب ہیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے فرانسیسی زبان میں بھی ترجمہ کیا تھا لیکن وہ شائع نہیں ہوا ہے۔ عربی میں اصل کتاب دنیائے عرب اور عجم میں درجنوں مرتبہ چھپی ہے اور دنیا کے ہر گوشے کے اہل علم نے مراکش سے لے کر انڈونیشیا اور جنوبی افریقہ سے لے کر انتہائی شمال تک جہاں جہاں مسلمان بستے ہیں، اس سے استفادہ کیا۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے موطا امام مالک کو علم حدیث کی بنیادی کتاب کے طور پر اختیار کیا۔ وہ موطا امام مالک کے بڑے مداح تھے۔ وہ اس کو صحیحین سے افضل اور راجح سمجھتے تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو موطا امام مالک کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال یہ تھا کہ جتنے مکاتب فقہ ہیں وہ سارے کے سارے بالواسطہ اور بلاواسطہ موطا امام مالک سے متاثر ہیں اور موطا امام مالک میں ان تمام مکاتب فکر کی جڑ موجود ہے جن کی بنیاد پر فقہی مکاتب اور حدیثی اسکول مرتب ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ تمام بڑے بڑے محدثین بالواسطہ اور بلاواسطہ امام مالک کے شاگرد ہیں۔ اس لئے ان کے حدیثی کام پر امام مالک کے اثرات نمایاں ہیں۔

امام شافعی براہ راست ان کے شاگرد ہیں، امام محمد بن حسن شیبانی جو فقہ حنفی کے مدون اول ہیں، وہ ان کے براہ راست شاگرد ہیں اور امام احمد بن حنبل ایک واسطہ سے ان کے شاگرد ہیں۔ اس لئے چاروں مکاتب فکر امام مالک سے بالواسطہ یا بلاواسطہ متعلق اور متاثر ہیں۔ لہٰذا موطا امام مالک کو دین و شریعت کی ساری تعلیم کی بنیاد ہونا چاہئے تاکہ سب مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جاسکے۔ اہل فقہ، اہل حدیث اور تمام اہل علم سب امام مالک کی ذات کے گرد ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو سکتے ہیں۔ یہ شاہ صاحب کا نقطہ نظر تھا جو انہوں نے بڑی تفصیل سے لکھا بھی ہے۔ اس لئے شاہ صاحب نے موطا امام مالک کا درس دینا شروع کیا۔ برصغیر میں پہلی مرتبہ موطا امام مالک کا درس انہوں نے ہی شروع کیا۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے موطا امام مالک کی دو شرحیں لکھیں۔ جیسے شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے مشکوٰۃ کی دو شرحیں لکھی تھیں اسی طرح شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے موطا امام مالک کی دو شرحیں لکھیں۔ ایک فارسی میں اور ایک عربی میں لکھی۔ عربی میں "المسوی" ہے جو

مفصل ہے اور فارسی میں 'المصفی' لکھی جو مختصر ہے۔ المسوی علم حدیث کے ماہرین اور طلبہ کے لئے ہے اور المصفی عام تعلیم یافتہ مسلمانوں کے لئے ہے۔

ان دو شرحوں کے ساتھ ساتھ شاہ صاحب نے علم حدیث پر اور بھی کتابیں لکھیں۔ ان میں سے ایک بڑی کتاب جو بخاری کی ان بحثوں کے بارے میں ہے جو دلچسپی کا باعث رہی ہیں جن میں امام بخاری کے ابواب کے عنوانات کے بارے میں سوال کیا تھا۔ یہ تراجم ابواب بخاری کی شرح ہے جس کا نام ہے 'شرح تراجم ابواب البخاری'۔ امام بخاری نے مختلف ابواب کے جو عنوانات قائم کئے ہیں ان میں کیا مفہوم اور حکمت پنہاں ہے۔ اس پر بہت سے لوگوں نے کتابیں لکھیں جن میں ایک شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی بھی ہے۔

شاہ عبدالعزیزؒ

شاہ صاحب کے یوں تو بہت سے شاگرد اور طلبہ تھے لیکن ان کے شاگردوں اور طلبہ میں جو سب سے نمایاں نام ہے وہ ان کے اپنے صاحبزادے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا ہے۔ شاہ ولی اللہ کی عمر تو شاید اکسٹھ یا باسٹھ سال ہوئی۔ لیکن شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی عمر زیادہ ہوئی۔ تقریباً اسی بیاسی سال ان کی عمر ہوئی اور انہوں نے کم وبیش ساٹھ سال تک ہندوستان میں درس حدیث دیا۔ جب ان کے والد کا انتقال ہوا تو شاہ عبدالعزیز کی عمر اٹھارہ یا انیس سال تھی اور وہ اسی وقت فارغ التحصیل ہو کر نئے نئے مدرس ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے والد کی جگہ سنبھالی اور علم حدیث اور درس قرآن کا سلسلہ شروع کیا۔ آج کل دہلی میں عوامی سطح پر درس قرآن کے جو حلقے جاری ہیں ان کے بانی شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ہیں۔ ان سے پہلے اس طرح عوامی سطح پر درس قرآن نہیں ہوا کرتا تھا۔ محدود درس قرآن کا آغاز شاہ عبدالعزیز کے دادا شاہ عبدالرحیم صاحب نے کیا تھا، پھر شاہ ولی اللہ نے اس کو جاری رکھا لیکن وہ محدود اہل علم کے لئے تھا۔ عوامی سطح پر جس میں ہزاروں لوگ شریک ہوتے تھے، وہ شاہ عبدالعزیز کا درس قرآن ہوتا تھا جو ہفتہ میں دو مرتبہ ہوتا تھا۔ اس میں مغل حکمرانوں کے اہل خانہ، شہزادے اور اعلیٰ حکام بھی شریک ہوتے تھے۔ ایک آدھ مرتبہ شاہ عبدالعزیز نے مغل بادشاہ کے ہاں جاکر بھی درس دیا اور مغل بادشاہوں نے بھی ان کے درس میں شرکت کی۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے ستر سال تک درس حدیث دیا اور 1824ء میں وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ چونکہ انہوں نے طویل عمر پائی تھی اس لئے جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے بیٹے بھی اور رشتہ دار اور بھائی تھے وہ سب ان سے پہلے دنیا سے جا چکے تھے۔ اب ان کے جانشین ان کے نواسے حضرت شاہ محمد اسحاق تھے۔ انہوں نے بھی کم و بیش چالیس یا پچاس سال ہندوستان میں درس حدیث دیا اور ہزاروں تلامذہ ان سے درس حدیث پڑھ کر فارغ ہوئے۔ ان کے تلامذہ میں یہ کہنا کہ کون نمایاں ہیں اور کون نمایاں نہیں ہیں بڑا دشوار ہے۔ شاہ محمد اسحاق دہلوی کے ہزاروں شاگرد تھے جنہوں نے ہندوستان کے کونے کونے میں علم حدیث کو عام کیا۔

حضرت میاں نذیر حسین محدث دہلوی

ان کے شاگردوں میں تین حضرات بڑے نمایاں ہیں۔ سب سے نمایاں ہیں ان میں سے دو دو ہیں جن کے چشمے جو ہندوستان کے ہر علاقے میں پھیلے۔ ان کے ایک شاگرد تھے جو شیخ الکل یعنی ہر فن کے استاد اور سب کے استاد کہلاتے تھے۔ وہ تھے حضرت میاں نذیر حسین محدث دہلوی۔ شاہ محمد اسحاق 1857ء کے ہنگامے کے کچھ سال بعد ہجرت کر کے مکہ مکرمہ چلے گئے۔ باقی زندگی وہیں گزاری اور وہیں ان کا انتقال بھی ہو گیا۔ ان کے بعد ان کی جانشینی ہندوستان میں جن حضرات نے کی ان میں ایک تو میاں نذیر حسین محدث دہلوی تھے جن سے تلامذہ کا ایک طویل سلسلہ چلا۔ میاں صاحب کے تلامذہ میں جو لوگ نمایاں ہیں ان میں سے دو تین نام میں عرض کر دیتا ہوں۔ ایک علامہ وحید الزمان تھے جنہوں نے علم حدیث کی تقریباً تمام کتابوں کا اردو ترجمہ کیا اور اردو زبان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ صحیح بخاری، صحیح مسلم، ترمذی، سنن ابو داؤد، موطا امام مالک اور حدیث کی بہت سی کتابیں اردو ترجمے کے ساتھ سامنے آئیں۔ گویا اردو زبان میں حدیث کی کتابوں کے پہلے مترجم علامہ وحید الزمان ہیں جو حضرت میاں نذیر حسین محدث دہلوی کے شاگرد ہیں۔ شاید یہاں بیٹھے ان کتب کے تراجم کی اشاعت سے علم حدیث جتنا عام ہوا اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

میاں نذیر حسین کے دوسرے شاگرد تھے علامہ شمس الحق عظیم آبادی، یہ اتنے بڑے محدث ہیں کہ اگر یہ کہا جائے کہ ان کے زمانے میں ان سے بڑا محدث کوئی نہیں تھا، یا اگر تھے تو ایک دو ہی تھے، تو شاید یہ مبالغہ نہیں ہوگا۔ انہوں نے دو کارنامے انجام دیئے جو بہت غیر معمولی

تھے۔ ان کا ایک کارنامہ تو یہ تھا کہ انہوں نے 'غایۃ المقصود' کے نام سے سنن ابوداؤد کی شرح لکھی جو بتیس جلدوں میں تھی۔ بہت افسوس کی بات ہے کہ یہ شرح چھپ نہیں سکی۔ انہوں نے اس کی جلد اول شائع کی تو بعض لوگوں نے کہا کہ اتنی طویل شرح کون پڑھے گا۔ اس کو کیسے چھاپیں گے۔ چنانچہ یہ آپ کی زندگی میں چھپ سکنے کی بات نہیں۔ انگریزوں کا دور تھا۔ مسلمانوں کے پاس وسائل نہیں تھے، فقر و فاقہ تھا۔ نہ چندہ دینے والے تھے اور نہ کوئی مسلمان بڑی رقم بطور چندہ دینے کی پوزیشن میں تھا۔ اس لئے انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی اور ایک دو شاگردوں کو اس کی تلخیص کے کام پر لگا دیا۔ یہ تلخیص 'عون المعبود' کے نام سے شائع ہوئی اور آج چھپی ہوئی ہر جگہ ملتی ہے جو سنن ابوداؤد کی بہترین شرحوں میں سے ایک ہے۔ عون المعبود برصغیر، ایران، بیروت، مصر اور باقی عرب دنیا میں بھی چھپی ہے اور اس کے درجنوں ایڈیشن نکلے ہیں۔

علامہ عبد الرحمٰن مبارکپوریؒ

علامہ شمس الحق عظیم آبادی کے ایک شاگرد اور ان کے سلسلے کے ایک اور بزرگ علامہ عبد الرحمٰن مبارکپوری تھے۔ علامہ عبد الرحمٰن مبارکپوری صف اول کے محدث تھے۔ انہوں نے سنن ترمذی کی ایک شرح لکھی جس کا نام 'تحفۃ الاحوذی' ہے۔ اس کے بارے میں اگر میں یہ عرض کروں کہ یہ سنن ترمذی کی اتنی ہی بہترین شرح ہے جتنی بہترین شرح صحیح بخاری کی فتح الباری ہے، تو شاید یہ مبالغہ نہ ہوگا۔ جامع ترمذی کی اس سے بہتر کوئی اور شرح موجود نہیں ہے اور یہ برصغیر کے ایک صاحب علم کا اتنا بڑا کارنامہ ہے جو دنیائے اسلام میں سمجھا بھی جاتا ہے اور اس کا اعتراف بھی کیا جاتا ہے۔ اس کتاب کا بیروت، تہران، مصر، ہندوستان، پاکستان اور کئی دوسری جگہوں پر بار بار چھپنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کتاب کو دنیائے اسلام میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا ہے۔ برصغیر میں اس کا جو ایڈیشن شائع ہوا تھا وہ پانچ جلدوں تک ہے۔ عرب دنیا میں شائع ہونے والے ایڈیشنوں کی جلدیں مختلف ہیں۔ کوئی سولہ جلدوں میں ہے، کوئی چودہ میں اور کوئی بیس میں۔ لیکن یہ ترمذی کی بہترین شرح ہے اور اگر کوئی اس سے اتفاق نہ کرے کہ یہ جامع ترمذی کی سب سے بہتر شرح ہے، تو یہ تو بلا شک و شبہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب جامع ترمذی کی چند بہترین شرحوں میں یقیناً ہے اور اس سے کوئی اختلاف نہیں کر سکے گا۔

مولانا عبدالرحمن مبارکپوری کے تلامذہ بہت کثرت سے ہیں۔ میں نے بھی ایک بزرگ سے اجازت حدیث لی تھی جو براہ راست مولانا عبدالرحمن مبارکپوری کے شاگرد تھے اور گویا میں نے ایک واسطے سے مولانا مبارکپوری سے اجازت حاصل کی ہے۔ وہ بزرگ درمیان میں ہیں اور انہوں نے مولانا مبارکپوری سے علم حدیث کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ہمارے برصغیر کے مشہور عالم اور مفسر قرآن مولانا امین احسن اصلاحی بھی علم حدیث میں مولانا مبارکپوری کے شاگرد تھے۔

مبارکپور اعظم گڑھ کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ میں 1982 میں اس گاؤں کو دیکھنے کے لئے صرف اس وجہ سے گیا تھا کہ مولانا عبدالرحمن مبارکپوری کا گاؤں ہے اس لئے دیکھنا چاہیے۔ وہ مدرسہ اب بھی قائم ہے جہاں مولانا مبارکپوری حدیث پڑھایا کرتے تھے۔ وہ کچا سا مکان اب بھی موجود ہے جس میں وہ کام ہوا جو پوری دنیائے اسلام میں جامع ترمذی کی تدوین کے بعد نہیں ہوا تھا۔

شاہ محمد اسحاق کے دوسرے شاگردوں کا ایک دوسرا سلسلہ ہے جن میں ایک بڑے مشہور بزرگ تھے شاہ ابوسعید مجددی۔ جو حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں تھے اور شاہ محمد اسحاق کے شاگردوں میں تھے۔ ان سے ایک نیا سلسلہ شاہ اسحاق کے تلامذہ کا نکلا جن کے شاگرد تھے مولانا شاہ عبدالغنی۔ ان کے شاگرد تھے مولانا مملوک علی۔ مولانا موصوف بھی طویل عرصہ تک علم حدیث کے استاد رہے۔ ان کے تلامذہ میں ایک گروہ وہ ہے جو علماء دیوبند کہلاتا ہے اور دوسرا وہ ہے جو سرسید احمد خان اور ان کے ہم راہی ہیں۔ سرسید احمد خان بھی مولانا مملوک علی کے شاگرد تھے اور علماء دیوبند میں مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی شامل ہیں۔

مولانا رشید احمد گنگوہی اور ان کے تلامذہ

مولانا رشید احمد گنگوہی زندگی بھر حدیث پڑھاتے رہے۔ ان کے اما لی یعنی حدیث میں ان کی تقریروں اور درسوں کو بہت سے لوگوں نے جمع کر کے مرتب کیا اور شائع کرایا۔ صحیح بخاری کی شرح لامع الدراری کے نام سے ایڈٹ ہوئی۔ اور بھی متعدد کتابوں کی شرحیں ایڈٹ ہوئیں اور ان کے نام سے یہ چیزیں شائع ہوئیں جو آج موجود ہیں۔ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے شاگردوں میں دو شخصیات بہت نمایاں ہیں۔ ایک کا اسم گرامی تھا مولانا محمد یحیٰی اور دوسرے کا نام گرامی تھا

مولانا خلیل احمد سہارنپوری نے سنن ابوداؤد کی شرح بذل المجہود کے نام سے لکھی۔ یہ بڑی اچھی شرح ہے جو چودہ یا پندرہ جلدوں میں ہے۔ عرب دنیا میں کئی بار چھپی ہے۔ مصر، ہندوستان، پاکستان اور کئی دوسری جگہوں پر چھپ چکی ہے۔ یہ سنن ابوداؤد کی بہترین شرحوں میں سے ایک ہے۔ فقہ اور تفقہ کا درجہ تو بلا شبہ بہت اونچا ہے۔ عون المعبود اور بذل المجہود دو درجے ہیں۔ اور یہ بڑی شرحوں کا درجہ ہے۔ یہ بڑی جامع ترین ہے۔ فقہی اعتبار سے اس میں مسائل پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ حدیثی اور روایتی مسائل پر عون المعبود میں زیادہ زور دیا گیا ہے اور اس طرح یہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں۔

مولانا انور شاہ کشمیری

مولانا خلیل احمد سہارنپوری کے ایک شاگرد جنہوں نے ان سے اور دیوبند سے بھی کسب فیض کیا وہ علامہ محمد انور شاہ کشمیری ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ علماء دیوبند میں ان سے بڑا محدث پیدا نہیں ہوا۔ یقیناً علماء دیوبند میں حدیث کی جو روایت ہے اس کے سب سے بڑے ترجمان اور سب سے بڑے نمائندہ علامہ سید انور شاہ صاحب کشمیری ہیں جن کے تلامذہ کی ایک بہت بڑی تعداد پورے برصغیر میں پھیلی ہوئی ہے۔ برصغیر میں بیسویں صدی کے نصف اول بلکہ 1925 تک کی ابتدائی چوتھائی کو خیال کریں تو جتنے بھی علم حدیث سے شغف رکھنے والے حضرات ہیں وہ سب کے سب مولانا انور شاہ کشمیری کے شاگرد ہیں۔ ان سب حضرات نے علم حدیث کے ہر موضوع پر کام کیا ہے۔ علم حدیث کی ہر کتاب کی شرح لکھی ہے۔ یہ اتنا بڑا کام ہے جس کی مثال چودھویں صدی میں دنیائے اسلام کے کسی اور حصے میں نہیں ملتی۔ تفصیلات بیان کرنے کا موقع نہیں۔ مولانا انور شاہ کشمیری کے درس حدیث کی امالی فیض الباری کے نام سے چار جلدوں میں شائع ہوئی ہیں جو ان کے شاگرد مولانا بدر عالم صاحب نے مرتب کی تھیں۔

مولانا انور شاہ کشمیری نے جو دروس جامع ترمذی پر دیے وہ ان کے شاگرد مولانا محمد یوسف بنوری نے جو بعد میں خود بھی استاد حدیث تھے مرتب کیے جو معارف السنن کے نام سے شائع ہوئے۔ ترمذی پر ان کے ایک اور شاگرد مولانا محمد چراغ نے جن کا تعلق گوجرانوالہ سے تھا، العرف الشذی کے نام سے کام کیا جو شاہ صاحب ہی کے امالی پر مبنی ہے اور مطبوعہ موجود ہے۔ مولانا

انور شاہ کشمیری کے ایک اور شاگرد مولانا محمد اشفاق الرحمٰن تھے جو مولانا مودودی کے بھی استاد تھے، ان کی دو کتابیں ہیں۔ ایک ترمذی کی شرح ہے جو غیر مطبوعہ ہے۔ اور دوسرے موطا امام مالک کی شرح ہے جو پاکستان میں کئی بار چھپی ہے اور موطا امام مالک کی مختصر اور جامع شرحوں میں سے ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔ مولانا انور شاہ کشمیری کے کئی شاگردوں نے علم حدیث کے مختلف موضوعات پر کام کیا۔ ذخیرہ حدیث کا ایک پورا ترجمہ جو انھوں نے ہندوستان میں چھوڑا۔ خود مولانا کے داماد اور شاگرد مولانا احمد رضا بجنوری نے صحیح بخاری پر اپنے شیخ کے امالی کو اردو میں اٹھارہ جلدوں میں مرتب کیا۔ ان کی یہ کتاب 'انوار الباری' کے نام سے پاکستان اور ہندوستان میں کئی بار چھپ چکی ہے۔ علامہ انور شاہ کشمیری کا کام اتنا وسیع ہے کہ اگر اس کی تفصیل بیان کی جائے تو اتنا وقت درکار ہے کہ شاید پورا ایک دن بھی اس کے لئے کافی نہ ہوگا۔ مولانا حبیب الرحمٰن مبارکپوری اور مولانا شمس الحق عظیم آبادی کے عظیم الشان کام کو میں نے نہایت اختصار کے ساتھ بیان کیا۔ اگر اس کی تفصیل بیان کی جائے تو بہت وقت درکار ہوگا۔

فرنگی محلی علماء

ایک اور بڑا مرکز تھا بلکہ ایک اور روایت تھی جس کا میں دو تین جملوں میں ذکر کرتا ہوں۔ اس روایت سے ابتدائی طور پر بھی علم حدیث میں بڑی غیر معمولی خدمات ہوئیں۔ یہ روایت علماء فرنگی محل کی ہے۔ لکھنؤ میں ایک بہت بڑا مکان تھا۔ ایک حویلی تھی جو جہانگیر نے انگریز تاجروں کو دی تھی۔ انگریز تاجر جہانگیر کے زمانے میں آئے تھے انہوں نے تجارتی مرکز قائم کرنے کی اجازت مانگی۔ جہانگیر نے ان کو دو تجارتی کوٹھیاں دے دیں۔ ہندوستان میں جہاں جہاں انگریزوں نے اپنے مرکز قائم کئے ان میں سے ایک لکھنؤ بھی تھا۔ وہ حویلی فرنگی محل کہلاتی تھی کیونکہ فرنگی وہاں رہا کرتے تھے۔ جب ان کی سازشیں اور حرکتیں برداشت کی حدوں سے باہر ہوگئیں تو اورنگزیب عالمگیر نے ان کے خلاف ایکشن لیا۔ ان کو وہاں سے نکال دیا۔ وہ فرنگی محل کی عمارت ان سے خالی کروائی اور ملا نظام الدین سہالوی ایک عالم تھے ان کو دے دی کہ اس میں کوئی دینی ادارہ قائم کردیں۔ اس طرح فرنگی محل میں ایک دینی ادارہ قائم ہوگیا اور جتنے بھی علماء وہاں کے فارغ التحصیل ہیں وہ فرنگی محلی کے نام سے مشہور ہیں۔ ان میں کئی علماء پیدا ہوئے جن

اگر پڑھنا چاہیں تو بہت آسان ہے۔ ابھی حال ہی میں ادارہ تحقیقات اسلامی (آئی آر آئی) اسلام آباد نے اس کا انگریزی ترجمہ شائع کیا ہے۔ اس کے ایک حصہ کا انگریزی ترجمہ میرے چھوٹے بھائی ڈاکٹر غزالی صاحب نے کیا تھا، وہ بھی مطبوعہ موجود ہے لیکن ایک مکمل ترجمہ دو جلدوں میں ایک امریکی نومسلم خاتون، جن کا اصل نام مارسیہ ہرملسن ہے، انہوں نے دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ وہ انگریزی ترجمہ بہت اچھا ہے اور یہاں ملتا ہے۔ اردو پڑھنا چاہیں تو مولانا عبد الحق حقانی کا ترجمہ پڑھ لیں۔

آج کے دور کے برصغیر کے محدثین کے بارے میں یوں عرض ہے۔

وہ اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا تذکرہ کرنا بڑا دشوار ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی کاوشوں میں برکت دے۔ لیکن اس درجہ کا کوئی آدمی نہیں ہے جس درجہ کے علامہ انور شاہ کشمیری، علامہ شمس الحق عظیم آبادی، یا مولانا عبد الرحمن مبارکپوری تھے۔ ابھی ایک بزرگ ہندوستان میں ہیں اور غالبا حیات ہیں اور بہت معمر ہوں گے۔ ان کی ایک شرح بخاری 'انوار الباری' کے نام سے چھپی ہے۔ کراچی میں بھی چھپی ہے۔ بہت اچھی کتاب ہے۔ یہ مولانا انور شاہ کشمیری کے داماد یا شاگرد تھے۔ انہوں نے ان کی تقریروں کے نوٹس مرتب کئے ہیں۔ جو مجھے بہت اچھے معلوم ہوئے۔ اگرچہ اس میں مسلکی چیزیں بہت ہیں جو نہیں ہونی چاہئے تھیں لیکن اس کے باوجود کتاب بہت اچھی ہے۔ ایک ہمارے دوست مولانا تقی عثمانی ہیں۔ انہوں نے مولانا شبیر احمد عثمانی کی شرح صحیح مسلم کی تکمیل کی ہے۔ فتح الملہم مولانا شبیر احمد عثمانی کے قلم سے صحیح مسلم کی شرح ہے۔ یہ نامکمل تھی اور کتاب الرضاع تک ہی لکھی جاسکی۔ اس کی بقیہ جلدیں مولانا محمد تقی عثمانی نے لکھی ہیں۔ اسی طرح اور حضرات کی کتابیں بھی ہیں جن کی تفصیل بیان کرنے کا موقع نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆☆

بارھواں خطبہ

علوم حدیث - دور جدید میں

ہفتہ 18 اکتوبر 2003

اپنے اپنے نمونے دنیا کے سامنے رکھے ہیں جن کو علم حدیث کی تاریخ میں ایک نئے دور کا نقطۂ آغاز کہا جا سکتا ہے۔ عرب دنیا میں بہت کی جامعات کے شعبہ ہائے علوم اسلامیات نے اور بہت کی جامعات اسلامیہ نے علم حدیث کے موضوع پر ایسے نئے نئے مقالات تیار کرائے ہیں جنہوں نے علم حدیث کے ان تمام گوشوں کو از سر نو زندہ کر دیا ہے جن کو ایک طویل عرصہ سے لوگوں نے نظر انداز کر دیا تھا۔

ایک عام تاثر یہ تھا کہ رجال اور جرح وتعدیل پر جتنا کام ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔ احادیث مرتب ہو چکیں، مدون ہو چکیں اور کتابی شکل میں ہم تک پہنچ چکیں۔ اب از سر نو رجال پر غور کرنے یا جرح وتعدیل کے مباحث کو دوبارہ چھیڑنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور نہ اب اس کی ضرورت ہے۔ جزوی طور پر یہ بات درست ہے اور ایک حد تک میں بھی اس سے اتفاق کرتا ہوں کہ احادیث مرتب ہو چکیں، کتابوں کی شکل میں مدون ہو چکیں، احادیث کا درجہ متعین کیا جا چکا ہے اور تم ویش سو فیصد احادیث کے بارے میں یہ تحقیق ہو چکی ہے کہ ان میں سے کس حدیث کا روایت کے اعتبار سے فن رجال اور سند کے اعتبار سے کیا درجہ ہے۔ اس لئے اس موضوع پر کسی نئی تحقیق یا کسی نئے نتیجہ کا سامنے آنا بہت بعید از امکان ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خود علم رجال اپنی اہمیت کھو چکا ہے۔ علم جرح وتعدیل کی اب کوئی اہمیت نہیں رہی اور یہ ماضی کا ایک بھولا بسرا علم ہے جس کو ایک تاریخی علم کے طور پر تو پڑھا جا سکتا ہے، ایک زندہ علم اور ایک مسلسل حرکت پذیر علم کے طور پر اب اس کی اہمیت نہیں رہی۔ میں اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ علم رجال، علم روایت، علم سند اور علوم حدیث آج بھی ویسے ہی زندہ علوم ہیں جیسے آج سے ایک ہزار سال پہلے یا بارہ سو سال پہلے تھے۔ ان علوم میں تحقیق کے اپنے اپنے گوشے اب بھی موجود ہیں جو اہل علم کی اور طلبہ حدیث کی توجہ کے مستحق ہیں۔ علامہ اقبال کا ایک فارسی شعر ہے جو شاید انہوں نے ایسے ہی کسی موقع کے لئے کہا ہوگا۔

ہنوز ہیں می نگر ہست نگاراں را یکتا
مگر ہے بے پایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

یہ مت سمجھو کہ انگور کے خوشے سے شراب نچوڑنے والے کا کام ختم ہو چکا ہے۔ ابھی تو انگور کے خوشوں میں ہزاروں شرابیں ہیں جو نچوڑی جانی ہیں اور ان کو نکال کر ابھی لوگوں کے

کیا گیا اور صحیح ترین نسخے کے تعین کا اہتمام کیا گیا۔ یہ اہتمام کس حد تک پہلے بھی ہوتا رہا تھا لیکن اب زیادہ سائنسی اور علمی انداز میں ہونے لگا ہے۔

اسی طرح سے اگر کتاب میں کسی سابقہ کتاب کا حوالہ ہے تو اس کتاب سے تلاش کرکے اس حوالہ کی نشاندہی کی جاتی ہے تاکہ آسانی ہو جائے اور اصل کتاب سے موازنہ کرکے رجوع کیا جا سکے۔ یہ طریقہ مغرب میں رائج ہوا اور دنیائے اسلام نے اس کو اپنایا۔ بلاشبہ یہ ایک اچھا طریقہ ہے۔ اس کے مطابق حدیث کی بہت سی کتابیں شائع ہوئی ہیں جن سے استفادہ کرنا بہت آسان ہو گیا ہے۔

تاریخ حدیث پر ہونے والا کام

بیسویں صدی میں تاریخ حدیث پر بھی ایک بڑا اہم کام ہوا جس کا تذکرہ میں اختصار کے ساتھ پہلے کر چکا ہوں۔ یہ کام جن صاحب علم بزرگ نے شروع کیا وہ مولانا سید مناظر احسن گیلانی تھے جو حیدرآباد دکن میں جامعہ عثمانیہ میں اسلامیات کے استاد اور بڑے عالم اور مشہور مفکر تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے تاریخ تدوین حدیث کے نام سے ایک کتاب مرتب کی۔ تاریخ تدوین حدیث مرتب کرتے ہوئے انہوں نے مستشرقین کے ان اعتراضات کو سامنے رکھا جن میں یہ کہا گیا تھا کہ علم حدیث سارے کا سارا محض زبانی اور سنی سنائی باتوں پر مشتمل ہے۔ اس کے پیچھے کوئی مضبوط تحریری یا علمی روایت نہیں ہے۔ اس لئے جو ذخیرہ حدیث کے نام سے آج پیش کئے جاتے ہیں وہ سارے کے سارے مشکوک ہیں۔ یہ بات مستشرقین بیسویں صدی کے شروع میں کہا کرتے تھے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے تدوین حدیث پر ایک بڑی ضخیم کتاب مرتب کی جو غالباً آٹھ نو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں انہوں نے اس اعتراض کو سامنے رکھ کر تدوین حدیث کی تاریخ کو اپنے انداز سے مرتب کیا کہ یہ اعتراض خود بخود ختم ہو جاتا ہے اور وہ سارے شواہد سامنے آ جاتے ہیں جن سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مستشرقین کا یہ اعتراض کتنا کمزور ہے، کتنا بے بنیاد ہے اور کتنا غیر علمی ہے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی کے اس کام کو ان کے شاگردوں نے آگے بڑھایا۔ ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم ان کے براہ راست شاگرد تھے۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے صحیفہ ہمام بن منبہ کو ایڈٹ کیا۔ یہ

علم حدیث پر نئے علوم کی روشنی میں کام

بیسویں صدی میں بعض نئے موضوعات پر لوگوں نے کام کیا تو علم حدیث کا ایک نئے انداز سے مطالعہ کیا۔ اس کی ایک مثال بہت دلچسپ ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ علم حدیث پر اس نئے انداز سے بھی کام شروع ہوا ہے۔ آپ نے مشہور فرانسیسی مصنف ڈاکٹر موریس بوکائی کا نام سنا ہوگا۔ وہ ایک زمانہ میں غالباً پورے فرانس کی میڈیکل ایسوسی ایشن کے صدر تھے۔ سائنسدان ہیں اور بہت بڑے سرجن ہیں۔ وہ شاہ فیصل مرحوم کے ذاتی معالج تھے اور شاہ فیصل مرحوم کا علاج کرنے کے لئے ان کو وقتاً فوقتاً ریاض بلایا جاتا تھا۔

ایک مرتبہ ان کو ریاض بلایا گیا تو سرکاری مہمان کے طور پر ہوٹل میں ٹھہرے اور کئی روز تک شاہ فیصل سے ملاقات کا انتظار کرتے رہے۔ ظاہر ہے کہ کسی بھی وقت بادشاہ کی طرف سے ملاقات کا بلاوا آ سکتا تھا اس لئے کہیں آ جا بھی نہیں سکتے تھے۔ ہر وقت اپنے کمرے میں رہتے تھے کہ اچانک کوئی فون کال آ جائے تو پہنچ جائیں گے۔ وہاں ہوٹل کے کمرے میں قرآن پاک کا ایک نسخہ انگریزی ترجمہ کے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ انہوں نے وقت گزاری کے لئے اس کی ورق گردانی شروع کر دی۔ عیسائی تھے اس سے ظاہر ہے کہ قرآن پاک پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس انگریزی ترجمہ کی ورق گردانی کے دوران خیال ہوا کہ قرآن پاک میں بعض ایسے بیانات پائے جاتے ہیں جو سائنسی نوعیت کے ہیں۔ مثلاً بارش کیسے ہوتی ہے، انسان کی ولادت کن مراحل سے گزر کر ہوتی ہے۔ اسی طرح اور بھی کئی چیزوں کی تفصیلات کا تذکرہ تھا۔

چونکہ وہ خود میڈیکل سائنس کے ماہر تھے اور سائنس ہی ان کا مضمون تھا اس لئے انہوں نے ان بیانات کو زیادہ دلچسپی کے ساتھ پڑھنا شروع کیا۔ ایک بار پڑھنے کے بعد قرآن پاک کو انہوں نے دوبارہ پڑھا اور ان مقامات پر نشان لگاتے گئے جہاں سائنس سے متعلق کوئی بیان تھا۔ چند دن وہاں رہے تو پورے قرآن پاک کا ترجمہ کئی بار پڑھ ڈالا اور اس طرح کے بیانات نوٹ کرتے گئے۔ اس سے ان کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اس طرح کے بیانات بائبل میں بھی ہوں اور ان کے ساتھ قرآن پاک کے بیانات کا تقابل کیا جائے تو دلچسپ چیز سامنے آ سکتی ہے۔ انہوں نے واپس جانے کے بعد یہی مشغلہ جاری رکھا۔ وہ بائبل میں جو اس طرح کے

ہے تو وہ آلہ سے خارج ہو جاتا ہے اور وہ انسانی جسم کے لئے زہر نہیں بنتی۔ لہٰذا اس سے
علاج کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر عبداللہ صاحب نے اس کے جواب میں ڈاکٹر موریس بوکائی سے کہا کہ میں تو سائنسدان
ہوں نہ میڈیکل ڈاکٹر ہوں اس لئے میں آپ کے ان دلائل کے بارے میں سائنسی اعتبار سے
تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن ایک عام آدمی کے طور پر میرے کچھ شبہات ہیں جن کا آپ جواب دیجئے
پھر اس تحقیق کو اپنے اعتراضات کے ساتھ ضرور شائع کریں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میں نے
میٹرک میں سائنس کی ایک دو کتابیں پڑھی تھیں۔ اس وقت مجھے کسی نے بتایا تھا کہ سائنسدان
جب تجربات کرتے ہیں تو اگر ایک تجربہ دو مرتبہ صحیح ثابت ہو جائے تو سائنسدان اس کو پچاس فیصد
درست قرار دیتے ہیں اور جب تین چار مرتبہ صحیح ثابت ہو جائے تو اس کا درجہ اور بڑھ جاتا ہے اور چار
پانچ مرتبہ کے تجربات میں اگر کوئی چیز صحیح ثابت ہو جائے تو آپ کہتے ہیں کہ فلاں بات
سو فیصد صحیح ثابت ہوگئی۔ حالانکہ آپ نے سو مرتبہ تجربہ نہیں کیا ہوتا۔ ایک تجربہ تین چار مرتبہ کرنے
کے بعد آپ اس کو درست مان لیتے ہیں۔ ڈاکٹر موریس نے کہا کہ ہاں واقعی ایسا ہی ہے۔ اگر
چار پانچ تجربات کا ایک ہی نتیجہ نکل آئے تو ہم کہتے ہیں کہ سو فیصد یہی نتیجہ ہے۔ ڈاکٹر
عبداللہ نے کہا کہ جب آپ نے صحیح بخاری کے حوالہ سے یہ حدیث سنی۔ صحابہ سے تابعین تک درست
قرار دے دیتے ہیں تو پھر اس واقعہ کو بغیر تجربات کے درست کیوں نہیں مان لیتے؟ جب کہ
پانچ تجربات کر کے آپ سو فیصد مان لیتے ہیں۔ یہ بات تو خود آپ کے معیار کے مطابق غلط ہے۔
ڈاکٹر موریس بوکائی نے اس کو تسلیم کیا کہ واقعی ان کا یہ شبہ اور یہ اعتراض غلط ہے۔

دوسری بات ڈاکٹر عبداللہ نے یہ کہی کہ میرے علم کے مطابق آپ میڈیکل سائنس
کے ماہر ہیں۔ انسانوں کا علاج کرتے ہیں۔ آپ جانوروں کے ماہر تو نہیں ہیں تو آپ کو پتہ نہیں
کہ دنیا میں کتنے قسم کے جانور پائے جاتے ہیں۔ پھر ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میں نہیں جانتا کہ علم
حیوانات میں کیا نیا شعبہ اور کون کون سی ذیلی شاخیں ہیں اور ان میں کیا کیا چیزیں دریافت ہوئی ہیں
لیکن اگر علم حیوانات میں مکھیات کا کوئی شعبہ ہے تو آپ اس شعبے کے ماہر نہیں ہیں۔ کیا آپ کو
پتہ ہے کہ دنیا میں کتنی اقسام کی مکھیاں ہوتی ہیں؟ کیا آپ نے کوئی سروے کیا ہے کہ دنیا میں کس
موسم میں کس قسم کی مکھیاں پائی جاتی ہیں۔ جب تک آپ عرب میں ہر موسم میں پائی جانے والی

کھمبیوں کو تجزیہ کرنے کے دوران انہوں نے ایک ایک جز کا معائنہ کر کے لیبارٹری میں چالیس پچاس سال تک کر کے بتایا کہ ان میں کسی کھمبی کے جز میں کسی بھی قسم کی شفا نہیں ہے۔ کہ وقت تک آپ یہ مفروضہ کیسے قائم کر سکتے ہیں کہ کھمبی کے پانی میں بیماری کی شفا نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر موریس بکائی نے اس سے بھی اتفاق کیا کہ واقعی مجھ سے غلطی ہوئی۔

پھر ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اگر آپ تحقیق کر کے پتا بھی کر دیں کہ کھمبی کے پانی میں شفا نہیں ہوتی تو یہ کیسے پتہ چلے گا کہ چودہ سو سال پہلے ایسی کھمبیاں نہیں ہوتی تھیں۔ ہو سکتا ہے ہوتی ہوں، ممکن ہے ان کی نسل ختم ہو گئی ہو۔ جانوروں کی نسلیں بھی آتی ہیں اور ختم بھی ہو جاتی ہیں۔ روز کا تجربہ ہے کہ جانوروں کی ایک نسل آئی اور بعد میں وہ ختم ہو گئی۔ تاریخ میں ذکر ملتا ہے اور خود سائنسدان بتاتے ہیں کہ فلاں جانور اس شکل کا اور فلاں اس شکل کا ہوتا تھا۔ ڈاکٹر موریس نے اس کو بھی درست تسلیم کیا۔

پھر ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے کہا کہ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ حضورؐ نے اونٹ کا پیشاب پینے کا حکم دیا، حالانکہ شریعت نے پیشاب کو ناپاک کہا ہے۔ بالکل ٹھیک ہے۔ یہ حدیث بیان کا مستند ذکر دہ مواد ہے۔ یہ بھی درست ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میں بطور ایک عام آدمی (layman) کے یہ سمجھتا ہوں کہ بعض بیماریوں کا علاج تیزاب سے بھی ہوتا ہے۔ ان دواؤں میں کیا ایسڈ شامل نہیں ہوتے۔ جانوروں کے پیشاب میں کیا ایسڈ شامل نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے کہ بعض علاج جو آج خالص اور آپ کے بقول پاک ایسڈ سے ہوتا ہے تو اگر عرب میں اس کا رواج ہو کہ کسی نیچرل طریقے سے لیا ہوا کوئی ایسا لیکوئیڈ جس میں تیزاب کی ایک خاص مقدار پائی جاتی ہو، وہ بطور علاج کے استعمال ہوتا ہو تو اس میں کوئی بات بعید از امکان اور غیر سائنسی ہے۔

پھر ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ آج سے کچھ سال پہلے میں نے ایک کتاب پڑھی تھی۔ ایک انگریز سیاح تھا جو پورے جزیرہ عرب کی سیاحت کر کے آیا تھا۔ اس کا نام تھا ڈاؤٹی۔ 1924، 25-26 میں اس نے پورے عرب کا دورہ کیا تھا اور دو کتابیں لکھی تھیں جو بہت زبردست کتابیں ہیں اور جزیرہ عرب کے جغرافیہ پر بڑی بہترین سمجھی جاتی ہیں۔ ایک کا نام Arabia Deserta اور دوسرے کا نام Arabia Petra ہے۔ یعنی جزیرہ عرب کا صحرائی حصہ اور جزیرہ عرب کا پہاڑی حصہ۔ انہوں نے کہا کہ اس شخص نے اتنی کثرت سے یہاں سفر کیا

احادیث میں سابقہ کتب کا ذکر

علم حدیث کا جو اور دوسروں نے نئے انداز سے مطالعہ شروع کیا ہے جس پر ابھی کام کا آغاز بھی صحیح معنوں میں نہیں ہوا۔ وہ یہ کہ بہت سی احادیث میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ سابقہ کتابوں کے حوالے ہیں کہ تورات میں یہ آیا ہے، انجیل میں یہ آیا ہے، فلاں کتاب میں یہ آیا ہے، سابقہ کتابوں میں یہ آیا ہے۔ آج ان کتابوں میں وہ حوالے نہیں ملتے۔ اس سے مطالعہ مذاہب کا اور مذاہب کی تاریخ پر کام کرنے کا ایک نیا راستہ کھلتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے وحی کی بنیاد پر سابقہ کتابوں کے مندرجات پر جو باتیں ارشاد فرمائیں، وہ کس حد تک آج کل کتابوں میں پائی جاتی ہیں اور نہیں پائی جاتیں تو اس کے اسباب کیا ہیں۔ اس سے پتہ چل جاتا ہے کہ ان کتابوں میں تحریف یا تبدیلی ہوئی تو کہاں کہاں ہوئی اور کن راستوں سے ہوئی۔ اس سے سابقہ کتابوں کے مطالعہ کی ایک نئی جہت ہمارے سامنے آتی ہے۔

اسی طرح سے مطالعہ مذاہب میں حدیث کے ذریعے وہ گوشے بھی سامنے آتے ہیں جن میں مذاہب کی وہ تعلیمات جو اللہ تعالیٰ اور انبیاء کی طرف سے تھیں، مذاہب کے ماننے والوں کی تحریفات اور ملاوٹوں سے پہلے جو تعلیمات تھیں، ان کا واضح پتہ احادیث سے چلتا ہے۔ مثلاً تورات میں یہ تھا، بائبل میں یہ تھا، فلاں پیغمبر کی تعلیم میں یہ تھا، فلاں پیغمبر کی تعلیم میں یہ تھا۔ اس سے دنیا کی دوسری اقوام کے سامنے بھی مطالعہ کی ایک نئی جہت روشن ہوتی ہے۔ جس سے وہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

مسلمانوں میں جو اجتماعی علوم پیدا ہوئے، سوشل سائنسز پیدا ہوئے، تاریخ کا فن پیدا ہوا، ریاست اور معاشرت کے مطالعہ کا فن پیدا ہوا، اس میں بہت بڑی مدد علم حدیث سے آج بھی ملتی ہے۔ علم حدیث ایک نئی تہذیب کا منادی ہے۔ علم حدیث نے ایک نئی تہذیب کو جنم دیا جس کی بنیاد تعلیم، فکر اور مطالعہ پر تھی جس کے نمونے آپ نے دیکھے۔ علم حدیث نے علم تاریخ کو ایک نئی جہت سے نوازا۔ اسلام سے پہلے دستاویزی کارروائی یا تاریخ نویسی کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اسلام نے پہلی مرتبہ علم حدیث کے ذریعے انسان کو یہ پیغام دیا کہ سابقہ اقوام کے بارے میں معلومات اور تاریخ کو جمع کرنے کے لئے کتنی احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ یہ وہ چیز ہے جس کی بنیاد پر

مسلمانوں نے ایک نیا فن تاریخ مرتب کیا۔ ابن خلدون اور امام سخاوی کا میں نے ذکر کیا تھا جو ہسٹوریوگرافی میں ایک نئی جہت اور ایک نئے اسلوب کو شروع کرنے والے ہیں۔ یہ وہ نئے میدان ہیں جو علم حدیث کے مطالعے کے راستے ہمارے سامنے کھولتے ہیں۔

بیسویں صدی میں علم حدیث کے نئے نئے مجموعے بھی مرتب ہوئے۔ نئے مجموعے ہر دور میں مرتب ہوتے رہے ہیں۔ جیسے جیسے انسانوں کے مسائل بڑھتے جائیں گے، نئے نئے مسائل پیش آتے جائیں گے، ان کو علم حدیث کے موضوعات کو نئے طریقوں سے مرتب کرنے کی ضرورت پیش آتی جائے گی۔

ان میں سے کون سے مجموعے قابل ذکر ہیں ان کا حوالہ دینا بھی بڑا دشوار ہے۔ اس لئے کہ وہ لاتعداد ہیں۔ ان کی فہرست بھی بیان کرنا مشکل ہے۔ بیسویں صدی میں مختلف زبانوں میں انگریزی، اردو، فارسی، فرانسیسی، عربی، ترکی اور جرمن زبانوں میں مرتب ہوئے اور انہوں نے ہزاروں لاکھوں انسانوں تک علم حدیث کے ذخائر اور معلومات کو پہنچایا۔

نئے انداز سے کام کرنے کی راہیں

آج جو نئے اور قابل ذکر مجموعے مرتب ہو رہے ہیں اور جن پر کام کرنے کی ضرورت ہے وہ نئے مسائل کے بارے میں ہیں۔ مثال کے طور پر آج معیشت نئے انداز سے مرتب ہو رہی ہے۔ حدیث نبوی کی بنیادی کتابوں میں اور احادیث نبوی کے ذخائر میں ہزاروں ایسے ارشادات اور ہدایات موجود ہیں جن کا انسان کی انفرادی اور اجتماعی معاشی زندگی سے، یعنی Micro Economics اور Macro Economics پہلو سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ بعض حضرات نے بعض ایسے مجموعے مرتب کئے ہیں۔ ڈاکٹر کرم خان صاحب ہمارے ایک دوست ہیں۔ انہوں نے علم حدیث کے ذخائر کو تلاش کر کے وہ احادیث دو جلدوں میں یکجا کی ہیں جو معاشیات سے متعلق ہیں۔ لیکن ابھی اس پر طویل کام کی ضرورت ہے۔ نئے نئے مجموعے جو اب شائع ہوئے ہیں ان کو مستقل کر اس مواد کو ایک ساتھ کرنے کی ضرورت ہے۔

آج سے کچھ سال پہلے ایک شخص نے یہ کام کیا تھا کہ علم حدیث کے تمام بنیادی مآخذ سے کام لے کر وہ تمام احادیث جمع کی تھیں جن کا تعلق ریاست اور حکومت سے ہے۔ تو اتنا

جواز خیرہ تیار ہوا کہ جس میں چالیس ہزار بلکہ شاید ہزاروں احادیث موجود ہیں جو بالواسطہ یا بلاواسطہ
سیاست اور بین الاقوامی امور سے متعلق ہیں۔ لہٰذا مختصر حدیث کی کتابیں آپ پڑھیں تو سو سو
احادیث میں مشکل سے ایک حدیث ایسی ہے جس کا تعلق حکومت اور ریاست سے ہو۔ لیکن ان
سارے مجموعوں کا جائزہ لیا جائے تو بڑی تعداد میں احادیث دستیاب ہو سکتی ہیں جن سے کئی جلدیں مرتب
ہو سکتی ہیں۔ بقیہ موضوعات کا آپ خود اندازہ کر لیں۔

تہذیب و تمدن کی اساس کس بنیاد پر قائم ہے۔ تہذیبوں کا عروج و زوال کیسے ہوتا ہے۔
سابق محدثین نے اپنی کتابیں مرتب کرتے وقت اپنے سامنے یہ موضوعات نہیں رکھے۔ انہوں
نے اپنے زمانے اور اپنی ضروریات کے لحاظ سے عنوانات تجویز کئے اور موضوعات رکھے۔ لیکن
سارے موضوعات کو اس طرح سے Re-arrange کریں تو نئے نئے عنوانات سامنے آئیں
گے۔ اس لئے امت کے اندر علم حدیث کے مجموعے مرتب کرنے کی ضرورت ہے جن میں آج
کے دور کے تہذیبی، تمدنی، سیاسی، معاشی، اجتماعی، انفرادی اور معاشرتی ضروریات کے مطابق ابواب
کی ترتیب اور مضامین کی تقسیم کی جائے اور یوں مجموعے مرتب کئے جائیں۔

ابتدائی صدیوں میں جب اسلام کے عقائد پر فقہائے اسلام اور متکلمین اسلام کام
کر رہے تھے تو اسلام کے عقائد پر جو اعتراضات یا شکوک یونانیوں کی طرف سے ہو رہے تھے یا جو
شبہات ایرانی اور ہندوستانی فلاسفہ کا طبقہ بیان کر رہا تھا، ان اعتراضات کا جواب علما
اور متکلمین نے احادیث کی روشنی میں دیا۔ آج اسلام اور اسلام کے عقائد پر وہ اعتراضات نہیں
ہو رہے ہیں۔ قدیم یونانی فلسفہ ختم ہو گیا۔ قدیم ایرانی اور ہندوستانی تصورات دنیا سے مٹ
گئے۔ آج نئے انداز سے حملے ہو رہے ہیں۔ آج اسلامی عقائد اور تعلیمات پر مغربی نظریہ علم کے
حوالہ سے، اسلام پر ادبی انداز کے اعتراضات ہو رہے ہیں۔ آج مغربی نفسیات نبوت پر
اعتراض کر رہی ہے۔ آج کی سائنس وحی کی حجیت کو بطور ماخذ علم نہیں مانتی۔ وحی کو بطور مصدر علم نہیں
مانتی۔ لہٰذا آج علم حدیث کے نئے انداز سے مرتب کرنے کی ضرورت ہے کہ اسلام کا فلسفہ
علم اور نظریہ معرفت مکمل طور پر ہمارے سامنے آ جائے۔ جو اعتراضات اسلام کے عقائد پر ہو رہے
ہیں ان کا جواب ان احادیث کی روشنی میں سامنے آ جائے۔

اسی طرح سے علم حدیث میں آپ نے دیکھا ہوگا۔ حدیث کی کوئی بھی کتاب آپ

اخذ کر دیکھ لیں اس میں سابقہ انبیا اور ان کے واقعات کا ذکر ہے۔ سابقہ اقوام کا ذکر ہے۔ انبیاء کے معاصرین ان کے ماننے والے اور انکار کرنے والے دونوں کے تذکرے ملتے ہیں۔ آج کل کے مستشرقین فن تاریخ کے نقطۂ نظر سے، آثار قدیمہ کے نقطۂ نظر سے اور آثار قدیمہ کے نقطۂ نظر سے ان پر اعتراضات کر رہے ہیں۔ ان اعتراضات کا جواب بھی حدیث کی کتابوں میں مل جاتا ہے۔ لیکن ان احادیث میں ان جوابات کو سامنے لانے کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے نئی ترتیب درکار ہے۔ نئے مجموعے مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ وہ چند مثالیں ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ نئے انداز سے احادیث کے نئے مجموعوں کی ضرورت پیش آتی رہے گی۔ آخذ یہی قدیم کتابیں اور یہی ذخائر ہیں گے جو شیخ الاسلام نے 458ھ تک مرتب کر کے ہمیں دے دیئے تھے۔ پانچویں صدی ہجری تک جو مجموعے مرتب ہو گئے وہ تو بنیادی ماخذ ہیں، وہ تو ایک طرح سے Power Houses ہیں جہاں سے آپ کو Connection لینا رہے گا۔ لیکن اس کنکشن سے آپ نئی نئی مشینیں چلائیں، نئے نئے کام کریں، نئے نئے انداز سے روشنی پیدا کریں، نئے نئے راستے روشن کریں۔ یہ کام ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ وہ پاور ہاؤس اپنی جگہ موجود رہیں گے۔

جس طرح سے متن حدیث کو نئے انداز سے مرتب کرنے کی ضرورت ہے اسی طرح علم حدیث کی نئی شرحیں لکھنے کی بھی ضرورت ہے۔ پرانی شرحیں پرانے سیاق وسباق میں ہیں۔ نئی شرحیں نئے سیاق وسباق میں لکھنا ہوں گی۔ ان میں جو پرانی شرحیں ہیں ان کو نئے انداز سے پیش کرنے کا کام بھی ہوگا اور نئے مسائل کی نئی شرحیں اور نئے اعتراضات کے نئے جواب بھی ہوں گے۔ پرانے اعتراضات کے پرانے جواب بھی ہوں گے اور پرانے اعتراضات کے نئے جواب بھی ہوں گے۔ یہ ایک نئی دنیا ہے جس پر ابھی کام کا شاید آغاز بھی نہیں ہوا ہے اور اگر آغاز ہوا ہے تو محض آغاز ہی ہے۔ ابھی تو محض پہلا قدم اٹھایا گیا ہے۔ کتنے دن اور کتنے سال یہ عمل چلے گا ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔

تدوین حدیث غیر مسلموں کے لئے

پھر ایک نئی چیز جو علم حدیث میں کرنے کی ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے تمام سابقہ آخذ جو

کو سمو دیا گیا ہے۔ اس میں تمام صحاح ستہ، مسند امام احمد اور حدیث کی دوسری بڑی کتابیں موجود ہیں اور کمپیوٹر کے ذریعے چند منٹ میں آپ کے سامنے آسکتی ہیں۔ چھوٹی سی سی ڈی ہے جیب میں رکھیں اور کہیں بھی کمپیوٹر کے ذریعے اس کو دیکھیں۔ یہ ایک مفید چیز ہے۔ لیکن ابھی حدیث کے متون بھی سارے کے سارے کمپیوٹرائز نہیں ہوئے۔ حدیث کی چند کتابیں ہی کمپیوٹرائز ہوئی ہیں۔ یہ سارے بنیادی ماخذ جو چودہویں صدی میں شائع ہوئے یا اس سے پہلے شائع ہوئے لیکن زیادہ متداول نہیں تھے وہ سارے کے سارے کمپیوٹرائز ہونے باقی ہیں۔

لیکن اس سے بھی زیادہ مشکل کام ہے وہ رجال کی کمپیوٹرائزیشن کا کام ہے۔ جو رجال کے بارے میں تفصیلات یا معلومات کے اس قدر ذخیرے کے ساتھ جو علمائے رجال اور جرح و تعدیل کے ائمہ نے جمع کیا ہے۔ اس کو کمپیوٹرائز کرنا انتہائی اہم، مشکل اور لمبا کام ہے۔ اس کے لئے ایک نئے سافٹ ویئر کی ضرورت ہے۔ وہ سافٹ ویئر وہ آدمی بنا سکتا ہے جو خود بھی محدث ہو۔ علم حدیث بھی جانتا ہو اور پروگرامنگ بھی جانتا ہو۔ اگر علم حدیث نہ جانتا ہو تو شاید اس کے لئے سافٹ ویئر بنانا بہت مشکل ہوگا۔ مثال کے طور پر میں نے عرض کیا تھا کہ بعض محدثین تعدیل اور جرح میں متشدد ہیں۔ بعض متساہل ہیں اور بعض معتدل ہیں۔ تو ان تینوں کو الگ الگ نمبر دینا ہوگا۔ متساہل کا کوڈ الگ ہوگا، متشدد کا الگ اور معتدل کا الگ ہوگا۔ پھر متشددین میں لوگوں کے درجات ہیں ان کو اسی سطح پر رکھنا ہوگا۔ اس کے لئے کمپیوٹر میں سافٹ ویئر کی تیاری کی ضرورت ہے۔ جب یہ سارا کام ہو جائے تو پھر اس کی مدد سے رجال کے سارے ذخیرے کو ایک نئے انداز سے دیکھنا پڑے گا۔ مثلاً علم حدیث میں رجال میں ایک اصطلاح 'مدار سند' استعمال ہوتی ہے۔ مدار سند اس کو کہتے ہیں کہ ایک محدث تک ایک حدیث مختلف راویوں اور مختلف سندوں سے پہنچی لیکن اوپر جا کر درمیان میں راوی ایک ہی ہے۔ پھر آگے چل کر اسی ایک راوی سے آگے بات چلتی ہے۔ اس کو مدار سند کہتے ہیں۔ مدار سند اگر کمزور ہیں تو سند کے بقیہ حصوں میں اگر اوپر نیچے اور نیچے راوی بھی موجود ہوں تو وہ irrelevant ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ مدار سند سے آگے بات کمزور ہے تو اگر نیچے کی سطح پر لوگ بہت مستند بھی ہیں تو بھی ان کا مستند ہونا کوئی خاص فائدہ نہیں رکھتا۔ مدار سند اگر مضبوط ہے تو پھر ان لوگوں کی مضبوطی بہت فائدہ دے گی۔ اس لئے مدار سند کی بہت اہمیت ہے۔ مدار سند کا پتہ غیر معمولی یادداشت اور طویل مطالعہ سے ہی چل سکتا ہے۔

آپ کو وہ جواب معلوم ہو اور آپ متاثر نہ ہوں تو وہ کسی اور کے سامنے اسی بات کو دہرا دیتے ہیں۔ وہ تسلسل کے ساتھ ایک ہی بات کو بار بار دہراتے رہتے ہیں۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان جوابات کو بھی بار بار بیان کیا جائے۔ اور ان غلط فہمیوں کی بار بار تردید کی جائے۔

علم حدیث پر انیسویں صدی کے وسط میں جو بنیادی اعتراض کئے گئے تھے ان سب کی اصل بنیاد یہ غلط فہمی تھی کہ ذخیرہ احادیث تاریخی طور پر ثابت شدہ نہیں ہے اور غیر مستند ہے۔ اس غلط فہمی کی تو اچھی طرح وضاحت ہو گئی۔ اب اس اعتراض کو نہیں دہرایا جاتا اور جو لوگ اس اعتراض کو دہراتے ہیں وہ کم پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ کوئی ذمہ دار مستشرق یا پڑھا لکھا منکر حدیث اب حدیث کی تاریخی سندوں کو نشانہ نہیں بناتا۔ لیکن ہمارے یہاں بعض کم علم لوگ ابھی تک اسی لکیر کو پیٹ رہے ہیں۔

اب دوسرے اعتراضات جو بعض لوگ آج کل علم حدیث پر کرتے ہیں وہ حدیث کے مندرجات پر ہو رہے ہیں۔ کچھ لوگ نیک نیتی سے کرتے ہیں جس کی دو مثالیں میں نے موریس بکائی کی دیں۔ کچھ لوگ کم فہمی سے اور کچھ بدنیتی سے کرتے ہیں۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان سب اعتراضات کا علمی انداز میں جائزہ لے کر ان کا جواب دیا جائے۔ میں اعتراضات کا جواب دینے کے اس طریقے کو صحیح نہیں سمجھتا کہ پہلے آپ اعتراض نقل کریں اور پھر اس کا جواب دیں۔ آپ اصل بات کو اس طرح بیان کریں کہ اعتراض پیدا ہی نہ ہو۔ یہ زیادہ دیرپا اور زیادہ موثر طریقہ ہے۔ اعتراضات بیان کر کے ان کا جواب دینا صحیح طریقہ نہیں ہے۔

علم حدیث پر بعض اعتراضات ایسے ہیں جو کم فہمی یا علم حدیث کی اہمیت سے ناواقفیت کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ اس طرح کے اعتراضات آج سے نہیں بلکہ شروع سے ہو رہے ہیں۔ سنن ابوداؤد میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک روایت ہے کہ ان سے کسی یہودی نے بڑے طنز کے ساتھ اور مذاق سے پوچھا کہ کیا تمہارے رسول تمہیں ہگنے موتنے کا طریقہ بھی بتاتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہاں بتاتے ہیں۔ آپ نے بتایا کہ استنجا کرو تو اس طرح کرو وغیرہ۔ انہوں نے اس پر کوئی ناراضگی کا اظہار نہیں کیا بلکہ سنجیدگی ظاہر کی اور اس کے طنز کو فخر کے طور پر تسلیم کیا اور کہا کہ ہمارے پیغمبر نے ہمیں ہر اچھی بات سکھائی ہے۔ حدیث رسول پر اعتراض کرنے کی جو ذہنیت ہے یہ یہودی ذہنیت ہے۔ یہ حضرت سلمان فارسیؓ کے زمانے سے آج تک

چلی آرہی ہے اور ہر زمانے میں یہودی اس طرح کے سوالات کرتے رہے ہیں۔ یہاں تمام لوگوں کی ذمہ داری ہے جو حدیث کا علم رکھتے ہیں یا اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو علم حدیث سے دلچسپی عطا فرمائی ہے اور جن کو اللہ تعالیٰ نے علم حدیث کا دفاع کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہے۔

یہ چند باتیں تھیں جن کو میں آج کہنا چاہتا تھا۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے یہ موقع عنایت فرمایا۔ دعا کریں کہ جو کچھ میں نے یہاں کہا اللہ تعالیٰ اس کو اخلاص سے کہنے کی توفیق کے ساتھ ساتھ اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے۔ جو کچھ کہا ہے مجھے بھی عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور آپ کو بھی عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ جو غلطیاں ہوئی ہوں ان کو اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔ جو صحیح بات ہوئی ہو اس کو قائم و دائم رکھے۔

☆☆☆☆☆

حجاب کا جو عام مفہوم ہے وہ یہی ہے۔ باقی جو اس کا معیار ہے اس میں تبدیلی ہے۔

دیکھئے، چہرے کے پردے کے بارے میں شروع سے ایک گفتگو چلی آرہی ہے جس میں صحابہ اور تابعین کے زمانے سے یہ بحث موجود ہے۔ قرآن پاک کی جس آیت میں آیا ہے کہ پردہ کرو، اس میں آیا ہے کہ الا ما ظهر منها سوائے اس کے کہ جو ظاہر ہو۔ تقریبا محدثین، صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کی ایک بہت بڑی تعداد کا کہنا ہے کہ الا ما ظهر منها یعنی سوائے اس کے کہ جو ظاہر ہو جائے، اس میں جسم کی ساخت اور قد وقامت شامل ہے جس کو نہیں چھپایا جا سکتا۔ جب ایک خاتون نکل کر کہیں جائے گی تو لوگ دیکھیں گے کہ دبلی ہے، پتلی ہے، موٹی ہے بھاری ہے تو یہ ظاہر ہو جائے گا اور جسم کی ساخت کا بھی اندازہ ہو جائے گا تو یہ تو نہیں چھپایا جا سکتا۔ اس لئے اس میں یہ شامل ہے باقی سب چیزیں چھپائی جائیں۔

کچھ اور حضرات کا کہنا ہے کہ اس میں جسم کے وہ اعضاء بھی شامل ہیں جن کو بعض اوقات کھولنا ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً کسی کام کے لئے خاتون جا رہی ہے، سفر پر جا رہی ہے تو ہاتھ کھلا ہوگا، پاؤں کھلے ہوں گے، کسی مزدوری کے لئے ضرورت پڑے گی تو ہاتھ کھولنا پڑے گا۔ اس میں کچھ لوگ چہرہ کھولنے کو بھی شامل سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ چہرہ کا پردہ واجب ہے کہ نہیں اس میں تو اختلاف شروع سے چلا آرہا ہے۔ اس لئے کچھ لوگ جو چہرے کے پردے کو لازمی سمجھتے ہیں ان میں ہمارے امام احمد بن حنبل اور سعودی علما شامل ہیں۔ وہ ہر حال میں چہرے کے پردے کو لازمی سمجھتے ہیں۔ کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ چہرے کا پردہ عام حالات میں تو کرنا چاہئے لیکن اگر کسی خاتون کو کوئی ناگزیر ضرورت ایسی پیش آجائے جس میں اسے وقتی یا مستقل طور پر چہرہ کھولنے پر مجبور ہو تو چہرہ، ہاتھ اور پاؤں کھولنے کی اجازت ہے۔

تیسرا نقطہ نظر یہ ہے جو مجھے بھی ذاتی طور پر دلائل وغیرہ دیکھ کر درست معلوم ہوتا ہے لیکن آپ کا جو جی چاہے وہ آپ اختیار کریں۔ وہ یہ ہے کہ چہرے کا ڈھکنا تو افضل اور عزیمت ہے لیکن کھولنے کی اجازت ہے۔ چہرہ کھولنا رخصت ہے۔ اگر وہ خاتون یہ سمجھتی ہیں کہ چہرہ نہ کھولنے سے اس کے لئے مشکلات ہیں تو وہ کھول سکتی ہیں۔ اور یہ مسائل بعض اوقات یورپ اور دیگر مغربی ممالک میں پیش آتے ہیں۔ جہاں ہماری بہت سی بہنوں کو نوکری کرنے کی ضرورت پڑتی ہے اور باہر جانا پڑتا ہے۔ وہاں کے ماحول میں ان کو سر ڈھانکنے کی اجازت بھی بڑی مشکل سے ملتی ہے تو

میرے خیال میں علمی فائدہ (Academic interest) ان کا محرک تھا۔ بہت سے لوگ خالص علمی جذبہ سے بھی کام کرتے تھے۔ انہوں نے علمی سہولت کے لئے یہ کام کیا۔ یہ ایک اچھا قول ہے، ایک اچھا وسیلہ ہے جس سے کام لے کر حدیث کی کتابوں سے استفادہ آسان ہو جاتا ہے۔

ایک اور بہن نے دعا کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نہیں اپنے واقع اور بھی دے۔ آمین

یہ کیسٹ کہاں دستیاب ہوں گی؟

مجھے نہیں معلوم۔ اگر الہدیٰ کے لوگوں نے کوئی کیسٹ بنائی ہے تو آپ ان سے پوچھ لیجئے۔

پوچھنے والا صاحب۔ یہ ہے آپ کی تقاریر کی درکیسٹیں کہاں دستیاب ہوں گی؟

میری تو ابھی کوئی کیسٹ کسی خاص جگہ پر دستیاب نہیں ہیں۔ نہ میں نے کبھی بنوائی ہیں۔ کسی پروگرام میں اگر کوئی خود ریکارڈ کر لے تو میں کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ میری تقریریں اور مواعظ ٹیپ ہوں اور لوگ پڑھیں۔ لیکن اگر اس پروگرام سے کیسٹیں بن گئے ہیں تو میری طرف سے آپ کے لئے ہدیہ ہے۔ کوئی نقل کرنا چاہے تو ضرور کرے۔

ابھی علوم حدیث کی بہت سی جہتیں باقی ہیں۔ آپ ضرور رابطہ کریں۔ میں اسلامی یونیورسٹی میں بیٹھتا ہوں جس کو جی چاہے رابطہ کرے۔

آپ نے جو حدیث بیان کی ہے اس کی سند کیا ایک کاپی مل سکتی ہے۔

بالکل مل سکتی ہے۔ میں ایک کاپی الہدیٰ میں دے دوں گا۔

ایک اور بہن نے دعا کی ہے۔ جزاک اللہ

صحیح مسلم کی ۔ کیا وہ ۔ یہ بھی حدیث بیان ہوئی ہیں کیا وہ سب صحیح ہیں؟

جی ہاں وہ سب صحیح ہیں۔ اس میں کوئی حدیث ضعیف یا حسن کے درجہ کی نہیں ہے وہ سب کی سب صحیح ہیں۔

اس بات کی کیا دلیل ہے کہ مسلم شریف میں جو حدیثیں درج ہیں وہ بغیر تحریف کے ہم تک پہنچی ہیں؟

یہ جو بارہ دنوں میں ساری داستان بیان کی گئی تو بتانے کے لئے بیان کی۔ ہر دور میں ہزاروں انسانوں نے ان کو زبانی یاد کیا، لاکھوں انسانوں نے ایک ایک آدمی کا نام محفوظ کیا جس کے ذریعے یہ ان تک پہنچا ہے۔ ان میں سے ہر آدمی کی تاریخ محفوظ ہے۔ ہر دور کے تحریری

امام بخاری پر بہت ساری کتابیں لکھی گئی ہیں۔ دو کتابوں کا میں ذکر کروں گا جو مجھے اچھی لگیں۔ ایک کتاب تو "تذکرۃ المحدثین" دو جلدوں میں ہے۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی ہندوستان کے ایک بزرگ تھے، ان کی لکھی ہوئی ہے۔ ہندوستان میں چھپی تھی۔ وہ آپ دیکھ لیں اس میں بڑے محدثین کا تذکرہ ہے۔ دوسری کتاب ہے جو مدینہ یونیورسٹی کے پڑھے ہوئے ایک بزرگ ڈاکٹر تقی الدین مظاہری کی لکھی ہوئی ہے۔ اردو میں ہے۔ کتاب کا نام ہے "محدثین کرام اور ان کے کارنامے"۔

ایک اور ہیں ڈاکٹر محمد عثمان اسحاق۔ ہندوستان کے، ان کی بھی تذکرہ محدثین پر ایک کتاب ہے۔

موریں بنگالی مسلمان ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنے قبول اسلام کا کوئی بیس سال پہلے اعلان کر دیا تھا۔

کیا امام ابو حنیفہ نے حضرت انس کو دیکھا تھا؟

جی ہاں امام صاحب نے حضرت انس کو دیکھا تھا۔ امام ابو حنیفہ اپنے والد کے ساتھ حج کے لئے گئے تھے۔ اس وقت ان کی عمر تیرہ یا چودہ سال تھی۔ حضرت انس مکہ مکرمہ میں تشریف لائے ہوئے تھے۔ اور امام ابو حنیفہ بیان کرتے ہیں کہ جب میں حج کے لئے گیا تو مسجد حرام کے باہر ہجوم تھا۔ بہت سے لوگ جمع تھے۔ ہر شخص لپک کر اس ہجوم کے مرکز تک پہنچنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ انہوں نے کسی سے پوچھ کر بتایا کہ صحابی رسول حضرت انس آئے ہوئے ہیں اور لوگ ان کو دیکھنے کے لئے جمع ہو رہے ہیں۔ تو امام ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ میں بھی لوگوں کے درمیان سے نکل کر ان تک پہنچ گیا اور میں نے ان کی زیارت کی۔

کیا استخارے میں خواب کا آنا ضروری ہے؟

نہیں استخارے میں خواب کا آنا ضروری نہیں ہے۔ استخارے کے معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے طلب خیر کی جائے۔ استخارہ کا مطلب ہے خیر طلب کرنا۔ جب آپ کے سامنے دو کام ہوں۔ دونوں جائز ہوں۔ یہ نہیں کہ ایک جائز ہو اور ایک ناجائز کہ سود کھاؤں کہ نہ کھاؤں، اور استخارہ کرنے لگے۔ یہ استخارہ نہیں ہوگا۔ استخارہ وہاں ہوگا جہاں دو جائز کام درپیش ہوں اور انتخاب میں مشکل پیش آ رہی ہو۔ مثلاً مکان خریدنے کا پروگرام ہے۔ دو مکان مل رہے ہیں اور آپ کے لئے

ایسی ہے جو کمزور ہے، مثلاً امام ترمذی کی کتاب جو میرے سامنے ہے جس میں پندرہ شعبان کو عبادت کرنے کا ذکر ہے لیکن ضعیف حدیث ہے۔ اکثر محدثین اس کو ضعیف سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ حدیث ضعیف ہے اور اس کا ضعف بڑے کمزور درجہ کا ہے۔ جو حضرات سمجھتے ہیں کہ اس کا ضعف کمزور درجہ کا نہیں وہ اس پر عمل کرنے کو جائز سمجھتے ہیں۔ اس لئے جو حدیث پر عمل کرنے کی نیت سے اس کام کو کرتے ہیں وہ بدعت نہیں ہے۔ لہٰذا اگر کوئی پندرہ شعبان کی رات کو عبادت کرتا ہے یا دن کو روزہ رکھتا ہے تو وہ نعوذ باللہ بدعت نہیں ہے۔ لیکن جو پندرہ شعبان کو پھلجھڑی چلاتا ہے وہ یقیناً بدعت ہے۔ جو سمجھتا ہے کہ پندرہ شعبان کو حلوہ پکانا ضروری ہے وہ یقیناً بدعت ہے۔ جو پندرہ شعبان کو چراغاں کرتا ہے وہ یقیناً بدعت ہے کیونکہ اس کو کوئی براہ راست یا بالواسطہ کسی حدیث میں، کسی ضعیف میں بھی کہیں نہیں آیا۔ یہ فرق ہے بدعت اور غیر بدعت میں۔ کسی چیز کا صحیح ہونا، سنت ہونا یا نہ ہونا یہ الگ چیز ہے اور اس کا بدعت ہونا یا نہ ہونا الگ چیز ہے۔

آپ نے فرمایا کہ دلائل مختصر ہوں اور جن کو صحیح سمجھتے ہوں ان کی پیروی کریں۔ کیا ہم لوگ، جو ابھی علمی میدان میں مبتدی ہیں، اس قابل ہیں کہ ہم خود فیصلہ کر سکیں کہ کس پر عمل کرنا چاہئے اور کس پر نہیں ....

اسی لئے میں نے کہا کہ جو اب تک کرتے آئے ہیں وہی کرتے رہیں۔ جو اب تک کرتی رہی ہیں وہ کرتی رہیے۔

یہ اسلام کی بڑی خدمت ہوگی اگر آپ سائیکالوجی پڑھ کر اس کی روشنی میں دلائل سے اسلامی عقائد اور نظریات کی تشریح کریں اور بتائیں کہ ان دلائل سے بھی یہ عقائد درست ہیں تو یہ بہت بڑی خدمت ہوگی، آپ ضرور کریں۔

آج کل دم یا قرآن پڑھ کر پھونک کر کا علاج کیا جاتا ہے اور اس کے پیسے وصول کئے جاتے ہیں اس بارے میں کچھ بتائیں۔ سورۃ فاتحہ سے ایک سردار کے علاج وغیرہ کا سن کر رقم لینے کی بات ہے۔ اگر اس کی اجازت واقعی ہے تو کیا ہم لوگ اس کے پیسے وصول کر کے اس طرح کے کلینک کھول سکتے ہیں؟

میرے خیال میں تو کلینک کھولنے کا راستہ تو بڑا خطرناک ہوگا۔ نہ کلینک کھولیں نہ پیسے

لیتی۔ صحابہ نے کوئی فیکلٹی نہیں کھولا تھا وہ بعد میں بھی سو سال تک رہے۔ 110ھ تک صحابہ کرام کا زمانہ ہے۔ انہیں فیکلٹی نہیں کھولا۔ اس لئے کلینک کھولنا سنت کے مزاج کے خلاف ہوگا۔ کلینک تو میڈیکل سائنس کی بنیاد پر کھولے جاتے ہیں۔ یہ تو ایک صحابی نے اس یقین سے کہ اللہ کی کتاب میں شفا ہے، قرآن پاک میں اس کو شفا کہا گیا ہے کہ فیہ شفاء لما فی الصدور، تو اس یقین سے اس کو پڑھ کر پھونک دیا اور اس قبیلہ کے سردار نے ہدیے کے طور پر کچھ پیسے بھی دے دیئے اور انہوں نے لے لئے۔ وہ معاوضہ کی بات نہیں تھی کہ انہوں نے پہلے فیس مقرر کی ہو کہ پانچ سو روپے لیں گے اور پانچ سو روپے لے کر پھونک دیں۔ یہ کسی صحابی یا تابعی نے نہیں کیا اس لئے دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

دی بائبل: قرآن اینڈ سائنس کے ڈاکٹر موریس بکائی Maourice اس کو فرنچ میں موریس پڑھتے ہیں اور بکائی کے ہجے ہیں Bucaille یہ فرنچ میں بکائی پڑھا جاتا ہے فرنچ میں جہاں بھی ڈبل ایل آئی آئے اس کو ی پڑھتے ہیں۔

شوق پیدا ہوا ہے مطالعہ کا، جدید کتاب بھی ہوں، کوئی شخص بتادیں

میرے علم میں تو کوئی ایسی کتاب نہیں ہے لیکن ایک بزرگ تھے آپ نے نام سنا ہوگا مولانا ابو الخیر مودودی مرحوم، سید ابو الاعلیٰ مودودی کے بڑے بھائی تھے۔ ان کے پاس میں بہت جایا کرتا تھا اور کتابوں پر تبادلہ خیال ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ میں ان کے پاس گیا۔ میں نے ان سے ایک سوال کیا جو شاید آپ کی دلچسپی کا بھی ہو، اگرچہ اس کا جواب نہیں ملا۔ میں نے ان سے پوچھا تھا کہ اب بھی لوگوں سے پوچھتا رہتا ہوں، تلاش بھی کرتا رہتا ہوں۔ جب یہ پوچھا تھا تو اس کو کوئی چھتیس سال ہو گئے ہیں۔ 1971 میں پوچھا تھا کہ رسول اللہ ﷺ تو جنوں اور انسانوں دونوں کے لئے بھیجے گئے تھے اور جنوں اور انسانوں دونوں کے لئے حضورؐ کے نبی ہونے کا ذکر قرآن پاک میں آتا ہے۔ تو انسانوں نے تو حدیث کے یہ سارے ذخیرے جمع کئے، فقہ مرتب کی، اصول حدیث اور اصول فقہ پر کتابیں لکھیں تو کیا جنوں نے بھی ایسا کوئی کام کیا کہ حضورؐ کے سارے ارشادات جمع کئے ہوں؟ یا وہ بھی انسانوں کے کیے ہوئے کے پابند ہیں؟ اگر انسانوں کے کئے ہوئے کے پابند ہیں تو اس کی دلیل کیا ہے؟ یعنی کیوں جنات انسانوں کے فقہ، علم حدیث اور علم جرح و تعدیل کی پیروی کریں؟ یا ان کے اپنے بھی جنہ لوگ ہیں؟ تو انہوں نے کہا کہ ابھی میں نے تو کبھی نہیں

ایک دوسری مثال یہ ہے کہ کسی صاحب نے اپنی نوجوان بالغ خاتون بیٹی کا نکاح کر دیا اور اس نے اعتراض کیا تو حضورؐ نے اس نکاح کو ختم کروا دیا اور ان سے کہا کہ ان کا نکاح کر دو۔ اور ایسی بھی مثالیں ہیں کہ ایما امرأة نکحت بغیر اذن ولیها فنکاحها باطل باطل باطل، کہ جو کوئی خاتون اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرے تو وہ باطل ہے باطل ہے باطل ہے۔ اب بظاہر یہ دو احادیث ہیں اور ان میں تعارض ہے۔ میں نے اس سے پہلے بتایا تھا کہ علما نے تعارض کو حل کرنے کے لئے کچھ بنیادی اصول مقرر کئے ہیں۔ ان میں سے ان اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے بعض علما کی رائے یہ ہے کہ جن احادیث میں ولی کی اجازت کے بغیر نکاح نہ کرنے کا ذکر ہے۔ ان احادیث کو ترجیح دی جائے گی اور ولی کی اجازت کے بغیر جو نکاح ہوگا وہ باطل ہوگا۔

امام ابو حنیفہ نے ان دونوں کو ایک دوسرے سے تطبیق دینے کی کوشش کی ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ جہاں ولی کی اجازت کے بغیر نکاح نہ کرنے کا ذکر ہے وہاں اس کے اخلاقی پہلو کو حضورؐ نے بیان کیا ہے کہ اخلاقی طور پر ایک مسلمان خاتون کو یہ زیب نہیں دیتا کہ باپ سے پوچھے بغیر جہاں چاہے نکاح کرے اور باپ کو بعد میں پتہ چلے وہ بیچارہ پریشان ہو۔ اس طرح نہیں کرنا چاہئے۔ یہ بہت مضبوط اخلاقی ہدایت ہے۔ لیکن اگر کوئی خاتون نکاح کرے تو کیا وہ نکاح **Valid** اور **Legally** ہوا کہ نہیں ہوا؟

یہ بالکل الگ معاملہ ہے۔ فرض کریں ایک خاتون نے نکاح کر لیا اور گھر والوں کو اطلاع نہیں دی۔ ان کو دس سال بعد پتہ چلا۔ میں ایک مثال دیتا ہوں۔ ایک لڑکی یہاں سے پڑھنے کے لئے انگلستان گئی۔ وہاں اپنے کسی کلاس فیلو سے شادی کر لی۔ ماں باپ کو پتہ نہیں چلا۔ دس سال بعد آئی تو شوہر صاحب بھی ساتھ آئے اور تین بچے بھی ساتھ تھے۔ اب بتائیے کہ جو فقہا کہتے ہیں کہ نکاح جائز نہیں ہے ان بچوں کو کیا کہیں گے؟

امام ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ یہ نکاح تو ہو جائز ہے لیکن ان کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اب آپ سزا دیں۔ جرمانہ کریں، قید میں ڈال دیں، تنبیہ بھی کر دیں اس لئے کہ اس نے ایک ایسا کام کیا ہے جس کی اجازت حدیث میں نہیں دی گئی ہے۔ لیکن قانوناً جو اس کا تکنیکی لیگل حصہ ہے وہ آپ منسوخ نہیں کر سکتے۔ یہ ایک لمبی بحث ہے لیکن دونوں کے بیانات کا خلاصہ یہ ہے۔ پاکستان میں عدالتیں اکثر امام ابو حنیفہ کے نقطۂ نظر کے مطابق فیصلہ کرتی ہیں۔ اس طرح کی مثالیں

کے بعض فیصلوں کے بارے میں مجھے بھی تامل ہے۔اس میں فیصلہ اس طرح نہیں ہوا جس طرح ہونا چاہئے تھا۔میرا کہنا یہ ہے کہ اس موضوع پر ایک مفصل مرتب قانون ہونا چاہئے۔

جب میں اسلامی نظریاتی کونسل کا رکن تھا تو وہاں میں نے یہ مسئلہ اٹھایا تھا اور اس ضرورت کا اظہار کیا تھا کہ ایک مکمل اور جامع مسلم فیملی لاء پاکستان میں تیار ہونا چاہئے جس میں اس طرح کے سارے مسائل کو مکمل طریقے سے بیان کر دیا جائے۔اور جو کمزور پہلو (Loop holes) ہیں یا پیچھے رہ گئے ہیں ان کو بند کر دیا جائے۔

سوال: ضعیف احادیث کو پڑھ کر ہم کیا فرق کیسے کریں؟

آپ وہ مجموعے پڑھیں جن میں صحیح احادیث کا ذکر ہے۔صحیح بخاری، صحیح مسلم کا ترجمہ پڑھیں۔اردو میں ایک کتاب ہے جس کا انگریزی ترجمہ بھی ملتا ہے۔اگرچہ بہت معیاری نہیں ہے۔وہ "اللؤلؤ والمرجان فی ما اتفق علیہ الشیخان" ہے۔جس میں صحیح بخاری اور مسلم دونوں کے متفق علیہ احادیث کو بیان کیا گیا ہے۔وہ موجود ہے اس کو پڑھئے ان میں ضعیف ہونے کا انشاء اللہ امکان نہیں ہے۔

آپ سے درخواست ہے کہ آپ ہمیں اصول فقہ پڑھا دیں۔

اگر زندگی رہی تو میں ضرور پڑھاؤں گا لیکن میں اسلامی یونیورسٹی میں پڑھاتا ہوں آپ وہاں داخلہ لے لیں تو میں آپ کو پڑھا دوں گا۔

علوم حدیث کے اس تعارف کے بعد ہم بحیثیت ایک مومن مسلمان کو کیا کرنا چاہئے۔ہمارے ہاں جو اختلافات ہیں ان کو ختم کرنا چاہئے۔۔۔

اختلافات کو ختم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔اختلاف کوئی بری چیز نہیں ہے۔اس سے خیالات کا تنوع اور ورائٹی سامنے آتی ہے۔جتنی ورائٹی ہوگی اتنے خیالات و افکار پھیلیں گے اور تعلیمی سطح بلند ہوگی۔لیکن ان خیالات کو آپس میں دوسرے سے جھگڑنے کا ذریعہ نہیں بنانا چاہئے۔امام بخاری اور امام مسلم میں کئی معاملات پر اختلاف ہے۔لیکن امام مسلم امام بخاری کا اتنا احترام کرتے ہیں کہ انہوں نے امام بخاری سے کہا کہ آپ اجازت دیں کہ میں آپ کے پاؤں چوم لوں۔لیکن امام مسلم نے خود اپنی صحیح مسلم کے مقدمہ میں امام بخاری پر اتنے احترام کے باوجود تنقید کی ہے۔تو احترام اپنی جگہ اور اختلاف اپنی جگہ۔دونوں ہو سکتے ہیں۔

کیا عورت و مرد کی نماز میں فرق ہے؟

یہ تو میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ نماز میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ایک ہی طرح کی ہے سارے احکام ایک جیسے ہیں۔ لیکن بعض فقہا کا کہنا یہ ہے کہ جب خاتون سجدہ یا رکوع کی حالت میں جائے تو سجدہ ایسے کرے کہ اس کے جسم کے لئے زیادہ سے زیادہ ساتر ہو اور جسم کے جو خدوخال ہیں وہ نمایاں نہ ہوں۔ یہ بھی ایک حدیث سے استدلال کی بنیاد پر ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کوئی ضرورت نہیں اسی طرح کرنی چاہئے۔ جیسے آپ کا جی چاہے سجدہ کریں۔

حضورؐ سے محبت میں کیسے اضافہ کیا جاسکتا ہے؟

آپ سیرت اور حدیث کا مطالعہ کریں حضورؐ سے محبت میں اضافہ ہو جائے گا۔

آپ نے ایک شعر پڑھ کر سنانے کا وعدہ کیا تھا

میں بھول گیا تھا ابھی پڑھتا ہوں۔

اگر ہر ایک کو اپنی پسند کے امام کے مسلک پر چلنے کی کھلی چھوٹ دے دی جائے تو کیا اس سے فرقہ بندی کی گنجائش پیدا نہیں ہوتی؟

اس سے اور بھی بہت سی خرابیاں پیدا ہوں گی اس لئے ہر شخص کو دو مسلکوں میں اپنی پسند کے مطابق فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ امام شاطبی کہتے ہیں کہ یہ تو اتباع شریعت نہیں ہوگا بلکہ اتباع ہوا کی ہوگی۔ اپنی خواہشات کے مطابق آدمی پیروی کرے گا۔ جو چیز کاروبار میں مفید ہوگی تو تاجر کہے گا کہ اسے اختیار کریں۔ جس کو کسی اور چیز میں فائدہ ہوگا تو وہ کہے گا اس چیز کو اختیار کریں۔ تو اس سے بڑی قباحت پیدا ہوگی۔

حواشی کا مطلب ہے حدیث کی کسی کتاب کے حاشیے پر۔

یہ اھ لکھا ہوتا ہے اس کا کیا مطلب ہے؟

جو لکھا ہوتا ہے یہ اھ کے ابجدی عدد ہیں۔ اھ کے معنی ہیں انتہیٰ۔ اھ کے ان ابجدی الفاظ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہاں حاشیہ ختم ہو گیا۔ یعنی unqoute جسے کہتے ہیں۔ انگریزی میں کہتے ہیں quote اور unquote تو پہلے لکھتے ہیں سے اس کے بعد لکھتے ہیں انتہیٰ تو انتہیٰ کی تلخیص کر کے انتہیٰ کی بجائے اھ لکھ دیتے ہیں۔

کیا ہم اس بات کا یقین کر سکیں کہ مستشرقین نے احادیث کو درست کرنے کے بغیر ردوبدل کی کوشش کی